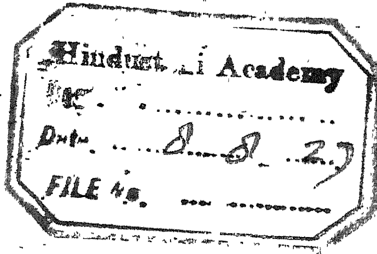
رجسٹرڈ نمبر　　　　　ھو المستعان　　　　　اے

الناظر



ایڈیٹر ـــــ ظفر الملک ـــــ علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ
للعہ

قیمت فی پرچہ
Rs 5/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
عہ کی روانگی پر آدھا
اور
عہ کی روانگی پر پورا

ہدیتہً بھیجیے
عہ کی روانگی پر الناظر ایک
اور
تمام کی روانگی پر عہ کی کتاب

مرزا غالب مرحوم

- اُردوئے معلی عہ
- عود ہندی
- دیوان غالب ے
- مکمل دیوان غالب صر

سرسید مرحوم

- خطبات احمدیہ ے
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ ۱۰
- مکتوبات سید ۶

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲
- کتاب المحبت و الشوق ۱۲
- ...تنیب
- خاتون کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- جہاد النحو علی للعہ
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد للعہ

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات ے
- دربار اکبری صر
- سخندان فارس ے
- نگارستان فارس ے
- نیرنگ خیال عہ
- سیر ایران عہ
- ڈرامہ اکبر عہ
- مجموعہ مکتوبات آزاد عہ
- مجموعہ نظم آزاد ۸
- نصیحت کا کرنپھول ۸
- جانورستان ۱۰
- بیاض آزاد صر
- تذکرہ علماء ۵
- لغت آزاد عہ
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۶

پروفیسر شہباز مرحوم

- زندگانی بے نظیر عہ
- خیالات شہباز عہ

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا عہ
- شیخ حسن ۱۲

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم صر
- الحقوق و الفرائض ے
- بنات النعش ے
- مراۃ العروس ۱۰
- توبۃ النصوح ۱۲
- موعظہ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانہ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد صر
- منتخب الحکایات ۶
- چند پند ۶
- مبادی الحکمۃ عہ

مولانا راشد الخیری مرحوم

- حیات امیں ۶
- الشیائی شاعری عہ
- نورجہان بیگم ۸
- ٹیپو سلطان عہ
- حیدر علی سلطان صر

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب ے
- حیات سعدی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- حیات جاوید للعہ
- دیوان حالی عہ
- مسدس حالی ۸
- مجموعہ نظم حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲
- شکوۂ ہند ۲

مولوی بشیر الدین احمد

- واقعات دار الحکومت دہلی عہ
- تاریخ بیجاپور عہ
- حرز طفلاں عہ
- نشاط عمر عہ
- عصائے پیری عہ
- لخت جگر ے
- حسن معاشرت عہ
- اصلاح معیشت عہ
- اقبال دلہن عہ
- شمع ہدایت عہ
- انشائے بشیر ۱۲
- دیوان بشیر عہ

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول صر
- جلد دوم للعہ
- سوم للعہ
- الفاروق صر و عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عہ
- سفرنامہ مصر و روم و شام عہ
- علم الکلام ۶
- الکلام ۶
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- دوم
- سوم
- چہارم ے
- پنجم ۶
- موازنہ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸
- آغاز اسلام ۸
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۰
- کلیات شبلی فارسی عہ

مولانا ذکاء اللہ

- تاریخ ہندوستان
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفہ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ
- جغرافیہ طبعی
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- رسالہ علم تناسب
- معاون الحساب
- مساحت ماڈ ہنٹر

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی رشید احمد

- المذہب و الاسلام
- تحریر المراۃ

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

فہرست مضامین بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء

نمبر		جلد ۳۳
فلسفہ کی غایت	مولوی معتقد ولی الرحمن ایم اے	۱
کب تک (نظم)	منشی شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	۱۳
موجودہ باطنی تحریک	" ش "	۱۴
جام سفال	مسٹر مشیر احمد علوی کاکوروی بی اے (علیگ)	۲۱
تاریخ انگلستان - ایک قابل قدر قلمی کتاب	اڈیٹر	۲۲
تضمین بر غزل مرزا غالب	سید محمد جعفر حسین اثر لکھنوی	۳۲
مسلم یونیورسٹی کی حالت زار		۳۳
پچھلے مہینے کے رسالے		۴۲
اردو رسائل کے خاص مضامین		۴۵
نظرے خوش گذرے		۴۶
انشاپردازی کا مقابلہ	منشی محمد عبد اللطیف صدیقی	۱-۳۳

مصنفین اردو

یعنی الناظر بک ایجنسی کی فہرست کتب بابت ۱۹۲۷ء تیار ہے۔ اس میں پانچ ہزار سے اوپر اردو کتابیں درج ہیں - قدردانان الناظر میں سے جن صاحب کو مطلوب ہو طلب فرمائیں - جو الناظر کے خریدار نہیں ہیں وہ ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال فرمائیں

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

نئی کتابیں

تاریخ فلسفۂ اسلام

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی (برلن)

ہالینڈ کے مشہور مستشرق ٹی۔ جے دو بوئر نے یورپ کے دوسرے مشہور و معروف مستشرقوں کے اُن متفرق مضامین سے یہ کتاب مرتب کی ہے جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے فلسفہ سے متعلق لکھے تھے۔ جس کے ملاحظہ سے اندازہ ہو سکے گا کہ فلسفہ و حکمت میں عربوں اور مسلمانوں نے کیا کیا موشگافیاں کی تھیں۔

قیمت عا

حکایات و احتسابات

مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب بی اے کے مختصر افسانوں اور متفرق مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ جس میں سفرِ بغداد و قسطنطنیہ کے دلچسپ حالات بھی شامل ہیں۔

قیمت عمہ

نوٹ:- سید سجاد حیدر صاحب کے افسانوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ خیالستان کئی بار شایع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے۔ جن اصحاب نے نہ ملاحظہ کیا ہو اب منگا لیں۔

قیمت عہر

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ا جلد ۲۳ ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

فلسفہ کی غایت

افلاطون نے ایک مکالمہ میں کہا ہے کہ "حیرت کا احساس فلسفی کی اصلی و حقیقی نشانی ہے، کیونکہ فلسفہ حیرت ہی سے پیدا ہوتا ہے" افلاطون کا یہ قول صحیح مانا جا سکتا ہے، کیونکہ فلسفی کو فی الواقع حیرت ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ اشیاء کے متعلق یہ حیرت صرف فلسفی ہی کو نہیں ہوتی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ ہوگا، کہ اس احساس کا ہر شخص کو تجربہ ہوتا ہے، کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں اس طرح منہمک و مصروف رہتے ہیں، کہ ان کو کسی چیز پر تعجب ہوتا ہے، نہ حیرت۔ پھر بعض لوگ ایسے ہیں، جن کی زندگی نہایت امن چین، آرام و آسائش سے گذرتی ہے، لہذا وہ ہر چیز کو فرض کر لیتے ہیں، اور حقائق اشیاء کو شاذ و نادر تعجب ہوتا ہے، یا بالکل تعجب نہیں ہوتا، تو اسکا یہ مطلب نہیں، کہ یہ استعجاب کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ ایسے ہیں، جنکو حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ دراز جو متجسس و متلاشی طبائع رکھتے ہیں۔ ان کو علم حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش حیرت و استعجاب ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ارسطو نے بالکل صحیح کہا ہے "کہ تمام انسان علم حاصل کرنے کے بالطبع خواہشمند ہوتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام انسانوں کو اشیاء کے متعلق حیرت ہوتی ہے، اگر ان کو اشیاء و واقعات پر تعجب ہوتا ہے، اگر یہ سب دراز طبیعت رکھتے ہیں، اور اگر وہ ان اشیاء کے متعلق مزید معلومات مہیا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، تب یا تو تمام انسان فلسفی ہیں، یا پھر یہ کہ جو حیرت "فلسفی کی نشانی" ہے وہ کسی نہ کسی طرح اب

۲۳ کو معلوم کرنے کی تکلیف گوارا ہی نہیں کرتے۔ ان کو کسی چیز پر تعجب کرنے کا خیال ہی نہیں آتا لیکن اگر بعض اشخاص کو

حیرت سے مختلف ہے، جس کے ہوتے ہوئے بھی انسان فلسفی نہیں بنتا۔ اس حالت میں جس علم کی فلسفی کو تلاش ہوتی ہے، وہ اس علم سے مختلف ہوگا، جس کا غیر فلسفی جویاں رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے، کہ ہر شخص فلسفی نہیں، اگرچہ ہر شخص، اور کوئی شخص فلسفی بن سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ فلسفی ہیں، اور جو لوگ فلسفی نہیں، اُن میں آخر فرق کیا ہے؟ اس مسئلہ پر ہم کو ایک دوسرے پہلو سے غور کرنا چاہیے۔ جب ایک بچہ ریاضی کے کسی سوال کو حل کرنے بیٹھتا ہے، تو گویا اسکے پیش نظر ایک ایسا مسئلہ ہوتا ہے، جس کا حل اسکو معلوم نہیں، لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ اس حل کو معلوم کر سکتا ہے، اور اسی واسطے وہ کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ حل دریافت ہو جاتا ہے، تو مسئلہ ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یعنی یہ کہ علم کو حاصل کرنے کی جو خواہش وہ رکھتا تھا، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اسکو اس حل کے دریافت کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی، تو اسکی مشکل ویسی کی ویسی ہی باقی رہتی ہے، اور اگر باوجود سخت کوشش کے بھی وہ کامیاب نہیں ہوتا، تو وہ اسکو بالکل ترک کر کے کسی اور چیز یا کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ یہ سمجھتا ہے، کہ مسئلہ اس قسم کا ہے جسکو وہ حل نہیں کر سکتا، اور اس لیے (کم از کم اسکے لیے) وہ ناقابل حل ہے۔ اب اگر وہ اسکو ناقابل حل سمجھ کر دستکش ہو جاتا ہے، تو کوئی شخص طبع آزمائی شروع کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ جو ابھی تک حل نہیں ہوا، کسی اور کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی مسئلہ کو بالکل ناقابل حل سمجھتا ہے، وہ اسکو حل کرنے کی کبھی کوشش نہ کریگا۔ اب اگر وہ اسکو حل کرنے کی کوشش شروع کرتا ہے، تو اسکا صریحًا مطلب یہ ہے کہ وہ اسکو قابلِ حل سمجھتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اُسکا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ ہمارا مطلب صرف اسقدر ہے کہ جب تک ایسا خیال نہ ہو، اُسوقت تک اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔

بعض مسائل تو ایسے ہوتے ہیں کہ جنکا حل کرنا مرنے اور فنا ہونے سے بچنے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ بدل ما تحلل کا مہیا کرنا، گرمی و سردی سے محفوظ رہنے کے لیے پناہ کی تلاش، مختصر یہ کہ جسم کی حرارتِ غریزی کی تجدید، اور اُس کا تحفظ، ایسے مسائل کی مثالیں ہیں۔ یہ مسائل عرف عام میں "عملی" کہلاتے ہیں۔ جب یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں تو آدمی سوچنا شروع کرتا ہے کہ انکو کس طرح حل کرے۔ وحشی انسان ایک جانور کو اپنے کام و دہن کی ضیافت کے لیے تاکتا ہے، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکو قابو میں کس طرح لائے۔ اس نے اسکو قابو میں کرنے کے وسائل کی تلاش شروع کی، اور انجام کار پتھروں اور ڈنڈوں کو اسکے لیے مفید پایا۔ بعد میں معلوم ہوا، کہ

پتھر اور زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ پھینکے جا سکتے ہیں۔ اسکے لیے غلیل ایجاد ہوئی۔ پھر کسی عقلمند
اور فطین وحشی کو خیال آیا کہ شکار مارنے کے لیے تیر اور کمان بہترین حربہ ہے۔ لیکن یہ تمام ترقی
یہیں پر ختم نہ ہوئی، بلکہ ایک اور بزرگ اُٹھے اور دعویٰ کیا کہ پتھروں کو پھینکنے کے لیے بہترین چیز
بارود ہے۔ یہاں سے منجنیق کی بنیاد پڑی جس نے رفتہ رفتہ بندوق، توپ اور ہاونزر کی صورت
اختیار کی۔ اور نہ معلوم ابھی اور کیا کیا ترمیم اس میں ہونے والی ہیں۔ مختصر یہ کہ جب کسی عملی مسئلہ
کا ایک حل دریافت ہو جاتا ہے، تو پھر کوئی اور شخص اس سے بہتر آسان تر اور مختصر تر حل دریافت
کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

وحشی انسان شروع شروع میں نہیں جانتا تھا کہ درخت بیج سے اُگتا ہے۔ وہ قدآور درختوں
کی شاخہائے ثمر دار اپنے سامنے دیکھتا تھا۔ اثمار اشجار سے اپنا پیٹ بھرتا تھا، اور بےفکری کی نیند سوتا
تھا۔ اسکو صرف "آم کھانے" سے مطلب تھا، نہ کہ آم کے "درخت گننے" سے، یا انکی اصل و نسل کا
پتہ چلانے سے۔ لیکن اسکے کسی بھائی بند کو حیرت ہوئی، کہ اتنا بڑا درخت جو زمین پر عمودی حالت
میں اس مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑا ہے، جو ہر سال مقررہ اوقات میں پُرانا لباس اُتار کر نیا
برگ و بار پیدا کرتا ہے، جو دھوپ کی حدت سے مرجھا جاتا ہے اور ٹھنڈک سے پھر ہرا ہو جاتا ہے
آخر کہاں سے آتا ہے، کیونکر پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے؟ یہ حیرت غور و فکر، مشاہدہ و مطالعہ کا
ایک سلسلہ آغاز کرتی ہے۔ بالآخر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ تناور درخت ایک ننھے سے بیج سے پیدا
ہوتا ہے۔ اس انکشاف کے بعد ہی وہ وحشی انسان تمدن کے دوسرے دور میں قدم رکھتا ہے۔
اس انکشاف سے قبل وہ جانوروں کا شکار کرتا تھا اور پیٹ کی دوزخ بھرتا تھا، اب وہ
زراعت شروع کرتا ہے۔ اس زراعتی دور میں وہ زمین کو بیج کے لیے تیار کرتا ہے، اور اسی
میں وہ مختلف انکشافات و ایجادات کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ ابتداءً وہ اس کام کے لیے ایک
لکڑی استعمال کرتا ہے، جس سے زمین میں سوراخ کر کے بیج ڈال دیتا ہے۔ اسکے بعد کسی کو خیال آیا
کہ کیا بیج بونے کا اس سے آسان کوئی اور طریقہ نہیں؟ اس حیرت کا نتیجہ ہل کی ایجاد کی صورت میں
ظاہر ہوا۔ پھر اس ہل میں تبدیلیاں ہوئیں پہلے اس کو بیل کھینچتے تھے، پھر گھوڑے کھینچنے لگے۔
کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ بھاپ اس کام کے لیے بہترین چیز ہے، لہذا بھاپ نے گھوڑے کی
جگہ لی۔ بھاپ بھی بہت دنوں قائم نہ رہ سکی۔ بجلی نے آکر اس کا قلع قمع کیا، چنانچہ آجکل ہل برقی
قوت سے چلائے جاتے ہیں۔ آئندہ خدا جانے اور کون سی قوت پیدا ہوگی! ہل کی اس ترقی کے

ساتھ ساتھ دوسری سمت میں بھی ترقی ہوئی - بیج کی ساخت، خاص خاص بیج کے لیے خاص
خاص زمین کی ضرورت، زمین کی نگاہداشت و پرداخت، یہ تمام باتیں منکشف ہوئیں۔ مختصر یہ کہ
علم زراعت اور نباتیات کی بنا پڑی۔ اور یہ تمام ترقی نتیجہ تھی اس حیرت کا جس سے اس سلسلہ
کا آغاز ہوا۔

ماحصل یہ کہ زندگی کے عملی مسائل، یعنی یہ کہ انسان کس طرح زندہ رہ سکتا ہے، اور آرام
و آسایش سے زندہ رہ سکتا ہے، ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں، اور غالباً ہمیشہ پیدا ہوتے رہینگے
انسان انکو ایک حد تک حل بھی کر لیتا ہے، کیونکہ اگر حل نہ کرے، تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ اس کا
یہ ہوتا ہے، کہ ایک طرف علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور دوسری طرف تہذیب و تمدن میں ترقی
ہوتی ہے - لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے، کہ "علم کی زیادتی" سے ہماری مراد "علم کا جمع ہونا"
ہے - یہ علم کا یہ ہمیشہ بڑھنے والا ذخیرہ ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے، اور ہر ایک نسل
اپنے اسلاف کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرتی ہے - اسکی صورت بعینہ ایسی ہی ہوتی ہے جیسے دولت
ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی ہے، اور ہر قدم پر اس میں زیادتی ہوتی جاتی ہے - لیکن اس سے
یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ نسل کے افراد گذشتہ نسل کے افراد پر بلحاظ عقل و فہم و فراست و کیاست
فائق ہیں، اگر بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، تو اسکی وجہ یہ ہے، کہ یہ نسل گذشتہ نسلوں کے
مقابلہ میں زیادہ بڑے ذخیرۂ علم کی مالک ہے، اور جو ذخیرۂ علم اسکو ورثہ میں ملتا ہے، اس پر
یہ اضافہ کر رہی ہے - ایک شخص روپیہ جمع کر کے اپنے بیٹے کے لیے چھوڑ جاتا ہے، بیٹا اسکو کاروبار
میں لگا کر نفع اٹھاتا ہے، اور اس طرح باپ کے اندوختہ میں اضافہ کرتا ہے - بعینہ یہی حال ذخیرۂ علم
کا ہے - قصہ اصل میں یہ ہے کہ اسلاف دولت اور علم جمع کرتے ہیں، اور اخلاف کا کام سوائے
اسکے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس اندوختہ پر اضافہ کریں - لیکن مادی دولت میں اضافہ کرنے
کی ایک ترکیب یہ ہے، کہ پرانی اور فرسودہ مشینوں کو نکال کر نئی مشینیں نصب کی جائیں - اس سے
دو فائدے مترتب ہوتے ہیں - اول تو یہ کہ پرانی مشینیں گھس چکی تھیں، انکے پرزے بیکار ہو چکے
تھے، انکے ٹوٹنے کا ہر وقت اندیشہ تھا - نئی مشین ان تمام نقائص سے پاک ہوتی ہے - دوسرا
فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ پرانی مشینیں اسلاف کی ساختہ تھیں، جن کا ذخیرۂ علم موجودہ ذخیرۂ علم سے
بہت کم تھا، لہذا انکی ساختہ مشینیں لازماً ناقص تھیں - ان میں وقت اور محنت زیادہ صرف
ہوتی تھی، اور پیداوار کم تھی - نئی مشین چونکہ اخلاف کی ایجاد ہوتی ہے، لہذا اس میں نقص کم ہوتا ہے۔

برخلاف پرانی مشینوں کے ان میں وقت اور محنت کم صرف ہوتی ہے، اور پیداوار زیادہ - بہترین مثال اسکی طباعت کی مشین ہے - دستی پریس، اسٹیم پریس، برقی پریس، اور راوڑی پریس، گویا چھاپنے کی مشین کے ارتقا کے مختلف مدارج ہیں - غور تو کیجیے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ماقبل کی مشین پر کتنی حیثیتوں سے فائق ہے - یہ تمام مشینیں ذہن انسانی کی ایجادات ہیں - طرفہ تماشہ یہ کہ بعینہ یہی حال اس علم کا ہے، جسکو ذہن انسانی منکشف کرتا ہے - جس طرح دستی پریس نے ایک ایسے پریس کے لیے جگہ خالی کی جو زیادہ طاقتور، زیادہ کامیاب اور زیادہ فائدہ مند تھا، اسی طرح علمی نظریات دیگر نظریات کے لیے جگہ خالی کرتے جاتے ہیں - اسکی مثال ہم علم ہیئت سے دیں گے - اجرام سماوی کی ظاہری حرکت کی توجیہ کے لیے ذہن انسانی نے مختلف قیاسات قائم کیے، اور ہر ایک قیاس بعد کے صحیح تر قیاس کی وجہ سے فنا ہوا - چنانچہ سب سے پہلے عقیدہ تھا کہ زمین ساکن ہے، اور سورج مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے - اسکے بعد یہ قیاس قائم ہوا کہ فی الواقع سورج ساکن ہے، اور زمین اسکے ارد گرد حرکت کرتی ہے، اور یہ کہ اسکا مدار دائری ہے - لیکن تھوڑی ہی مدت بعد نظریہ ادوار نے اسکی جگہ لی اور سب سے آخر میں اس نظریہ نے بھی سجادہ خالی کیا، اور یہ قیاس مقبول عام ہوا کہ زمین کا مدار اہلیلجی ہے - بعینہ یہی حال ہر علم کے نظریات کا ہوتا ہے - اسی بنا پر کہا گیا ہے، کہ علوم کی ترقی کا راستہ متروکہ قیاسات کے کھنڈرات سے پٹا پڑا ہے - زمانۂ ماضی میں ایسا ہی ہوا، اور زمانۂ آئندہ میں بھی ایسا ہی ہوگا - سائنس کے مختلف شعبے مختلف نئے واقعات منکشف کر رہے ہیں - ان نئے واقعات کی توجیہ کے لیے کہیں تو پرانے قیاسات میں ترمیم کرنی پڑتی ہے، اور کہیں انکو ترک کر کے نئے قیاسات قائم کرنے پڑتے ہیں - یہ نئے قیاسات ممکن ہے، کہ پرانے قیاسات کے مقابلہ میں زیادہ سادہ ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ ان سے ایسے واقعات کی توجیہ ہوتی ہو، جن کی توجیہ گذشتہ قیاسات سے نہ ہوتی تھی - لیکن باوصف اسکے قیاسات ہی رہتے ہیں -

لیکن اگرچہ زندگی کے عملی مسائل کو حل کرنے کی خواہش، یا شاید یہ کہنا موزوں تر ہوگا کہ انکو حل کرنے کی اشد ضرورت، انسان کو علم حاصل، جمع، اور نسلاً بعد نسل منتقل کرنے کی ترغیب دلاتی ہے - یہ علم بعض صورتوں میں تو سائنٹفک ہوتا ہے، اور بعض حالتوں میں ایسا ہوتا تو نہیں، لیکن ایسا بنایا جا سکتا ہے - ایک وقت ایسا آتا ہے، جب یہ علم بالارادہ حاصل کیا جاتا ہے، اور سائنس کو سائنس کی خاطر ترقی دی جاتی ہے - اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ہم پہلے

فلسفہ کی غایت

دیکھ چکے ہیں، کہ اکتساب علم کا شوق نتیجہ ہوتا ہے اُس حیرت اور رازجوئی کا، جو انسان اور حیوان
میں مشترک ہے۔ اسی رازجوئی اور تجسس کی بنا پر ارسطو کا مقولہ بالکل صحیح ہے کہ "تمام انسان بالطبع
علم کے خواہشمند ہوتے ہیں"۔ انسان اور ادنیٰ حیوانات، اور مہذب و متمدن انسان اور وحشی
انسان میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ادنیٰ نوع کی تشفی بہت جلد ہو جاتی ہے، برخلاف اسکے
اعلیٰ نوع کی تشفی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ نفسیات پوری طرح ثابت کر چکی ہے، کہ بعض چیزیں ایسی
ہوتی ہیں جنکی خواہش ابتداءً تو کسی غایت کے وسیلہ کی حیثیت سے ہوتی ہے، لیکن بعد میں یہی
چیزیں خود غایت بن جاتی ہیں۔ اور انکی خواہش بھی بحیثیت وسیلہ کے نہیں، بلکہ بطور غایت کے ہونے
لگتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ روپیہ کی اصلی قیمت اس وجہ سے ہوتی ہے، کہ ہم اس سے اپنے آرام و
آسایش کی اشیا خرید سکتے ہیں، اور یہ کہ اسکی خواہش بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن کنجوس روپیہ
جوڑتا ہے، نہ اس لیے کہ اپنی ضروریات اور مایحتاج زندگی پر صرف کرے، بلکہ صرف اس غرض سے کہ اسکے
پاس روپیہ رہے، وہ کھانے تک کے لیے تو روپیہ خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ روپیہ اسکے لیے
مقصود بالذات ہے۔ شکار کا اصلی مقصد تو یہ تھا، کہ وہ حیوانات ہلاک کیے جائیں، جو انسانوں
کے لیے باعث خطر ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شکار دراصل ایک وسیلہ تھا مہلک و موذی حیوانات
کے ہلاک کرنے کا۔ لیکن اب حال یہ ہے، کہ جنگلوں میں شیر، چیتے، ہاتھی، ہرن وغیرہ پالے جاتے ہیں
جنکی باحتیاط تمام حفاظت کی جاتی ہے۔ لیکن کس لیے؟ صرف اس لیے کہ انکا شکار کیا جا سکے! اب
یہ شکار وسیلہ نہیں، بلکہ بذات خود ایک غایت ہے۔ کیا ایک عام واقعہ نہیں کہ ایک شخص
شراب دواءً استعمال کرتا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ اسکی صحت برقرار رہے، لیکن بعد میں وہ
شراب پیتا ہے، صحت کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں، بلکہ محض شراب پینے کی خاطر، حالانکہ اس کو
بخوبی علم ہے، کہ اب یہ شراب صحت کو برقرار رکھنے کے بجائے صحت کو تباہ کر رہی ہے۔ بعینہٖ یہی
حال علم کا بھی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ علم محض ایک ذریعہ تھا زندگی کے عملی مسائل کو حل
کرنے کا، لیکن رفتہ رفتہ یہ مقصود بالذات بن گیا۔ جس مجموعہ معلومات کو اصطلاحاً "علم نظری"
کہتے ہیں، وہ اسی سے تعلق رکھتا ہے، اس کا اکتساب خود اسی کی خاطر ہوتا ہے۔ بعض لوگ
البتہ ایسے ہوتے ہیں، جن کے سروں میں اس مجموعہ معلومات کا سودا ہوتا ہے، جسکو "علم عملی" کہتے
ہیں۔ یہ لوگ علم نظری کو عملی مقاصد کے لیے مفید اور بارآور بناتے ہیں۔ انکو اس بات کی ضرورت
نہیں، کہ وہ اپنے مشاغل کے جواز میں کوئی حجت پیش کریں۔ لیکن جو لوگ علم نظری کو اپنا مطمح نظر

قرار دیتے ہیں، انکو اسکے جواز کو ثابت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنی شفاعت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں، کہ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت اور کس عملی مقصد کے لیے ہمارا یہ نظری علم مفید ثابت ہو، لہذا بہتر یہی ہے، کہ اس علم کو ہر ممکن سمت میں ترقی دی جائے، تاکہ "عند الضرورت بکار آید" یہ دلیل ممکن ہے، کہ عملی شخص کے لیے تشفی بخش یا مسکت ہو، کہ اکتساب علم اسکے لیے ایک وسیلہ ہے لیکن عاملان و متعلمان علم نظری اسکو اپنی شفاعت میں پیش کرنے کے مجاز نہیں، وہ پیشگوئی نہیں کر سکتے کہ علم نظری کے کسی انکشاف سے کیا کیا عملی نتائج مترتب ہونگے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی تسلی صرف اس خیال سے کر سکتے ہیں، کہ علم نظری کا اکتساب نتائج و عواقب کیلیے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود و مراد افزائش علم، اور محض افزائش علم ہے۔

اُن ادنیٰ حیوانات کو بھی بسا اوقات حیرت ہوتی ہے۔ ان کی حالت میں یہ رازجوئی کی صورت اختیار کرتی ہے، جو جاننے کی خواہش کا مظہر ہے۔ جو حیوان کسی نئی، یا غیر معمولی چیز پر تعجب کرتا ہے، وہ دراصل اسکے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حیوان میں یہ تعجب یا جاننے کی خواہش، اتنی ہی حقیقی ہوتی ہے، جتنی کہ خوراک کی خواہش۔ لیکن اُسکی تشفی بہت جلد ہو جاتی ہے، یا یوں کہیے، کہ یہ آسانی کے ساتھ کسی اور طرف منتقل ہو سکتی ہے۔ اسکی خواہش علم ایک ابتدائی اور خام خواہش ہوتی ہے۔ انسان کا حال اس سے جداگانہ ہے۔ تجسس، رازجوئی، حقیقت کشائی، جسقدر اسکے حصہ میں آئی ہے، اس قدر کسی اور حیوان کو نہیں ملی۔ یہ صحیح ہے کہ اسکی خواہش علم پوری ہوتی رہتی ہے، لیکن اسکی تشفی ہمیشہ کے لیے اور مختتم طور پر کبھی نہیں ہوتی۔ یہ خواہش نسلاً بعد نسل چلی جاتی ہے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ اسکی خواہش غیر فانی اور دائمی ہوتی ہے، بلکہ یہ دیگر حیوانات پر اس خصوص میں بھی فائق ہے، کہ یہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنا ذخیرہ علم اخلاف کے حوالہ کر جاتا ہے۔ تعجب پر تعجب یہ کہ خواہش کو پورا کرنے کیلیے جو قدم وہ اُٹھاتا ہے، وہ اسکے توسن شوق کے لیے مہمیز بنجاتا ہے۔ علم کی "ہفت اقلیم" کو قبضہ میں لانے کے بعد بھی وہ "دربند اقلیم دگر" رہتا ہے۔ اسکی معلومات میں ہر اضافہ اور زیادہ اضافہ کی ترغیب دلاتا ہے، اور ہر قدم پر اسکے ذرائع و وسائل علم بہتر اور کامیاب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی بعد میں وہ زیادہ سیکھتا ہے اور بہتر سیکھتا ہے، تاآنکہ وہ پکار اُٹھتا ہے کہ "علم قوت ہے"! ان معنوں میں کہ وہ اپنی غایات کے حصول کی قدرت، فطرت کو اسی علم کے ذریعہ سے مسخر کر سکتا ہے۔ جب وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے، تو علم کا حجاب اکبر اسکی عقل کی آنکھوں پر پڑ جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ سوائے

گمراہی اور بے راہ روی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اس سے یہ نتیجہ اور غلط نتیجہ نکالتا ہے، کہ اکتساب علم کی غایت وحیدہ یہ ہے، کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدرت و فطرت کو مسخر کیا جائے۔ اس نتیجہ میں غلطی دوگونہ ہے۔ علم بعض عملی مقاصد کے لیے نہ شروع میں حاصل کیا جاتا تھا، نہ اب حاصل کیا جاتا ہے۔ علم کی وہ "طلب" جو حیرت کا نتیجہ ہوتی ہے، اکتساب علم کی مستقل محرک شروع میں بھی تھی اور اب بھی ہے۔ اسکی بہترین مثال ریاضیات میں ملتی ہے۔ اتفاق سے یہی وہ علم ہے، جو سب سے پہلے صورت بند ہوا، اور جو دیگر علوم کے لیے بمنزلہ بنیادی پتھر کے ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ روزمرہ زندگی میں یہ عملی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً فن تعمیر وغیرہ میں۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس نے برگ و بار پیدا کیے ہیں، اور جن لوگوں نے اسکو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہونچایا ہے، وہ لوگ تھے، جو ریاضیات نظری کے متکلم تھے۔ ہماری مراد یہ ہے، کہ یہ لوگ اشیاء کے قابل شمار ہونے کی خاصیت، اور اس خاصیت کے ریاضیاتی نتائج سے دلچسپی رکھتے تھے، اس علم کے نتائج ایسے مکان (Space) کے لیے بھی صحیح ہیں جنکی ابعاد تین سے زائد یا کم ہیں۔ اس کے اصول اس ذی ابعاد ثلاثہ مکان کے تابع نہیں، جن میں انسان موجود ہے، یا کم از کم جس میں وہ خیال کرتا ہے، کہ وہ ہے۔ ریاضیات نظری کا اکتساب عملی مقاصد سے بالکل بے نیاز ہے۔ یہ نتیجہ ہے علم کی "طلب" اور غیر ممکن التشفی حیرت کا۔ ریاضیات دیگر علوم کا بنیادی پتھر ہی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا نصب العین بھی ہے، جسکو حاصل کرنے کے لیے باقی تمام علوم کوشاں ہیں۔

ہم نے اس مضمون کو افلاطون کے اس قول سے شروع کیا تھا کہ "حیرت کا احساس فلسفی کی اصلی نشانی ہے، کیونکہ فلسفہ حیرت ہی سے شروع ہوتا ہے۔" لیکن ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ حیرت کم و بیش ہر شخص کو ہوتی ہے۔ اسی پر ہم نے پوچھا تھا، کہ جب صورت حال یہ ہے، تو فلسفی اور غیر فلسفی میں آخر مابہ الامتیاز کیا ہے؟ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں، کہ زندگی کے عملی مسائل انسان پر دباؤ ڈالتے ہیں، اور وہ انکو حل کرنے کے لیے پریشان ہوتا ہے۔ وہ یہ فرض کر لیتا ہے، کہ مسائل قابل حل ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو وہ حل کرنا سیکھ بھی لیتا ہے، اور اس طرح جو کچھ معلومات وہ حاصل کرتا ہے، انکو وہ اپنے اخلاف کے لیے بطور ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اس توارث میں یہ علم برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اکتساب علم مزید علم کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ علم ہمارے پاس ہوتا ہے اسی قدر ہم کو اس کی زیادہ خواہش بھی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں

الناظر

توعلم کی خواہش صرف عملی مقاصد کی خاطر، یا زندگی کے عملی مسائل کی تحلیل کے لیے ہوتی ہے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد یہ مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ یہیں سے "علم نظری" اور "علم عملی" مفترق ہوتے ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کو تو صرف اعلیٰ ترین اذہان اختیار کر لیتے ہیں، نہ اس لیے کہ اسکو عملی مقاصد میں استعمال کریں، بلکہ محض اس غرض سے کہ سائنٹفک علم کے حدود وسیع ہو جائیں۔ اس میں وہ حیرت محرک کا کام دیتی ہے، جو فطرت و قدرت پر تدبر و تامل سے پیدا ہوتی ہے، اور جو علم کی بدولت قدرت کے ہر راز کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم کی صبح آفرینش سے اسوقت تک عملی ضروریات کو پورا کرنا مطالعہ فطرت کی غایت نہیں رہا۔ شروع ہی سے انسان کی حالت یہ رہی ہے، کہ وہ قدرت کو دیکھتا ہے، اس پر حیرت کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے اسکو علم کی خواہش ہوتی ہے۔ کتنا سچ ہے ارسطو کا قول، کہ "انسان بالطبع علم کا خواہشمند ہے"۔

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ سائنس کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے، اور اسی حیرت سے بقول افلاطون، فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر صورت یہ ہے، تو فلسفہ اور سائنس میں کیا فرق ہے؟ جب سائنس کا کام پورا ہو جاتا ہے، تو کسی فلسفہ کی ضرورت، یا گنجایش باقی رہتی بھی ہے؟ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے، کہ اس حالت میں فلسفہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجایش۔ ہر وہ چیز جو قدرت، تدبر و تامل کے لیے انسان کے سامنے پیش کرتی ہے، باقاعدہ اور سائنٹفک طور پر مطالعہ کی جا سکتی ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اسکا مطالعہ سائنٹفک طریق سے ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس علوم ان گنت ہیں۔ قدرت کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جو کسی نہ کسی سائنس کے احاطہ میں نہ ہو۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کے لیے باقی ہی کچھ نہیں رہتا۔ آخر وہ کونسا کام ہے جسکو سائنس نے ادھورا چھوڑ دیا ہے اور جسکو پورا کرنے کے لیے فلسفہ کی ضرورت پڑتی ہے؟ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ علوم ان گنت ہیں، اور ہر ایک علم ایک مخصوص موضوع پر بحث کرتا ہے، مثلاً طبیعیات، عضویات، حیاتیات، نفسیات وغیرہ، لیکن ممکن ہے کہ انکے نتائج کو تطبیق و توحید کی ضرورت ہو۔ اور یہی کام فلسفہ کا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی فلسفی کومٹ نے سائنٹفک علم کی توحید ہی کا نام فلسفہ رکھا ہے۔ لیکن اگر اسکی یہ کوشش بار آور بھی ہوتی، تب بھی اسکو فلسفہ کہنا بجا نہ ہوتا۔ کیونکہ سائنس کے نتائج کو اگر تطبیق دی جائے اور انکو ایک ہی عنوان کے تحت جمع کر دیا جائے، تب یہ سائنٹفک ہی رہیگا، فلسفہ نہ بن جائے گا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکو

فلسفہ کی غایت

فلسفہ کتنا ور پردہ اعتراف ہے اس امر کا کہ فلسفہ کا در حقیقت وجود ہی نہیں، بلکہ جو کچھ ہے سائنس ہے۔ فلسفہ کو اس بنا پر سائنس سے علیحدہ اور اس سے بے نیاز، فلسفہ کی ہستی سے انکار لازم آتا ہے۔ فلسفہ کو "علم العلوم" کتنا بہترین مدح ہے، جو ایک سائنس دان فلسفہ کی کر سکتا ہے، لیکن بنظر تعمق دیکھیے تو یہ ہجو ملیح ہے۔ یہ گویا فلسفہ کی ہستی سے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ "علم العلوم" لازماً علم (سائنس) ہی ہوگا۔ اسکو سن کر کوئی صاحب ہوش فلسفی، جو فلسفہ کو سائنس سے علیحدہ سمجھتا ہے، خوش نہ ہوگا لیکن سائنس دان کا اصرار ہے، کہ بتاؤ تو سہی کہ فلسفہ آخر ہے کیا؟ اس کا کام کیا ہے؟ سائنس کے ہوتے ہوئے اسکی کیا ضرورت ہے؟ اسکا جواب فلسفہ کا ایک نامور زعیم پروفیسر ہنری سجوک، یہ دیتا ہے، کہ فلسفہ کی غایت یہ ہے، کہ علم کے مختلف حصوں کو جمع کرکے ایک منتظم "کل" کی صورت میں لے آئے۔ لیکن اس پر سائنس اعتراض کرتا ہے، کہ اگر یہ جواب صحیح ہے، تو "علم کے حصول" کا وجود نفس علم سے قبل ہونا چاہیے، کیونکہ اگر ان کا وجود نفس علم سے قبل نہیں تو فلسفی جمع کس چیز کو کرتا ہے؟ سائنس کے مختلف شعبہ جات فلسفہ کے وجود میں آنے سے قبل موجود تھے۔ لیکن ایک تاریخی واقعہ ہے، کہ فلسفہ اور سائنس دونوں توام ہیں، بلکہ فلسفہ (ارسطو و افلاطون کا) تو علوم طبیعیہ کی پیدائش سے بہت پہلے موجود تھا۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کہ فلسفہ علم کے مختلف حصوں کو جمع کرتا ہے۔ اس اعتراض کی وقعت و صحت کو تسلیم نہ کرنا فلسفی کی شان حق پرستی کے خلاف ہے۔ تعجب یہ ہے، کہ سجوک جیسا معتمد علیہ زعیم اس قدر بے سروپا بیان دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سجوک یہ دعویٰ کرتے وقت اس بات کو بھول گیا، کہ کل کے اجزاء کا اس کل سے قبل وجود نہیں ہو سکتا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ علم کے اجزاء نفس علم سے قبل موجود ہوں؟ یہ کہنا اتنا ہی بے معنی اور مہمل ہے، جتنا یہ دعویٰ کہ گائے کا سر، چاروں ٹانگیں، دھڑ، کان، ناک، دم وغیرہ تو پہلے ہی سے علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ بعد میں ان سب کو جوڑ کر گائے بنادی گئی۔ اصلیت یہ ہے کہ گائے (بلکہ کہنا چاہیے کہ ہر جسم نامی و غیر نامی) شروع ہی سے ایک کل ہوتی ہے۔ اسکے حصوں کا اسکے بغیر وجود ہی نہیں ہو سکتا اور نہ کل بغیر اجزا کے باقی رہ سکتا ہے۔ بعینہ یہی حال علم کا ہے۔ اس میں کلام نہیں، کہ اجزاء علم کے بھی ہوتے ہیں، لیکن بہرحال اجزاء تو یہ علم ہی کے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر علم غیر موجود ہے تو اجزاء بالضرورت غیر موجود ہونگے۔ علم ایک کل ہے، کیونکہ اگر یہ کل نہ ہوتا، تو اسکے اجزاء بھی نہ ہو سکتے تھے۔ اب اگر یہ کل ہے تو نہ تو یہ اجزاء سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے، نہ اجزاء کو اس سے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ یہ ایک کل ہے، بلکہ ایک وسعت پذیر کل ہے، اور اسکی توسیع اجسام نامیہ کی طرح خود

اسکے اندر سے ہوتی ہے نہ بیرونی و خارجی ایزادات سے ۔ مطلب یہ ہے کہ اسکی توسیع و ترقی کے لیے اس میں کسی اور چیز کا پیوند لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے، کہ علم کی ترقی اجزاء علم کے ملانے سے بھی نہیں ہوتی، کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ اجزاء نفس علم سے قبل موجود ہی نہیں ہوتے ۔

مختصر یہ کہ سیجوک کا یہ خیال کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، کہ "اجزاء علم کو ایک منتظم کُل کی صورت میں جمع کرنا فلسفہ کی غایت ہے"۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ اس قول کی ایک دلالت یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا، کہ جب علم کُل نہ تھا، لیکن اسکے اجزا موجود تھے ۔ ان ہی اجزاء پریشاں کی شیرازہ بندی کے لیے فلسفہ کی پیدایش ہوئی ۔ اب صرف دو صورتیں ممکن ہیں، یا تو یہ کہ شروع میں یہ اجزاء اجزاء ہی کی صورت میں موجود تھے، یا پھر یہ کہ اس صورت میں موجود نہ تھے ۔ اب اگر یہ اجزاء تھے، تو لازمی ہے، کہ کسی کُل کے اجزاء ہونگے، اور یہ علم کے اجزاء ہونگے ۔ اور یہ علم کے اجزاء نہ تھے، تو علم ہی تھے ۔ اس صورت میں فلسفہ کی کوئی کوشش بھی اسکو علم نہیں بنا سکتی ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس داں کا سوال ویسا کا ویسا ہی باقی رہ جاتا ہے، کہ اگر سیجوک کا قول قول فیصل نہیں، تو یہ عجیب و غریب چیز، جسکو فلسفہ کہتے ہیں کس کام آتی ہے؟ اس فطری اور بالکل بجا سوال کے جواب میں معلم اول افلاطون الٰہی لب کشا ہوتا ہے، سنیے وہ کیا کہتا ہے :۔ یہ نہ سیجوک کا ہم آہنگ ہے، نہ کومٹ کا ۔ اسکے نزدیک فلسفہ نہ اسلیے پیدا ہوا ہے کہ اجزاء علم کو جوڑ کر علم بحیثیت کل پیدا کرے ۔ نہ وہ اس بات کا قائل ہے، کہ فلسفہ کا ظہور سائنس کے تمام شعبہ جات کی توحید کے بعد ہوا ۔ ایک غیر موجود کُل کو پیدا کرنا فلسفہ کا مقصد یا کام نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے، کہ فلسفہ کا کام "اشیاء کے کُل" کو پیدا کرنا نہیں، بلکہ اسکو دیکھنا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہی وہ کُل ہے، جس پر اشیاء کی ہستی موقوف ہے، اور خود یہ اپنے وجود کے لیے اشیاء کا رہین منت ہے ۔ مختصر یہ کہ فلسفہ گویا "دیکھنا" یا بصیرت یا وجدان ہے ۔ لیکن کہا جا سکتا ہے، کہ سائنس بھی اشیا کو "دیکھتی" ہے ۔ یہ صحیح ہے، لیکن سائنس کے "دیکھنے" اور فلسفہ کے دیکھنے میں فرق ہے ۔ سائنس اشیاء کو پہلے مختلف حصوں اور شعبوں میں تقسیم کرتی ہے اور ہر ایک حصہ یا شعبہ اپنے ایک خاص شعبہ کے سپرد کرتی ہے فلسفہ اس تفرقہ و جماعت بندی کو روا نہیں رکھتا، بلکہ تمام اشیاء پر مجتمعاً نظر ڈالتا ہے، کیونکہ صرف اسی طرح نظر ڈالنے سے وہ کُل معلوم کیا جا سکتا ہے

جو اپنے وجود کے لیے اُن اشیاء کا محتاج ہے، اور جس پر ان تمام اشیاء کا وجود موقوف ہے
صرف وہی شخص فلسفی بننے کی قابلیت رکھتا ہے جو ان اشیاء کو اس طرح دیکھ سکتا ہے۔ اس
قابلیت کا شخص نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ مختلف علوم (سائنس) ایک طرف تو
باہمی تعلقات رکھتے ہیں، اور دوسری طرف سب کے سب نفس وجود سے یکجی متعلق ہیں۔
دوسرے الفاظ میں فلسفی وہ شخص ہے جو کثرت میں وحدت کو دیکھتا ہے۔ وہ ایک وجدان، ایک
ہمہ گیر نظر، کا مالک ہوتا ہے، جسکی مدد سے وہ تمام اشیاء میں حقیقت کو دیکھتا ہے، اور یہی حقیقت
وہ چیز ہے جسکے بغیر ان اشیاء کا وجود ممکن ہی نہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے،
کہ فلسفہ اس حقیقت کو پیدا نہیں کرتا، وہ صرف اُسکو دیکھتا یا اُس پر غور و فکر کرتا ہے۔ یہ کل
جو فلسفہ کا موضوع ہے، ٹکڑوں کے جوڑنے سے صورت پذیر نہیں ہوتا، بلکہ یہ پہلے ہی موجود
ہوتا ہے، اور صرف صاحب نظر اسکو معلوم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ سائنس داں کے سوال کا جواب افلاطون اس طرح دیتا ہے، کہ فلسفہ اشیاء کو
علیحدہ علیحدہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا، جس طرح کہ سائنس کے مختلف شعبہ جات دیکھتے اور
بحث کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے وہ کُل، یا حقیقت، جسکے بغیر اشیاء کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، فلسفہ
کا موضوع ہے۔ اس تلاشِ حقیقت کی ترغیب حیرت کی وجہ سے ہوتی ہے، کیونکہ "فلسفہ کا آغاز
حیرت سے ہوتا ہے"۔ اشیاء کماہی کا علم عسیر الحصول ہے۔ اشیاء جیسی کہ ہمکو دکھائی دیتی ہیں ہمیشہ
ویسی نہیں ہوتیں۔ اگر یہ واقعہ ہے، تو طبعی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے، کہ "پھر درحقیقت یہ
کیسی ہیں؟" یہی حیرت و تعجب فلسفہ کا سرچشمہ ہے۔

ارسطو بھی اس باب میں اصولاً اپنے اُستاد کا ہمزبان ہے۔ لیکن اس نے "فلسفہ" اور
"جدلیات" میں وہ فرق بیان کیا ہے، جو افلاطون کے ذہن میں نہ آیا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ
فلسفہ تو گویا علم ہے، اور جدلیات اس علم کے حصول کی کوشش۔ فلسفی وہ شخص ہے جو تمام اشیاء
پر غور و فکر کرتا ہے۔ اب "وجود" تمام اشیاء میں مشترک ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جدلیات وجود
یا حقیقت کی تلاش کرتی ہے۔ جب یہ دریافت ہو جاتی ہے، تو فلسفی اسکو تمام اشیاء میں دیکھتا
ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے جوابات میں فرق اصول کا نہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے، کہ
وہ دونوں مختلف حصوں پر زور دیتے ہیں۔ افلاطون، وجود، یا حقیقت کی تلاش پر زور دیتا ہے
اور ارسطو فلسفہ پر۔ فلسفہ سے حقیقت پر تدبر و تامل مراد لیتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ افلاطون

نے اپنی تمام عمر تلاشِ حقیقت میں ختم کر دی، اور ارسطو خود اپنے متعلق کہا کرتا تھا، کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے حقیقت پر غور و فکر کرنا شروع کیا ہے۔ اسی بناء پر اسکے تلامذہ و متبعین اُس کو "استاذ العلماء" کہتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ تک ارسطو کا قول قولِ فیصل، اور اسکا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا تھا، اسکی بات آیت و حدیث تھی کہ اسکے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ارسطو کی تعلیمات گویا مجسم ادعا و تحکم تھیں۔ لیکن ادعا و تحکم دیر یا سویر ارتیابیت پیدا کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ "زمین گول ہے" اور کوئی دلیل بیان نہ کرنا سننے والے کے دل میں طبعی طور پر سوال پیدا کرتا ہے، کہ "آخر کیسے معلوم ہوا کہ زمین گول ہے؟" یہی سوال ارتیابیت کا نقطۂ آغاز ہے۔ کیونکہ اس سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ فی الواقع اسکی کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ جب ایک دفعہ یہ شبہ پیدا ہو جائے اور اسکی کُرید لگ جائے، تو پھر سوائے اسکے چارہ نہیں ہوتا کہ اس پر بحث کی جائے، شرط صرف یہ ہے کہ ہم حقیقتِ اشیا کے متلاشی ہوں، اور طلبِ علم کا سودا ہمارے سروں میں ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہماری "حیرت" بے جان نہ ہوئی ہو کہ دنیا و مافیہا کی کوئی چیز بھی اسکو بیدار نہ کر سکے۔

معتضد ولی الرحمٰن ایم اے

کب تک؟

ستم شعار! یہ اندازِ ساحری کب تک؟　　رہے گی رونقِ بازارِ سامری کب تک؟
یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تا چند　　یہ اشتہارِ کرم کی فسونگری کب تک
یہ بزمِ عیش و مزامیرِ خسروی تا کے　　یہ تاج و تخت، یہ گلبانگِ قیصری کب تک
یہ فخرِ تیغ و علم کی نمائشیں تا چند　　یہ شانِ طرۂ دستارِ سروری کب تک
یہ زور و شور ستمہائے رہزنی کے دن　　یہ ادعائے خوش آہنگِ رہبری کب تک
یہ طنطنے، یہ تحکم، یہ دبدبے تا کے　　زبوں خصال! یہ جھوٹی سپہگری کب تک
یہ شیطنت میں نمودِ پیمبری کیسی؟　　پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک
یہ چیرہ دستیِ تثلیثِ ناروا تا چند　　یہ فتنہ خیزیِ توحیدِ آذری کب تک
یہ شغلِ ظلم، یہ آئینِ دہری تا کے　　یہ عشقِ جور، یہ اندازِ دلبری کب تک
ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے　　سنبھل سنبھل! کہ زمانہ بدلنے والا ہے

شبیر حسن خاں جوش

موجودہ باطنی تحریک

قارئین کرام شاید اس عنوان سے چونک اٹھیں گے اور ان چند سطور میں کسی گہری سیاسی سازش کے انکشاف کے متوقع ہوں گے۔ لیکن انکو ابھی سے مایوس ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس مضمون میں کسی ملکی مسئلہ سے بحث مقصود نہیں۔ اسی طرح فرقۂ باطنیہ کی موجودہ سرگرمیاں بھی جنکے سرپرست یا پیشوا ہز ہائینس سر آغا خاں ہیں ہمارا موضوع بحث نہیں۔ ہمارا مقصد آج کی صحبت میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس طرح اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے مسلمانوں میں باطنی تحریک پیدا ہوئی تھی ٹھیک اسیطرح اب بھی موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قدیم تحریک کے داعیات سیاسی تھے اور جدید کے اسباب مذہبی ہیں۔ اسی سلسلہ میں دونوں کے اسباب و نتائج کی مختصر کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے ارباب نظر یہ اندازہ کرسکیں گے کہ عہد حاضر میں اسلام کو کتنا بڑا خطرہ درپیش ہے۔

پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر فرقۂ باطنیہ کی ابتدا اور انکے امہات اصول بیان کیے جائیں۔

فرقۂ باطنیۂ اسمٰعیلیہ کی ابتدا اور وجہ تسمیہ

اہل قبلہ تمام اصول مذہب میں تقریباً متفق ہیں۔ انکی تعبیر یا جزئیات میں ضرور اختلافات ہیں۔ مسلمانوں کے دونوں فرقے سنّی اور شیعہ توحید، نبوت، معاد پر اعتقاد لازمی جانتے ہیں۔ صرف امامت کا مسئلہ ایسا ہے جو دونوں میں مابہ النزاع ہے۔ اس میں بھی نفس امامت دونوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ بحث صرف نوعیت و تعیین میں ہے۔ شیعۂ امامیہ پھر دو شاخوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ اثنا عشریہ اور سبعیہ۔ اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ امام سادس حضرت جعفر صادق اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو ولیعہد قرار دیتے ہیں۔ بعد ازاں انتخاب سابق سے رجوع فرماتے ہیں اور حسب فرمان ایزدی چھوٹے صاحبزادے موسیٰ کاظم کو منصب امامت تفویض کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق تک دونوں فریق متفق ہیں، لیکن یہاں سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ یعنی اثنا عشریہ حضرت موسیٰ کاظم کو ساتواں امام اور انکے بعد انکے فرزند حضرت علی رضا کو آٹھواں امام مانتے ہیں یہاں تک کہ بارہویں امام حضرت مہدی علیہ وعلیٰ آبائہ السلام پر سلسلۂ امامت ختم کرتے ہیں۔

اگر سبعیہ (باطنیہ) حضرت اسمٰعیل کو ساتواں اور آخری امام قرار دیتے ہیں۔ یہ آخرالذکر گروہ اپنے آپ کو سبعیہ کہتا ہے جسکی ایک وجہ اوپر گذری۔ تفصیل بعد کو آئے گی۔ دوسرا نام جس سے یہ فرقہ اپنے کو موسوم کرتا ہے اسمٰعیلیہ ہے کیونکہ اس فرقہ کا آغاز اسمٰعیل بن جعفر الصادق کے ولیعہدی کے مسئلہ سے ہوتا ہے۔ مورخین اسلام نے تاریخوں میں انکو ملاحدہ اور باطنیہ کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ باطنیہ کی وجہ تسمیہ یا تو یہ ہے کہ یہ لوگ پوشیدہ طور پر دعوت دیتے تھے یا اس لیے کہ انکا عقیدہ تھا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

انگریزی میں ایک لفظ اساسن (Assasin) بمعنی قاتل ہے۔ جسکی تاریخ حروب صلیبی کے زمانے سے آغاز ہوتی ہے۔ اب تک اس لفظ کا ماخذ اہل لغت میں غیر محقق تھا بعض کا گمان تھا کہ یہ انگلوسیکسنی مادہ (Seam) سے مشتق ہے جسکے معنی چھرے کے ہیں۔ دوسروں کا خیال تھا فارسی لفظ شاہنشاہ سے ماخوذ ہے۔ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر وسیع تھی انکا فیصلہ تھا کہ سنیوں (پیروان حسن بن صباح اعنی) کو بگاڑ کر اساسن بولنے لگے ہیں۔ حال کی تحقیق اس لفظ کو حشاشین یا حشیشئین سے مشتق قرار دیتی ہے۔ کیونکہ اسماعیلی پیروان حسن جو اپنے سردار کی طرف سے مختلف بڑے آدمیوں کے قتل پر مامور رہتے تھے حشیش (بھنگ) کا استعمال کرتے تھے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ (Assassin) اساسن کا لفظ حساسین کا بگاڑا ہوا ہے جسکے معنی قاتلوں کے ہیں۔

باطنیہ کے عقائد

اس فرقہ کی انتہا یوں پڑی کہ غلاۃ اس میں کثرت سے داخل ہو گئے جو الوہیت ائمہ اور حلول اور تناسخ وغیرہ کے قائل تھے۔ باطنیوں کی تاریخی اہمیت کی ابتدا فاطمئین (۹۰۹ء[1]) کے عہد سے ہوتی ہے جو مصر اور شمالی افریقہ پر حکمران تھے فاطمئین سادات ہونے کے مدعی تھے اور خلافت بغداد کے رقیب سمجھے جاتے تھے۔ اقتدار کی ہوس نے انکو مجبور کیا کہ ایران میں اپنی مذہبی اور سیاسی دعوت (پروپاگنڈا) داعیوں کے ذریعہ سے پھیلائیں۔ اس کام کے لیے اسماعیلیوں سے بہتر کوئی آلہ کار نہ تھا۔ یہ اسماعیلی داعی زمین کے طول و عرض میں سیاحت کرتے تھے اور جب خلائق کو اپنے علم و تقدس سے رام کر لیتے تھے تو ان سے مخفی طور پر خلفائے مصر کی بیعت لیتے تھے۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ مذہب کی بنیاد تاویل پر ہے جسکو بجز امام کوئی نہیں جانتا۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے جس تک رسائی بغیر امام کے محال ہے۔ مثلاً حج اہل ظاہر کے نزدیک زیارت کعبہ سے عبادت ہے لیکن اہل

مقصود حج سے زیارت امام ہے۔ اسی طریقہ سے صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ کا صحیح مفہوم وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے۔ ان تاویلات سے مذہب تمام تر مسخ ہو گیا۔ اور شریعت سے امان اٹھ گئی۔ آزادی پسند اور راحت طلب طبائع نے ان عقائد کو بڑی خوشی سے لبیک کہا اور کثرت سے لوگ سلسلۂ بیعت میں داخل ہونے لگے۔

اس گروہ میں سات کا عدد نہایت پُراسرار اور معنی خیز تھا۔ وہ سات دورِ رسالت کے مانتے تھے ترتیب اس طرح ہے۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد رسول اللہ۔ اور حضرت محمد بن اسمٰعیل۔ ان میں سے ہر ایک کے تابع ۶ نابغہ سات امام ہوتے تھے جن میں سے پہلا نبی ناطق پیشوا کا صامت رازدار ہوتا تھا۔ جیسے حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صامت خلیفہ تھے۔ ہر ساتویں امام کے بعد بارہ نقیب (ذئی حُجّت نقبا) آتے جن پر وہ سلسلہ ختم ہو جاتا اور نئے دور کا آغاز ہوتا۔

ان داعیوں کے مختلف مدارج تھے۔ سب کا پیشوا داعی الدعاۃ کہلاتا تھا جس کا نائب داعی کبیر کے خطاب سے مخاطب ہوتا تھا۔ اسکے ماتحت دوسرے داعی ہوتے تھے۔ ان لوگوں کا کام تبلیغ و دعوت اور تنظیم تھا۔ عملی اور خطرناک خدمات ادنیٰ ماتحتوں سے لی جاتی تھیں جن کو رفیق، لصیق اور فدائی کہتے تھے۔ فدائی کا لفظ اس عہد میں یورپ اور ایشیا میں بڑے بڑے سلاطین اور مشاہیر کو لرزہ بر اندام کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ فدائی حشیش کے استعمال کے بعد حالتِ مدہوشی میں فرقۂ باطنیہ کی بنائی ہوئی "فردوس بریں" میں لیجائے جاتے تھے جہاں پہنچکر "حوروں" کی نظر فریب ادائیں، باغ کی دلکشا ہوائیں، فضا کی طلسم نما کیفیت، بہار کی کیف فزا حالت انکو مبہوت کر دیتی اور انکو سچ مچ جنت کا گمان گذرتا۔ اسکے بعد پھر نشہ پلا کر انکو وہاں سے منتقل کر دیا جاتا جس سے انکی بیقراری اور جنت کا اشتیاق اور بڑھ جاتا۔ یہ حالت دیکھ کر داعی الدعاۃ (شیخ الجبل) انکو جنت کے وعدہ پر کسی خطرناک مہم کے سر انجام دینے کے لیے روانہ کرتا اور یہ فدائی دیوانہ وار اسکی تعمیل حکم کرتے۔ بڑے بڑے سردار اور علما جن کو باطنیہ اپنے مشن کی راہ میں مزاحم سمجھتے فدائیوں کے ذریعہ سے تلوار کے گھاٹ اتار دیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام ایشیا میں اور حروب صلیبی کی بدولت یورپ میں باطنیوں اور فدائیوں کا نام عرصے تک قتل اور خونریزی کا مترادف سمجھا جاتا رہا۔

باطنیہ کا تاریخی عروج و زوال جیسا کہا جا چکا ہے باطنیہ یا اسمٰعیلیہ کی تاریخی اہمیت فاطمین مصر کے عہد

کی رہینِ منت ہے۔ ۱۰۹۴ء تک آٹھواں فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ اسمٰعیلیوں کا سردار رہا لیکن
آخر میں اُسکے دونوں بیٹوں مستعلی اور نزار کی باہمی کشمکش نے اس فرقہ میں تفریق پیدا کردی مغربی
مستعلی کے طرفدار ہوئے اور ایران والے نزار کے۔ ناصر خسرو جو شاعر، فلسفی، مشنری اور سیاح
کی مختلف حیثیتوں کا جامع تھا۔ نزار ہی کا داعی تھا اور حجتِ خراسان کے لقب سے پکارا جاتا
تھا۔ مشہور حسن ابن صباح (متوفی ۱۱۲۴ء) جسکے متعلق نظام الملک طوسی اور عمر خیام کی ہم مکتبی
کا بے بنیاد افسانہ زبان زدِ عوام ہے ایک کوفی الاصل اثنا عشری تھا جو نوجوانی ہی میں ناصر خسرو
کے اثر میں آکر اسمٰعیلی ہوگیا۔ مصر جاکر حسن نے بچشم خود وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور وہاں
سے ایران واپس آکر وہ قلعہ الموت پر قابض ہوگیا۔ اور بالآخر ایسی حکومت قائم کرگیا جو ملک شاہ
سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی جیسے قابل اور زبردست فرمانرواؤں سے بھی مغلوب نہ ہوسکی۔
آخرکار تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ ہلاکو کے تاتاری وحشیوں نے تمام
ممالک اسلامی کو ویران کردیا۔ اسمٰعیلیوں کی حکومت بھی ہمیشہ کے لیے فنا ہوگئی اور جہاں
ایک طرف مغلوں کے سیلاب میں خلافت بغداد کا فلک بوس قصر زمین پر آرہا دوسری طرف یہ "فرِسین
لاج" بھی طوفان کی نذر ہوگیا۔ حال میں اس فرقہ کے لوگ شام، ایران، مشرقی افریقہ اور ہند
میں پائے جاتے ہیں اور نہایت امن اور خاموشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس اجمالی تذکرہ سے واضح ہوا ہوگا کہ فرقہ باطنیہ نے ایک زمانہ میں کس قدر خطرناک
صورت اختیار کرلی تھی۔ ٹھیک اسی طرح مسلمانوں میں آج بھی فرقۂ باطنیہ موجود ہے۔ اس فرقہ
کا آغاز سیاسی اغراض سے ہوا تھا۔ اسکی تہ میں مذہبی اسباب پوشیدہ ہیں۔ وہ حکومت اسلام
کے لیے خطرہ تھا یہ خود مذہبِ اسلام کے لیے۔ میری مراد مذہبی خطرہ سے وہ مذہبی، عقلی ازاد
آزادی کی روح ہے جو ہماری نئی تعلیم یافتہ جماعت میں ہرجگہ پائی جاتی ہے۔ میں انکو باطنی
اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ یہ بھی مذہب کی بنیاد تاویل پر رکھتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے لوگ
اُس تاویل کا محرم صرف امام کو قرار دیتے تھے۔ حال کے اہل نظر خود ساختہ تاویل کا اہل خود
اپنی ذات کو سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہر ظاہر کے لیے ایک باطن کے قائل تھے۔ آج بھی محکماتِ
قرآن کو Allegory یا متشابہات کہہ کر بدلنے والے بکثرت ہیں۔ جس طرح پیشتر صوم و
صلوٰۃ وغیرہ کو بغیر صارفِ قطعی صرف عن الظاہر کرکے اُنکا مفہوم مسخ کردیا گیا تھا۔ اسی طرح
اب بھی نصوص کی تحریف معنوی کرنے میں حدیث، اجماع، لغت و محاورۂ عرب سب کو

بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ آخر اس بے قیدی اور اباحت کے اسباب کیا ہیں؟

مسلمانوں پر ایک اعتزال اور آزادی کا دور پہلے بھی آچکا ہے جبکہ علوم یونانیہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمان غیر علوم سے نئے نئے واقف ہوئے اور فلسفہ کی سموم فضا میں پہلی سانس لی اُسوقت علمائے حق کو ضرورت محسوس ہوئی کہ نئے علوم کے عاشقوں کو انھیں علوم کے اصول سے مغلوب کیا جائے۔ چنانچہ علم کلام کی بنیاد پڑی۔ جس نے منطق اور فلسفہ کے حربوں سے مذہب کے حملوں کو دفع کیا۔ عہد حاضر میں بھی جب سے مغربی علوم و فنون کی روشنی آئی مسلمانوں کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ اُنھوں نے ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا شروع کر دیا۔ جس چیز کو مطابق پایا فبہا ورنہ یا تاویل کرلی یا رد کر دیا۔
اگر غور سے دیکھا جائے تو اس موجودہ ذہنیت کی تہ میں چند نقائص ہیں:۔

(۱) ہم اکثر اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عقل و مذہب دونوں کے حدود اسقدر متباین ہیں کہ اُن میں نزاع ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بزرگ نے اس کے متعلق نہایت دلچسپ تمثیل بیان کی کہ جس طرح ایک ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں تصادم ناممکن ہے اسی طرح عقل و مذہب میں مخالفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مذہب سراسر ما بعد الطبیعۃ امور سے متعلق ہے اور عقل (سائنس) طبیعی حوادث کے علاوہ نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ نہیں کرتی (دیکھو مذہب و عقلیات مولوی عبد الباری ندوی۔ اگرچہ مولانا نے عقل کو ایک حد تک معطل قرار دیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ عقل فی نفسہ مذہب کے رد و قبول میں حکم نہیں ہو سکتی)

(۲) ہم جس وقت مذہب پر عقلی اعتراض کرتے ہیں اُسوقت یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہماری عقل غلطی نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہ موجودہ سائنس نے تمام قوانین کائنات کا احاطہ کر لیا ہے۔

(۳) قوانین فطرت کے متعلق ہم اسکے سوا کیا دعوے کر سکتے ہیں کہ حال میں بعض حوادث کو نئی ہم نے یکے بعد دیگرے اس ترتیب سے دیکھے ہیں کہ سہولت کے واسطے ہم پہلے کو علت اور دوسرے کو معلول کہدیں۔ اگر زمانہ ماضی میں اسکے خلاف ہوا ہو یا مستقبل میں خلاف ہو تو عقلاً ہمارے پاس نفی کی کوئی دلیل نہیں۔

(۴) حاکم کی ہر چیز محکوم کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ اور انسان کی پستی فطرت اسکی ذمہ دار ہے۔ ہم یورپ کے محکوم ہیں اور نہ صرف ہم، بلکہ ہماری ذہنیت بھی

غلاموں کی طرح مرعوب اور مغلوب ہے۔ جسکا اثر یہ ہے کہ اگر کسی انگریزی میگزین میں ہم پڑھتے ہیں
کہ فلاں یورپین یا امریکن ڈاکٹر نے ایک مُردہ پر اپنا عمل کیا جس سے وہ جی اُٹھا، ہم بے تامل
مان لیتے ہیں اور دلیل وحجت نہیں چاہتے رد روایت اور روایت کے تمام اصول جرح وتعدیل
بالائے طاق رکھکر ہم اُس خبر پر اعتقاد لے آتے ہیں اور ہماری عقلیت کی حس کو ذرا بھی
ٹھیس نہیں لگتی۔ لیکن اگر کوئی مخبرِ صادق ہم کو بتاتا ہے کہ فلاں مقبولِ بارگاہِ الٰہی نے مُردوں
کو زندہ کر دیا تھا، اُس پر ہم ہزاروں طرح سے جرح کرتے ہیں۔

(۵) ہر قوم کے ادب (لٹریچر) کے سمجھنے کے لیے اُس قوم کے اہلِ لغت کی شہادت اور
اہلِ زبان کے قواعد ومحاورات کی معرفت ہم ضروری سمجھتے ہیں، مگر بڑے غضب کی بات ہے کہ
قرآن کے بارے میں ہم اس قاعدہ کلیہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ شکسپیر اور
ملٹن کے مطالعہ کے لیے تو ہم ڈاوڈن DOWDEN اور مارک پٹیسن MARK PATTISON
کی رائے کو وقیع تصور کریں، اور کتابِ الٰہی کے مطالب کے بارے میں ابنِ
عباسؓ اور ابنِ مسعودؓ کے قول کو بے اعتبار جانیں۔

(۶) ہم لوگ ذرا بیمار پڑتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ بہترین طبی مشورہ حاصل کریں۔
اگر کوئی قانونی مشکل پیش آتی ہے تو ماہر وکیل سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن مذہب کے
بارے میں خود رائے قائم کرنے یا تاویل گھڑنے میں ہم کو ذرا باک نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم مذہب
کو اپنی صحت یا قانونی مسائل کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

(۷) موجودہ نقطۂ نظر میں ایک نقص یہ ہے کہ جب کبھی علوم انسانی کے نظریات بدلیں گے
ہمیں بھی مذہب کی تعبیر بدلنی پڑیگی۔ اور اس طرح دین برحق ایک بازیچہ بنکر رہ جائے گا۔

(۸) ہم اپنے طرزِ عمل سے دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ ہمارا مذہب عقلِ انسانی کو گمراہ
کرتا آیا ہے کہ اب تک اسکی تعبیر تمام دنیا ایک طریقہ پر کرتی تھی اور اب جدید تحقیقات میں
اُس نے دوسرا پیرایہ اختیار کر لیا۔

(۹) دنیا کا کوئی مذہب (لامذہبی کا ذکر نہیں) ایسا نہیں جس میں کم وبیش کچھ مسائل فہم
انسانی سے بالاتر نہ ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان چند معجزات اور مسائل معاد وغیرہ کی بنا پر
دوسرے مذاہب سے شرمائیں۔

اس ذہنیت کے اسباب وغیرہ جو کچھ ہوں، نتیجہ بہر حال یہ ہے کہ ذہنیت عام لٹے پر

غالب آتی جاتی ہے۔ نئی تعلیم یافتہ جماعت ہر جگہ اور ہر موقع پر تقریر میں تحریر میں، صحائف و جرائد میں، عام جلسوں اور خاص صحبتوں میں انھیں خیالات کی داعی اور دوسروں کو اپنا ہمخیال بنانے میں ساعی نظر آتی ہے۔ ان تشکیک و تاویلات کا دائرہ نہ صرف فروع تک محدود ہے، بلکہ اصول مذہب بھی اُنکی زد سے محفوظ نہیں۔ اور وہ زمانہ دور نہیں جب کہ نبوت اور معاد اوہام، اور صوم و صلوٰۃ ڈھکوسلا بنکر رہ جائیں گے۔ مجھے خود ایک ذی علم مسلم مشنری سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جنکے خیال میں حشر اور بعث بعد الموت کا رتبہ تمثیلات سے زیادہ نہیں اور جنکے نزدیک نماز عارضی و وقتی تنظیم قومی کی غرض سے قائم کی گئی تھی اور بس۔ ﷲ انصاف! کیا یہی عقائد و خیالات اُن بزرگوں کے بھی تھے جو قرآن و اسلام کے مخاطب اول تھے اور کیا ان اعتقادات کو رکھتے ہوے اسلام اور خدمتِ اسلام کا دعوے ایک ایک کھیل نہیں؟ کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است۔

مرض کا علاج

اس مرض کے علاج کی طرف حال میں بہت توجہ کی گئی مگر ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ حکماے امت اس بیماری کے تدارک کی موثر تدابیر پر غور کریں۔ جس طرح قدیم اعتزال کے مقابلہ کے لیے علماے اسلام نے علم کلام کی بنیاد ڈالی تھی اسی طرح جدید اعتزال کے حملوں کی مدافعت کے لیے بھی ایک علم کلام کی ضرورت ہے۔ اسوقت نہ تو ایسے علماء درکار ہیں جو خود آزادی پر عامل اور مذہب کے درد سے غافل ہوں، نہ ایسے جو فروعات و جزئیات سے اختلاف یا اعتراض پر تکفیر کے لیے آمادہ رہیں۔ بلکہ اُن نفوس قدسی کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و عمل کا نمونہ اور صداقت و اخلاص کا مجسمہ ہوں اور دوسری طرف علوم جدیدہ سے آگاہ اور ضروریاتِ زمانہ سے باخبر ہوں۔ تحریک ترک موالات سے پیشتر علماے کرام کی جماعت اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں جس قدر بیگانگی تھی محتاج بیان نہیں اس بیگانگی کی ذمہ دار کوئی جماعت سہی، مگر اس سے انکار نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہونچا۔ جب خدا خدا کرکے وہ غیریت رفع ہوئی تو سیاسیات کی مصروفیتوں نے اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا۔ اُس سے ذرا مہلت ملی تھی کہ شریفی و سعودی کے مباحث چھڑ گئے۔ مگر افسوس کہ اس سے زیادہ اہم مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ کاش ہمارے ارباب فکر و نظر اس طرف توجہ کریں۔

اس مختصر سے خشک مضمون میں، جو اگرچہ مخلصانہ دردمندی کے ساتھ لکھا گیا ہے کہیں کہیں

مجبوراً تلخ نوائی سے کام لینا پڑا ہے جس کے لیے ہم غالب کی زبان سے معذرت خواہ ہیں

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

"مں"

"جام سفال"

ہوا فاش راز الفت مرے نالہ و فغاں سے
سراج ...... ہوئی بات وہ پرائی جو نکل گئی زباں سے

کیے ہیں نے نالے ہاں ہاں بھری ہیں نے آہ بیشک
منظر ...... مگر اے بگڑنے والے اسی بے اثر زباں سے

مرے آشیاں پہ گرنے کو ہزار بجلیاں تھیں
گوہر ...... مری قبر پر نہ ٹوٹا کوئی تارا آسماں سے

سنے ذلتوں کے شکوے تو وہ مسکرا کے بولے
بلیغ ...... کوئی اُن سے یہ تو پوچھے ملی آبرو کہاں سے

ہیں مناظر اتنے پیدا جو زمین و آسماں سے
عزیز ...... یہ ورق اُڑا لیے ہیں مرے دل کی داستاں سے

شبِ ہجر والے قسمت مری آنکھ بھی لگی کب
ثروت ...... مرا دل سنبھل گیا جب مرے غم کی داستاں سے

دمِ نزع ناتوانی نہیں ہاتھ اُٹھنے دیتی
ہادی ...... کوئی اشک پونچھ دیتا مری چشم خوں فشاں سے

یہ چراغ اندھے اندھے یہ ستارے دھندلے دھندلے
ثروت ...... ہیں اُنھیں کی شاید آنکھیں جو گزر گئے جہاں سے

کیا میرے دل پہ قبضہ کس ادا سے اُس نے کہئے
سراج یہ ہمارا آئنہ ہے اسے لائے تم کہاں سے۔

مشیر احمد علوی کاکوروی (علیگ)

تاریخ انگلستان

ایک قابلِ قدر قلمی کتاب

۱۸۵۶ء میں جب واجد علی شاہ، آخری تاجدارِ اودھ، معزول کیے گئے، تو لکھنؤ سے کلکتہ بدیں عزم گئے کہ انگلستان جا کر برطانوی پارلیمنٹ اور ملکۂ وکٹوریہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ کلکتہ پہنچ کر بادشاہ کی رائے بدل گئی، اور بجائے اس کے کہ وہ خود زحمتِ سفر گوارا کرتے، اپنی والدۂ ماجدہ ملکۂ کشور، اپنے بھائی مرزا سکندر حشمت اور ولیعہد مرزا حامد علی بہادر کو انگلستان روانہ کیا، اور اُن کی معیت میں ہمارے اعزائے وطن میں سے ایک بزرگ مولوی مسیح الدین خاں کو اپنا مختار بنا کر بھیجا کہ بادشاہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کریں اور انگلستان کے اربابِ حل و عقد کو اس ظلم و ناانصافی سے بہ تفصیل آگاہ کر کے مناسب تدارک و اصلاحِ حال کے لیے کوشش کریں۔

مولوی مسیح الدین خاں کو اس سلسلہ میں تقریباً آٹھ سال انگلستان میں رہنے کا اتفاق ہوا اور اگرچہ جس مقصد سے وہ گئے تھے اُس میں اس سبب سے کامیابی نہ ہوئی کہ نواب واجد علی شاہ نے اپنے مشیروں کی رائے سے متاثر ہو کر یا اس ملک میں غدر ہو جانے کی وجہ سے جو نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اُس سے مرعوب ہو کر حکومتِ ہند سے ایک قلیل وظیفہ پر مصالحت کر لی۔ لیکن وہاں کے قیام سے اُنھوں نے فائدہ اُٹھا کر بعض تصانیف کے لیے ضروری اطلاعات فراہم کیں اور ہندوستان واپس آنے کے بعد پہلے مذاقِ قدیم کے مطابق فارسی میں یہ تاریخ انگلستان لکھی اور پھر زمانہ کے تغیرات کا اندازہ کر کے خود ہی اُسکو اُردو کا لباس پہنا دیا۔

تاریخ انگلستان، جس کا تعارف اہلِ ملک سے کرانا منظور ہے، ہمارے پیشِ نظر ہے۔ فارسی نسخہ ابھی تک دسترس سے باہر رہا ہے، اور اُسکے متعلق یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب اور کس وقت مصنف کے اہلِ خاندان کے قبضہ سے نکل گیا اور اب کہاں ہے۔

میرے پھوپھی زاد بھائی منشی احمد علی مرحوم (بی اے ایل ایل بی وکیل بارہ بنکی و مترجم شبابِ لکھنؤ و تاریخ تمدن وغیرہ) نے انجمن اخوان الصفا کاکوری کے کتبخانہ کے لیے اُردو نسخہ کی ایک

نقل کرائی تھی مگر ۱۹۱۵ء کی طوفاں خیز بارش میں کتب خانۂ انجمن جس مکان میں تھا اُس کی چھت گر گئی اور بہت سی دوسری قیمتی کتابوں کے ساتھ تاریخ انگلستان کی نقل بھی تلف ہو گئی۔ صرف ایک جزو یعنی مصنف کی اپنی خود نوشت سوانح عمری باقی ہے جسے الناظر ہی کی وساطت سے عنقریب شایع کیا جائے گا۔

تاریخ انگلستان کی تحریر اُردو میں غالباً ۱۸۶۹ء میں شروع ہوئی اور جیسا کہ خاتمہ کتاب پر لکھا ہے ۱۸۷۱ء میں تکمیل کو پہونچی اور شروع سے آخر تک خود مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ فلسکیپ کاغذ کے ۱۹ سطری مسطر پر ہے اور جوانب میں کئی انگل چوڑا حاشیہ چھوڑا گیا ہے حاشیہ پر دستور قدیم کے مطابق اکثر عنوانات لکھے گئے ہیں اور جابجا حواشی پر چھوٹی ہوئی عبارتیں درج ہیں۔ کتاب کا مجموعی حجم ۱۵۰۰ صفحے سے زائد ہے اور اس غرض کے لیے کہ کتاب کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے ذیل میں اُس کے ہر باب کی تفصیل درج کی جاتی ہے:-

باب اول۔ جسکے شروع میں ۹ صفحے کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے ۷۶ صفحے پر تمام ہوتا ہے۔ اور اس میں یونائٹیڈ کنگڈم آف گریٹ بریٹن اینڈ آئرلینڈ (سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ) کا جغرافیہ لکھا گیا ہے۔ اس میں بارہ فصلیں ہیں جن کی تفصیل مصنف نے یوں کی ہے

فصل اول۔ برطانیہ اعظم وغیرہ کی شکل اور صورت کے بیان میں

فصل دوسری۔ انگلینڈ اور اسکی تقسیم کے بیان میں کونٹیوں وغیرہ پر۔

فصل تیسری۔ انگلینڈ اور ویلس کے عمدہ شہروں اور بندروں کے ذکر میں۔

فصل چوتھی۔ انگلینڈ اور ویلس کی کونٹیوں سے جو جزائر متعلق ہیں اُسکے بیان میں۔

فصل پانچویں۔ انگلینڈ اور ویلس کے عجائب آثار قدیمہ اور عجائب خلقی کے بیان میں۔

فصل چھٹی۔ اسکاٹلنڈ کے ذکر میں اسکی تقسیم کونٹیوں پر اور بیان اُس کے شہروں کا اور معمورات کا اور اُس کے جزائر اور عجائب آثار قدیمہ اور عجائب خلقی اس کے سب اسی فصل میں ہے۔

فصل ساتویں۔ جزیرۂ آئرلینڈ کے ذکر میں۔ اس فصل میں اُس کی شکل اور صورت اور تقسیم اُس کی کونٹیوں پر اور اُس کے کوائف مذکور ہیں۔

فصل آٹھویں۔ جزیرۂ آئرلینڈ کے شہروں اور بستیوں کے ذکر میں ہے۔

فصل نویں۔ جو چھوٹے چھوٹے جزیرے آئرلینڈ سے متعلق ہیں اُسکے ذکر میں ہے اور اس فصل میں عجائبِ خلقتی آئرلینڈ کے جس میں یہ جزو متفرو اور رکیہ وتہنا ہے مذکور ہے۔

فصل دسویں۔ داخل اور مخارج خاص اس سلطنت کے ممالک اربعہ کے بیان میں ہے۔

فصل گیارہویں۔ کیفیت قرض کے بیان میں جو اس سلطنت پر ہے اور اس کے اسباب کے بیان میں۔

فصل بارہویں۔ افواج بری اور بحری اور جہازاتِ جنگی وغیرہ کے بیان میں اور اسی فصل میں کیفیت اور تعداد رعایا کے جہازات کی مذکور ہے۔

دوسرا باب ۲۵۰ صفحے کا ہے۔ اس میں سلطنت برطانیہ اعظم کی تاریخ ہے۔ چونکہ مصنف کو "ایک تاریخ مفصل نہایت صحیح انگلستان کی ڈروہیڈ کے عہد سے جو سکان قدیم انگلستان کے رومیوں کی تسخیر کے قبل تھے اپنے زمانہ تک علیحدہ لکھنا" منظور تھی" اس واسطے اس کتاب میں صرف حالات مختصر ولیم فاتح کے عہد سے جو خاندان حالیہ اس سلطنت کا بانی تھا ہر بادشاہ کے وقائع ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد تک مندرج کیے گئے اور تھوڑا سا ذکر رومیوں کی تسخیر کا اور قوم سکسن وغیرہ کی سلطنت کا بھی کیا گیا۔ مگر تاریخ اسکاٹلینڈ اور آئرلینڈ اور ویلس کے سلاطین کے قبل اُن ممالک کے الحاق کی سلطنت انگلینڈ میں نہیں لکھی گئی صرف جستہ جستہ اس سلطنت کے معارک (معرکوں) کے ذکر میں جو ان ممالک کے ساتھ ابتدا میں ہوئے ہیں کچھ کچھ وہاں کے سلاطین کا بھی ذکر آ گیا ہے" اس باب کی ۳۷ فصلوں کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی فصل میں کچھ مختصر حال رومیوں کی تسخیر کا اور سکسن اور نارمن بادشاہوں کا ذکر ہے۔

دوسری فصل جس میں ذکر سلطنت ولیم فاتح کا ہے جو خاندان حالیہ اس سلطنت کے بانی اور جداعلیٰ تھے۔ شروع انکی سلطنت سے ایام وفات تک۔

تیسری فصل۔ جس میں ولیم روفس کی سلطنت کا بیان ہے جسکو ولیم دوم کہتے ہیں۔

چوتھی فصل۔ جس میں ہنری اول ولیم فاتح کے تیسرے بیٹے کی سلطنت کا حال ہے۔

پانچویں فصل۔ جس میں شاہ اسٹیفن ولیم روفس کے نواسے کی سلطنت کا بیان ہے کہ باطلہ ہنری اول کی بیٹی کو سلطنت سے معزول کر کے خود بادشاہ ہو گیا۔

چھٹی فصل۔ جس میں ہنری دوم ہنری اول کے نواسے کی سلطنت کا بیان ہے ماطلدا اُنکی بیٹی کے بطن سے جو شاہنشاہ جرمن کی ملکہ دولہن تھیں۔

ساتویں فصل۔ جس میں رچارڈ اول ہنری دوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے

آٹھویں فصل۔ جس میں جان رچارڈ اول کے بھائی کی سلطنت کا بیان ہے۔

نویں فصل۔ جس میں ہنری سوم جان کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

دسویں فصل۔ جس میں اڈورڈ اول ہنری سیوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

گیارہویں فصل۔ جس میں اڈورڈ دوم اڈورد اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے

بارہویں فصل۔ جس میں اڈورڈ سیوم اڈورڈ دویم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

تیرہویں فصل۔ جس میں رچارڈ دوم اڈورد سیوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔

چودھویں فصل۔ جس میں ہنری چہارم رچارڈ دوم کے چچا کے بیٹے اور اڈورڈ سیوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔

پندرہویں فصل۔ جسمیں ہنری پنجم ہنری چہارم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

سولھویں فصل۔ جس میں ہنری ششم ہنری پنجم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

سترہویں فصل۔ جس میں سلطنت اڈورڈ چہارم کا بیان ہے جو ڈیوک آف کلارنس اڈورڈ سیوم کے بیٹے کی اولاد دختری سے تھے جس وجہ سے ان کو استحقاق سلطنت ہوا اور ڈیوک آف یارک سب سے چھوٹے بیٹے اڈورڈ سیوم کی اولاد پسری سے تھے۔

اٹھارہویں فصل۔ جس میں اڈورڈ چہارم کے بیٹے کی تھوڑے دنوں کی سلطنت کا بیان ہے جن کو انکے اپنے چچا رچارڈ نے قتل کیا۔

انیسویں فصل۔ جس میں رچارڈ سیوم، اڈورد چہارم کے بھائی اور اڈورد پنجم کے چچا کی سلطنت کا بیان ہے۔

بیسویں فصل۔ جس میں ہنری ہفتم کی سلطنت کا بیان ہے جو متناسل ڈیوک آف لنکاسٹر کی کی اولاد دختری سے تھے اڈورڈ سیوم کے تیسرے بیٹے۔

اکیسویں فصل جس میں ہنری ہشتم ہنری ہفتم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

بائیسویں فصل۔ جس میں اڈورڈ ششم ہنری ہشتم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

تیئسویں فصل۔ جس میں ملکہ میری کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہشتم کی بیٹی اڈورڈ ششم کی سوتیلی بہن تھی۔

چوبیسویں فصل۔ جس میں الزبتھ کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہشتم کی بیٹی اور

ملکہ میری کی سوتیلی بہن تھیں۔

پچیسویں فصل جس میں جیمس اول کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہفتم کی بیٹی کی پوتی کے بیٹے تھے اور ملکہ الزابتھ کے قرابت کے نواسے ہوے اس واسطے کہ انکے بنی عم بھائی کے نواسے تھے

چھبیسویں فصل جس میں چارلس اول جیمس اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

ستائیسویں فصل جس میں ذکر حکومت واقراسی کا اس سلطنت میں ہے جس کا بانی اور سردار اولیور کرامول ایک شخص نہایت نامی سے تھا اور اس حکومت کا نام کامن ولستھ کہا تھا جس کا ترجمہ ہے دولت عامہ۔

اٹھائیسویں فصل جس میں چارلس دوم کی سلطنت کا بیان ہے چارلس اول کے بڑے بیٹے

انتیسویں فصل جس میں جیمس دوم چارلس دوم کے بھائی اور جیمس اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

تیسویں فصل۔ جس میں سلطنت مشترکہ ولیم اور میری کا بیان ہے جو دونوں بہ اشتراک بعد جیمس دوم کی معزولی کے بادشاہ مقرر ہوے مگر شرط یہ ہوئی کہ انتظام سلطنت کا منحصر ولیم پر رہے اور وہ چارلس اول کے نواسے تھے اور جیمس دوم کے داماد، انھیں میری کے شوہر جو مشترک ان کے ساتھ سلطانہ ہوئیں اور ولیم کا لقب ولیم سوم مقرر ہوا۔

اکتیسویں فصل جس میں ملکہ این کی سلطنت کا بیان جیمس دوم کی دوسری بیٹی۔

بتیسویں فصل جس میں جارج اول ہانوور کے الکٹر کی سلطنت کا بیان ہے، الکٹرس سوفیا کے بیٹے اور جیمس اول کی نواسی تھیں الزابتھ نام ان کی بیٹی کے پیٹ سے بموجب پارلمنٹ کے قانون کے الکٹرس سوفیا ملکہ این کی ولیعہد مقرر ہوئیں مگر چونکہ ملکہ این کے مرنے سے پہلے وہ مر چکی تھیں اس سبب سے بموجب اسی قانون کے انکے بیٹے بادشاہ ہوے۔

تینتیسویں فصل جس میں جارج دوم جارج اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

چونتیسویں فصل جس میں جارج سیوم جارج دوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔ جو فردرک نام ان کے بیٹے کے بیٹے تھے اور انکے باپ کا خطاب ڈیوک آف کمبرلینڈ تھا۔

پینتیسویں فصل جس میں جارج چہارم جارج سیوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔

چھتیسویں فصل جس میں ولیم چہارم کی سلطنت کا بیان ہے جارج سیوم کے تیسرے بیٹے اور جارج چہارم کے حقیقی بھائی جن کا لقب ڈیوک آف کلارنس تھا۔

ستائیسویں فصل ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی سلطنت کا بیان جو ولیم چہارم کی بھتیجی اور جارج سوم کی پوتی ہیں اُن کے دوسرے بیٹے کی بیٹی جن کا نام ڈیوک آف کنٹ تھا۔ (۱۸۷۰ء تک)

تیسرا باب ـ سلطنت کے نظم و نسق کے طریقوں میں ہے جو سلطنت متحدہ برطانیۂ اعظم اور آئرلینڈ میں جاری ہیں ـ اور ۲۲۴ صفحہ پر تمام ہوا ہے ـ کتاب کا یہ حصہ خاص طور پر قابل قدر ہے، کیونکہ اُردو میں اس وقت کوئی ایسی مفصل تاریخ عام طور پر مروج نہیں جسمیں انگلستان کے نظم و نسق سے متعلق اس قدر تفصیلی معلومات فراہم ہو ـ

انگریزی نظم و نسق کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے ـ اگزکٹو پاور ـ لیجسلیٹو پاور ـ جوڈیشل پاور ـ اڈمنسٹریٹو پاور ـ اور اکلسی اسٹیکل پاور ـ اور اسی مناسبت سے یہ باب مندرجۂ ذیل پانچ فصلوں پر مشتمل ہے :—

پہلی فصل ـ سربراہی (اگزکیوٹو) کے اقتدار کے ذکر میں ـ

دوسری فصل ـ لیجسلیٹو پاور یعنی اقتدار تقنین قانون کے بیان میں ـ

تیسری فصل ـ عدالتوں کے اقتدار کے بیان میں ہے جسکو جوڈیشل پاور کہتے ہیں ـ

چوتھی فصل ـ اقتدار انتظام کے ذکر میں ہے جسکو اڈمنسٹریٹو کہتے ہیں ـ

پانچویں فصل ـ اقتدار مذہبی کے بیان میں ہے جسکو اکلسی اسٹیکل پاور کہتے ہیں ـ

چوتھا باب ـ ممالک مقبوضۂ سلطنت برطانیۂ اعظم کے ذکر میں ہے جو خارج ممالک اربعہ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ اور ویلس اور آئرلینڈ سے ہیں ـ یہ ۲۸۷ صفحے پر پھیلا ہے اور اس میں سات فصلیں ہیں

پہلی فصل ـ بعضے مطالب تمہیدی اُن ممالک خارجہ کے ذکر میں ہے اور انکو کالونی اور اسٹلمنٹ کہتے ہیں ـ

دوسری فصل اُن کالونیوں کے یعنی مقبوضات بیرونی سلطنت برطانیہ کے ذکر میں ہے جو یورپ یعنی فرنگستان میں ہیں ـ

تیسری فصل ـ اس سلطنت کے اُن ملکوں کے ذکر میں ہے جو ایشیہ میں ہیں ـ

چوتھی فصل ـ سلطنت برطانیہ کے اُن ممالک و جزائر کے بیان میں ہے جو خطۂ اسٹرالاشیا کے حدود میں واقع ہیں ـ

پانچویں فصل ـ سلطنت برطانیہ اعظم کے اُن ممالک مقبوضہ کے بیان میں ہے جو خطۂ افریقیہ

میں واقع ہیں

چھٹی فصل - سلطنت برطانیہ کے اُن ممالک کے بیان میں ہے جو خطۂ امریکا میں واقع ہیں (اور جن کو مقبوضات سلطنت برطانیہ خطۂ امریکا میں کہتے ہیں)

ساتویں فصل - دوسری قسم خطۂ امریکا کے ممالک کی جسکو ہندوستان مغربی (West Indies) کہتے ہیں -

پانچواں باب ۴۹۱ صفحہ پر تمام ہوا ہے اور یہ اقوام برطانیہ کے تمدن کے ذکر میں ہے اپنی ولایت میں اور باہر بھی اور اُن کے خصائص اور صفات کے بیان میں ہے - یہ باب اٹھارہ فصلوں پر تقسیم کیا گیا ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے

پہلی فصل میں بعضے مطالب تمہیدی اس باب کے ہیں جن کی تقدیم سب مطالب پر مناسب ہوئی

دوسری فصل تعلیم اور تعلیم جہال اور اطفال کے بیان میں ہے - اس فصل میں آٹھ بحث مذکور ہیں -

(۱) تعلیم کی تعریف میں اور اُس کی تقسیم میں دو قسم پر ہے -

(۲) اُس تعلیم کے ذکر میں ہے جو ہمارے اہل اسلام میں رائج ہیں

(۳) اُس تعلیم کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم کے ممالک میں جاری ہے -

(۴) بعضے تفریعات اور نتائج خیر اور شر کے ذکر میں ہے جو تعلیم مروجہ ممالک سلطنت برطانیہ اعظم سے نکلتے ہیں -

(۵) پچھلے علوم کے ذکر میں ہے جو اس سلطنت کے ممالک میں مہذب ہوئے اور بعضے نئے علموں کے بیان میں جو وہاں ایجاد ہوئے اور اسی بحث میں بعضے اُن علوم کا ذکر ہے جنکو اہل فرنگ نے ہمارے اہل اسلام سے اخذ کیا ہے -

(۶) عینک کے ذکر میں ہے اور اُس کے فائدے اور نقصان اور طریقے استعمال کے اور بنانے کے اُس میں مذکور ہیں -

(۷) گونگے، بہرے اور اندھوں کی تعلیم کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم میں مروج ہے اور اُس میں نئے قاعدے گونگے بہروں کی تعلیم کے واسطے عربی یا فارسی یا اُردو زبان کے اور علوم کے جو نامہ نگار نے ایجاد کیے ہیں مذکور ہیں -

(۸) مختصر نویسی کے ذکر میں ہے جو فرنگستان میں جاری ہے -

تیسری فصل۔ تجارت کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ کے ممالک میں مروج ہے۔
چوتھی فصل۔ درختوں سے اور سبزیوں سے نفع اٹھانے کے ذکر میں ہے جس سے زراعت اور فلاحت کے صرفے نکلتے ہیں
پانچویں فصل۔ حیوانات سے نفع اٹھانے کے ذکر میں ہے۔
چھٹی فصل۔ صناعت اور دستکاری سے نفع اٹھانے کے ذکر میں ہے۔
ساتویں فصل۔ معادن یعنی کھانوں سے نفع اٹھانے کے ذکر میں ہے۔
آٹھویں فصل۔ علم تعمیر کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم کے ممالک میں مروج ہے اس علم کو چار فن پر تقسیم کیا ہے
(۱) نہروں کے اور نالیوں کے جاری کرنے کے ذکر میں ہے۔
(۲) ایک قسم کے کنوؤں کے بنانے کے ذکر میں ہے جنکو آرٹیشین ویلس artesian wells کہتے ہیں جو زمین میں برما کے بہت چھوٹے منہ کے کنویں بناتے ہیں کہ اُس سے پانی خود بخود جوش کرکے فواروں کی طرح سے باہر نکل پڑتا ہے۔
(۳) سڑکوں کے اور رستوں کے بنانے کے بیان میں ہے
(۴) ان تعمیرات کے ذکر میں ہے جو خاص عمارتوں کے واسطے موضوع ہیں اور خاص میں بعضے مشاہیر اور نامور عمارتوں کا بیان ہے جو اُن ممالک میں تیار ہیں۔
نویں فصل۔ دریا کے سفر کے ذکر میں ہے جو جہازوں اور کشتیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اسی فصل میں بادبانی اور بخاری جہازوں کا بیان ہے۔
دسویں فصل۔ ریلوے یعنی لوہے کی پٹیاں بچھائی ہوئی سڑکوں کے ذکر میں ہے جن پر بخاری گاڑیاں چلتی ہیں۔
گیارہویں فصل۔ ٹیلی گراف اور سیما فور اور الکٹرک ٹیلی گراف کے ذکر میں ہے جس کے ذریعہ سے سیکڑوں اور ہزاروں کوس کے پیغام اور مراسلات گھڑیوں میں ہوتے ہیں۔ اس فصل میں بعضے قواعد سیما فور اور ٹیلی گراف کے جو عربی اور فارسی اور اردو میں خبریں بھیجنے کے لیے نامہ نگار نے ایجاد کیے ہیں وہ مذکور ہوں گے۔
بارہویں فصل۔ کاغذات اخبار جاری ہونے کا ذکر ہے۔
تیرہویں فصل۔ سب قسم کے چھاپے خانوں کے ذکر میں ہے جسکے ذریعہ سے لاکھوں کتابیں اتنی

دیر میں چھپتی ہیں جتنی دیر میں ایک کتاب ہاتھ سے لکھی جائے۔
چودھویں فصل - ڈاک خانہ کے تقرر کے ذکر میں ہے جسکے ذریعہ سے علی العموم لوگوں کے مراسلات کی آمد و رفت بہت حسن انتظام اور سرعت سے ہوتی ہے۔
پندرہویں فصل - دارالضرب یعنی ٹکسال کے تقرر اور حسن انتظام کے ذکر میں ہے۔
سولھویں فصل - ہر چیز کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے ناپنے سے اور تولنے سے اور گننے سے اور اور طریقوں سے - اس فصل کو سات بحثوں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) گنتی سے تعین کے ذکر میں ہے

(۲) ابعاد کے تعین کے ذکر میں ہے ناپنے کے ذریعہ سے۔

(۳) بادشاہی کے پیمانوں کے ذکر میں اور سیالات اور بھاری چیزوں کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے۔

(۴) ہوا کی اور ہر چیز کی حرارت اور برودت کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو آلہ تھرمامیٹر کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس میں اس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

(۵) ہوا کے ثقل کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو بارومیٹر کے آلہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اُس میں اس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

(۶) ثقل اصلی اجسام اور اجرام کے معین کرنے کے ذکر میں ہے۔

(۷) پانی برسنے کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو رین گاج کے آلہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اُس میں اُس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

سترہویں فصل - دُوربین اور کلاں بین کے ذکر میں ہے اور اس میں ان دونوں آلات کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

اٹھارویں فصل - اوصاف اور فضائل اور سیئات اور رذائل اقوام برطانیہ کے بیان میں ہے جو اور لوگوں کی کتابوں سے اور کچھ اپنے انتخاب اور تمیز سے لکھے گئے ہیں - اس فصل کو دو بحثوں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) میں بعضے اخلاق اور فضائل مستحسن اور پسندیدہ مذکور ہیں جنمیں برطانیہ کی اقوام منفرد ہیں۔

[illegible] رذائل ناپسندیدہ مذکور ہیں جن میں برطانیہ کی اقوام متفرد ہیں [illegible] ختم ہوگئے ہیں اور اُسی صفحہ سے خاتمۂ کتاب شروع ہوا ہے جسمیں مصنف [illegible] اپنے سوانح لکھے ہیں۔ یہ سوانح ۴۶۶ صفحہ پر تمام ہوے ہیں۔ جس کے بعد مصنف نے اپنے جد اعلیٰ مولانا حمید الدین قدس سرہٗ کا ایک رسالہ علم اخلاق میں فارسی سے ترجمہ کرکے بطور ضمیمہ اضافہ کیا ہے۔

مصنف کا نشوونما جس عہد میں ہوا اُس میں عام طور پر تصنیف و تالیف کا کیا ذکر معمولی مراسلت و مکاتبت تک فارسی میں ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ خاندانی علما کے طبقہ میں تو اب تک کم ایسے بزرگ ملیں گے جو سلیس اور فصیح اُردو لکھ سکیں۔ اسی بنا پر تاریخ انگلستان میں اور مولوی مسیح الدین خاں صاحب کی ایک دوسری تصنیف تاریخ الخلفا میں جسے اُنکے خلف اکبر مولوی اکرام الدین خاں سابق تعلقدار ریاست نظام نے ۱۳۰۸ھ میں بمقام اورنگ آباد دکن طبع کرایا تھا وہ اوبیت نہیں پائی جاتی جس نے اُن کے بعض معاصر شعرا و ادبا کو بہت ممتاز کردیا ہے۔

لیکن ایک طرف کتاب کے اہم مبحث، اسکی جامعیت اور پھر ضخامت کو دیکھا جائے اور دوسری طرف زمانۂ تالیف کی قلیل مدت اور اُنکے انداز تحریر کی صفائی و سادگی پر نظر کی جائے تو بے اختیار دل سے واہ نکلتی ہے۔

کتاب کے مختلف فصول میں بکثرت مصطلحات استعمال ہوے ہیں اور جابجا مصنف نے یا تو اُنکا ترجمہ کردیا ہے یا اُنکے مفہوم کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اُردو باوجود اپنی بے بضاعتی و کم مایگی کے اب سے بہت پیشتر اس قابل ہوگئی تھی کہ دوسری زبان کے خیالات اور سنجیدہ علمی مباحث کو صحت و صفائی کے ساتھ ادا کرسکے۔

انگلستان کی متعدد تاریخیں اُردو میں اس وقت تک لکھی گئیں اور شایع ہوچکی ہیں۔ مگر ضخامت کی بنا پر نیز اپنے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ جیسا ابواب و فصول کے عنوانات سے اندازہ ہوگا انگلستان کے جغرافیائی حالات کے جزئیات وہاں کے باشندوں کے تمدنی و اخلاقی حالات اور اُس مملکت کے نظام و آئین کی تفصیلات پر مصنف نے خاص توجہ کی ہے جو تمام تاریخوں میں یا تو بالکل نظر انداز کردی جاتی ہیں یا نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔

مظفر الملک

تضمین بر غزل مرزا غالب

ہوں میں دنیا میں زبس دردِ جگر ہونے تک
موت معلوم "مگر جی کا ضرر ہونے تک"
ہے مرا خاتمہ بالخیر سحر ہونے تک
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اس قدر ہجر میں آنکھوں نے بہایا خوں ناب
ہو گئے مردمکِ چشم بھی آخر نایاب
جلے کرتا ہے بہم زیست کا اپنی اسباب
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

حالِ بیمار جسے ہے مرضِ دل مزمن
رو باصلاح ہو اس میں بھی لگیں گے کچھ دن
ہیں تجھے زہر کے ہم بزم لگائے ہمسن
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میں نہ چھوڑوں گا کبھی تیری جفا کی تکریم
وہ وفادار ہوں، خود تو نے وفا کی تسلیم
تو جو بھیجے تو کروں کیوں نہ قضا کی تعظیم
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حسن و انداز پہ پھر کس لیے بیتاب ہے دل
دولت و حشمتِ دنیا پہ عبث ہے مائل
اب کوئی دم میں ہے درپیش عدم کی منزل
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

سچ تو یہ ہے کہ بلا ہوتے ہیں یہ دامِ نہنگ
دم پہ بن جاتی ہے سنتے ہیں اگر نامِ نہنگ
ہیں بہادر وہ اٹھاتے ہیں جو آلامِ نہنگ
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہے اثرؔ ان کے لیے ذوقِ فنا میں معراج
کل یہ سب خلد نشیں ہوں گے جو پروانے ہیں آج
ہوش ہے اعجازِ مسیحی کے نہیں ہیں محتاج
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سید محمد جعفر حسین اثرؔ لکھنوی

مسلم یونیورسٹی کی حالتِ زار

(سلسلۂ ماہ گذشتہ)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی طولانی رپورٹ کا ضروری ملخص گذشتہ پرچہ میں دیا جا چکا ہے۔ اگر حالات واقعتاً ایسے ہی ہیں جیسے کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتے ہیں تو بے شبہہ ماننا پڑے گا کہ وہ قومی درسگاہ جس پر پچاس سال سے مسلمانوں کی توجہ، قوتِ عمل اور سرمایہ کی کثیر مقدار صرف ہوتی رہی ہے حد درجہ ابتری کی حالت میں ہے اور عموماً تمام ہی خواہان قوم و ملت کو اور خصوصاً اُن اصحاب کو جنھیں اس مرکز تعلیم سے کسی نہ کسی نہج سے ذاتی تعلق ہے یونیورسٹی کی زبون و زار حالت کی اصلاح پر پوری توجہ صرف کرنا چاہیے۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ایک دوسری رپورٹ موجودہ وائس چانسلر نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے نام قلمبند کی ہے جس میں صاحبزادہ صاحب کے اکثر بیانات کی تردید و تغلیط کی گئی ہے یا اُن کی تشریح و تاویل کر کے ایسے نتائج کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جو صاحبزادہ صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے مختلف و متبائن ہیں اور یہ رپورٹ چھاپ کر تقسیم بھی کی گئی ہے اس لیے ایسے تمام اشخاص کے لیے جو صاحبزادہ صاحب یا ڈاکٹر صاحب کسی کی جماعت سے تعلق نہ رکھتے ہوں دونوں بیانات غور سے مطالعہ کرنے کے بعد صحیح نتیجے پر پہونچنا آسان ہو گیا ہے۔

صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں غالباً "نیازمندِ خصوصی" کی مطبوعہ چٹھیوں کو پیش نظر رکھ کر اُنھوں نے اُن تمام کارگزاریوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے جو اپنے سہ سالہ عہد میں وہ انجام دے سکے، اور دوسرے حصہ میں وہ نقائص اور ابتریاں بیان ہوئی ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں موجودہ انتظام و آئین کی بدولت رونما ہیں اور جنکی اصلاح کی اشد ضرورت وہ محسوس کرتے اور دوسروں خصوصاً یونیورسٹی کی کارفرما جماعتوں کو محسوس کرانا چاہتے ہیں۔

پہلے حصہ پر کسی تبصرہ کی حاجت نہ تھی، مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کو پڑھ کر ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اسکے بعض خاص اجزا پر بھی بحث کی جائے ۔

(۱) ڈاکٹر صاحب نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ ۲۲ - دسمبر ۲۶ء کو لیجسلیٹو کونسل کا اور ۲۴ - دسمبر ۲۶ء کو کورٹ کا جلسہ ہونے والا تھا اور بجائے اسکے کہ صاحبزادہ صاحب کونسل یا کورٹ میں اپنی شکایات پیش کرتے انھوں نے گورنمنٹ کو تحقیقات کرنے کی دعوت دی - حالانکہ کونسل اور کورٹ کے جو تجربات و حالات صاحبزادہ صاحب نے بیان کیے ہیں اور جسکی تردید ڈاکٹر صاحب نے بھی نہیں کی اُن کی بنا پر صاحبزادہ صاحب کو اسکی کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کونسل یا کورٹ میں اُن کی فریاد پر کوئی توجہ کی جائے گی - اور صاحبزادہ صاحب نے اپنی رپورٹ کے شروع ہی میں جو پیشگوئی کی تھی - ڈاکٹر صاحب اور اُنکے مویدین نے اُسکو بھی پورا کر دکھایا ہے، یعنی لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ کو تحقیقات کرنے کی دعوت دے کر یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت بیجا کا موقع فراہم کر دیا ہے - اول تو یہ باتیں کچھ ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مویدین پر پھبتی نہیں کہ وہ صاحبزادہ صاحب کے مقابلہ میں سرکار والاتبار سے عقیدت و محبت رکھنے میں کسی طرح کی کوتاہی کے ملزم نہیں قرار دیے جا سکتے، بلکہ جب یونیورسٹی بنائی جا رہی تھی تو قوم کے جذبات و مطالبات سے زیادہ حکومت کے اقتدار و اختیارات کا پاس و لحاظ سب سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مویدین ہی کو تھا - دوسرے یہ امر واقعہ کے بھی بالکل خلاف ہے - جس کی شہادت صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ کے علاوہ خود ڈاکٹر صاحب کے بیان میں بھی موجود ہے -

صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ

"گذشتہ اگست و ستمبر میں منصوری پر اور ۶ - اکتوبر کو علی گڈھ آکر افواہاً سُنا کہ گورنمنٹ یونیورسٹی کی جانچ کرنا چاہتی ہے - ۲۳ - اکتوبر کو مسٹر رچی سے دہلی میں ملاقات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ شملہ میں ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب سے ملے تھے اور اُن سے کہہ دیا تھا کہ گورنمنٹ امتحانات کے نتائج سے مطمئن نہیں ہے اور اس کے متعلق تحقیقات کرنا چاہتی ہے - ڈاکٹر ضیاءالدین نے وعدہ کیا کہ اس قسم کی تحقیقات کی تحریک کونسل میں کی جائے گی - اور گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کر رہی ہے" (ص ۹۳ و ۹۴ - الناظر فروری و مارچ)

اب ڈاکٹر صاحب کے بیان پر ایک نظر ڈالیے تو سب سے پہلے یہ جملہ سامنے آتا ہے :-

"ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ نے اپنی رپورٹ میں جو رائے ظاہر کی اور اخبار لیڈر میں جو مضامین نکلے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وجہ سے (حکومت کے) اعلیٰ طبقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے امتحانات کا معیار پست ہے۔ مئی سنہ ۲۵ء میں جبکہ میں نینی تال میں تھا اس امر کی طرف میری توجہ مبذول کرائی گئی اور ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا"
(ص ۲۵ و ۲۶ بیان ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب)

اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگست سنہ ۲۶ء میں میں اسکین کمیٹی کی شرکت کے لیے شملہ گیا اور وہاں مسٹر رچی سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اُن کی علالت کے باعث زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کیجا سکی۔ ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ کی رپورٹ میں جو رائے ظاہر کی گئی تھی اُنھوں نے اس پر میری توجہ منعطف کرائی اور میں نے اپنی ذاتی رائے یہ ظاہر کی کہ یونیورسٹی اور ہمارے موجودہ طلبا کے مفاد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ ہم گورنمنٹ کو اس بات کا اطمینان دلائیں کہ ہمارا معیار اعلیٰ ہے۔ مگر انکو کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا تھا کہ اس بارے میں مناسب کارروائی کرنا یونیورسٹی کی ایکزیکیٹو کونسل کے اختیار میں تھا۔ مسٹر رچی نے ۶۔ دسمبر سنہ ۲۶ء کو مجھے ایک تحریر بھیجی اور خواہش کی کہ اس معاملہ کو اکتوبر کے پہلے جلسہ میں یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے روبرو پیش کیا جائے"
(ص ۲۷ و ۲۸ ایضاً)

اقتباسات بالا سے صاف عیاں ہے کہ تحقیقات کا خیال خود حکومت کے اعلیٰ طبقوں میں، ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ کی رائے مندرجہ رپورٹ کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ مسٹر رچی نے ڈاکٹر صاحب کو تحقیقات کی ضرورت جتائی، ڈاکٹر صاحب نے اس ضرورت کا اعتراف کیا اور مسٹر رچی نے اُنھیں سے خواہش کی کہ وہ اس معاملہ کو کونسل کے روبرو پیش کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے کونسل یا کورٹ کسی کے روبرو مسٹر رچی کا خط نہ رکھا اور نہ زبانی ہی اس معاملہ کو پیش کیا۔ اور بجائے اسکے صاحبزادہ صاحب کو مورد الزام قرار دینے کے لیے یہ واقعہ تصنیف فرما دیا ہے کہ

"میں نے صاحبزادہ صاحب کو مسٹر رچی کے خط کا مفہوم سمجھا دیا مگر خط اس سبب

سے نہیں دکھا سکا کہ وہ تعطیلات کے خطوط میں مل گیا تھا اور خطوط اس قدر جمع ہوگئے تھے کہ جلد اُن سے فراغت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سارا عملہ نئے داخلوں کی وجہ سے انتہائی محنت سے مصروف کار رہا۔ صاحبزادہ صاحب نے معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا فیصلہ کیا اور مسٹر رچی سے جاکر ملے جسکے بعد میں نے اُس مسئلہ کو نظر انداز کردیا۔" (صـ۲۸ ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کو سطور بالا کی تحریر کے وقت یہ یاد نہیں رہا کہ صاحبزادہ صاحب مسٹر رچی سے ۲۳ر اکتوبر کو ملے تھے اور اُسوقت تک ڈاکٹر صاحب نے اُن سے مسٹر رچی کے خط کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انھیں تو سب سے پہلے اس تحریر کا علم خود مسٹر رچی کے بیان سے ہوا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اس سبب سے ڈاکٹر صاحب نے مزید کارروائی نہیں کی۔ چنانچہ اپنے اس بیان کی تردید ڈاکٹر صاحب نے خود ہی ایک دوسرے جملہ میں کردی ہے جس میں اُنھوں نے مسٹر رچی کے خط کو کونسل کے روبرو پیش نہ کرنے کی یہ وجہ بتائی ہے:-

"چونکہ وائس چانسلر کا انتخاب سر پر آ گیا تھا، مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا، کہ حکومت ہند یا مقامی حکومت کو اس جد وجہد کے میدان میں گھسیٹا جائے۔" (صـ۲۸ ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کی یہ جسارت قابل حیرت ہے کہ ایسے صاف اور کھُلے ہوئے معاملہ کو جس کے ایک ایک جزو کی تصدیق خود اُنھیں کی تحریر سے ہو رہی ہے خواہ مخواہ پیچیدہ بنانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر گورنمنٹ کو مداخلت کی دعوت دینے کا الزام عائد ہو جائے اور اس سے زیادہ تاسف انگیز اُن لوگوں کی حالت ہے جو ڈاکٹر صاحب کے بیان کو غور سے پڑھے بغیر محض اُنکی تائید کے خیال سے یا اُنکی پھیلائی ہوئی خبر کو باور کرکے .... صاحبزادہ صاحب کو موردِ الزام بنا رہے اور قوم میں مطعون کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں ناظرین کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کے لیے ایک اور تماشہ کیا ہے، وہ یہ کہ جون ۱۹۲۶ء میں شیخ عبداللہ صاحب کی صدارت میں جو اصلاحی کمیٹی صاحبزادہ صاحب کی نے مقرر کی تھی اس کی تفصیلات ایسے طریقہ پر بیان کی ہیں کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ یہ کمیٹی گورنمنٹ کے اطمینان کے لیے بٹھائی گئی تھی اور ڈاکٹر صاحب ہی کے ایما سے مقرر

ہوئی تھی۔ حالانکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اُس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق جو ہدایتیں صاحبزادہ صاحب نے اُن کو کی تھیں اُنکی تعمیل میں وہ اس قدر چون و چرا نہ کرتے بلکہ جب اگست کے مہینہ میں مسٹر رچی سے شملہ میں ملاقات ہوئی ہے تو وہ اُنکو یہ کہکر مطمئن کر دیتے کہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے اور وہ کام کر رہی ہے۔

حکومت ہند کے ذمہ دار تعلیمی عہدہ دار کا اہم مراسلہ یونیورسٹی کے اعلیٰ کارکن (وائس چانسلر) کو صرف اس عذر کی بنا پر نہ دینا کہ دفتر میں کام بہت ہے اور باوجود اُس اعلیٰ عہدہ دار کی خواہش کے کہ معاملہ ایگزیکٹیو کونسل کے روبرو اکتوبر کے پہلے جلسہ میں پیش کیا جائے محض دسمبر میں ہونے والے انتخاب کے خیال سے اُس معاملہ کو دبا دینا، دونوں باتوں کا خود ڈاکٹر صاحب کو اعتراف ہے اور انھیں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یونیورسٹی کو انھوں نے کیسا کھلونا بنا رکھا ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کے چندہ کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں پانچ لاکھ کی اُس رقم کا تو ذکر کیا ہے جو گورنمنٹ نے سائنس کالج کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے مگر اُن کے وائس چانسلر منتخب ہونے سے بارہ سال پیشتر تیس لاکھ روپیہ جو یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے فراہم کیا گیا یا سر جیمس مسٹن کے عہد میں جو دو لاکھ کا اسکول کے اور پندرہ ہزار کا تیراکی کے حوض کے لیے وعدہ ہوا اور ۱۹[illegible]ء میں جو پچاس ہزار کا اضافہ یونیورسٹی کی مستقل امداد میں ہوا اُن رقوم کا کیوں ذکر نہیں کیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی کے لیے جو سرمایہ فراہم کیا گیا اُس سے قطع نظر کرنا کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کے تمام سربرآوردہ اصحاب کی متحدہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ محض علی گڈھ یا ایک دو مخصوص کارکنوں کو اس کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح یونیورسٹی کی مستقل سرکاری امداد میں جو اضافہ ہوا، اُس کا تذکرہ بھی غیر ضروری تھا کہ یہ علی گڈھ کالج کے یونیورسٹی کا لازمی نتیجہ تھا جو ڈاکٹر صاحب یا کسی دوسرے کارکن کی جد و جہد کا ثمرہ نہیں خیال کیا جا سکتا۔ صاحبزادہ صاحب نے غالباً اسی نقطۂ نظر سے حساب میں پچیس ہزار کے جدید اضافہ کو بھی نہیں دکھایا۔ البتہ اسکول اور تیراکی کے حوض کی رقوم کا درج نہ ہونا ضرور اُنکی فرو گذاشت کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اسکے اندراج کے بعد بھی صاحبزادہ صاحب کے عہد کار میں جس قدر مالی اعانت حکومت اور قوم سے حاصل ہوئی وہ سابقہ دس سال کے مقابلہ میں تقریباً چند گُنی ہے

اور اگر پانچ لاکھ کی رقم برائے سائنس کالج اور دو لاکھ کی امداد برائے عمارت مدرسہ دونوں موعود ہونے کی بنا پر خارج از حساب ہو جائیں تو اُسوقت دونوں میعادوں میں فراہم شدہ سرمایہ کی نسبت ایک اور پانچ کی ہو جائے گی۔

بے شبہ جوبلی فنڈ اور دوسری رقوم کے حصول میں طلبہ، اساتذہ اور دوسرے ارباب کار کی بھی شرکت ضرور رہی ہوگی جس طرح کہ درسگاہ کے تمام کاموں میں اُنکی شرکت ہوتی ہے، لیکن اس سے صاحبزادہ صاحب کی حسنِ کارگزاری میں فرق نہیں آ سکتا۔ وہ اس تعلیمی فوج کے جتنے دنوں سپہ سالار رہے اُس مدت کی کامیابیوں اور ناکامیابیوں دونوں کے بہت کچھ وہی ذمہ دار قرار پائیں گے ـــــ خصوصًا ایسے تمام کاموں کے جن میں اُن کی تحریک وزرہ نمائی کو براہ راست دخل ہو۔

صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ کے دوسرے حصہ میں جن نقائص پر توجہ دلائی گئی ہے، اُن میں سے ایک اہم مسئلہ شعبۂ علوم اسلامی کا ہے جس کی تفصیلات الناظر جنوری نمبر میں باب ششم کے تحت صفحات ۶۶- ۶۷ و ۶۸ پر ملاحظہ سے گذری ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے جواب کے ابواب نمبر ۵ و ۶ میں صاحبزادہ صاحب کے بیان کی تردید فرمانے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ سطور ذیل سے اندازہ ہو جائیگا، ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش بالکل کامیاب نہیں ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب نے شکایت کی تھی کہ

"سنہ ۲۳-۲۴ء کی مطبوعہ فہرست نصاب میں اس محکمہ کا ذکر گیارہویں نمبر پر موجود تھا اور مولانا سلیمان اشرف صاحب اسکے معلم اعلیٰ و صدر ظاہر کیے گئے تھے۔ اسطرح پبلک کو باور ... کرایا گیا کہ دوسرے شعبہ جات کی طرح اسلامی علوم کا شعبہ بھی اس یونیورسٹی میں ہے اور پرو وائس چانسلر صاحب کی اس سفارش پر کہ مولانا سلیمان اشرف جو انکے خیال میں اسلامی علوم کے مضمون کیلیے موزوں ترین شخص ہیں اس شعبہ کے معلم اعلیٰ مقرر کیے جائیں انکی تنخواہ ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک کے بجائے ۴۰۰ سے ۷۵۰ تک کر دیگئی اور غالبًا اپنے اس عہدہ کی بنا پر وہ مجلس تعلیم کے بھی رکن بنگئے۔ فی الحقیقت جہاں تک کہ مولانا کی تنخواہ اور انکے صدر محکمہ کی حیثیت کا تعلق ہے اسلامی علوم کا شعبہ وجود میں ہے مگر جہاں تک کہ تعلیمی کام کا تعلق ہے اس محکمہ کا عدم وجود برابر ہے نہ تو اس شعبہ کی تعلیم پانے والے طلبا ہی ہیں، اور نہ اب تک اسس کا .... نصاب ہی ....

متعین ہوا ہے۔" (ص ۶۷ سطر ۶ لغایت ۱۴ - الناظر ماہ جنوری ۲۰ء)

یہ عبارت اُس تحریر سے لی گئی ہے جو صاحبزادہ صاحب نے ۵ اپریل ۲۴ء کو نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب کے نام بھیجی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کے اضافہ کو تو اس بنیاد پر حق بجانب ٹھہرایا ہے کہ

"ترک موالات کے نازک ایام میں وہ اُن معدودے چند علما میں سے ایک تھے جنھوں نے اس بات کی جسارت کی کہ اُسوقت کے مقبول عام معتقدات کے خلاف کھڑے ہوں اور ایسا کرنے میں اپنی شہرت بلکہ جان تک انھوں نے معرض خطر میں ڈالدی اور کئی بیش قیمت رسائل تصنیف کیے جن میں سے ۲۵۰ صفحہ کا رسالہ النور خاص اہمیت رکھتا تھا۔" (ص ۶ جواب ڈاکٹر صاحب)

بے شبہہ مولانا سلیمان اشرف صاحب کی یہ خدمات عظیمہ اسی قابل تھیں کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب کار انکی قدر افزائی فرماتے۔ اور جہاں تک ہمیں صاحبزادہ صاحب کے خیالات وعقائد سیاسی کا اندازہ ہے، ہم بے خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر صاحبزادہ صاحب کے علم میں یہ خدمات لائی جاتیں تو وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی دل سے تائید فرماتے کہ ایسے قابل قدر بزرگ کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب اور صاحبزادہ صاحب کے عقائد وخیالات اور نصب العین میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ طریقہ کار میں ہے۔ صاحبزادہ صاحب چاہتے ہیں کہ مسلمہ قوانین اخلاق اور خود یونیورسٹی کے آئینی ضوابط کے حدود میں رہ کر تمام کارروائیاں کیجائیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی قسم کے اخلاقی یا آئینی ضوابط کے حدود کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کا مسلک شاید یہ ہے کہ انگریزی مثل کے مطابق "ذرائع عمل اور طریق کار کو نتائج و ثمرات حق بجانب بنا دیتے ہیں۔"

صاحبزادہ صاحب کے سامنے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی خدمات کے اعتراف کا سوال ہوتا تو وہ غالبًا ایک طرف حکومت میں تحریک فرماتے کہ حضرت مولانا کی عظیم الشان خدمات کے صلہ میں شمس العلما یا خاں صاحب کا خطاب مرحمت فرمایا جائے۔ اور دوسری طرف کورٹ یا ایگزیکٹو کونسل سے سفارش کرتے کہ جس طرح گورنمنٹ برطانیہ نے ارل ہیگ اور لارڈ الینبائی وغیرہ کو لاکھوں پونڈ کی رقم بطور انعام عطا کی ہے، یونیورسٹی کی طرف سے مولانا کو یکمشت دس بیس ہزار روپے دیدیے جائیں یا تنخواہ سے الگ کوئی رقم بطور سالانہ وظیفہ کے مقرر کر دی جائے۔

شعبۂ اسلامی علوم کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ

"دنیا میں کوئی نمونہ ایسا موجود نہیں جسکے مطابق مسلم یونیورسٹی کے لیے نصاب تعلیم معین کیا جاتا - اس لیے ایک ایسے نئے مضمون کا نصاب مرتب کرنے میں جس کا طرز مخصوص وضع کا ہو رفتار قدرتاً سست ہونا چاہیے تھی - دو سال ہوئے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب کی رہنمائی میں یونیورسٹی نے اسلامی علوم کا نصاب مرتب کر لیا ہے - ہم اس مضمون کی تعلیم گذشتہ دو سال سے دے رہے ہیں اور اسلامی علوم کے شعبہ کا امتحان طلبا سنہ ۲۷ء میں دیں گے - نصاب میں ترمیم و اصلاح کی بہت گنجایش ہے - نواب صدر یار جنگ مولانا سلیمان اشرف اور میری مسلسل درخواست پر سید سلیمان صاحب ندوی، مولوی مناظر احسن صاحب، مولانا امجد علی صاحب، مولانا اکرام اللہ صاحب ندوی، عبد العزیز میمن صاحب، شمس العلما مولوی عباس حسین مرحوم اور مولانا سلیمان اشرف صاحب (طلب کنندۂ مجلس) کی ایک مجلس اسلامی علوم کا نصاب بنانے کے لیے مقرر ہوئی تھی اور عربی اور دینیات بھی اُنکے دائرۂ تحقیقات میں شامل تھی - یہ مجلس تقریباً ایک ہفتہ تک علی گڑھ میں نشست کرتی رہی اور اسکی رپورٹ ۲۳ - فروری سنہ ۲۶ء کو وائس چانسلر کی خدمت میں پیش ہوئی مگر انھوں نے اس پر کوئی کارروائی نہیں کی - رپورٹ اب اُنکے یہاں سے لے لی گئی ہے اور اسلامی علوم، عربی و دینیات کے محکمہ جات کی مشترکہ مجلس کے روبرو عنقریب پیش ہوگی" - (ص ۸ رپورٹ ڈاکٹر صاحب)

صاحبزادہ صاحب کے بیان کے بموجب اکزیکیوٹو کونسل (مجلس انتظامی) کے جلسہ منعقدہ ۱۷ دسمبر سنہ ۲۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی تجویز پر یہ طے پایا تھا کہ یکم جنوری سنہ ۲۴ء سے مولانا سلیمان اشرف کا اسلامی علوم کے مشاہرہ یاب معلم اعلیٰ مقرر ہوئے مگر سنہ ۲۳-۲۴ء و ۲۴-۲۵ء میں مولانا موصوف کے پاس اس شعبہ کا نہ کوئی معینہ نصاب تھا اور نہ طالب علم - ڈاکٹر صاحب کے بیان سے اس اعتراض کی تردید نہیں ہوتی اور صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یکم جنوری سنہ ۲۴ء سے لیکر یکم اکتوبر سنہ ۲۵ء تک جبکہ یونیورسٹی کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے یعنی ایک سال آٹھ مہینے تک مولانا سلیمان اشرف صاحب کو شعبۂ اسلامی علوم کے طلبا کو کسی قسم کی تعلیم دیے بغیر ترقی یافتہ درجہ کی تنخواہ ملتی رہی - کیونکہ جن طلبا کا پہلی بار سنہ ۲۷ء میں امتحان ہوگا اُن کی دو سال کی خواندگی اکتوبر سنہ ۲۵ء سے قبل

نہیں شروع ہو سکتی تھی۔

اکتوبر ۲۵ء سے جس نصاب کی تعلیم شروع ہونے کا ذکر ڈاکٹر صاحب کے بیان میں پایا جاتا ہے اُسکے متعلق ڈاکٹر صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ اکیڈمک کونسل نے کب اسے منظور کیا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے اعتراضات کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب نے باہمی مشورہ سے محض دفع الوقتی کے طور پر کوئی نصاب تصنیف کر دیا ہو اور اُسی کی تعلیم دی جا رہی ہو۔

ہر حال خواہ کوئی صورت بھی ہو ڈاکٹر صاحب ان الزامات سے اپنی براءت نہیں کر سکتے کہ

(۱) اسٹیچوٹس کی دفعہ ۱۹-الف کے بموجب جن پندرہ علوم کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی کے لیے لازمی تھا اُن میں سے شعبۂ اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد سے ۱۹۲۵ء تک نہیں کیا گیا۔

(۲) یکم جنوری ۲۴ء سے آخر ستمبر ۲۵ء تک کامل ایک سال آٹھ مہینے، بغیر نصاب معین ہوئے اور کسی طالب علم کو اُسکی تعلیم دیے ہوئے مولانا سلیمان اشرف صاحب کو بحیثیت شعبۂ اسلامی علوم کے معلم اعلیٰ کے عہدہ اور تنخواہ کی ترقی حاصل رہی

اور اگر واقعی اکیڈمک کونسل کی منظوری کے بغیر کوئی نصاب تعلیم محض قانون کی تعمیل پڑھایا گیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے اندیشہ ہوتا ہے تو یہ بجائے خود ایک نیا الزام ڈاکٹر صاحب پر عائد ہو گا۔

ہمارے پاس اکیڈمک کونسل کے جلسوں کی کارروائیاں نہیں ہیں جنکو دیکھ کر ہم تحقیق کے ساتھ بتا سکتے کہ وہ نصاب تعلیم جو ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بموجب گذشتہ دو سال سے پڑھایا جا رہا ہے اُسکا منظور کردہ ہے یا نہیں۔ اور ہم شکر گزار ہوں گے اگر کوئی صاحب جنھوں نے ان کارروائیوں کا مطالعہ کیا ہو یا جنکے پاس اکیڈمک کونسل کی مطبوعہ روداد یں موجود ہوں اس بارے میں ہمارے شکوک کو رفع کر دیں۔

(نوٹ) ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ کا ترجمہ بالاقساط اخبار حقیقت میں شائع ہونے لگا ہے۔ جو صاحب مزید اطمینان کے لیے دیکھنا چاہیں دیکھ لیں۔

ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف جون نمبر میں مولوی سید ریاست علی ندوی نے مصر کے مشہور انشاپرداز شیخ محب الدین الخطیب مدیر الزہراء کے مضمون کا خلاصہ "ترکی ادبیات کے تین دَور" کے عنوان سے پیش کیا ہے جو تمام ادب دوست اصحاب کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ اسی میں ادب ترکی پر یورپ کی بیداری کا اثر اور دَور اسلامی کے زوال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے :-

"یورپ کی عام بیداری، صنعت و حرفت، علم و فن اور آداب و معاشرت میں اسکی عہد بہ عہد کی ترقی اور ادھر ترکی ادبیات میں دور اسلامی کا انحطاط دونوں بیک وقت شروع ہوے۔ کیونکہ ادب قوموں کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس دَور میں اس کے جو خط و خال ہوں گے وہی اس میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یورپ کی حیرت انگیز ترقی نے ترکوں کی نگاہیں خیرہ کردیں اس لیے رفتہ رفتہ اُن کی دلچسپیاں اُن تمام چیزوں سے ختم ہو گئیں جن میں قدامت کا کوئی ادنیٰ شائبہ موجود تھا۔

لیکن اس کا خطرناک اثر یہ مترتب ہوا کہ سرے سے ترکی شعر و شاعری مانڈ پڑ گئی اور قریب تھا کہ ترکی ادبیات کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ سلطان سلیم ثالث نے ۱۲۱۲ھ میں اس خطرے کو محسوس کرکے اصلاح کی کوشش کی اور اعیان حکومت کو طلب کرکے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور شعراء کو اپنا دلچسپ مشغلہ جاری کرنے کی ترغیب دی، لیکن یہ جد وجہد یورپ کی طرف ترکوں کے بڑھتے ہوے شوق کا سدباب نہ کر سکی، اور نہ شاعری میں کوئی زندگی پیدا ہوئی۔ اس لیے سلطان محمود ثانی نے ۱۲۴۱ھ میں ایک دوسری تدبیر اختیار کی اور نوجوانان ترک کو یورپ کی نظموں کو ترکی میں منتقل کرنے کی طرف مائل کیا اور پھر ۱۲۵۵ھ تک یہ تحریک حکومت عثمانیہ کا ایک خاص مشن بن گئی، چنانچہ سلطان عبدالمجید نے مصطفےٰ رشید پاشا صدر اعظم کے مساعی جمیلہ سے نوجوانان ترک کے درمیان اس تحریک کی فرمان سلطانی کے ذریعہ عام اشاعت کی کہ وہ یورپ کی بہترین نظمیں ترکی زبان میں منتقل کریں جسمیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی

چنانچہ اسی فرمان سلطانی سے ترکی ادبیات کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے جسمیں نوجوانانِ ترک یورپ کی ادبی دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں۔"

ہمایوں عربی ارباب قلم کے زیر عنوان، مولوی عبدالحمید نعمانی نے ہمایوں کے جون نمبر میں ایک مضمون لکھا ہے جو اشہر مشاہیر ادباء الشرق سے ماخوذ اور در اصل محمد کردعلی کے مضمون "الانشاء و المنشؤن" کا ترجمہ ہے۔ اس میں ابتدا سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک

کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی تصنیفات و تالیفات کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اقتباسِ ذیل سے مضمون کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔ جو عربی داں طبقہ کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہو گا:۔

"عہد آغاز اسلام میں جسے بلاغت و انشا کا دور اول کہنا چاہیے، فصاحت و بلاغت کی ریاست بلا چون و چرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیر قلم تھی۔ محققین اس امر میں متفق ہیں کہ قرآن مجید و احادیث نبویہ کے بعد نہج البلاغہ ہی کا مرتبہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ جس کی تدوین شریف رضی نے کی اور شرح ابن ابو الحدید نے۔ امام ابوبکر باقلانی اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے مصنفات اعجاز القرآن، اتقان اور نہر ہزیز اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ قرن اول کے اس دور میں اور بھی بہت سے انشا پرداز ہیں، بقول رقاشی عربوں کے دماغ نے نظم سے زیادہ نثر کا حصہ پیدا کیا، لیکن نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اور نظم کا دسواں حصہ ہی بچ سکا۔ یہ مختصر اور محفوظ حصہ طباعت کی دولت سے محروم ہے، اور زیادہ تر مغرب کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں میں گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس دور میں جن ممتاز منشیوں کا پتہ چلتا ہے اُن میں زیاد، حجاج، قطری، عمران وغیرہ قابل ذکر افراد ہیں۔ اس بزم کی آخری شمع حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں اور ابن جوزی نے مناقب میں آپ کے جو خطبات اور مختصر رسائل نقل کیے ہیں وہ فصاحت اور بلاغت میں آیات کبریٰ کا مرتبہ رکھتے ہیں اور اُن کے پڑھنے سے نہ صرف آپ کے انشا پردازانہ اقتدار کا پتہ چلتا ہے بلکہ آپ کی سلطنت رانی اور سیاست دانی کے حالات و واقعات بھی آئینہ ہو جاتے ہیں۔"

جامعہ گذشتہ سال امپیریل کانفرنس (لندن) کی اس قرارداد نے کہ نوآبادیاں سلطنت کے اندر خود مختار حکومتوں کا درجہ رکھتی ہیں، مرتبہ میں باہم مساوی اور اپنے داخلی و خارجی معاملات میں کسی طرح بھی ایک دوسری کی ماتحت نہیں ہیں البتہ ملک معظم کی مشترک اطاعت اُنھیں متحد کرتی ہے اور برطانیہ کی دولت متحدہ اقوام میں بحیثیت آزاد اراکین کے شریک کی جاتی ہیں۔ برطانوی سلطنت کے مستقبل سے متعلق لوگوں کے دلوں میں امید و بیم کے متضاد خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ چنانچہ عبد القادر صاحب جونپوری بی اے (جامعی) کا ایک بسیط اور دلچسپ مضمون "سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل" کے عنوان سے جون کے "جامعہ" میں شایع ہوا ہے۔ جس میں اُن تمام امکانات سے بحث کی گئی ہے جو اس قرارداد

کی بدولت رونما ہو سکتے ہیں اور آخر میں دکھایا ہے کہ حسب ذیل اسباب کے پیدا ہو جانے سے برطانوی سلطنت کے ٹوٹ جانے کا امکان ہے :—

"(۱) کسی عالمگیر سلطنت کا قیام جس کے رکن دنیا کے تمام ممالک ہوں اور جس میں سلطنت برطانیہ بھی مدغم ہو جائے۔

(۲) نوآبادیوں کا طاقت پکڑ جانا (آبادی، دولت اور فوجی قوت کی ترقی سے)

(۳) نوآبادیوں کی صنعتی آزادی (یعنی ملکی صنعت و حرفت کی ترقی۔ جس سے ملکی مصنوعات اور غیر ملکی مصنوعات برطانوی مصنوعات کا آپس میں مقابلہ شروع ہو جانے اور نوآبادیاں برطانیہ کی رقیب بن جائیں۔

(۴) دنیا کے نظام اقتصادی میں تبدیلیاں"

نیرنگِ خیال کے جون نمبر میں مولانا سید محمد الیاس رضوی نے "ادب جاپان کی سرگذشت" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے جو غالباً کہیں سے ترجمہ کیا گیا ہے، اگرچہ مضمون میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ جس سے جاپانی علم ادب کی یہ عجیب خصوصیت معلوم ہوئی کہ اُس کا سنگ بنیاد صنف لطیف کے نازک ہاتھوں نے رکھا تھا۔ چنانچہ جاپان کی ادبی تاریخ کے متعلق یہ بیان کرنے کے بعد کہ

"ہندوستان کی طرح ازمنۂ قدیمہ میں وہاں بھی یہ دستور تھا کہ علم و ادب صرف خاندان شاہی اور مذہبی رہنماؤں تک محدود تھا اور عوام کو اس کی تحصیل کی اجازت نہ تھی"

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"جاپان میں "اتی یاسو" کی صلح عام کے بعد اوائل سترہویں صدی میں یہ تفریق مٹی اور عوام میں بھی تعلیم کا اچھا رواج ہو گیا۔ اور اگلی قیود باقی نہ رہیں۔ سب سے پہلے جاپانی عورتوں نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ اُنھوں نے مختلف نظمیں اور بیشمار افسانے لکھے۔ ان میں سے اکثر تو صرف تخیلات اور جذبات ہی کا آئینہ ہوتے تھے اور بعض میں حالات و واقعات بھی شامل ہوتے تھے۔ صنف نازک کے ادبی انہاک اور دلچسپیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جو رنگ اُسوقت قائم ہوا ادب جاپان کا وہی انداز ابھی تک عام طور پر مقبول ہے اور خالص ادبِ جاپان بھی وہی سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پسند عام کے خلعت اور قبولیت کے تاج حاصل کرنے کے لیے جب مرد بھی لکھنے بیٹھتے ہیں تو اُنکو بھی لازمی طور پر انھیں عورتوں کے طرز نگارش کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ ادب جاپان کا وہ طفل نوخیز جسنے وہاں کی بہترین اہل قلم ماؤں کے آغوش توجہ میں پرورش پائی پائی۔ جوان ہو کر اُس نے وہ سکہ جمایا ہے کہ آج سات سو برس گذرنے پر بھی اس زمانہ کی تصانیف اُتنی ہی مقبول اور دلچسپ پائی جاتی ہیں اور یہ وہی تصانیف ہیں جو چینی زبان کے اثرات سے آزاد خالص ملکی زبان میں لکھی گئی تھیں"

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جون ۲۷ء)

معارف ۔ اعظم گڈھ

(۱) مسئلہ حقوق نسواں
(۲) ترکی ادبیات پر ایک اجمالی نظر
(۳) حضرت پیر روشان اور فرقۂ روشنائی
(۴) سوشیالزم کے مختلف نظریے

ہمایوں ۔ لاہور

(۱) عربی ارباب قلم
(۲) حقیر شے کی قوت
(۳) ہندی شعرا کا تخیل

جامعہ ۔ دہلی

(۱) ولے براؤن
(۲) عرب فرانسیسی ادبیات میں
(۳) سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل

مرقع ۔ لکھنؤ

(۱) سیدنا عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام
(۲) جمالستان کے راہب کی ایک فرصت
(۳) نوشیرواں

نیرنگ خیال ۔ لاہور

(۱) عادل شاہیوں اور مرہٹوں کے تعلقات
(۲) ادب جاپان کی سرگزشت
(۳) ننھا بچہ (افسانہ)

قوس قزح ۔ لاہور

(۱) ہر ملکے و ہر رسمے
(۲) بیوی کا انتخاب (افسانہ)
(۳) جہت کعبہ

مخزن ۔ لاہور

(۱) ورشن (افسانہ)
(۲) روئیپٹ پڈک
(۳) بچوں کے لیے کتابیں
(۴) حیات بعد الممات

تنظیم ۔ امرتسر

(۱) ہماری اصلاحی پالیسی
(۲) ہندو مسلم اتحاد کی واحد صورت
(۳) ہمارے اجتماعی اخلاق

نظرے خوش گذرے

ہندوستان میں فارسی شاعری کی ایک راجدھانی پنجاب میں قائم تھی، افسوس ہے کہ ۲۶-مئی کو اُس کا آخری تاجدار گرامی بھی اس دنیا سے رحلت کر گیا - انا للہ وانا الیہ راجعون - مرحوم کی بیوہ جو خود بھی اُردو کی شاعرہ ہیں اور ترک تخلص کرتی ہیں اور اُنکے شاگردان خاص حفیظ، اقبال، وسالک وغیرہ کے ساتھ الناظر کی طرف سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے - اہل پنجاب کی زندہ دلی وسرگرمی کو دیکھتے ہوے یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ جلد سے جلد گرامی مرحوم کا کل کلام چھاپ کر محفوظ کر دیا جائے گا - اور خواجہ عزیز لکھنوی کی طرح شاعر کے جسم کے ساتھ اُسکی روح بھی پیوند زمین نہ ہونے پائے گی -

---

مولانا شرر کے متعلق جس انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا، اُسکی میعاد پہلے ۳۰-جون رکھی گئی تھی، بعد میں بسبب اسکے کہ اخبارات میں اعلان بتاخیر شایع ہوا، ۳۱-جولائی تک میعاد بڑھا دی گئی تھی - اب یہ مدت بھی قریب اختتام آگئی ہے - جن اصحاب نے مضمون مقابلہ پر طبع آزمائی کی ہو، از راہ کرم اسی ماہ کے اندر اندر ارسال فرما دیں -

---

انشا پردازی کے مقابلہ کے متعدد مضامین پہلے شایع کیے جا چکے ہیں، ایک مضمون اس دفعہ ہدیۂ ناظرین ہے - جسکے بعد صرف ایک مضمون اور باقی رہ جاتا ہے - انشاءاللہ اگست نمبر میں وہ بھی شایع ہو جائیگا - ستمبر سے بالالتزام مولوی مسیح الدین خاں مرحوم کی خودنوشت سوانحعمری درج کی جاسکے گی - اور کوشش کی جائیگی کہ ششماہی کے اندر ہی اندر کتاب ختم ہو جائے - خدا کی مرضی ہے تو آیندہ ہر ششماہی میں یا نہ کم سے کم سال میں ایک مکمل کتاب الناظر کے اوراق پر شایع کیجائے گی - جسکے لیے ضرورت ہوگی تو موجودہ حجم ۸۰ صفحے میں اضافہ کر دیا جائے گا -

---

میں تنہا ہوں، اور اسی حال میں ہر مہینے بہت سے صفحات الناظر کے سیاہ کرنا پڑتے ہیں - کتابوں، تنقیدوں، جو ماہوار شایع ہونا چاہیے تھیں اسی باعث رکی ہوئی ہیں، مصنفین ہو تقین اس معذرت کو قبول فرمائیں

ظفر الملک ۹-۷-۲۱

ایجنسی کی بعض کتابین

اساس التعلیم مصنفہ منشی محمد عبد الحق
بی اے ایل ایل بی جدید تعلیم اور مغربی
تمدن کی اشاعت نے اہل ملک کے
خیالات مین جو ہیجان پیدا کر دیا ہو اُسکی
وجہ سے یہ ضرورت عام طور پر محسوس
کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین جو طریقۂ
تعلیم عام طور پر رائج ہو اس مین مناسب
اصلاح و ترمیم کی جائے اِس تعلیم کا
سب سے بڑا نقص یہ ہو کہ بچہ کی ابتدائی
تعلیم و پرداخت پر کافی توجہ نہین کیجاتی
والدین اور معلمین عام طور پر بچہ کے
طبعی رجحان اور عام فطرت انسانی کو
نظرانداز کر دیتے ہین۔ یورپ و امریکہ کے
تعلیمی حلقون مین بچون کی تعلیم و تربیت کے
متعلق مختلف تجربات کیے گئے ہین جنمین
ایک امریکن خاتون مانٹی ساری کا طریقہ
نہایت مقبول ہوا ہی۔ مصنف کتاب ہذا
ان کے تعلیمی اصول کو ہندوستانی
ضروریات کے لحاظ سے مناسب تغیرات
کے ساتھ ملک مین رواج دینا چاہتے
ہین۔ چنانچہ اِس کتاب مین پہلے تو
طریقہ تعلیم پر اصولی بحث کی ہی۔ پھر
مانٹی ساری کے طریقۂ تعلیم کی تفصیل
و شرح بیان کی ہو اور مطالب کتاب کو
بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے
مختلف اشیائے تعلیمی کی عکسی تصاویر
بھی دی گئی ہین۔ قیمت عه/

انسان۔ جس مین انسان کے اندرونی
و بیرونی اعضا کا حال جدید تحقیقات
کی رو سے بیان کیا گیا ہی۔ قیمت ۸/

اشعرستان۔ نواب میرزا جعفر علی
خانصاحب بی اے اثر لکھنوی کا
دیوان، دورِ حاضرہ مین لکھنؤ نے
شاعری مین جو انقلاب پیدا کیا ہو اُسکے
نمونے مقدمۂ دیوان حضرت عزیز لکھنوی
کے قلم سے نکلا ہی۔ جس مین مصنف کی
سوانحعمری اور ادبی کارنامے درج ہین
قیمت عصہ/

امثال ضرب المثلون پر فلسفیانہ بحث
ان کی تاریخ۔ استعمال کا موقع و محل
ادب اردو مین عجیب و غریب کتاب
قیمت عصہ/

انتخاب صحاح ستہ۔ حدیث شریف
کی چھ مشہور کتابون سے ۵۰۰ حدیثین
منتخب کر کے ان کا ترجمہ شایع کیا ہی
اور ایک فہرست بہ لحاظ مطالب
مرتب کی ہے تاکہ جس مضمون کی
حدیث درکار ہو بآسانی مِل جائے
آخر مین اصل عبارت حدیث بھی درج
ہے اور ترجمہ و متن دونون پر یکسان
اعداد شمار دیے گئے ہین قیمت عہ/

التربیت الاستقلالیہ (مولفہ مولانا
عبد السلام ندوی) فرانسیسی زبان کی
مشہور کتاب "انیسوی صدی کا امیل"
مصر کے عربی ترجمہ کی وساطت سے
اردو زبان مین منتقل ہوئی ہو اور
اس مین خطوط کے ذریعہ اس امر پر
بحث کی گئی ہو کہ تعلیم و تربیت کے
کون سے طریقے اور اصول قابل
ترویج ہین۔ لائق مترجم نے مغربی
طریقون کے مقابل اپنے بسوط مقدمہ
مین وہ طریقۂ تعلیم بھی درج کر دیا
ہے جو اسلامی طریقہ کہا جاتا ہو اور
جسکی بدولت مسلمان تمام دنیا پر چھا گئے
تھے۔ قیمت عه/

آئینۂ حقیقت نما۔ اِس لاجواب کتاب

مین ہندوؤن اور مسلمانونکے گیارہ سو سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہو اور اس بات کو بدلائل و شہادت نمایان کیا گیا ہو کہ مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین ہندوونکے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے بہت زیادہ محبت و مروت ملحوظ رکھی۔ اور اس وقت جو ہندوؤنکے دلون مین مسلمانون کی طرف سے بدگمانیان نظر آتی ہین یہ محض غلط تاریخون کے رواج سے پیدا ہوئی ہین۔ تاریخی غلط بیانیون اور غلط فہمیون کے لیے انشاء اللہ یہ کتاب بمنزلہ تریاق ثابت ہوگی۔ قیمت جلد اوّل ۸ع ر

احسن الافادہ لارباب الارادہ۔ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر نے اس رسالہ مین قرآن و حدیث کے حوالون سے ثابت کیا ہو کہ شوہر سے زوجہ کی بیعت جائز ہو مگر اسکا ترک اولیٰ ہو۔ قیمت ۲ ر

الکہف والرقیم۔ اس کتاب مین حضرت شیخ عبد الکریم جیلی نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ایک ایک حرف و نقطہ کی تفسیر و تشریح مین عالم عالم بیان فرمایا تھا۔ منشی وہاج الدین قلندر کاکوروی نے اس لاجواب کتاب کو مع اردو ترجمہ شرح اور مقدمہ کے شایع کیا ہو۔ قیمت ۸عہ

الدرۃ البیضاء۔ اس کتاب مین حافظ شاہ علی انور قلندر نے تمام مسلمانون کے فائدہ کیلئے نکاح کے معنی، فوائد و آفات، مہر و کیفیت نکاح اور دوسرے امور متعلقہ پر کتب و سیر و فقہ سے معتبر روایات جمع فرمائی ہین اور اسی سلسلہ مین یہ بھی تحقیق فرمایا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مہر کتنا تھا۔ اور حساب مروجہ سے اُسکی صحیح رقم کتنی ہوتی ہے۔ قیمت ۸عہ

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم (جلد اول) مولفہ مولانا شاہ علی انور قلندر مرحوم۔ جسمین تصوف اور صوفیون کے متعلق معلومات کثیرہ فراہم کی گئی ہین اور حضرت غوث الاعظم کے متعلق بزرگان متقدمین کے اخبارات و بشارات درج کیے گئے ہین اور اُن بزرگون کے حالات لکھے گئے ہین جنھون نے حضرت غوث الاعظم کی تعریف فرمائی ہے یا جن کی خود آپنے تعریف فرمائی نیز حضرت غوث الاعظم کا حسب و نسب بیان کیا ہو۔ حجم ۲۷ جزو کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت ۸عہ

جلد دوم مین حضرت غوث الاعظم کی ولادت سے وفات تک کے حالات زندگی، آپ کی تحصیل علوم ظاہری و باطنی اور اساتذۂ ظاہر و باطن کا ذکر، آپکے مواعظ و تعلیمات، اور آپکی ازواج و اولاد کا بیان، اور آپکے خلفا کے حالات لکھے گئے ہین حجم ۶۰۶ صفحہ تقطیع کلان۔ قیمت للعہ

اسلام بجواب ترک اسلام۔ آریہ سماج کے اعتراضات کا دندان شکن جواب، قرآن کے الہامی ہونے کا ثبوت قیمت ۱۲ ر

باغبانی (۳ جلد) یعنے "فرمینگرس مینول آف گارڈننگ" کا ترجمہ از مولوی سید مصطفےٰ بی اے اندر سکرٹری ریاست بھوپال۔ جس مین نہایت تفصیل کے ساتھ فن باغبانی پر علمی و عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہو اور منشی خورشید احمد صاحب مہتمم باغات ریاست بھوپال نے نہایت مفید حواشی اور ضروری تصریحات کا اضافہ کرکے بہت کارآمد بنا دیا ہے۔ قیمت للعہ

بصائر القرآن۔ قرآن مجید کے وہ قصے جو عرب جیسے ریگستان مین بیداری کی روح پھونک چکے ہین اُن کا ترجمہ عام فہم اردو مین کیا گیا ہو۔ ان مین اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی نکات موجود ہین۔ ہر مسلمان کا فرض ہے

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بچون کو یہ قصے پڑھانے ۸ر

تعلیم۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب
علی گڈھ کالج جنھون نے اپنی عمر
تعلیمی خدمات کے لیے وقف
اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا
تعلیم کے متعلق مسلمانان ہندوستان
دوسرا شخص ایسا نہین جو اتقدر
اور تجربہ رکھتا ہو، یہ کتاب
کے رشحات قلم سے نکلی ہوئی ہی
ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی
اسکا مطالعہ فرمائین ۸ر

ازدواج۔ جسمین علمائے یورپ
شہادتون سے تجرد کے
اور شادی کے فوائد بیان کیے
یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم کو
کس عمر تک شادی کر لینا چاہیے

نامور فرمان روایان ہلکر کے
شاہ اورنگ زیب کے
سے ۱۹۲۴ء تک اندور کی
اور فرمان روائی کے انقلاب
لون کو اِس تاریخ کا مطالعہ
ی ہے۔ لائق مصنف کے
تاریخ کو افسانہ کی طرح
با ہی۔ قیمت ۱۴ر

تصویر عبرت یا اسنہ لتا دیوی۔ نہایت
دردانگیز اخلاقی نظم۔ بنگال کے خراب
رسم و رواج کا خاکہ قیمت ۴ر

تاریخ زوال روما۔ نامور انگریز مورخ
ایڈورڈ گبن کی مشہور تصنیف ڈیکلائن
اینڈ فال آف رومن ایمپائر کے ترجمہ
کی پہلی جلد قیمت ۸ر

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن
اِس نام سے خواجہ عبدالحی فاروقی معلم
تفسیر جامعہ ملیہ ایک تفسیر لکھ رہے ہین
جس مین قدیم رنگ کے مفسرین کی
طرح منطقی دلائل اور فلسفیانہ بحث کے
بجائے کھلی صاف باتون کو سادہ زبان
مین بیان کیا ہی۔ اور قرآن کے مطالب
حقیقی ذہن نشین کرنے کی کوشش
کی گئی ہی تاکہ لوگ اسلام کے اہم ترین
مقاصد کو پیش نظر رکھ سکین اور حالات
حاضرہ مین قرآن کی تعلیم کے مطابق
عمل پیرا ہون۔ مذہب کی اصلی روح
ان مین سرایت کرے اور وہ جانین
کہ قومون کے عروج و زوال کے اسباب
کیا ہوتے ہین اور مسلمانون کی ترقی
کے لیے خدائے کریم نے کیا کیا تدبیرین
بتائی ہین۔ نیز عہد رسالت اور خلفائے
راشدین کے مبارک دور مین مسلمانونکا

کیا نظام تھا۔ ابتک حسب ذیل حصص
شایع ہوئے ہین:۔

الخلافۃ الکبریٰ۔ سورۂ بقر کی تفسیر
مجلد قیمت صہ ر

بیان۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر ۱۲ر

الصراط المستقیم۔ سورۂ انفال اور
سورۂ توبہ کی تفسیر قیمت ۶ر

سبیل الرشاد۔ سورۂ حجرات کی
تفسیر قیمت ۱۰ر

عبرت۔ سورۂ یوسف کی تفسیر عہ ر

البصائر۔ اِس رسالہ مین خواجہ عبدالحی
صاحب نے بنی اسرائیل کے وہ واقعات
بیان کیے ہین جو قرآن مجید مین
درج ہین کہ زمانۂ حال مین مسلمانونکے
حالات بہت کچھ اسی قسم کے ہو گئے
ہین قیمت ۶ر

جدید دنیائے اسلام۔ گذشتہ
نصف صدی کے اندر آہستہ آہستہ
اور محاربۂ یورپ کے دوران مین
اور اُسکے بعد سرعت اور تیزی کے
ساتھ اسلامی ممالک مین جو حرکت
و بیداری کے آثار نمایان ہوئے
ہین، اُنکی بنا پر امریکہ کے ماہر سیاسیات
ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ نے یہ کتاب

ب کی ہے جسمین ممالک اسلامی کے
ندون کے حالات پر معاشرتی، مذہبی
نی، سیاسی و اقتصادی پہلوؤن
ے بحث کرکے انکے موجودہ رجحانات
طالع نظر کے اسباب و علل کا پتہ
لانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا
جمہ مولوی جمیل الدین صاحب بی اے
ملیگ) نے بڑی دیدہ ریزی و
کاوی سے کیا ہے۔ حجم چار سو
فحے سے زائد ہے قیمت عہ

ور فلک۔ مشہور ناول، ایسٹ لن
ا ترجمہ از پروفیسر انعام اللہ خان ایم اے
حجیم ناول ۲ جلدون مین ترجمہ ہوا
ہے اور دیکھنے کے لائق ہے قیمت لے

حضرت بلھے شاہ۔ پنجاب کے
مشہور درویش اور پنجابی زبان کے
مشہور شاعر کی سوانح عمری۔ جن کا
کلام ہمہ اوست کے رنگ مین رنگا
ہوا ہے۔ قیمت ۸ر

خیالات۔ مرزا سلطان احمد صاحب
کے ان متفرق مضامین کا مجموعہ۔ جو
ملک کے موقر رسائل مین شایع ہو چکے
ہین۔ قیمت عہ

دلائل الخلافت۔ جس مین مشہور
مناظر مولانا عبد الحکیم بہاری مقیم لکھنؤ نے
آیات قرآنیہ کی مدد سے خلفائے ثلثہ
کی حقیقت و راشدیت کو نہایت مدلل
طور پر ثابت کرکے معترضین کو دندان
شکن جوابات دیے ہین۔ قیمت ۶ر

دماغی تربیت۔ مسٹر جیمس ایلن کی
لاجواب کتاب "ہاؤ ٹو کلٹویٹ دی مائنڈ"
کا اردو ترجمہ۔ ایک نوجوان مسلمان کے
زور قلم کا نتیجہ ہے۔ جو ذہن، صحت جسمانی،
تربیت ذاتی، اور انتخاب پیشہ کے متعلق
مفید ترین معلومات سے مالا مال ہے ۸ر

داغ جگر۔ حضرت جگر مرادآبادی کا
قابل دید دیوان، جسے بزم ادب
اعظم گڑھ کی طرف سے مولوی احسان
احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی
وکیل نے شایع کیا، اور شروع مین
جناب جگر کی شاعری پر ایک پرلطف
مقدمہ اضافہ کیا ہے۔ جو بجائے خود
دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت عہ ر

ریاض باسط۔ یعنے مولوی سید
باسط علی صاحب رئیس متھرا کا دلچسپ
کلام۔ جس مین حمد و نعت کے علاوہ قصائد
منقبت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ
اور شہدائے کربلا کے نوحے اور سلام
قابل دید ہین۔ کتاب اعلی لکھائی چھپائی
کا بہترین نمونہ ہے قیمت عصر

روح تنقید۔ (تالیف سید غلام محی الدین
قادری، زور بی اے) سید محی الدین
زور نے فن تنقید پر یہ دلچسپ اور مفید
کتاب لکھی ہے۔ جس مین مقاصد اصول
تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر
سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ
کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی
پیش کی گئی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے
والون کے لیے بہت کارآمد ہوگی عہ

رموز فطرت۔ جسمین علم طبیعیات و طبقات
الارض کے ابتدائی اصول اور جغرافیہ طبعی
کے بنیادی مسائل نہایت سلیس اور سادہ
زبان مین بیان کیے گئے ہین قیمت عہ

زینت آسمان (تالیف پروفیسر
برکت علی ایم اے و پروفیسر منہاج الدین
ایم، ایس، سی) ستارون کی شناخت
پر اردو مین پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب
مین ستارون کے بارہ نقشے ہین اور
ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستارون کے
مختصر حالات بھی قلمبند کر دیے ہین
تاکہ ستارون کے پہچاننے مین
کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت عہ

من چلے۔ دل جلون کے لیے ظرافت
یادداشت۔ ہر ورق کشت زعفران
ہے۔ قیمت ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس زمانہ میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انجمن ادب اردو کے جلسہ میں ان چاروں مصنفین یعنی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی اور شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد میں کون صدر اعظم مقرر کیا جاوے، جتنا یہ انتخاب دلچسپ ہے اُتنا ہی نہایت غور و خوض کا محتاج، اس انتخاب کا انحصار ہے وسعت معلومات وان مصنفین کے کارہائے نمایاں پر، جن لوگوں نے ان مصنفین کے تصانیف کا مطالعہ بہ نظر امعان کیا ہے، وہی خوب اسکی گرہ کشائی کرسکتے ہیں، ورنہ "سبکساران ساحل" سے اس انتخاب کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے، سہولت تفہیم کے لیئے شائد یہ مثال کافی ہو کہ ایک صحبت میں چند احباب کا اجتماع ہے، اُسمیں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ شبلی، حالی، آزاد و نذیر احمد میں سب سے بڑا انشاپرداز کون تھا، اور کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی ہے، اس صحبت احباب میں ایک شخص ایسا ہے جو صرف دینیات و افسانہ نگاری سے دلچسپی رکھتا ہے وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں ووٹ دیگا، دوسرا شخص وہ ہے جو عبارت آرائی، بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی کو پسند کرتا ہے، وہ مولانا آزاد کا حلقہ بگوش ہوجائیگا،

تیسرا ایسا شخص وہاں موجود ہے جو نصیحت آمیز اشعار، نیچرل شاعری و تاریخی مضامین کا دلدادہ ہے وہ ضرور مولانا حالی کا اسم گرامی پیش کریگا، لیکن اب اُن میں چوتھا شخص وہ ہے جو ہر صنف کا ذوق صحیح و سلیم رکھتا ہے، یعنی دینیات سے بھی دلچسپی رکھتا ہے اور عبارت آرائی و محاورے کی دل آویزی کا بھی خواہشمند، شاعری سے بھی شغف رکھتا ہے اور تاریخ و تنقید سے بھی وہ یقیناً علامہ شبلی کی موافقت کریگا،

راقم مضمون ہذا اسی چوتھے شخص کی تائید کرتا ہے، فی الحقیقت علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود ادب اُردو کے لئے مایۂ ناز رہیگا، انکی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر اُن کو آفتاب بناکر چمکا یا ہے، دور حاضرہ میں جو لوگ انشا پرداز تسلیم کئے گئے ہیں اُن میں سب سے نمایاں مولانا محمد حسین آزاد و مولانا الطاف حسین حالی و ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ ہیں، ان بزرگوں کی انشاپردازی و کمال سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر انصاف کی عینک لگاکر ان اصحاب کی انشاپردازی کا ملاحظہ فرمائیے تو ان میں سے ہر بزرگ کی تحریر میں کچھ نہ کچھ نقص یا کمی ضرور موجود پائیے گا، مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر میں زور و سادگی ہو لیکن بہت زیادہ خشک ہے اور کہیں کہیں رکیک الفاظ اور محاورے ستعمال کر جاتے ہیں جو ایک انشاپرداز کے لیے ناز یبا ہے مولانا حالی کا طرز تحریر بھی مولانا آزاد کی طرح سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور ہے، ڈاکٹر نذیر احمد صرف ایک قادر الکلام اہل زبان ہیں، افسانہ نگاری آپ کا خاص جوہر ہے لیکن متین سنجیدہ عبارت سے کوئی تعلق نہیں، فی الحقیقت من حیث المجموع اگر کسیکو کامل الفن انشاپرداز یا ادیب کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی ذات واحد ہے، سادگی، سلاست، اختصار،

کہ جو چیز محسوس نہیں وہ خیالی اور وہمی ہے اسکا نتیجہ ہے کہ طبیعیات جاننے والے
مجردات اور روحانیات کے منکر ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کا سلسلہ خدا تک
پہونچ جاتا ہے کیونکہ وہ اعلے المجردات ہے"۔

غرض اس عبارت کے نقل کرنے سے یہ ہو کہ مولانا شبلی مرحوم جس بحث و موضوع
پر قلم اُٹھاتے تھے اُسکو مثل آشنائے فن کے ادا کر دیتے تھے، یہی ایک انشاپرداز کی
نمایاں صفت ہے جو دیگر مصنفیں میں کم نظر آتی ہے۔

"فلسفی"۔ ایک انشاپرداز کے لئے فلسفی ہونا بھی ضروری ہے، اس سے یہ مقصد نہیں
ہے کہ اُسنے بحیثیت ایک فن کے اُس کا مطالعہ کیا ہو، کیونکہ اکثر ایسے فلسفہ داں گذرے
ہیں جو انشاپرداز نہ تھے بلکہ مقصد اس سے یہ ہے کہ فطری طور پر اُس کا دماغ فلسفیانہ ہو
تاکہ واقعات و مسائل کی بحث میں تحقیق و تنقید سے کام لے سکے، اگر ایک انشاپرداز کا
فرض صرف اسقدر ہے کہ وہ کسی موضوع یا مبحث پر جسقدر معلومات مل سکے فراہم کر دے
تو ہر صاحب علم انشاپرداز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن ایک انشاپرداز کا رتبہ
اس سے بہت اعلےٰ و ارفع ہے اس کا اصلی جوہر تحقیق و تنقید ہونا چاہیے، یعنی
کسی مسئلہ یا مبحث پر قلم اُٹھاتے وقت یہ ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ اُس کو کیا
لکھنا ہے اور کس ترتیب کے ساتھ لکھنا چاہیئے کون امر ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے
اور کون سا غیر ضروری، ان سب امور کا لحاظ اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو شخص
فلسفی و حقیقت بیں ہو، وہ شخص جو فلسفی نہیں ہے وہ اُن امور کو مدنظر نہیں
رکھ سکتا، تمثیلاً ہم مولانا محمد حسین آزاد کو لیتے ہیں موصوف کی آب حیات
معرکۃ الآرا کتاب ہے، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے اسی وجہ سے آب حیات میں
بہت نقائص نظر آتے ہیں، اول یہ کہ موصوف نے اردو شاعری کی صحیح معنوں میں
تنقید نہیں کی، اُسکو شروع سے آخر تک مطالعہ کر جائیے، لیکن اس کا اندازہ

بالکل نہیں ہوتا، کہ اردو کی ابتدا کیونکر ہوئی کیا کیا دور قائم ہوئے، عہد بہ عہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں، ملک اور قوم کا شاعری پر کیا اثر پڑا اور شاعری کا ملک و قوم پر کیا اثر ہوا، درحقیقت مولانا آزاد کا آب حیات لکھتے وقت یہ فرض تھا کہ ان امور کو پیش نظر رکھتے، ورنہ شعرا کے حالات و قصے ہر شخص جسکو کچھ بھی استعداد ہو فراہم کرسکتا تھا، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے بدینوجہ ان اہم و نازک مسائل کو پیش نظر نہ رکھ سکے،

برعکس اسکے شعر العجم کو ملاحظہ فرمایئے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی دقیق النظر انشاپرداز کی سحر بیانی کا مرقع ہے، چنانچہ علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم تالیف فرماتے وقت ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، فارسی شاعری کے ارتقائے تدریجی کا واضح طور پر تذکرہ کیا ہے، ہر دور کی شاعری پر مثلاً فلسفیانہ شاعری، صوفیانہ شاعری، عاشقانہ شاعری، اخلاقی شاعری و قصیدہ گوئی، ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی، شاعری کی تدریجی رفتار، نظام حکومت کا اثر شاعری پر کیا ہوا غرض ہر مبحث پر جیسی جامع و مانع تعریف اہل آشنائے فن کے کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت و فصاحت و مضمون نگاری کا دریا لہریں مار رہا ہے، مولانا مرحوم نے شعر العجم حصہ پنجم صفحہ ۱۶۱ میں فلسفیانہ شاعری پر بحث کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلسفی فلسفیانہ شاعری کا تذکرہ لکھ رہا ہے، پہلے فلسفہ کی تعریف کی ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ فلسفہ کیا چیز ہے،

"کتب درسیات میں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات ان سب کے مجموعہ کا نام فلسفہ ہے"،

اسکی تعریف دوسری طرح یہ کی ہے کہ

"فلسفہ وہ علم ہے جسمیں موجودات کے متعلق وسیع ترین کلیات قائم کئے جاتے ہیں"

جس علم میں کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اُسکے عوارض انفرادی اور مختصات شخصی و نوعی تمام یا تقریباً تمام حذف کر دے جائیں اور اُس مسئلہ کی صرف کُلّی یا مجموعی حیثیت سے سروکار رکھا جائے اُسی کا نام فلسفہ ہے''۔

صوفیانہ شاعری کی اس طرح بحث کی ہے کہ گویا ایک صوفی تذکرہ لکھ رہا ہے۔ ''تصوف کے مقامات میں سے اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے جذبات کو تعلق ہے مثلاً رضا، فنا، محویت وجدت، استغراق، اس لئے ان مقامات کے ادا کرنے میں خود بخود کلام میں زور، جذبہ اور اثر پیدا ہوتا ہے، اور یہی چیزیں شاعری کی روح ہیں، مثلاً رضا کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ عالم میں خیر و شر، نیک و بد، حسن و قبح، رنج و راحت ہے سب فاعل مطلق کے حکم سے ہے، اسلئے ہمکو چون و چرا کا حق اور گلہ و شکایت کا موقع نہیں خرابات مقام فنا کو کہتے ہیں سالک عارف باخبر کو کہتے ہیں، تصوف میں انسان کو اشرف المخلوقات اور عالم اکبر مانا ہے، اسلئے صوفیانہ شاعری نے عزت نفس کا خیال پیدا کیا، تصوف نے بتایا کہ زمین و آسمان اور کون و مکان سب انسان کے لئے ہیں، ہم بادشاہ ازل کے نور کے سایہ ہیں، ہم آدم و حوا کے فرزند نہیں، تصوف نے بتایا کہ فرشتے اور افلاک انسان کا مرتبہ پہچاننے کے قابل نہیں، تصوف اصل میں زبان و قلم کی حدود سے باہر ہے وہ وجدان ذوق و مشاہدہ کا نام ہے جو بیان میں نہیں آسکتا، ایک تمثیلی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے جگنو سے پوچھا کہ تم دن کو کیوں نہیں نکلتے، اُس نے کہا میں تو دن و رات ایک ہی جگہ رہتا ہوں، لیکن آفتاب کی روشنی کے ہوتے ہوئے میں لوگوں کو نظر نہیں آتا، یہی حال تمام عالم کا ہے کہ خدا کی ہستی کے مقابلہ میں اُن کا وجود اس حال کو نظر نہیں آتا، اس وحدت کو

وحدت شہود کہتے ہیں، اس وحدت کا خیال رفتہ رفتہ وجود کی حد تک
پہونچا یا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں ثابت کیا ہے کہ درحقیقت
خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں یا یوں کہو جو کچھ موجود ہے
سب خدا ہی ہے"۔

ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے کس قدر ادیبانہ وصوفیانہ انداز میں ڈوبا
ہوا ہے مولانا کا وصف امتیازی یہی ہے کہ کتاب کے صفحے کے صفحے مطالعہ کرجائیے
لیکن، کہیں پر بھی کوئی رکیک وغیر فصیح لفظ یا مبتذل محاورہ نہ پایئے گا۔

وسعت معلومات:۔ ایک انشا پرداز کے لئے وسیع معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے
ترقیوں کی بوالعجبیاں، ایجادات کی بوقلمونی مرہون ہیں وسعت معلومات کی
اور وسعت معلومات منت کش ہے مطالعہ کتب کی،

مشہور ضرب المثل ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور انشا پرداز بنائے جاتے ہیں
لیکن یہ صحیح نہیں، شاعر اور انشا پرداز دونوں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں بنائے جاتے
ہیں، ایک انشا پرداز کے لئے وسیع المطالعہ بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے
نظر میں وسعت نہیں پیدا ہوسکتی، اور نہ کسی مسئلہ یا مبحث پر جامع ومانع بحث کی
جاسکتی ہے، ممکن ہے کہ ایک صاحب علم میں لطافت، رنگینی، ندرت، واجتہاد ہو لیکن
جامعیت کی صفت حاصل نہیں ہوسکتی، بجز علامہ شبلی کے یہ صفت دوسرے مصنفین
میں کم پائی جاتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ علامہ مرحوم ایک واقعہ یا مسئلہ کی تلاش
میں کتابوں کے صفحے کے صفحے مطالعہ کرجاتے تھے، ہر واقعہ کو تحقیق وتدقیق کے ساتھ
لکھنا اور اُس کا ثبوت بھی بہم پہونچانا مولانا ہی کا حصہ تھا، جب تک مرحوم ہر واقعہ
کو تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر خوب اچھی طرح پرکھ نہ لیتے، آگے بڑھنے کا
نام نہ لیتے تھے۔

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے وہ یہ وصف ازل سے لیکر آئے تھے، موصوف میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھتے تھے کہ مخاطب کون ہے، کس حیثیت کا ہے، کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنا چاہیئے، اُسی کے موافق وہ الفاظ استعمال کرتے تھے، یہ صفت یعنی الفاظ کے انتخاب میں فرق مراتب کا لحاظ رکھنا بجز مولانا شبلی کے ڈاکٹر نذیر احمدؒ و مولانا حالی وغیرہ میں بہت کم پائی جاتی ہے، اب راقم مضمون ہذا ان چاروں انشا پردازوں کے تصانیف کے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہے جن سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ انشا پردازی کا حقیقی معیار کیا ہے اور انشا پردازانہ حیثیت سے مولانا اپنے ہمعصروں میں کیا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا حالی یادگار غالب صفحہ ۵۳ میں اپنے استاد مرزا اسداللہ خاں غالب کی شان میں جن کے سامنے مولانا حالی نے زانوئے ادب تہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے نہایت بے تکلفی تھی، اکثر شام کو اُن کے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اُسوقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے گئے مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے، انھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا، مرزا نے کہا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اُجرت طلب کی، مرزا نے کہا بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے ہیں نے تمھارے پیسے دابے حساب برابر ہوا"۔

پلنگ پر پڑے ہوئے یہ بہت عامیانہ لفظ ہے جو اپنے سے کمتر درجہ کے

شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس موقع پر "پلنگ پر لیٹے ہوئے" زیادہ موزوں تھا،
حیات انیسؔ میں مولانا کا تبصرہ جو مرثیہ پر موصوف نے دیا ہے شائع ہوا ہے ،
ملاحظہ ہو حیات انیسؔ صفحہ، "زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی
تعریف کو مرثیہ، عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیے ایسے سچّے اور صحیح حالات
و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی،
لہذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدّت پیدا کریں اور
اور اُس کے مضامین میں کچھ اضافہ کیا جائے ، ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی
نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ حسن نظم کی بنیاد محض بین
اور مرثیت پر ہونی چاہیئے تھی، اسمیں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح
فخر و مباہات رزم و بزم بھی نہایت شدومد کے ساتھ شامل ہو گئی جس نے
اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا کردی، پہلے جہانتک ہمکو معلوم ہے
میر ضمیرؔ نے ایسے مرثیے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر میر انیسؔ نے
نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُن کے
خاندان میں چلی آتی تھی، اسپر اردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا"
"زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں" یہ محاورہ نہ اہل لکھنؤ کا ہے
نہ اہل دہلی کا بجائے قصیدہ بولنے کے اگر مولانا حالیؔ اس جگہ قصیدہ کہتے ہیں
تحریر فرماتے تو موزوں ہوتا، علامہ شبلی نعمانی حیات انیسؔ میں اسطرح مرثیہ پر تبصرہ
فرماتے ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۵۰ ۔

"عرب میں سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی اس کے بعد
شاعری اصلی حالت سے نکلکر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ خود بخود
زوال پذیر ہو گیا کیونکہ قصائد کی طرح اُس سے کچھ صلہ نہیں ملسکتا تھا ،

اسی زمانہ میں کربلا کا واقعہ پیش آگیا اُسوقت میں اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی، مگر زمانہ نے بنو اُمیہ اور بنی العباس کی سلطنت میں اس رنگ کو اُبھرنے نہ دیا، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے، اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا، غالبًا پہلا شخص جسنے ممبر پر بیٹھکر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے، نئی تشبیہیں نئے استعارے پسندیدہ مبالغے واقعہ نگاری مناظر قدرت کی تصویر وغیرہ تمام محاسن کلام میر ضمیر کے یہاں پائے جاتے ہیں، مگر اُن کے ہاں ان کا رنگ ہلکا سا تھا، میر انیس اور مرزا دبیر نے اسکو زیادہ شوخ کردیا۔"

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشاپردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنی چاہیئے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمدؒ اپنی کتاب اجتہاد صفحہ۱۴ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں،

"خدا کا کرنا پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہوگیا، اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے" "دبے چپکے سے سٹک گئے"، یہ عامیانہ درکیک الفاظ ایک معمولی شخص کے متعلق بھی کسی انشاپرداز کو استعمال نہ کرنا چاہئیں، چہ جائیکہ ایک پیغمبر کی شان میں، رقم مضمون کا قلم اس عبارت کو لکھتے ہوئے کانپا جاتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنی کتاب اجتہاد میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمدؒ تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ۸۲۔

"آخر دعوتِ اسلام کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لیکر مدینہ بھاگ جانا پڑا"

"مدینہ بھاگ جانا پڑا وہ بھی جان لیکر" یہ الفاظ کوئی صحیح المذاق انشا پرداز کبھی ایک پیغمبر کی شان میں استعمال نہیں کر سکتا، حیرت اور سخت حیرت ہے، اب اسکے مقابلہ میں راقم مضمون ہذا علامہ شبلی نعمانی کی عبارت نقل کرتا ہے کہ وہ اس واقعہ کو کس طرح لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اول صفحہ ۱۹۸

"کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا، اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھکو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھکو رہنے نہیں دیتے"۔

"قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا" اس فقرے کی بلاغت کو ملاحظہ فرمائے، کفار کا بے خبر ہو جانا محض اتفاقی امر نہ تھا، بلکہ یہ تائیدِ غیبی تھی، لیکن ڈپٹی نذیر احمدؒ کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت نے ہجرت صرف بزدلی کی وجہ سے کی تھی،

بیعت رضوان کا واقعہ ڈپٹی نذیر احمدؒ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف الحقوق والفرائض حصہ دوم صفحہ ۹ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں،

"یہ صلح پیغمبر صاحب نے دب کر کی اور مسلمانوں کی بڑی دل شکنی ہوئی، اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا، کہ پیغمبر صاحب نے یہ کیسا خواب دیکھا تھا، اور بعض منافقین یہ شبہہ کرتے تھے کہ اگر خدا اسلام کا حامی ہوتا تو یوں دب کر صلح نہ کیجاتی، اور کچھ لوگ شروع ہی سے پیچھے رہ گئے تھے اُن کو یقین تھا کہ اہل مکہ ان مسلمانوں کو گھسنے نہیں دینگے،

اور ایسا ہی ہوا، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست، حدیبیہ کی صلح بظاہر دبکر ہوئی تھی، مگر حقیقت میں اسمیں مسلمانوں کی بڑی جیت تھی، کہ ابتدائی حالت میں آئے دن کی لڑائی اُن کو پنپنے نہیں دیتی تھی، مسلمانوں کو مُہلت آئی اور مکہ پر چڑھ دوڑے، خدا کا کرنا کہ مکہ بے لڑائی فتح ہوا، حدیبیہ سے لوٹے تو پیغمبر صاحب سیدھے خیبر پر جا چڑھے، اور اُسکو فتح کیا اور وہاں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا، اس صلح حدیبیہ کے چند واقعات قابل تذکرہ ہیں، ایک بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے جسمیں حضرت عثمانؓ پیام صلح لیکر اہل مکہ کے پاس گئے تھے اُن کے آنے میں ہوئی دیر، یہاں یہ مشہور ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے مار ڈالا، تو اب چار و ناچار لڑائی ٹھہری، اس پر پیغمبر صاحب نے مسلمانوں سے لڑنے مرنے کی بیعت لی، جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور وہ ایک کیکر کے درخت کے تلے ہوئی تھی، ایک آیت نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہے، اونچی دوکان پھیکا پکوان، خدائی دعویٰ اور مکھی جیسی حقیر اور قابل نفرت چیز کا نام، ہمکو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہے، کمشنر سے اونچے درجے کے حکام کی خط و کتابت اُن کے عُلو مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرٹری اپنے نام سے کرتا ہے، جسکو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتر کہتے ہیں، سکتر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سر رشتہ دار ہے گو وہ اپنے نام سے خط و کتابت کرے، مگر حقیقت میں وہ خط و کتابت اُس کے افسر کی ہے، جس کا وہ سکتر ہے۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو الحقوق و الفرائض حصہ دوم صفحہ ۹۱۔

یہودیوں کی عادت بہت کٹھ حجتی کرنے کی تھی، چنانچہ ذبح گاؤ میں معلوم ہوچکا اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو اس طرح کی کرید سے منع فرما دیا ہے اور آیات کی منسوخی کے بارہ میں اسکی وجہ تلاش کرنی یہ بھی ایک قسم کی کرید ہے۔"

بیعت رضوان کے متعلق علامہ شبلی نعمانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ سیرۃ نبوی حصہ اول صفحہ ۴۲۲)

"بیعت رضوان ۔ بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھکو بچا سکے، آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، قریش نے اُن کو نظر بند کر دیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہکر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھکر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے، سورہ فتح میں اس واقعہ کا ذکر ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

"خدا مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے اُن پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔"

ڈپٹی نذیر احمد سورۂ فتح کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

"جب مسلمان ایک (کیکر) درخت کے تلے تمہارے ہاتھ پر (لڑنے مرنے) کی بیعت کر رہے تھے، خدا مسلمانوں سے خوش ہوا اور اُس نے اُن کی دلی عقیدت مندی کو جان لیا اور اُن کو اطمینان قلب عطا کیا، اور بدلے میں اُن کو سر دست خیبر کی فتح دی"۔

ہجرت حبش کا تذکرہ ڈپٹی نذیر احمد ان الفاظ میں فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو جتہاد صفحہ ۳۹۔

"پیغمبر صاحب نے اپنی خاندانی وجاہت کے بھروسہ پر جہاں تک ہو سکا، ان نو مسلموں کی حمایت کی، لیکن نری وجاہت ایسے لوگوں کی عام شورش کے مقابلہ میں کیا کام آئے، جو ہر وقت مار کٹائی اور بے حرمتی پر تلے رہتے تھے، آخر پیغمبر صاحب نے ان نو مسلموں کے تحفظ کے لئے ان کو نجاشی بادشاہ حبش کے یہاں چلتا کیا"۔

"مار کٹائی" "چلتا کیا" "بے حرمتی" کیا یہ الفاظ ایک پیغمبر کی شان میں ئی صحیح المذاق انشا پرداز استعمال کر سکتا ہے؟ غور فرمائیے کسقدر یہ الفاظ میانہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۱۷۱۔

"قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا، تو رحمت عالم نے جان نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں"۔

ڈاکٹر نذیر احمد اپنی کتاب اجتہاد میں قریش کے برتاؤ کو جو انھوں نے رہبر ورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا اس طرح بیان فرماتے ہیں:

ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۹۔

”وہ گرم مزاج لوگ بتوں کی تحقیر اور اپنے بزرگوں کی تحمیق کی تاب نہ لاکر بھڑوں کی طرح چھتوں سے باہر نکل پڑے، اور پیغمبر صاحب کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی اور دشنام دہی اور موقع پاکر زد و کوب کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا“

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۳۱۔

”اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھکر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کس مفاد کی توقع کر سکتے تھے، اسی دعویٰ نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی، کہ

جھڑکی تو دونوں سے مساوات ہو گئی — گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہر مار کھائی تو سن لو گے ایک دن — اسکی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا“

ملاحظہ کیجئے یہ بازاری و متبذل اشعار ایک پیغمبر کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں اب علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو کس طرح بیان فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ النبو جلد اوّل صفحہ ۲۸۰

”خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبّاران قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کیں تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ

بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی ،
وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا، وہ بھی
تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹاکر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں
لگایا کرتے تھے"۔

یہی مختصر اور بلیغ فقرے درحقیقت انشا پردازی کی جان ہیں،
مولانا محمد حسین آزاد رنگینی کے بادشاہ ہیں، لیکن رنگینی کے ساتھ ساتھ
لطافت اور شکوہ کا لحاظ رکھنا صرف علامہ شبلی کا کام ہے اسکا اندازہ آپ کو ان
دونوں مصنفین کی عبارتوں سے ہوجائیگا جو کہ حسب ذیل ہیں :۔

شمس العلماء محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق
کی تعریف میں رنگینی اور فصاحت کا دریا بہادیا ہے، ملاحظہ ہو آب حیات
صفحہ ۴۰۵۔

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت
کے فرشتوں نے باغ سخن کے پھولوں کا تاج سجایا ۔ جن کی خوشبو شہرت
عام بنکر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت
بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا، تو آب حیات اُس پر شبنم ہوکر برسا، کہ
شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے، ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے
موزوں ہوا، اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اسپر نظم اُردو
کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر
ہندوستان میں پیدا ہو، سبب اسکا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ
برباد ہوگیا، نہ ہمصفیر رہے نہ ہمداستاں رہے، نہ اُس بولی کے سمجھنے والے رہے
جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور

بولتا ہے اشہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا، اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے، گھرانوں کے وارث علم وکمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے وہ جادوکار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں، آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد واختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اوز اصل کی شاخیں ہیں، انھوں نے اور پانی سے نشو ونما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہی ہیں، پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ کیا مبارک زمانہ ہوگا، جبکہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالت طفولیت میں ہوگی، صرف ونحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک اُستاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے، ان لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی، وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا، کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا، ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے، مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں، یہ شائد اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنیوالے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا، ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے، اسی واسطے میں لکھونگا، اور سب کچھ لکھونگا جو باتیں اُن کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑونگا۔"

مولانا محمد حسین آزاد اپنی سب سے بہترین تصنیف دربار اکبری میں، جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان کی پیدائش کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔ دربار اکبری صفحہ ۱

امیر تیمور نے ہندوستان کو زور شمشیر سے فتح کیا، مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا، بابر اُسکا پوتا جو چھٹی پشت میں ہوتا تھا، سوا سو برس کے بعد آیا، اُس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اُسی رستے ملک عدم کو روانہ ہوا، ہمایوں اُس کے بیٹے نے قصر سلطنت کی بنیاد کھودی، اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں، مگر شیر شاہ کے اقبال نے اُسے دم نہ لینے دیا، اخیر عمر میں اُسکی طرف پھر ہوائے اقبال کا جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی، یہانتک کہ ۹۶۳ھ میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہوا، تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط، مگر خدا کی قدرت دیکھو اُسنے سلطنت کی عمارت کو انتہائے بلندی تک پہونچایا، اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ پشتوں تک جنبش نہ ہوئی، وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، پھر بھی اپنے نیک نامی کے کتابے کو ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں اُنھیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اُتنا ہی چمکتے آتے ہیں، اگر جانشیں بھی اسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگارنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے، بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لئے آئینہ ہوتے، اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا، ایک دن ماں نے اُس کی ضیافت کی، وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی، اور دیکھتے ہی

اُسکے حسن و جمال کا عاشق شیدا ہو گیا، دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا
کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے، ایک سید بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام
کی اولاد میں ہیں، اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے اُستاد ہیں، یہ اُنکے
خاندان کی بیٹی ہے، ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے، ہندال نے
کہا، مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو، ہمایوں کا دل
ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا، آخر محل میں داخل کر لیا"۔

متذکرہ بالا عبارت مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے
لیکن اسکو علامہ شبلی نعمانی کے "ظہور قدسی" سے کیا نسبت ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی
حصہ اول صفحہ ۱۲۲ "ظہور قدسی"

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے
کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی
ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جسکے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے
کروڑوں برس صرف کر دئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں
ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز
کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں،
عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی
تر دستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف،
معجزہ طرازی موسیٰ، جان نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے
گراں ارز، شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی
صبح جان نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، ارباب سیر
اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے

۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا،
لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین
کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر
آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک
میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں
دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں
بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا
آئینہ پر تو قدس سے چمک اٹھا۔"

سرنامہ سیرۃ نبوی جلد اول میں یہ الفاظ علامہ شبلی نے تحریر فرمائے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ پر شیشے جڑے ہیں،

"ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں، اخلاص وعقیدت کی
نذر لیکر آیا ہے، زچشم آستین بردار وگوہر را تماشا کن"۔

علامہ شبلی نعمانی کی تحریر میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ
خاص موزوں ہو سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، آقا و خادم،
چھوٹے اور بڑے کے مختصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے
ہیں، مولانا موصوف ثقیل لفظوں کو بالکل ناپسند کرتے ہیں اور اُن کو کیسا ہی
مضمون ہاتھ لگے لیکن جبتک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈھ نہیں لیتے اُس مضمون کی
طرف متوجہ نہیں ہوتے، مولانا شبلی کا طرز تحریر بلاغت کی جان، سلاست کی
روح اور فصاحت کی کان ہے، مولانا موصوف فصیح لفظوں کو اس خوبی سے
ترتیب دیتے ہیں جیسے جڑنے والا نگینوں کو نہایت صحیح مناسبت کے ساتھ
زیوروں میں بٹھاتا ہے، مولانا کے تسلسل بیان میں وہ خوبی ہے کہ کہیں سے

کوئی کڑی علیحدہ ہی نہیں ہوتی، اور ایک کڑی دوسری کڑی سے اس خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو پہچانی نہیں جاتی، جیسے مرصع زیورات میں اعلیٰ کاریگر کا لگایا ہوا ٹانکا جو بالکل وصول ہوجاتا ہے اور دو حصوں کو وصل کر دیتا ہے،

مولانا حالی کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور،

ملاحظہ ہو حیات سعدی صفحہ ا۔

"اُسکا نام شرف الدین اور مصلح لقب ہے، اور سعدی تخلص ہے، سر گور اوسلی نے اُسکی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۲۳۳ء میں لکھی ہے، مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے، شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا، چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لئے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا، شیخ کا باپ جیسا کہ اُسکے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متورع آدمی تھا، شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں، کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے، اور بچپن ہی میں اُسکو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔"

علامہ شبلی اپنی کتاب شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۲۲ میں شیخ سعدی کے حالات اس طرح بیان فرماتے ہیں، مولانا موصوف خشک تاریخ کو مضمون کی چاشنی میں ہمارے دسترخوان پر پیش کرتے ہیں۔

"مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، اُن کے والد اتابک سعد بن زنگی

بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا،
سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی،
عمر کی مدت تذکروں میں ۱۰۲ برس لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت
۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرح ابن جوزی کے شاگرد ہیں
اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں
سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے اس لئے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۰ برس کی
ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور
کمالات نے کم از کم ۳۰، ۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے،
اُن کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک
مُرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر اُن کو ٹوکتے تھے
اور اُن کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، اُن کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں
زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا،"

غور فرمائیے ایک ایک لفظ کسقدر راویانہ انداز میں ڈوبا ہوا ہے،
مولانا شبلی نے باوجود تاریخی مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اُس کو ادا کیا
ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخی اصلیت بدستور اپنی
اصلی صورت پر موجود ہے،

علامہ شبلی نعمانی جب کبھی رنگیں عبارت لکھتے ہیں کیونکہ مولانا عموماً
سادہ لکھا کرتے ہیں تو مولانا آزاد باوجود اپنی قادر الکلامی کے اس حد تک
نہیں پہونچ سکتے، ملاحظہ ہو شعر العجم حصّہ چہارم صفحہ ۲۱۵:

"ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر
آب رواں، سبزہ زار، اور آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ

زمردیں ننگی، باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے، جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا" ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۳۲

"بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے، پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے رات رات بھر وہ سوز دل کہتا رہا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے بارہا اس نے غنچہ کی عین اسوقت پردہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا"

حضور سرور کائنات کی جامعیت کبریٰ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہیں، ملاحظہ کیجئے سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۲

"لیکن اسوقت تک دنیا کی جسقدر تاریخ معلوم ہے، اسنے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عام انسانی تکمیل کے لئے زمانہ ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا، جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو، اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجہ گرداں بھی، ....

ڈاکٹر نذیر احمدؒ نے اردو کو دہلی کے گھرانے اور محل سرائے سے نکال کر
شاہراہ عام پر بٹھادیا، مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، مولانا نذیر احمدؒ نے
ترجمہ قرآن شریف میں ایسی ہی رواجی اور خانگی اُردو کو ٹھونس دیا ہے
اور قرآن عظیم کی اعلیٰ متانت کا خیال نہیں رکھا، ان کا ترجمہ قرآن شریف
ناپسندیدہ اور قابل تنسیخ ہے، مولانا نذیر احمدؒ کی تمام تصنیفات دینیات پر
مبنی ہیں، اُس سے ہر ملت و مذہب کا شخص مستفیض نہیں ہوسکتا، زیادہ تر
کتابیں "جنس لطیف" کی دلچسپی کے لئے لکھی ہیں، مثلاً ایامی، محصنات، بنات النعش
مراۃ العروس وغیرہ جسمیں ایک ہندوستانی گھرانے کی معاشرت کے ساتھ
اخلاقی تعلیم کا بیان ہے،

مولانا نذیر احمدؒ کی اردو ایک زمانہ شناس بڑی بی بی معلوم ہوتی ہے،
مولانا الطاف حسین حالی کی تصانیف میں یادگار غالب، حیات سعدی
ور حیات جاوید مشہور کتابیں ہیں اور اردو نثر کے ذخیرہ میں صرف یہ تصانیف
دگار ہیں، مولانا ایک ناصح مشفق شاعر تھے، زبان اُردو پر اُن کا یہ احسان
ہمیشہ رہیگا کہ مرحوم نے جسقدر نئے خیالات نظم کئے ہیں کسی دوسرے
خص نے نظم نہیں کئے، اسکا ثبوت مسدس حالی ہے، یہ اردو زبان میں
ہت قابل قدر کتاب ہے، اسمیں مولانا نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی
تصویر دکھائی ہے اُس سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں ہوسکتی، سرسید مرحوم نے
س مسدس کو قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا جب مجھ سے
پوچھیگا کہ کیا لایا ہے تو اس مسدس کو پیش کروں گا" اور ہمیں امید ہے کہ
مسدس اُن کی اور مولانا دونوں کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن مگر بحیثیت
وعی دیکھا جائے تو مولانا شبلی سے زیادہ کسی نے آجتک اُردو کی خدمت

یں کی، مولانا مرحوم کی تصانیف میں سیرۃ نبوی و الفاروق اور شعر العجم
ہر، ایسی کتابیں ہیں جو سوائے اردو کے کسی زبان میں نہیں، آنحضرت کی
وانح عمریاں متعدد زبانوں میں لکھی گئیں لیکن ایسی جامع و نافع و مستند
ضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مولانا مرحوم کی سیرۃ نبوی سے
یشتر کسی نے نہیں لکھی، اسمیں خاص بات یہ لحاظ کے قابل ہے کہ جو اعتراض
ں معترض کے دلمیں پیدا ہوتا ہے اُسکا کافی جواب آگے مطالعہ کرنے سے
ا تا ہے،

مہاتما گاندھی نے بھی یرودا جیل میں اس کا مطالعہ کیا ہے اور
ر مہاتما موصوف پر سیرۃ نبوی مطالعہ کرکے ہوا اُس کا اظہار انگریزی
ردو کا مرڈ" مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں کیا ہے، مولانا شبلی کی تصانیف
، ہر ملت و مذہب کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، موصوف کی تصنیفات
یں بہت کثرت سے کتابیں یادگار ہیں، الفاروق، المامون، سیرۃ نبوی
العجم، رسائل شبلی خاص کر قابل تذکرہ ہیں اردو نظم میں مثنوی صبح امید
شبلی اور بوئے گل یادگار ہیں، مولانا شبلی معدودے چند مصنفوں میں
جنہوں نے کریٹی سزم تنقید کے اصلی مفہوم کو سمجھا ہے، اور کوشش کی ہے
ید کا حق اُردو زبان میں بھی ادا کیا جائے۔

غرض علامہ شبلی نعمانی کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت قابل قدر
مرحوم نے اس راستہ کو اتنا سہل گزار بنا دیا ہے کہ اُس کے پیرؤوں کو
یں بہت سہولت ہوگئی ہے اور مختلف الموضوع کتابیں تصنیف فرماکر
زبان کو مالامال کر دیا ہے،

راقم مضمون ہذا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مسٹر براؤن آف کیمبرج کی

وہ تحریر پیش کرتا ہے جو موصوف نے شعر العجم مطالعہ کرنے کے بعد ڈیلی نیوز "[illegible]" میں شائع کرائی تھی، کون کہہ سکتا تھا؟ کہ ۱۹۱۲ء میں دفعتہً علامہ شبلی کا وجود یورپ میں نمودار ہوگا اور پروفیسر براؤن آف کیمبرج سے جو آجکل مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے خراج تحسین وصول کرے گا، پروفیسر موصوف نے شعر العجم کی عبارتیں بطور استناد تاریخ ادبیات ایران میں نقل کی ہیں، الغرض یہ بات اردو زبان کے لئے نہایت باعث فخر ہے کہ دوسری زبان اُس سے سند لے، کیا اب بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ علامہ شبلی سے زیادہ کسی دوسرے مصنف نے اردو زبان کو ترقی دی؟ موصوف نے جب سے تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اُسوقت سے لیکر اس جہان فانی کو خیرباد کرتے وقت تک مصروف رفتار رہے، جس کا ثبوت علامہ موصوف کی اس رباعی سے ملتا ہے،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا *

راقم مضمون محمد عبد اللطیف صدیقی طالب العلم ایف۔ اے کلاس
محلہ دوگانواں، لکھنؤ۔

تصانیف مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی صلعم - جلد اوّل حصہ اوّل (مجلد) قیمت باختلاف کاغذ و جلد - ۲؎ و ۱۸؎

" " " حصہ دوم " " " ۸؎ و ۱۲؎

جلد دوم ۱۵؎ و ۲؎

الفاروق - خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروق کے سوانح زندگی اور آپ کا طرز حکومت ۵؎ و ۲؎

سیرۃ النعمان - امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری اور انکے اجتہادات و مسائل ۱؎ و ۳؎

الغزالی - امام غزالی کی سوانح عمری اور اُن کا فلسفہ ۱؎ و ۳؎

سوانح مولانا روم - مولانا جلال الدین رومی کی سوانحعمری، مثنوی اور دیگر تصانیف پر تقریظ ۲؎

المامون - خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات ۳؎

رسائل شبلی - مولانا شبلی کے مختلف علمی مضامین کا مجموعہ ۳؎

مقالات شبلی " " " " ۱۲؎ و ۱؎

مضامین عالمگیر - شہنشاہ اورنگ زیب پر اعتراضات اور اُنکے جوابات ۳؎ و ۵؎ و ۸؎

علم الکلام - مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ - اسکی عہد بعہد کی ترقیاں اور علمائے متکلمین کے نظریات ۳؎ و ۲؎

الکلام - جدید علم کلام، عقلی دلائل سے مذہب کا اثبات، اور ملاحدہ و منکرین کا رد ۳؎ و ۲؎

شعر العجم - (حصہ اوّل) شاعری کی حقیقت، فارسی شاعری کا آغاز اور قدما کا دور ۷؎ و ۲؎

" (حصہ دوم) شعرائے متوسطین کا دور ۱؎ و ۳؎

" (حصہ سوم) شعرائے متاخرین کا دور ۱؎ و ۳؎

" (حصہ چہارم) فارسی شاعری پر ریویو ۷؎ و ۱؎

" (حصہ پنجم) فلسفیانہ، صوفیانہ، اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ ۲؎ و ۳؎

سفرنامہ روم و مصر و شام - تینوں ملکوں کی معاشرت و تمدن کا بہترین مرقع - ۲؎

موازنہ انیس و دبیر - ایک ہی فن کے دو معاصر اُستادوں کے کلام پر تبصرہ جو ادبی تنقید کا بہترین نمونہ ہے قیمت ۷؎

آغاز اسلام - ابتدائے عہد کی اسلامی تاریخ جو فارسی میں لکھی گئی تھی اُسکا ترجمہ - قیمت ۸؎

مجموعہ کلام شبلی (اردو) ۱۲؎ مثنوی صبح اُمید (اردو) ۴؎ کلیات شبلی (فارسی) ۲؎

متفرق مضامین - اسلامی حکومت ۲؎ اسلامی مدارس ۲؎ زیب النسا ۱؎ جہانگیر ۱؎ کتبخانہ اسکندریہ ۶؎

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

الناظر

نمبر ۲ جلد ۳۳ — اگست سنہ ۱۹۲۷ء

فیضی اور اُسکی مثنوی

"الحق مثنوی ایست کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد" یہ وہ الفاظ ہیں جو فیضی کی عشقیہ مثنوی (نل دمن) کے حق میں اُس کے سخت ترین مخالف مگر حق پسند نقاد البدایونی کے قلم سے نکلے ہیں۔ گستاخی نہ ہو تو میں اس میں اس قدر اور اضافہ کروں گا کہ البدایونی کے اس ریمارک پر تین سو برس سے زیادہ گذر جانے کے باوجود بھی گذشتہ چھ صدیوں میں کسی سے نل دمن کا جواب نہ ہو سکا۔

ان سطور میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ رائے کس حد تک صداقت پر مبنی ہے ور فیضی کے آرٹ کی وہ کون سی خصوصیات تھیں جنھوں نے ہندوستان اور ایران سے یکساں خراج تحسین وصول کیا۔ مگر اس امر پر بحث کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور ۔ فارسی میں مثنوی کی ابتدا اور اسکی ترقیات کے دور پر چند مباحث بطور مقدمہ عرض کر دیے ائیں تاکہ اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ فیضی کی مثنوی کا فارسی ادبیات میں کیا درجہ ہے۔

۔ اس مضمون میں جن کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے حسب ذیل ہیں۔ (تاریخ) اکبر نامہ منتخب التواریخ۔ طبقات اکبری۔ (تذکرہ و تنقید) آئین اکبری ۔ منتخب حصہ سوم۔ شعر العجم ۔ ہفت آسمان۔ مقدمۂ شعر و شاعری حالی۔ مقدمۂ مجنوں لیلیٰ خسرو از مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی ۔ دربار اکبری ۔ (مثنویات) نل دمن ۔ مرکز ادوار۔ لیلےٰ مجنوں نظامی ۔ مجنوں لیلیٰ خسرو۔ لیلیٰ مجنوں جامی وغیرہا۔

مثنوی کی اصل

مثنوی کی اصل اہل ادب میں مختلف فیہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا ماخذ رجز ہے جو عربی شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ مگر چونکہ عربی کے ادب میں بخلاف فارسی کے کوئی مستقل مثنوی نہیں ملتی یہ نظریہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مثنوی کی ابتدا کا سہرا فارسی کے سر ہے۔ ذیل میں ہم ایک جدول دیتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ مشہور اصناف شعر کا ماخذ کیا تھا۔ اور انکو کس زبان میں کس نام سے پکارتے ہیں :۔

صنف شعر	اصل	عربی نام	فارسی نام
رجز	عرب	رجز	-
مرثیہ	"	مرثیہ	مرثیہ
قصیدہ	"	قصیدہ	قصیدہ
غزل	فارس	نسیب (تشبیب)	غزل
مثنوی	"	مزدوجہ	مثنوی
رباعی	"	دوبیتی (رباعی)	ترانہ (رباعی)

فارسی زبان میں رودکی سے جسکو آدم الشعرا کہا جاتا ہے پیشتر بھی اکثر شعر کہنے والے ہوے ہیں اور انکے بعض اشعار بھی تاریخ نے ہم تک پہونچائے ہیں۔ بلکہ قیاس چاہتا ہے کہ ایران جیسے خطہ میں جو قدیم تمدن اور قدرتی لطافت کا مرکز رہا ہے فتوحات اسلام سے پہلے بھی نظم ونثر کا معتدبہ ذخیرہ ہوگا۔ بہرحال تاریخی شہادت کے نہ موجود ہونے کی صورت میں ہم یہ قرار دینے پر مجبور ہیں کہ شاعری کی باقاعدہ ترقی کا زمانہ سامانیوں سے آغاز ہوتا ہے جن کے دربار کا شاعر رودکی تھا۔ عام شاعری کے علاوہ مثنوی کی ابتدا بھی رودکی سے ماننی پڑیگی جسکی مثنوی کے چند شعر اسوقت تک محفوظ ہیں۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں

گفت با خرگوش خانہ خان من	خیز و خاشاک از و بیروں فگن
شو بداں کنج اندروں خے بجوے	زیر او سیجے بیست بیروں شد بدوے
چونکہ مالیدہ بدو گستاخ شد	کار مالیدہ بدو درواخ شد
آفریدہ مردماں مر رنج را	پیشہ کردہ رنج جان آرنج را

ان اشعار کو پڑھکر جو قدیم زبان میں ہیں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد تک مثنوی نے بلکہ شاعری نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ سیدھے سادے خیالات سادہ زبان میں ادا کر دیے

جاتے تھے - رودکی کے بعد دقیقی کا شاہنامہ اور اسدی کا گرشاسپ نامہ خاص طور پر قابلِ
ذکر ہیں - یہاں تک کہ وہ دور آتا ہے کہ فردوسی شاہنامہ کی تکمیل کر کے اپنے زورِ نظم سے
ملک سخن کو تسخیر کرتا ہے - یہی وہ مثنوی ہے جسکو ابن اثیر قرآن عجم کہتا ہے - یہی وہ نظم ہے جسکو
مستشرقین یورپ دنیا کے ادبیات عالیہ میں شمار کرتے ہیں - فردوسی کے بعد مثنوی گویوں کے
زمرے میں حکیم سنائی کی شہرت محتاج بیان نہیں جن کی کتاب حدیقہ عطار اور مولانا روم کے
لیے شمع راہ ثابت ہوئی - ما از پے سنائی و عطار آمدیم (مولوی)

ان کے بعد مولانا نظامی گنجوی کا زمانہ آتا ہے جن کی پنج گنج (خمسۂ نظامی) کا آوازہ
شُہرت عالم میں پھیلا ہوا ہے - حقیقت یہ ہے کہ شاہنامۂ فردوسی کا اگر جواب ہو سکتا ہے تو
سکندر نامۂ نظامی ہے - بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شاہنامہ نقش اول ہے اور سکندر نامہ نقش ثانی - نظامی
کے بعد اکثر اساتذۂ فن نے رزمیہ شاہنامے لکھے مگر شعرا کا زورِ قلم اور مسلمانوں کا جوش قومی اسقدر
افسردہ ہو چکا تھا کہ بقول علامہ شبلی اُن مثنویوں کے دو شعر بھی بر زبان نہ رہے - نظامی کی
عشقیہ مثنویوں کی بھی اکثر شعرا نے تقلید کی اور بعض کامیاب بھی ہوے - جن کا ذکر آگے
آئے گا - غرض یہ امر مسلم ہے کہ نظامی کے بعد جو مثنوی نویس ہوے سب نے نظامی ہی کے
نمونے کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کی -

نظامی کے معاصروں میں بھی چند با کمال مثنوی نویس گذرے ہیں جن میں خاقانی،
ظہیر، عطار کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

عطار کے بعد مولانا روم نے مثنوی میں وہ کمال دکھایا کہ آج تک نہ صرف ایشیا
بلکہ یورپ تک اسکی صداے بازگشت سے گونج رہا ہے - اسی کی تعریف میں بعض معتقدین نے
یہاں تک کہہ دیا کہ ہست قرآں در زبانِ پہلوی -

ذیل کی ترتیب سے مثنوی نویسوں کے دور اور مثنوی کے ارتقا کی کیفیت واضح ہوگی -
رودکی (مثنوی کلیلہ دمنہ) ابو شکور - دقیقی (شاہنامہ) عنصری - اسدی (گرشاسپ نامہ)
فردوسی (شاہنامہ) (۲) ناصر خسرو (روشنائی نامہ) فخر الدین اسعد گرگانی (ویس و رامین)
قطران (قوس نامہ) مسعود سعد سلمان (۳) حکیم سنائی (حدیقۃ الحقیقہ) عمعق بخاری

مستشرقین نے ایران کے تمام لٹریچر میں چار کتابوں کو ( ) میں شمار
مثنوی شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولوی [illegible]، دیوان حافظ، اور گلستان سعدی -

(یوسف زلیخا) نظامی عروضی سمرقندی (ویس ورامین) - فصیحی جرجانی (وامق و عذرا) (۵) نظامی گنجوی (پنج گنج) - رشیدی سمرقندی - خاقانی - ظہیر - ازرقی - عطار - (۶) مولانا ئے روم (مثنوی مولوی) (۷) مقلدین نظامی گنجوی -

مولانا نظامی کے بارے میں اوپر عرض کیا گیا ہے کہ انکے بعد کے تقریباً تمام مثنوی نویسوں نے انھیں کے قائم کردہ اصول کو اپنا دستورالعمل بنایا اور انھیں کی تقلید کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار جانا - بیشمار شعرائے نظامی کے تتبع میں خمسے لکھے اور داد کمال دی - ان میں سب سے زیادہ نامور اور کامیاب خسرو - خواجوی کرمانی - جامی اور فیضی گذرے ہیں - آج کا موضوع بحث یہ ہے کہ فیضی کی مثنوی کا آرٹ کیا ہے اور وہ کس حد تک نظامی کا صحیح جانشیں کہا جا سکتا ہے - مگر پہلی بات جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ خود نظامی نے مثنوی کو کیا ترقی دی اور انکی بابت اساطین فن کی کیا رائے ہے - نظامی کے معاصرین اور متاخرین اس امر پر متفق ہیں کہ نظامی ملک نظم کے فرماں روا اور خصوصاً مثنوی کے بادشاہ ہیں - خسرو جیسے استاد کو اعتراف ہے کہ

نظامی کآب حیواں ریخت در حرف ہمہ عمرش دراں سرمایہ شد صرف
چناں در خمسہ داد اندیشہ را داد کہ با سبع شداد ش بست بنیاد
نظامی خود سخن ناگفتہ نگذاشت ز خوبی گوہرے ناسفتہ نگذاشت

صاحب سلم السموات لکھتے ہیں

نظامی کہ استاد این فن ویست دریں بزمگہ شمع روغن ویست
ز ویرانۂ گنجہ شد گنج سنج رسانید گنج سخن را بہ پنج

فیضی ایک قصیدہ میں مولانا نظامی کی استادی کا اس طرح معترف ہے

ز سحر کاری گنجور گنجہ نیز مپرس کہ داشت کلکش بر گنج غیب ثعبانی
بنظم او برسد نظم غیر اگر برسد مخیل متنبی بہ نقش تمثال مانی

تمام نقادان فن کا فیصلہ ہے کہ قصیدہ میں خاقانی (جدت) و انوری (سلاست) - غزل میں سعدی مثنوی میں فردوسی (رزمیہ) و نظامی (عشقیہ) - قطعہ میں ابن یمین اور رباعی میں عمر خیام ائمہ سخن ہوے ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی نویس شعرا نے ہمیشہ نظامی کا تتبع کیا ہے نہ کہ فردوسی کا - اور یہ بھی امر مسلم ہے کہ مولانا نظامی کی عشقیہ مثنویاں فارسی ادب کے شاہکار

تصانیف شمار کی جاتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنویہ کے دور کی جنگجویانہ روح قوم میں ایک مدت تک مضمحل ہو چکی تھی اور ملک کی قدرتی لطافت حسن و عشق کے ولولوں کو ابھارنے میں مدد دے رہی تھی۔ ان حالات میں مولانائے گنجوی کی سخن آفرینی اور نکتہ رس طبیعت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ انھوں نے مثنوی کا قالب مکمل کیا اور اس میں تعریف سخن سبب تالیف۔ نصائح۔ ساقی نامہ کے مضامین ایجاد کیے۔ جب سے مثنوی میں یہ لوازم قرار پائے۔ حمد۔ مناجات۔ نعت۔ ذکر معراج۔ منقبت۔ مدح۔ تعریف سخن و سخنوران۔ سبب تالیف۔ نصائح۔ تمہید کلام۔ ساقی نامہ۔ آغاز داستان۔ خاتمہ۔ انھوں نے مثنویوں میں مباحث حکمیہ کا اضافہ کیا اور آیندہ کے لیے فلسفیانہ مضامین کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں اور مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحروں کو مثنوی میں داخل کیا۔ (دیکھو شبلی) ان سب باتوں کے ساتھ انکی نازک خیالی اور مضمون آفرینی نے تشبیہ اور استعارہ کے زور سے شعر کو سحر کے درجہ پر پہونچا دیا۔ جسکی بدولت انکا کلام تازگی و شگفتگی میں اسوقت تک ضرب المثل ہے۔ کہن گشتی و ہمچناں تازہ۔

مثنوی کا بہترین صنف شعر ہونا

حقیقت یہ ہے کہ مثنوی سے بہتر اور مفید تر کوئی صنف سخن نہیں۔ سب سے بڑی بات جو مثنوی میں ہے وہ یہ کہ اس میں ردیف کا ہونا ضروری نہیں۔ برخلاف غزل کے جو ردیف کے بغیر نہایت خشک اور بےمزہ معلوم ہوتی ہے۔ قدما کی غزلوں کو پڑھو۔ عموماً ردیف سے معرا اور بے سبقت سے خالی پاؤگے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو فارسی غزل ایک نہایت مشکل اور پرازتکلف چیز ہے۔ جن زبانوں میں بلینک ورس کا رواج ہے ان کا تو ذکر نہیں۔ ہمارے ہاں ادب ایسے اشعار کو شعر (مرجز) سے زیادہ درجہ نہیں دیں گے۔ غضب تو یہ ہے کہ قافیہ پر بھی قناعت نہیں بلکہ ردیف کی قید بڑھا کر خیال کو محدود اور دائرہ سخن کو تنگ کر دیتے ہیں۔ بہر حال مثنوی میں یہ قید چنداں لازم نہیں۔ قاسم کاہی رسالہ قافیہ میں لکھتا ہے کہ در غزل ردیف عیب است و در مثنوی عکس آں۔ پھر لطف یہ کہ مثنوی کے ہر شعر میں قافیہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ بھی بڑی سہولت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مثنوی میں تعداد اشعار محدود نہیں۔ رباعی کے دو شعر ہوتے ہیں وہ اس میں ایک مکمل تخیل ادا کرنے کی مشکلات پیدا کردے۔ غزل کے اشعار بھی عموماً سترہ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ قصیدہ میں البتہ اشعار زیادہ ہوتے ہیں لیکن کبھی اس سے زیادہ بھی شعر

کہے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک حد ہے۔ اسکے برخلاف مثنوی میں اشعار کی کوئی تعداد معین نہیں۔ شعرا نے پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ ہزار مسلسل اشعار کی مثنویاں لکھی ہیں اور زور سخن دکھایا ہے۔ شاہنامہ اور مثنوی مولوی وغیرہ ہمارے دعوے کے شاہد ہیں۔

اس کے علاوہ مضامین مثنوی میں تنوع کی اس قدر گنجایش ہے کہ اور اصناف شعر میں نہیں اس میں غزل یا قصیدہ کی طرح تغزل یا مدح کی پابندی ضرور نہیں بلکہ رزم و بزم اخلاق و موعظت۔ تصوف و فلسفہ غرض ہر موضوع کے لیے خواہ اُس میں علیحدہ علیحدہ مستقل بالذات تخیلات ادا کیے گئے ہوں یا ایک مربوط و مسلسل مضمون ہو اُسکا میدان اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے۔ مثنوی ایک طرف رزم و تاریخ و افسانہ پر حاوی ہونے کے لحاظ سے محاکات کے اور دوسری طرف فلسفہ و تصوف کی حامل ہونے کے اعتبار سے تخییل کے مختلف عناصر پر محتوی ہے۔ اسی جامعیت کا نتیجہ ہے کہ تاریخ و افسانہ و اخلاق کے بڑے سے بڑے دفتر صرف مثنوی ہی کی بدولت شعر کے جامہ سے مزین ہو سکے۔ ذیل میں ہم مثنوی کے مختلف اقسام اور انکی مثالیں دیں گے جن سے اُسکے تنوع کا اندازہ ہوگا۔ مثنوی کی تقسیم دو طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ بہ اعتبار معنی و بہ لحاظ صورت۔ پہلے طریقہ کی بابت یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کوئی جامع و مانع تقسیم تو نہیں کی جا سکتی البتہ موجودہ مثنویاں حسب ذیل عنوانوں کے تحت میں رکھی جا سکتی ہیں:

(۱) رزمیہ مثلاً شاہنامہ۔ سکندرنامہ۔ گشتاسپ نامہ۔ (۲) تاریخی۔ مثلاً اکبرنامہ فیضی۔ تاج الفتوح خسرو (۳) افسانہ۔ جیسے کلیلہ دمنہ رودکی۔ ہفت پیکر نظامی۔ ہشت بہشت خسرو (۴) عشقیہ مثلاً لیلی مجنون۔ یوسف زلیخا۔ شیریں خسرو۔ نل دمن (۵) اخلاقی۔ مثلاً مخزن اسرار۔ تحفۃ الاحرار۔ مرکز ادوار۔ مطلع انوار۔ مجمع ابکار۔ روضۃ الانوار۔ مشہد انوار۔ منبع انہار۔ دیدۂ بیدار۔ بوستاں۔ (۶) فلسفیانہ۔ جیسے روشنائی نامہ۔ (۷) صوفیانہ۔ جیسے حدیقۂ سنائی۔ منطق الطیر۔ مثنوی مولوی معنوی۔ جام جم۔ گلشن راز۔

صورت کے لحاظ سے مثنوی سات بحروں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

(۱) بحر متقارب مثمن مقصور (یا محذوف) جیسے کنوں رزم سہراب و رستم شنو ❊ دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو۔ (شاہنامہ فردوسی)

(۲) بحر ہزج مسدس مقصور۔ مثلاً الٰہی غنچۂ امید بکشاے ❊ گلے از روضۂ جاوید بنماے (یوسف زلیخا جامی)

(۳) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مکفوف جیسے اے نام تو بہترین سرآغاز - بے نام تو نامہ کے کنم باز (لیلی مجنوں نظامی)

(۴) بحر رمل مسدس محذوف - جیسے بشنو از نے چوں حکایت میکند - وز جدائیہا شکایت میکند (مثنوی مولوی معنوی)

(۵) بحر رمل مسدس مخبون محذوف - مثلاً تا بجائے کہ صد پارسیاں - اندریں عہد دوں گشت عیاں - (نہ سپہر خسرو)

(۶) بحر سریع مسدس مطوی مکسوف - جیسے پیر زنے راستے ور گرفت - دست زد و دامن سنجر گرفت (مخزن اسرار نظامی)

(۷) بحر خفیف مسدس ابتر - مثلاً ہر کہ طے کردہ ایں مواقف را - چہ شناسد قتیل و واقف را (باد مخالف غالب)

بعض متاخرین نے ایک بحر کا مثنوی میں اور اضافہ کیا ہے - بحر متقارب مثمن اثلم جیسے روزے بسوے دشت یمن شد - دشت از جمالش رشک چمن شد (لا اعلم) مثنوی کی اس ہمہ گیری اور وسعت کو دیکھتے ہوے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ تمام اصناف شاعری میں مفید ترین ہے اور اسی کی بدولت مستقل اور طویل نظم فارسی میں مل سکتی ہے -

عمدہ مثنوی کی شرائط مثنوی کی دو بڑی قسموں محاکاتیہ Narrative اور تخئیلیہ Reflective میں رزمیہ - تاریخی - افسانہ - اور عشقیہ قسم اول میں، اور اخلاقی - فلسفیانہ - صوفیانہ دوم میں داخل ہیں - چونکہ اس مقالہ کا موضوع قسم اول (خصوصاً عشقیہ) ہے اور عشقیہ مثنوی بداہتہً قصہ یا story کی حد میں آتی ہے اس لیے اسکے واسطے وہی لوازم ہونے چاہییں جو ایک قصہ کے لیے درکار ہیں -

یہ لوازم یا شرائط حسب ذیل ہیں - الف - واقعات کی ترتیب اس موزونیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہو کہ تسلسل اور ربط میں فرق نہ آنے پائے - جو امور کہ نمایاں کرنے کے قابل ہوں انکو نمایاں کرکے پیش کیا جائے - جو نکات کہ اشارۃً یا کنایۃً بیان کرنے ہوں وہ اس لطافت سے ادا کیے جائیں کہ باوجود کنایہ ذہن اس کی طرف منتقل ہو جائے - کیونکہ الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ (دیکھو شعر العجم) - اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تخئیل و محاکات کا مصرف صحیح نظر انداز نہ ہو - تخئیل کی جگہ محاکات یا محاکات کے موقع پر تخئیل کا استعمال یا

دونوں میں سے ایک کا ترک کر دینا شاعر کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔

ایک خاص بات جو پلاٹ کے تیار کرنے میں مدنظر ہونی چاہیے وہ جذبات کی ترجمانی ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے اساتذہ نے اس خاص امر پر زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا۔ وہ جذبات کی ترجمانی کرتے بھی ہیں تو اس طریقہ سے کہ بجائے ہیرو کی شخصیت قائم رکھنے کے اپنی شخصیت نمایاں کر دیتے ہیں اور اس کے منہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یا اس طرح کہ تمام قصہ فرضی اور غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ قصہ نفس الامر میں واقعی ہو یا غیر واقعی، غیر فطری اور خلافِ مقتضائے حال نہ ہونا چاہیے۔ اسکے لیے ضرورت ہے کہ شاعر یا نثار مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ جذباتِ انسانی کا خوگر رہا ہو۔

اس کا آرٹ یہ ہے کہ بے جان پتلوں میں یوں جان ڈال دے کہ چشم نظارہ کو چلتے پھرتے نظر آئیں اور قصہ پر واقعہ کا دھوکا ہونے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ قارئین کو اشخاص متعلق سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اخلاقی عنصر معدوم نہ ہو جائے اور جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر اخلاق کا پہلو بھی پیش نظر رہے۔ ضمنی کی قید اس لیے مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگر بالکل اڑا دی جائے گی تو اس ادبی تصنیف اور جعفر زٹلی کے کارنامہ میں کوئی مابہ الامتیاز نہ رہے گا اور اگر اخلاق کا عنصر زیادہ نمایاں رہا تو وہ کتاب اخلاق ناصری یا جلالی بن جائے گی۔

(ب) کیریکٹر۔ ہر قصہ میں کچھ کیریکٹر (اشخاص) ہوتے ہیں جن کی سیرت کی صحیح ترجمانی پر ادیب کے کمال کا دارومدار ہوتا ہے۔ خصوصاً قصہ کے ہیرو (فردِ مخصوص) تمام قصہ کی جان ہوتا ہے اور اسی کی شخصیت تمام واقعاتِ داستان کی محور ہوتی ہے۔

کیریکٹر دکھانے کے لیے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ضرورت ہے کہ ادیب کتاب فطرت کا مطالعہ کرنے والا ہو اور جو تصویر کھینچے وہ اس قدر اصلی، فطری اور صحیح ہو گویا اب بولنا چاہتی ہے۔

سیرت نگاری کا فن فارسی اور اردو میں اسوقت تک بہت ناقص ہے۔ جو تصاویر ہمارے مثنوی نویس شعرا نے کھینچی ہیں وہ چند پتلے ہیں جو اپنے تخیل کے زور سے انھوں نے بنا کر کھڑے کر دیے ہیں مگر جان دیکھو تو نام کو نہیں۔ مضمون کی طوالت اور وقت کی قلت کے سبب مجبور ہوں ورنہ ایسی بہت سی مثالیں جتنے کتابیں بھری پڑی ہیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا سکتی تھیں۔ غرضکہ سیرت نگاری میں اگر عمق اور ژرف بینی نہیں تو ادبی اور معنوی حیثیت سے اسکو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اسی سلسلہ میں اگر یہ عرض کر دیا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ سیرت نگاری میں جو نقائص عام طور

پر پائے جاتے ہیں وہ یا تو ادیب کی سطحی نظر کا قصور ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ فطرت و جذباتِ انسانی کے اعمال تک پہونچنے سے عاجز رہتا ہے یا کیرکٹر میں عدم اتحاد کا ہونا جسکی وجہ سے وہ ایک ہی شخص سے متضاد امور کے صدور کو ممکن ٹھہراتا ہے۔ مثلاً ایک عالی حوصلہ شخص جس نے حق و صداقت کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں کر دکھائی ہوں ایک موقع پر معمولی دباؤ یا لالچ سے متاثر ہو جائے۔ یا کیرکٹر کا احول سے مطابق نہ ہونا۔ یعنی ایسے جذبات کا اظہار جو کسی مخصوص کیرکٹر کی حیثیت یا زمان و مکان سے قطعاً بیگانہ ہوں۔ مثلاً ایک پست فطرت غلام کا بادشاہ سے حریفانہ برتاؤ کرنا۔ یا اب سے صدیوں پہلے عرب میں کسی شادی کا فوٹو کھینچنا اور اُس میں ہندوستانیوں الکہ ہندوؤں کی رسمیں دکھانا۔ غرضکہ یہ اور اسی قسم کے امور ہیں جن کا خیال رکھنا ایک افسانہ نویس کو لازم ہے۔

(ج) محاکات - ایک افسانہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ محاکات پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ اور کسی منظر یا واقعہ کے بیان کرنے میں ماہر ہو جس سے سننے یا پڑھنے والوں کی نگاہوں میں اُس کی تصویر کھنچ جائے۔ علامہ شبلی مرحوم نے بہت خوب لکھا ہے - ایک ماہر EXPERT. اور غیر ماہر LAYMAN. کے بیان یا محاکات میں ہمیشہ یہ فرق ہوگا کہ اول الذکر جس شے کی تعریف مقصود ہے اُس کے فنی محاسن یا نقائص ظاہر کرے گا۔ واقعۂ زیر بحث کی نسبت تمام ضروری اور کافی تفصیلات پیش کریگا اور متناقض یا خلاف قیاس بیانات سے احتراز کرے گا۔ اسکے برخلاف آخر الذکر عام اور مبہم یا سطحی و متناقض بیان سے کام لیگا۔ محاکات کے بارے میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ادیب انداز بیان میں ہمیشہ اختصار اور زور ملحوظ رکھے گا۔ اور خلافِ تہذیب امور کے ذکر سے حتی الامکان مجتنب رہیگا۔

قصہ مختصر یہ چند لوازمات ہیں جو ایک محاکاتیہ مثنوی یا افسانہ کے لیے ضروری ہیں۔ رزمیہ مثنوی میں چند اور خصوصیات کا ہونا بھی لازم ہے جنکی تفصیل ہم کسی دوسرے موقع کیلیے موقوف رکھتے ہیں۔

عشقیہ مثنوی کے خصائص | اب صرف یہ دیکھنا رہا کہ عشقیہ مثنوی کیلیے اور کیا اضافی خصوصیات ہیں جو اسکو عام افسانوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اسکے لیے مناسب ہوگا کہ ہم اول چند اقتباسات پیش کریں اور پھر اُنسے نتیجہ اخذ کریں۔ مثنوی اور خصوصاً عشقیہ مثنوی کے بادشاہ مولانا نظامی لیلی مجنوں میں فرماتے ہیں :-

آمد بدیار یار پویان　　　لبیک زنان و بیت گویان
چون کار دلش ز دست بگذشت　　　بر خرگہ یار مست بگذشت

بر رسم عرب نشستہ آں ماہ بر پشتہ زدہ شکنج خرگاہ

لیلیٰ چو فلک بہ پردہ داری مجنوں چو ستارہ در عماری

لیلیٰ گلہا دراز کردہ مجنوں گلہ نیز باز کردہ

لیلیٰ چو رباب دست بر سر مجنوں ز خروش چنگ در بر

لیلی نہ کہ صبح گیتی افروز مجنوں نہ کہ شمع خویشتن سوز

لیلی چمن خزاں ندیدہ مجنوں چمن خزاں رسیدہ

لیلی مے مشکبوے در دست مجنوں نہ ز مے نہ بوے مے مست

قانع شدہ ایں ازاں بہ بوئے واں راضی ازاں بجست وجوے

خسرو میں لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں :—

گفت ایں وچو سرو از جاے بر خاست جبیں را گرہ کرد و فرق را راست

بآں آئیں کہ خوباں را بود دست زنخداں می کشاد و زلف می بست

جمال خویش را در غمزو خارا بہ پوشیدن ہمی کرد آشکارا

گہے بر فرق تند آشفتہ می بود گرہ می بست و بر مہ مشک می سود

بہ زیور راست کردن دیر می شد کہ پالیش بہ سر شمشیر می شد

بہ چشمے ناز بے اندازہ می کرد بہ دیگر چشم عذرے تازہ می کرد

موقع پر شیریں خسرو سے یوں مخاطب ہے :—

ہنوزت در سر از شاہی غرور است دریغا کیں غرور از عشق دور است

ہنوزم ہندواں آتش پرستند ہنوزم دیدہا ترکان مستند

ہنوزم لب پر آب زندگانیست ہنوزم آب در جوے جوانیست

بدو تا بر کمانت ہم بجوں دست کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست

اشعار سے اشعار ذیل کا مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عشقیہ شاعری کی زبان ہی مختلف ہے۔

ہزاہز در آمد بہ دشت نبرد رزادو در آمد بمردان مرد

طرائے کہ از مطرقہ خاستہ زہاں رفت زیں طاق آراستہ

ازاں تیغ بر گشتہ جائے نبود کہ در غار او اژدہائے نبود

کند اژدہائے مسلسل شکنج دہن باز کردہ بتاراج گنج

عشقیہ مضامین میں علاوہ لطافت مضامین کے زبان کا لوچ اور شیرینی اس قدر بدیہی امور ہیں
جنکا انکار نہیں ہو سکتا - برخلاف اسکے رزمیہ شاعری میں زبان کا زور اور الفاظ کی شان وشکوہ اگر
مفقود ہوں تو وہ رزم نہیں بزم ہو جاتی ہے - ہزاہز - طراق - مطرقہ - اژدہا وغیرہ کا زور اس امر کا
شاہد ہے کہ مولانا اس نکتہ سے واقف تھے کہ موضوع بدلنے سے تصنیف کا انداز بدل جاتا ہے -
خود سکندر نامہ میں رزم اور بزم کی زبان مختلف ہے - نوشابہ کا دربار یا کنیزک چینی کی داستان
ہمارے دعوے کی دلیل ہیں -

زبان کی لطافت کے علاوہ غالبًا بحروں کے انتخاب کو بھی اس میں کافی دخل ہے -
میرا خیال ہے کہ اگر شیریں خسرو یا لیلیٰ مجنوں سکندر نامہ کی بحر میں لکھی جاتیں تو وہ تاثیر پیدا نہ ہوتی -
دوسری بات جو عشقیہ مضامین میں جان ڈالتی ہے اور طبیعتوں میں کیف پیدا کرتی ہے تشبیہ
اور استعارہ کی نزاکت اور رنگینی ہے - جیسا کہ اوپر کے اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا - رزمیہ اور
عشقیہ تصانیف میں اسی فرق مراتب کے ترک کر دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمارے ہمایون خواجو :
اکبرنامہ، تیمور نامہ، سلیمان نامہ، آئینہ سکندری خسرو، سکندر نامہ جامی میں رزم کے بدلے بزم کا
سماں نظر آتا ہے اور اسی لیے ان میں سے کسی کو شاہنامہ یا سکندر نامہ کے عشر عشیر بھی درجہ نہ ملا -
تمدن نے زبان اور خیالات کو اس قدر شیریں اور لطیف بنا دیا تھا کہ رزمیہ مضامین میں بھی بزم
کے تلازمے باندھنے لگے - پھر اثر ہوتا تو کیونکر - غرضکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عشقیہ مثنوی میں
زبان کا شیریں اور رنگین ہونا طرز بیان کا دلکش اور بدیع ہونا اور تشابیہ و استعارات کا لطیف
اور نازک ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ غزل میں - اور اگر یہ نکتہ نظر انداز کر دیا جائے تو شاعر
کا آرٹ ناقص اور نامکمل رہتا ہے -

قصہ نل دمن کی اصلیت

آمدم بر سر مطلب - اس تمہید کے بعد جس کی بابت ہم قارئین کرام
سے معذرت خواہ ہیں اصل مطلب شروع ہوتا ہے - یعنی فیضی
ان شرائط پر کس قدر پورا اترا - اور کس اعتبار سے ایک کامیاب مثنوی نویس کہلایا - مگر اس
سے پیشتر قصہ نل دمن کی اصلیت عرض کر دی جائے تو بیجا نہ ہوگا - اکبر کی خواہش تھی کہ خمسۂ نظامی
کا جواب لکھا جائے - یہ خدمت ملک الشعرا فیضی کو سپرد کی گئی - تجویز یہ تھی کہ مخزن اسرار کے
جواب میں مرکز ادوار - خسرو شیریں کے جواب میں سلیمان بلقیس - لیلیٰ مجنوں کے جواب میں
نل دمن - ہفت پیکر کے جواب میں ہفت کشور اور سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ تیار ہوں - مگر

زمانہ نے فرصت نہ دی اور صرف مرکز ادوار اور نل دمن تکمیل کو پہونچیں - نل دمن کا سنہ تصنیف ۱۰۰۳ھ ہے - جیسا کہ فیضی خود لکھتا ہے

سی و نہم از جلوس شاہی — تاریخ مجدد الٰہی
چوں سال عرب شمار کردم — الف و ... الف نگاہ کردم

اسوقت فیضی کی عمر اُنچاس برس کی تھی

اکنوں کہ چل و نہم دریں دیر — ہفتاد و دو شعبہ کردہ ام سیر

اس مثنوی میں چار ہزار سے کچھ زائد اشعار ہیں اور چار ماہ میں ختم ہوئی - بادشاہ کی طبیعت کا رجحا جیسا کچھ ہندو مذہب کی طرف تھا ظاہر ہے - اسی کا نتیجہ تھا کہ اُسکی نگاہ انتخاب سب سے پہلے ایک ہندو قصہ پر پڑی اور فیضی نے بھی اپنے آقا کے حکم کی تعمیل سے پہلے اسی کو تکمیل تک پہونچایا

گفت اے چمنت ز شبنم ما — جادو گر آتشیں دم ما
از دل شررے بدرم در افگن — آتش بہ نے قلم در افگن
در ہند ز عشق سرگذشتے است — جاں را بنداش باز گشتے ست
نو ساز فسانہ کہن را — عشق نل و خوبی دمن را

نل دمن سنسکرت کی مشہور رزمیہ کتاب مہا بھارت مصنفہ بیاس سے ماخوذ ہے جس میں نسوانی وفاداری دکھائی گئی ہے - اس تصنیف کی تاریخ مسیح علیہ السلام سے تقریباً چار سو سال قبل ہے - قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ نل فرماں روائے اجین غیر معلوم طور پر اپنے دل میں خار محبت کی خلش محسوس کرتا ہے - آخر ایک مصاحب دمن (دختر راجہ بیدر) کے زہد فریب جمال کا ذکر کرتا ہے اور نل عاشق ہو جاتا ہے - اُدھر دمن کے قلب میں بھی عشق کی لگن پیدا ہوتی ہے - باہم عاشقانہ خط و کتابت کا آغاز ہوتا ہے - آخر سوئمبر کی رسم قرار پاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے - اور یہ خوش نصیب عاشق و معشوق بخیر و خوبی اجین کو واپس آتے ہیں - مگر افسانہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا - بلکہ یہاں سے دور آزمائش شروع ہوتا ہے - نل کے دل و دماغ پر ایک روح مسلط ہو جاتی ہے جو قدرت کی طرف سے امتحان وفا کے لیے معین ہوئی ہے - جس کے اثر سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ شطرنج کھیلتا ہے اور بالآخر حکومت ہار جاتا ہے - اور جلا وطنی پر مجبور ہوتا ہے - دمن باوجود ممانعت مصیبت میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے - نل ایک موقع پر اپنی نازک اندام بیوی کو جنگل میں سوتا چھوڑ کر چل دیتا ہے - دمن بیدار ہو کر لق و دق صحرا میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار

پاتی ہے - اچانک ایک اژدہا اُس پر حملہ کرتا ہے مگر ایک شکاری کی مدد سے اُسکی جان بچتی ہے
شکاری موقع پاکر دمن کو اپنے دام تزویر میں پھانسنا چاہتا ہے مگر وہ وفا شعار اپنے شوہر
کے سوا دوسرے شخص کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی اور ہزار مشکل وہاں سے گرتی پڑتی
اپنے باپ کے قلمرو میں پہونچتی ہے - ادھر نل کو سانپ ڈستا ہے جسکی تاثیر سے اُسکا رنگ
سیاہ پڑ جاتا ہے - سانپ ایک مُہرہ اُسکو دیتا ہے اور راجہ رت پرن والی اجودھیا کے
پاس جانے کی ہدایت کرتا ہے - نل تعمیل کرتا ہے اور اجودھیا پہونچ کر راجہ مذکور کی سلک ملازمت
میں منسلک ہوتا ہے - دمن دُور دُور اُس کی تلاش میں آدمی روانہ کرتی ہے - بالآخر نل کا
سراغ لگا لیتی ہے - ایک فرضی سوئمبر کے انعقاد کا اعلان کیا جاتا ہے - راجہ رت پرن بھی شریک
ہوتا ہے اور اُس کے معیت میں نل بھی پہونچتا ہے - مُہرہ کی مدد سے نل اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے
دونوں عاشق و معشوق ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں - اور صدمہ ہجر مسرت وصال سے بدل جاتا
ہے - نل دمن کو لیکر اُجین واپس آتا ہے اور رت پرن سے قمار سیکھ کر اپنے بھائی کو ہراتا اور دوبارہ
حکومت حاصل کرتا ہے - آخر ایک عرصے تک حکومت کرنے کے بعد نل کی شمع حیات بجھ جاتی ہے
اور صداقت شعار دمن پروانہ وار اُس پر ستی ہو جاتی ہے -

مثنوی نل دمن کے محاسن

ہمیں نہایت سچائی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے کہ افسانہ کیلیے جو
شرائط جدید طریقۂ تنقید نے قرار دی ہیں اُن میں سے بعض فیضی کی
مثنوی میں مفقود یا غیر نمایاں ہیں - اسکا سبب یہ ہے کہ تنقید کا موجودہ معیار اُسوقت تک قائم نہیں
ہوا تھا - اُس زمانہ تک ایک افسانہ نگار (ناظم ہو یا ناثر) کے لیے یہ کافی تھا کہ کسی واقعہ کو
نازکخیالی اور بدیع الاسلوبی کے ساتھ تحریر کرے اور سامعین یا قارئین پر غم یا مسرت کی کیفیات
طاری کر دے - افسانہ نویسی اور سیرت نگاری کے موجودہ اصول ہمارے ایشیائی ادب میں
بالکل حال کی پیداوار ہیں -

اس کے علاوہ فیضی بحکم المامور معذور مجبور تھا کہ سنسکرت کے افسانہ کو حتی الامکان
بعینہ فارسی میں منتقل کر دے - اور تمام دور از کار روایات کو بلا تصرف جوں کا توں بیان کر دے -
معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اُسکو اس خدمت کے سرانجام دینے میں کچھ تامل ہوا جیسا کہ اسکے
اشعار سے مترشح ہوتا ہے -

از خواندنِ این فسانۂ راز کش خواند بمن فسانہ پرداز

مو بر تن من زبیم برخاست | دود ے ز دل دو نیم برخاست
کیں زور نہ کار بازو یم بود | ویں شاک نہ ہم ترازویم بود
رفت از کفم اختیار بیرون | کز حوصلہ بود کار بیرون
لیکن چکنم نداشت از بیم | بیچارہ دلم بغیر تسلیم
آں کو برضائے او قضا رفت | باید رہش از سر رضا رفت

مگر یہ خیال کرکے حیرت ہوتی ہے کہ ان مشکلات کے باوجود فیضی ایسی مثنوی لکھنے میں جسکو ادبیات فارسیہ کی اختراع فائق کہنا بیجا نہ ہوگا کیونکر کامیاب ہوگیا۔ شمس العلما آزاد دہلوی اس کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ سنسکرت اور فارسی میں معنی آفرینی کے جو انداز تھے دونوں سے واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں زبانوں کے نازک اسالیب کو باہم امتزاج دے کر اس نے ایک ایسا نمونۂ شعر پیش کیا جو سحر کی حد تک پہونچا ہوا ہے۔

بہرحال ذیل میں ہم مثنوی مذکور کے محاسن چند خصوصیات کے تحت میں دکھانے کی کوشش کریں گے اور فیضی کے کمال سخن پر حتی المقدور روشنی ڈالیں گے۔

پہلی خصوصیت۔ موضوع کی ترتیب اور کیرکٹر کی ترجمانی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا افسانہ نگاری کا موجودہ معیار اس زمانہ میں قائم نہیں ہوا تھا۔ علاوہ بریں مترجم کو اپنی طرف سے رد و بدل کا اور تصرف کا اختیار بھی نہ تھا اس لیے موضوع کی ترتیب اور کیرکٹر کے معاملہ میں فیضی بالکل مجبور تھا۔ اگرچہ مثنوی نلدمن لفظ بلفظ ترجمہ نہیں ہے اور نہ ہوسکتی تھی تاہم واقعات کو بعینہٖ نقل کردینا فیضی کا فرض تھا۔ اس نے دکھایا ہے کہ نل غیر معمولی طور پر اپنے دل میں عشق کی خلش محسوس کرتا ہے۔

ناگہ گل بخت نارس افتاد | در دیدۂ خواب او خس افتاد
گردش زدہ ملال برخاست | در خانہ دل خیال برخاست
دریافت بچشم خود غبارے | در سینہ نہفتہ خارخارے
آگہ نہ کہ گرد دامن کیست | ویں غنچہ زخار گلشن کیست
در جیب گلش کہ ایں خسک ریخت | در زخم دلش کہ ایں نمک ریخت
آتش کہ بسقف خانہ در زد | ویں فتنہ زد امن کہ سر زد

یا اس نے لکھا ہے کہ سانپ نل کو کاٹتا ہے اور بعد کو ایک مہرہ دیتا ہے جسکی مدد سے

وہ آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے - یہ اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں جنکو فیضی بحیثیت ایک مترجم کے نظرانداز کرنے کا مجاز نہ تھا -

اسی طرح کیریکٹر یا سیرت کے بیان کرنے میں بعض خامیاں پائی جاتی ہیں - مثلاً ایک موقع پر نل جو دمن کے نام پر جان دیتا تھا اُسکو تن تنہا لق و دق بیابان میں چھوڑکر نکل بھاگتا ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکا الزام اصل مصنف پر ہے نہ کہ فیضی پر - ممکن ہے کہ اسکے باوجود یہ سطور بالا بجائے محاسن کے فیضی کے معائب میں شمار کی جائیں - مگر نہیں - ہمارا دعویٰ ہے کہ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی فیضی ایک ادیب کے فرائض سے کس خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکا ہے - مثلاً - ہندوستان کی شاعری میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد معشوق - اور عورت ہی کی طرف سے اظہار عشق ہوتا ہے - ایک طرف تو یہ رسم و رواج کی آزادی ہے - دوسری طرف نسوانی حیا کی پابندی ہے جو سوز عشق کے باوجود اظہار سے مانع ہے - ان متضاد کیفیات کو ملحوظ رکھو اور پھر دمن کے خط کو پڑھو جو نل کے جواب میں لکھا گیا ہے - اول چند اشعار نل کے نامۂ شوق کے سُن لو - (یہ واضح رہے کہ پیام معاشقہ کی ابتدا مرد کی طرف سے کی ہے)

اے از بُتِ چیں ثبات بردہ　　　صد نقب بہ سومنات بردہ
جنّتیت بہ روزگار رِسنت　　　دیوانہ ام از بہار رِسنت
روے تو چمن بہ کار بُردہ　　　رنگ از رخِ نوبہار بُردہ
انداختہ ساقیم بہ محفل　　　در دار وِ بے ہُشی ہلاہل
بے وصل تو زندگانیم چیست　　　صد خندۂ مرگ بر چنیں زیست
دریاب کہ من ز دست رفتم　　　در پاے امید پست رفتم

اس کے جواب میں دمن لکھتی ہے - ایک ایک لفظ غور کرنے کے قابل ہے

از من بشنو کہ در چہ کارم　　　با درد و محنت چہ کار دارم
دل خفتہ بجون و دیدہ بیدار　　　من خانہ نشیں و دل بہ بازار
زنار بر بُتان عصرم　　　در باب کہ بے درست قصرم
بر من ز جہاں خروش برخاست　　　خلقے بہزار جوش برخاست
عشقت و جہاں جہاں ملامت　　　دیگر چہ من و کجا سلامت
از نالۂ عاشقانۂ من　　　حسرت کدہ ایست خانۂ من

من پردہ نشین و غم نشیمن | زندانِ بلاست خانۂ من
شاہی و دولت این آن چند | بر تخت حدیث عشق تا چند
تو بادہ بنوش آشکارا | خوں نابہ بعاشقاں گوارا

من پردہ نشین (الخ) کو پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ طنز و تعریض بنسوانی فطرت کا کس قدر سچا آئینہ ہے اسیرت (کیرکٹر) کے سلسلہ میں ایک خاص امر اور قابل گذارش ہے - وہ یہ کہ قصہ کا موضوع اور ماحصل عورت کی وفاداری دکھانا ہے اسی لیے فیضی نے ہر ہر قدم پر کیرکٹر کے اعتبار سے دمن (دمنیت) کا تفوق نل پر ثابت کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ دونوں دعوے محبت میں صادق ہیں اور دونوں اپنی قربانیوں سے اپنی صداقت کا ثبوت دے چکے ہیں - مگر یہ ماننا پڑے گا کہ دمن کی محبت کا پایہ بلند تر ہے - اسکی مشکلات اور مصائب پر غور کرو - وہ عورت ذات ہے. سوزِ عشق دل میں رکھتی ہے مگر پاس ضبط مانع اظہار ہے - وہ مصیبت میں اپنے شوہر کی رفاقت سے منہ نہیں موڑتی اور سخت سے سخت مشکل میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتی - تنہائی میں بھی نل کی یاد اُسکی مونس ہے - طرح طرح کی ترغیبات اُس کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں مگر وہ ہر ایک کو سراپا ے استحقار سے ٹھکرا دیتی ہے - نل کی تلاش اور خیال اُس کی روح کی غذا اور اُسکے قلب کی تسکین ہے - بالآخر وہ اپنے گوہر مقصود کو پالیتی ہے اور دونوں طالب و مطلوب ایک دوسرے کے وصال سے بہرہ ور ہوتے ہیں - آخر کچھ عرصہ بعد نل جہانِ فانی کو خیرباد کہتا ہے اور دمن بپکر اخلاص دمن اُسکی لاش پر ستی ہو جاتی ہے -

ان تمام واقعات میں اول سے آخر تک صاف نظر آرہا ہے کہ شاعر نے کس قدر کامیابی کے ساتھ دمن کے کیرکٹر کا تفوق پیش نظر رکھا ہے -

(۳) محاکات و ادائے جذبات - فیضی کی قوتِ محاکات کا یہ عالم ہے کہ گویا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے - روانی، صفائی اور زور میں اُس کا اندازِ بیان بے نظیر ہے - مگر عام ایرانی لٹریچر کی طرح (برخلاف ہندی کے) اُسکے محاکات تخیل سے لبریز، تصنع سے مملو، اور بیشتر مبہم ہوتی رہیں - ایک نقاد کا تلخ فرض ہے کہ شاعر کی ہر خصوصیت کی خوبیاں دکھانے کے ساتھ اُسکی خامیاں بھی واضح کر دے - لہذا ہمیں صاف کہنا چاہیے کہ اُسکی محاکات میں جزئی اور تفصیلی نقش و نگار کی تلاش بے سود ہے - اور یہ ایسا عیب ہے کہ اس میں فیضی ہی منفرد نہیں بلکہ ایران کے اکثر اساتذہ اُسکے شریکِ غالب ہیں -

محاکات کی تمثیل میں نل دمن کے ذیل کے اشعار جن میں عشق کی حقیقت بیان کی گئی ہے پڑھنے کے قابل ہیں

حرفِ شبِ عاشقاں درازست　　افسانۂ عشق جانگدازست
حُسن آمد و بر جہاں صلا زد　　عشق آمد و صد درِ بلا زد
عشق است سرِ سبو کشادہ　　معشوق پیالہ حُسن بادہ
ایں شعلہ بہند گرم خیزاست　　زینجاست کہ آفتاب تیزاست

مثنوی مذکور میں کئی جگہ عشق کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور داد نازک خیالی دی گئی ہے مگر حق یہ ہے کہ اسکو محاکات کے بجائے تخئیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک موقع پر نل سے ایک مصاحب حُسن دمن کی غائبانہ تعریف بیان کرتا ہے جو کسی قدر زیادہ صاف اور نیچرل ہے۔

رنگیں چمنے ست روزگارت　　گلہاست شگفتہ در بہارت
در خاکِ دکن کہ فتنہ خیزاست　　امروز دکانِ فتنہ تیزاست
جادو صنمے صنم فریبے　　نگذاشتہ در جہاں شکیبے
بتخانۂ ہند چشم مستش　　ہندی صنماں صنم پرستش
صد برہمنش بخوں نشستہ　　در بتکدہ بت بہ بت شکستہ
آتش زن سومنات قصرش　　زنار گسل بتانِ عصرش
صد شعبدہ جلوہ ریز راہش　　صد زلزلہ گرد جلوہ گاہش
شمشیر گرِ نگاہِ خونی　　سوہان زن آتشِ درونی
بر خندہ نمک پرات کردہ　　از سحر نمک نبات کردہ
محبوبۂ ملکِ ناشکیباں　　اعجوبۂ شہر دلفریباں
صد صندل تر بخونِ تازہ　　مالیدہ چو گُل بجائے غازہ
شاہنشہِ غمزہ فوج در فوج　　طوفان و کرشمہ موج در موج

دمن کے زاہد فریب حُسن کا موازنہ نل کے مردانہ حُسن سے کیجیے تو نہایت پُر لطف فرق نظر آئیگا۔

حُسنے و بہار دلفریبے　　عشقے و جہان ناشکیبے
سیمیں بت و بت پرست ماہے　　صد بتکدہ زیر ہر نگاہے
بالا چو سنانِ آب دادہ　　ابرو چو کمند تاب دادہ

ہم خیل سپاہ بیکرانش — ہم لشکرِ دل جہاں جہانش

نل جب وقت سوئمبر کی شرکت کے لیے روانہ ہوا ہے اُس کے موکبِ اجلال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

از خطِ اُجین تا بہ بیدر — انباشتہ شد بہ زر و گوہر
دریا دریا ز عنبرِ تر — صحرا صحرا بمشک اذفر
گلبوے عبیر پرنیاں سنج — پر وردہ بصد بہار نارنج
آں دشت کہ صد چمن رواں داشت — خرمن خرمن ززعفراں داشت
از صندل و عود بستہ بستہ — وز لبّد و لعل دستہ دستہ
اکسون و پرند زنگ در زنگ — سنجاب و سمور تنگ در تنگ
ناہید تناں بہ پردہ داری — بنشستہ بہ ہودجِ عماری
از خیمہ چمن چمن دراں دشت — کاندیشہ درو رود بہ گلگشت

اوپر کے اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا کہ فیضیؔ جب تخیل اور آورد سے علیحدہ ہو کر محاکات کا قصد کرتا ہے تو موقع کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اور یہی بیان کی خوبی اور محاکات کا آرٹ ہے جذبات کے بارے میں ہم بے تامل دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس میدان میں کبھی وہ ایران کے کسی اُستاد سے پیچھے نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ نل سب سے پہلے ایک ندیم سے دمن کے عالم سوز حسن کا ذکر سنتا ہے تو اُس پر کیا قیامت گذرتی ہے

اے ہمنفس ایں چہ داستاں بود — ویں گردہ کہ ام آستاں بود
گر یک گرہ مرا کشودی — چندیں گرہِ دگر فزودی
بر رغمِ دلِ بلاکشِ من — آتش چہ زدی بر آتشِ من
یاقوت ز دیدہ ام فشاندی — الماس بہ سینہ ام نشاندی
بر دیدہ درِ بلا کشادی — بر فتنہ صلاے عام دادی

دمن کی ماں اپنی پیاری بیٹی کو سمجھاتی ہے اور اُسکی آشفتگی کا سبب پوچھتی ہے

آں مادرِ مہرباں کہ دانی — بر خواند فسونِ مہربانی
کاے تازہ نہالِ نوبہاری — در سر ز تو چیست بیقراری
دیدی بہ رہے اگر پری را — در کار کنم فسونگری را

ہیں کہیں تصنع سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ماں کا بیٹی سے کہنا

آشفتہ چنیں چرا ست خویت　　　آشفتگی ایں نہ بس بہ بویت
چوں غنچہ مپیچ خویشتن را　　　تنگی بگذار پیرہن را

س کے برخلاف باپ کا بیٹی کی محبت کے باوجود پاس ناموس سے برہم ہونا مرد کی فطرت
ن کتنی صحیح تصویر ہے۔

کے واشتم ایں گماں کہ در گشت　　　از بام فلک بیفتدم طشت
اکنوں کہ فتاد شیشہ از طاق　　　زد طبل ملامت من آفاق
ہیہات زہے محال کامی　　　دیگر من و نام نیکنامی

امہ شبلی کا خیال ہے کہ خواجہ حافظ کی طرح فیضی کا کلام بھی سوز و گداز کے جذبات سے
سر خالی ہے۔ جو آخر الذکر کی علمی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ یہ خیال بہت زیادہ حد تک درست ہے۔
چہ فیضی نے کہیں کہیں یاس و غم اور ناپائداری عالم کے مضامین خوب باندھے ہیں مگر جو
ز اُس کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے وہ درد و غم نہیں بلکہ ولولہ اور رجائیت ہے جسکو
آگے چل کر عرض کریں گے۔

(۳) تخئیل کی رفعت اور تشبیہ و استعارہ کی لطافت۔ یہ منجملہ اُن خصائص کے ہے
ہیں فیضی نے ہند و عجم میں نام پایا اور کوس دارائی بجایا ہے۔ نہ صرف معاصرین بلکہ قدما
کم ایسے باکمال نکلیں گے جو تخئیل کی فراوانی اور تشبیہ و استعارہ کی رنگینی میں اُسکے ساتھ
سکے ہوں۔ حقیقت میں اگر اُسکی مثنوی میں اس کے سوا اور محاسن نہ ہوتے تو بھی صرف یہی
صیت اُسکے کلام کا کمال دکھانے اور اُس کے شعر کو سحر حلال قرار دینے کو کافی تھی۔ ذیل
ثالیں ملاحظہ ہوں

حمد میں انسان کی عاجزی اور معرفت الٰہی سے اُسکی کوتاہی پرانے خیالات ہیں۔ مگر فیضی
خوبی سے بیان کرتا ہے

توحید تو ہر کہ راند در قیل　　　بر مورچہ زد عماری فیل
پروانہ خس و ہوا شرربار　　　پرواز چہ گل کند دریں کار
ہیہات چگونہ سر کشد کس　　　دہ بر دم تیغ و پائے از خس
ہم پاشنہ ریش و ہم کف آماس　　　چوں پائے نہم بہ دشت الماس

بعض ملکوں میں دستور تھا کہ مسافر یا مجرم سرکاری کارندوں سے بچنے کے لیے اپنے گھوڑوں کے نعل اُلٹے لگاتے تھے تاکہ سراغ لگانے والے دھوکے میں پڑ جائیں۔ فیضی نے یہ خیال ظاہر کرنے کے لیے کہ کنہ الٰہی نے اپنے اسرار مخفی رکھنے کے غرض سے انسان کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے "نعل واژگونہ" کی تمثیل استعمال کی ہے۔ یقیناً یہ نادر تشبیہ اس کی قوتِ متخیلہ کا کمال پرواز ہے اور اس کی نظیر فارسی یا عربی شاعری میں عاجز کی نظر سے نہیں گذری

آں نقش کہ دانیش نمونہ — کنہش زدہ نعل واژگونہ

اسکے حقائق پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہم نے باری تعالیٰ کی ذات و صفات کی نسبت جو تخیلات باندھ رکھے ہیں وہ اصلاً کیا ہیں؟ کیا اُسکی صحیح حقیقت پر اُن سے روشنی پڑتی ہے۔ حاشا۔ بلکہ وہ ہمارے ذہن کے اختراعات ہیں۔ سبحانہٗ عما یصفون۔ ہم خدا کے عدل۔ رحم۔ علم۔ قدرت پر اعتماد رکھتے ہیں مگر اُس لامتناہی ذات کے لامتناہی صفات کا قیاس کرنے کے لیے مخلوق کی متناہی صفات سے مدد لیتے ہیں جن کا ہم کو تجربہ ہے۔ لیکن کیا اسکو صفات باری کا صحیح ادراک کہہ سکتے ہیں؟

ایک موقع پر علم ظاہر کے بیہودہ ہونے کی جو تمثیلیں اُس نے پیش کی ہیں ملاحظہ ہوں:-

آنکس کہ بجیت از کتابش — پیچیدہ ورق ورق حجابش

تو بردہ بخط گمان نفعے — واں خود ہمہ عقربست وافعے

اے سادہ زخط مباش غافل — کیں مورچہ خوردہ جوہرِ دل

آئینہ ز نقش سادہ باید — کاں سادہ عذار رو نماید

تشبیہات واستعارات کی رنگینی اور نزاکت کا اندازہ کرنے کے لیے وہ اشعار مکرر پڑھو جو دمن کے حسن کی تعریف میں اوپر گذرے۔ چند اشعار جن میں خاک ہند کی عشق خیزی بیان کی ہے سننے کے قابل ہیں

ایں شعلہ چراغِ ہر خسے نیست — ایں رشتہ بدست ہر کسے نیست

ایں بادہ مجو ز بزم ہر کس — کیں نشہ بہ ہند باشد و بس

ہند ست و ہزار عالمِ عشق — ہند ست و جہاں جہاں غمِ عشق

خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہرست — ہر ذرہ چراغِ نہ سپہرست

ہندی صنمانِ آتشیں خوے — آتش نفگناں بہر بنِ موے

زاں غمزہ کہ در خرام کردہ　　　صد زلزلہ فتنہ وام کردہ

(۴) جوشِ بیان اور رجائیت[1] - یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ جوش بیان اور سرمستیِ ادا میں فیضی کی نل دمن کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ امیر خسرو اور مولانا نظامی بھی برابری نہیں کر سکتے - اِن دونوں بزرگوں کے کمالِ فن کا جو منکر ہو وہ شاعری کے مذہب کی رو سے کافر - مگر بہ قول شخصے انصاف شیوہ ایست کہ بالاے طاعتست - لیلیٰ مجنوں نظامی اور مجنوں لیلیٰ خسرو کو پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ جوش بیان اُنکے یہاں ہے یا نہیں - علامہ شبلی مرحوم نے سچ کہا ہے کہ فیضی کا جوش بیان حافظ و عرفی سے برتر ہے - یہ واقعہ ہے کہ اسکے کلام میں سرمستی اور جوش بیان کا وہ زور ہے گویا دریا کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے - زیادہ تفصیل کے بجاے ہم تمثیل پر اکتفا کریں گے - جس موقع پر شاہی نقیب اس کی طلبی کے لیے آتا ہے اُس کے فخر و مسرت کی حد نہیں رہتی - جب اُسکو معلوم ہوتا ہے کہ سلطانی نوازشیں اُس کے حال پر مبذول ہیں وہ اپنا کلاہ گوشۂ افتخار کج کرتا ہے اور خوشی سے جامہ میں نہیں سماتا - کون سلطان - جو اُسکا مربی، محسن اور منعم ہی نہیں بلکہ اُسکی جان، مال، عزت ہر چیز کی حفاظت کا کفیل ہے - اُس کا مرجع امید اور مرکز تمنا ہے - ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ کیا کچھ جوش اور فخر کے جذبات سے شگفتہ نہ ہوگا - ملاحظہ ہو -

یعنی کہ نقیب بارگاہی　　　آورد نویدِ پادشاہی
برخیز کہ یاد کرد بخشت　　　شہ خواند بہ پائگاہِ تخشت
برخاستم از زمین فلک تاز　　　برخاستہ مو بمو بہ پرواز
پا از مژہ چوں برہ کشادم　　　بر ہر مژہ نقشے نہادم
چشمے کہ برہ گذار کردم　　　چشم دگرش نثار کردم

زیں در بگذشتہ پیش رفتم　　　وانجا نفسے ز خویش رفتم
بگذشتم ازیں درِ ادب نیز　　　کو نیں گذاشتہ بہ دہلیز
دیدم دو جہاں بیک جہاں در　　　صد عمر ابد بیک زماں در
پیوند ز مینیاں گسستم　　　نزدیک بہ آسماں نشستم
دل بود و جو دیدہ بارگی بود　　　ہر مو بہ تنم نظارگی بود

[1] رجائیت ——— optimism

گفت اے چمنت ز شبنمِ ما — جادو دگر آتشیں دمِ ما
از دل شررے بدم در افگن — آتش بہ نے قلم در افگن
نو ساز فسانۂ کہن را — عشقِ نل و خوبیِ دمن را

دربار میں حاضر ہونے کے جو کیفیت بیان کی ہے (زیں در گذشتہ الخ) اُسکا جوش محتاجِ تعریف نہیں
اسکے بعد کچھ فخریہ اشعار لکھے ہیں جنکی بلند آہنگی ایک ایک قدم پہ آسمان سے باتیں کرتی ہے :-

امروز نہ شاعرم حکیمم — دانندۂ حادث و قدیمم
کلکم بہ نقاط جزو کل بیں — یک نخل بعد ہزار گل بیں
سوگند بمنظرِ الٰہی — یعنے بجمالِ پادشاہی
کیں شیشہ نہادہ ام بر آں طاق — کانجا نہ رسید دستِ عشاق
گفتم سخنے دریں سخن نیست — کانجا کہ منم مقامِ من نیست
دریاب کہ از نظارۂ چند — بگداختہ ام شمارۂ چند

دوسرے موقع پر یہی لَے اور زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ سننے کے قابل ہے

شاہنشاہا خسرو پژوہا — دریا گہرا فلک شکوہا
بزمے ست جہاں بعیش پیوست — دورِ تو شراب و آسماں مست
من مطربِ سازِ پردہ خوانی — کلکم بنواے ارغنونی
زیں بزم کہ عشرتِ تو ساقی ست — گر من بروم ترانہ باقی ست
امروز بایں نواے چوں شہد — من باربدم تو خسروِ عہد
ترکیبِ طلسم خوانیم بیں — واں خدمتِ جاودانیم بیں
زیں پردہ کہ انسج آسماں یافت — بخت تو طرازِ جاوداں یافت
پیراستہ ام معانیِ بکر — در گنجۂ طبع و دہلیِ فکر
ایں کار منست و کار کس نیست — اندازۂ اختیار کس نیست
بگداختہ ام دل و زباں را — کیں نقش نمودہ ام جہاں را
ہم با امرا نظیر گشتم — ہم بر شعرا امیر گشتم
فخر الحکما خطِ جبینم — ختم الشعرا گلِ نگینم
طرزِ دگراں وداع کردم — طرزِ دگر اختراع کردم

اس کے فخریہ کے جواب میں مثنوی نشانی (مولانا احمد علی ہُنرکن دہلوی) کے چند فخریہ اشعار بھی پڑھیے اور انصاف کیجیے کجا فیضی کجا نشانی۔ مولانا کا زورِ قلم یقیناً مسلّم، مگر وہ جوش اور روانی کہاں؟

چند زنی لاف کہ در ساحری   ساحریم ساحریم ساحری
خسروِ ملکِ ہمہ دانی منم   حاکمِ اقلیمِ معانی منم
جوہری سلکِ سخن دانیم   صیرفیِ نقدِ سخن دانیم
دعوے اعجازِ معانی مکن   شمع تُرِ چرب زبانی مکن
خانہ کہ از نظم بیاراستی   آب و گلش از دگراں خواستی
گر خضری آبِ حیاتِ تو کو   ور شکری شاخِ نباتِ تو کو
ساحریم من کہ بہ نیرو فسوں   بیعتے از سحر بہ آرم بروں
غلغلہ در زہرۂ و ماہ افگنم   نسخۂ ہاروت بہ چاہ افگنم
ساحراں در گرہِ موے من   بابلیاں در چہِ جادوے من

فخریہ میں سرمستی اور رجائیت اور عشقیہ میں رنگینی اور لطافت لازمی ہیں اور ظاہر ہے کہ فیضی اس تفاوت کے نکتہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔

(۵) جدتِ اسلوب اور قدرتِ زباں۔ زورِ بیان اور روانی کلام کے علاوہ جن کی چند مثالیں اوپر گذریں۔ اُس کا پایہ جدتِ ادا اور حسنِ ترکیب وغیرہ کے اعتبار سے بھی اہلِ زبان سے کم نہیں۔ ایک بات کو متعدد، متنوع اور دلکش پیرایوں میں ادا کرنا اُس کے کلام کا مایۂ ناز وصف ہے۔ یہ بیان کرنا ہے کہ راجہ کے دل میں عشق کی خلش پیدا ہوتی ہے، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا باعث کیا ہے۔ اسکو اس طریقہ سے لکھتا ہے

آگہ نہ کہ گردِ دامن کیست   ویں غنچہ زخارِ گلشن کیست
در جیبِ گلش کہ ایں خسک ریخت   در زخمِ دلش کہ ایں نمک ریخت
آتش کہ بہ سقفِ خانہ در زد   ویں فتنہ ز دامن کہ سر زد
ایں صبر و شکیب خستۂ کیست   ویں شیشہ بر ہ شکستۂ کیست
ایں فتنہ بخونِ من کہ سر داد   ایں دارو بہشتی کہ در داد
ایں شعلہ ز آب و تشنۂ کیست   ایں دیدۂ خشک تشنۂ کیست

سن کا تبان عصر میں مناظر ہونا کس ندرت کے ساتھ ادا کیا ہے

آتش زن سومنات قصرش | زنار گسل بتانِ عصرش
صد بہ ہمنش بچوں نشستہ | در تبکدۂ بت بہ بت شکستہ

"عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود" کو کس کس طریقہ سے بیان کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

عاشق جرسے کہ بہ فغاں بست | معشوق ہماں جرس بجاں رفت
عاشق قدحے کہ در جگر زد | معشوق ہماں قدح بسر زد

یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بادشاہ کے قرب میں پہونچکر فخر و خوشی سے اپنے آپے میں نہ رہا۔ اسکا اسلوب ادا کس قدر نادر اور پرزور ہے

پیوند زمینیاں گسستم | نزدیک بہ آسماں نشستم

علاوہ بریں اُس نے بعض تراکیب جو اُس کی مخصوص تراکیب ہیں اس خوبی سے صرف کی ہیں جس سے اُس کی اُستادی اور قادرالکلامی کی بین شہادت ملتی ہے۔ شلاً

بہ مورچہ عماری فیل زدن۔ کوس بہ لب دوال زدن۔ شرگاں گسل۔ نظر گداز۔ اندیشہ زدائے پیش بیناں۔ ذرہ گل خیز۔ قطرہ لب ریز۔ شاہد اقدسی عمامہ۔ گرداب بسیں و موج اول۔ جاب قدم بساط افلاک۔ شعل نہ پیشگاہ اقرار۔ آتش زنِ دود مان انکار۔ مطلع اول سباعی۔ مصرع آخر رباعی۔ شمشیر گرِ نگاہ خونی۔ سوہان زنِ آتش درونی۔ آئینہ پرست خود پرستی۔ وغیرہ وغیرہ

(٦) فلسفہ و اخلاق۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ باوجود ایک متبحر فلسفی ہونے کے اُس نے مثنوی میں فلسفہ و اخلاق کا عنصر کم رکھا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اُس کی مثنوی میں بد اخلاقی کے مضامین ہیں (بلکہ سوائے ایک آدھ موقع کے نل دمن کا پیرایہ نہایت شایستہ اور مہذب ہی) مراد یہ ہے کہ اُس نے شاید عشقیہ مثنوی کو فلسفیانہ بحث کے لیے عمداً موزوں خیال نہیں کیا۔ پھر بھی جو کچھ لکھا ہے بہت غنیمت ہے۔ ایک درویش (سادھو) اس طرح راجہ نل کو نصیحت کرتا ہے

ملک تو عجب کشیدہ خوانیست | بر خوانِ تو خلق میہما نیست
از دادہ ایزدی بروں دہ | او داد فزوں تو ہم فزوں دہ
چوں کوس زنی ببام درگاہ | یاد آر ز نالۂ سحرگاہ
با غیر کن آں ترانہ سنجی | کز غیر چو بشنوی نہ رنجی

غور کرو "کز غیر چو بشنوی نہ رنجی" علم اخلاق کا کس قدر زریں اصول ہے۔ اور جیسا پیشتر صحیح تھا اب بھی صحیح ہے۔ فیضی ایک موقع پر عشق کی ماہیت اور فلسفہ بیان کرتے ہوے تصوف کی سرحد

تک پہونچ گیا ہے

این عشق مگو کہ در رگ و پوست　　راہیست نہفتہ تا در دوست
بے بانگ و صداست این چغانہ　　عشق ست کہ می زند ترانہ
عشقے بپذیر جاودانی　　کو ماند اگر تو خود نمانی

دوسرے موقع پر یہی رنگ ذرا زیادہ گہرا ہوگیا ہے

دریاب کہ عشق ترک ہستی ست　　نے شیوۂ کالبد پرستی ست
چوں دیدہ ز صورتِ تو بستم　　دستے ست کہ سنیت پرستم

مضمون زیادہ طویل ہوجائے گا اگر نل دمن کے تمام محاسن کی تفصیل اور دوسرے اساتذہ کی عشقیہ مثنویوں سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ صرف چند سطور لکھنے کے بعد ہم مضمون کو ختم کرتے اور اپنی لغزشوں اور مقالہ کی طوالت کے لیے حضرات قارئین سے معذرت خواہ ہوتے ہیں۔

نل دمن کے متعلق آخری فیصلہ

فارسی ادب میں مثنوی مذکور کا جو درجہ ہے اُس کا اب ہم آسانی سے اندازہ کرسکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اسکے متعلق البدایونی کا مندرجۂ عنوان ریمارک بالکل واقعیت پر مبنی ہے۔ البدایونی نے پوری جرأت سے کام لیکر فیضی کی سیرت اور اس کے عقائد اور عام کلام کی نسبت نہایت معاندانہ رائے ظاہر کی ہے مگر مثنوی کی بابت کمال صداقت سے مُلا کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ امیر خسرو کے بعد اس کا نظیر نہ ہوسکا۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداءُ۔ مولانا شبلی نعمانی ہندوستان میں فارسی شاعری کے صرف دو رُکن قرار دیتے ہیں خسرو اور فیضی۔ اور فیضی کو مثنوی کا استاد قرار دیتے ہیں۔ آزاد دہلوی کا فیصلہ اوپر آپ پڑھ چکے کہ وہ نل دمن کو فیضی کی شاہکار تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اہل عجم کی نا تواں بینی مشہور ہے۔ وہ ارض ہند کی بدولت خاک سے اکسیر بن جاتے ہیں مگر نہایت دیدہ دلیری اور محسن کُشی کے ساتھ اہل ہند ہی کو گالیاں سناتے ہیں۔ ہندوستان کے کمالوں کے کمال کا اقرار کرنا انکی توہین ہے۔ حد ہو گئی کہ خسرو جیسا خسرو ملک سخن بھی اُنکے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک کہتا ہے "خسرو ست وہیں دوازدہ بیت"۔ دوسرا کہتا ہے "خانۂ شعر نظامی تاراج کردۂ خسرو ست"۔ تیسرے فرماتے ہیں

کفش بو دزاں گونہ گوہر تہی　　زرش ساخت لیکن [illegible]

جب یہ حال ہو تو فیضی کیسے بچ سکتا تھا۔ واللہ داغستانی فیضی کے کمال سے تو انکار نہ کر سکا مگر اسد رے تعصب، اسکو اہل ایمان ہی کا فیض یافتہ قرار دیا۔ لکھتا ہے کہ چاشنی و عذوبتے کہ در کلام شیخ فیضی یافتہ می شود از فیض اثر صحبت خواجہ حسین ثنائی ست"۔ واضح رہے کہ یہ خواجہ حسین ثنائی وہی بزرگ ہیں جن کی بابت البدایونی کا قول ہے "عامی بے مادہ بود۔ عبارات ش وفا بانِ قصیدہا نیند اونمی کند۔ بماں مثل است کہ

خانہا شاں بلند و ہمت پست — یارب ایں ہر دو را برابر کن"

ظاہر ہے کہ اسکو پڑھنے کے بعد واله کے ریمارک کی کیا وقعت رہ جاتی ہے لیکن باغ میں جہاں خار ہیں وہاں گل بھی ہیں بعض منصف مزاج ناقدانِ عجم فیضی کے علو کمال اور قدرت کلام کے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ مقر ہیں۔ امین احمد رازی صاحب ہفت اقلیم لکھتے ہیں "فیضی عربیت و حکمت را بیشتر تتبع کردہ در انشا و انبساط طبع و مکارم اخلاق بے ہمتاست"۔ علی نقی کا قطعہ ملاحظہ ہو جسکا ایک شعر یہ ہے

نیم با او رسد در شاعری دعوائے ہم چشمی — کہ در ایں خانقاہم من مرید او ہست پیر من

صائب ایک غزل میں اُس کی تقلید کرتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت — در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

ان شہادتوں کے بعد فیضی اور اسکے کلام کی نسبت زیادہ کہنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

فبای حدیث بعدہ یومنون

ضیاء احمد البدایونی (ایم اے)

بہت بے اختیار اس بسمل ناشاد کا دل ہے — دم آنکھوں میں ہے اٹکا، حسرت دیدار قاتل ہے

نجاتِ اہلِ زنداں کو اگر تاثیر حاصل ہے — تو اک دن دیکھنا یہ سر ہے اور شمشیر قاتل ہے

فراقِ یار میں ملتی ہے لذت وصل جاناں کی — خیالِ دوست سے خلوت میں بھی آباد محفل ہے

قفس کو پھونک دے جس روز چاہے ایک نالہ میں — دلِ سوزاں کو اے صیاد یہ قدرت بھی حاصل ہے

اٹھیں گے داغِ حسرت لیکے ہم گلزار ہستی سے — یہی اک پھول اس گلشن سے لیجانے کے قابل ہے

توقع رحم کی بیجا ہے اے سید کہ مقتل میں
نگاہِ حسرت آگیں بھی ستم افزائے قاتل ہے

سید حسین بی اے (الک)

"میں اور میرا ایک رفیق کُتا"

(ترجمہ از ترجنیو)

ایک روز جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی باہر ہوا کے تند و تیز جھونکوں بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک نے ایک عجیب وحشت ناک منظر پیدا کر رکھا تھا - میں تنہا کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے قریب میرا رفیق کُتا ہے -

یہ بالکل میرے مقابل بیٹھا ہوا ٹکٹکی باندھے مجھے بغور دیکھ رہا ہے - میں خود بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں - ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ مجھ سے بولنے ہی چاہتا ہے - مگر آہ وہ بے زبان ہے - اظہار مطلب کے لیے اُسکے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں، وہ نافہم ہے مگر مجھے اُس کے احساسات کا کافی اندازہ ہے -

میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت میرے اور اُس کے دل میں ایک ہی قسم کے خیالات موجزن ہیں کہ " ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں - ہم دونوں ایک ہی چیز ہیں - اور ہم میں سے ہر ایک میں وہی ایک بھڑکتا ہوا شعلہ روشن ہے -

" موت اپنے وسیع بازو کی ایک ذرا سی جنبش سے ہمارا وجود درہم و برہم کر دیتی ہے س یہی ہمارا انتقام ہے" ....

اس کے بعد پھر بھلا کون تمیز کر سکتا ہے کہ ہمارے قلب کس نور سے منور تھے اور اسکے ں کون سا نور ضوفشاں تھا -

نہیں! نہیں ہم ایک دوسرے کو بحیثیت ایک انسان اور حیوانِ مطلق کے ہیں دیکھ رہے ہیں - .... بلکہ یہ آنکھیں دو ہم رتبہ اور مساوی لوگوں کی ھیں ہیں - یہی وہ آنکھیں ہیں جنھوں نے ایک دوسرے کو آپس میں بالکل ملا دیا ہے - رہر دو حیوان مطلق اور انسان کی زندگی حالتِ خوف میں ایک دوسرے ے بالکل مخلوط ہو جاتی ہے" .....

حکیم الدین علوی

قدیم اُردو شاعری کے لطائف

قدیم شاعری میں بہتیرے ایسے محاورات دیکھنے میں آتے ہیں جو آجکل صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہیں۔ اُس زمانہ کی شاعری میں ہندی کے الفاظ اور محاورات بہت مروّج تھے آج کل وہ کان کو انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ایک لغت میں بہتیرے ایسے محاورات دیکھے۔ یہ لغت اُردو سے انگریزی کا ہے۔ ۱۸۱۵ء کا مطبوعہ ہے اور شکسپیر کا مرتبہ ہے۔ اس میں صرف اُردو کے تقریباً ۸۰۰۰۰ الفاظ ہیں۔ اور جابجا اشعار بھی مندرج ہیں۔ زیادہ تر میر تقی کے اشعار نقل ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں میر سے لوگوں کو کتنی عقیدت تھی۔ مندرجۂ ذیل اشعار قابل تذکرہ ہیں:—

(۱) لفظ سانگ کا استعمال

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
رات تھوڑی ہے اور بہت ہو سانگ (میر)

(۲) شاخسانے

شاخسانے ہزار نکلیں گے
جو گیا اُسکی زلف کا یکتار (〃)

(۳) شاخِ زعفران

نازِ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے
ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے (〃)

(۴) عقل کو عشق ہونا:—

عشق اُنکی عقل کو ہے جو ما سوا ہمارے
ناچیز جانتے ہیں ہبود جانتے ہیں (〃)

(۵) گھر ہونا:—

دُنیا کی نہ کر تو خواہشگاری
اس سے کبھی بہرہ ور نہ ہوگا
اے خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا (〃)

(۶) لالے پڑنا:—

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے (〃)

(۷) لفظ "لپکا" کا استعمال:—

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا (〃)

---

(۸) منہ دکھانا :۔

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا (میر)

(۹) منہ سے پھول جھڑنا :

گالیاں دے کے اب بگڑتے ہیں واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں (〃)

(۱۰) ہوتا رہے گا :۔

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا (〃)

(۱۱) تجنیس خطی :۔

یہ نہ ہو دریا کہ جس سے گزریے پُل باندھ کر موجِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پُل (سودا)

(۱۲) سہرنا :۔

گیا جو پوس پہونچا ماگھ سر پہ لگے جاڑا بدن او دے سہر کر (نامعلوم)

(۱۳) طوطی سے ہونٹھ ل ڈالنا :۔

بولا نکر اے یار تو ہر اک سے بگڑ کر ل ڈالے گا طوطی سے کوئی ہونٹھ پکڑ کر (نامعلوم)

(۱۴) طوفان ہونا :۔

اشکِ گلگوں جیب و داماں پہ مرے غلطاں ہیں
اس زمانے کے تو لڑکے بھی کوئی طوفاں ہیں (ہدایت)

(۱۵) تجھ رُو :۔

تجھ رُو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں (اشرف علی خان فغاں)

(۱۶) کریاں میں غلیلا لگانا :۔

بیٹھے اگر خوشی سے آ کر چمن میں بلبل کریاں میں غلیلا ایسا لگے کہ اُڑ جائے (سجاد)

(۱۷) گھر بیٹھنا :۔

جس سمت کو تو نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا مانندِ حباب گھر کے گھر بیٹھ گئے (میر درد)

(۱۸) پائیں بھی پانوں :۔

یہ تو پوچھیں لال بجھکڑ اور نہ بوجھے کوئے
پائیں چکی باندھ کر مت ہرنا کودا ہوئے (نامعلوم)

(۱۹) دانت نکالنا :۔ (مستزاد)

میں سوز عبث دیکھ کے حیراں ہو گا　　خوباں کا جمال

دل زلف میں اُلجھے گا پریشاں ہوگا　　مت لے یہ وبال

یہ چال بُری ہے تجھ سے نبھنے کی نہیں　　آ، مان کہا

کیا ہنستا ہے تو بہت پشیماں ہو گا　　مت دانت نکال

(۱) موج مارنا :-

سیلِ سرشک اپنا جب سر بموج مارے　　طوفانِ نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے (محمد بقا)

(۱) میں خوش مرا خدا خوش :-

گر ناخوشی سے میرے ہوتا ہے جی ترا خوش

جس میں تری خوشی ہو، میں خوش مرا خدا خوش (نامعلوم)

(۲) نام دھرنا اور "ناشاعر" :-

کبھی بولیں عقیق اور گہ نگینِ لعل ٹھہراویں　　یہ ناشاعر ترے ہونٹوں کو کیا کیا نام دھرتے ہیں (نامعلوم)

(۲) ہاتھ اُٹھا :-

ہاتھ اُٹھا ظلم اور جفا سے تو　　یہی گویا سلام ہے تیرا (یکرنگ)

(۲) دل پر ہاتھ کا دھرا رہنا اور "سو" کا استعمال :-

چاہو چھپاؤ دستِ حنابستہ سے یہ دل　　ایسا سو دل کسی کا دھرا ہاتھ پہ نہیں (تپش)

(۲) منہ لے کے رہ جانا :-

دیکھا جو اُسکے چشم و دہن کو تو شرم سے　　منہ لیکے اپنا پستہ و بادام رہ گئے (نامعلوم)

(۲) لفظ ہار بمعنی والا

بہار آئی، نہ دیکھن ہار آیا　　انار آیا، نہ چاکھن ہار آیا (〃)

قاضی محمد فرید

صاحب مضمون نے انتخاب میں کافی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی اور اُن الفاظ، ترکیبوں اور محاوروں کی مثالیں بھی لکھدیں جو اب بھی رائج ہیں اور صحیح مانے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں نقل بھی مطابق اصل نہیں معلوم ہوتی ہے ممکن ہے کہ خود شاعر سے سہو ہوا ہو یا شیکسپیئر صاحب کو صحیح شعر نہ ملا ہو۔　　اڈیٹر

سر سید احمد خاں مرحوم

(سید سجاد حیدر یلدرم بی اے علیگ)

(۱)

دُور دل سے اب خیالِ زحمت و آلام کر — کوثر و تسنیم سے شیریں وہاں کا کام کر
واسطہ اللہ کا اس وقت اتنا کام کر — جانشینوں کو ذرا تفہیم کر افہام کر
خوب محنت کر چکا آرام کر آرام کر

(۲)

مشکلوں کا ہم پہ گر باران ہے تو تجھکو کیا — قالبِ قومی اگر بے جان ہے تو تجھکو کیا
ایک عالم ششدر و حیران ہے تو تجھکو کیا — خانہ جنگی کا اگر سامان ہے تو تجھکو کیا
گر قیامت ہو یہاں برپا تو تجھکو کیا خبر

(۳)

ب مسلمانوں میں ایسا درد والا کون ہے — طلعتِ اسلام کا شیدا و والا کون ہے
بتری کا جس نے ایسا ڈھنگ ڈالا کون ہے — اپنے سر پہ بارکایوں لینے والا کون ہے
کون ہے جو دے دعا دشنام دیں اُسکو اگر

(۴)

ہمتیں تجھ پہ کہ تو اب کام اپنا کر چکا — کام اپنا کر چکا اور نام اپنا کر چکا
پنے ہمعصروں سے اونچا بام اپنا کر چکا — کلفتیں بھی سب سہیں آرام اپنا کر چکا
تیری روحِ پاک پہ ہو حق کی رحمت کا گذر

۔ مارچ ۲۶ء

(مرسلہ) مشیر احمد علوی
بی اے (علیگ)

نظم سرسید کی برسی کے موقع پر علیگڈھ میں پڑھی گئی تھی۔ اڈیٹر

مُسلِم یونیورسٹی کی حالتِ زار

(سلسلۂ ماہ گذشتہ)

صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کی جن بدنظمیوں پر توجہ دلائی ہے اُن میں اساتذہ کی کونسلوں میں شرکت کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ الناظر بابت فروری و مارچ کے صفحات ۷۷، لغایت ۸۰ میں صاحبزادہ صاحب کے طولانی بیان کا خلاصہ درج کیا جاچکا ہے۔ جس سے حسب ذیل امور منکشف ہوتے ہیں

(۱) ۲۳ء کے انتخابات میں ڈاکٹر ضیاءالدین و ڈاکٹر کریم حیدر لودی علی الترتیب صوبہ کی کونسل اور اسمبلی کے رُکن منتخب ہوے۔ تین سال میں اُنکی غیرحاضری سے یونیورسٹی کے کام میں ہرج واقع ہوا۔ حتیٰ کہ شعبۂ اقتصادیات جس کے ڈاکٹر حیدر معلم اعلیٰ تھے، اُس کے نتائج خراب رہے اور بیرونی ممتحنین نے شکایت کی۔

(۲) ۲۶ء کے انتخاب میں شرکت کے لیے جب ڈاکٹر حیدر اور مسٹر حبیب نے اجازت طلب کی تو صاحبزادہ صاحب نے ہرجِ کار ہی کی بنیاد پر اختلاف کیا، مگر ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کی مخالفت اور اساتذہ کی کثرتِ رائے سے ان اصحاب کو اجازت دے دی گئی۔

(۳) مسٹر حبیب اپنے انتخاب کی جدوجہد کے لیے اکتوبر اور نومبر کے دو مہینوں میں برابر اپنے کام سے غیرحاضر رہے۔

(۴) اس دو ماہ کے عرصہ میں مسٹر حبیب نے اتفاقی اور رعایتی رخصتیں بھی حاصل کیں جن کے وہ ازروے قواعد مستحق ہو سکتے تھے، اور کچھ زمانہ ایسی غیرحاضری میں بھی بسر کیا جو بالکل خلاف قاعدہ تھی۔

(۵) رخصت حاصل کرنے اور بے رخصت غیرحاضر رہنے کے سلسلہ میں جو بیقاعدگیاں مسٹر حبیب نے کیں اُنپر اکزیکٹیو کونسل نے قواعد کے بموجب کارروائی نہیں کی۔

• نوٹ۔ اکزیکٹیو کونسل کے ضوابط کا باب نہم فقرہ ۱۳ (فروری و مارچ کے الناظر میں صفحہ سطر ۲ پر ۱۳ کے بجاے ۳۸ غلط چھپا ہے) جسکا حوالہ صاحبزادہ صاحب نے دیا ہے حسب ذیل ہے

"اگر یونیورسٹی کا کوئی افسر یا ملازم دانستہ اپنے کام سے غیر حاضر ہو اور وقت معینہ پر اپنے فرائض کو حاضر ہو کر انجام نہ دے تو متصور ہوگا کہ اس نے بغیر اطلاع دیے اپنی جگہ سے استعفا دیدیا۔"

اور باب یازدہم کے فقرہ جات ۳۰ - ۳۲ (جنکا حوالہ صاحبزادہ صاحب نے دیا ہے) میں سے فقرہ ۳۲ حسب ذیل ہے:-

"اگر کوئی افسر یا ملازم اپنی رخصت کے ختم ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر اپنے کام پر نہ لوٹے تو یہ تصور کیا جائے گا کہ اس نے اپنی جگہ خالی کر دی۔ اور یونیورسٹی کی ملازمت سے علٰحدہ ہو جائے گا بشرطیکہ اپنی غیر حاضری کے مناسب وجوہ بیان کر کے اکزیکیٹو کونسل کا اطمینان نہ کر دے۔"

صاحبزادہ صاحب نے جو کچھ اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے اُن میں دو باتیں اور اضافہ کی جا سکتی ہیں:-

(۱) ڈاکٹر کریم حیدر لودی، اسمبلی کے رُکن منتخب ہونے کے بعد ایک سرکاری کمیشن کے رکن منتخب ہو گئے ہیں جسکی وجہ سے یونیورسٹی سے ایک مدت تک غیر حاضر رہیں گے۔

(۲) یونیورسٹی کے اساتذہ جب کسی انتخاب میں شریک ہوتے ہیں تو اپنی انتخابی دوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے یونیورسٹی کے طلبہ کو اضلاع میں کام کرنے کے لیے لے جاتے ہیں - جس کے باعث اُنکی تعلیم میں ہرج واقع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی جوابی رپورٹ میں ڈاکٹر لودی یا مسٹر حبیب کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا - جس کے صاف معنے یہ نکلتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس صاحبزادہ صاحب کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ہے - اور ظاہر ہے کہ واقعات کا بطلان وہ کیسے کر سکتے ہیں - بہر ایں ہمہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مبحث پر بالکل خامہ فرسائی نہ فرماتے - چنانچہ انھوں نے اس فصیح و بلیغ جملہ سے اپنا جواب شروع فرمایا ہے کہ

"بد قسمتی سے صاحبزادہ صاحب اس امر کو پسند نہیں کرتے کہ عملۂ تعلیمی کا کوئی رکن قوم، ملک یا حکومت کی خدمت انجام دیکر اپنا رُتبہ بڑھائے یا امتیاز حاصل کرے۔"

اسکے بعد اساتذہ کا یہ مطمح نظر ظاہر کیا ہے کہ

"بے شبہہ وہ اپنے تئیں اس درس گاہ کو کامیابی سے چلانے کا ذمہ دار جانتے ہیں

مگر ساتھ ہی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ تمام حصص ملک کے مسلمانوں کے تعلیمی و دیگر امور میں عملی حصہ لیں۔" (ایضاً)

پھر کورٹ کی دسمبر ۲۳ء کی اس تجویز کو درج کر کے جسکی رو سے یونیورسٹی کا کوئی ملازم ایگزیکیٹو کونسل کی اجازت کے بغیر کونسل یا اسمبلی وغیرہ کے انتخاب میں شرکت نہیں کرسکتا، ایگزیکیٹو کونسل منعقدہ ۵۔ جولائی ۲۶ء کی ایک تجویز نقل فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن افسروں کو انتخابات میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے اُنھیں عام رخصتوں کے علاوہ ۵ یوم کی رخصت خاص بغیر تنخواہ کے پانے کا حق ہوگا اور اگر وہ پانچ یوم سے زیادہ رخصت چاہیں تو ۳۵ یوم تک کا اضافہ منظور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنا قائمقام دیں جسکا تقرر اُنھیں کے صرف سے ۲۵۰ ماہوار پر کیا جائے گا اور اُس صورت میں یہ ۳۵ یوم کی رخصت با تنخواہ ملے گی۔

اور آخر میں ۲۴۔ دسمبر ۲۶ء کے کورٹ کے جلسہ کی یہ کارروائی بیان فرمائی ہے کہ جب منشی سید نثار حسین کی تحریک اور مولوی حبیب اللہ خاں کی تائید سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ آئندہ سے کسی معلم کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ تو ۴۰ میں سے صرف ۳ اصحاب نے اس تجویز کی موافقت کی ۔ جس سے ڈاکٹر صاحب اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرنا چاہتے ہیں کہ کورٹ کی اکثریت اُنکی ہم نوا اور صاحبزادہ صاحب کی رائے کی مخالف ہے۔

غریب صاحبزادہ صاحب نے کب یہ دعویٰ کیا تھا کہ کورٹ یا کونسل کی اکثریت اُنکی ہمنوا ہے۔ وہ تو خود اسی کے شاکی ہیں کہ قوم کے نمائندوں یعنی کورٹ کے اراکین نے جس شخص کو وائس چانسلر مقرر کیا، جس کا درجہ یونیورسٹی کے قانون کے بموجب چانسلر اور پرو چانسلر کے بعد رکھا گیا ہے اور جسے بجا طور پر یونیورسٹی کے نظم و نسق کا سب سے زیادہ ذمہ دار سمجھا جاتا ہے وہ یونیورسٹی کے ایک تنخواہ پانے والے افسر کے مقابلہ میں، محض اس سبب سے کہ کورٹ اور کونسل کے اندر اسکو اکثریت حاصل رہتی ہے، عضو معطل بنا ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ خود صاحبزادہ صاحب کے اندر ایسے عیوب موجود ہوں جنکے باعث وہ یونیورسٹی کے اربابِ کار کا استحادِ عمل حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہوں لیکن جو حالات ابتک سامنے آئے ہیں اُن سے تو اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ صاف

نایاں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جو اقتدار حاصل ہو گیا ہے اُس کی وجہ سے قطعاً ناممکن تھا کہ
صاحبزادہ صاحب اپنے فرائض کو دیانت و ایمانداری کے ساتھ انجام دے سکتے۔

واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں، کہ اگر حالات میں مناسب تبدیلی نہ ہوئی تو آیندہ
رف وہی اصحاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو سکیں گے جو ڈاکٹر صاحب کی رضا جوئی
د، یونیورسٹی کے قانون اور طلبا کے مفادِ تعلیمی پر مقدم سمجھیں۔ اور غالباً اس ضرورت کو
یسے ہی بزرگ زیادہ خوبی کے ساتھ پورا کر سکیں گے جو اس عہدہ کے لیے باعث عزت نہ ہوں
لکہ جن کے لیے یہ عہدہ موجب عزت افزائی ہو جائے۔ کونسل میں اساتذہ کی شرکت سے،
یا اُنکے مرتبہ و عزت میں خواہ کتنا ہی اضافہ ہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انتخابات
، زمانہ میں جو شدید انہماک ہوتا ہے اُس سے اور اُسکے بعد مسلسل کونسل کے جلسوں میں
ثرکت کرنے کی غرض سے جس قدر توجہ اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے اُس سے یونیورسٹی
ے تعلیمی کام کو ضرور نقصان پہونچتا ہے۔

لیکن اگر بفرض محال ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے صائب مان لی جائے کہ کونسلوں میں
لم یونیورسٹی کے اساتذہ کی شرکت مفید اور ضروری ہے، تب بھی یہ بات تو بہر حال کسی طرح
ندیدہ نہیں ہو سکتی کہ اساتذہ بالکل مطلق العنان چھوڑ دیے جائیں، جب چاہیں کام کریں
رجب چاہیں گھر بیٹھ رہیں۔ مسٹر حبیب، یونیورسٹی میں جیسا اچھا کام کر رہے تھے، اگر
کٹر صاحب کی رائے میں کونسل کے اندر رہ کر وہ اس سے بھی زیادہ یونیورسٹی کے
لیے مفید ہو سکتے تھے تو اُنکو چاہیے تھا کہ شروع ہی سے اُنکو دو ماہ یا زائد کی رخصت
تنخواہ کے دلا دیتے بلکہ انتخابات کے مصارف کے لیے کچھ رقم بطور انعام یا امداد کے بھی
ور کرا دیتے۔ لیکن یہ تو صریح ہٹ دھرمی اور ناانصافی ہے کہ مسٹر حبیب یونیورسٹی کے
ن اور عام ضابطہ اخلاق کو پامال کریں اور یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جنھیں ڈسپلن
نابطہ کا مجسمہ ہونا چاہیے، یہی نہیں کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں بلکہ جب وائس چانسلر کی
یب پر معاملہ کونسل کے سامنے پیش ہو تو خود ہی اُنکی پردہ پوشی کرنا چاہیں۔

جس درسگاہ کا سب سے اعلیٰ تعلیمی افسر قانون اور ضابطہ سے اس قدر بے پروا
وہاں کسی دوسرے افسر یا طالب علم سے ضابطہ و قانون کی پابندی کی توقع ہی فضول
۔ اور یہی صاحبزادہ صاحب کی اصلی شکایت ہے۔

مسٹر حبیب کے معاملہ سے بھی زیادہ سنگین مولوی مقتدیٰ خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی
پریس کا واقعہ ہے۔ اور اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے جواب میں اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا ہے
مگر یہ بات یقیناً مسلم یونیورسٹی کی اگزکیٹیو کونسل یا پرو وائس چانسلر کے لیے لائق ستائش نہیں
کہی جا سکتی کہ یونیورسٹی کا ایک ملازم اُس کے سب سے بڑے عہدہ دار کے خلاف علانیہ
بغاوت کرے اور یونیورسٹی کی با اختیار جماعت اُسے سزا دیے بغیر چھوڑ دے۔
اور خواہ عالیجناب نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب اور جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب
اسے تسلیم نہ کریں لیکن عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ مولوی مقتدیٰ خاں شروانی کو ہرگز
صاحبزادہ صاحب کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کی جرأت نہ ہوتی اگر یونیورسٹی کے ایسے بڑے
بڑے اور ذمہ دار اصحاب اُن کی پشت پناہی کے لیے موجود نہ ہوتے۔

دسمبر ۲۶ء میں اگزکیٹیو کونسل نے قرار دیا تھا کہ
"چونکہ اس معاملہ میں چند ایسی باتیں ہیں جن کی توضیح کی ضرورت ہے اس لیے
یہ معاملہ کونسل کے آیندہ اجلاس تک بغرض مزید تجویز ملتوی کیا جاتا ہے۔"

۲۷ء کے اندر غالباً اس وقت تک متعدد جلسے اگزکیٹیو کونسل کے ہو چکے ہیں کیا ڈاکٹر صاحب
یا عالیجناب وائس چانسلر صاحب حال ازراہ کرم مطلع فرمائیں گے کہ اس وقت تک اس بارہ
میں کیا کارروائی ہوئی؟ جہاں تک دریافت سے ہمیں معلوم ہوا ہے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔
اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ گذشتہ دسمبر میں جو کچھ قرار دیا گیا تھا اُس کی غایت محض دفع الوقتی
تھی، تاکہ صاحبزادہ صاحب کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد یہ معاملہ قطعاً نظر انداز
کر دیا جائے۔

یونیورسٹی کی تعلیمی حالت کی ابتری اور عام طور پر قوانین کی پابندی نہ کرنے کی جو شکایات
صاحبزادہ صاحب نے کی ہیں اُن پر تبصرہ کرنے کے لیے یونیورسٹی کے اندرونی حالات سے
زیادہ گہری واقفیت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ امر بھی لازمی ہے کہ یونیورسٹی کے ہر قسم کے
کاغذات پر پورا دسترس حاصل ہو اور اس امر کا اعتراف کر لینے کے بعد کہ ہمیں اس قسم کے
مواقع حاصل نہیں ہم اس ضروری حصہ پر تبصرہ کرنے کی جسارت نہ کریں گے۔ اور اب تو یہ خبر
اخبارات میں شایع ہو چکی ہے کہ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے بحیثیت مسلم یونیورسٹی کی

چانسلر ہونے کے ایک تحقیقاتی کمیشن کا تقرر کیا ہے جو بمبئی کے مشہور رہنما سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں امید ہے کہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے گا۔ اس لیے فی الاصل کسی تبصرہ کی حاجت بھی باقی نہیں رہی۔

باایں ہمہ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُن تمام امور میں جن کا ذکر اب تک کیا گیا صاحبزادہ صاحب کے بیانات صحیح ماننے کے قابل اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات سرتاسر ابلہ فریبیوں سے لبریز ہیں۔ اُسی طرح یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ یونیورسٹی کے تعلیمی نظم و نسق سے متعلق جو کچھ صاحبزادہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ بھی صداقت سے خالی نہ ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب بے شبہ ہماری قوم میں بحیثیت ایک ماہر تعلیم ہونے کے ایک خاص امتیازی حالت رکھتے ہیں لیکن علی گڈھ کالج کے ایک سابق طالب علم کے بقول جو اب ایک سرکاری محکمہ کے ممتاز عہدہ دار ہیں، حالات ایسے نازک اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ قوم کو ڈاکٹر صاحب اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان ایک فیصلہ کن انتخاب کرنا ہوگا۔ مسلم یونیورسٹی کو اگر ایسی حالت پر لانا ہے کہ وہ اس معیار کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی خدمت انجام دے جو گذشتہ پچاس سال سے برابر مسلمانوں کے پیش نظر رہا ہے اور جسے سر سید احمد خاں سے لیکر آج تک تمام مسلمان قومی رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار مسلمانوں کے روبرو پیش کرتے رہے ہیں تو یونیورسٹی کو ڈاکٹر صاحب کے پنجۂ اقتدار سے نکال کر ایسے ہاتھوں میں دینا پڑے گا جو اس نصب العین کے مطابق کام کر سکتے ہوں، اور اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی رائے میں ڈاکٹر صاحب کا وجود یونیورسٹی کے لیے ہر نہج میں ناگذیر ہے تو بس اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ کر مسلم یونیورسٹی کی فاتحہ خوانی کر دینا چاہیے۔

آخر میں ہم کو یہ بھی عرض کر دینا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے بھی قوم کے ساتھ عدہ درجہ بے اعتنائی برتی۔ اُن کا فرض تھا کہ اپنی سہ سالہ میعادِ خدمت کے خاتمہ پر نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے یونیورسٹی کے تمام حالات سے نہ صرف کورٹ کے اراکین کو بلکہ ساری قوم کو مطلع کرتے تاکہ اب سے بہت پہلے یونیورسٹی کی ابتر و زبوں حالت پر توجہ کی جاتی اور یونیورسٹی کے قانون میں جس تبدیلی کی حاجت وہ محسوس فرماتے تھے اس میں ترمیم کرانے کے لیے بھی قاعدہ جد و جہد عمل میں آتی۔

ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف

غالباً ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرہٹی انسائکلو پیڈیا میں حضور سرورکائنات صلعم کی ذات اقدس پر بے بنیاد اعتراضات کیے گئے تھے، جس پر مسلم پریس نے بہت کافی لے دے کی تھی اور بالآخر اڈیٹر انسائکلو پیڈیا کو معافی مانگنا پڑی تھی۔ انھیں اعتراضات کے جواب میں پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے نے "سیرۃ رسول اللہؐ" کے نام سے ایک مکمل کتاب لکھنا شروع کی ہے بمقام شکر ہے کہ اس کتاب کے تقریباً ۱۳ جزو لکھے جا چکے ہیں۔ ابھی تک "غزوۂ بنو نضیر" تک کتاب لکھی گئی ہے۔ غزوات نبوی اور فلسفۂ جنگ کے عنوان سے اس کا ایک ٹکڑا جولائی کے معارف میں شایع ہوا ہے۔ انشاءاللہ کتاب دورحاضرہ کی مغربی و مشرقی جملہ معلومات سے مکمل ہوگی۔ ہم بھی مدیر معارف کے ہم نوا ہوکر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ "اُردو" سے زیادہ ضرورت اس کتاب کی انگریزی میں ہے، اور چونکہ پروفیسر صاحب اسکے اہل ہیں، اس لیے اگر یہ امید کی جائے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کریں گے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ امید ہے کہ پروفیسر صاحب قوم کی ان توقعات کو ضرور پورا کریں گے۔ صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں جنگ کے فلسفہ پر بہت لطیف بحث کی ہے - اسی سلسلہ میں گذشتہ انبیاء اور ملل کی جنگوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ قبل اس کے کہ غزوات پر بحث کی جاتی مسئلۂ جنگ کو جس حیثیت سے وہ مختلف اقوام و مذاہب میں سمجھا جاتا ہے مجملاً بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے - ایک جگہ لکھتے ہیں :-

> ..... حکماے یونان نے مسئلہ جنگ کو علم النفس کی روشنی میں دکھلایا، انسان میں جبلّی قوتِ غضبی جب حدِ اعتدال کو پہونچے تب فضیلت شجاعت حاصل ہوتی ہے ورنہ حدِ افراط یعنی تہور اور حدِ تفریط یعنی جبن دونوں مذموم ہیں - یہی حال تمام صفاتِ حسنہ کا ہے، اس لیے عدالت جامع فضائل ہے - اور یہی معیار ہے - افلاطون اپنی کتاب قوانین میں کہتا ہے کہ حاکم عادل کا فرض اولیں یہ ہے کہ ملک وملت کو صلح آشتی سے آباد کرے اور صرف ضرورت کے وقت جنگ میں مشغول ہو - لیکن جب معاملہ وحشی اقوام سے پڑے تو عدل کے قوانین پر عمل دشوار ہوجاتا ہے - ارسطو اپنی کتاب سیاست مدن میں کہتا ہے کہ حفاظت ملت بڑی فرض ہے - افزائش ملت جنگ

کے ذریعہ سے روا ہے۔ بشرطیکہ جائز طریقہ سے ہو۔ ایسی اقوام جن کی طینت میں محکومی ہے انپر استیلا روا ہے تاکہ امن وامان قائم رہے۔ ارسطو کا یہ آخر الذکر قول جو اسکندر کی حرصِ فتوحات کے لیے ایک دستاویز تھا، دولتِ روما اور بعد کو اُسکے جانشینوں یعنی موجودہ یورپین سلطنتوں کی ہوس ملک گیری اور اقوام عالم کو اپنا محکوم بنانے کے لیے ایک بہانہ ہوگیا ہے جسکے نتائج نہایت خوفناک ہیں۔"

ہمایوں | ہمایوں کے جولائی نمبر میں منشی محمد حامد خاں دہلوی نے ایک دلچسپ مضمون بدویت وحضریت کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کسی پیشہ کا ہو دونوں حالتوں میں سے ایک نہ ایک حالت وہ ضرور اختیار کرے گا۔ لیکن فی زمانہ عجیب دلچسپی ہے کہ ہم نے دونوں حالتیں اختیار کرلی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"...... عہدِ عتیق میں دورِ حاضرہ کے خلاف حضریت شاذونادر اور بدویت عام تھی شاید اس وجہ سے کہ انسان میں اور اک پیدا ہوتے ہی دیگر ضروریات کے احساس کے علاوہ عمدہ اور خوشگوار مقامات کی تلاش بھی لابد ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بنی آدم کی زندگی کے چار مدارج ہیں۔ صیادی - راعیت - زراعت اور حکومت۔ صیادی - جب بنی آدم کا مسکن غار اور گذر چوپایوں کے شکار پر تھی جن کے گوشت سے شکم پروری اور چرم سے تن پوشی ہوتی تھی اُسوقت بھی انکو اکثر جگہوں یا خانہ بدوش کی صورت میں بدویت اختیار کرنی پڑتی ہوگی ...... راعیت - یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ سب سے پہلے کس نے گھوڑے کو زیر اور جانوروں کو رام کیا۔ بلا شبہہ حضرت انسان اس اپنے ارادہ میں خوب کامیاب ہوئے۔ صحرائی اور خونخوار زندگی سے گزر کر شائستہ پیشہ گلہ بانیت اختیار کرنا واقعی انسان کے طرزِ معاشرت اور خیالات میں انقلابِ عظیم کا ثبوت ہے۔ اس تغیر کے ساتھ ہی قبضۂ ملک کے احساس نے بھی ضرور ترقی شروع کی ہوگی ...... زراعت کاشتکاری کے بغیر حضریت حاصل نہیں ہوتی ...... کاشتکاری سے تمدن، حکومت اور تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو کاشتکار کی جھونپڑی ہی سے ریاست کی ابتدا ہے ... قانونِ قدرت کا تقاضہ ہے کہ جب انسان اس درجہ پر پہونچتا ہے تو اپنے ہمسایوں کے ساتھ جو اسی طرح آباد ہوگئے تھے بحالتِ مخالفت جنگ سے پیش آتا ہے۔ ورنہ بصورتِ اتحاد باہمی تجارت کو فروغ دیتا ہے۔ یہی آغاز سلطنت کا ہے جو ملکی تدابیر و مصالح جارجہ کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ حکومت یا شاہی ...... اعلیٰ ترین درجہ شہروں کا بنانا اور شہروں میں آباد ہونا ہے۔ جب کثیر التعداد اور ہم قوم بنی آدم ایک مخصوص مقام پر مکانات تعمیر کرکے آباد ہوجاتے ہیں تو وہ مقام شہر یا قصبہ کہلاتا ہے۔ محافظت کی غرض سے

---

(۱) اس اقتباس میں جگہ جگہ عبارات حذف کردی گئی ہیں مگر نقل میں علامت حذف ہوگئی۔ ایڈیٹر

اسکے گرداگرد مستحکم دیوار تعمیر کرتے ہیں۔ جو شہر پناہ یا فصیل کے نام سے منسوب ہوتی ہے ...... اگر غور کیا جائے تو ہر قوم کی ابتدا اور اسکے تمدن کا آغاز مندرجہ بالا صورتوں کے سوا اور کسی صورت سے نہیں ہوا ......"

نیرنگ خیال کا جولائی نمبر "تحفۂ تیاتر" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ پروفیسر مولانا محمد علم الدین صاحب سالک بی اے نے اس میں فارسی ڈراما پر ایک بے مثل مضمون لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی ڈراما کب شروع ہوا؟ اسکا سنگ بنیاد کیونکر رکھا گیا؟ اس کے متعلق ادبائے اروپا نے مجمل خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سر مالکم نے اس ڈراما کے متعلق ایران کی تاریخ میں نہایت حیرت و استعجاب سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ایک جگہ پروفیسر علم الدین تحریر فرماتے ہیں کہ

"...... ایسے قصے اور "مقامات" ایرانی ڈرامہ کی ابتدائی داغ بیل ہیں اور انھیں پر موجودہ ڈراما نگاری کی نقش آرائیاں ہو رہی ہیں۔ ایران میں آجکل بھی دو قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ ایک وہ ڈرامے جن کا تعلق مذہبی وارفتگی اور جوش سے ہے، دوسرے وہ ڈرامے جو تفنن طبع کے لیے کھیلے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے ڈراموں کو "تعزیہ" اور دوسری کو "تماشہ" کہتے ہیں۔ "تماشہ" کے ممثل عام طور پر بازاری لوگ رند، اوباش اور دنیا بھر کے بھکڑے ہوتے ہیں۔ ایرانی ان کو لوطی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انھیں اپنے فن میں اس قدر مہارت حاصل ہوتی ہے کہ جس وقت وہ اسٹیج پر آکر اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں تو حاضرین مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ "تماشا" کی زبان ادبی نقطۂ نظر سے بالکل عامیانہ ہوتی ہے۔ اس میں بازاریت اور ابتذال کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا دور از انصاف نہ ہوگا کہ ایرانی "تماشا" کامڈی (تمثیل بہجت) کی ادنیٰ ترین مثال ہے۔ "تعزیہ" مذہبی جوش و ولولہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں اصلیت و واقعیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے اور روحوں کو اٹھاتا (۹) ہے چونکہ ایرانیوں کے قومی ہیرو (بطل) امام الشہدین ہیں اس لیے جو انس و محبت اور عقیدت اہلبیت سے ہے وہ کسی اور رشتے سے نہیں .... وہ واقعات کربلا کو ڈرامائی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ "ممثلین تعزیہ" خاص الخاص افراد ہوتے ہیں۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد اور ان کے بچے مذہبی جوش اور عقیدت کی بنا پر اس ڈراما میں شامل ہوتے ہیں ...... تمثیل تعزیہ یوماً فیوماً ایران میں ترقی کر رہی ہے اسکی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اکثر تمثیلوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو رہا ہے ...... مشہور و معروف فلسفی اور مستشرق

ارنسٹ رینن "تعزیہ" پر بحث کرتا ہوا ایک جگہ لکھتا ہے کہ اگر شکسپیر ان ڈراموں کو پڑھ لیتا تو وہ بھی مسحور ہوجاتا ..... وہ چیزیں جو انکے (ایرانیوں کے) خیال میں خامیوں سے پُر اور لغزشوں سے لبریز ہیں ہمارے لیے اہل مغرب کی تصنع آفرینیوں اور فنی قیود سے پابند ادبی کارناموں سے ہزار درجہ بہتر ہیں "

مخزن مخزن کے جولائی نمبر میں ڈاکٹر سڈلر کا طبی مضمون ہے جس میں انھوں نے بیخوابی اور اسکے سات اسباب لکھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شب کو بیخوابی کی وجہ سے جو تکان محسوس ہوتا ہے اُسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ بیخوابی ہوتی ہے بلکہ وہ پریشانی کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ بے خوابی کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے اور اُسی پریشانی کے باعث تکان محسوس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے حسب ذیل (۷) اسباب عام بے خوابی کے لکھے ہیں (۱) خون کا دباؤ (ضعیف آدمیوں کے جگر سے بہت زور سے خون نکلتا ہے اور رگوں میں گرتا ہے جیسے بلندی سے پتھر یعنی ضعیفوں کے خون کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے) (۲) تشکیل امراض مثلاً دمہ، سر پہ رسولی نکلنا (۳) وہ حالتیں جن میں کسی زہر نے جسمانی نظام پہ اثر کیا ہو، گھیگا وغیرہ (۴) پُرخوری یا بے وقت کا کھانا (۵) دماغ کا تکان (۶) اعصاب کی کمزوری (۷) پریشان رہنا، ڈر، خوف وغیرہ۔ آخر میں فاضل ڈاکٹر نے اسکا علاج بھی لکھا ہے کہ

"نیند جسم کے ستانے کا دوسرا نام ہے۔ جسم کو اُسوقت تک آرام نہیں پہونچ سکتا جب تک دماغ کو آرام نہ میسر ہو۔ سوچنا بند کردو تو سو جاؤگے۔ لہذا بیخوابی کے تین علاج یہ ہوسکتے ہیں (۱) دماغی آرام (۲) جسمانی آرام (۳) اکتا دینے والی آوازیں ..... دماغ کو الجھنوں سے پاک کرو۔ دماغ کی یہ "پاکیزگی" جسم کو مدد دیتی ہے اور تم سو جاتے ہو"

قاسم القاسم ایک ماہوار علمی و دینی رسالہ ہے جو مرکز العلوم الاسلامیہ جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند کا نقیب ہے اسکے محرم نمبر میں مولانا حسین احمد صاحب معلم حدیث کا مضمون "معراج و سائنس" ہے جو مسلسل شایع ہوتا رہے گا۔ مضمون بہت عمدہ ہے۔ ایک جگہ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ

"عرب کے باشندے کہانت کو تسلیم کرتے تھے جن کا حصول جنات سے ہوتا تھا۔ جنات کی تیزی اور تند حرکت کے ماننے میں ان کو پس و پیش بھی نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ملائکہ اور فرشتوں کی تیز اور قوی حرکت کا ان کو اقرار تھا اور یہی وجہ تھی کہ باوجود

انکار نہ کیا کہ بہت جلد بارگاہِ خداوندی سے فرشتہ وحی لے آتا ہے۔ یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ فرشتہ میں یہ قوت نہیں کہ چشم زدن میں آسمانوں کے اوپر سے کوئی چیز لا سکے۔ اور نہ فرشتوں کے وجود کا اُنکو انکار تھا۔ اس سے اُنکو سوچنا چاہیے تھا کہ جبکہ جنات و فرشتوں وغیرہ میں اس قدر قوت ہے کہ آناً فاناً میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں تو اگر روحِ نبوی میں اس قدر قوت تھی جو کہ آناً فاناً میں اس جسم کو لیکر آسمانوں اور اُن کے اوپر تک پہونچ جائے یا جسمِ نبوی نے روح و جسم کی مجاورت کی وجہ سے روحانی خفت ایسی پیدا کر لی ہو کہ آناً فاناً میں روح کے ساتھ اُڑتی چلی جائے یا کسی قوی فرشتہ نے آنحضرت صلعم کی روحانی اور جسمانی برداشت کی اور آپ کو اپنی قوت سے ایک منٹ میں کہیں سے کہیں اُٹھا کر پہونچا دیا تو کیا استبعاد ہے اور کون سا امر محال شمار کیا جاتا ہے؟"

تنظیم ڈاکٹر کچلو کے مخلص رفیق جناب قریشی نے ہفتہ وار اخبار تنظیم کے ساتھ چند ماہ سے اسی نام کا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ہے جسکے جولائی نمبر میں مولانا داؤد صاحب غزنوی مدیر "توحید" نے "اسلام اور سرمایہ داری" پر ایک دلچسپ مضمون تحریر کیا ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"سرمایہ داری کا یہ دیو بڑی بڑی حکومتوں ہی کی شکل میں نظر نہیں آتا بلکہ غلام قوموں میں بھی بڑی سرمایہ دار قوم چھوٹی سرمایہ دار قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے، اور چھوٹی سرمایہ دار قوم اپنے غریبوں کو ذلت و نامرادی کے گڑھے میں پھینکنا چاہتی ہے۔ اور یہی وہ مفاسد ہیں جن کے باعث اسلام نے سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے، اسکو بدترین معصیت ٹھہرایا ہے۔ اور اسکی کثرت و عمومیت کو وجہ فساد ٹھہرایا ہے ...... اسلام دنیا کے لیے ایک پیغامِ امن اور مکمل نظامِ عمل ہے۔ اسلام کا مقصد دنیا میں خدائی حکومت کا قائم کرنا اور اس کی ماتحتی میں ایک ایسی انسانی برادری کی تشکیل ہے جسکی زندگی کا مقصد مخلوقِ خدا کی بے غرضانہ خدمت، قربانی، ایثار، اخوت اور عام مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ پس ہر وہ چیز جس میں خود غرضی، بے رحمی، سنگدلانہ بے اعتنائی ہو گی، جس میں انسانی اخوت کے بجائے تعبد اور غلامی کو دخل ہوگا اسلام کے نزدیک اس قابل ہے کہ وہ مٹا دی جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کا امن و راحت دن بہ دن مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے، اور انسانی دماغ رات دن ایسے آلات کی تیاری میں مصروف ہیں، جن سے انسانوں کو قتل کرنے اور دوسری اقوام کو غلامی کے دائرہ میں لانے میں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو، اور انسانی اخوت کے بجائے تعبد اور غلامی کا راستہ

صاف ہو لیکن آپ جانتے ہیں ان تمام بدیوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ سرمایہ داری (کیپٹل ازم) - پس اسلام نے "دولت" اور "سرمایہ داری" سے پیدا ہونیوالے مفاسد کے انسداد کے لیے زکوٰۃ فرض کردی "تاکہ ایک طرف مال کی محبت اور بخل و امساک امرا کے اخلاق کو مغلوب نہ کرسکے - اور دوسری طرف غربا کی جماعت کو اپنے دولتمند اور سرمایہ داروں سے اُنس و محبت ہو..... اسلام نے "سود" کو اسی لیے حرام کیا ہے"

زمانہ

ہز اکسلنسی سر ولیم سنکلر میرس کے - سی - ایس - آئی گورنر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے ہندوستانی اکاڈمی کے افتتاح کے موقع پر ۲۹ - مارچ ۱۹۲۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں جو پُر مغز تقریر کی تھی اُس کا ترجمہ زمانہ جولائی نمبر میں شایع کیا گیا ہے - یوں تو ساری تقریر کارآمد اور مفید مشوروں سے لبریز ہے لیکن چند مقامات خاص طور پر اس قابل ہیں کہ بہی خواہان اُردو اُن پر غور فرمائیں، اس لیے یہاں منتخب کیے جاتے ہیں

(۱) ..... سخت محنت اور کوشش سے زبان کے قواعد منضبط کیے جائیں زبان سے بھرتی کے الفاظ دُور کیے جائیں اور زبان کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھ کر اس قابل بنایا جائے کہ علوم و فنون کی تالیف اور انکے ترجموں میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

(۲) ..... میں جانتا ہوں کہ اگر کتاب زیادہ تعداد میں فروخت کرنا منظور ہے تو اسکی قیمت کم رکھنا ہوگی - لیکن کفایت کا لحاظ رکھتے ہوے جہاں تک ممکن ہو عمدہ کاغذ اور عمدہ طباعت کا انتظام بھی ضروری ہے اور اگر تصاویر کی ضرورت ہو تو عمدہ تصویریں بھی ہونا چاہییں -

(۳) سب سے بہتر ناول وہ ہوتے ہیں جو "معمولی" انسان کے متعلق ہوتے ہیں

(۴) ابھی تک کسی نے ہندوستانی مذاق کے موافق ناول نہیں لکھے -

(۵) ..... کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اصلی اور سیدھے سادھے افسانے نہ لکھے جائیں. اور انھیں لوگ نہ پڑھیں - لیکن ان افسانوں میں جو واقعات لکھے جائیں وہ ایسے ہوں جنکا تعلق ملکی معاشرت سے ہو - یہ میدان فسانہ نگاری کے لیے بہت وسیع ہے - فطرت سے جنگ کرنا اس ملک میں اتنا ہی ضروری ہے جتنا امریکہ کے مغربی اضلاع میں تھا علوم کے حاصل کرنے اور روزی کمانے میں یہاں اتنی ہی جد و جہد کرنا پڑتی ہے جتنی اسکاٹ لینڈ کے طالبعلموں کو عرصہ تک کرنا پڑی تھی - ہندوستانی ادب میں اتنی گنجایش ہے کہ وہ مذہبی افسانے پیش کرسکے - پیدایش، حیات، ممات، شادی و غمی کے

اردو رسائل کے خاص مضامین

(جولائی سنہ ۱۹۲۷ء)

زمانہ - کانپور

۱- ہندوستانی اکاڈمی کے مقاصد
۲- بھاشا کے نورتن

معارف - اعظم گڈھ

۱- غزوات نبوی اور فلسفۂ جنگ
۲- ہندوستان کی معاشی حالت پر کمپنی کا اثر
۳- ابن رشد کی تصنیفات

جامعہ - دہلی

۱- آسمانی بجلی
۲- ترکی میں جدید تمدنی تحریک

القاسم - دیوبند

۱- تعلیمات اسلام
۲- معراج اور سائنس

مرقع - لکھنؤ

۱- زبان اردو میں مختصر قصص و افسانے
۲- [illegible]

مخزن - لاہور

۱- بیخوابی اور اُس کے اسباب
۲- زندگی کا سانس (افسانہ)

ہمایوں - لاہور

۱- بدویت و حضریت
۲- خوناب مسرت
۳- انجام عیش

نیرنگ خیال - لاہور

۱- رتناولی (ڈراما)
۲- لیلائے وطن (ڈراما)
۳- فارسی ڈراما -

تنظیم - امرتسر

۱- اسلام و سرمایہ داری

کیف - اجمیر

۱- ہمایوں کی ناکامی کے اسباب
۲- بدگمانی (افسانہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد میں اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟

ہمارے اُردو لٹریچر کے اربعہ عناصر یعنی شبلی، حالی، نذیر احمد اور مولانا آزاد کا نام
ی آسمان شہرت پر آفتاب بنکر چمکا ہے، جنکے خامۂ جادو نگار کی دایہ نے دربار
ہجہانی کی اس ننھی سی چھوکری کو مدتوں کی جانفشانیوں کے بعد پال پال کر اس لائق
یا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ بہنوں کے پاس جہاں کبھی نہیں بیٹھ سکتی تھی، اب چار چار
یں ملانے لگی ہے، ورنہ ایک وقت تھا کہ اردو کا دائرہ اسقدر تنگ اور غیر وسیع تھا
یاری گمنامی کے ظلمات میں جا پڑی تھی، علوم و فنون کا اس کے یہاں بہت کم
رتھا، ادبی تاریخی اور فلسفیانہ حیثیت سے بالکل کوری تھی، البتہ اس کے مربیوں کے
یں شعرا کا نام تھا جو اسے عالم خیال کی سیر کراتے مگر واقعات کے میدان سے
ی دور لئے پھرتے تھے، مگر للہ الحمد کہ ایک مدت کے بعد ان بزرگوں (شبلی حالی
حمد اور آزاد) کے سہارے پر گمنامی کے عالمگیر تاریکی سے اس نے جو سر نکالا تو
تاب شہرت کی شعاعیں اسپر عکس فگن تھیں، اس سماں کو دیکھکر اپنی اس عالم
پر انکی ذرہ نوازیوں کو یاد کرکے بزبان حال وہ بول اٹھی،

شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را"۔

لیکن اتفاق سے ان دنوں بعض علمی حلقوں میں یہ سوال گشت لگا رہا ہے

ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز ان چاروں بزرگوں میں سے کون ہے، سو خاکسار کا اس باب میں نتیجہ فکر یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز محمد حسین آزاد ہے، اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے آگے چلکر ہم اس کو بخوبی ثابت کریں گے، مگر اول اول ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انشا پردازی کا اطلاق کن کن اشیاء پر ہوتا ہے، انشا پردازی اعلےٰ درجہ کی لٹریری قابلیت کا نام ہے جسکو فصاحت اور بلاغت کے بیمثل پیرایہ میں اس طرح ادا کیا جائے کہ اگر کسی واقعہ یا تخیل کی تصویر کھینچنی منظور ہو تو اس کی زندہ تصویر کا سماں آنکھوں کے روبرو پھر جائے، فصاحت سے یہ مطلب ہے کہ الفاظ ثقیل بھدے اور غیر مانوس نہوں اور قواعد صرفی کے روسے صحیح ہوں، اور روزمرہ اور محاورہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے[1]، بلاغت اسے کہتے ہیں کہ کلام فصیح مقتضائے حال کے مناسب ہو، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خوشی اور فرحت کا موقع ہو تو سرور و انبساط کی روح پھونکی جائے، اگر غم و الم کی داستان بیان کرنی ہو تو رنج و مصیبت کی تصویر کھینچی جائے، مگر اکثر مواقع ایسے آپڑتے ہیں کہ جہاں کلام کا نشتر دلپر اسی وقت کھٹکتا ہے جبکہ اسکو گوناگوں طریقہ سے تشبیہ، استعارے اور ضرب الامثال کے قالب میں ڈھال دیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر تصویر اور تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت کچھ انہی کی بدولت ہے[2]، بشرطیکہ اسمیں اعتدال ہو ورنہ اصل مضمون خاک میں ملجائیگا اور فسانہ عجائب اور منیجر قصہ کے مضامین کی طرح مقصود مبالغہ کے کانٹوں میں الجھکر رہجائیگا، اسکی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ مثلاً کوئی اپنے بیٹے کے مرجانے پر بجائے یہ کہنے کے کہ "میرا عزیز بیٹا مرگیا" یوں کہے کہ "میری آنکھ پھوٹ گئی" یا "میرا اگل مرجھا کر

[1] دیکھو موازنہ انیس دبیر صفحہ ۲، تعریف فصاحت [2] موازنہ انیس دبیر صفحہ ۵

خاک پر گر گیا" تو مضمون کہاں سے کہاں تک بلند ہو جاتا ہے،
اسی طرح ضرب الامثال اور تشبیہات بھی لڑیچر کی روح خیال کیجاتی ہیں جیسے
"دلی دور است، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، چھوٹا منہ بڑی بات" وہ جملے ہیں
جن سے بڑے سے بڑے مضمون کو باتوں باتوں میں ادا کر سکتے ہیں، کبھی معشوق کیلیے
گل، زلف کے لیے بنفشہ، آنکھ کے لیے نرگس، قاصد کے لیے باد سحر، لاکر کلام کو
بہت بلیغ بنا دیتے ہیں، اسی طرح کلیجہ پر سانپ لوٹنا، ہوا سے باتیں کرنا، آسماں سے
زمیں پنوانا، وہ جملے ہیں جو کلام کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں، غرضیکہ
یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر بعض اوقات انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا
خلاصہ یہ کہ انشا پردازی کے لیے حسب ذیل چیزیں ازبس لازمی ہیں"

(۱) کلام کا فصیح ہونا، یعنی عیوب ثلاثہ سے پاک صاف ہونا، اگر اس کے
ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورات بھی ہوں تو کلام کی فصاحت اور بڑھ جائیگی، کیونکہ
یہ چیزیں اسکا ایک فرد خاص ہیں،۔

(۲) کلام کا بلیغ ہونا، اور اس کے لئے مناسب موقع پر تشبیہ استعارہ اور
ضرب الامثال سے کام لینا جو لڑیچر کی جاں ہیں اور حسن کلام کا زیور،

(۳) معانی کا بلیغ ہونا، کیونکہ اعلے درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے،
الفاظ سے اسکا چنداں تعلق نہیں، محض مضامین کو بلیغ یا غیر بلیغ کہہ سکتے ہیں،
بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے[۱]۔

غرضیکہ انشا پردازی کے شرائط یہ ہیں، جنکا ایک ادیب یا انشا پرداز میں پایا جانا
لازمی ہے، اب دیکھنا یہ ہے یہ کہ انشا پردازی کی یہ تعریف کس کے کلام پر بدرجۂ
اتم صادق آتی ہے، تاکہ اس کو سب پر فوقیت دیجائے، مگر اسکے معلوم کرنے کا

[۱] موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۴۲،

ایک اور بھی ذریعہ ہے وہ یہ کہ اگر ان بزرگوں میں سے کوئی صاحب کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید نہ ہونگے بلکہ اس سے نکلکر ہر قسم کے تخیلات پر بھی بہ نسبت دوسروں کے نہایت کامیابی کے ساتھ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں تو ان کو اس حیثیت سے دوسروں پر ترجیح ہوگی، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ایک ہی مسئلہ پر بہت کم قلم آزمائی کی ہے، البتہ کہیں کہیں بعض بعض مقامات متحد المعنا میں نظر آ گئے ہیں جن کو ہم موازنہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں،

علامہ شبلی شیراز کی مشہور سیر گاہ چشمۂ رکناباد کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں،

"رکناباد جو ایک چشمہ ہے شیراز کی مشہور سیر گاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہگئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھ کر لطف اٹھاتے ہیں، دوست احباب جمع ہوتے ہیں، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے کر اسکا ذکر کرتے ہیں،"

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔ کنار آب رکناباد و گلگشت مصلی را[۱]

آزاد اسکو یوں فرماتے ہیں"

"وہ زمین مذکور سبزہ و گل کا وطن ہے، خصوصاً فصل بہار میں کہ جب سبزہ فرش خاک پر زمرد سجاتا ہے، پھول سبزہ کے سر پر تاج رکھتا ہے، در و دیوار سے بہار برستی ہے، شادابی ہوا میں موجیں مارتی ہے، شیراز کے گلزار، خاک مصلے، چشمہ رکناباد، اصفہاں کے مرغزار، کوہ الوند کی چوٹیاں اور دامن پھولوں سے بھرے، ان کے اتار چڑھاؤ پر پانی کی چادریں گرتی ہیں، اور گھاٹیوں میں گرجتے بادلوں کی طرح گڑ گڑاتی چلی جاتی ہیں، انہیں میں سے لہراتی لہریں نکلتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کبھی ابر کبھی بادلوں کی بہار کبھی مینہ کا پھوار،"

[۱] شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۲۱۔

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلیٰ را[1]

اب غور سے دونوں بزرگوں کی عبارت کو دیکھو، کسقدر فرق نظر آتا ہے، دکھانا تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے سامان تفریح چشمہ رکناباد کے کنارے کس قسم کے تھے، مگر آزاد نے ان کے لئے ایک خاص طرز بیان ایجاد کیا ہے جو علامہ کے یہاں بہت پھیکا ہے، خصوصًا خط کشیدہ جملے بہت پرشکوہ اور فصیح ہیں جنھیں محاورہ کے طور پر اکثر بولا کرتا ہیں"

گلستان سعدیؒ کی عالمگیر شہرت اور اسکی عام مقبولیت پر مولانا حالی لکھتے ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ بوستان کا بھی ذکر ہے۔

"ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا لب لباب کہنا چاہئے، ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب اس سے زیادہ مقبول خاص و عام نہوئی"............
بچپن میں اسکی تعلیم شروع ہوتی ہے، اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے، لاکھوں استادوں نے انہیں پڑھایا، اور کروڑوں شاگردوں نے انہیں پڑھا، اس کے بےشمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے، اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے، مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، مشائخ اور علمانے اسکی قدر کی[2]"

آزاد اسپر فرماتے ہیں،

"عجائب اتفاق سے ہے کہ اس محدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھولدیا، اس میں فصاحت نے شربت اور سلامت نے دودھ بہایا، اور گلستان ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جسکا آجتک جواب نہیں، ادنےٰ سے اعلےٰ تک کوئی پڑھا لکھا نہوگا جس نے اس کے سبق نہ پڑھے ہوں، مگر

[1] سخنداں پارس صفحہ ۲۱۴،

عجب تر یہ کہ عالم .... اس عالم میں پڑھا ہے کہ گویا نہیں پڑھا، عارف اور پارسا سے لے کر بے حیا تک سب پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے مزے لیتے ہیں، پھر کیسی طبیعت اور کیا مزاج لیکر آیا تھا کہ شاہانہ، فقیرانہ، واعظانہ، نصیحت بزرگانہ جس مضمون کی حکایت کو جا ہو پڑھ لو، اسکی شوخی اپنے انداز سے کبھی بھی نہیں چوکتی، یہ بھی قدرتی اتفاق ہے کہ حسن قبول نے اُسے محبت کے ہاتھوں پر لیا[۱]

آزاد اور حالی کی اس عبارت میں بہت فرق ہے، حالی کی عبارت بالکل سادہ ہے، لیکن آزاد نے کچھ اس ڈھنگ سے لکھا ہے کہ فصاحت کا دریا بہا دیا، اور اسپر خط کشیدہ جملے خاص لطف دیتے ہیں، نذیر احمد کا کوئی مشترک مضمون نہیں ملتا مگر کم سے کم بطور امتحان کے ہم انکی ایک عبارت نقل کئے دیتے ہیں، جسکو انھوں نے لکھکر ایک خاص موقع پر پڑھا تھا، فرماتے ہیں۔

جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے، وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر بہار آرہی تھی، لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا، یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا، انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے کہ جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی وہ ہوتی حلیہ فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی، بس ضرور تھا کہ کسی داؤ سے پچھاڑنے اجاڑ جوان کو خوب اررلل تھا، یعنی فصاحت" قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید محمود اور حالی شبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے[۲]

ڈپٹی صاحب کی یہ عبارت جسقدر شوخ اور ظریفانہ انداز میں نظر آتی ہے، اگرچہ ایک سلیم الطبع انسان کو ناگوار خاطر معلوم ہوگی لیکن انصاف سے دیکھو

---

[۱] سخندان پارس صفحہ ۶۴، [۲] لکچرز آف ڈپٹی نذیر احمد،

تو انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے مگر تاہم آزاد کے جدتِ اختراع کو نہیں پہنچ سکتی، جو آگے چلکر مجموعی حیثیت سے معلوم ہوگا، موازنہ کی یہ چند صورتیں گزر گئیں سب میں آزاد ہی کو مجموعی لحاظ سے ترجیح رہی، اور چونکہ اب اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اسلئے ہم ہر شخص کے خصوصیات انشا یعنی کلام کی فصاحت بلاغت اور ان کے دائرۂ سخن کے حدود کی تعیین کے متعلق فرداً فرداً مفصل گفتگو کریں گے، جس سے یہ اندازہ لگانا بالکل آسان ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے کس کو ترجیح ہے، چنانچہ پہلے ہم علامہ شبلی کے خصوصیات کلام کو دکھلاتے ہیں، علامہ فرماتے ہیں،

سب سے اخیر کوکبہ نبوی نمایاں ہوا، جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھا جاتا تھا، حضرت زبیر بن العوام علم بردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوے گئے، ارشاد ہوا کہ عبادہ نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے یہ کہکر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لیکر ان کے بیٹے کو دیدیا جائے[1]،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"جو لوگ اختیار کے قائل ہیں انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ انسان کو خدا نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دو متناقض کاموں میں سے جس کام کو چاہے اختیار کرلے، اسلئے انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل ہے اور اسلئے وہ مجبور نہیں کہا جاسکتا، لیکن اسکی تہ میں بھی غلطی ہے، بے شبہ خدا نے انسان کو ارادہ اور قدرت عطا کی ہے، لیکن اس ارادہ پر بھی وہ مجبور ہے، یعنی جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو ایسے اسباب جمع ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کے ارادہ پر مجبور ہوتا ہے، لوگوں نے یہ سمجھکر کہ ہمارا نفس بد ہمکو برے کام کا حکم دیتا ہے، نفس بد کا نام

[1] سیرت النبی صفحہ ۷۷۳،

نفس امارہ رکھا ہے، لیکن خود یہ نفس امارہ کسکا مامور ہے[1]

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے، کہ علامہ کی عبارت کسقدر صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے، اور مشکل واطناب طلب مضموں کو وہ کس خوبی سے چند جملوں میں ادا کر دیتے تھے، اسکی بہتیری مثالیں ہم انکے کلام سے پیش کرتے ہیں مگر چونکہ وہ بہت طول طویل ہیں جو کسی طرح یہاں لکھی نہیں جا سکتیں، اسلئے ہم محض چند حوالے پر اکتفا کریں گے،

(۱) غزوۂ بدر ایک مختلف فیہ تاریخی واقعہ ہے، اسمیں مسلمانوں کے پیش قدمی کے علل اور اسباب کا دریافت کرنا کہ آیا انکا مقصد اس سے مشرکین کے حملوں کا دفاع تھا، یا کارواں قریش کو لوٹنا، ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے، اور ضرورت ہے کہ اسکے لئے سیکڑوں صفحے کم سے کم وقف کر دے جائیں، مگر علامہ نے کس خوبی سے قرآں وغیرہ کے چند اصول قائم کر کے محض آٹھ صفحوں پر "غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر" کے عنواں سے لکھدیا ہے،

(۲) ذبیح کون ہے؟ اس طویل المبحث مضموں کو فقط دو ورق میں باوجود پیچیدہ ہونے کے طے کر دیا،

(۳) مکہ معظمہ کی تعیین کے اختلاف کو تین صفحوں میں ادا کیا"

ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تاریخ کے مشکل سے مشکل مسائل کو کس آسانی کے ساتھ بات بات میں حل کر دیتے، اور عبارت نہایت سلیس اور رواں ہوتی، اور یہی انکا اصلی کمال ہے، تمام سیرت نبوی، شعر العجم اور اں کی تمام سوانحات کو اٹھا کر دیکھو، سب کو اسی رنگ میں رنگی ہوئی پاوگے یعنی عبارت سادہ سلیس صاف شفاف اور رواں ہونگی، البتہ سیرت نبوی میں

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۲۱۶،

میں جسکو مولانا نے نہایت جوش اور خروش کے ساتھ لکھی ہے، کہیں کہیں واقعات کے ضمن میں اپنی بہترین انشا پردازی کا جوہر بھی دکھلا یا ہے، اگران مقامات کو اگر یکجا جمع کر دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس کے لئے چار ورق درکار رہوں گے، اس جگہ ہم انکی چند بہترین عبارت کو نقل کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں،

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم کو اس سروسامان سے سجائی ہیں، کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہگئیں ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردے ہیں، سیارگاں فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جانفواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابرد باد کی تیزتردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہاے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی صبح جانواز وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیرا پنے محدود پیرایہ بیاں میں لکھتے ہیں "کہ" آج کی رات ایوان کسری کے چودہ کنگرے گرگئے، آتشکدہ فارس بجھ گیا، دریاے سادہ خشک ہوگیا، لیکن سچ ہے کہ ایوان کسری نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہاے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدہ کفر آذرکدہ گمرہی سرد ہوکر رہگئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں ملگئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کر کے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پر تو قدس سے چمک اٹھا[۱]

اس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے ولادت نبوی اور اس کے ضمن میں دیگر تاریخی واقعات کو جس گوناگوں انداز میں دکھلایا ہے اس سے اُن کی تاریخی واقعات کو نہائیت عمدگی سے قلمبند کرنے کی شہادت ملتی ہے، لیکن خط کشیدہ جملے تبلاتے ہیں کہ عبارت کی ساری شان فارسی الفاظ کی خوشگوار آمیزش نے رکھ لی ہے، اگرچہ فی نفسہ ہم اسے برا نہیں کہتے کیونکہ اردو زبان فارسی کی ہمیشہ سے خوشہ چیں رہی ہے لیکن کسی استاد کے اس مقولہ کو کہتے ہیں اسے زبان اردو" جیسیں شہو رنگ فارسی کا،

پر نظر پڑتی ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی یہ شان نہونی چاہیئے، تم خود دیکھو، پیر کہن سال دہر، متاع ہائے گراں ارز، معجز طرازی موسلی، آذر کدہ گمرہی، اوج چیں کے قصر ہائے فلک بوس، کیا یہ جملے اردو جیسی شیریں اور سلیس زبان کے لیئے کسی طرح زیبا ہیں،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جسکو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیئے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہات میں چھری ہے، دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اب باپ ہی کا ھر پرورہات اسکا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی فضائے آسمان سے عالم کائنات کا یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں،

[۱] سیرت نبوی جلد اول صفحہ

اور انگشت بہ دنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے یہ آواز آتی ہے،

طفیان ناز بیں کہ جگر گوشہ خلیل ۔ در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، اسکا صلہ یہی تھا کہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اسکی یادگار رہجائے[1]،

بہرکیف اس ساری داستان سے معلوم ہوا کہ مولانا کی ادبی معرکہ آرائیوں کا جولانگاہ فقط تاریخ ہے جسپر انھوں نے فلسفہ کا رنگ چڑھایا ہے اور انکی عبارت نہایت صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے اسی کو انکا اصلی کمال سمجھنا چاہیے، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے جمکایا ہے اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہونچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں[2]"

فصاحت و بلاغت کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کی عبارت چونکہ حشو و زوائد سے پاک اور سلاست اور روانی کا بہترین نمونہ ہے اسلئے فصیح ہے، اور مشکل سے مشکل مسائل کو وہ چند لفظوں میں ذہن نشین کرا دیتے ہیں اسلئے بلاغت کی جان ہے، لیکن ایک بات یہاں اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ روزمرہ اور محاورات وغیرہ کی ان کے یہاں بیحد کمی ہے، تاریخی واقعات وغیرہ سے ہٹکر مولانا نے بہت کم لکھا ہے، شعر العجم میں خیال تھا کہ دائرہ تحقیق سے ہٹکر عام تخیلات پر کچھ لکھیں گے، مگر اسمیں بھی تمامتر تحقیق ہی تحقیق ہے، البتہ ایک جگہ شاعری کی تعریف کرتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں،

"کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصل تصویر آنکھوں میں

[1] سیرت نبوی جلد اول صفحہ ۱۴۷، [2] افادات مہدی صفحہ ۲۱۶،

پھر جائے تو اسپر شعر کی تعریف صادق آئیگی، دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج و غم، غیظ و غضب جوش و محبت، افسوس وعبرت خوشی ان اشیاء کا اسطرح بیاں کرنا کہ اس کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر دلپر طاری ہو جائے یہی شاعری ہے[۱]"

مگر اس قسم کی مثالیں آپ کو بہت کم ملیں گی، غرضیکہ ان کے خصوصیات کلام کی تلخیص حسب ذیل یوں کیجا سکتی ہے۔

(۱) ان کے ادبی فتوحات کا دائرہ محض فلسفہ تاریخ تک محدود ہے، جسکو انھوں نے سلیس صاف اور رواں عبارت میں لکھا ہے،

(۲) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ روزمرہ اور محاورات اور امثال وغیرہ کی ان کے یہاں بہت قلت ہے،

(۳) وہ مضامین جو کسی واقعات یا خاص معلومات سے تعلق نہیں رکھتے اور سراسر تخیلات کے دفتر ہوا کرتے ہیں علامہ کے قلمرو سخن کے حدود سے باہر ہیں،

رہے حالی سو ان کے ادبی کارناموں کو دیکھنے کے لئے ہم ان کی کتابوں کے چیدہ چیدہ اقتباسات ذیل میں درج کر دیتے ہیں، جن سے آسانی کے ساتھ ہم ان کے خصوصیات انشا معلوم کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں،

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی، اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا،

[۱] شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲،

گر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا، نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا، کہ اسمیں کیا خوبیاں ہونی چاہییں، جب سب لوگ اپنی اپنی رائے کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو، مرزا نے کہا، بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں، میٹھا ہو اور بہت ہو سب حاضرین ہنس پڑے[1]

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اگرچہ جس زمانہ میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھکو ہمیشہ فخر رہیگا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی[2]

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی میں ایجاز بیانی کسقدر تھی، وہی مضمون جو دوسروں کے یہاں کئی صفحوں پر نہیں آسکتا ان کے یہاں اس کے لئے فقط چند سطریں کافی ہیں، پھر اسپر عبارت کا سلجھاؤ اور اسکا حشو وزوائد سے پاک صاف ہونا عجیب لطف دیتا ہے، حیات جاوید میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی، دوسرے جس قسم کے مضامین اسمیں بیان کئے گئے ہیں ... فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے، اسلئے اس کے

[1] یادگار غالب صفحہ ۴۳، ۴۴، [2] یادگار غالب صفحہ ۱۔

پڑھنے سے جی الجھتا تھا، پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے مسہود خطاسے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اسلئے اسکا صحیح کرنا بہت دشوار تھا، سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہونچائے، اسمیں ایک دو نسخہ صحیح بھی مل گیا[1]

انکی ان عبارتوں کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ فن سوانح نگاری میں وہ ایک کہنہ مشق استاد کی حیثیت رکھتے تھے، اور جیسا کہ لائف نگاری چاہتی ہے کہ جہانتک ہو اختصار کے ساتھ تمام واقعات زندگی قلمبند کر دے جائیں تاکہ پڑھتے وقت طبیعت میں الجھن نہ پیدا ہو، وہ حتی الامکان ایجاز سے کام لیتے اور حشو و زوائد کو ہاتھ نہ لگاتے تھے، عبارت میں ایک خاص سلجھاؤ تھا اور یہی انکا اصلی کمال ہے جس نے انکو ممتاز بنادیا، اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو وہ اس سے ہٹکر انشا پردازی کے عام منظر پر بھی نکل آئے ہیں، شعر و شاعری کا مقدمہ اسکی بہترین نظیر ہے، مسدس حالی کے دیباچہ میں وہ فرماتے ہیں"

البتہ شاعری کی بدولت چندروز جھوٹا عاشق بننا پڑا، ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا، کبھی نالہ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا، طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا، جب رشک کا تلاطم ہوا ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہانتک کہ آپ اپنے سے بدگماں ہو گئے، جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا، بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے .... اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے، گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اوتار ڈالا اور جب چاہا

[1] حیات جاوید،

پہن لیا، میداں قیامت میں اکثر گذر ہوا، بہشت دوزخ کی بارہا سیر کی، بادہ نوشی پر آئے، تو خم کے خم لنڈھا دئے، اور پھر بھی سیر نہوے، کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی، کفر سے مانوس رہے، ایماں سے بیزار رہے، پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کیں، واعظوں کا خاکہ اڑایا، دیر و بتخانہ کی تعظیم کی، کعبہ و مسجد کی توہین کی، خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا، غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور باد خوانون کے منہ پھیر دئیے[۵]،

اس عبارت کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ جسطرح وہ فن لالف نگاری کے استاد تھے وہ ایک کامل انشا پرداز بھی تھے، مقدمہ شعر و شاعری کو انھوں نے اسی رنگ میں لکھا ہے مگر انکا بہترین کارنامہ سیرت نگاری ہے، ان کے خصوصیات انشا یہ ہیں،

(۱) سیرت نگاری، اس فن میں جتنی کتابیں انھوں نے لکھی ہے سبکی عبارت سلیس اور بالکل سادہ ہے،

(۲) لالف نگاری سے ہٹکر وہ عام تخیلات میں بھی اپنی انشا پردازی کا بہترین ثبوت دے سکتے ہیں، مقدمہ اسکی دلیل ہے، مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں،

(۳) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، فصیح یوں ہے کہ ان کے یہاں عیوب ثلاثہ سے عموماً الفاظ پاک ہوتے ہیں اگرچہ زیادہ تر سادہ ہی کیوں نہوں، بلیغ اس وجہ سے ہے کہ زیادہ تر ان کی تصانیف فن سیرت میں ہے، یہ فن ایجاز طلب ہے اور ایجاز

[۵] دیباچہ مسدس حالی صفحہ ۲،

سلجھاؤ اور حشو زوائد کا نہ ہونا ان کے کلام کا جزو اعظم ہے، اور یہ حد درجہ کی بلاغت ہے کہ جو فن جیسا ہو اسکو اسی رنگ میں ادا کر دیا جائے،

آقائے اردو علامہ نذیر احمد کا اعلیٰ وصف دہلی کی ٹکسالی زبان کو معیار ترقی پر پہونچا دینا ہے، ان کی بے مثل فصاحت اور اعلےٰ درجہ کی بلاغت لٹریچر کی جان ہے جسکا اندازہ ان کے اقتباسات کلام سے ہوتا ہے،

فرماتے ہیں،۔

"خداوند کریم کا شکر اپنی گویائی کی بساط بھر تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اسکی بندہ نوازیاں اور ہزاروں لاکھوں نعمتوں کی مکافات کا حوصلہ، چھوٹا منہہ بڑی بات پیغمبر صاحب کی مح، اپنی ارادت ناقص کی قدر تو بن ہی نہیں پڑتی ان کی شفقتوں اور دل سوزیوں کی تلافی کا دعویٰ، اتنی سی جان گز بھر کی زبان[1]"

ان جادو بھرے جملوں کو دیکھو، اور پھر اسپر ضرب الامثال کا اضافہ سونے سہاگہ کا کام دیتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں،

حسن آرا کے مزاج کی افتاد، ایسی بری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا، نہ ماں کا ادب، نہ آپا کا لحاظ، نہ باپ کا ڈر، نہ بھائیوں سے ملاپ، نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں، لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں، غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی، شاہ زمانی بیگم کے آنے سے چاہیئے کہ بڑی خالہ سمجھکر حسن آرا گھڑی دو گھڑی کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی، کیا ذکر شاہ زمانی بیگم کو پالکی سے اترے دیر نہوئی تھی کہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں، نرگس روتی ہوئی آئی کہ بیگم صاحب دیکھئے چھوٹی صاحبزادی نے

[1] دیباچہ مراۃ العروس صفحہ۱،

اس زور سے تھپڑ مارا کہ میری آنکھیں پھوٹتے پھوٹتے بچ گئیں، سوسن نے آ فریاد
کی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحبزادی بی نے مجھ سے کہا کہ دیکھوں سوسن تیری زبان جوں ہی
میں دکھانے کو زبان نکالی نیچے سے تھوڑی میں ایسا مکا مارا کہ سارے دانت زبان میں
بیٹھ گئے، گلاب بلبلا اٹھی کہ ہائے میرا کان خونا خون ہوگیا، دائی چلائی کہ
دیکھئے مجھ کمبخت کے ایسے زور سے لکڑی ماری کہ بازو میں بدھی پڑ گئی، باورچی خانہ
سے ماما نے دہائی دی کہ اچھے کوئی ان کو سمجھانا سالن کی پتیلیوں میں مٹھیاں بھر بھر کر
راکھ جھونک رہی ہیں، شاہ زمانی بیگم نے آواز دی کہ حسنا یہاں آؤ، خالہ کی
آواز پہچان بارے حسن آرا چلی تو آئی، نہ سلام نہ دعا، ہاتھوں میں راکھ
پاؤں میں کیچڑ اسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی، خالہ نے کہا حسنا تم
بہت شوخی کرنے لگی، حسن آرا نے کہا اس سنبل چڑیل نے فریاد کی ہوگی،
یہ کہکر خالہ کی گود سے نکل لپک کر بیخطا بیقصور سنبل کا سر گھسوٹ لیا، بہتیرا
خالہ ایں ایں کرتی رہیں ایک نہ سنی[1]،

عبارت سے اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی ٹپکتی ہے، طرز ادا بہت دلکش ہے
اہل زبان کے روزمرہ کا چٹخارہ اگر دیکھنا مقصود ہو، تو اس عبارت کو پڑھو کہ
کس خوبی سے مضمون کو ادا کیا ہے، محاورات کی بھی کثرت ہے،۔

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"یوں دیکھنے اور کہنے کو تو حسن آرا اکیلی مکتب میں بیٹھی مگر کوئی درجن بھر لونڈیاں
اسکے ساتھ تھیں اور کوئی کوڑی بھر سہیلیاں، لونڈیاں کا تو یہ قاعدہ تھا کہ بے
ضرورت بھی ہر دم اور ہر لحظہ چاروں طرف حسن آرا کو گھیرے رہتیں اور کچھ کام
نہیں تو بات بات میں خوشامد بات بات پہ تعریف، ذرا ٹھیک ٹھاک کی کہ سب کی سب

[1] نبات النعش صفحہ ۲، ۳،

بول اٹھیں بسم اللہ بسم اللہ، چھینک لی تو سب چلائیں شکر الحمد للہ، نانی جی
ہیں کہ چپکے ہی چپکے قل ہو اللہ کی تسبیحاں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہیں، انا ہیں کہ
بار باران یکا دم کرتی جاتی ہیں، اور جو کہیں حسن آرا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا
تو کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی، کوئی چوری یا رومال ہلانے کھڑی ہو گئی،
کوئی بولی واری جاؤں گلوری کھا لو یا گولے ہی کے دو دانے ڈال لو، دیر ہوئی
منھ بدمزہ ہو گیا ہوگا، کوئی کہنے لگی، صدقے گئی، ایک گھونٹ شربت ہی پی لو
نگوڑے ہونٹھ ہیں کہ سوکھے جاتے ہیں پپڑیاں بندھ گئی ہیں، بھاڑ میں جائے
دیا پڑھنا اور آگ لگے ایسے مکتب کو، لڑکی کا مونہ تو دیکھو کیسا ذرا سا نکل آیا ہے
یہ کہکر جلدی سے لپک کر چٹا چٹ بلائیں لے حسن آرا کو گلے سے لگا لیا، جس شخص پر
حسن آرا کی طرح ایسے لونڈیوں کا غضب الٰہی اور ایسے نوکروں کی بلا مسلط ہو
اسکے مزاج کا درست رہنا عجب کی بات ہے، فرشتہ بھی ہو تو ایسی صحبت میں لتھ پتھ
بھوت سے بدتر ہو جائے،[1]

اس عبارت پر نگاہ ڈالو، اہل زبان کے روزمرہ کی بول چال اور اسپر اضافہ
یہ کہ محاورات و امثال کی کثرت کو علامہ نذیر نے جس خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں
جگہ دی ہے، اس سے ان کی انشا پردازی کی غیر معمولی قابلیت کا پتہ چلتا ہے،
حق تو یہ ہے کہ دہلی کی ٹکسالی زبان ان کے قلم کے سایہ میں پلکر بام ترقی کے
انتہائی زینہ تک پہنچ گئی، اور ان کے قلم کے فیوض و برکات سے مالا مال ہو گئی،
رویائے صادقہ کی وہ عبارت جہاں انھوں نے دہلی کی سوسائیٹی کا نقشہ کھینچا ہے
خصوصًا اس بلا کی ہے کہ اسکے متعلق ملک کے ایک مشہور انشا پرداز کو یہ کہنا پڑا
کہ اس سے بڑھکر چند سطریں لکھنا کسی طرح امکان میں نہیں آ سکتا، مجھے تعجب ہے

[1] بنات النعش صفحہ ۱۱، [2] ایم مہدی۔

ان لوگوں پر جو بے سوچے سمجھے زباں سے کہہ گذرتے ہیں کہ علامہ نذیر احمد کا کلام بلیغ نہیں، ان کی حقیقت بھیڑوں کے غول سے زیادہ نہیں کہ جس راستہ پر ہولیا اندھے ہوکر اسی پر ہمیشہ ہمیشہ چلتے رہے، انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ ان کے لکچرز ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جس شخص کے لکچروں کا کوئی مستقل عنوان نہیں ہوتا اس کے ٹو دی پوائنٹ ہونے کے کیا معنی؟ ڈپٹی صاحب محض تفریحا جلسے میں کھڑے کئے جاتے اور جہانتک ان سے ہوسکتا اپنی جادو اثر تقریر اور اپنی بے مثل فصاحت کا جوہر دکھاتے، کسی خاص مسئلہ پر بولنے کے لیے وہ شاید ہی اسٹیج پر آئے ہوں، اگر بالفرض وہ آتے تو اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ اپنی بےمثل قادر الکلامی اور اعلےٰ درجہ کی علمی قابلیت کے ہوتے ہوے ناکام رہجاتے، کیا توبۃ النصوح یا دیگر کتابوں کے لکھنے میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہوے، الحقوق والفرائض میں انھوں نے ایماں بالقدر کے دقیق مسئلہ کو جس خوبی سے ثابت کیا ہے اس سے ان کی بے مثل بلاغت کی داد دینی پڑتی ہے، البتہ اس جگہ ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ان کے لکچروں یا دیگر تصانیف میں انگریزی وغیرہ کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ اس طرح گئے ہیں کہ اس کے کلام کے غیر فصیح ہونیکا دھوکہ ہوتا ہے اگر شرط انصاف یہ ہے ان سب نکتہ چینیوں سے انکا کلام بے نیاز رہیگا، چنانچہ اس کے متعلق امور یل کا لحاظ رکھنا کافی ہے،

(۱) ہر زباں کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ وہ دوسری زباں کے بہت سے الفاظ پنی زباں میں ستعمال کرنے لگتے ہیں، مصر وشام میں یورپ کے عام زبانوں کے ت سے الفاظ معرب ہوکر آگئے ہیں، حالانکہ انکی جگہ خود اں کی زبان میں الفاظ وجود ہوتے ہیں، جیسے پروانہ راہداری کو قدیم عربی میں تذکرہ مرور کھتے ہیں مصریوں نے اس کے ہوتے ہوے پاسپورٹ کا معرب بسابورط بنا لیا ہے،

(۲) ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم آپ کو ملیں گے لہٰذا اس قلتِ عیوب کی کثرتِ محاسن کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں، اور نہ اس سے ان کی فصاحت پر کچھ دھبہ آتا ہے مرزا غالب اردو کے مسلم الثبوت شاعر ہیں مگر نقادان سخن اکثر ان کے کلام پر سخت چوٹ کر بیٹھتے ہیں، لیکن کیا اس معمولی خامیوں سے ان کے اصلی کمال کو کوئی صدمہ پہونچتا ہے گلاب کا پھول دنیا کی بہترین نعمت ہے مگر اسکا حال یہ ہے کہ کانٹوں میں الجھا ہوا ہوتا ہے،

(۳) ہم نے مانا کہ ایسے الفاظ حلیہ فصاحت کے لئے زیبا نہیں، مگر انھوں نے انھیں کچھ اسطرح ادا کیا ہے کہ یہی الفاظ جو دوسروں کے یہاں بیگانہ ہیں، ان کے زور بیان میں آ آکر اس طرح جذب ہوگئے ہیں کہ اجنبیت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کے مخصوص طرز کو کچھ صدمہ پہونچتا ہے، یہ سارا قصور ان کے زورِ بیاں کا ہے،

(۴) اصول نمبر ۲ میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اصلی بلاغت معنی کی بلاغت ہے، لہٰذا نذیر احمد کا کلام اگر بلیغ ہے تو پھر ان چند بے جوڑ اور غیر مانوس الفاظ کی سبک شکستہ جبینیوں سے انکی بلاغت ہمیشہ بے نیاز رہیگی،

مگر ان کی ساری کتابوں کو پڑھکر ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مذہبی دائرہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے، تاریخ کی طرف جسمیں تحقیق کے ساتھ ساتھ استخراج نتائج کی سخت ضرورت ہے وہ عموماً نہیں آتے، اور یہی انمیں ایک کمی ہے، ان کے خصوصیات انشا کی تلخیص یوں کی جاسکتی ہے،

(۱) وہ مذہبی دائرہ سخن میں رہکر فصاحت و بلاغت کا دریا بہا سکتے ہیں، مگر اس سے الگ ہوکر وہ دوسرے کوچہ میں قدم نہیں رکھتے، اور یہی ان میں ایک کمی ہے،

(۲) دہلی کی ٹکسالی زبان کو انھوں نے ترقی دی اوراسپر جابجا محاورات اور ضرب الامثال کی کثرت لٹریچر کی روح ہے، کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے،

پروفیسر آزاد کے خصوصیات سخن کو ہم دو طرح سے بتلانا چاہتے ہیں، ایک تو وہ جسکا خاص کر تاریخی یا دیگر قسم کے واقعات سے تعلق ہے، دوسرے وہ جو محض تخیلات یا افسانہ کی حثییت رکھتے ہیں، تاریخی واقعات،

آزاد فرماتے ہیں،

حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی، دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا، ابھی پنجاب میں ہے، ابھی سندہ میں ہے، ابھی بیکانیر اور جیسلمیر کے ریگستانوں میں سرگرداں چلا جاتا ہے، پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں جودھپور کا رخ ہے، کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے، قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی، وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے، ناچار الٹے پاؤں پھر آتا ہے، یہ سب مصیبتیں ہیں، مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے، کئی لڑائیوں کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی پڑیں، مگر اسے تعویذ کی طرح گلے لگائے پھرا، جب وہ جودھپور کے سفر میں تھا، تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا، اس سفر سے پھرے اور سندہ کی طرف آئے، ایام ولادت بہت نزدیک سا تھے، اس لئے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا اور آپ آکے پرانی لڑائی کو تازہ کیا، اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا، یہ تارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا وہ آفتاب ہوکر چمکیگا اور سارے ستارے اسکی روشنی میں دہندلے ہوکر نظروں سے غائب ہوجاینگے،

ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اسکی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا، آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے، اسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دیدیا کہ شگون خالی نہ جائے، اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا، کہ دل میلا نہ کیجیو، اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلیگی[۱]"

اس واقعہ کو پڑھو، آزاد نے ہمایوں کی پریشانی، حمیدہ بیگم سے اس کی شادی اور اکبر کی ولادت کے واقعات کی تصویر کس بلیغ اور دلستان انداز میں کھینچی ہے کہ واقعہ کی زندہ تصویر آنکھوں میں پھر گئی، یہی وہ بلاغت ہے جسپر جسقدر ناز کیا جائے بجا ہے، ملا بدایونی نے ہر چند عہد اکبری کی تاریخ لکھی مگر آزاد کی دربار اکبری کے گرد کو نہیں پہنچ سکتی، سبب اسکا یہ ہے کہ ملا نے فقط اہم واقعات کو یکجا جمع کر دیا ہے اور درباری امراء پر کچھ لے دے کیا ہے، مگر آزاد نے اس زمانہ کی زندہ تصویر اور اکبر کے کرایکٹر کا مکمل خاکہ کھینچا ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دربار لگا ہے، اور یہ حد درجہ کی بلاغت ہے، اکبر کی سواری کی کیفیت وہ یوں بیان کرتے ہیں،

اب دولہا کے سامنے عروس دولت کی برات گذرتی ہے، نشان کا ہاتھی آگئے، اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار، پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی، جنگلی ہاتھی پر فولادی پاکھر بن، پیشانیوں پر ڈھالیں، بعض کی مستکوں پر دیو زادی نقش ونگار، بعض کے چہروں پر گینڈوں، ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلوں سمیت چڑھی ہوئی ہیبت ناک صورتیں، ڈراونی مورتیں، سونڈوں میں گرز، برچھیاں تلواریں لے، سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم، گردن کھینچی، سینے تنے، جیسے لقا کبوتر، پھر گھوڑوں کی قطاریں، عربی ایرانی، ترکی ہندوستانی آراستہ پیراستہ سازویراق میں غرق، چالاکی میں برق اچھلتے مچلتے

[۱] دربار اکبری صفحہ ۲،

کودتے شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے، پھر شیر پلنگ، چیتے گینڈے، بھیڑیے
جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار،
گل گلزار آنکھوں پر زردوزی غلاف وہ اوراں کے بیل کشمیری شالیں،
مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے، بیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج سینگ
مصوّروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر، پاؤں میں جھانجن، گلے میں گھنگرو
چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے، شکاری کتے کہ شیر سے منھ نہ پھرائیں، شکار کی
بو پر پتال سے پتا نکال لائیں[1]"

یہاں سواری کی کیفیت کس پُر زور عبارت میں بیاں کی ہے، الفاظ کا زور شور
خصوصًا کس غضب کا ہے کہ گویا کوئی تفنگ چلا رہا ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا،
ایک جگہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کی داستاں لکھتے ہیں،

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے
فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جس کی خوشبو شہرت عام بنکر
جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج
سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر
نہ پھونچے، ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے
شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید
نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو، سبب اسکا یہ ہے کہ جس
باغ کا وہ بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا، نہ ہمصفیر رہے، نہ ہمداستاں رہے،
نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زباں کے ٹکسال تھا،
وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے، شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا، امراکے گھرانے

[1] دربار اکبری صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴،

تباہ ہو گئے، گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی ٹکڑے سے محروم ہو کر حواس
کھو بیٹھے، وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور
عمدہ تراشیں نکالتی تھیں آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے
ایجاد و اختراع کی فرصت دی ہیں وہ اور ادر کی شاخیں ہیں، انھوں نے
اور پانی سے نشو و نما پائی ہے وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں"[1]

تم نے ان اقتباسات کو دیکھا، آزاد نے ان واقعات میں کسطرح انشا پردازی کی
روح پھونکی ہے، واقعات اپنی اپنی جگہ پر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، کسی میں
محض اتنا ہے کہ ہمایوں نے اپنی پریشانی کے زمانہ میں حمیدہ بیگم سے شادی کی اور
اکبر کی ولادت ہوئی، ایک میں ہے کہ اکبر کی سواری کی کیا کیفیت تھی، دوسرے میں
ہے کہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کا کیا عالم تھا، مگر آزاد نے کس فصاحت اور بلاغت
کے ساتھ اسکو ادا کیا، غرضیکہ ان اقتباسات کا تعلق واقعات سے تھا جسکے اندر رہکر
انھوں نے اپنی انشا پردازی کا جوہر دکھلایا ہے،

(۲) عام تخیلات کی چند مثالیں،

برسات کا سماں دکھلاتے ہیں،

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں، سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی، ابر
دھواں دھار ہے، بجلی کوندتی چلی آتی ہے سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید
قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں، جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی تو پرندے کبھی
دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں، مور جدا
جھنکارتے ہیں، پپیہے الگ پکارتے ہیں، محبت کا متوالا چنبیلی کی جھرمٹ میں
آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ایک... کہ بوا بھی پڑنے لگی ہے، مست ہو کر وہیں

[1] آب حیات صفحہ ۳۰۴، ۳۲۴، ۷،

بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے[1]"

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے، تو کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا، کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج مارنے لگا، کوئی مشرق سے کافور آڑاتا چلا آتا ہے، صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اسمیں نہیں پیدا ہوئے وہ کہتا ہے سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے، صبح طلائی تھالی سر پہ دھرے آتی ہے کبھی مرغان سحر کا غل، اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کرکے صبح کی دھوم دھام دکھلاتا ہے، تو کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار، تاج مرصع سر پر رکھے، کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا، شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے مغرب کی چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا، کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوانوں میں آگ لگی ہے، تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں، دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں[2]"

حق تو یہ ہے انسان عبارتوں پر جھومتا اور ناز کرتا ہے، کثرت تشبیہات نے کلام کو بالاتر بنا دیا ہے۔

آزاد فسانہ کے طور پر اپنے ایک خواب کو بیاں کرتے ہیں،

یکایک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں ـــــ کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جسکی وسعت کی انتہا نہیں، امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے، آس پاس سے لیکر جہانتک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگیں اور شاداب ہے، ہر چند رنگ و روپ کی دھوم ہے

[1] آب حیات صفحہ ۵۸، [2] آب حیات صفحہ ۶۰،

چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے، زمین فصل بہار کی طرح
گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے، اور رنگارنگ کے جانور درختوں پر
چہچہے بھر رہے ہیں یہ سماں ہاں کا دیکھ کر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا، جب
ذرا ہوش آیا تو ان جنہاے دلکشا کو نظر غور سے دیکھا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے
چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو، پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے
رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہوئے ہیں، آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل
جھلمل کر رہے ہیں اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جو جانور
دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں،
چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک
پھیلاتے ہیں[1]،

ان چند اقتباسات سے ان کی ہر مضمون پر بے نظیر قادر الکلامی کا کافی ثبوت
ملتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ الفاظ کی شیرینی اور ان کی موزونیت اس درجہ کی ہے کہ اس پر بناوٹ
کا خاتمہ کیا جائے، مضمون اسقدر دل میں گھر کرنیوالا ہے کہ بلاغت کی جان اس پر فدا ہے
لیکن ان کے کلام میں بعض بعض جگہ انگریزی وغیرہ کے غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں جو
ایک حد تک ثقیل معلوم ہوتے ہیں، مثلاً الکٹریسٹی بل ڈاگ[2]، کڈھب، گاڈز وغیرہ
وغیرہ، اگر غور سے دیکھو تو اسکا بھی یہی جواب ہے جو ہم علامہ نذیر احمد کے متعلق دیچکے ہیں،
ان کے خصوصیات انشا کا خلاصہ یوں ہوگا،

(ا) وہ تاریخی واقعات اور اس سے الگ ہو کر یعنی عام تخیلات ہر دو اصناف پر
کامل مہارت اور قدرت رکھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ وہ کسی چیز یا سہارے کے محتاج
نہیں، ہر مضمون پر یکساں قادر ہیں،

[1] نیرنگ خیال صفحہ ۲۵، ۲۶،

(۲) انکا کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے، کلام میں کثرت محاورات تشبیہات،
استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل، عبارت کی بیساختگی اور برجستگی لڑیچر کی
جان ہیں،

آپ کے سامنے ہر شخص کے خصوصیات کلام ان کے عیوب و نقائص اور ہر شخص
کے ادبی معرکہ آرائیوں کی داستان پوری طرح سے بیان کردی گئی خود ہی فیصلہ کو قلم
ہاتھ میں لیجئے اور انصاف سے دیکھئے کہ کس کو ترجیح دیجائے خاکسار کا فیصلہ تو یہ ہے کہ
اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز ان میں آزاد ہے اسکا، سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تقریر
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ہیں کہ ان کے سارے ادبی کارنامے محض تاریخی واقعات
کے ساتھ ساتھ وابستہ ہیں، اس سے الگ ہو کر یعنی اگر تاریخ ان سے لے لیجائے تو
وہ کچھ نہیں رہجاتے انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ محاورات روزمرہ تشبیہات
اور استعارات وغیرہ کی جو حسن کلام کے زیور ہیں انکے یہاں بہت کمی ہے حالی یہ ہے
کہ وہ محض سیرت نگاری کے استاذ ہیں، انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، اس سے الگ
اگر وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں، نذیر احمد کی ساری فصاحت
بلاغت مذہب کے میدان میں کام آ سکتی ہے، مگر ان کے کلام میں سوقیت بھی
بہت زیادہ ہے،

مگر آزاد، شبلی حالی اور نذیر احمد کی طرح کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید
نہیں وہ ہر مضمون پر نہایت کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں، خواہ انکا تعلق واقعات
سے ہو یا تخیلات سے، اور اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی کا یہی کمال ہونا چاہیے،
دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ ان تینوں بزرگوں کا کلام فصیح اور بلیغ ہے مگر آزاد کے
کلام کو استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل اور تشبیہات و محاورات کی کثرت کی وجہ
سے کے کلام پر فوقیت ہے، غرضیکہ مجموعی حیثیت سے آزاد کو اوروں پر ترجیح ہے،

ملک کا ایک انشا پرداز لکھتا ہے،

"سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہجائیں گے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنکو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، اس لئے واقعات بھی انھوں نے جسقدر لکھے ہیں قصص (ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں افسانہ یا راس کمن سمجھئے"[1]

اب اردو کی خدمت کا سوال ہے کہ اسکی سب سے زیادہ ان بزرگوں میں سے کس نے خدمت انجام دی، چنانچہ ہم ہر شخص کے متعلق اس کے دائرہ سخن کے حدود کی تعیین کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کس نے کس فن میں کسقدر تصانیف چھوڑی ہیں، تاکہ آسانی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کیا جاسکے،

مولانا حالی کے کارنامے،

(۱) ادب میں مقدمہ شعر و شاعری، دیوان حالی اردو مسدس حالی، بیوہ کی مناجات، چپ کی داد، وغیرہ

(۲) فن سیرت میں حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب،

نذیر احمد کے کارنامے،

(۱) ادب میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ، الحقوق والفرائض، اجتہاد، مبادی الصرف۔

(۲) فن منطق میں مبادی الحکمۃ،

مولانا آزاد کے کارنامے،

[1] افادات مہدی صفحہ ۲۱۶،

(۱) ادب میں ۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخندانِ پارس، مجموعہ نظمِ اردو، نصیحت کے کرن پھول، دیباچہ دیوانِ ذوق، مکتوباتِ آزاد، سیرِ ایران، قندِ پارسی وغیرہ،

(۲) فنِ تاریخ میں ۔ دربارِ اکبری،

(۳) فنِ سیرت میں ۔ نگارستانِ فارس (شعرارِ فارسی کی مختصر سوانح)

علامہ شبلی کے کارنامے،

(۱) ادب میں ۔ شعر العجم ۵ جلدوں میں، مجموعہ کلامِ شبلی اردو، مثنوی صبحِ امید، مکاتیبِ شبلی دو حصہ میں،

(۲) فنِ سیرت میں سیرت نبوی دو جلدوں میں، سیرت النعمان، الفاروق، غزالی، المامون، سوانح مولانا روم،

(۳) تاریخ میں ۔ مقالاتِ شبلی، (تاریخی مضامین کا مجموعہ) عالمگیر پر ایک نظر، رسائلِ شبلی، وغیرہ

(۴) فلسفہ میں ۔ علم الکلام، الکلام،

(۵) مذہبیات میں ۔ ظل الغمام فی قرأۃ خلف الامام"

اسکے علاوہ علامہ حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہ چکے ہیں، ان کے اہتمام میں اس نے یورپ کی بہتری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا، ان میں فلسفہ اجتماع، اور تاریخ تمدن، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،

الندوہ کے سرپرست رہکر مدت تک انھوں نے اردو زبان کی خدمت کی اب ہر شخص کے علمی کارنامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور بجز علامہ شبلی کسی نے مذکورہ بالا فنوں میں کافی کتابیں نہیں لکھیں، نذیر احمد نے افسانے کے پر چند رسالے لکھدئے، تاریخ سیرت اور فلسفہ کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا

مولانا حالی نے فن سیرت اور کچھ ادب میں کتابیں لکھ کر اپنا کام ختم کردیا، لہذا نذیر احمد اور حالی تو خدمت کے لحاظ سے علامہ شبلی کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اب رہے آزاد تو انکی زیادہ کتابیں فن ادب ہی میں ہیں، فلسفہ یا فن سیرت میں انھوں نے کچھ نہ لکھا، البتہ نگارستان فارس فن سیرت میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، مگر علامہ نے فن ادب کے علاوہ سیرت اور فلسفہ میں بھی متعدد کتابیں لکھیں، یہی وہ سبب ہے جس سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو زباں کی سب سے زیادہ انجام دہی کا سہرہ علامہ شبلی کے سر ہے، دوسری حیثیت سے دیکھیں تو یہ حضرات مولانا کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچے، اسکی وجہ یہ ہے کہ اردو میں فن تاریخ اور سیرت وغیرہ کی بہتیری کتابیں پہلے ہی سے موجود تھیں، مولوی ذکاءاللہ نے دس ضخیم جلدوں میں ہندوستان کی اسلامی اور برٹش حکومت کی مفصل تاریخ لکھی، فسانہ عجائب ادب کی بہترین کتاب موجود تھی، مگر اسلام کے تاریخی واقعات کی سچی داستان کسی کو معلوم نہ تھی،

علم کلام اور فلسفہ یونان کے متعلق زبان اردو میں کچھ ذخیرہ نہ تھا، لیکن علامہ شبلی نے اس خدمت کا بار گراں اپنے سر لیا اور مدتوں کی دماغ پاشی اور طرح طرح کی جانفشانیوں کے بعد اسلامی واقعات کی تحقیق کی (جو کچھیں رسائل شبلی میں مل سکتے ہیں) اور علم الکلام اور الکلام لکھکر اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا، علامہ کی سب سے بڑی اردو زباں کی خدمت دار المصنفین کا قائم کرنا ہے جسکے اردو زباں کی خدمات کا سلسلہ ہمیشہ غیر فانی رہیگا، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ کچھ یوں ہی سے رہے، یادش بخیر! حالی نے مدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھکر اپنا ٹھکانا کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں، اور جس موضوع پر

جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعۂ خیال موجود نہیں[۱]"
اسلئے علامہ شبلی کی خدمات سب سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

الراقم محمد یوسف متعلم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، ڈاکخانہ
سرائمیر، ضلع اعظم گڈھ،

[۱] افادات مہدی صفحہ ۱۰۰

کتب مصنفہ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد مرحوم و مغفور

حمائل شریف مجلد۔ ترجمہ بین السطور مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو سفر و حضر میں ساتھ رکھنے کے قابل قیمت ہے ۳ر

دہ سورہ فی احسن سورہ۔ مترجم پنجسورہ کی جگہ۔ وظیفہ پڑھنے والوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۱۰ار

ادعیۃ القرآن۔ قرآن شریف کی ساری دعائیں معہ ترجمہ و خواص قیمت ۱۲ر

الحقوق والفرائض (۳ جلد) مذہب اسلام کے سارے مسائل کا مجموعہ۔ قرآن شریف کی آیات و احادیث کے ساتھ ۔ر ۳ر

اجتہاد۔ اسلام کی حقانیت کا دلائل و براہین قاطعہ سے اثبات۔ جو مسلمان اپنے عقیدے میں پکا ہونا چاہے وہ اس کتاب کو ضرور دیکھے عہ۳ر

نظم بے نظیر۔ مولانا مرحوم کی نظموں کا مجموعہ۔ بصراحت اس امر کے کہ کہاں اور کس موقع پر پڑھی گئی۔ قیمت عہ۳ر

مراۃ العروس۔ لڑکیوں کو امور خانہ داری اور سلیقہ سکھانے کی سب سے بہتر کتاب۔ اصغری اکبری کا قصہ قیمت ۱۲ر

بنات النعش۔ مراۃ العروس کا دوسرا حصہ قیمت ۹ر

توبۃ النصوح۔ عورتوں کو نیک کرداری اور مذہبی و اخلاقی تعلیم دینے کا بہترین طریقہ۔ قیمت ۱۰ر

محصنات۔ تعدد ازدواج کے روح فرسا نتائج۔ قیمت ۳ر

رویائے صادقہ۔ مختلف مذاہب کا مقابلہ اسلام سے۔ قیمت عہ۳ر

ایامیٰ۔ بیواؤں کے حالات کا دردناک فوٹو۔ قیمت عہ۳ر

ابن الوقت۔ انگریزی وضع کی کورانہ تقلید کے تباہ کن نتائج قیمت عہ۳ر

موعظہ حسنہ۔ مولانا کے اصلی نصیحت آمیز خطوط فرزند کے نام ۳ر

منتخب الحکایات۔ بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ نتیجہ خیز کہانیاں۔ قیمت ۲ر

چند پند۔ مفید و نصیحت آمیز مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے لیے۔ قیمت ۲ر

صرف صغیر۔ اردو زبان میں فارسی گرامر قیمت ۲ر

نصاب خسرو۔ جدید طرز کی خالق باری۔ قیمت ۶ر

رسم الخط۔ املا نویسی کے قواعد لڑکوں کے لیے۔ قیمت ۶ر

مبادی الحکمۃ۔ سلیس اردو میں عربی منطق کے قواعد۔ قیمت عہ ر

الفیننگ فی الصرف۔ صرف عربی کی بہترین گرامر اردو میں قیمت ۱۲ر

لکچروں کا مجموعہ۔ دو جلدوں میں ۲۴ لکچر الگ الگ بھی فروخت ہونگے ۲ قیمت صہ۳ر

مطالب القرآن۔ قرآن شریف کی تفسیر کا پہلا حصہ جتنا لکھا جا چکا تھا چھاپ دیا گیا۔ قیمت عہ۳ر

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۳ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

مسلمان اور علوم ہند

حال ہی میں مسٹر گنڈی لال بی اے (آکسن) نائب صدر مجلس مقننہ صوبہ متحدہ نے ہندی مسلمانوں کے عہد حکومت کی علمی ترقیوں کے متعلق ایک پُر از معلومات و بے لوث مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ابتداءً یہ مضمون ہندی جریدہ ”سرسوتی“ (الہ آباد) میں شایع ہوا تھا۔ اُسکے بعد مختلف اُردو مجلات و اخبارات میں اس کا ترجمہ ہوا۔ تنگ خیالی و عصبیت پرستی کے موجودہ دَور میں ایک ہندو اہل قلم کی زبان سے اس قسم کی تحریر کا نکلنا باعث صد تشکر و امتنان ہے۔ اور ہر حیثیت سے قابل مضمون نگار کی سعی جمیل مستحق داد ہے۔ مگر مضمون مذکور مسلمانوں کی علمی جدوجہد کا ایک نہایت ہی غیر مکمل مرقع ہے۔ یہی خیال مضمون ہذا کی تحریر کا محرک ہوا ہے۔

سطور ذیل میں فرزندانِ اسلام کے اُن کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو شعبۂ علوم ہند سے متعلق اُنھوں نے عہد ماضی میں سرانجام دیے۔ اور متوقع ہوں گا کہ کوئی ایسے بزرگ جنھیں مجھ سے زیادہ فرصت اور علمی ساز و سامان میسر ہے اس بحث پہ ایک جامع مضمون تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

مسلمان اپنی تعلیمی جد و جہد کے زمانے میں تمام دنیا کے علمی خزائن اپنے تصرف میں

لے آئے تھے۔ یونان وروما، مصر وہند، بابل و اسیریا کے پرانے تمدنوں کے رازہائے سربستہ انکے تفحص و تحقیق علمیہ کے روبرو پانی کی مثال تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے علمی کارناموں کا عہد زریں عباسی عہد حکومت ہے۔ اس دور میں دُور دُور سے کتب علمیہ زرِ کثیر صرف کر کے منگائی جاتی تھیں اور اُنکے تراجم اور تلخیصات سے عربی زبان و عربی تمدن کو مالا مال کیا جاتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندی ذخائرِ علمیہ کی جانب آستانۂ خلافت کی توجہ نہایت شد و مد سے مبذول ہوئی۔

اس مبحث پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم مختصراً عربی ادبیات کے مختلف مدارجِ ارتقائیہ پر تبصرہ کریں۔ عربی ادب کا سنگِ بنیاد ۵۶۸ء کے مابین رکھا گیا تھا۔ ابتداءً عربوں نے سوائے مذہبیات کے دوسرے شعبوں کی طرف بہت کم توجہ کی، مگر بعد کو ان کی ہمہ گیر ذہنیت نے تمام اصنافِ علوم و فنون پر قبضہ کر لیا۔ انکی معلومات کے ماخذ حسب ذیل تھے:۔

۱۔ یونانی ادبیات و علوم

۲۔ فارسی علوم و فنون

۳ ہندی عناصر

یونانی علوم و فنون مختلف تراجم کے ذریعہ سے عربوں میں بہت زیادہ مروج ہوئے اُن کے فلسفہ، مابعد الطبیعیات، نفسیات اور منطق وغیرہ پر زیادہ تر یونانی رنگ غالب ہے۔ یونانی تخئیل نے عربی تخئیل پر کتنا اثر ڈالا، اسکے لیے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔ میں انشاءاللہ بشرطِ فرصت اس مبحث پر بھی قلم اُٹھاؤں گا۔ اس موضوع پر سردست اتنا لکھنا کافی ہے کہ یونانی تمدن اور یونانی تخئیل نے عربی تمدن پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ دونوں میں بمشکل تمیز ہو سکتی ہے۔

جب عربی فتوحات کا سیلاب کسریٰ (کیخسرو) کے ملک تک پہونچا اور اللہ والے صحرانشینوں نے درفشِ کاویانی کی عظمت کو پارہ پارہ کر دیا تو مفتوحین نہ صرف سیاسی حیثیت سے مغلوب ہوئے بلکہ اُنھوں نے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے بھی فاتحین کا اتباع کیا۔ مفتوح اور فاتح ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ عجمیوں نے اہلِ عرب کا مذہب قبول کیا اور عرب فاتحین مفتوح تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ بچ سکے۔ ایرانی

دیستانی زبان ملک کے نظم ونسق کی زبان قرار پائی - افسانوں کی تعداد کثیر ایرانی ادب سے مستعار لی گئی - الف لیلہ - کلیلہ و دمنہ - شاہ نامہ اور دیگر فسانہ جات عشق و محبت کے پلاٹ ایرانی ادب سے ماخوذ ہیں - اخلاقی قصص اور بزرگ مہر و نوشیروان کے نقصوں کا ماخذ بھی یہی ایرانی ادب ہے - فن جنگ - علم بیطاری اور طب کی بعض کتابیں ایرانی سے ترجمہ کی گئیں - اہل ایران نے ریاضیات و ہیئت جیسے علوم میں بہت کم ترقی کی تھی مگر ان علوم کے متعلق بھی جو کتابیں ایرانی ادب میں موجود تھیں اُن سے مسلمانوں نے استفادہ حاصل کیا علی ابن زیاد التمیمی نے اپنی مشہور کتاب زیج الشہریار کو ایرانی زبان سے ترجمہ کیا - مشہور الخوارزمی نے برہما سدھانت کی تلخیص میں اس کتاب سے مدد لی ہے - ایرانی ادب سے مسلمانوں نے اکثر مصطلحات مستعار لی ہیں -

ہندی عنصر دو مختلف ذرائع سے عربی ادب میں داخل ہوا :-

۱ - براہ راست سنسکرت اور پراکرت کے تراجم سے

۲ - ایرانی تراجم سے یعنی ابتداءً سنسکرت اور پراکرت سے ایرانی میں ترجمہ ہوا بعدہٗ ایرانی سے عربی لباس پہنایا گیا - مسلم فتوحات ملکیہ نے بھی اس میں بہت زیادہ حصہ لیا -

ملک ہند میں اسلام کا پرچم سب سے اوّل اموی عہد میں لہرایا اور عرب کا وہ منچلا نوجوان جو آج تاریخ میں محمد بن قاسم کے نام سے پکارا جاتا ہے، چھتیس کروڑ دیوتاؤں کے استھان میں آکر پڑا تھا - ہندو علوم وفنون سے مسلمانوں کی علم دوست طبیعت اس زمانہ میں بہت زیادہ روشناس ہوئی اور اسکی چاشنی ملک عرب کی علمی دنیا تک پہونچی - جب اموی نیر اقبال گہن میں آگیا اور عباسی مہر نیمروز نے اپنے تحیر خیز و نظارہ سوز انداز سے ایشیا کے ذرہ ذرہ کو جگمگانا شروع کیا تو ہندو اقوام اور اُن کے علوم کا رسوخ بھی عربی قدردانوں میں یوماً فیوماً بڑھنے لگا - ہیئت و فلکیات - ہندسہ و ریاضیات کے در( ) جواہر ریزے جدید آب و تاب سے عراقی بازاروں میں بکنے لگے -

خلیفہ منصور (۷۵۴ - ۷۷۴) کے عہد حکومت میں سندھ کا ایک صوبہ تھا - اس صوبہ سے بغداد میں وفود آتے تھے اور بغدادی شائقین علم ہندوستانی علوم سے سیراب ہونے کے لیے مختلف قطاعِ ہند کے سفر کیا کرتے تھے - اسی زمانہ میں برہم سدھانتا مصنفہ برہم گپت کا ترجمہ عربی میں ہوا - یہ کتاب علم ہیئت میں ہے اور سند ہند کے نام سے

مسلمانوں میں رواج پا گئی ہے۔ بطلیموسی اور فیثاغورثی کتب کی ترویج سے پہلے یہ سندہند مسلمانوں میں فلکیات اور ہیئت کا ذوق سلیم پیدا کر چکی تھی۔ اس کتاب کو محمد ابن ابراہیم الفزاری نے ہندو اصحاب علم کی مدد سے عربی کا جامہ پہنایا۔ اسکے علاوہ برہم گپت کی دوسری کتاب کرن کھنڈ کھانڈک کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا اور اس کا نام الارکند مشہور ہوا۔ افسوس ہے کہ حوادث و مرور ایام نے ہمیں الفزاری کے علمی سرمایہ سے محروم کر دیا۔ اور اب صرف اس کا نام باقی ہے۔

یعقوب بن طارق نے دوسری صدی ہجری میں ہیئت و ریاضی۔ علم السنین اور جغرافیۂ ہنود کا درس دینا شروع کیا۔ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی موجد جبر و مقابلہ و عربی اعداد نے جو مسلمانوں میں مشہور ریاضی داں گذرا ہے سدھانت کی تلخیص کی اور بغدادی طالبعلموں کی زبان پر اسکو رائج کرادیا۔ الفزاری اور ابن طارق کا ہمعصر ایک دوسرا حکیم ابوالحسن اہوازی تھا جس نے سیاروں کی حرکات کی جدولیں چھٹی صدی عیسوی کے مشہور ریاضی داں اور ہیئت داں آریہ بھٹہ کی ہیئت کی کتابوں سے تیار کی تھیں۔ یہ کتاب سدھانت کے بعد عالم وجود میں آئی۔

علم ہیئت اور طب کے علاوہ ہندو حکماء کی بہت سی دیگر کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ احکام نجوم۔ تعبیر رؤیاء۔ قیافہ شناسی۔ فلاحت اور موسیقی کی متعدد تصانیف عربی لباس سے ملبوس ہوکر شائقین علوم کے ہاتھوں میں پہونچیں۔

عہد ہارونی میں (۷۸۶ - ۸۰۸) برامکہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اس خاندان نے ہندو علوم و فنون کے نشر و اشاعت میں نہایت فیاضی سے حصہ لیا۔ ہندو اصحاب علم کو بغداد بلاکر مناصب جلیلہ پر فائز کیا۔ طلبا ہندی علوم سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کھینچے جاتے تھے۔ ہندو علماء کو کثیر مشاہرہ دے کر بغداد بلایا جاتا تھا۔ مشہور شفاخانے انکی نگرانی میں دیے جاتے تھے اور ان سے طب۔ علم الادویہ۔ علم السم۔ فلسفہ۔ ہیئت اور دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمہ میں مدد لی جاتی تھی۔ انھیں اغراض کے لیے مسلم سفیر برامکہ کی طرف سے ہندوستان کی سیاحت پر مامور کیے جاتے تھے۔ الموفق نے البیرونی سے پہلے ہندوستان کا سفر کیا۔ افسوس ہے کہ ہندی عربی تصنیفات کا زیادہ حصہ برباد ہو گیا۔ صرف انکے نام فہرستوں میں باقی ہیں۔

برامکہ کے زمانہ میں اسپتالوں کا مہتمم اعلیٰ ابن دہن تھا۔ یہ لفظ غالباً دھنیاں یا دھنین کا معرب ہے۔ اسی زمانہ کا دوسرا طبیب کنکا ہے اس کا اصلی نام کنکیانہ ہے۔ اسی نام کی ایک کتاب ہندی طب میں سند کا کام دیتی ہے۔ دوسرا طبیب واثر ہے۔ یہ شخص مشروبات پر ایک کتاب کا مصنف ہے۔ اسی زمانے میں **بیدبا یا بیدباہ** کی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا ہے ہم اکثر اس نام کا ترجمہ بیدپاہ کے نام سے پاتے ہیں۔ یہ لفظ اصلاً **ویداویاسا** ہے۔ یہ فلسفہ ویدانت یا ہندی تصوف کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اہل عرب نے سرپاودیا (علم الحیات) وشاودیا (علم السم) طلسم۔ طلبی ارواح۔ منطق۔ فلسفہ اخلاقیات وسیاسیات وفن حرب کے متعلق بھی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔

جب سندھ عباسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا سلسلہ تبادلۂ خیالات کا منقطع ہو گیا۔ ہندی علوم وفنون سے اہل عرب کو کافی شغف نہ رہا۔ اب عربی ادبیات کا رجحان دوسری طرف ہو گیا۔ اس زمانے میں مسلمان یونانی علوم وفنون سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ نسطوری اطبا وفلاسفہ حران نے افلاطونی ارسطاطالیسی اور جالینوسی نظریات کا درس دینا شروع کیا۔

خلافت میں ضعف پیدا ہونے کے بعد خاندان سامانیہ (۸۹۲ - ۹۹۹) نے ہندی علوم کے احیا کا دوبارہ بیڑا اٹھایا اس خاندان کے وزیر الجیہانی کو اس جانب خاص توجہ تھی۔ الپتگین وسبکتگین اسی خاندان کے آغوش تربیت کے پروردہ یافتہ ہیں۔

خاندان سبکتگین کا مہر منیر سلطان محمود غزنوی ہے پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے محمود کو مجبوراً ملاحدہ اور باطنیہ کے استیصال کے لیے ہندوستان آنا پڑا۔ محمود زبردست فاتح اور بے بدل جنرل ہونے کے علاوہ علم دوست اور فضل نواز بھی تھا۔ اسکے عہد میں غزنی علوم وفنون کا سرچشمہ اور فضلاء واہل کمال کا ملجاء وماویٰ تھا سلطانی عنایات والطاف خسروانہ کے سحاب فیضان سے علم وفن کے سوکھے ہوئے جدولوں میں از سر نو آبیاری ہونے لگی۔ دور دور کے ارباب فضل وکمال شاہی کرم ہائے گوناگوں کے مقناطیسی اثر سے کھنچ کر اس عروس البلاد میں جمع ہوئے۔ عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ انوری۔ فردوسی۔ البیرونی جیسے اساتذۂ علم وفن کا دربار میں مجمع تھا۔ ہند کے حکماء وفضلاء بھی اس ہمہ گیر کشش سے نہ بچ سکے۔ اس زمانہ میں غزنی دنیائے متمدن کا لندن تھا۔ علاوہ دیگر علوم کے سنسکرت

کے علمی ذخائر بھی قدر دانانِ فن کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔
عہد غزنوی کا ارسطاطالیس ثانی البیرونی ہے۔ البیرونی کو علوم ہند سے خاص شغف تھا۔ اس نے ہندو علوم و فنون سے واقفیت تامہ حاصل کرنے کے لیے خود سنسکرت پڑھی تھی۔ اور مختلف حصصِ ہند کی سیاحت بھی کی تھی۔ بیرونی کی مشہور تصنیف "کتاب ابی ریحان محمد ابن احمد البیرونی فی تحقیق ما للہند" کتاب الہند کے نام سے مشہور رہے۔ البیرونی نے نہایت محنت و جانفشانی سے اہل ہند کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کیں۔ اور انکو اس کتاب میں جمع کیا۔ کتاب الہند میں زیادہ تر مدد ذاتی مشاہدات اور مطالعہ سے لی گئی ہے۔ البیرونی کو ۴۵ سال کی عمر میں یہ شوق پیدا ہوا اور اس نے ۱۵ سال کامل ہندو علوم کی تحصیل و تلاش میں صرف کیے۔ البیرونی اہل ہند کے مذہبیات۔ فلسفہ۔ فلکیات اور ریاضیات کے مغلق نکات کو نہایت عمدگی سے سمجھتا تھا۔ اس میدان میں اسکی وسعتِ معلومات سے نہایت حیرت ہوتی ہے۔ البیرونی کی معرکۃ الآرا تصنیف ۸۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ مضامین کی بوقلمونی، طرزِ بیان کی خوش اسلوبی اور مباحث کی جامعیت سے بے اختیار ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ واقعی بیرونی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ البیرونی نے اس کتاب میں ہر مسئلہ پر ایک بے لوث مورخ کے نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ اس کتاب سے علمی نشأۃ ثانیہ کا پتہ چلتا ہے۔

ملک ہند کی بدقسمتی سے ہندی خزائن علمیہ کے کلید بردار ایسے اصحاب تھے جو "ملکش" اقوام کے ناپاک قدموں سے اپنی پاک اور پوتر درسگاہوں کو گندہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ زبان سنسکرت جو ہندی علوم و فنون کی زبان تھی چند برہمنوں کے حلقہ میں محدود تھی۔ غیر برہمن کی دسترس وہاں تک محال تھی۔ مگر امت محمدیہ کے تشنگانِ علم نے "الحکمۃ ضالۃ المومن" کو تلاش کرتے ہوئے ہزاروں میل کے سفر کر کے لاکھوں مصائب برداشت کر کے علم کے موتیوں کو سائنس کے گنجینوں کو ہر ممکن طریق پر فراہم کیا۔ سنسکرت کی صعب الحصول سرزمین بھی انکی تلاش کے دور رس اثرات سے نہ بچ سکی۔ اور انکی علم دوستی نے ہند کے پردہ نشین علوم و فنون سے دنیا کا تعارف کرا کے چھوڑا۔ البیرونی نے بھی زبان سنسکرت کی مشکل ترین صرف و نحو کی منزل مقصود کو طے کر کے علمائے ہند کو رام کیا۔ اور ان سے علمی خزائن کی کنجیاں حاصل کیں۔ یہ تمام مراحل البیرونی کی متبحر طبیعت کے سامنے چنداں دشوار گزار

نہ تھے ابتدائی مشکلات کے حل ہونے کے بعد البیرونی کی گیرائی نے ہر قسم کے علمی نکات کا احاطہ کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے اساتذہ کی امداد سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ البیرونی اس سلسلۂ تلمذ کے متعلق لکھتا ہے

ہندو ہیئت دانوں سے ابتداءً میرا تعلق شاگردانہ رہا۔ لیکن تھوڑے زمانہ میں جب کچھ واقفیت ہو گئی تو میری حیثیت اُستاد کی ہو گئی۔ مجھے ہیئت و ریاضی میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اب میں انھیں خود درس دینے لگا۔ پنڈتوں کو میری معلومات سے بہت تعجب ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ تم نے کس ہندو پنڈت سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اجنبی انکے یہاں آکر ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ لوگ مجھے ساحر سمجھنے لگے تھے اور اکثر "ساگر" کے نام سے پکارتے تھے" (کتاب الہند باب اول)

البیرونی نے تحصیل علوم سنسکرت میں بہت سے پُرانے تراجم سے بھی مدد لی تھی۔ یہ تمام تراجم اسکے کتبخانے میں موجود تھے۔ علی ابن زین کا کراکا کا ترجمہ اسکے یہاں تھا۔ پنچا تنتر کا ترجمہ اسکے پاس تھا۔ اس کے کتبخانے میں کارن سار (مصنفہ وتی سوار) کا بھی ترجمہ تھا۔ مترجم کا نام معلوم نہیں۔ البیرونی نے ہندو علوم کے سیکھنے میں الفزاری۔ ابن طارق۔ ابو الحسن اہوازی۔ الکندی۔ ابو معشر بلخی اور الجیحانی کی تصانیف سے بہت زیادہ مدد لی۔ اس نے پُرانے تراجم کے اغلاط درست کیے۔ اکثر کتابوں کے عربی ترجمے کیے۔ کپل کی سانکھ۔ پاتنجلی۔ پان سائے وصفانت مصنفۂ برہم گپت سدھانت یا سندہند کا ترجمۂ ثانی یری ہم ہتیا اور رگھوجا تاکم مصنفہ دراہمیر کا نام البیرونی کی فہرست تراجم میں شامل ہے۔ امراض خبیثہ کے متعلق بھی ایک سنسکرتی تصنیف کا ترجمہ اس نے عربی میں کیا۔

البیرونی نے بعض عربی کتب کو بھی سنسکرت کا جامہ پہنایا۔ یہ ارادہ غالباً ہندو احباب کے اصرار پر کیا گیا ہو گا۔ کتاب الاقلیدس۔ کتاب المجسطی اور بعض اپنی تصانیف متعلق علم ہیئت کا ترجمہ اس نے سنسکرت میں کیا۔

اس کے علاوہ البیرونی نے بہت سی سنسکرت کتب کا مطالعہ کیا۔ بھگوت گیتا گوہرِ ادبیات سنسکرت البیرونی کو بہت زیادہ پسند تھی اس نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

دنیائے اسلام میں البیرونی ہی پہلا شخص ہے جس نے پُرانوں کا بغور مطالعہ کیا اور غیر ہندو دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ پُرانوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں اسنے وشنو دھرم وشنو پران۔ وایا پران اور ادتیا پران کو بغور دیکھا۔ البیرونی نے مہابھارت رامائن۔ منو مہاراج کا دھرم شاستر بھی پڑھا تھا۔ جگہ جگہ ان کتابوں کے اقتباسات اس کی تصانیف میں درج ہیں۔

البیرونی کی تصانیف اسکے پیشرووں کے مقابلہ میں بہت زیادہ جامع مبسوط اور صحیح ہیں۔ البیرونی نے فلسفۂ ہنود کی شرح لاجواب طریق پر کی ہے۔ دینیات و فلسفہ کے مباحث کے سلسلہ میں البیرونی نے کپل کی سانکھ۔ پاتنجلی اور گیتا سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ ہیئت، نجوم، جغرافیہ اور دیگر مذاکرات کے دوران میں البیرونی نے کثیر التعداد ہندو تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ غرض اس فرید روزگار وحید عصر علامہ کے علمی تبحر اور وسعتِ معلومات پر عقل انسانی ششدر رہ جاتی ہے اور بے اختیار کہنا پڑتا ہے

بسے دَور باید کہ چرخِ ظفر   بیارد کسے چون تو بارِ دگر

افغان و خلجی عہد حکومت میں مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان میں دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ شاہانِ وقت و اعیانِ دولت نے علم و فن کی قدردانی میں خلفاء بغداد، دیالمہ و سلاجقہ کے نمونے پیش کیے۔ بادشاہانِ وقت و اہل دولت کی سرپرستیوں نے ہندوستان کو اہل کمال کا مستقر بنا دیا۔ مختلف شعبہ جات علمی کے ساتھ ساتھ علوم سنسکرت کو بھی حصّہ ملا۔ بلبنی اور خلجی عہد میں ہندوستان کا شاعر بے بدل، باکمال ادیب، اقلیم سخن میں اپنی خسرویت کے کوکبہ کو بلند کرکے گورنظامی میں زلزلہ ڈال رہا تھا۔ آج ہندوستان کا بچہ بچہ حضرت امیر خسرو کے اسم گرامی سے واقف ہے۔ ترکی و فارسی امیر کی مادری زبان تھی۔ عربی ادب میں وہ ادباء عرب کے ہم پلہ تھے۔ سنسکرت میں بھی امیر کو مہارتِ تامہ حاصل تھی اُس وقت عربی اور ہندی تمدنوں کی آمیزش سے ایک نئی قوم بن رہی تھی جو آیندہ چل کر تاریخ ہند میں جدید باب کا اضافہ کرنے والی تھی۔ علوم، فنون، زبان و اخلاق میں حاکم و محکوم دونوں ایک دوسرے کا رنگ اختیار کرتے جاتے تھے۔ اہل ہند "الناس علیٰ دین ملوکھم" پر عمل پیرا ہو کر عربی و فارسی اساتذہ کے حضور زانوے ادب تہ کر رہے تھے اور مسلمان اپنے ہمسایوں کے حالات اور علوم و فنون کے درخشاں کارناموں کو حاصل کرنے کے لیے بیتاب

اور سنسکرت سیکھتے تھے۔ امیر خسرو اس قران السعدین کے بہترین فرزند تھے۔ امیر نے موسیقی میں متعدد ایسی راگنیاں ایجاد کیں جو ہندی و عجمی راگوں کا مجموعہ تھیں۔ اس سے موسیقی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ علاوہ بریں شعر و سخن کے میدان میں امیر یکہ تاز عرصہ سخن ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ فارسی شاعری میں امیر کی قادر الکلامی نے شعرائے عجم سے خراج تحسین وصول کر کے چھوڑا۔ برج بھاکا میں بھی امیر اساتذۂ وقت کے ہم پلہ تھے۔ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا جتنا کلام فارسی میں ہے اتنا ہی برج بھاکا میں ہے۔ افسوس ہے کہ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے امیر کے اس کلام کا مجموعہ ہم تک نہ پہونچنے دیا۔ امیر اپنی سنسکرت دانی کا تذکرہ "مثنوی نہ سپہر" میں ایک گونہ کسر نفسی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ع

"من قدرے بر سرایں کار شدم"

یہ شاعرانہ انکسار ہے ورنہ امیر کی وسعت معلومات اس زبان میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔ امیر نے فارسی کے اشعار میں بھی ٹھیٹ بھاشا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بالآخر اسی قسم کی فارسی و بھاشا کی ترکیب امتزاجی سے خانوادہ السنہ میں وہ دختر نیک اختر پیدا ہوئی جو آج اُردو کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ امیر کے اس کلام کے چند نمونے ہم محض ناظرین کرام کے تفنن طبع کے لیے پیش کرتے ہیں

دارم آرزو کہ حکایت کنیم بات	لالہ غلام روے تو صد برگ زیر پات
ہر برہمن کہ دید رخ خوبت اے صنم	زنار را شکست و لکدز د بردے لات

رفتم بتماشا کنار جوئے	دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہای موہیت چہ بود	فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

شاہان ہند کے تغلقیہ سلسلہ نے بھی ایسے ایسے قدردان علم و فن پیدا کیے ہیں کہ ان کا نام ہندوستان کی علمی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ کا گوہر درخشاں، انمول موتی فیروز شاہ تغلق ہے۔ آج ہندی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد اس شاہ ذیجاہ کے علمی و سیاسی کارناموں سے واقف ہے۔ برادران وطن اپنے مسلمان محسنوں کی شان میں جتنا شاتمہ چاہیں روا رکھیں اور انکے متعلق جو چاہیں لکھیں، اور

سیاسی رنگ آمیزی کے خوگر مسیحی مورخین جو کچھ چاہیں تحریر کریں مگر مصنف مزاج اور بالغ نظر اصحاب پر فرزندان اسلام کا عدل وانصاف پوشیدہ نہیں۔

عہد فیروزی میں اصحاب لبست وکشاد میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ دو ہندو وزرا کو حاصل تھا۔ ملک کا سیاہ وسپید اُن کے اختیار میں تھا۔ دربار شاہی سے بھی انکو "خان جہاں" کا خطاب تھا۔ سلطانی رواداری صرف مناصب تک محدود نہ تھی۔ دربار شاہی سے گراں قدر مصارف محکوم اقوام کے علوم وفنون کے حصول کے لیے بھی منظور کیے گئے تھے۔ جس وقت سلطانی عساکر ظفر موج کا داخلہ نگرکوٹ میں ہوا اور راجہ مخذول ومنکوب ہو کر دست بستہ حاضر دربار کیا گیا۔ فیاض سلطان نے دشمن کے قصور کو نہایت دریا دلی سے معاف کر دیا۔ اُسکی سلطنت اُسکو واپس دیدی۔ اس وقت عمائدین راج نے سلطان کو اطلاع دی کہ نگرکوٹ کے مندر میں جس شبیہ کی پرستش ہوتی ہے وہ نوشابہ زوجۂ سکندر اعظم کی تصویر ہے۔ یہ تصویر یونانی فاتحوں نے اپنے معتوصین کو نذر کی تھی اب اُس شبیہ کی پرستش ہوتی ہے اُسکو "دیوی" کا مرتبہ حاصل ہے اور جوالا مکھی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ہندوستان کی باطل پرستی قابل داد ہے۔ یہاں ہر صاحب عظمت کو آسانی مرتبۂ الوہیت حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مندر کے متعلق ہند وکتب علمیہ کا ایک کتبخانہ بھی تھا جس میں کم وبیش ۱۳۰۰ نادر نسخے تھے۔ فیروز نے صرف اس علمی سرمایہ کو اپنی فتح کا حاصل قرار دیا، بقیہ مال ومنال سے عذر کیا۔ سلطانی حکم سے مختلف دیار وامصار سے ہندو اہل علم ان کتابوں کے ترجمے کے لیے جمع کیے گئے، مسلمان فضلا بھی اُنکے شریک کار رہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں بھی سنسکرت دانوں کی کمی نہ تھی۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر اس زمانے کے شہرۂ آفاق شاعر عزیز الدین خالد خانی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عزیز الدین علاوہ دیگر السنۂ شرقیہ کے زبان سنسکرت کا بھی فاضل تھا۔ عزیز الدین کو ایک کتاب کا ترجمہ سپرد کیا گیا جو بالآخر "دلائل فیروزشاہی" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کتاب فارسی نثر میں تھی۔ مسٹر الیٹ مولف تاریخ فیروزشاہی نے لکھنؤ کے ایک کتبخانے میں فارسی زبان میں علم ہیئت پر ایک کتاب دیکھی۔ اسکی اصل سنسکرت زبان میں تھی جس کا ترجمہ عہد فیروزشاہی میں ہوا تھا۔ اس عہد میں

علم بیطاری کی ایک کتاب سالی ہوتر کا ترجمہ فارسی میں ہوا اور اس کا نام "قرۃ الملک" رکھا گیا۔ غالباً سلوترا اور سلوتری اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ عہد شاہجہانی میں بھی اس کتاب کا دوبارہ ترجمہ ہوا۔ لودی عہد میں دیسی اور نو واردا قوام میں میل جول اور اختلاط و ارتباط بہت زیادہ ہو گیا۔ ہندو اصحاب نے فارسی ادب سے دلچسپی لینا شروع کر دی اور مسلمانوں کا رجحان سنسکرت کی طرف زیادہ ہوا۔ عہد سکندر لودی میں متعدد کتابوں کے ترجمے فارسی میں ہوے۔ اس میں سب سے زیادہ مشہور اد کا مہا ویدک علم الادویۃ والمعالجہ کا ترجمہ ہے۔ اس تالیف جدید کا نام "طب سکندری" رکھا گیا۔ یہ کتاب اُس زمانے کے اطباء ہند کی سرمایۂ ناز تھی۔ بعد کو اس کتاب میں مزید ترمیمات ہوئیں۔ چنانچہ صاحب وقائعات مشتقی کا قول ہے کہ "یہ کتاب اُس مجموعہ کا نام ہے جسکو ویدک اطباءِ ہند اور خراسانی اطباء یونانی نے مروج کیا تھا"۔

تاریخی حیثیت سے ظلم ہوگا اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں کے مساعیِ علمیہ کے ساتھ ساتھ سلاطین بنگال کی ادبی و علمی دلچسپیوں کو نظر انداز کر دیں۔ فی زماننا السنۂ ہند میں بنگالی سب سے زیادہ جامعیت، علمیت اور کثرتِ ذخائر پر ناز کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگال نے ایسے ایسے باکمال اصحاب پیدا کیے کہ آج اُن میں سے اکثر اپنی عالمگیر شہرت و نیکنامی کے باعث چہار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ مشہور سائنس داں سر بوس اور شاعرِ بے بدل رابندر ناتھ ٹیگور کو کون نہیں جانتا۔ گیتانجلی آج بنگال کا سام وید ہے تمام اہل بنگال اپنی زبان پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں، مگر کبھی کسی نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ خود بنگالی زبان کا وجود کس کے فیضان کرم کا نتیجہ ہے؟ یہ مایۂ ناز زبان کس کے آغوش تربیت میں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی؟ یہ زبان مسلم حکمرانان بنگال کی مرہونِ منت ہے۔ بنگالی ادب کا سنگ بنیاد مسلمانوں نے رکھا اور اُسکو مختلف تراجم و تصنیفات سے مالامال کیا۔ بنگال میں ایک عرصہ تک سنسکرت کا دور دورہ رہا ہے اور اہل علم و اہل مذہب کی زبان سنسکرت ہی تھی۔ بنگالی کو سنسکرت سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ اس دختر ربیبہ کے نشو ونما اور نیز ہندی خزائنِ علمیہ پر قبضہ کرنے کے فطری میلان نے بنگال میں بھی حلقہ بگوشانِ اسلام کو سنسکرت کے دفائن اور کنوز مخفیہ کی طرف متوجہ کیا۔ یہی شوق تھا جو بالآخر بنگالی ادب کی ترقی کا باعث ہوا۔

ناصر شاہ سلطان بنگالہ ۱۲۸۲ء سے لیکر ۱۳۲۵ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ ناصر شاہ صوبۂ بنگال کی دیسی زبان یعنی بنگالی کا بہت زبردست مربی و حامی گذرا ہے۔ سلطان کے عہد میں شاہی خزانۂ عامرہ کے مصارف سے مہابھارت کا ترجمہ سنسکرت سے بنگالی میں ہوا۔ مشہور شاعر ودیاپتی کو دربار سلطانی میں بہت بڑا رسوخ حاصل تھا اُس نے متعدد قصیدے سلطان کی مدح میں تصنیف کیے۔ رامائن کا بنگالی ترجمہ سلطان غیاث الدین کی یادگار ہے۔ ہمارے بھائیوں کی احسان شناسی قابل دید ہے کہ وہ اُسکو راجہ کشنا نرائن کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

سلطان حسین شاہ بھی بنگالی کا بہت بڑا محسن تھا۔ مالادھر باسو کو سلطان نے مامور کیا تھا کہ وہ بھاگوت پُران کو بنگالی لباس سے آراستہ کرے۔

سلطانی عہد کے والیوں اور صوبہ داروں نے بھی اس علمی دلچسپی میں بہت بڑا حصہ لیا اس زمانے میں چٹگانگ کی زمام حکومت ایک علم دوست والی "پیراغل خاں" کے قبضہ میں تھی۔ اسکے بعد اسکا بیٹا چھٹے خاں نظامت چٹگانگ پر فائز ہوا۔ پیراغل خاں کے اہتمام سے مہابھارت کا ایک اور ترجمہ بنگالی میں شروع ہوا۔ جسکا سلسلہ چھٹے خاں کے عہد تک جاری رہا۔ پیراغل خاں کو بنگالی تراجم سے عشق تھا۔ وہ روزانہ مہابھارت کا ترجمہ سنا کرتا تھا۔ پیراغل خاں کے زمانے میں "استری پروا" تک ترجمہ ہوا چھٹے خاں نے اس سلسلہ کو "اشوامیدھ پروا" تک پہونچا دیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ادب بنگال مولفۂ دنیش چندرسین صفحہ ۱۲) اس زمانے میں سنسکرت داں صاحبان علم اور ہندو راجہ بنگالی سے متنفر تھے۔ اور اُسکو باقاعدہ ادبی زبان بنانے کے راستہ میں ان کا وجود سنگِ راہ تھا۔ مگر مسلم حکمرانوں اور ناظموں کے علم دوست طبائع، رواداراںہ خصائل اور غیرمعمولی زرپاشی نے اس تنگ خیالی و کجروی کے ٹکڑے اُڑا دیے اور بنگالی کو اس راستے پر لگا دیا جس پر چل کر وہ متمدن السنہ کے مقابل لاف ہمسری مارنے لگی۔ خدا کی شان ہے کہ ہمارے دست حق پرست کے پروردہ اور ہمارے خوانِ کرم کے زلہ رُبا آج ہم پر پھبتیاں اُڑا رہے ہیں۔ سچ ہے

ہم نے جسکو آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اُس حریفِ بدزباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

عہد مغلیہ کے مہتم بالشان سلسلہ کی بڑی اول ترین کڑیاں آپ دو ہمایوں ہیں۔ انکا دور تغیر و

انقلاب کا دور ہے - حکومت کو ہنوز استقلال نصیب نہ ہوا تھا بلکہ ہمایوں تو

"اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوے"

کا مصداق تھا، لیکن اکبری زمانہ علم و فن کی ترقی کا اعلیٰ عہد ہے - نیم جاہل بادشاہ کا دربار ہر مذہب و ملت کے باکمال اصحاب کا مرجع تھا "عبادت خانۂ اکبری" کی مجالس علمی مباحث کے لیے مخصوص تھیں - زردشتی و اسرائیلی، مسیحی و ہنود، سُنّی و شیعہ، براہمنہ و جینی، بُدھ مت و دہریہ، غرض ہر مذہب و عقیدہ کے لوگ وہاں جمع تھے - پادری روڈلف بھی پرتگیزی مقبوضہ گوا سے اس علمی اکھاڑے میں زور آزمائی کے لیے حاضر ہوتا تھا - بادشاہی حکم سے بہت سی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے فارسی یا ہندی میں کیے گئے - ۱۵۸۲ء میں مہابھارت کے ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا - بادشاہ کو اس سے گہری دلچسپی تھی - متعدد ہندو پنڈت مختلف مقامات سے اس کارِ خاص کے لیے طلب کیے گئے - ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی اور سلطان حاجی تھانیسری کی بھی امداد حاصل کی گئی - تکمیل ہونے کے بعد اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" رکھا گیا اور اس کو جا بجا مناسب تصاویر سے بھی مزیّن کیا گیا - ۱۵۸۹ء میں ملا عبدالقادر کے سپرد دوسری خدمت کی گئی - مُلّا سنسکرت میں بھی وحید عصر و یکتائے زمانہ تھا - مُلّا نے رامائن کا ترجمہ فارسی میں کیا - اسی زمانے میں اتھروید کا ترجمہ دوسرے عالم حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کیا گیا - **لیلاوتی** کا ترجمہ فیضی کے حصہ میں آیا - فیضی بھی سنسکرت کا فاضل اور علامہ تھا - ہیئت کی ایک کتاب **تاجک** کا ترجمہ محمد خاں گجراتی کے سپرد کیا گیا - اکبری عہد میں کاشمیر کی سنسکرتی تاریخ کو فارسی کا جامہ پہنایا گیا - مولانا شاہ محمد شاہ آبادی اسکے مترجم ہیں - ترجمے کا نام بعد تکمیل "روضۃ الطاہراں" رکھا گیا - **راج ترنگینی** کا ترجمہ مولانا عماد الدین کا مرہون منت ہے - سنسکرت کی مشہور کتاب "**ہربنسا**" کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا - سنسکرت کی دوسری شہرۂ آفاق تصنیف "**پنچا تنتر**" یا دانش طیور کے نام سے موسوم تھی - مُلّا نصراللہ مستوفی نے نہایت محنت و جاں کاہی سے اسکو فارسی ملبوس سے مزیّن کیا اور اُس کا نام کلیلہ دمنہ رکھا - یہ ترجمہ مشکل تھا اسکو اور زیادہ سہل کیا گیا اور نئی تالیف کا نام عیار دانش ہوا - علامۂ عصر فیضی نے بھی لیلیٰ و مجنوں کے طریق پر فارسی میں مثنوی لکھی - نل و دمینتی کے مشہور افسانۂ عشق و محبت کو سنسکرت سے لیکر نظم فارسی

جامہ پہنایا اور اُس کا نام نل دمن رکھا۔ اس مثنوی کا مشہور مطلع

اے در تگ و پوے تو ز آغاز　　عنقاے نظر بلند پرواز

اسوقت تک زبان زدِ عوام ہے۔ سنسکرتی تراجم کو اور بھی زیادہ دلکش اور دلآویز بنانے کے لیے فن مصوری سے امداد لی جاتی تھی اور فن تصویر سازی و تحریر کے ہر جدید اسلوب سے انکو مرصع و مذہب کیا جاتا تھا۔ شاہنشاہی فرمان کے اتباع میں سنسکرت کے مشہور عالم تصنیف سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ملا عبدالقادر بدایونی نے فارسی میں کیا۔ اس جدید تالیف کا نام خرد افزا نامہ رکھا گیا۔ علامہ ابوالفضل کے زیر نگرانی مقدر ہیئت کی کتابیں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ ان کتابوں میں کشن جوشی۔ گنگا دھر اور مہیش مہانندا شامل ہیں۔ عہد شاہجہانی میں سنسکرت کی تعلیم و ترویج زیادہ تر شاہزادہ دارا شکوہ کی مرہونِ منت ہے۔ دارا شکوہ خود سنسکرت کا فاضل تھا اور بآسانی سنسکرت کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کا ترجمہ سنسکرت میں کر سکتا تھا۔ اس شاہزادہ کو ہندو علوم و فنون سے غلو تھا۔ اسکے وقت کا زیادہ حصہ پنڈتوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کی خدمت میں گذرتا تھا۔ دارا شکوہ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جسکے نگ پر اس نے "پربھو" کندہ کرایا تھا۔ ویدکے ترجمہ کے لیے اس نے جگہ جگہ سے ہندو علماء کو طلب کیا تھا۔ دارا شکوہ نے اپنیشد کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام سرالاسرار رکھا۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ بھی دارا شکوہ کے حُسن سعی کا نتیجہ ہے رامائن کا بھی نیا ترجمہ کیا گیا۔ دارا شکوہ پر "ہندو فلسفہ"، ویدانت اور صوفیاء کے مسئلہ "ہمہ اوست" کا رنگ غالب تھا۔ ان دونوں مسائل کی تشریح کے لیے اُس نے ایک کتاب "مجمع البحرین" تصنیف کی۔ غرض سنسکرت کی تصانیف کے تراجم کا سلسلہ عہد محمد شاہ تک جاری رہا۔ محمد شاہ نے دہلی میں ایک زبردست رصدگاہ تعمیر کرائی اور اُسکا نام "جنتر منتر" رکھا۔ یہ رصدگاہ جاٹوں کی یورش میں تباہ ہوگئی۔ مرزا خیر اللہ، شیخ محمد اور جے سنگھ اس رصدگاہ کے روح رواں تھے۔ رصدگاہی مشاہدات کا نام "محمد شاہی نقشۂ ہیئت" رکھا گیا۔ زیچ محمد شاہی اسی رصدگاہ کی ممنونِ احسان ہے۔ دہلی کی رصدگاہ میں ایک زبردست دھوپ گھڑی تھی جو سمرت جنتر کے نام سے ملقب تھی۔

افسوس! اس وقت دنیاے اسلام پر علمی جمود کی کیفیت طاری ہے۔ علوم و فنون کے جدید شعبوں کی تحقیق و تدقیق تو درکنار ہم میں اتنی بھی صلاحیت باقی نہیں کہ ہم کم از کم

اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو اپنے ذہن ہی میں محفوظ رکھ سکیں

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

محمد یحییٰ ایم اے بدایونی

غزل

جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم

کیا ہنسیں بولیں کہیں دردِ محبت دل میں ہے
چھیڑنے کو یادِ خلوت ساتھ ہر محفل میں ہے

صفحۂ دردِ نہاں کی سطر ہے ایک اک شکن
ہاں مرے ماتھے پہ لکھا ہے جو میرے دل میں ہے

زندگی میں موت کا ڈر خوفِ پُرسش بعدِ مرگ
اک نئی مشکل غرض درپیش ہر منزل میں ہے

دردِ الفت کے مزے لیتا ہوں کہہ سکتا نہیں
تا زباں کس طرح وہ آئے جو لذت دل میں ہے

آفتِ ہوش و خرد ہیں وحشت کی دلچسپیاں
جس سے شمعیں بجھ رہی ہیں وہ ہوا محفل میں ہے

جام کو چھلکا دیا شیشے میں کھا کے نئے جوش
ٹپکی پڑتی ہے وہ آنکھوں سے جو حسرت دل میں ہے

بن گئی جوہر زبانوں کا مرے دل کی خلش
ذکر اب رازِ نہفتہ کا ہر اک محفل میں ہے

کچھ نہیں حاجت کماں کی گر نشانے میں ہو جذب
جو ترے ترکش میں تھا وہ تیر میرے دل میں ہے

ہیں سبق آموزِ عالم واقعاتِ زندگی
وہ چراغِ کشتہ ہوں جس کی ضیا محفل میں ہے

درد اک دیتا ہے لاتا ہے وہ اک آرزو
آ رہی ہے کس کس طرح کا راز رکھ دی محفل میں ہے

قصائدِ محشر پر تنقیدی نظر

جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشرؔ لکھنوی کا دیوانِ قصائد مسمّٰی بہ "شفیع محشر" کچھ مدت گذری شایع ہوا ہے۔ قصائد تمامتر اہلبیت اطہار اور ائمۂ کبار کی منقبت میں ہیں۔ دیوان کے آخری اوراق پر چند مشہور احباب کی تقریظیں شامل ہیں جن میں مصنف موصوف کے کلام پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ اصنافِ شاعری میں مشکل ترین صنف قصیدہ ہے۔ چنانچہ غزل گوئی سے متجاوز ہو کر شاعر قصیدہ کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اس طرح قصیدہ کا میدان غزل سے وسیع تر ہے اور اس میں شاعر کے سمندِ فکر کو زیادہ آزادی کے ساتھ جولانی کا موقع ملتا ہے۔ گذشتہ دَورِ شاعری میں قصیدہ محض سلاطین و اُمراء کی مدحت سرائی کے لیے وقف سمجھا جاتا تھا اور کسی دوسرے عالی تر مقصد میں اس کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ گویا یہ شعرا کے لیے دنیاوی اعزاز و دولت حاصل کرنے کا آلہ رہ گیا تھا۔ موجودہ دَور میں شاعری کی بالعموم اور قصیدہ گوئی کی بالخصوص کساد بازاری کے اسباب مشرقی سلاطین کا انتزاعِ سلطنت، نظامِ حکومت کا تغیر، اور اُمراء کے سلبِ اختیارات وغیرہ کہے جاسکتے ہیں لیکن فی الحقیقت اس کا سب سے بڑا راز عالمگیر شاعرانہ مذاق کی تبدیلی ہے۔ اب کسی شاعرانہ خوبی کا معیار شوکتِ الفاظ اور بعید از واقعہ حالات کی مبالغہ آمیز بندش نہیں، بلکہ حقیقی جذبات اور کارآمد خیالات کا اظہار ہے۔ اور یہی فی الواقع شاعری کا اچھا مصرف ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ منقبت نگاری شاعری کا بالعموم اور قصیدہ گوئی کا خاص کر اعلیٰ ترین مقصد کہا جا سکتا ہے لیکن شاعری کی یہ صنف جس قدر اہم ہے اُسی قدر دشوار بھی۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ شاعر کو اس باب میں فطرت کی طرف سے خاص طور پر مذاقِ سلیم اور جوہرِ استعداد مناسب ودیعت ہوا ہو۔ کیونکہ فطری استعداد کی عدم موجودگی میں شرفِ قبول حاصل ہونا نہ صرف مشکل بلکہ امرِ محال ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ شعراء کے حلقہ میں ہم کو ایسے شاعر جنھوں نے اس صنف میں معراجِ کمال حاصل کیا ہو صرف معدودے چند نظر آتے ہیں۔

جنابِ محشرؔ کے کلام میں شاعرانہ محاسن کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں

مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں۔

رفعتِ تخیل میں بعض بعض جگہ تو جناب محشر کا پایہ کسی طرح قاآنی سے کم نہیں رہتا ۔ ملاحظہ ہو

وہی میں ہوں کہ جوشِ نشہ میں میری نگاہوں نے　　لگائے بارہا نشترِ رگِ ابرِ بہاراں پر

وہی مینوش ہوں جس وقت کھولا منہ صراحی کا　　اُڑا اس طرح جوہر چھا گئی بدلی گلستاں پر

لطافتِ خیال کے باب میں انشا نے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں لیکن جناب محشر کا یہ شعر بھی لطافت کی جان ہے :-

زحمتِ تشریف سے چہرہ پہ سُرخی آ گئی　　کیا ہی رنگِ حسن میں ڈوبا ہوا پھولا گلاب

ذیل کے شعر میں بہار کے اعلان کا پیرایہ کس قدر لطیف اختیار کیا گیا ہے :-

دیتے ہیں غنچے چٹک کر نغمۂ بلبل کی داد　　کر رہے ہیں عاشق و معشوق اعلانِ بہار

رہوارِ تخیل کی میدانِ منقبت میں جولانی ملاحظہ ہو :-

جو ادنیٰ شحنۂ عدلِ شہِ والا کا آیا ہو　　نہ لے مریخ پھر صبحِ ابد تک نامِ جلادی

ید اللّٰہی دکھائی آپنے یوں جنگِ خیبر میں　　کہ توڑا کفر کے رشتے کی صورت بابِ فولادی

بہار کی ردیف میں بےشمار قصائد کہے گئے ہیں، لیکن جناب محشر کے قصیدہ نے منقبت کے پیرایہ میں اس ردیف کو چار چاند لگا دیے ہیں :-

گلشنِ محبوبِ خالق کے گلِ شاداب ہیں　　جنکا اک کہنہ سراپردہ ہے دامانِ بہار

آپ کے گلزارِ معنیٰ کی اگر پھیلے شمیم　　گھیر لے کون و مکاں کو دورِ دورانِ بہار

طبعِ روشن سے جو دیں افتادہ طینت کو ضیا　　غازۂ روئے جناں ہو خاکِ میدانِ بہار

عدل انکا قلبِ دشمن میں جو نیکی ڈالدے　　تا قیامت ہو خزاں سے نگہبانِ بہار

آتشِ قہر و غضب سے ہوں اگر پیدا شرر　　کا غذِ آتش زدہ بنجائے دامانِ بہار

مندرجۂ بالا محاسن کے ساتھ ساتھ جناب محشر کے کلام میں بعض ایسی فروگذاشتیں بھی نظر آئیں گی جنکے متعلق ماننا پڑیگا کہ وہ جناب محشر جیسے کہنہ مشق، ماہرِ فن اور پُرگو شاعر کے شایانِ شان نہیں ہو سکتیں۔ اس مختصر ریویو میں ہم اس فروگذاشت کے پہلو کو بھی جس کی موجودگی ہر مصنف کے کلام میں کم و بیش ہونا فطری امر ہے مختصراً پیش کریں گے۔ اس طرح تصویر کے اس تاریک رخ پر کسی قدر روشنی پڑ جائے گی جسکی عدم موجودگی میں دائرۂ تنقید محدود و ناقص

ہو کر رہ جاتا ہے۔

اولاً ہمارا اشارہ صرف اُن اغلاط کی جانب ہے جو شاعرانہ نقطۂ نظر سے سرزد ہوئی ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور عقیدتمندانہ غلو کی بنا پر جو ہیں وہ اسکے علاوہ ہیں۔ با ایں ہمہ جناب محشر کا کلام دیگر مختلف اعتبارات سے بلند پایہ اور فی الجملہ قابل ستائش ہے اور آپ موجودہ شعرا میں ایک ممتاز اور بلند درجہ پانے کے مستحق ہیں۔

ان اغلاط کی مثال میں ہم جناب محشر کے دیوان قصائد سے چند اشعار انتخاب کر کے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں:—

اگر محشر ہوں پی لوں گا میں الدن نیت بھر کے   قیامت کا بھروسہ ہے مجھے جذبات پنہاں پر

ظاہر ہے کہ "نیت" میں صحیح یائے مشدد ہے نہ کہ متحرک۔ یہ ایسی فروگذاشت ہے جو کسی طرح اجازاتِ شعر کی حد میں نہیں آسکتی۔

نیز ملاحظہ ہو:—

یہ دنیا درمیاں میں اک حدِ فاصل ہو کیا یعنی   جیوں گا تیرے احساں پہ مروں گا تیرے احساں پر

اس شعر میں حد کی دال بالتشدید ہونا چاہیے۔

اسی طرح اس شعر میں:—

شگافِ خامہ جسکا حیدرِ صفدر کی نصرت میں   بنا ہے درمیاں میں حق و باطل کے حدِ فاصل

ذیل کے شعر میں "لے" کی "ی" وزن سے گر جاتی ہے، جو اگرچہ اجازات کی حد میں آتا ہو لیکن شاعرانہ معائب میں ضرور داخل ہے:—

وہ ساقی جسکا جامِ شربتِ دیدار پینے کو   لے آیا جذبۂ دل کھینچکر آدم کو جنت سے

مندرجۂ بالا شعر ہمارے سرسری انتخاب میں آگیا ہے، ورنہ اس نوع کے اغلاط جو اس سے زیادہ سنگین اور بدنما ہیں جناب محشر کے دیوان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

دوسری نوع کے تحت میں وہ اغلاط ہیں جو "غلوِ مذہبی" کی بدولت، جسے "فرطِ محبت" سے تعبیر کیا جاتا ہے پیدا ہوئی ہیں۔ اور ہماری نظر میں یہ اغلاط کی معیوب ترین قسم ہے۔ جناب محشر کا یہ قول کہ:—

بجوشِ منقبت مدہوشیاں بھی عین ملت ہیں   نہیں پروا اگر محشر کو کہدے کوئی غالی ہے

غلو کام آئیگا یا دشمنیٔ آلِ محمدؐ سے   زمانہ دیکھ ہی لے گا قیامت ہونے والی ہے

برات کی سند نہیں ہو سکتا۔ اگر غلو کے جذبہ نے فرقِ مراتب باقی نہ رکھا جسکی مثال نُصیری کا عقیدہ پیش کرتا ہے تو ایسا غلو مستحسن نہیں بلکہ خسرانِ عظیم کا باعث ہے۔ گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ لیکن محشر صاحب بالخصوص اُس موقع کے لیے کیا کہیں گے جہاں اُنھوں نے اہلبیت کی منقبت کے غلو میں احترامِ شانِ رسالت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

کا مفہوم پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو :۔

جہانِ فطرت میں اُس کا ہمسر خیالِ انساں کہاں سے لائے

کہ جسکو ذات و صفاتِ احمدؐ سے ادّعا ہو برابری کا

خدائی صدقے اس جو لانگہِ حسنِ امامت پر جہاں مُہر نبوت کو بھی شوق پائمالی ہے

اسی "جوشِ غلو" یا جذبِ محبت سے بے اختیار ہو کر جناب محشر دیگر انبیا علیہم السلام کی شان میں ایسے کلمات ادا کر گئے ہیں جن سے صاف طور پر تنقیص و اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ اس نوع کے اشعار اسکے تقریباً ہر قصیدہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند اشعار درج کرتے ہیں:

ید بیضا کلیم اللہ نے پایا انکے صدقہ میں دمِ حسنِ عطا یہ قدرتِ روشنخیالی ہے

قصۂ یوسف شنیدہ واقعہ یہ دیدہ ہے جوشِ عشرت کا سبب اہلِ ولا سے پوچھیے

گویا قصۂ یوسف کی صداقت میں جو نصِ قرآنی سے ثابت ہے شبہہ کی گنجائش ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ذیل کے اشعار سے انبیائے اولو العزم کی شان میں استخفاف کا پہلو نکلتا ہے :۔

زہدِ عیسیٰ کی ہیں گو چوتھے فلک تک شہرتیں فقر کی حالت میں فخرِ نفسِ حیدر دیکھ لو

چلے ہو طور پہ سننے کو موسیٰ یار کی باتیں خدا ہی راس لائے حسرتِ دیدار کی باتیں

حشر کا روز آئے تو عید خدا دکھائے تو جب کی سند کہ انبیا آپ کو مقتدا کہیں

شراب حُبِ علی کا ہے میری بزم میں دَور حلال کہ کے جسے انبیا ہوے عاقل

ترے کرم کو اگر دیکھیں نزعِ مومن میں مسیح و خضر کو ہو جائے زندگی مشکل

رسولانِ سلف کو جب ہوا قربِ خدا حاصل کہ دنیا کو کیا طے آپ کی راہِ ہدایت سے

وہ درپردہ جمالِ مرتضیٰ کی ایک جھلکی تھی کیا تھا طور پر جسنے کلیم اللہ کو غافل

جناں سے انبیا کی روحیں کہتی ہوئی آئیں — ہمارے ترک اولیٰ کی بھی حل ہو یا علی مشکل

کہاں ہیں حضرت یوسف خدا اب سامنے آئیں — جمالِ مرتضیٰ نے سارے دعوے کر دیے باطل

بے تکلف قبر میں پھر دیکھنا حُسنِ علی — جلوہ گاہِ طور سے موسیٰ پھریں ناکامیاب

آئینِ کلیم میرے ساتھ نورِ خدا نجف میں ہے — جذبۂ شوق طور تک جا کے دکھا دیا تو کیا

نہ جانے موسیٰ پہ کیا بنی تھی کہ طور کی شکل پھر نہ دیکھی — بُرا نہ مانے کوئی تو کہدیں یہ شانِ شوق لقا نہیں ہے

جناب یوسف پہ پاک دامن ہنسا تو دل کو ہوئی مسرت — ارے زلیخا ذرا خبر لے یہ مقتضائے وفا نہیں ہے

وغیرہ۔

اس نوع کے گستاخانہ تخیلات عاشقانہ شاعری میں نہ صرف جائز بلکہ بدقسمتی سے اُسکے طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں لیکن منقبت کے باب میں یہ کہاں تک قابلِ قبول یا قابلِ درگزر ہو سکتے ہیں، اسکا فیصلہ ہم ناظرین کے ذوق سلیم پر چھوڑتے ہیں۔

اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جناب محشر مذہب امامیہ رکھتے ہیں ہم یہ عرض کریں گے کہ جناب محشر کے عقائد فی الحقیقت اُس متجاوز عن الحد اور محدود شیعی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سب وشتم یا بدرجۂ اقل نوک جھونک کو اپنا شعار مذہبی سمجھ رکھا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم جناب محشر کے چند اشعار پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

یہ صدائے بازگشت اب تک غدیرِ خم کی ہے — مصطفےٰ کا جز علی کوئی نہیں نائب مناب

وجہ نزولِ انما خاص علی کی ذات ہے — فرطِ ہوس میں اوروں نے گھر بھی لُٹا دیا تو کیا

ثانی خلیفۂ برحق علی امین اللہ — علی وصیِّ بلافصل و رہبرِ کامل

علاوہ ازیں بعض قصائد میں طوالت و اطناب حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے۔ مثلاً قصیدہ زیرِ عنوان "مناظرۂ حقیقی" میں سوال وجواب کی ایک لڑی قائم کرکے ہر پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کو دوسرے شعر کے مصرعۂ اولیٰ سے مربوط کیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ کے درمیانی حلقوں میں اکثر مقامات پہ ندرت و لطافت مفقود ہو گئی ہے اور بھرتی کے جملوں اور بڑے بیت الفاظ کا داخلہ مذاق سلیم پر گراں گزرنے لگتا ہے۔

محبوب علی صدیقی

ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی

ایک دلچسپ مکالمہ

(اردو شعر و شاعری پر)

گرمی کا موسم صبح کا وقت، دل میں آیا کہ آج سویرے چل کر دہلی سے جو چیزیں درکار ہیں اُنھیں خرید لاؤں۔ چاندنی چوک پہونچا تو معلوم ہوا کہ ابھی دُکانیں نہیں کھلیں۔ تقریباً آٹھ بجے ہوں گے۔ اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ دس بجے تک کا وقت کہاں اور کس طرح کاٹا جائے۔ فوراً خیال آیا کہ احمد مرزا سے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی اور غالباً اُنکو شکایت بھی ہوگی کہ میں اکثر دہلی آتا جاتا ہوں اور اُن سے کئی مہینے سے نہیں ملا۔ چلو آج اُن سے ملیں اور بعد ازاں چاندنی چوک سے چیزیں خرید کر غازی آباد واپس ہو جائیں۔ جلدی جلدی قدم اُٹھا کر میں احمد مرزا کے عالیشان مکان پر پہونچا۔ حضرت ایک کرسی پر بیٹھے ہوے حقے کا شغل فرما رہے تھے اور دو چار اصحاب جو میرے بھی شناسا تھے اِدھر اُدھر کرسیوں پر متمکن تھے۔ مجھے دیکھتے ہی احمد مرزا نے کہا "آج کہاں بھول پڑے؟" اور دیگر حضرات نے کہا "بھئی خوب آئے، آپ سے تو عرصے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی" مزاج پرسی اور معمولی شکوہ و شکایت کے بعد سلسلۂ کلام یوں شروع ہوا جو غالباً پہلے سے جاری تھا:

احمد مرزا - "بھئی! مجھے تو جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، اور فانی بدایونی کے کلام میں ایک ندرت معلوم ہوتی ہے اور ہماری شاعری جو ابتذال کی حد تک پہونچ گئی تھی اور نواب مرزا داغ مرحوم کے بعد ہر غزل گو نے جو اپنا شعار معاملہ بندی قرار دے لیا تھا اور غزل کو ہزل بنا دیا تھا اُس شاہراہ سے ہٹ کر چند شعراء نے نئی راہ نکالی جن میں سے یہ تینوں حضرات ضرور قابل الذکر ہیں۔ انھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ اُردو شاعری محض زلف پیچاں اور کنگھی چوٹی تک محدود نہیں ہے۔ اس میں اعلیٰ خیالات بھی نظم ہو سکتے ہیں۔ اور غزل ہی وہ میدان ہے جس میں ہر قسم کے جذبات و احساسات نہایت عمدگی کے ساتھ مختصر طور پر ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔"

راقم - "آہا! آج تو پروفیسر احمد مرزا صاحب اُردو شاعری پر لیکچر دے رہے ہیں! بھئی غور سے سُنو۔"

احمد مرزا - (ذرا ہنس کر اور راقم سے مخاطب ہو کر) "خیر! لیکچر ویکچر تو نہیں! آپ کے آنے سے

پہلے کچھ اسی قسم کی باتیں آپس میں ہو رہی تھیں۔ میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ اتفاق سے آپ بھی تشریف فرما ہیں۔ تبادلۂ خیالات نہایت عمدہ چیز ہے کچھ آپ بھی اس بارے فرمائیے"

راقم۔ (اظہار، عابد، محمود کی طرف دیکھ کر) "پہلے کچھ آپ حضرات ارشاد فرمائیں تو مجھے اصل بحث کا پتہ چلے۔ پھر میں بھی اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا"

اظہار۔ بحث صرف یہ ہے کہ "تغزل اُردو شاعری کی جان ہے اور اُردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل ہی کو ترقی دینی چاہیے"۔

عابد۔ احمد مرزا صاحب نے اُن اصحاب کے نام لیے تھے جنھوں نے تغزل کا اعلیٰ معیار قائم کر دیا ہے۔

محمود (راقم سے مخاطب ہو کر) اب آپ کہیے۔ آپ اس خیال سے متفق ہیں یا آپ اس کی تردید کے لیے تیار ہیں۔

راقم۔ میرے خیالات سے آپ صاحبان بخوبی واقف ہیں۔ میں تو اُردو زبان کی ترقی کے لیے سرے سے شاعری ہی کو کچھ عرصہ کے لیے بند کرنا چاہتا ہوں اور نثر کے میدان میں ہر تعلیم یافتہ شخص کو یکہ تاز اور شہسوار دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اب تک غزل لکھے چلے جاتے ہیں حالانکہ اس صنف میں اب کچھ لکھنے کے لیے باقی نہیں رہا اور ہمارے بزرگ اساتذہ اس مضمون پر اس قدر خامہ فرسائی کر چکے ہیں کہ اب غزل لکھنا حماقت شعاری میں داخل ہو گیا ہے۔ مرزا غالب مرحوم کی تقلید میں اگر زور لگا کر اور عمر ضائع کر کے بعض اصحاب کچھ عمدہ شعر بھی کہہ لیتے ہیں تو میرے نزدیک کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ کیا ان کا حاصل عمر یہی ہے بہ قول مولانا حالی

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں تو بھانڈ آ کی غزلیں مجالس میں گائیں

شاید آپ صاحبان کہیں کہ اب بھانڈ تو اُن کی غزلیں نہیں گاتے البتہ وہ خود اپنی غزلیں ترنم کے ساتھ مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور لوگ اُنکے اشعار پڑھ پڑھ کر سر دُھنتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن ایک زمانہ آئے گا جب ہماری آیندہ نسلیں ہماری اس غلطی کو کبھی معاف نہ کریں گی۔ ہم اپنے بزرگ اُستادوں کو اس وجہ سے معاف بھی کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر اور اُس سوسائٹی میں رہ کر غزل لکھتے تھے جبکہ شاعری کا اصل مفہوم غزل ہی سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب شاعری کا مفہوم غزل تک محدود نہیں رہا۔ اور نہ وہ حالات

رہے۔ شاعری میں ہر قسم کے جذبات و احساسات کے اظہار کے علاوہ ہر کیفیت کا نقشہ کھینچنا، ہر واقعہ کو اصل کی طرح کر دکھانا، ہر خیال کو اس انداز سے بیان کر دینا کہ سادہ لفظوں میں اس کا اظہار اگرچہ دلکش نہ ہو، تاہم شعر میں وہ نہایت مرغوب اور مطبوع خاطر ہو جائے۔ یہ سب باتیں شاعری میں داخل ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کو شاعری سمجھ رکھا تھا اب یہ صرف اصنافِ سخن میں سے ہیں۔ لفظ شاعری کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانہ میں خدا کا شکر ہے لوگ شاعری کو اُس کے حقیقی معنوں میں سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن جس طرح انقلابِ فرانس اصلاحاتِ آئینِ حکومت کی بنا پر واقع ہوا تھا اور لوگ بادشاہت سے متنفر ہو کر بادشاہ اور اُس کی ملکہ کو قتل کر چکے تھے مگر ایک شخص نپولین بونا پارٹ کے زیرِ فرمان ہو کر وہ شہنشاہیت کو پسند کرنے لگے، اور نپولین کے زوال کے بعد بھی خاندان بوربون (جو صدہا سال سے فرانس پر حکومت کرتا چلا آتا تھا) سے ہمدردی ظاہر کرنے لگے۔ اُنکو پھر اپنا بادشاہ بنایا اور بعد ازاں اُنکی کمزوریوں سے تنگ آ کر پھر نپولین سوئم (جو نپولین بونا پارٹ کا بھتیجا تھا) کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دیدی یہاں تک کہ فرانس و پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء نے فرانس میں جمہوری سلطنت مستقل طور پر قائم کر دی۔ اور اب فرانس برابر جمہوری سلطنت چلا آتا ہے۔ اسی طرح ہماری اُردو شاعری میں غزل کی بے تکی، قصیدہ کے مبالغہ اور مثنوی کی تلخی نے اصلاحِ شاعری کا خیال پیدا کیا۔ کرنل ہالرائیڈ نے ہماری شاعری کے انقلاب میں روبسپیر کا کام انجام دیا۔ آزاد نے لیفٹ کا اور حالی ہماری شاعری کے زمانۂ انقلاب میں رفتہ رفتہ جنرل بونا پارٹ، پھر قونصل اول اور پھر شہنشاہ نپولین ہو گئے۔ جس طرح قدیم طرزِ حکومت کے دلدادہ فرانس میں برابر اپنی ریشہ دوانیاں کرتے رہے، اسی طرح ہماری زبان میں قدیم طرزِ شاعری کے دلدادہ اپنے رنگِ تغزل و ترنم سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ اصغر ہوں یا فانی، جگر ہوں یا عزیز ان کو خاندان بوربون کے افراد میں سمجھنا چاہیے اور اقبال کو نپولین سوئم کہنا بجا ہے۔ لیکن جب تک ہماری شاعری کے دورِ حاضر میں کوئی جنگِ فرانس و پروشیا ۱۸۷۰ء واقع نہ ہو گی اُسوقت تک ہماری شاعری کی جمہوری سلطنت مستقل طور پر قائم نہ ہوگی یعنی جو اصلاحات ہم اپنی شاعری میں کرنا چاہتے ہیں اور جو مشروطہ ہم کو زمانۂ انقلاب میں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری نے بخش دیا تھا اُس پر عمل درآمد کمل طور پر اُسی وقت

ہو سکتا ہے جبکہ قدیم طرز شاعری کی فرانسیسی افواج کو موجودہ اسلوب بیان پروشیا کی افواج کی طرح شکست فاش دے اور ہمیشہ کے لیے ہماری شاعری میں طرز نو کی جمہوری حکومت قائم کر دے۔ انظہار صاحب کا یہ فرمانا کہ تغزل اُردو شاعری کی جان ہے اور اُردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل ہی کو ترقی دینی چاہیے، کہاں تک درست کہا جا سکتا ہے۔ نہ تغزل اُردو شاعری کی جان ہے اور نہ اُردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل کی ضرورت ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہماری زبان تغزل کے اعلیٰ نمونے پیش کر سکے، لیکن دیگر اصناف سخن میں وہ صفر کے برابر ہو؟ - خدا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے حالی کو جس نے مدوجزر اسلام اور چند مقبول خلائق نظمیں یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ ہمیشہ حقیقی شاعری کی طرف متوجہ کرنے میں نشان راہ کا کام دیتی رہیں گی بیشک غزل کے ایک شعر میں ایک خیال نظم ہو سکتا ہے لیکن نیچرل نظمیں ایک شعر میں نہیں کھپ سکتیں جن کے لکھے جانے کی ہماری زبان میں سخت ضرورت ہے۔

انظہار۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا صاحب تغزل سے اس قدر بدظن ہیں کہ غزل میں کوئی خوبی ہی نہیں پاتے۔ کیا یہ کم تعریف کی بات ہے کہ جب تغزل میں بہ قول تنہا صاحب کوئی مضمون ہی ادا کرنا باقی نہ رہا تھا ہمارے نوجوان شعراء نے اپنی نئی طرز نکالی اور پرانے مضامین کو خیر باد کہہ کر نئی نئی تراکیب اور نئی نئی تشبیہات پیدا کر کے اپنے خیالات جدیدہ کو نئے انداز سے بیان کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا صاحب نے داغِ جگر، روح نشاط اور باقیاتِ فانی کو نہیں دیکھا ورنہ تغزل کی نسبت اُن کی ایسی سخت رائے قائم نہ ہوتی۔

احمد مرزا۔ خدا کا شکر ہے کہ انظہار صاحب! آپ میرے ہم خیال نکلے۔ میں تو تنہا صاحب کی تقریر سے ڈر گیا تھا کہ انقلاب فرانس کی مثال دیتے ہوئے کہیں تنہا صاحب عہد ہولناک نہ قائم کر دیں اور ہمارے دل پسند شعراء اصغر و جگر و فانی کو محبوب پھانسی کے حوالے کر دیں۔

عابد۔ آپ کا خوف بیجا نہیں ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

محمود۔ لیکن مجھے تنہا صاحب کی تقریر کے لفظ لفظ سے اتفاق ہے۔ میں آپ صاحبان سے پوچھتا ہوں کیا شاعری اسی کا نام ہے؟ اور ان اصحاب ثلاثہ کے مداحان و ہوا خواہان

جو غالب و مومن کی شاعری کو نقش اول اور ان حضرات کی شاعری کو نقش ثانی اور بہتر قرار دیتے ہیں صحیح رستہ پر ہیں؟

اصغر۔ رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بنجائے　　　　جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

یعنی رند جس برتن میں شراب پی لے وہی اُس کا پیالہ ہے اور جس جگہ بیٹھ کر پی لیتا ہے اُس کے نزدیک وہی میخانہ ہے۔ آجکل بیٹھ کے کی جگہ بیٹھ کر استعمال ہوتا ہے۔

غالب۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

" پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

کیوں صاحبان! اصغر کے نقش ثانی نے غالب کے نقش اوّل میں کیا اضافہ فرمایا؟

جگر مرادآبادی:

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی　　　　یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہوجائے

غالب۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

شاید جگر کے نقش ثانی نے غالب کے نقش اوّل کو مٹا دیا!

اصغر۔ وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے　　　　اُنکی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

غالب۔ پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوے یار　　　　جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو میں

شاید یہاں بھی نقش ثانی نقش اول سے سبقت لے گیا۔ اس غزل میں اصغر صاحب نے غالب کے قافیوں کو بچا بچا کر اپنے قافیے نظم کیے ہیں۔ صرف ٹھہرا اور رہگذر کا قافیہ دونوں کے یہاں بندھا ہے۔ اسی غزل میں اصغر کا ایک شعر ہے جو عجیب معلوم ہوتا ہے۔

" آشوب گاہ حشر مجھے کیوں عجیب ہو　　　　جب آج دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

"عجیب ہو" کا ٹکڑا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید آپ صاحبان مجھے سمجھا سکیں۔ کم از کم محاورۂ اہلِ زباں تو یہ نہیں ہے۔ "عجیب معلوم ہو" یا "عجیب دکھائی دے" کہتے ہیں۔ "عجیب ہو" آج ہی سُنا ہے۔ بے شک یہ ضرور کہتے ہیں کہ "تم بھی عجیب آدمی ہو" مگر اس موقع پر "عجیب ہو" کا استعمال عجیب و غریب ہے۔ ایک مرتبہ تجلی اپریل ۲۶ء میں اصغر صاحب کے اس شعر پہ اعتراض کیا گیا تھا جو سچا تھا

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھکو شوقِ عریانی　　　　کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیبِ گریباں کو

اعتراض تھا کہ جیب اور گریباں ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں جنکو واوِ عطف سے مربوط کیا گیا ہے اگر جیب و گریباں کے بجائے میرے گریباں کردیں تو اعتراض جاتا رہے۔

اصغر صاحب فرماتے ہیں

وہ لذتِ الم کا جو خوگر سمجھ گئے		اب ظلم مجھپہ ہے ستمِ گاہ گاہ کا

یہ ستمِ گاہ گاہ کا ظلم کیا معنی؟ ظلم کا ظلم بے معنی بات ہے اس سے تو ظلم کے بجائے لطف ہوتا تو بہتر ہوتا۔

غالب۔ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ		ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

الغرض اصغر کیا جگر کیا اور فانی کیا سب کے کلام میں نقش ثانی، نقش اول سے بہت پست پایا جائے گا۔ آجکل تعلیم یافتہ اصحاب یا مدح خواں اشخاص سرقہ کو نقش ثانی کہکر حضرات شعرا کی ہمت افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ فانی کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں ورنہ اسکا موازنہ بھی غالب بیچارے سے کردیا جاتا۔ بیشک ہم لوگوں پر مردہ پرستی کا الزام ہے لیکن جواب میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ گلستان سعدی کا جواب ممکن نہ تھا اور نہ ہے۔ اسی طرح دیوان غالب کا جواب نہ ممکن تھا اور نہ ہے۔ کیا غالب کے اس شعر کے مقابلہ میں داغ جگر، نشاط روح اور باقیاتِ فانی ارزاں نہیں ہیں؟

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی		چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

دوسرا لاجواب شعر سنیے

شال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر		کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ایک تیسرا شعر اور سنیے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں		موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

احمد مرزا۔ ہم میں سے ایک شخص بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اصغر یا جگر یا فانی، غالب و مومن سے سبقت لے گئے۔ ایسا کہنا نافہمی کی دلیل ہے۔ سبقت لیجانا کیا معنی انکے عشر عشیر بھی نہیں۔ لیکن میں ان صاحبان کی شاعری کا ایک اور وجہ سے معتقد ہوں۔

ہم جسپہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور		عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اصل یہ ہے کہ مرزا داغ کے شاگردوں نے محاورات اور روزمرہ کی بندش میں وہ صفائی دکھائی کہ حقیقی شاعری کوسوں دُور ہوگئی۔ ایسے پُرشور زمانہ میں اول اقبال نے صدائے احتجاج بلند کی

بعد ازاں فانی، جگر اور اصغر نے اپنے شگفتہ اور بلند کلام سے تغزل کی مٹی پلید ہونے سے بچائی۔ میں تو صرف اس وجہ سے انکے کلام کو پسند کرتا ہوں ۔ بے شک یہ لوگ غالب کی ترکیبیں باندھتے ہیں، غالب کے نقش قدم پر چلتے ہیں، غالب کے انداز پر ترکیبیں تراشتے ہیں اور فانی صاحب غالب کی تقلید میں کبھی مہمل بھی فرما دیتے ہیں۔ مثلاً

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

یا- جبر قبول عام کر، کار دِ فغاں تمام کر
غیرتِ غم کو رام کر، اُف کی مجال رہ نہ جائے

وصل خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں
یا د و صال مختصر ل کے شب دراز میں

یا- زہر ہے یاد دلے دل وہ ہیں کہ موت ہی قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

با ایں ہمہ ان صاحبان کے کلام میں خوبیاں زیادہ اور عیوب کم ہیں۔ نقائص سے کسی کا کلام خالی نہیں ۔ خود غالب کا نسخۂ حمیدیہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ حضرت کے کلام میں کسقدر مہملات ہیں۔ اور صاف اور سادہ کلام میں بھی عیوب ہیں، مثلاً

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

یہ "عذر لانا" اردو زبان کا کونسا محاورہ ہے؟ "عذر کرنا" بولتے ہیں ۔ میرے نزدیک لوگوں میں تناسب کا خیال کم ہے اس وجہ سے وہ اِن اصحابِ ثلاثہ کو غالب و مومن سے نسبت دیتے ہیں ۔ ورنہ ان حضرات کو

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اظہار- واہ! احمد مرزا صاحب واہ! آپ بھی فانی وغیرہ کے خوب معتقد نکلے۔ اس سے زیادہ بد عقیدہ اور کون شخص ہو سکتا ہے جو اپنے ممدوح کی مذمت کرے ۔ حضرت! ذرا کلام فانی پڑھیے ۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فانی کی شاہراہ غالب کے رستہ سے علیحدہ ہے ۔ غالب اور فانی کا موازنہ ایک بے جوڑسی بات ہے ۔ غالب کچھ اور کہتا ہے، فانی کچھ اور، مثلاً

فانی- آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

یہ ایک شعر ایک غزل کے برابر ہے ۔

عابد- خوب! بہت اچھا شعر ہے اگرچہ ہماری سمجھ میں مطلب نہیں آیا۔ آپ صاحبان شاید کہیں کہ پھر تعریف کیوں کی؟ میں نے الفاظ کی نشست کی تعریف کی ہے مطلب اظہار صاحب بیان کریں گے۔

اظہار۔ ہم اس مسئلہ پر متانت کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔ اگر مزاح کو دخل دیا جاتا ہے تو یہ گفتگو موقوف کیجیے۔ خوش گپی کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔

عابد۔ واللہ! اظہار صاحب آپ خفا نہ ہوں۔ فی الواقع اس شعر کا مطلب سمجھنے میں مجھے دقت ہوئی۔ میں کہتا ہوں اگر تیرے کوچے کی ضمیر کا مرجع خدا ہے تو اُس کی ذات دیوار اور مکان سے منزہ ہے۔ دوسرے مصرع میں ترا سایۂ دیوار کیا معنی رکھتا ہے۔ اور معشوق مجازی سے مراد ہے تو آسمان کو اس کے کوچے کی زمین کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اگر رہگذر کی زمین کہتے تو بیشک مطلب صاف ہو جاتا۔ کوچہ کے لفظ کے ساتھ مکانات کا تخیل لازمی ہے۔ پھر سایۂ دیوار نہ ہونا کیا معنی؟ بلا شبہ رہگذر کی زمین نہیں کہہ سکتے صرف رہگذر کہنا کافی ہے۔ غرض اسی قسم کے شبہات اس شعر کو سُن کر پیدا ہوے۔ آپ اس شعر کا مطلب ارشاد فرمائیں اور اسکی خوبی بیان کریں۔ مجھے غالب کا شعر یاد آگیا۔ آپ دونوں کا موازنہ فرمائیں

غالب۔ کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لیے ۔۔۔ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

میرا خیال ہے کہ فانی صاحب نے اپنے اس شعر میں غالب کے شعر سے استفادہ کیا ہے۔ بہرحال اب آپ فرمائیے آپ کا کیا خیال ہے؟

اظہار۔ عابد صاحب! اس شعر کا مطلب صاف ہے۔ اتنا ادق نہیں جتنا آپ نے اپنی کم توجہی سے اسے بنا دیا ہے۔ کہتا ہے۔ جس طرح تیرے کوچے کی زمین تیرے قدومِ میمنت لزوم کی رہینِ منت ہے اسی طرح آسمان بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ تیرے کوچے کی زمین پر ترا سایۂ دیوار بھی ہے اور آسمان کو یہ شرف حاصل نہیں۔ معشوق کے کوچے کی زمین کو آسمان پر فوقیت دیتا ہے لیکن کس خوبی کے ساتھ! غالب کے شعر کا مطلب اور ہے۔ اُسکو اس شعر سے کیا واسطہ؟

عابد۔ اچھا صاحب! آپ نے اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیا اور اب میں بھی اسکو اچھا شعر کہتا ہوں لیکن غالب کی طرح جو فانی صاحب نے غزل لکھی ہے اُسکے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو ہم قافیہ ہیں

فانی۔ ہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی ۔۔۔ یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۔۔۔ یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

فانیؔ۔ گم کردہ راہ ہوں، قدمِ اولیں کے بعد — پھر راہبر مجھے، نہ ملا راہبر کو میں
غالبؔ۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
فانیؔ۔ ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہگذر کو میں
غالبؔ۔ جاتا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اب آپ انصاف سے فرمائیے کہ فانیؔ صاحب نے کیا غالبؔ کی غزل کا چربہ نہیں اُتارا۔ بہت سے الفاظ غالبؔ کے بدستور قائم رکھے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ فرق کر دیا ہے جب غالبؔ کی غزل کو بار بار پڑھا جائے گا تو کوئی نہ کوئی مضمون نئے پیرایہ میں ادا ہو جانا کچھ مشکل نہیں۔ تنہاؔ صاحب کبھی غزل نہیں کہتے مگر ایک مرتبہ غالبؔ کی غزل آزار دیکھکر پوار دیکھکر پڑھی تو انھوں اُنھوں نے بھی ایک شعر کہہ دیا جو اچھا خاصہ ہے

تنہاؔ۔ یہ کب کی دشمنی تھی فلک کو ہمارے ساتھ — جلتا ہے اُسکو بر سر آزار دیکھکر

پس یہ حضرات جو غزل گوئی کو اپنا حاصلِ عمر سمجھتے ہیں غالبؔ کے دیوان کو بار بار پڑھ کر کسی نہ کسی رنگ سے قافیوں کو باندھ لیتے ہیں تو اِس میں اِن کی جدّت و ندرت کچھ نہیں۔ فانیؔ کے پہلے شعر میں بہلا نہ دل کیسا بے جوڑ ٹکڑا ہے۔ تیسرے شعر میں نقشِ پا کو دیکھ کر سر دُھننے سے کیا مطلب؟ سجدہ کرنا موزوں تھا۔ مومنؔ فرماتے ہیں

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

رہگذر کے لیے پہچانتا موزوں نہیں بلکہ جانتا ہی موزوں ہے جیسا کہ غالبؔ نے باندھا ہے۔

احمد مرزاؔ۔ ہم لوگ اصل بحث سے کسی قدر دُور جا پڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ غزل اُردو شاعری کی جان ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ سرمایہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ زیادہ تر غزل ہی کا ہے۔ بلاشبہ اب تک تغزل اُردو شاعری کی جان رہا ہے۔ لیکن آیندہ ہم کو دیگر اصنافِ سخن کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑے گا۔ اور زمانہ بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ اگر اپنی زبان کی ترقی و وسعت چاہتے ہو تو ہر قسم کے خیالات اپنی شاعری میں داخل کرو۔ صرف معشوقوں سے باتیں کرنے ہی پر اکتفا نہ کرو یعنی غزل کے علاوہ مثنوی، قطعہ، رباعی سب کچھ کہو۔ دریا، پہاڑ، میدان، بادل وغیرہ سب پر نظمیں لکھو۔ قومی ضروریات بیان کرو۔ دلچسپ پیرایہ میں سیاسیات پر بھی نظمیں لکھو۔ غرض کوئی پہلو نہ چھوڑو۔ استقامِ لفظی پر خواہ مخواہ نکتہ چینی نہ کرو اور متروکات کی فہرست نہ بڑھاؤ

بلکہ توسیع زبان میں کوشش کرو تاکہ ہر خیال عمدگی کے ساتھ بآسانی منظوم ہو سکے۔ ہمارے بزرگ
جو متروکات کی فہرست میں اضافہ فرماتے رہتے تھے اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُنکی جولان گاہ
غزل کا ایک محدود میدان تھا۔ لیکن اگر آپ کو نیچرل شاعری کی طرف قدم بڑھانا ہے تو
متروکات میں اضافہ نہ کیجیے۔ کوئی لفظ بذاتہ بُرا یا بھلا نہیں ہوتا۔ کثرتِ استعمال و عدم
استعمال پر اسکی فصاحت وغیر فصاحت موقوف ہوتی ہے۔ پس اب میرے نزدیک بھی تغزل
کو ترقی نہ دینی چاہیے بلکہ بہ قول تنہا صاحب اس کا سدّباب کرنا چاہیے تاکہ دیگر قسم کی شاعری
کی طرف طبائع متوجہ ہوں۔

راقم۔ دیکھیے! ہمارے بچے جو عشق و حُسن کی گلکاریوں سے محض ناواقف ہوتے ہیں
کس قدر متعجب ہوتے ہوں گے جب ہمارے ابوالشعراء میر تقی میر کا یہ شعر جو اُنکے بہتر نشتروں
میں سے ہے پڑھتے ہوں گے اور یہ شعر اکثر کورس میں انتخاب بھی کیا جاتا ہے۔

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

اُستاد اس شعر کے عشق کو خدا کے عشق پر بھی محمول نہیں کر سکتا۔ مجبوراً اُسکو عاشق و معشوق کی
تصویر کھینچنی پڑتی ہے جو اُستاد کو بھی ناگوار ہوتی ہے اور شاگرد بھی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔
کیا بچوں کو زبان سکھلانے کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے حُسن و عشق کا سبق پڑھایا جائے۔ نیچرل
مضامین میر انیس کے مرثیوں میں بہت ہیں لیکن گھوڑے اور تلوار کی تعریف جو اُنکے یہاں ہے۔
اصلی تلوار اور اصلی گھوڑے کی تصویر کھینچنے میں معذور رہے۔ دیگر واقع کے نقشے اُنھوں نے
اپنے زورِ قلم سے خوب کھینچے ہیں مگر وہ مرثیہ کا جزو ہیں۔ اور ایک دو بند کے بعد حضرت
امام حسین علیہ السلام اور اُن کے اعزہ و اقربا کا نام ضرور آجاتا ہے جسکی وجہ سے وہ عام
دلچسپی کا سامان پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اس لیے اُن کا انتخاب داخلِ کورس
نہیں کیا جا سکتا۔ لے دے کر مولانا حالی ہی کی نظمیں رہ جاتی ہیں جو ہر کورس کے انتخاب میں
شامل کی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں برکھا رُت، مناجات بیوہ وغیرہ
جیسی بلند پایہ نظمیں اضافہ کی جائیں تاکہ کورس سے غزلوں کا انتخاب موقوف ہو سکے۔ اور
غزلوں کو بی۔ اے کورس سے پہلے طلباء کو نہ پڑھایا جائے۔

اظہار۔ میں اس بات سے ضرور متفق ہوں کہ بچوں کو واقعی غزلیں نہ پڑھانی چاہییں
اور ہماری شاعری میں یہ سخت کمی ہے کہ ہم بچوں کے حسبِ حال نظمیں اُردو میں نہیں پاتے۔

حالی کے علاوہ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں بھی خوب ہیں لیکن ہمارے اساتذہ نے اُسکو شاعر ہی نہیں مانا۔ ممکن ہے کچھ اسقام لفظی اُن کے یہاں ہوں لیکن وہ جذبات کی ترجمانی خوب کہتے ہیں اور بیانیہ شاعری کے اُستاد ہیں۔ روضۂ تاج گنج کی تعریف اور کیفیت کیا خوب بیان کی ہے؟ آدمی اور بنجارے کی بھی کیسی اچھی نظمیں ہیں؟

راقم۔ ان اسقام لفظی کی کیا شکایت کرتے ہو؟ میرا خیال ہے کہ اگر شکسپیر ہمارے یہاں پیدا ہو جاتا، ظاہر ہے کہ وہ کم علم تھا اور بہت کم اُس نے تعلیم پائی تھی لیکن شاعری کا ملکہ اُسکی فطرت میں ودیعت تھا، تو ہمارے یہاں کے شعراء ہرگز اُسکو پنپنے نہ دیتے اور وہ بہت زور مارتا تو نظیر اکبر آبادی سے کچھ کم ہی رہتا۔ انگریزوں نے شکسپیر کی وہ قدر کی کہ اُسکو تمام دُنیا کا بہترین شاعر منوا دیا۔ اور جو الفاظ وہ اپنی ناواقفیت اور کم علمی سے غلط استعمال کر دیتا تھا اُن کی جگہ اُسکے کلام کی تشریح و توضیح کے وقت صحیح الفاظ رکھ کر اُن غلط لفظوں کے معنی بتائے ہیں بلکہ لغاتِ شکسپیر کے نام سے علٰحدہ کتاب لکھی گئی اور اُس کے غلط محاورات اور غلط الفاظ کو بتلایا کہ شکسپیر کا ان الفاظ اور ان محاورات سے کیا منشا ہے؟ اِسکو کہتے ہیں قدر دانی! یہی وجہ ہے کہ وہ ڈراما نویسی میں بلاشبہ بے نظیر ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب جس مزے سے اُسکے پلیز (ڈرامے) پڑھتے ہیں ہرگز اپنی زبان کی نظموں کو نہیں پڑھتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگرچہ انگریزی غیر زبان ہے لیکن شکسپیر ہر واقعہ کی تصویر صحیح کھینچتا ہے۔ جذبات اس عمدگی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ دل خواہ مخواہ اس کے مزے لینے لگتا ہے۔ ہماری زبان کی نظموں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ کچھ تو قافیے اور زیادہ تر ردیف کی قید نے ہماری شاعری کو بیکار کر دیا ہے۔ خیالات و جذبات آسانی کے ساتھ نظم نہیں کیے جا سکتے۔ قافیہ اور ردیف کی وجہ سے حشو و زوائد نظم میں داخل کیے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جو بڑی بڑی نظمیں ہیں وہ قافیہ اور ردیف کی قید سے بالکل آزاد ہیں۔ ہمارے یہاں نظم غیر مقفیٰ کانوں کو خوشگوار نہیں معلوم ہوتی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ نظم غیر مقفیٰ کو رواج دیا جائے۔ انکی اہمیت کو انکی کثرت ہی دور کریگی۔

اظہار۔ اقبال کی نظمیں تعلیم یافتہ اصحاب ضرور مزے لے کر پڑھتے [illegible] اُنکے بلند خیالات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ اُنکے یہاں بھی اسقام لفظی اور غلط محاورات موجود ہیں۔ اصل وجہ [illegible] کے ساتھ بیان کیے جاتے [illegible]

لطف کے ساتھ اُن کو پڑھے گا اور اُس کی نظر معمولی کمزوریوں پر نہ پڑیگی۔

راقم۔ اقبال کی اُردو نظمیں بیشک خوب ہیں۔ لیکن اب وہ اُردو کی بجائے فارسی شاعر ہونا چاہتے ہیں۔ ایں خیالست و محالست و جنوں۔ اہل زباں نے فیضی اور غالب کو فارسی کا شاعر نہیں مانا تو اقبال غریب کو یہ درجۂ امتیاز کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آیندہ ہم لوگ بھی اقبال کو اُردو کا قادرالکلام شاعر نہ مانیں کیونکہ وہ اپنے خیالات معلوم ہوتا ہے اُردو میں اُس زور کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں جو وہ ہمارے نزدیک فارسی زبان میں بیان کرجاتے ہیں۔

محمود۔ بیشک تنہا صاحب کا یہ خیال درست ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے دو مثنویاں فارسی زبان میں تحریر فرمائی ہیں اور عذر یہ کیا ہے کہ امیر افغانستان کو پیش کرنے کے لیے فارسی زبان ہی کو ذریعہ اظہار مطالب بنانا ضروری تھا۔ لیکن میں اُن کے اس عذر کو عذرِ لنگ سمجھتا ہوں اس وجہ سے کہ لارڈ بائرن نے اپنے اظہار مطالب کے لیے انگریزی زبان ہی ذریعہ قرار دیا، حالانکہ اُنھوں نے اپنی مشہور نظم چائلڈ ہیرلڈ اٹلی اور یونان کی آزادی کے لیے تحریر کی تھی اور وہ لاطینی زبان میں ایسی نظم لکھ سکتے تھے جو اہل اطالیہ اور اہل یونان کے جذبات بھڑکانے میں تیل پر آگ کا کام دیتی۔ لیکن نہیں، اُن کی انگریزی نظم ہی نے دونوں ممالک بلکہ یورپ میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگادی۔ اور یونان ترکوں سے آزاد ہوکر رہا۔ اور اٹلی متفق و متحد ہوکر آسٹریا ہنگری کے پنجے سے چھوٹا، اور پاپائے روما کو چاروناچار اپنا پایۂ تخت رُما شاہِ اٹلی کے حوالہ کرنا پڑا۔ افغانیوں سے زیادہ اپنے ملک کے ساتھ ہمدردی کرنا ضروری ہے۔ اُنکے بھائی نہایت پست حالت میں ہیں وہ اپنی نظموں سے اپنی قومی ذلت کو دُور کراسکتے ہیں تو اُن کو اُردو ہی میں لکھنا چاہیے کہ اُن کے کلام سے اور اُن کے خیالات سے ہر کس و ناکس مستفید ہوسکے۔ اور اُنکو سرسید کا اتباع کرنا چاہیے جو اپنے قومی تنزل سے گھبرا کر مصر کو ہجرت کرتے تھے لیکن بعد ازاں اپنی قوم کی اصلاح پر کمربستہ ہوگئے۔ اور جو کچھ اُن سے بن آیا ہندوستان ہی میں رہ کر کیا۔ اُردو والے اصحاب کو اپنی زبان ہی میں لکھنا چاہیے اور غیر زبان میں ضرورت اور مجبوری کے سوا قلم اُٹھانا اپنے لیے ننگ و عار سمجھنا چاہیے۔

(گھڑی نے ٹن ٹن گیارہ بجائے)

راقم - اوہو - گیارہ بج گئے ہیں - مجھے اب یہاں سے جلد جانا چاہیے -
احمد مرزا - خیر ہے - ایسی جلدی کیا -
راقم - مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں اور جلد واپس ہونا ضروری ہے -
احمد مرزا - کھانا تیار ہے - اب کھانا کھا کر جانا ہوگا -
راقم - مجھے تکلف کی عادت نہیں - کام ضروری ہے - اس لیے اس وقت معافی کا خواستگار ہوں - یار زندہ صحبت باقی -

احمد مرزا صاحب سے رخصت ہو کر اور چاندنی چوک سے چیزیں خرید کر فوراً غازی آباد واپس آیا - چونکہ یہ مکالمہ دلچسپ تھا اس لیے اسکو قلمبند کیا گیا تاکہ ایڈیٹر صاحب الناظر کے تقاضے سے سبکدوش ہو سکوں -

محمد یحییٰ تنہا (بی اے، ایل ایل بی)

نظم خیالات

لکھنؤ میں موسیقی کالج کھلا — چوک کے استاد بھی ٹیچر ہوے
کیا ترنم ریز ہے تعلیمِ قوم — جب سے بُدّھی خاں پروفیسر ہوے

قوم بھی اب آپ کی ہے، ملک بھی اب آپ کا — راج بھی سب آپ کا، سوراج بھی سب آپ کا
پوچھتے ہیں مالوی جی سے یہ کیوں - کے - سی - متر — کیا سیاست آپ کی ہے، کیا ہے مذہب آپ کا؟

کام کرنا ہے کون سا پہلے — پہلے ٹھیک اسکا تصفیہ کرلو
شوقِ اصلاحِ قوم اگر کچھ ہے — نفس کا اپنے تزکیہ کرلو

ابو عـ[illegible]

لکھنؤ کا موسیقی کالج

بڑے دنوں کی تعطیلوں میں ہم کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم مارس میوزیکل کالج کو دیکھنے گئے جس کا افتتاح گورنر صاحب نے کیا ہے۔ تعلقداران اودھ اسکے اخراجات کے کفیل ہیں۔ دیگر ذرائع سے بھی اُسکو امدادِ مالی غالباً ملتی ہے۔ تعطیلوں کے سبب طالب العلم تو وہاں ہم نہ دیکھ سکے نہ تعلیم کا طریقہ ہمارے مشاہدہ میں آیا۔ البتہ خوش نصیبی سے ہم کو پنڈت بھت کنڈے صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اُن سے مل کر طبیعت نہایت محظوظ ہوئی۔ واقعی یہ صاحب ہندی موسیقی کے مسلم الثبوت ماہر اور عالم ہیں۔ اُنھوں نے تیس سال اسکے تجسس اور تحقیق میں صرف کیے ہیں۔ قدیم اور جدید راگ کی سنگیتیں اُنھوں نے بغور مطالعہ کیں اور اُن کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپین موسیقی کے موٹے موٹے اصول بھی وہ جانتے ہیں۔ اُنکی رائے ہے کہ ایشیائی اور یورپین راگ کے جداگانہ طرز ہیں۔ انکا رنگ اپنا اپنا ہے۔ بہ قول اُنکے ہندی راگ میں ہارمنی خوش اسلوبی سے داخل نہیں ہوسکتی۔ ہم نے جو راگ سازوں اور گلے سے یورپ میں چند ماہ ہوے سُنے تھے، اُنکی کیفیت اُنکے گوش گزار کی۔ ہم کو اس امر کے اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ نوتر دام **Notre dame** گرجے کے آرگن۔ پیرس کے گرینڈ آپرا **Grand opera** اور لنڈن کے تھیٹروں میں جو راگ گایا اور بجایا جاتا ہے ہمیں بہت پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس سے یورپ میں بہت کام لیا گیا ہے۔ ہماری دیسی موسیقی کی صدیوں سے ترقی مسدود ہے بلکہ اس میں اتنی آمیزش ہوگئی ہے کہ اسکے اصلی رنگ میں بہت فرق آگیا ہے۔ یہ کہنا بھی غالباً صحیح ہے کہ جتنا کچھ تھا بھی وہ بھی فراموش ہوگیا۔ ہاں اب پھر اُسکا قدرے چرچا شروع ہوا ہے، اب درجوآمد کے آثار نمودار ہیں۔

پنڈت صاحب موصوف دیسی راگ پر بہت احسان کررہے ہیں۔ اُنکے فیضانِ صحبت کا نتیجہ ہے کہ راجہ نواب علی صاحب تعلقدار نے اسکو اردو جامہ پہنایا ہے، جسکا اُنکو اعتراف ہے۔ بمبئی میں اُن کا لکچر سنکر عطیہ بیگم رحمن نے حال میں ایک عمدہ کتاب ہندی موسیقی پر انگریزی میں تصنیف کی ہے۔ پنڈت صاحب دیسی راگ کے قلمبند کرنے میں بھی مصروف ہیں۔ علاوہ بریں کئی ابتدائی تصنیف فرمائی ہیں جس سے بتدریج طالب العلم فنِ موسیقی سیکھ سکتا ہے۔

علاوہ بریں اُنھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو راگ اور راگنیوں کے سوتر اور اُنکے لکھشن بھی بنائے
ہیں جو حافظہ کو امداد دیتے ہیں اور جن سے مختلف راگ اور راگنیوں میں تمیز ہو سکتی ہے۔
اُنکی ایک شاگرد نے ہم کو ایک راگنی کے سوتر اور لکھشن سنائے جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے
سوتر کا طریق سنسکرت زبان میں قدیم سے چلا آتا ہے مگر مدتوں سے متروک تھا پنڈت
صاحب کا مزاج نہایت سادہ اور طبیعت میں انکسار ہے۔ اُنکی گفتگو ایسی دلکش ہے کہ اُنکے
پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم نے کئی اصحاب سے وہاں سُنا کہ اُنکی طبیعت میں بخل
قطعی نہیں۔ بہت گوّیے اور موسیقار اُن کے پاس آتے رہتے ہیں، وہ اُنکے شبہات رفع
کرتے ہیں، اور جو معلومات مطلوب ہوتی ہیں بلا تامل اُنکو بہم پہونچاتے ہیں۔ ہم کو بھی اُن سے
بہت باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم کو جو کچھ معلوم تھا ہم نے اُن سے عرض کیا۔ اُسپر مباحثہ بھی ہوا۔
اُنھوں نے ہمیں ایک نقشہ بنا کر دکھایا جس میں صبح، دوپہر شام اور رات کے راگوں کی ترتیب
دکھلائی۔ ہم نے اُن سے یہ درخواست کی کہ کسی Laboratory معمل خانے سے سُروں
کے رنگ کی جو کتب سنسکرت میں مذکور ہیں تصدیق کرائیں۔

پنڈت صاحب نے موسیقی کے متعلق کتب کا معقول ذخیرہ جمع کیا ہے۔ ہم نے اپنا
تصنیف کردہ رسالہ "ہندو راگ" اُنکی خدمت میں پیش کیا۔ کالج کے کتبخانہ میں اسکو شرف
قبولیت عطا ہوا۔

شاید قیودِ مذہبی مانع ہوں ورنہ ایسے عالم کو ضرور یورپ جانا چاہیے اور وہاں یورپیوں
کی روز افزوں ترقی کو دیکھنا چاہیے۔ ان کا کمال دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔
شائقان فن موسیقی کے لیے لازم ہے کہ ایسے کالج کو ہر نوع سے امداد کریں تاکہ یہ کالج سرسبز
ہو اور فنِ موسیقی کو پھر تازگی اور ترتیب دے سکے۔
ہمیں اس بات کی تمنا رہی کہ ہم نے طریق تعلیم نہ سُنا۔ پنڈت صاحب فرماتے تھے کہ بی اے ایل ایل
بی اور ہر مذاق کے لوگ شام کو وہاں سبق لینے آتے ہیں اور پانچ چھ ( ) میں تیار ہو جاتے ہیں۔
ہمیں راجہ نواب علی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم اُنکی کوٹھی پر گئے۔ مگر
وہ چند منٹ پہلے اپنے علاقہ کو روانہ ہو گئے تھے۔ اگر وہ ملاقات ہو سکتے تو ہم اپنا ایک ایڈریس جو ہم نے لاہور
موسیقی کانفرنس پر چند سال گزرے پڑھا تھا اُنکی خدمت میں پیش کرتے تاکہ تبادلہ خیال ہو جاتا۔

شیو نرائن شمیم (۱۹۲۶)

شاہی چور

(۱)

ہجرت کو پانچ سو نواسی برس گزرے ہیں۔ قمری منزل دوسری ہے "عروس شب" سولہ مسافتیں طے کر چکی ہے۔ اسلام پر بدقسمتی اور مصیبت کا وقت شروع ہوتا ہے۔ شیر صفت صلاح الدین مرض تپ میں مبتلا ہے۔ مرض میں ترقی ہے۔ مملکت اسلام کے چپہ چپہ میں کہرام مچا ہے اور ہر متنفس شیدائے اسلام شہنشاہِ جلیل القدر پر اپنی عزیز جان قربان کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہے تاکہ وہ فدیہ ہو اور سلطان صحت یاب ہو سکے۔ صلیبی ممالک میں چراغاں ہوتا ہے، دشمنوں کے دل بڑھتے ہیں" حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ محاربات صلیبی کی یاد دوبارہ بیقرار کرتی ہے کہ آخرکار اس ماہ کی ستائیسویں (۲۷) علی الصباح پیام غم لیکر مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ فاتح بیت المقدس کی جاں فروشی اور قومی عصبیت نے کلمہ گو طبقہ میں ایک روح پھونک دی تھی۔ تختِ شاہی کی جگہ گھوڑے کی ننگی پشت اور بزم کی جگہ رزم اسکو زیادہ مرغوب تھی۔ ہر سپاہی فاتحِ ہیکل سلیمانی کے نقش قدم پہ چلنا سعادتِ ابدی تصور کرتا ہے۔ جب جہاد کا اعلانِ عام ہوتا تو دور دور سے عالی قدر شہزادے اس نعمت عظمیٰ میں حصہ لینے کے لیے آتے۔ وادیِ نیل پر معرکہ آرائی تھی۔ صلیبی نشان ہر جگہ بلند تھے۔ عجیب ابتلا و مصیبت کا زمانہ تھا۔ اسی وقت جب اس جہاد کی خبر مصر سے ماوراء النہر تک پہونچی تو اس خبر کو سنتے ہی شہزادہ ناظر والی بدخشاں اور "شہزادۂ سلجوق" والی طبرستان بھی بطور سپاہی کے اعزازِ کلمۃ الحق کی تبلیغ کے لیے شریک ہو گئے۔

(۲)

وادیِ نیل پر معرکہ آرائی ہے۔ ملک الاشرف موسیٰ مقدمۃ الجیش ہے اور مسلمانوں کی ہمت بدخشاں کے شہزادۂ ناظر کی شمولیت سے دوگنی بڑھی ہوئی ہے۔ لڑائی خود بخود بند ہو گئی۔ صلیب پرست طبقہ نے پیغامِ صلح بھیجے مگر "ہیکل سلیمانی" عسقلان، طبریہ، صدبہ وغیرہ مفتوحہ علاقہ جات واپس مانگے۔ اور "معبدِ قدس" کی تعمیر کے لیے بھی رقم دینا نامنظور کی تو عساکر اسلامیہ جنگ کے لیے بیقرار ہو گئے۔ مسیحی فوج کثرتِ تعداد سے بے فکر تھی۔ قیامت ہو گئی۔ چند سر بکف جاں فروش مسلمانوں نے دریائے نیل کو مختلف جگہوں سے

کاٹ دیا جس سے تمام پانی صلیبی محاذ میں جانے لگا - دلدل اور کیچڑ سے پریشان ہوکر فوج نے نقل و حرکت شروع کی - محض اب ایک راستہ باقی تھا اُس پر ملک الکامل اپنی فوج کا بہترین حصہ لیے ہوے موجود تھا - مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دمیاط مسلمانوں کے حوالہ کیا گیا۔ اسی خوشی میں مصر کے ایک گورنر نے اعلان کیا کہ جس "جاں فروش" نے اسلام کی اس قدر اہم خدمت انجام دی ہے اُسکی کنیزی میں لڑکی دینا میں اپنا فخر تصور کروں گا" - مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی - لیکن باوجود تجسس کے بھی "شاہی چور" کا پتہ نہ چلا -

(۳)

"فرشتۂ جابال" جب "آتشیں رُخ" کھولتا ہے تو اُسکی روشنی تاریک سے تاریک مقامات کو بھی منور کر دیتی ہے - بجلی جب تک نہیں چمکتی اُسکی آواز سے کان اور چمک سے بصارت ناآشنائے محض رہتی ہے - جب ایک بار چمکتی ہے تو آنکھوں میں دیر تک خیرگی باقی رہتی ہے اور قوتِ سامعہ اُسکی صدائے مہیب سے متوحش! مشک جب نافہ سے نکلتا ہے تو شامہ اُسکے مشام سے مسرور ہوتا ہے - اور کوئی دنیاوی قوت نہیں ہوتی جو اُسکی بو نکلنے اور قوتِ شامہ کو مشام سے منع کر سکے - "نادرہ" جو ایک مرتبہ آفتاب بنکر طلوع ہو چکی تھی، جو ایک بار صاعقۂ ہوش رُبا بنکر چمک چکی تھی - جس نے ایک مرتبہ اپنے نافہ سے باہر قدم نکالا تھا، ناممکن تھا کہ اب دُنیا کی کوئی قوتِ امکانی اُسکی پردہ داری کر سکتی - وہ بجلی بنکر چمکی "آفتاب" بنکر روشن ہوئی اور نکہت بنکر شامہ تک پہونچی - دل پر اُسکی ابرو کے خنجر چلے، روح نے اُسکی پذیرائی کی اور لبوں نے اُس کے رخساروں کی شراب کو پیا - کانوں نے اُسکی موسیقیت کو سُنا، آنکھوں نے اُسکی تصویر دلوں پر کھینچی - اس میں تو کلام نہیں کہ قرطاسِ عالم پر صدہا بلکہ کروڑہا نقوش صناعِ حقیقی کی صنعت گری کے موجود ہیں، لیکن "نادرہ" نے اپنے "حسن و شباب" کی بدولت جو شہرت حاصل کی تھی، وہ طبقۂ نسواں کے لیے ایک امتیازی نشانِ اعزاز تھا - اگر دورِ ماضیہ کی زلیخا اور کلیوپیٹرا، دورِ متوسط کی نورجہاں اور پدمنی اُسکے عالمگیر حُسن کا شہرہ سُن لیتیں، تو یقیناً شرم سے پانی پانی ہوکر اپنے عنصرِ اصلی سے واصل ہوجاتیں - قصرِ جلالت کا کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس شمعِ جبینالی کا پروانہ نہ ہوتا - بڑی بڑی عالی مرتبت و ذی مرتبت ہستیاں اس بارگاہِ ناز میں جبیں سائی کرنا فخرِ ابدی تصور کرتیں اور بھکاری کی حیثیت میں زکوٰۃِ حُسن لینے کے لیے ہمہ تن نیاز نظر آتیں، اسکی محبت کا دم بھرتیں اور تحسین و

شاہی چور

(۱)

ہجرت کو پانچ سو نواسی برس گزرے ہیں۔ قمری منزل دوسری ہے "عروس شب" سولہ مسافتیں طے کر چکی ہے۔ اسلام پر بدقسمتی اور مصیبت کا وقت شروع ہوتا ہے۔ شیر صفت صلاح الدین مرض تپ میں مبتلا ہے۔ مرض میں ترقی ہے۔ مملکت اسلام کے چپہ چپہ میں کہرام مچا ہے اور ہر ہر متنفس شیدائے اسلام شہنشاہِ جلیل القدر پر اپنی عزیز جان قربان کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہے تاکہ وہ فدیہ ہو اور سلطان صحت یاب ہو سکے۔ صلیبی ممالک میں چراغاں ہوتا ہے، دشمنوں کے دل بڑھتے ہیں" حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ محاربات صلیبی کی یاد دوبارہ بیقرار کرتی ہے کہ آخرکار اس ماہ کی ستائیسویں (۲۷) علی الصباح پیغام غم لیکر مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ فاتح بیت المقدس کی جاں فروشی اور قومی عصبیت نے کلمہ گو طبقہ میں ایک روح پھونک دی تھی۔ تخت شاہی کی جگہ گھوڑے کی ننگی پشت اور بزم کی جگہ رزم اسکو زیادہ مرغوب تھی۔ ہر سپاہی فاتح ہیکل سلیمانی کے نقش قدم پہ چلنا سعادتِ ابدی تصور کرتا ہے۔ جب جہاد کا اعلانِ عام ہوتا تو دور دور سے عالی قدر شہزادے اس نعمت عظمیٰ میں حصہ لینے کے لیے آتے۔ وادیِ نیل پر معرکہ آرائی تھی۔ صلیبی نشان ہر جگہ بلند تھے۔ عجیب ابتلا و مصیبت کا زمانہ تھا۔ اسی وقت جب اس جہاد کی خبر مصر سے ماوراء النہر تک پہونچی تو اس خبر کو سنتے ہی شہزادہ ناظر والی بدخشاں اور "شہزادۂ سلجوق" والی طبرستان بھی بطور سپاہی کے اعزازانہ کلمۃ الحق کی تبلیغ کے لیے شریک ہو گئے۔

(۲)

وادیِ نیل پر معرکہ آرائی ہے۔ ملک الاشرف موسیٰ مقدمۃ الجیش ہے اور مسلمانوں کی ہمت بدخشاں کے شہزادۂ ناظر کی شمولیت سے دوگنی بڑھی ہوئی ہے۔ لڑائی خود بخود بند ہو گئی۔ صلیب پرست طبقہ نے پیغامِ صلح بھیجے مگر "ہیکل سلیمانی" عسقلان، طبریہ، صدبہ وغیرہ مفتوحہ علاقہ جات واپس مانگے۔ اور "معبدِ قدس" کی تعمیر کے لیے بھی رقم دینا نامنظور کی تو عساکر اسلامیہ جنگ کے لیے بیقرار ہو گئے۔ سبھی فوج کثرتِ تعداد سے بے فکر تھی۔۔ قیامت ہو گئی۔ چند سر کف جاں فروش مسلمانوں نے دریائے نیل کو مختلف جگہوں سے

کاٹ دیا جس سے تمام پانی صلیبی محاذ میں جانے لگا۔ دلدل اور کیچڑ سے پریشان ہوکر فوج نے نقل و حرکت شروع کی۔ محض اب ایک راستہ باقی تھا اُس پر ملک الکامل اپنی فوج کا بہترین حصہ لیے ہوئے موجود تھا۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دمیاط مسلمانوں کے حوالہ کیا گیا۔ اسی خوشی میں مصر کے ایک گورنر نے اعلان کیا کہ جس "جاں فروش" نے اسلام کی اس قدر اہم خدمت انجام دی ہے اُسکی کنیزی میں لڑکی دنیا میں اپنا فخر تصور کروں گا"۔ مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن باوجود تجسس کے بھی "شاہی چور" کا پتہ نہ چلا۔

(۳)

"فرشتۂ جلال" جب "آتشیں رُخ" کھولتا ہے تو اُسکی روشنی تاریک سے تاریک مقامات کو بھی منور کر دیتی ہے۔ بجلی جب تک نہیں چمکتی اُسکی آواز سے کان اور چمک سے بصارت ناآشنائے محض رہتی ہے۔ جب ایک بار چمکتی ہے تو آنکھوں میں دیر تک خیرگی باقی رہتی ہے اور قوتِ سامعہ اُسکی صدائے مہیب سے متوحش! مشک جب نافہ سے نکلتا ہے تو شامہ اُسکے مشام سے مسرور ہوتا ہے۔ اور کوئی دنیاوی قوت نہیں ہوتی جو اُسکی بو نکلنے اور قوتِ شامہ کو مشام سے منع کر سکے۔ "نادرہ" جو ایک مرتبہ آفتاب بنکر طلوع ہو چکی تھی، جو ایک بار صاعقۂ ہوش رُبا بنکر چمک چکی تھی، جس نے ایک مرتبہ اپنے نافہ سے باہر قدم نکالا تھا، ناممکن تھا کہ اب دُنیا کی کوئی قوتِ امکانی اُسکی پردہ داری کر سکتی۔ وہ بجلی بنکر چمکی، آفتاب بنکر روشن ہوئی اور نکہت بنکر شامہ تک پہونچی۔ دل پر اُسکی ابرو کے خنجر چلے، روح نے اُسکی پذیرائی کی اور لبوں نے اُس کے رخساروں کی شراب کو پیا۔ کانوں نے اُسکی موسیقیت کو سُنا، آنکھوں نے اُسکی تصویر دلوں پر کھینچی۔ اس میں تو کلام نہیں کہ قرطاس عالم پر صدہا بلکہ کروڑہا نقوش صانع حقیقی کی صنعت گری کے موجود ہیں، لیکن "نادرہ" نے اپنے "حسن و شباب" کی بدولت جو شہرت حاصل کی تھی، وہ طبقۂ نسواں کے لیے ایک امتیازی نشان اعزاز تھا۔ اگر دورِ ماضیہ کی زلیخا اور قلوپطرا، دورِ متوسط کی نورجہاں اور پدمنی اُسکے عالمگیر حُسن کا شہرہ سُن لیتیں، تو یقیناً شرم سے پانی پانی ہوکر اپنے عنصرِ اصلی سے واصل ہو جاتیں۔ قصرِ جلالت کا کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس شمع جمالی کا پروانہ نہ ہوتا۔ بڑی بڑی عالی مرتبت و ذی مرتبت ہستیاں اس بارگاہِ ناز میں جبیں سائی کرنا فخر ابدی تصور کرتیں اور بھکاری کی حیثیت میں زکوٰۃ حسن لینے کے لیے ہمہ تن نیاز نظر آتیں، اسکی محبت کا دم بھرتیں اور تحسین و

توسیف کے لاتعداد زر و جواہر سے اس گنجینۂ حسن کی قدر و قیمت کو دوبالا کرتیں انھیں وارفتگانِ الفت میں سے ایک شہزادہ سلجوق والی طبرستان بھی تھا

(۴)

آفتاب اپنی آتشیں مسافت کے بعد روپہلی نقاب میں مستور ہوتا ہے۔ پرندوں کے غول آسمان پر دکھائی دیتے ہیں۔ تاریکی بڑھنا شروع ہوتی ہے، شہر کی چہل پہل میں اضافہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ "لیلیٰ شب" کی "سوداویت" "نورانیت" سے متبدل ہونا شروع ہوتی ہے۔ گھڑیال ۱۲ کا اعلان کرتا ہے۔ قاہرہ کے تنگ و تاریک گلی کوچے جو چند ہی گھنٹے قبل تجارت پیشہ افراد کی دلچسپ تفرج گاہ بنے ہوئے تھے اب بالکل ویران اور سنسان نظر آنے لگے۔ فصیل اور شہر پناہ کے آہنی دروازے مقفل ہیں۔ چوکیدار کی تھکمانہ للکار کی آواز سے سکون مطلق متحرک ہوتا ہے۔ قاہرہ کا بچہ بچہ اطمینان و آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ مگر حیرت پر حیرت اس وقت گورنر مصر کی اکلوتی شہزادی، سپہر حسن کا درخشندہ سیارہ، قصر شاہی کا تابندہ گوہر، سلطنت مصر کی سرمایۂ ناز، جانشین زلیخا، نازش کلوپیٹرا، باغ شاہی کے ایک سنسان گوشہ میں سبزۂ نو دمیدہ کے فرش کمخوابی پر متفکر، متردد، متحیر اور مغموم، مستقبل پر غور کر رہی ہے۔ "ناظر" کے فتح دمیاط میں نمایاں کارنامے غور کر کے اُسکے دیکھنے کا خواہ مخواہ شوق رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک "سہیلی" جو اس کار خاص پر متعین کی گئی تھی، مشعل کافوری لیے ایک جانب سے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "شہزادہ ناظر" بدخشاں کا ولیعہد ہے، جو حسن میں لاثانی آفاق میں نامی شہزادی سمرقند کی زلف میں اسیر ہے۔ اس حور نژاد ہستی کا نام "عاصمہ" ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ عاصمہ کی شادی کا وعدہ بچپن ہی سے خوارزم شاہ کے ہر دلعزیز بھانجے سلطان سلجوق کے ساتھ ہو گیا ہے۔

(۵)

سمرقند کی شہزادی "عاصمہ" دنیائے حسن میں آپ اپنی نظیر تھی، اُسکو "سلطان سلجوق" سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اور اس شہزادی سے شہزادہ "ناظر" کو بھی عشق کا دعویٰ تھا اور سلطان سلجوق نادرہ کا راندہ دربار تھا۔ عاصمہ کو ناظر اور سلجوق کی محبتوں کا حال معلوم ہوا تو اُس نے ایک امتحان مقرر کیا، اور امتحان بھی کس قدر سخت!

"قاہرہ کی حسین نادرہ کا بیش قیمت لعل ہر وقت اُسکے بالوں میں رہتا ہے جو اُسے

لائے گا ..... عاصمہ اُسی کی ہے۔"

دونوں "محبت کے مارے" "جہاد اکبر" پر روانہ ہوتے ہیں۔ کہیں راستہ میں یہ معلوم کرکے کہ مسیحی افواج نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا ہے، نفسانیت چھوڑ کر اللہ کی راہ میں بہترین دوست بن جاتے ہیں۔ عیسائیوں کی حلب پر چڑھائی اور شکست سے سبق لیکر ۵۸۳ھ ہجری میں یہ دونوں شاہی چور" ملک الناصر کی فوج میں شامل ہوکر بیت المقدس کی فتح میں شریک ہوتے ہیں۔ اب تصویر ملاحظہ طلب ہے، سلجوق بستر علالت پر ہے بیت المقدس فتح ہو چکا ہے اور ناظر جو اسکا رقیب تھا واحد تیمار دار ہے۔

(۶)

قاہرہ سے ایک قاصد شہزادہ ناظر کی جستجو میں بیت المقدس پہونچتا ہے۔ اور ناظر سے ملاقات کے بعد پیام محبت پہونچاتا ہے۔ "ناظر" سخت پس و پیش میں ہے۔ وہ بذاتہ عاصمہ پر دل و جان سے مفتوں ہے اور نادرہ "ناظر" پر۔ پیغام کا یہ جواب "سلجوق" سے دریافت کرکے دیتا ہے کہ "اگر نادرہ اپنا بیش قیمت لعل شبچراغ بھیجدے تو ناظر نادرہ سے شادی کرلیگا۔" اتفاق کی بات اس طرف "ناقہ سوار" جنگلوں میں غائب ہوا اور یہاں سلجوق کو شکار میں چوٹ آئی۔ جس سے جاں بر نہ ہوسکا۔ موت کی خبر بجلی کی طرح سرعت سے سمرقند پہونچی۔ وفا کی پتلی عاصمہ نے "ہیرے کی کنی" سے اپنی عزیز جان قربان کردی۔

جان دیدی ترے کوچے میں تڑپ کر آخر
ہوگیا خاتمہ بالخیر وفاداروں کا

سلطان سلجوق اور شہزادی عاصمہ آج دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن آج بھی انکی محبت حقیقی کے اثرات سے دنیائے محبت متزلزل ہے۔ ارواحِ مقدسہ نے اُن کا استقبال کیا، سدا بہار انوار الٰہیہ کے برکات کی بچھاور ہوئی۔ شہزادی عاصمہ کی موت کی خبر نے ناظر کو وارفتہ کردیا۔ انتہائے رنج و افسوس سے جنگلوں کی راہ لے لی۔

(۷)

ایک برقعہ پوش خاتون محل میں آتی ہے اور شہزادہ ناظر کا پتہ پوچھتی ہے۔ لوگ سودائی ناظر کا پتہ تبلادیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرطِ غم کی وجہ سے ناظر آبادی سے دور جنگلوں میں ایک قدیم متوحش قبرستان میں پڑا رہتا ہے اور شب و روز اسکو گریہ و زاری کے سوا کوئی کام

نہیں ہے۔ "نقاب پوش ساحرہ" تلاش ناظر میں نکلتی ہے، اور جب ناظر ملتا ہے تو اسکی مطلوب شے یعنی "لعلِ شبچراغ" مع ایک پرچہ کے ڈال کر آناً فاناً دشت میں مستور ہو جاتی ہے۔ ناظر کو جب ہوش آتا ہے تو پرچہ اٹھا کر دیکھتا ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاتون نے اپنے قلم سے کچھ عبارت لکھی ہے

"ناظر .... عورت محبت ہی نہیں کرتی .... اور جب محبت کرتی ہے تو کونین کی کونی شے ہے کہ مذہب کی ایسی محترم بالذات چیز بھی آڑے نہیں آتی۔ یہ وہ آگ ہے جو نہ لگائے لگ سکتی ہے اور نہ بجھائے ... بجھ سکتی ہے .... محبت روحانی جذبہ ہے، اسکو مادیات سے مطلقاً تعلق نہیں ہے .... اب یہ نہ کہنا کہ عورت محبت میں صادق نہیں ہے ....

اچھا خدا حافظ .... ن .... "

شہزادہ ناظر فرطِ اشتیاق سے "لعلِ شبچراغ" اٹھاتا ہے، اور حیرت سے اسکو دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو جاتا ہے .... اور "نقاب پوش ساحرہ" قاہرہ کی تنگ و تاریک گلی کوچوں سے ہوتی ہوئی کشادہ اور وسیع مرغزاروں سے گذرتی ہوئی محل میں داخل ہو جاتی ہے، اور وہ اسوقت غمگین اور حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی ہے حوض کے قریب سرخ مچھلیوں کا منظر بے پروائی سے دیکھ رہی ہے اور ناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گونہ سکون ہے۔ دل میں کہتی ہے آہ میرا تفاخر حسن کیا ہوا، پندار کہاں ہے اور غرور کا کیا حشر ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ میں ہی اس حسین دیوتا سے بھکارن بنکر زکوٰۃ مانگتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تفاخرِ نادرہ کو شکست ہوئی۔

(۸)

قاہرہ کے وسط میں جہاں اب ایک بڑا قہوہ خانہ تعمیر ہو گیا ہے ایک سنگی فرش بنا ہوا ہے۔ سورج کی شعاعیں اور چاندنی کی موجیں اس فرش کو بقعۂ نور بنائے رکھتی تھیں۔ اسکے قریب ہی کہا جاتا ہے کہ فراعنۂ مصر اور شہزادی زلیخا کی خوشخرامی کے لیے آرام باغ بنے ہوئے تھے۔ جس میں ایک باغ شاہی اب بھی باقی ہے۔ شب کے خاموش اور خوفناک گھنٹوں میں جب تمام کائنات پر مکمل سکوت طاری ہوتا ہے۔ وہاں جانا فرشتۂ قضا سے بغلگیر ہونے کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ضعیف العمر لوگ کمسن اولاد کو "وادیٔ فراعنہ" میں جانے سے ہمیشہ منع کرتے رہتے ہیں جو غیر آباد ہونے کی وجہ سے جانوروں کا مسکن ہو گیا ہے۔ اس وادی کے شمالی

حصہ میں کچھ قبریں ہیں جو شہید مردوں کی سمجھی جاتی ہیں۔ وہاں شہر کے اوباش، قطاع الطریق، جملہ افعال قبیحہ کے وسائل پر غور کرتے ہیں۔ اسی لیے سلطان سلیم عثمانی کے عہد میں جب مصر کی خلافت عباسیہ ترکوں کے حصہ میں آئی تو ترکوں نے ان باغات کو کھدوا ڈالا اور انکی جگہ پر بہت کشادہ خوبصورت پارک، ہوٹل، قہوہ خانہ، دار المطالعہ، ادارۂ صحافت بنوا دیے۔ حیرت پر حیرت۔ اس سنسان اور تخیل سوز مقام پر "ناظر اسوقت موجود ہے۔ دفعتاً اس تیرہ و تار مقام کی فضا متغیر ہونا شروع ہوئی، وہ پہلے بادلوں کا رنگ سیاہ ہوا۔ اور کرۂ سماوی سے ایک خوفناک جہندہ و درخشندہ برق تڑپ کر وادیِ فراعنہ کے شمالی حصہ میں گری۔ ایک خوفناک چیخ کی آواز نکلی اور چشم زدن میں چرند و پرند، وحوش وطیور سب جل کر خاکستر ہو گئے۔ معاً اُسی وقت شہزادۂ ناظر سراسیمگی میں وادیِ فراعنہ سے بھاگا اور تاریکی میں وادی کے کنارے کنارے ہوتا ہوا نہر کبیر کے کنارے جو پائین باغ تھا اُس میں داخل ہو گیا۔ پائین باغ اور وادیِ فراعنہ بہت دُور نہ تھے۔ اتفاق یا حسنِ اتفاق، یہ باغ "نادرہ" کا خواب گاہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مطلع صاف ہوا اور نگار آتشیں سر کھولے ہوئے سقف مینائی پر طلعت ریزیاں کرنے لگا۔ اب شہزادہ ناظر کو اپنی اُس خطرناک مقام کا احساس ہوا تو جسم میں رعشہ پڑ گیا مگر نہایت ہمت کر کے سردی کی وجہ سے اندر کی صحنچی میں داخل ہو گیا۔ ....

(۹)

شب کے ابتدائی منازل ختم ہو چکی ہیں، رات کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے: فضائے لطیف خواب آور نوشیں سے لطف اندوز ہو رہی ہے چلمنیں پڑی ہوئی ہیں اور ایک زنانہ شگین پردہ مسہری کے چاروں طرف قائم ہے۔ شمع روشن ہے اور اُس کا عکس چھن چھن کر مسہری کے اندر ایک حسین و جمیل خاتون کے چہرہ پر پڑ رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہی ہے۔ اور بہت مضمحل اور متردد ہے۔ حزن و ملال کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ ہائیں۔ وہ تو خاموشی سے اشکباری میں بھی مصروف ہے۔ "یہ کون ہے .... ؟" یہ مختصر جملہ تھا جو ناظر کی زبان سے نکلا اور بیہوش ہو گیا۔ ایک گرنے کی آواز آئی .... دھماکا ہوا۔ چور چور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سب پہرے والی دوڑیں۔ لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ شہزادہ ناظر کے ساتھ بے ادبی سے پیش آسکتا۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو نادرہ خود اُٹھ کر "چور" کے معائنہ کے لیے گئی .... ہائیں یہ تو ناظر ہے ...... پیارے کیسے ..... ؟

نادرہ کا یہ جملہ ہوا میں گونجا..... ناظر ہوش میں آیا..... اُس نے بھی یہ الفاظ سُنے کہا "ہاں میں ہی ناظر ہوں"......

..... اس جملہ کی ادائیگی سے سحرستان ناز میں تہلکہ مچ گیا، خاموشی مسلط ہو گئی۔ ہر شخص کی ہمت نے جواب دیدیا۔

نادرہ نے نہایت شکست آمیز جرأت اور شکیب فروز استخفاف سے کہا کیا شہزادہ بدخشاں؟

"ہاں"۔

دونوں جانب سے مُہر سکوت لگ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ بادشاہ سے نادرہ نے کہا "ناظر کیا تم وہی ناظر ہو جسکے درخشندہ کارنامے ماہ تاباں کی طرح روشن و منور ہیں، اور ایک بد باطن "چور" کی حیثیت سے ایک نامحرم کی خوابگاہ میں موجود ہو۔ کیا ناظر کو نہیں معلوم کہ اسکی جان اسوقت کس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ چیونٹی سے زیادہ وقعت نہیں چاہوں تو ابھی تلووں سے مسل دوں۔ سمجھا کیا ہے، کوئی مذاق ہے۔ (خواصوں سے) کیا دیکھتی ہو۔ اس "چور" کو گرفتار کرلو۔ اور علی الصباح اس بد باطن کمینہ کو جلاد کے سپرد کر دو، وہ سر اتار دمشقی دروازہ پر لٹکا دے تاکہ راہگیروں کو عبرت ہو، اور اس کا خون پیالوں میں میرے ہاتھ رنگنے کے لیے لاؤ۔ جب تک اسکے خون سے ہاتھ نہ رنگ لونگی مجھکو سکون نہ ملیگا۔ تاکہ معلوم ہو کہ نامحرم عورتوں کو دیکھنے کی یہ سزا ہے۔ آخری الفاظ بمشکل کرۂ ہوا میں غائب ہوئے تھے کہ شہزادہ ناظر "شاہی چور" بات کی بات میں گرفتار ہو کر پائین باغ کے ایک گوشہ میں نظر بند کر دیا گیا اور ننگی چمکدار تلواروں کا سنگین پہرہ مقرر ہو گیا۔

نادرہ کہنے کو تو کہہ گئی مگر دل میں بہت شرمندہ ہوئی اور خواصوں کو بلا کر حکم دیا کہ خبردار ناظر کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ سزا تادیبانہ ہے نہ کہ تعذیبًا۔ بلکہ تم لوگ اُسکا دل بہلاؤ، ہر ممکن طریقہ سے اُس کا دل ہاتھ میں لو اور میری جانب اُس کے قلب کو مائل کرو۔ خبردار کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ورنہ مجھسے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

(۱۰)

چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی ہے، تارے اپنی عارضی روشنی شب ماہ کے بسیط نور میں جذب کر رہے ہیں۔ اور شہزادہ ناظر مجرم کی حیثیت سے پائین باغ کے ایک محفوظ گوشہ میں نظر بند ہے وقت گذر رہا ہے۔ راتیں ختم ہو ہو کر صبحوں میں تبدیل ہوتی ہیں، لیکن ناظر کے کرب و اضطراب میں مطلقاً

کمی نہیں ہوتی - خواصیں برابر ناظر کو چھیڑتی ہیں، دق کرتی ہیں، اُسکے قلبِ محزوں کو بہلانے کی لاطائل کوششیں کرتی ہیں لیکن ناظر کی سراسیمگی میں کوئی فرق نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ ....
خواصوں کا دق کرنا رنگ لایا - آخر ایک دن وہ یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ

"مُردہ مُردوں کے لیے ہیں اور زندہ زندوں کے لیے" اب میں بھی اس اصول پر کاربند ہو کر نادرہ سے محبت کروں گا - مگر محبت تو ایک ہی سے ہوسکتی ہے - محبت غیر منقسم ہے۔ محبت کو بدنام تو نہیں کرسکتا، ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شادی نادرہ سے کرلوں - فرق صرف اس قدر ہے کہ "عاصمہ" کا میں طالب تھا اور نادرہ میری طالب ہے - اسی قسم کے خیالات نشو و نما پاتے رہے اور شہزادہ ناظر کئی ہفتوں تک نظر بند رہا - اس عرصہ میں کبھی گھنٹہ کبھی آدھ گھنٹہ دن کبھی شب و روز برابر نادرہ ناظر کے پاس رہنے لگی اتصال نظری رنگ لایا۔ حسنِ سامری باثمر ہوا جذب دل نے تاثیر دکھائی آنکھوں نے اظہار حال کیا - لبوں نے شکوہ و شکایت کی - جذبات نے پذیرائی کی اور دونوں جانب ہیجان فطری پیدا ہوا........اب کیا تھا - یہ طے ہوچکا تھا کہ نادرہ میری ہے اور میں نادرہ کا ...."

(۱۱)

عروس شب نے اپنی مضطرب و لرزاں شعاعیں خمیدہ و متوازی ناظر کے قلب پر ڈالیں کیوپڈ کا تیر بے خطا چلا - کرشن جی کی بانسری بجی - قلوپطرہ اور زلیخا کی پسلیاں پھڑکیں - محبت کی دنیا میں ہل چل مچی - خوشگوار ہوا کے جھونکے مہکتے ہوئے دماغ عفیف میں سرایت کرگئے اور فرحت بخش اثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے - وہ شرمندہ نظریں، وہ منتظر قلب، وہ دردمند دل، وہ محبت کرنے والی ہستیاں اتصالِ خیالی کے لیے تیار ہوگئیں کہ ملحقہ شہ نشین کی غلام گردش میں، دفعتاً برق حسن اپنے پورے جاہ و جلال سے چمکی - فلکی شمعیں جھلملا گئیں - منظر میں ایک لطیف رنگینی پیدا ہوگئی - یعنی نادرہ نشۂ حسن میں سرمست فتنہ خیزی اور محشر خرامی سے آتی ہوئی دکھائی دی - معلوم ہونے لگا گویا فطرت مسکرا رہی ہے - بھائی نظام داد دو - ایک ہجراں نصیب دل کے لیے یہ "آفتِ ناگہانی" بلا خیز رعنائی جمال کیا کچھ سامانِ غارتگری کی حامل نہ تھی .... کہ ناظر کا دردمند و زخم رسیدہ دل ضبط کرسکتا، اُدھ کھلے کو کھٹکنے کا بہانہ بہت تھا - ایک سیلاب تھا کہ دونوں جانب اُمنڈ رہا تھا..... اب ناظر آزاد تھا........ اور مطلقاً آزاد ....

(۱۲)

نادرہ شبخوابی کے بیش قیمت ملبوس میں تھی۔ اُس کا نازک نازک صبیح گلابی رنگ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا "فانوس احمر" میں شمع حسن فروزاں ہے ..... تنہائی تھی۔ دونوں دارفتگانِ الفت کا شباب اور شب تھی۔ ایک عالم کیف تھا جسکا تعلق وجدان سے ہے۔ قلوب میں دھڑکن اور اجسام میں رعشہ موجود تھا۔ فرطِ اشتیاق میں آنکھیں قریب قریب بند تھیں۔ حیا مانع تھی۔ رعب حسن سے جرأت نہ ہوئی .... زبان سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن خدا معلوم کیوں لبوں پر مہر سکوت ثبت تھی۔ .... اور دونوں ایک دوسرے کو خاموش نیم باز نظروں سے دیکھ رہے تھے ...... نیم شگفتہ غنچوں کی نکہت نے آکر اٹکھلیاں کیں اور ختم ہو گئیں۔ ایک نئی قسم کی روح دونوں مریضانِ محبت میں عود کر آئی۔ چاہتے تھے کہ کچھ کہیں لیکن زبان نے یاری نہ کی اور "دل" کے شعلے زبان تک نہ آسکے۔ مہکتی ہوئی ہوائیں آئیں اور چلی گئیں۔ مگر دو تڑپتے ہوئے دلوں کے تلاطم اور جوش محبت میں خدا معلوم کس قسم کی کیفیت طاری ہوگئی کہ دیر تک لبوں پر مہر سکوت رہی .... آخر ناظر سے نہ رہا گیا۔ پیمانۂ صبر و ضبط چھلک اٹھا اور ایک حسرت اندوز لہجہ میں کہا

"......... ناظر۔ وہ، ناظر جس نے نادرہ کو کبھی عاصمہ کے تلووں کے برابر بھی نہ سمجھا، آج وہی ناظر تمہارے سامنے حاضر ہے۔ اور وہ اپنے دل میں نادرہ کی محبت موجزن پاتا ہے۔ ...."

یہ محبت انگیز الفاظ نادرہ کے لیے کافی تھے

نادرہ۔ ناظر تم کو اسوقت اختیار کلی حاصل ہے کہ مجھ ناآشنائے راحت کو "بیوفا" "سرد مہر" "ستمگر" کہو۔ مگر میں تم سے بصد ادب معافی مانگتی ہوں، اور یہ بتلا دینا چاہتی ہوں کہ میرے سینہ زار الفت میں ایک عورت کا "دل" ہے۔ جس میں محبت کے لطیف جذبات ہمیشہ متلاطم نظر آتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ یہ محبت کی چنگاریاں عشق و الفت کی عنایایں انتہائی ضبط سے امکانی قوت سے نہاں خانۂ دل میں مستور ہیں۔ بے اختیاری و اضطراب کا ذکر نہیں۔ ہماری شریعت میں یہ حکم ہے کہ مثل شمع گھل گھل کر اپنی جان فنا کر دو۔ پھول کی طرح سکوت سے زندگی گزار دو مگر رازداری کو ہمیشہ شیوۂ عمل رکھو۔ بلبل اور پروانہ کے اضطراب انگیز رویہ سے سبق نہ لو۔ ہم محبت کے بیتاب شعلوں کو سینہ سے لگاتے ہیں اور

خاموشی سے کنج عزلت میں رہ کر اپنی حیات مستعار کے ایام گزارتے ہیں، تڑپتے ہیں اور جان نثار کرتے ہیں - مگر مردوں نے اس کا یہ صلہ دیا ہے کہ اس دردمندانہ ضبط ستم صبر کا نام ظلم و ستم رکھ چھوڑا ہے - عورت ایک نگاہ محبت پر اپنی جان اپنی آسایش حتیٰ کہ عزیز شے مذہب قربان کر دیتی ہے لیکن یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اُس کے محبوب کا سوال خالی جائے۔

بہر حال یہ حقیر نادرہ - تمھاری راندۂ درگاہ ——— تم دُور دُور بھاگے میں تم سے زیادہ قریب ہوئی - تمھاری محبت کی وارفتہ اور تم پہ میرے نظریہ میں تم سے زیادہ تمھاری شفیقہ اس وقت حاضر ہے - جو سزا چاہو اسکو دو - یہ اس محل شاہی میں نظر بندی میں تمھارے رخ انور کی زیارت کی سوا اسکے اور کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آئی ——— معاف کرو اقتضائے وقت یہی تھا - اگر یقین نہ آئے تو اجازت دو کہ اپنے قلب بسمل کے چند مجروح ٹکڑے بھی تمھارے سامنے نکال کر رکھ دوں اور پھر شہزادۂ ناظر کو معلوم ہو جائے کہ محبت کے خونچکاں زخم اور عشق کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کے پیکان ایسے ہوا کرتے ہیں - تڑپنے اور تڑپانے، جلنے اور جلانے، مٹنے اور مٹانے کے راز اس وقت اُن پُر اضطراب اجزائے دل مجروح سے دریافت کرنا ہے ——— میں یقین دلاتی ہوں کہ اگر اب میں زندہ ہوں تو تمھاری پرستش محبت کے لیے، اور اگر سانس لیتی ہوں تو تمھاری آرزومندیوں کی خاطر ——— معاف کرو ——— للہ ناظر معاف کرو -

ناظر- نادرہ - شہزادی نادرہ - بیشک میں نے تمھاری تذلیل کی - معاف کرنا تمھارے عہد شباب کی میں نے قدر نہ کی - آہ - عاصمہ اب اس عالم میں نہیں ہے - اُس کی پاک روح سے میں شرمندہ ہوں - مگر تمھاری مصیبت اور حرماں نصیبی بھی دیکھی نہیں جاتی - میں یقیناً تمھاری خاطر اپنی نفسانی خواہشات کے لیے نہیں بلکہ ایک محبت کے نعم البدل میں یہ حقیر زخم رسیدہ مجروح و فگار دل تمھاری نذر کرتا ہوں ——— ہاں مجھ کو اعتراف ہے کہ چند ہفتے قبل تمھاری محبت سے نفرت تھی، تمھارے نام سے چڑھ تھی، تمھارے ذکر سے حقارت ٹپکتی تھی لیکن اس ہفتہ میں خدا معلوم میرے قلب کو کس نے پلٹ دیا کہ تمھاری محبت میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے - میں، یقین مانو، محبت کا مبہم لفظ استعمال کرتے بہت ڈرتا ہوں، کیونکہ محبت ایک خوفناک نقاب پوش ساحرہ ہے - محبت جسکو عموماً سب محبت کہتے ہیں وہ صرف خود غرضی ہوتی ہے - عورتیں عموماً اپنے جذبات

کو پہچاننے میں غلطی کرتی ہیں۔ اور اسوقت نادرہ تم بھی اسی غلطی کا شکار ہو رہی ہو۔ اگر تم آفتاب کو نقطہ نصف النہار پر قائم کر سکتی ہو، اگر حرکت کو سکون سے اور سکون کو حرکت سے بدل سکتی ہو، اگر شب چاردہم میں روز روشن کے جلوے دنیا کو دکھا سکتی ہو، تو ہاں تم کو یقیناً اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ تم محبت کرو ——— بہرحال مجکو بذاتہ تم سے کوئی شکایت نہیں، میں تمہاری ہی زبان میں اس "محبت" کی قدر کرتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب تم سے ایک دلی تعلق پیدا ہوگیا ہے"۔

بھائی کلیم۔ تصویر ملاحظہ طلب یہ ہے کہ آواز بھرّا گئی۔ محبت کے پینگ بڑھنا شروع ہوے، اور فرطِ بیتابی بحران شوق نے زبان پکڑلی۔ جسم مرتعش ہوے۔ عروس شب معجزہ رنائی دکھا رہی ہے، بادِ نسیم کے خوش آیند جھونکے چل رہے ہیں۔ نادرہ، معصوم نادرہ، حسین نادرہ مخمور شباب میں لغزش ہوئی۔ اضطراب میں اضافہ ہوا۔ اور ایک ادائے بیخودی جس پر ہزارہا خودیاں قربان!!! بغیر کسی مزید گفتگو کے ساعدسیمیں ناظر کی صراحی دار گردن میں حائل ہوتی نظر آئیں۔ منور فرشتۂ جمال کی شعاعیں اس منظر لطیف سے لڑیں۔ دونوں مجروح شکستہ قلوب جوش الفت سے لبریز ہوے۔ فضائے بسیط کا ہر ذرہ، کائنات کا ہر حصہ اور جنت ارضی کا ہر ہر ریزہ اس ادائے دلفریب سے مرتعش ہوا۔

(۱۳)

ملک سنجر عسقلانی کو معرکۂ نیل کا وعدہ یاد دلایا جاتا ہے۔ شہزادہ ناظر بدخشانی کی درخواست شرف قبولیت بخشتا ہے۔ ایک حسین وجمیل صبح کو جب وہ تاج شاہی سر پر رکھے ہوے نمایاں ہوئی۔ مرغان خوش الحان اپنی نغمہ سرائی سے فضائے بسیط کو مترنم بناتے ہیں۔ نسیم سحری کے خوش آیند جھونکے کائنات کو مسرور و متبسم کرتے ہیں، دربار عام کے ایک مخصوص کمرے میں جہاں ہر ہر چیز اور ہر ہر سرشتہ قاعدہ و قرینہ سے آراستہ ہے، بڑے بڑے بیش بہا استنبولی قالین، ایرانی نمالیچے، عربی چادریں بچھی ہیں، فراعنۂ مصر کی قیمتی تصویریں اور مناظر رنگیں کے نقوش دیواروں پر آویزاں ہیں۔ دروازوں پر اطلس و دیبا کے زرکار پردے، دیواروں پر حلبی آئینے جڑے ہوے تھے، وہیں نادرہ بصد ناز و انداز ایک حسین وجمیل چہرہ میں آتی ہے۔ جسکو دیکھکر یہ گمان ہوتا تھا کہ سیلاب حسن آیا ہے یا قاف کی خیالی پریاں آج دنیا میں اتر آئی ہیں۔ خوش آمدید و حبذا کے نعرہ ہائے مسرت بلند ہوتے ہیں۔ اور قاہرہ کا مفتی اعظم

شہزادہ ناظر اور شہزادی نادرہ کو شرعی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ مبارک و سلامت کے شادیانے بجتے ہیں فضائے آرزو وجہانِ تمنا اس "عہد شباب" پر شاہد ہوتی ہیں۔ "نظام کائنات" اس "مظہر حسن" کے طور پر "کلیم وش" منتظر جلوہ بنکر مبارک باد دیتا ہے۔ شجر و حجر غرضکہ جمیع کائنات سدا بہار خلوص کے خوشنما ہار ناظر و نادرہ پہ نچھاور کرتے ہیں۔ ارواح مقدسہ تحفۂ تبریک پیش کرتی ہیں اور طرفین کے مرتعش لبوں پر ایک ہلکی برق وش مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور تھوڑی سی فطری جھجک کے بعد دونوں روائے حیا میں مستور ہو جاتے ہیں ———— "

مشیر احمد علوی۔ بی اے

بادۂ سرجوش

(غزل) از تراوش فکر جناب مولوی رضی احمد صاحب رضی بدایونی

اک سکونِ اضطراری پردہ دارِ جوش تھا
تیرا دیوانہ ازل سے بے نیازِ ہوش تھا

گُم تھا نظارہ بھی جلوؤں کا یہاں تک جوش تھا
مژدۂ دیدار پیغامِ وداعِ ہوش تھا

حُسنِ خود بیں جب حجابِ ناز میں روپوش تھا
نغمے خوابِ ناز میں تھے سازِ کُن خاموش تھا

دل نے ہلچل ڈال دی کُل کائناتِ دہر میں
اک لہو کی بوند میں اللہ اتنا جوش تھا

صدقے جذبِ بیخودی کے اب وہ ہے زیبِ کنار
جو نگاہِ جستجو سے آج تک رُوپوش تھا

کہنے کی باتیں ہیں کس کا جلوہ کیسی برقِ حُسن
ایک فریبِ تنگیٔ نظر تھا اک فریبِ ہوش تھا

بے زبانی تھی محبت میں زبانِ آرزو
ہر نفس سازِ نوائے نغمۂ خاموش تھا

شکر ہے دونوں محبت میں ٹھکانے لگ گئے
دل عذابِ زندگی تھا سر وبالِ دوش تھا

توڑ دی ہمت رضی ناکامیٔ منصور نے
ورنہ میرے جام میں بھی بادۂ سرجوش تھا

تنقیدیں

اقتباسات سیرۃ النبی (انگریزی) مترجمہ مسٹر سید علی پروفیسر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج - ۶۰ صفحے - غالباً مصنف سے مل سکتی ہے -

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور تالیف سیرۃ النبی ادبی، تاریخی، اور مذہبی تینوں حیثیتوں سے اس قابل ہے کہ دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی اسکے تراجم شایع کیے جائیں - مسٹر سید علی نے اسے انگریزی لباس پہنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے - پہلی اور دوسری جلد کا کچھ حصہ ترجمہ کر چکنے کے بعد صاحب موصوف نے ترجمے کے بعض اقتباسات ایک رسالہ کی صورت میں شایع کیے ہیں تاکہ ملک کے اہل قلم کے سامنے بغرض اظہار رائے و مشورہ پیش کریں - ترجمہ لفظی ہے، اور انگریزی محاورہ کی پابندی کے باوجود اصل کتاب کا ادبی لطف بڑی حد تک باقی ہے - یہ بڑی جاں فشانی کا کام اور ترجمہ کا کمال ہے - رحمۃ للعالمین کے سوانح حیات کو ایک عالمگیر زبان کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی نیت مبارک ہو!

حقیقت اسلام جب مولوی احمد حسین خاں، ایف آر، اے ایس، چیف سکرٹری سرکار نظام کے بچے انگلستان میں تعلیم پاتے تھے، تو ایک پادری کی بحث نے انکے ایمان میں کچھ شکوک پیدا کر دیے - بزرگ باپ اپنی فرصت کے اوقات میں اسلام کے بہترین مذہب ہونے کے ثبوت میں چند یادداشتیں انگریزی میں لکھ کر اپنے ہفتہ وار خطوط کے ساتھ اپنے بچوں کو بھیجتے رہے - اور بعد میں "نوٹس آن اسلام" کے نام سے انھیں شایع کیا - اور مولوی علی بشیر صاحب نے اسے اردو کا لباس پہنایا - اس کتاب میں مذہب کیا ہے، حقیقی اسلام کیا، اسلام کیوں بہترین مذہب ہے، اور مسلمانوں کی قومی اصلاح وغیرہ پر بہت دلچسپ بحث کی گئی ہے - جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام سائنس جدید کے مطابق بہترین مذہب ہے - ترجمہ کی دشواریوں کو دیکھتے ہوے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان بھی اچھی ہے گمراہ تعلیم یافتہ طبقہ کی اصلاح کے لیے اس نوع کا لٹریچر شایع کرنا نہایت ضروری ہے -

نقادی کے نکتے مولفہ چودھری محمد علی صاحب تعلقدار ردولی - حجم پاکٹ سائز کے ۴۸ صفحے قیمت ۴ر پتہ :- تعلقدار پریس - لکھنؤ -

اس کتاب میں سر رابرٹ کلیر مون وٹ کی تصنیف سے مصوری کے تمام اصول اخذ کرکے شایع کیے گئے ہیں - آخر میں ہندوستانی طرز کے خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے - مگر جناب مولف نے اس اختصار سے کام لیا ہے کہ کتاب کا مقصد ہی فوت ہو گیا - بغیر اس خیال کے کہ فن مصوری سے ناواقف پڑھنے والے کی سمجھ کہاں تک اخذ مطالب میں یاوری کر سکے گی، مصوری کے سارے اصول نمبروار گنا دیے گئے ہیں - کتاب کے ساتھ اگر کوئی تصویریں شامل ہوتی تو شاید کچھ سمجھ میں آتا - جو فن کے جاننے والے ہیں انکے لیے یہ ابتدائی رسالہ ظاہر ہے کہ کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتا - بہر حال اردو زبان میں اس دلچسپ موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے - اور اگر اسکے مطالعہ سے ایک بھی اہل قلم اس طرف متوجہ ہو گیا تو بھی مصنف کو اپنی مشقت کا صلہ مل جائیگا -

براؤننگ از سید وقار احمد بی اے (عثمانیہ) ضخامت پاکٹ سائز کے ۰ ۷ صفحے - قیمت ؟
مصنف سے (نظامت منزل کناگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن) طلب فرمائیے -

براؤننگ انگریزی زبان کا ایک دشوار گو شاعر ہے - اور اس کی مشہور نظم " ابی بن عذرا " خاص طور پر مشکل ہے - عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ہونہار گریجویٹ سید وقار احمد صاحب نے بڑی محنت سے اسکا اردو ترجمہ شائع کیا ہے مترجم کا مقصد یہ ہے کہ اردو شعرا کے سامنے انگریزی ادب کی رجائی نظمیں پیش کیجائیں - براؤننگ بڑھاپے کو انسانی روح کی انتہائی تکمیل کا زمانہ سمجھتا ہے اور جو مایوسی اور شکستہ دلی بڑھاپے سے متعلق ہے اُسے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے - اس نظم کا پہلا ہی بند یوں شروع ہوتا ہے :-

" نوجوانو! میری طرح تم بھی بڑھاپے کا تجربہ کرو - یہ عمر کا بہترین زمانہ آنے والا ہے - اسی کی تیاری کے لیے ہمیں پہلے جوانی کا زمانہ عطا کیا گیا - ہماری زندگی کا مالک وہی ہے جو کہتا ہے کہ میں نے انسان کو اچھی شکل پر پیدا کیا ہے " جوانی تمہاری زندگی کا صرف آدھا زمانہ دکھاتی ہے ؛ تم اپنے مالک پر بھروسا کرو ، اپنی زندگی کی پوری بہار دیکھ لو اور بڑھاپے کی آمد سے ہراساں نہ ہو "

ترجمہ کی عبارت با محاورہ ہے اور اصل نظم کا لطف ترجمہ میں بھی باقی ہے - جناب مترجم اس کامیابی کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں - شروع میں براؤننگ کی مختصر سوانح عمری اور اسکی شاعری پر بھی بحث کی گئی ہے -

رنگ زمانہ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کے شاگرد منشی برج بھوکن لال محب ، عبد الماجد صاحب کے ہموطن اور ہمارے دیرینہ عنایت فرما ہیں - جن کا کلام الناظر میں کبھی کبھی شایع ہوا ہے - کتاب زیر تنقید آپ کا مجموعۂ افکار ہے جو بلحاظ مضامین اسم بامسمیٰ کہا جا سکتا ہے - اس کا مسودہ ۱۹۱۸ء میں کسی مطبع کو برغرض طبع دیا گیا تھا - ۱۹۲۳ء میں کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو کثرت اغلاط کے باعث محب صاحب کو پسند نہ آئی اور بہاں دو سال تک مطبع میں پڑی رہی - اب مجبوراً کتاب شایع کی گئی ہے - اور امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں تمام غلطیاں دور کر دی جاویں گی -

لڑائی کے زمانہ میں کاغذ بھی بہت گراں تھا ، اس لیے شاید رنگ زمانہ کو سفید کاغذ بھی نہ میسر آیا اور مٹیالے کاغذ پر قناعت کرنا پڑی - کلام محب کے چند نمونے ، ادھر اُدھر سے ، درج کیے جاتے ہیں ، تاکہ ناظرین کو رنگ زمانہ کا کسی قدر اندازہ ہو جائے -

گڈ مارننگ ہر اک سے کہو ہیٹ اُتار کر　　　دستور اب یہی ہے سلام و نیاز کا
ہو گیا سہل سفر ریل کے باعث اے خضر　　　رہبر شوق ہے اب عشق ترا انجن اپنا
قسمت کو نہیں سمجھے اس گرانی میں غریب　　　سوکھی روکھی روٹیوں سے پیٹ بھر لیا
قلی دکھا رہے مجھ ناتوانِ عشق فیشن کو　　　کہ اسٹیشن پہ خود ہاتھوں سے بستر اٹھا نہیں سکتا
اب تو اپنے لیے مغرب کے طریقے ہیں مفید　　　مشرقی طرز میں ہے خطرۂ انجام بہت
اور رہ لیں عورتیں پردہ کے اندر چند روز　　　ہند میں قائم ہے یہ سد سکندر چند روز
کہہ رہی ہے تربت اپنی زبانِ حال سے　　　سادھوؤں کی قدر تعظیم قلندر چند روز
قیس کو پیارا رہا گر لیلیٰ کا طوق　　　دوستوں کو فیشنی کالر عزیز

داں جہاں تابِ عیش محنت سے — ہم لنگوٹی میں کھیلتے ہیں پھاگ

ہم اپنے دل میں سمجھیں بادشاہت ہفت کشور کی — کلرکی کی جگہ مل جائے گر صاحب کے دفتر میں

نگاہیں اس بتِ رعنا پہ آمادہ ہیں شوخی پر — رقابت بڑھتی جاتی ہے ہم شیخ و برہمن میں

آپ کیوں ہر سال رہتے ہیں پریشاں اے محب — ووٹ کم آتے ہیں شاید ممبری ملتی نہیں

سرجن کی ڈاکٹر کی ہے توقیر آج کل — عزت نہ بید کی ہے نہ قدرِ طبیب ہے

کیجیے بے دین ہو کر کوچۂ مغرب کی سیر — اہل مذہب کو یوں ہی گمراہ رہنے دیجیے

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت خیر خواہِ قوم ہیں — پھر بھی بیجا ہے یہ چندہ کا تقاضا ہر گھڑی

بنے تھیٹر کے ایکٹر وہ نئے فیشن کے صدقے میں — نہ داڑھی ہے نہ مونچھیں ہیں نہ چندن ہے نہ چوٹی ہے

مل کے آپس میں نہ کوئی کام کرنا چاہیے — کارخانے پڑ اُٹھیں گے ہم کو مرنا چاہیے

ڈیڑھ سو صفحے کے اس مجموعہ میں اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں۔

مجموعہ کی ترتیب و تہذیب، صحت املا و الفاظ کے متعلق محب صاحب خود حد درجہ غیر مطمئن ہیں اس لیے کسی قسم کی شکایت فضول ہے۔ شاعرانہ تصرفات و تسامحات کے بارے میں حضرات شعرائے کرام کی رائے زیادہ وزن دار ہو سکتی ہے۔

امید ہے کہ طبع ثانی کے وقت اس مجموعہ کی حالت ہر حیثیت سے بہتر ہو جائے گی۔ قیمت ۱۰ر

ملنے کا پتہ:۔ منشی برج بھوکن لال محب۔ دریاباد ضلع بارہ بنکی۔

دیوان نوشاد

خدا بخشے مرحوم راجہ نوشاد علی خاں تعلقدار میلا رائے گنج کو، تعلقہ داران اودھ میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ ذہانت و طباعی، ذوقِ علمی و شوقِ ادبی، عالی حوصلگی و فیاضی، جوشِ قومی و حبِ وطن، نفاست پسندی، خوش مزاجی، خلق و انکسار، محبت و مروت، غرضکہ ایک رئیس میں جتنی خوبیاں تلاش کی جاتی ہیں وہ سب اُن میں موجود تھیں۔ اور جہاں رئیسوں کی خوبیاں تھیں وہاں اُنکے مخصوص معائب سے بھی وہ محروم نہ تھے۔ جن میں سب سے زیادہ نمایاں اُنکی شاہ خرچی تھی۔ جس کے بدولت علاقہ تک آخر میں نیچ ہو گیا۔

نوشاد مرحوم خود بھی شعر کہتے تھے اور اکثر رئیسوں کی طرح دوسرے شاعروں کے جو شعر پسند آتے وہ بھی اپنا لیا کرتے تھے۔ راجہ اعجاز رسول خاں صاحب تعلقدار جہانگیر آباد نے اُنکا دیوان شائع کرا دیا ہے۔ اور کسی پیچھے رستم نے اُنکے نام سے ایک دلچسپ دیباچہ بھی اضافہ کر دیا ہے۔ کلام میں لکھنؤ کا وہ رنگ تغزل نمایاں ہے جسے اب لکھنؤ والے خود چھوڑ چکے ہیں۔ پھر بھی بہت سے اشعار صفائی و شوخیِ بیان کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ پڑھے اور یاد رکھے جائیں۔

ایڈیٹر

(بقیہ صفحہ ۵۹)

بعض خبریں یا قرآن شریف کی قیامِ عالم اور قیامِ قیامت پر صاف روشنی ڈالنے والی آیتیں خرق اور التیام اجرامِ فلکیہ پر نہایت وضاحت سے دلالت کر رہی ہیں تو کیا اسلام کا دم بھرنے والے یا آسمانی ادیان کا اقرار کرنے والے اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ......"

"مشیر قادری"

پچھلے مہینے کے رسالے

جو رسالے وقت تحریر تک کسی سبب سے وصول نہیں ہوتے، خواہ شایع نہ ہوں یا شایع ہوں اور دفتر الناظر میں نہ پہونچیں، اُن کا ذکر ان اوراق میں رہ جاتا ہے۔ — ایڈیٹر

ہمایوں

میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) اڈیٹر رسالۂ ہمایوں نے مسلسل پانچ نمبروں میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں تقریباً تمام مذاہب عالم پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے آخری دو نمبروں میں "اسلام" پر بحث کی گئی ہے اور آخری قسط کے دوران میں "اہلِ بہاء" کے متعلق چند سطور میں جس صفائی سے بعض تعلیمات بہائی کی تصریح کی گئی ہے وہاں ایک دو اصولی اشتباہات ہوگئے ہیں جنکے رفع کرنے کے لیے مولانا میر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی نے ایک مضمون "دنیا کے مذہبی و معاشرتی تاریخ اور اہلِ بہا" کے عنوان سے "اگست" کے رسالہ میں شایع کیا ہے جس سے اہلِ بہا کا عقیدہ معلوم ہوتا ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:۔

..... اہلِ بہاء کا اعتقاد ہے کہ ہر قوم و ملت اور ہر قانون کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ تغیر و تبدیل فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ نوع بشر ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتی ہے اور اسکی احتیاجات بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے قوانین جو اپنے وقت میں مناسب اور حق بجانب تھے اُن میں تغیر کی حتمی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اگر لفظاً اس حقیقت کا اقرار نہ کیا جائے تو لوگ نئی نئی تفسیروں کے ذریعہ سے پُرانے قوانین کو نئی ضروریات کے مطابق بنانے کی متواتر کوششوں سے قانون کی تجدید کی ضرورت کا عملی اعلان کرتے رہتے ہیں۔

لیکن ایسی کوششیں پراگندہ ملتوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ اختلاف و انشقاق کا موجب ثابت ہوتی ہیں، اس لیے اہلِ بہا اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ ہمیشہ سے خدا تعالیٰ کا یہ طریق ہے کہ انقلاب زمانہ اور تغیر حالات کے بعد وہ ایک آسمانی کتاب کے بجائے دوسری الٰہی کتاب نازل فرماتا ہے۔ جو آیندہ سیکڑوں سال کے لیے آنے والی نسلوں کی روحانی، اخلاقی، وجدانی اور سیاسی و معاشرتی رہنمائی کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے

.... معلوم ہوا کہ مذہبی زندگی، روحانی بیداری، دینی حیات، جو انبیا اور مظاہر الٰہی کے ذریعہ سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اُس سے اس قسم کے اصلاح مہاجر

کہ جو مذاہب و ادیان کے اندر بلا استثنا .... ہوتی رہتی ہیں ..... اہل بہا کا اعتقاد ہے کہ سیکڑوں سال مثلاً ہزار سال یا اس سے کم و بیش مدت کے بعد نوع بشر میں ایک ایسا عظیم الشان انسان پیدا ہوتا ہے جو نئی کتاب، نیا پیغام، نئی زندگی دنیا کے لیے لاتا ہے۔ اسکی صداقت کی سب سے بڑی دلیل خود اُس کا وجود، اس کا پیغام اور اس کا نفوذ ہوتا ہے ..... حضرت بہاء اللہ مذہبی اصطلاح کے مطابق صرف موعود اسلام ہی نہیں بلکہ موعود جمیع ادیان اور مربی عالم ہیں .... اگر دین و مذہب کی اصطلاحات سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو آپ کی تعلیمات میں وہ ہدایات اتم و اکمل واضح طور پر موجود ہیں۔"

مخزن

جناب حفیظ جالندھری مدیر مخزن کا بیان ہے کہ کارپردازان مخزن شروع ہی سے ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مخزن کی ہر جدید اشاعت اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک خاص نمبر ہو اور "مخزن" کی یہ اشاعت صرف ایک بزم ماتم ہے اور بس" جس کا نام "گرامی نمبر" یا "یادگار گرامی" ہے۔ آفتاب سخن کے غروب ہو جانے پر کون سی آنکھ ہے جو پرنم نہیں ہے کون سا قلب ہے جو حزیں نہیں ہے۔ اس سانحۂ عظمیٰ پر ہر مذہب و ملت کے اہل قلم نے جس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ موت گرامی پر اظہار الم کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے شعر کا ہر غم کا ہر ہر حرف تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مختصر مرثیہ نثر میں جناب محمد امیر صاحب بی اے نے سپرد قلم فرمایا ہے جسکے اقتباسات ناظرین کی آگاہی کے لیے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :—

"........ مرنے والے کا غم ہی ایک ایسا غم ہے جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ...... یہ وہ زخم ہے جسے اہل درد ہمیشہ ہرا رکھتے ہیں ...... آہ آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ ڈوب گیا .... یہ کسے توقع تھی کہ اس گلستان شاعری کی وہ بہار بہت جلد ختم ہو جائے گی .... جو مہر عثمانی کی کرنوں سے لہلہا رہا تھا۔ آہ! آج شعرائی امت بیوہ ہو گئی۔ شاعر اپنی غیر فانی شاعری کے ذریعہ انسانوں کے حافظہ میں زندہ رہتا ہے۔ یہی اُس کی شاعری کا معراج ہے ..... جس طرح بچہ شام ہوتے ہی اپنی ماں کی گود میں جا کر سو جاتا ہے اسی طرح تو بھی اپنی شام زندگی کے آغاز پر مادر گیتی کے آغوش میں جا کر ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے ...."

نیرنگ خیال

مولانا محمد آدم کنجاہ مرحوم ضلع گجرات (پنجاب) کے باشندے اور دورہ عالمگیری کے ایک مشہور فارسی شاعر تھے، غنیمت تخلص فرماتے تھے

نواب مکرم خاں کے حاشیہ نشینوں میں تھے - چنانچہ نواب صاحب کے صاحبزادہ میاں "عزیز" اور اُن کی منظورِ نظر "شاہد" کے حسن و عشق کی داستان کو مثنوی نیرنگِ عشق لکھ کر حیاتِ جاوید عطا کی ہے - مثنوی بہت مقبول ہے - اس مثنوی پر میر ولی اللہ صاحب وکیل نے ایک مبسوط تبصرہ کیا ہے جو نیرنگِ خیال کے اگست نمبر میں شایع ہوا ہے - مثنوی بہت ہی مؤثر اور سوز و گداز سے پُر ہے - خواہ مخواہ دل چاہتا ہے کہ کچھ شعر نقل کروں -

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں　　　عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں
ز ہرش سینہ ہا جولاں گہِ برق　　　دلِ ہر ذرہ در جوشِ انا الشرق
جگر سوزی چراغِ خانۂ او　　　تپش ہا شوخیِ پروانۂ او
دلِ مستانِ عشق خود مقامش　　　شکستِ رنگہا مہتاب بامش
امیدِ تماشائے نگارے　　　نمودم جانبِ مکتب گذارے
برآمد بر درِ مکتب خروشم　　　کہ من سیپارۂ دل می فروشم

سراپا کردہ رفتم یک قدم پیش　　　بلا گردانِ لطفِ طالعِ خویش

بارِ منت چہ غنیمت نتوانیم کشید　　　اینکہ احساں نہ نمودند چہ احساں کردند

اگر این ست عمرِ انتظارِ صبحِ وصل اد　　　کہ می گوید کہ فردائے قیامت دیر می آید؟

نیرنگ خدا معلوم یہ کیا مرض متعدی ہوتا جاتا ہے کہ روزانہ نت نئے نمبر نکلتے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ لکھنؤ میں ایک رسالہ کا ایڈیٹر نمبر نکلنے والا ہے - نیرنگ کا بھی یہ تنقید نمبر نکلا ہے - حقیقت یہ ہے کہ "تنقید" ابھی تک ہندوستان میں عنقا ہے - آج کل تنقید کا مقصد محض یہ ہے کہ اگر ہمارے کسی عزیز، استاد، یا دوست کی کتاب ہے تو اُسکی تعریف ہوگی، اگر کسی "جنسِ مخالف" کی کتاب ہے تو خواہ وہ "آسمان کے تارے" بھی توڑ کر لایا ہو" پھر بھی خراب ہے - بہرحال نیرنگ نے تنقید نمبر نکالا ہے اور حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کا فوٹو بھی شایع کیا ہے - ایک مضمون جو فی الواقع اس قابل ہے کہ پڑھا جائے وہ موازنۂ امیر و داغ ہے - امیر و داغ کے موازنہ پر حقیقت یہ ہے کہ آج تک کوئی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی - حالانکہ بہت ضرورت ہے - دونوں مسلمہ استاد ہیں - ایک آفتاب ہے اور ایک ماہتاب - کسی کو دن کی ضرورت ہے اور کسی کو رات کی - لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے

آمیر داغ سے بدرجہا بہتر ہیں - داغ و امیر کا صحیح موازنہ اب تک ہوا ہی نہیں ہے - تاثیر صاحب نے مخزن کے دورِ جدید (اپریل ۱۹۲۶ء) میں داغ و امیر کے عنوان سے ایک مضمون شایع کیا تھا، اُنھوں نے موازنۂ نفسیاتِ شاعری کی رو سے کیا ہے اور ثابت کیا کہ داغ سے بہتر امیر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی ثابت کر گئے ہیں کہ " امیر نے داغ کے طرز کو نباہ بھی لیا ہے تو یہ درحقیقت داغ ہی کی کامیابی ہے"- اس مضمون کا جواب جناب عشرت رامپوری نے نیرنگ کے تنقید نمبر میں دیا ہے - لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ یہ مضمون بھی "جواب شافی" نہیں ہے - ایک جگہ فاضل مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ

> ....." امیر نے داغ کا طرز ..... اختیار نہیں کیا، انکی شان عالمیت آڑے تھی - لیکن اگر ایسا کیا بھی تھا تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ امیر کی کامیابی داغ کی کامیابی ہے - حافظ کی کامیابی خواجو اسلمان، ابن یمین کی کامیابی نہیں کہلاتی - شیکسپیر کی کامیابی، مارلو، کاگریو اور پلوٹارک کی کامیابی نہیں کہی جا سکتی - حالانکہ یہ صریحی ہے کہ اپنے ڈراموں کا مسالہ شیکسپیر نے انھیں مذکورہ شاعروں کی تصانیف سے حاصل کیا تھا - ..... داغ کے کلام میں زبان کا چٹخارہ ضرور پایا جاتا ہے، لیکن جن خوبیوں کی بنا پر داغ کا کلام ایک کرامت سمجھا جاتا ہے وہ کم و بیش ہر شاعر ماضی و حال کے یہاں ملتی ہیں - جن واقعاتِ زندگی پر وہ روشنی ڈالتے ہیں عامیانہ ہیں - اور ہر شخص کے تجربہ میں روزانہ آتے رہتے ہیں - کوئی نوادر نہیں - اُن کے شعر ہمارے خیالات میں، ہمارے اذہان میں ہماری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں کرتے - انکا کلام زیادہ تر ہیجِ نفس ہوتا ہے - اور ساری عالی خیالی معشوق اور وہ بھی بازاری معشوق کے چوچلوں کو منظوم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اگر داغ کے دواوین کو دریا میں ڈبو دیا جائے تو ادب اُردو میں سوائے اسکے کہ دہلی کے محاوروں کی اسناد کا ایک وسیلہ معدوم ہو جائے گا، اور کسی قسم کی کمی نہیں آسکتی مگر دہلی کی زبان کی سند فرہنگ آصفیہ سے مل سکتی ہے - داغ کا کلام امیر سے ٹکر نہیں کھا سکتا - انکا مقابلہ کرنے والے ایک سعی باطل کرتے ہیں ....."

معارف

تازہ نمبر میں مولانا ابو الخیر صاحب مودودی رکن دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ نے اپنے بے نظیر مقالہ "ہندوستان کی معاشی حالت پر کمپنی کا اثر" کا دوسرا حصہ پیش کیا ہے - مضمون بہت ہی مؤثر اور دردناک ہے - اس قابل تھا کہ حرف بحرف نقل کیا جاتا لیکن رسالہ کے محدود اوراق اسکے متحمل ہی نہیں ہو سکتے - بہر حال بخوف طوالت چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں - یہ عہد تاریخ ہند کے ہر تحقیق پسند طالب علم کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے - امید ہے کہ مولانا موصوف اس مبحث پر ایک مستقل کتاب تحریر فرمانے کی زحمت

گوارا کریں گے۔ جس سے معلوم ہو سکے گا کہ بدنصیب ہندوستان پر کیسے کیسے استبدادی دور گذر گئے۔ پہلے نمبر میں کمپنی کی تدریجی ترقی پر اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا۔ فلسفۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان ۲ ½ صدیوں کے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کمپنی اس مدت میں اپنی تاریخ کے پانچ دوروں سے گذری ہے۔ یہ پانچ دور حسب ذیل ہیں

(۱) ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۷ء تک۔ پلاسی کی فتح کے بعد تنہا مالک بنتی ہے۔

(۲) ۱۷۵۷ء سے ۱۷۷۲ء تک۔ یہ کلایو اور ہیسٹنگز کے جنگی اقدامات اور سیاسی دسایس کا زمانہ تھا۔

(۳) ۱۷۷۲ سے ۱۸۱۶ تک۔ میسور کی فتح، مرہٹوں کا استیصال، مہاراشٹر کا الحاق، اس عہد کے اہم واقعات ہیں۔

(۴) ۱۸۱۶ سے ۱۸۳۲ تک۔ یہ امن و صلح، نظم و نسق، اصلاح و ارتقاء کا عہد زریں ہے۔

(۵) ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۸ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ اہم عہد ہے جب ہندوستان کی طاقت کا پانسہ پلٹتا ہے اور ایک شاہی مجرم بغاوت کے الزام میں رنگون کے قید خانہ میں نظر بند کردیا جاتا ہے اور اورنگِ برطانیہ کا پرچم قصرِ معلّٰی (آہ) پر لہراتا ہے! ہندوستان کی ان دوروں میں کیا حالت تھی اور کس طرح روز بروز خراب ہوتی گئی؟ اسی کا نوحہ ہے جو فاضل مقالہ نگار نے اس دوسرے مضمون میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:۔

"...... اکبر و شاہجہاں کے وقتوں کا تو ذکر ہی نہیں ...... کہ کمپنی گورنمنٹ کے عہد سے وہ وقت بھی بدرجہا بہتر تھا جب حکومت کی باگ عالمگیر کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں تھی اور جب کسی مستقل نظام حکومت کے نہ ہونے سے ...... ملک پر بدامنیوں، خانہ جنگیوں طوائف الملوکیوں کا راج تھا۔ صنعتیں برباد ہو رہی تھیں، اہل ہنر کا کوئی قدردان نہ تھا۔ لوگ خوشحالی کو ترسنے لگے تھے۔ اگلے وقتوں کو یاد کرکے روتے تھے۔ تاہم اس تباہی بخش و پر از اضطراب زمانہ میں بھی ہر قسم کی صنعتی پیداوار کی اتنی کثرت تھی کہ نہ صرف گھر کی ضروریات ہی پوری ہوتی تھیں بلکہ باہر کی ضرورتیں بھی یہیں سے پوری ہوتی تھیں... لیکن کمپنی گورنمنٹ کے آتے ہی تو ہوا بدل گئی، اہل حرفہ کے گلے گھونٹ دیے گئے، صنعتیں بیٹھ گئیں۔ تجارت کی کساد بازاری ہوگئی، زراعت پر اوس پڑ گئی، کسانوں پر عرصۂ زندگی تنگ ہو گیا۔ زرعی و صنعتی روح بیدردی سے کچل ڈالی گئی اور ظالم خود غرضوں نے اس غریب (ہندوستان) کو ضرورت کی ایک ایک چیز سے محتاج کرکے اپنے ملک کی فلاح کے لیے خام پیداوار کی ایک ایسی قحط زدہ منڈی بنا دیا کہ تنہا "زرعی ملک" کا جفاکش کسان، آج دنیا میں سب سے زیادہ محنتی ہونے کے باوجود سب سے زیادہ

مفلس ہے اور انتہا یہ ہے کہ غریب اپنے اس خرمن کے کم از کم فوائد سے بھی محروم ہے۔ جسے وہ اپنے خون سے سینچتا ہے"

اتنی جلدی ایسا عظیم الشان انقلاب کیسے ہوگیا؟ اسکا جواب بھی کسی مشرقی زبان سے نہیں بلکہ مغربی قلم سے سُنیئے :-

...... ولسن لکھتا ہے "یہ ایک واقعہ ہے کہ انگریزی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستانی صنعت کو انتہائی ناانصافی سے مٹایا گیا ہے۔ اگر برطانوی صناع ہندوستانی صناع سے صرف صناع کی حیثیت سے مقابلہ کرتا تو ہرگز کامیاب نہ ہوسکتا"

شور لکھتا ہے :-

.... "ہندوستان کے اچھے دن گذر گئے۔ وہ دولت جسکا کبھی وہ مالک تھا لوٹ لی گئی وہ قابلیت و ذہانت جس کا دنیا جہان میں شہرہ تھا تباہ و برباد کردی گئی۔ اور ظالمانہ طریق حکومت سے اسکے فوائد کو اپنے فوائد پر قربان کردیا گیا"

.... لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز زراعت کی تباہی ہے جس نے اس بدنصیب ملک کے باشندوں کو مردوں سے بھی بدتر کردیا ہے۔ آج اسکے بچے معصوم بچے ایک مٹھی بھر اناج کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہیں اور نہیں پاتے۔ سسکتے ہیں اور مرجاتے ہیں"۔

..... اس معاشی ظلم نے ہندوستانی کسان کو کنگال کردیا۔ اس میں جان نہ رہی، چہرہ پر مصیبت و فلاکت برسنے لگی۔ قرض میں بوٹی بوٹی بندھ گئی۔ اور غریب پیسہ پیسہ کو محتاج ہوکر ان حالوں کو پہونچ گیا کہ اسکے بچے بھوکوں مرنے، جاڑوں ٹھٹھرنے لگے۔ پہلے وہ ایک فصل بوتا تھا اور چین سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اب بارہ مہینے اپنی ہڈیاں پیلتا اور خون پسینہ کرکے ٹھکانا ہے مگر پھر بھی روٹی کپڑے کو محتاج رہتا ہے۔ .... جب اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ گھر بار چھوڑکر بھاگ جاتا ہے۔ اور کبھی اپنے بال بچوں کو (بھی) بیچ ڈالتا ہے"

..... "یہ حقیقت کس درجہ تلخ و افسوسناک ہے، جو ملک دنیا کا بہترین صنعتی ملک ہو، جسکی مصنوعات سارے جہان کی مصنوعات پر سبقت لیگئی ہوں، جسکی خام پیداوار کا دُور دُور شہرہ ہو، جہاں اجناس کی اتنی ریل پیل ہو کہ ایک کمانے والے پر گھر کے گھر پلتے ہوں، جسکی زمین سونا اُگلتی ہو اور جہاں دولت کی نہریں بہتی ہوں، وہ ملک ایک صدی کے اندر اندر اتنا مفلس، اتنا قلاش، اتنا بدحال اور فلاکت زدہ ہوجائے کہ اسکی آبادی کا ایک تہائی حصہ نان شبینہ کو محتاج ہو اور پوری نصف آبادی جاڑے گرمی میں ڈھنگ کا کپڑا نہ پہن سکے! کیا کسی قوم کے لیے جو انصاف، انسانیت، شرافت، تہذیب اور ابنائے انسان کی ہمدردی و غمخواری کی بلند بانگ مدعی ہو، اس سے زیادہ کوئی بات شرمناک ہوسکتی ہے؟

جامعہ

"ترکیۂ جدیدہ میں تمدنی تحریک" کی پہلی قسط کے اقتباسات گذشتہ نمبر میں دیے جا چکے ہیں، اس بار سلسلہ قائم رکھتے ہوے قسط دوم کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے - ترکی معاملات سے جو دلچسپی آجکل مشرق میں لی جا رہی ہے اُسکو دیکھتے ہوے امید ہے کہ یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائیگا - پہلی قسط میں فاضل ادیب نے دکھلایا تھا کہ نئی تحریک سے جو انقلاب پیدا ہوا وہ ایک نئے تصور کائنات و حیات کی شکل میں اور دوسری طرف ایک جدید سیاسی و معاشی تنظیم کی صورت میں رونما ہوا - اگر "دنیاے جدید" کے مظاہر تکوین پر سلسلہ وار اجمالی نظر ڈالی جائے تو یہ جدید تصور کائنات و حیات مندرجۂ ذیل صورتوں میں نظر آئے گا (۱) انسان اور اُسکی عقل کی قدر (۲) زندگی اور دنیا کی طرف انسان کا رویہ (۳) فرد اور جماعت کا تصور اور جدید ریاست اور نئی تقننیت کے مظاہر میں ایک نئی سیاسی و معاشی تنظیم - یہ واقعات ذرا تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں - ہم بھی چند اقتباسات پیش کریں گے جنسے ان ہر سہ ادوار پر ایک مجمل روشنی پڑیگی :-

...... "قدیم ترکوں کا تصور کائنات اسلامی کا تصور تھا - لیکن عثمانی ترکوں نے جب اسلام کو قبول کیا ہے تو یہ کافی تاریخی نشو و نما پا چکا تھا اور اپنی اصلی ہیئت سے کافی ہٹ چکا تھا - اصل اسلام میں انسان کو کائنات میں سب سے بلند جگہ دی گئی تھی لیکن تاریخی نشو و نما کے دوران میں انسان کی یہ شاہانہ شوکت مدھم پڑ چلی تھی ......

قدیم اسلام میں انسان کو کائنات میں جو تفوق دیا گیا تھا اور عالم کی جو حکمرانی عطا ہوئی تھی اُسے تاریخی اسلام نے یا تو بھلا دیا یا اُسکی غلط توجیہیں کیں - قرآن کے تصور کائنات میں انسان کو جو بلند مرتبہ دیا گیا ہے اسکے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی تشکیل میں جماعتی اور سیاسی عناصر کا اثر ہے یا وہ نبی اسلام کے احساس جماعتی کا نتیجہ ہے - لیکن اس میں شک نہیں کہ بعد کو چل کر اس پر سیاسی و جماعتی حالات نے اثر ڈالا، اس میں کمی کی اور بالآخر اسے بالکل ہی مٹا دیا - ایک طرف اسلامی ممالک کی جابرانہ حکومت تھی جس نے انسان کو اتقا قوت اور بادشاہوں کے مزاج و وہم کے لیے کھلونا بنا دیا اور سیاسی و معاشی انحصار کا دائمی عذاب اسکے سر ڈال دیا تھا، دوسری طرف تمدن و تہذیب کے انحطاط نے اسے قدرت کی بے رحم طاقتوں کا دست نگر کر دیا تھا - اور یہ دونوں حالتیں ایسی نہ تھیں کہ عظمت بشری کا قرآنی تخیل اس میں قائم رہ سکتا - ہاں خود ان نئے حالات میں قیام کی مناسبت تھی - قدیم دنیا میں جبتک یہ قوت باقی تھی کہ اپنے اثر کو قائم رکھ سکے - اسوقت تک افراد کے لیے سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ رضا و تسلیم کے ساتھ اسکے ساتھ ساتھ چلیں لیکن جب پھر وقت آیا تو انسانیت نے اپنا حق حاصل

کرنے کی کوشش کی ..... عثمانی سلطنت کے سیاسی انقلابات مغربی تمدن سے تعلق اور یورپی انسانیت سے واقفیت ان سب چیزوں نے مل کر ایسی مدد کی کہ دت کا دبا ہوا مواد پھٹ پڑا عقل کی حقارت کا جذبہ تاریخی اسلام میں متصوفین کے یہاں پیدا ہوا انھوں نے شریعت کی رسمی پابندیوں اور متکلمین کی عقلیت کے خلاف علم بلند کیا۔ ادھر دوسرے حلقوں میں عقل سے مراد یہ صلاحیت نہ رہی جس کا مطالبہ قرآن اور رسول نے کیا تھا، کہ ہمیشہ از سر نو تخلیقی طور پر ایمان و عقیدہ کو تازہ رکھا جائے بلکہ اسے فرائض انسانی کی وجہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ....

..... اس انقلاب ذہنی کا تیسرا عنصر یعنی ارتقاء کا تصور اسلام اور ترکوں کے تصور کائنات میں بالکل نئی چیز ہے۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کی مخلوق دنیا پوری اور مکمل ہے ...... جدید معنوں میں وہاں امکان نہیں ہے"

نظام المشائخ نظام المشائخ کا اگست و ستمبر کا پرچہ بطور رسول نمبر شایع ہوا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر بہت بہتر ہے کئی مضامین بہت ہی اچھے ہیں۔ خدا بخشے ر سید اعظم مرحوم کو جنھوں نے جان ڈیونپورٹ سے اسلام پر بہت بہتر اور مسکت جواب عیسائیوں ے لیے لکھایا۔ چنانچہ مولانا ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جانشین حضرت میر درد دہلوی نے "قرآن ور رسول سے اعتذار" کے چند اقتباسات رسول نمبر میں شایع کیے ہیں۔ ایک جگہ اس مشہور اعتراض بھی جواب دیا ہے کہ "اسلام تلوار سے پھیلا ہے"

..... یہ اعتراض کہ حضور سرور کائنات صلعم نے اپنا مذہب (حقہ) بزور شمشیر پھیلایا اور اس طریقہ سے کثیر حصہ انسان کے خون کا ضائع ہوا اور بہت سی تباہیاں عمل میں آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار دو عالم (محمدؐ) نے اکثر لڑائیاں لڑی ہیں، مگر وہ حضرت موسیٰؑ کی لڑائیوں سے مختلف تھیں۔ کیونکہ حضورؐ کا منشا اُن سے تخریب نہ تھا بلکہ یہ غرض تھی کہ عرب کی قوم ایک ہو جائے اور بت پرستی زائل ہو جائے۔ اور خدائے واحد کی بندگی سکھائی جائے۔ حضور سرور دو عالم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت ہمدردی برتی جو کہ اسکے قانون کے تحت میں آگئے۔ جنگی لوگوں کو بیشک قتل کیا گیا مگر کسی خاتون یا معصوم بچوں کا خون نہیں بہایا گیا مختصر طور پر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کو مانیں اور اسیر جلیں انھیں ہرگز تباہ و برباد نہ کیا جائے بلکہ اُن سے برادرانہ برتاؤ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ نے اسکے خلاف تمام قوم کو بغیر شرائط رحم کے مانے ہوئے یا پیش کیے ہوئے غارت کیا۔ اور ایسی مثال حضور سرور کائنات سے کبھی عمل میں نہیں آئی"

کیف جناب سید عطاء الرحمٰن صاحب نے کیف کے تازہ نمبر میں معرفت کائنات کے

عنوان سے ایک دلچسپ فلسفیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ہم کائنات کی ہر شے کا احساس اسی طرح کریں جس طرح خود اپنا کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے اور ہر ذی روح کے ساتھ اسی لطف و اعتنا کا اظہار کریں جیسا اپنے ساتھ کرتے ہیں ۔۔۔۔ اور معرفت کائنات میں معرفت الٰہی بھی شامل ہے۔ ایک جگہ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ

"۔۔۔۔ ہر مذہب حیوانیت سے انسانیت کو فروغ دینے کے لیے آیا ہے۔ ہر معلم دین نے اپنے اصول منضبط کیے ہیں اور روح انسانی کو پستی ذلت و خود غرضی سے نکال کر علو و شرف کی جانب مائل کرنے کے دعوے کا اعلان کیا۔ قدیم ہندوستان کے رشی کنج تنہائی میں زندگی گزارتے تھے۔ وہ مدنی زندگی سے احتراز کرتے تھے۔ کاروبار ارضی اور معاملات دنیاوی میں حصہ لینا ان کے اصول حیات کے منافی تھا۔ وہ محبت کو مغلوب کرنے اور قوائے بہیمی کو ابھارنے کے لیے تنہائی کے گوشوں اور ویرانوں میں چلے جاتے تھے لیکن وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر رہے کہ خدا شناسی جو ان کی منزل مقصود ہے چند ایسے فرائض انسانیت اور اخلاق حسنہ پر مشتمل ہے جن کی پرورش اور بالیدگی براہ راست انسانوں سے اشتراک و ارتباط پر منحصر ہے ۔۔۔۔۔۔ اگر تم خود سعی و اکتساب سے گریز کرتے ہو تو دوسروں کی کمائی یا ثمرات عرق ریزی کو کشادہ پیشانی سے صرف کرنا فیاضی نہیں کہلایا جا سکتا۔ فیاضی کے لیے غیروں کے منت پذیر نہ ہو، بلکہ فیض رسانی کے ذرائع خود اپنی دیانت اور جفاکشی سے پیدا کرو ۔۔۔۔ امور خیر اور رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لو۔ یہ ہے حقیقی فیض رسانی اور کیا یہ جنگلوں میں ممکن ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔"

القاسم — القاسم کے ربیع الاول نمبر میں "معراج و سائنس" کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ اسکا پہلا حصہ گزشتہ ماہ میں شائع ہو چکا ہے مضمون دلچسپ ہے اسلیے مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"۔۔۔۔۔ یہ بھی شبہ دامنگیر ہوا کہ معراج کی وہ کیفیت جو کہ آیتوں اور حدیثوں میں ذکر کی گئی ہے جب ہی قابل تسلیم ہو سکتی ہے کہ آسمان میں خرق والتیام کو مانا جا سکے ہمیں ۔ علاوہ وغیرہ مسلم ہے۔ گو فلسفہ قدیم اس کا منکر ہے ۔۔ یہ شبہ ایک ایسا دلچسپ ہے کہ سوا سے دہریوں اور ملحدوں کے جو کہ کسی آسمانی مذہب کو نہیں مانتا کوئی شخص تسلیم نہیں کر سکتا۔ فرشتوں کا عروج و نزول وحی کا اترنا بغیر آسمان پھٹے نہ گزر سکا ہو ایسے ظلم ہیں۔ پھر قیامت کی

(القاسم ربیع الاول ص ۱۰)

اردو رسائل کے خاص مضامین

(اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

معارف ۔ اعظم گڈھ

(۱) مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ
(۲) امریکہ کولمبس سے پہلے معلوم تھا
(۳) معتزلہ کی ایک قدیم تصنیف
(۴) ہندوستان کی معاشی حالت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر

جامعہ ۔ دہلی

(۱) ترکیۂ جدیدہ میں تمدنی تحریک
(۲) عنفوان شباب کی مجموعی نفسی سیرت
(۳) شادی کا پیغام (افسانہ)

نظام المشائخ ۔ دہلی

(۱) این اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن
(۲) دنیا اور اسلام
(۳) برگزیدہ رسول کے نکاح

اُردو ۔ اورنگ آباد دکن

(۱) ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی
(۲) قدیم اُردو
(۳) صبح بنارس (نظم)

مخزن ۔ لاہور

(۱) کلام گرامی
(۲) نثر (مرثیہ)

ہمایوں ۔ لاہور

(۱) فلسفی
(۲) قربانی (افسانہ)
(۳) معاشرتی تاریخ اور اہل بہا

نیرنگ خیال ۔ لاہور

(۱) غنیمت
(۲) اختر و زہرہ (افسانہ)

کیف ۔ اجمیر

(۱) معرفت کائنات
(۲) ہر دُوار

مرقع ۔ لکھنؤ

(۱) سانپ
(۲) ترانۂ بلبل (نظم)

نظرے خوش گذرے

جولائی نمبر میں تاریخ انگلستان کا تعارف کراتے ہوئے وعدہ کیا گیا تھا کہ مصنف کی خود نوشت جو کتاب کے آخر میں ہے وہ انشاءاللہ الناظر کے ذریعہ شایع کی جائے گی - اس ماہ سے اُسکی اشاعت شروع کردی گئی ہے - ناظرین کرام ان اوراق کو رسالہ سے الگ کر کے رکھتے جائیں تاکہ آخر میں مکمل کتاب تیار ہو جائے -

---

یہ سال ہوا خواہان اُردو کے لیے نہایت درجہ صبر آزما ثابت ہوا - مولانا شرر، حضرت شاد اور مضطر خیر آبادی جیسے محسنین اُردو کے انتقال سے جو صدمہ و نقصان پہونچا تھا اُس میں گذشتہ مہینے اور اضافہ ہوا یعنی شمس العلما مولانا نذیر احمد دہلوی کے نامور خلف و جانشین مولوی بشیرالدین احمد نے بعارضۂ فالج انتقال کیا - مرحوم نے اپنے قیام حیدرآباد ہی کے زمانہ میں، جہاں وہ ڈپٹی کمشنری کے عہدہ پر فائز تھے تصنیف و تالیف کا شغل شروع کر دیا تھا - اقبال دولھن، حسنِ معاشرت، تاریخ بیجاپور، حرز طفلاں، نشاطِ عمر، اور عصاے پیری وغیرہ اسی عہد میں شایع ہو کر حسن قبول اور خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں - پنشن لیکر اطمینان سے وطن میں رہنے کا موقع ملا تو نہ صرف اُنھوں نے اپنے والد ماجد مرحوم و مغفور کی تمام تصانیف کو نہایت خوش اسلوبی سے چھپوانے اور شایع کرنے کا اہتمام کیا بلکہ شمع ہدایت، لختِ جگر، تین بسیط جلدوں میں واقعاتِ تاریخ دہلی، دیوان و انشاے بشیر، فرامین شاہی، حکایاتِ لطیفہ و لطائف عجیبہ وغیرہ کے اضافہ سے زبان اُردو کو مالامال کیا - اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا، اگر فالج لے گذشتہ سال سے بالکل ہی مجبور نہ بنا دیا ہوتا - اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور اُنکے پسماندگان کو توفیق صبر - اُمید ہے کہ مرحوم کے صاحبزادہ مسٹر محمد منظر بی اے ایل ایل بی اپنے اب وجد کی ادبی خدمات کے سلسلہ کو جاری رکھیں گے اور مرحوم کے اُن مسودات کی تکمیل و اشاعت میں ساعی رہیں گے جو فالج کی مہلک بیماری میں مبتلا ہونے کے باعث نامکمل رہ گئے ہوں -

---

ہندوستانی اکیڈمی سے براہِ راست ہمیں کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ وہ ایک خالص سرکاری
محکمہ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے مہاتما گاندھی کے متبعین کو کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔ تاہم اُردو
کے ایک ادبی خادم ہونے کی حیثیت سے، ان اوراق پر ہم برابر اُسکا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔

خیال تھا اور حالات کا تقاضہ بھی یہ تھا کہ صوبہ کے جو مصنفین و اہل قلم ہندوستانی اکیڈمی
کے رکن بنائے گئے ہیں اکیڈمی کے سارے کام اُنھیں کی رہنمائی اور مشورہ سے انجام پائیں گے
لیکن اب تک جو کارروائی ہوئی ہے اُس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کی شرکت محض برائے
نام رہیگی اور عملاً مجلس منتظمہ تمام امور میں مختارِ کل ہوگی ۔ بے شبہ اُس مجلس میں بھی سید سجاد حیدر
اور منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ جیسے خادمانِ اُردو موجود ہیں، لیکن ایسے زمانہ میں جبکہ اہل ملک
حکومت کے ہر شعبہ کے نظم و نسق کو جمہوری اصولوں پر چلانے کے خواہاں ہیں، کسی محکمہ کے تمام
امور کا انصرام ایک مختصر سی مجلس منتظمہ کو تفویض کر دینا کسی طرح برمحل نہیں ہو سکتا۔

مجلس منتظمہ، یقیناً اُن تمام انتظامات کی ذمہ دار رہے گی جو اکیڈمی کو حصول مقاصد کے
لیے عمل میں لانا ہوں لیکن اکیڈمی کو ملک کے لیے پوری طرح مفید بنانا ہے تو مجلس منتظمہ کو طریق
کار متعین کرنے سے قبل ضروری تجاویز کی منظوری اکیڈمی کے عام اراکین سے حاصل کرنا چاہیے
اس سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا کہ سال میں ایک دو دفعہ ان اراکین کو جمع کیا جائے اور
جو کارروائیاں مجلس منتظمہ نے بغیر اُسکے مشورہ اور منظوری کے انجام دی ہوں اُنکی روداد پیش کر دی جائے

سال رواں کے متعلق جو طریق کار مجلس منتظمہ نے طے کیا اور جس طرح سرکاری امداد کو صرف کرنا
تجویز کیا ہے بہت ممکن ہے کہ عام اراکین بھی اُسی کی تائید کرتے اور منظوری دیتے، لیکن چونکہ اُن
سے مشورہ نہیں کیا گیا اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ اُسکے ثمرات و نتائج کی ذمہ داری اُن پر عائد
نہیں ہو سکتی، اور احتمال ہے کہ جو لوگ اسکی شرکت کو اپنے لیے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے بلکہ خدمت کا
ایک اچھا موقع خیال کر کے اس میں شریک ہوئے ہیں وہ اس طریق کار سے بددل ہوں اور اسے
اپنی خودداری کے خلاف سمجھیں۔

ہمیں امید ہے کہ اکیڈمی کے محترم صدر اور مجلس منتظمہ کے دیگر اراکین اس مسئلہ پر پوری توجہ
فرمائیں گے اور مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کے غلط طریقہ کو رواج دینے سے پرہیز کرینگے صوبوں
اور حکومت ہند کے اراکین، یا یونیورسٹیوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے کارکن جس طرح اپنے اپنے سالانہ بجٹ
رائے عامہ کے نمائندوں کے روبرو پیش کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی اکیڈمی کو عام اراکین کے روبرو اپنی تمام تجاویز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خاتمہ کتاب کا جس مین کچھ کوایف اور سوانح اپنے اس کتاب کے مؤلف نے لکھے ہین تاکہ اُس کے پڑھنے والے مفصل اُس کے نام ونشان سے آگاہ ہوجاوین اور چونکہ ہر قسم کی تصنیف اور تالیف باقیات سے زمان دراز تک ہے اگرچہ واقعی نہو مگر ممکن ہے کہ انسان کی ابنی اور اس کی اولاد کی عمر سے اُس کی عمر بہت طویل ہو - اور آدمی جو جبلت سے حریص اپنی پایندگی کا ہے - اور اُس کو محال سمجھ کے اسی پر قانع ہوتا ہے کہ نام ہی پایندہ رہے - اس نظر سے یہ ضمیمہ ضرور معلوم ہوا - الغرض نام اس بے نام ونشان کا محمد مسیح الدین ہے اور مولد ومنشا اُس کا ایک قصبہ ہے جس کو کاکوری کہتے ہین وہ لکھنؤ سے پچھم طرف قریب پانچ کوس کے بادشاہی مکانات سے واقع ہے - زبان بزبان مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہین کہ ہم لوگ علوی ہین محمد ابن حنفیہ کی اولاد سے اور مادری نسب ہمارا عباسی ہے - جس کی شرح نسب ناموں سے معلوم ہوگی جو آیندہ مذکور ہونگے - اب بیان بیلے ہم کو ضرور ہے کہ کچھ مختصر حالات اپنے اجداد کا جہان تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ ہم لکھین - پس راقم محمد مسیح الدین ابن مولوی محمد علیم الدین خان بہادر - ابن قاضی القضات

خاتمہ کتاب کا مؤلف کے حالات کے ذکر میں

مؤلف اس کتاب کا باپ کی طرف سے علوی اور ماں کی طرف سے عباسی ہے اور وہ [illegible]

مولوی نجم الدین علی خان بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی الدین ابن ملا محمد غوث
مرحومین ہے لقب ہم لوگون کا ملکزادے مشہور ہے۔ ملک کا خطاب سلاطین دہلی۔ خلجی یا
غازی کی طرف سے بڑے بڑے امراؤن کو اُن کے عہد کے ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ ہم کو نہین معلوم
ہے کہ کس بزرگ کو ہمارے اجداد مین سے کس بادشاہ کی طرف سے یہ خطاب عطا ہوا تھا

ذکر ملا محمد غوث مغفور و اولاد کے — در زمانہ عالمگیر بادشاہ کے عہد مین منصب دار رہے

ملا محمد غوث مغفور اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے عہد مین بہت رشد رکھتے
تھے اور بڑے عالم باعمل تھے۔ اول اُن کو منصب وکالت مرزا کام بخش شہزادے
کا مفوض ہوا اس واسطے کہ اُس عہد مین ظاہرا دستور تھا۔ سب شاہزادون کے
سارے عقود بیع اور شرا وغیرہ شریعت کے طریقے پر ہوتے تھے تو شاید ایجاب
قبول کے واسطے کوئی وکیل مقرر ہوتا ہو گا۔ یا شاید اگر عدالت مین اُن پر کسی
کچھ دعوے ہوا یا اون کو کسی کے اوپر کچھ دعوے ہو تو انجام جوابدہی کا یا اثبات دعوے کا
وکلا سے متعلق ہو گا۔ غرض تفصیل اس کی راقم کو نہین معلوم ہے کہ وکلا سے کیا کام متعلق
تھا۔ صرف تعلق اس منصب کا پرانے کاغذات سے معلوم ہوا۔ اس عہدے سے ترقی ہو
تب محتسب مستقر الخلافت بلدہ اکبراباد کے مقرر ہوے۔ خدمت احتساب کی غالب ہے
اکثر لوگون کو معلوم ہو گی کہ واسطے ممانعت جمیع منہیات شرعیہ کے اُس شہر مین جہان محتسب
مقرر ہوا کرتا تھا۔ اُس عہدے سے پھر ترقی ہوئی تو صدر الصدور صوبہ الہ آباد کے مقـ
ہوے۔ یہ خدمت سلاطین تیموریہ کے عہد مین واسطے تحقیقات اور تجسس مدد معاش او
التمغا کے مقرر ہوتی تھی۔ کیا کیا کام اون سے اس باب مین متعلق تھا یہ ہم کو مفصل نہین
معلوم ہے۔ مگر ظاہرا یہ غرض ہو گی کہ اوس کے اسناد مین جعل اور تلبیس نہ واقع ہو اور دامی مد
معاش وغیرہ ورثہ شرعیہ پر تقسیم ہو اون کے باہم نزاع نہ ہونے پاوے اور مادام الحیات ا
مشروط خدمت مین کچھ فتور اور خیانت نہو۔ اوس عہدے سے بھی ترقی ہوئی تو صوبہ دا
کے جزیہ کی تحصیل کے واسطے مقرر ہوے۔ ان چارون مین سے ایک کسی خدمت پر

دو صد و پنجاہی منصب تھا بعضے کاغذات سے یہ امر ثابت ہوا مگر یہ نہین معلوم ہوا
کہ یہ منصب پہلی خدمت کا تھا یا کسی بیچ والی خدمت کا یا اخیر خدمت کا اور آئین اکبری
سے معلوم ہوا کہ دو صد و پنجاہی منصب مین نو سو روپیہ درماہے کے حساب سے جاگیر
عطا ہوتی تھی بعد اکبر بادشاہ کے سب مناصب مین کچھ کچھ ترقی ہوئی۔ اس منصب
مین بھی کچھ ہوئی ہوگی۔ اور یہ بھی بالیقین نہین معلوم ہوا کہ ان چارون منصبون کے سوا
کوئی اور منصب نہین متعلق ہوا۔ اس واسطے کہ جب عالمگیر بادشاہ بارہ[ص] برس دکن کے
اطراف مین رہے تب جناب ممدوح بادشاہ کے ہمراہ تھے مگر کچھ معلوم نہین ہوا کہ اوس
عرصے مین کون خدمت متعلق تھی۔ اس واسطے کہ تین خدمتون مین تو اختصاص مکانات
اقامت کا معلوم ہوتا ہے۔ یا اکبر آباد یا الہ آباد یا اودھ تو بادشاہ کی ہمراہی مین یا مرزا
کام بخش کی وکالت ہوگی یا کوئی دوسرا عہدہ ہوگا مگر غالب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات
آپ کی صوبۂ اودھ کے جزیے کی تحقیق کی خدمت مین ہوئی ہے اور یہ بھی حکایت زبان بزبان
بزرگون سے سنی ہے کہ عالمگیر بادشاہ کا ارادہ تھا حدیث کی کتابین آپ سے پڑھنے کا
لیکن آپ نے سند حدیث کی اوس وقت تک نہین کی تھی اس واسطے بادشاہ نے آپ کو
حکم دیا کہ لاہور مین جا کے ملا یعقوب بنانی سے جو بڑے محدث اوس عہد کے مشہور تھے
حدیث سند کر کے آیئے چنانچہ آپ وہان تشریف لے گئے اور حدیث سند کی لیکن کچھ ایسا
تفرقہ واقع ہوا کہ بادشاہ کو آپ سے سند کرنے کی نوبت نہ پہونچی جناب ممدوح نے ۲۶ صفر
۱۱۰۰ھ مین ساٹھ برس کی عمر مین قضا کی ہے وہی زمانہ پس و پیش عالمگیر کے قضا کرنے کا بھی
تھا۔ شاید اسی سبب سے نوبت نہ آئی ہو۔ ہم نے اپنے بزرگون کے وصایا سے سنا ہے
کہ جو شخص عزم راسخ گناہون کے ترک کا صداقت سے بغیر مکر اور ریا کے کرے تو اللہ تعالیٰ
اوس کو ایسی توفیق دیتا ہے کہ کسی گناہ کے ابتلا مین اوس کو مجبور نہین کرتا۔ اور اسی وصیت
پر نقل جناب غفران مآب ملا محمد غوث کی سننے مین آئی کہ آپ کو شریعت کے اوامر اور

ص حاشیہ چھوٹ گیا۔ ۱۲

نواہی پر اتنی استقامت تھی کہ کوئی مندوب ترک نہین فرماتے تھے اور کوئی مکروہ عمل
مین نہین لاتے تھے ۔ اتفاقاً دکن کے سفر مین چونکہ جاگیر مواجب کی وطن مین تھی بسبب
بعد کے اور اوس عہد کی راہون کے خراب ہونے کے سبب سے روپیہ وطن سے نہین
پہونچ سکتا تھا آپ سودی قرض لینے مین مجبور ہوے اس سبب سے آپ کو بہت ملال تھا
اس واسطے کہ جیسا سود لینا ہماری شریعت مین ممنوع ہے سود دینا بھی ممنوع ہے اگرچہ
نہایت ضرورت کے وقت متاخرین نے فتوا اوس کے جواز کا دیا ہے مگر ظاہرا آپ کے
نزدیک جایز نہ ہوگا ۔ اتفاقاً قبل اس کے کہ اوس مین مبتلا ہون آپ کے خیال مین آیا کہ
جیسے ہم وطن سے خرچ نہین منگوا سکتے جو لوگ ہمارے جوار کے رہنے والے لشکر مین نقدی
کے نوکر ہین وہ خرچ اپنے اہل وعیال کے واسطے بھیج نہین سکتے تو ایسے لوگون کی تلاش
کر کے اون سے آپ نے کہا کہ تم ہم کو روپیہ دو ۔ وطن مین بغیر کچھ صرف کے وہی روپیہ
تمہارے اہل وعیال کو ہم پہونچا دین گے ۔ اتنا روپیہ جمع ہوگیا کہ جاگیر کا روپیہ بمشکل
کافی اوس کے ادا کرنے کے واسطے ہوا اور آپ سودی قرض لینے سے محفوظ رہے ۔ ایک
حکایت جناب ممدوح کے الہ آباد کے ہنگام قیام کی ۔ ایک بزرگ نے ہمارے قصبہ کاکوری
کے باشندون کا ایک تذکرہ لکھا ہے اوس مین نقل کی ہے ۔ وہ لکھتے ہین کہ اوس عہد
مین جب آپ الہ آباد کے صدر الصدور تھے ۔ علی ابراہیم خان نام ایک ولایتی وہان کے
صوبہ دار تھے اون کا مذہب شیعہ تھا اور ظاہرا متعصب بھی تھے مگر اوس عرصہ مین سب
امرا ایرانی اپنے مذہب کو چھپاتے تھے ۔ اتفاقاً عید کا دن تھا ایک رسالہ دار جس کا مذہب
اہل سنت وجماعت تھا وہ صوبہ دار کے نذر دینے کو جاتے تھے ۔ راستہ مین ایک اونھین
کے رسالہ کے سوار نے جس کا مذہب شیعہ تھا تنخواہ کے نہ پانے سے تنگ ہو کے اور
اون کی کمر مین ہاتھ ڈال کے اون کو روکا اور خلفاے ثلثہ رضوان اللہ علیہم سے تبری
مشروطہ کی یعنی کہنے لگا کہ اگر آج تم ہماری تنخواہ نہ دلوا دو تو تبرائی پر لعنت ہے ۔ رسالہ دار

صہ حاشیہ چھوٹ گیا ۱۲

بہرصورت اوس سے پیچھا چھوڑا کے ناظم تک پہونچا اور اُن سے اس حرکت کا اشتغاثہ کیا
ناظم نے جبرًا اور کرہًا صرف بادشاہ کے خوف سے اوس سوار کو گرفتار کرکے پابجولانہ مقید کیا
لیکن اس فکر مین پڑا کہ کسی نہج سے اوس کی رہائی ہو اور بادشاہ کی طرف سے اون پر الزام
نہ آوے۔ تمام شہر کے علما کو اور قاضی اور مفتی کو ناظم نے جمع کیا کہ اوس سوار کے مقدمہ مین تحقیق
اور تجویز شرعی اون کے سامنے ہو۔ ملا امان بنارسی ایک شخص بڑے فاضل متقی تھے۔ ظاہرا
ناظم نے خلوت مین اون سے ایما کیا تھا کہ کسی طرح سے اوس کی رہائی ہو۔ وہ ملا امان ظاہرا
ارباب دنیا سے تھے۔ الغرض ناظم نے اوس مجلس مین جناب غفران ملا محمد غوث کو بھی اصرار
سے بلایا۔ اگرچہ آپ نے عذر بہت کیا کہ اس مجلس مین ایسے لوگون کی شرکت چاہیے جن کا
عہدہ علم کا ہو میرا علم اتفاقی ہے۔ میرے عہدے مین علم کا ہونا ضرور نہین ہے مگر ناظم نے ہرگز
عذر آپ کا قبول نہ کیا اور اصرار سے طلب کیا جب مجلس جمع ہوئی قاضی اور مفتی نے
فتوے قتل کا اوس سوار کے واسطے لکھا۔ ملا امان بنارسی نے یہ تقریر کی۔ وجوب قتل ایک
مرد مسلمان کا بسبب اوس کی اوس دن کی تقریر کے ہے جو عید کے دن رسالہ دار سے
اوس نے کی تھی کہ آپ لوگون کے نزدیک اوس نے سبّ خلفاے ثلثہ کیا لیکن وہ سبّ
واقع نہین ہوئی کہ الفاظ سبّ کے قضیہ شرطیہ کے تالی مین ہین اور تالی کا وقوع بدون
وجود مقدم کے نہین ہوتا اور اوس وقت مقدم کا وجود نہ تھا۔ اس صورت مین تالی کا
حکم اوس وقت واقع نہین ہوا۔ اور اگر رسالہ دار اوس دن تنخواہ دیدیتا تو ہرگز واقع نہ ہوتا
اس صورت مین وقوع سبّ کا جس کو موجب قتل کہتے ہو وہ اوس شخص کے فعل
سے نہین واقع ہوا جس کو مجرم قرار دیتے ہو۔ بلکہ وہ رسالہ دار کے فعل سے واقع ہوا۔
اس تقریر سے سب علما بند ہو گئے مگر جناب ملا محمد غوث مغفور نے فرمایا۔ حضرات
مجرم ٹھیرایا گیا ہے سبّ خلفا کا جو موجب قتل ہے۔ پہلے معنے سبّ کے لغت مین
دیکھیے بعد اوس کے بنظر معنے کے تجویز فرمائیے کہ اوس کلام سے جو مجرم نے کہا سبّ واقع

ہوئی یا نہین۔ سب لوگ اس پر راضی ہوے۔ معتبر کتب لغت کے منگوائے اور سب کے معنے دیکھے
گئے یہ نکلے اَلسَّبُّ مَا لَحِقَ بِهِ الْعَارُ یعنی سب نام ہے اوس کا کہ کسی کو ایسی بات کہے
جس مین اوس کی سبکی ہو۔ اوس وقت جناب ممدوح نے ملا مان کی طرف متوجہ ہو کے
کہا۔ اگر کوئی شخص کسی کو گالی معلق اور مشروط ایک امر محال پر کر کے دیوے مثلاً کہے کہ
اگر آج نصف شب کو آفتاب نکلے تو تیری جورو فاحشہ ہے۔ تو باوجود اسکے کہ وجود مقدم
کا محال ہے البتہ وس شخص کی سبکی ہوگی۔ اسی طرح سے اگر خلفائے ثلثہ زندہ ہوتے تو العیاذ باللہ
لعن کے انتساب سے اون کی طرف اون کی سبکی ہوتی۔ اس نظر سے اوس شخص کی
زبان سے سب واقع ہوئی۔ ملا مان بنارسی نے ظاہرا ایسا سمجھا تھا کہ ناظم نے جس طرح
سے سفارش اوس شخص کی رہائی کی اون سے کی اوروں سے بھی کی ہوگی۔ وہ ناظم کی
طرف متوجہ ہو کے کہنے لگے پھر ہم بیان کاہیکو آئے تھے۔ جناب ملا محمد غوث نے اس کے
جواب مین مبادرت کی اور ایک ایہامی جواب دیا یعنی فرمایا بندہ فاعل مختار ہے۔ آپ
خود جانتے ہون گے کہ آپ کس واسطے آئے تھے۔ غرض اس جواب سے یہ تھی کہ شیعہ
کے عقیدے مین بندہ فاعل مختار ہے۔ حضرت مولانا نے اشارہ اس امر کی طرف کیا کہ ایسا
مقدمہ مین شیعہ کی اعانت کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ شیعہ ہین۔ الغرض اوس وقت
مجلس برخاست ہوئی اور تجویز اوس مقدمہ کی دوسرے دن پر رہی اور سوانح نگار نے
ساری کیفیت اس مقدمہ کی مع روئداد سارے مکالمات کے جو اوس مجلس مین واقع
ہوئے تھے بادشاہ کے حضور مین لکھ بھیجی۔ وہان سے حکم قتل کا اوس شخص کے واسطے
صادر ہوا۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ کسی نہج کی تہدید یا تعزیر ناظم پر بھی بنظر مداہنت کے اجرائے
حکم شریعت مین واقع ہوئی شاید معزولی یا تبدیلی ہوئی ہے۔

چونکہ ہم لوگون مین تحریر کوائف اور سوانح گذشتہ خاندانی کی عادت بہت کم ہے اور
حالات تفصیلی سے جیسے تاریخ ولادت وغیرہ حضرت ملا مغفور کی ہے معلوم نہین ہوئی اور

ہ کچھ عبارت حاشیہ پر بڑھائی گئی تھی جو چھوٹ گئی ہے۔ ۱۲

جو کچھ پچھلے کاغذات سے معلوم ہوتا وہ بسبب انقراض دہور کے باقی نہین رہے اور چونکہ دستور اوس عہد کا تھا کہ نال اموال منصبداروں کا جو قضا کر جائین سلطنت مین ضبط ہو جاتا تھا اور کچھ تھوڑا سا اہل وعیال کے کھانے کے واسطے مقرر ہو جایا کرتا تھا اوس کا بھی مفصل حال کچھ نہین معلوم ہوا۔ سب اعقاب کا بھی مفصل حال نہین معلوم ہوا۔ ہمارے اجداد مین آپ کے ایک بیٹے مولوی غازی الدین مغفور تھے۔ ظاہرا چھ سات برس کی عمر کے تھے جب آپ نے قضا کی[عہ]۔ اپنے سن شباب مین تعلیم اور تربیت پانے کے لیے دلّی مین تشریف لے گئے تھے وہان کسی مدرسہ مین پڑھتے تھے کہ طلبہ مین آپس مین خانہ جنگی ہوئی۔ آپ رفع فساد کے واسطے بیچ مین پڑے اوس حالت مین قتل عمد یا قتل خطا سے شہید ہو گئے۔ پچھلے کاغذات سے اون کی تاریخ ولادت اونیسوین رجب سنہ ۱۱[illegible]ھ اور تاریخ وفات اٹھارہوین ذیقعدہ سنہ [illegible]ھ معلوم ہوئی۔ اور وہ ایک بیٹے بحالت صغیر السن مولوی حمید الدین مغفور کو وطن مین چھوڑ گئے تھے کہ وہ بہت رشید ہوئے جو والد ہمارے جد کے تھے

مولوی غازی الدین مغفور مولف کے جد امجد کا ذکر

کوائف اور سوانح جناب ممدوح کے علم وعمل کے ہمارے جوار اور دیار مین ایسے مشہور ہین کہ حاجت اون کے لکھنے کی نہین ہے مگر مختصر کچھ ہم لکھتے ہین جس سے عظمت شان جناب ممدوح کی معلوم ہو اور اون کی رفعت مرتبے کے بیان کے واسطے صرف ذکر اس[عہ] حکایت کا کافی ہے کہ جناب حضرت شاہ کاظم قدس سرہ جو ہمارے بزرگون مین مشایخ کبار سلسلۂ قلندریہ سے تھے اگرچہ عمر مین آپ سے کچھ چھوٹے تھے اور تلمذ بھی آپ سے اون کو تھا بسبب ریاضات شاقہ سے اور تصوف کے علم وعمل سے بہت بڑے رتبۂ عالی پر پہونچے تھے ایک دن حضرت شاہ کاظم ممدوح خواب مین یا بیچ اون اشغال معمولی مین مشرف صحبت بابرکت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئے اوس حالت مین حضرتؐ سے استفسار کیا کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

مولوی حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ مولف کے جد کے والد کا ذکر

عہ کچھ عبارت حاشیہ پر رہ گئی [illegible] عہ حاشیہ چھوٹ گیا ۔

جو قرآن شریف مین آپ کی شان مین نازل ہوا ہے۔ مین امیدوار کہ اوس کی مجھکو کچھ
تعلیم فرمائیے۔ اوس کے جواب مین آپ نے ارشاد فرمایا کہ مولوی حمید الدین سے پوچھو
یا فرمایا سیکھو۔ اوسی وقت حضرت شاہ صاحب ممدوح ہمارے جناب جد اعلے کے پاس
تشریف لائے اور کہا کہ مین حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مامور ہوا
ہون کہ علم اخلاق آپ سے سیکھون۔ اس واسطے بموجب امر کے آپ نے ایک رسالہ مختصر
فارسی زبان مین تحریر فرمایا ہے۔ راقم کی نیت ہے کہ محض احراز سعادت اور برکت کے واسطے
اوس رسالہ کو تتمہ اپنی اس کتاب کا کرے۔ ایک[عہ] حکایت نہایت تعجب اور حیرت افزا
آپ کے تقوے کی مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ نے سارے باغات آم کے تمام ممالک
محروسہ کے یا لکھنؤ کے متصل گرد وپیش کے سب ضبط کر لیے تھے اور سب آم سارے باغات
کے لوٹ کے سرکار مین چلے جاتے تھے مگر بازارون مین آم کچھ کچھ بکا بھی کرتے تھے۔ اور
ظاہر ہے کہ وہ سب آم یا چوری کے ہوتے تھے۔ یا اگر سرکار کے حکم سے بکتے ہون تو غیر کا مال
چھینا ہوا ظلم سے بکتا تھا قریب آٹھ نو برس کے یہ ضبطی عام رہی۔ اس سارے ایام ضبطی
مین حضرت نے بالکل آم نہین کھائے۔ ایک روز آپ موضع دگھیا اپنی زمینداری کے
گانون مین تشریف لیگئے تھے وہان کے کارپردازنے آم کی چٹنی پسوا کے کھانے کے
وقت آپ کے دسترخوان پر رکھی۔ اور ہر چند اوس نے اصرار کیا کہ آپ ہی کے باغ کے آم
کی مین نے یہ چٹنی پیسی ہے آپ نے ہرگز وہ چٹنی بھی نہین کھائی۔ یہ حکایت بعینہ اوسی
طرح کی ہے جو حضرت ابی حنیفہؒ کی احتیاط کی مشہور ہے کہ کسی شخص کی بکری کھو گئی تھی
حضرت نے اس نظر سے کہ عمر طبعی بکری کی بارہ برس ہے۔ بارہ برس تک گوشت
بکری کا نہین کھایا۔ ایک[عہ] حکایت آپ کے اخلاق اور مروت کی مشہور ہے کہ کسی سفر
مین ایک دن عصر کے وقت رستے مین ایک مقام پر آپ نماز پڑھ چکے تھے مگر جائے نماز
پر بیٹھے ہوے وظیفہ پڑھ رہے تھے ایک کوئی صاحب ارباب تعارف سے گھوڑے پر سوار

عہ و عہ حاشیہ چھوٹ گیا ۱۲

اور ایک برچھا ہاتھ مین اون کے تھا کسی طرف سے آتے تھے آپ کو دیکھ کے گھوڑے کو
روک لیا کچھ باتین کرنے لگے اور برچھا زمین مین گاڑ دیا۔ چونکہ اندھیرا تھا اتفاقاً وہ برچھا
آپ کے ہاتھ کی پشت پر گر گیا۔ دو تین دقیقے جب تلک وہ صاحب کھڑے ہوے باتین
کرتے رہے آپ نے اُف نہ کیا صرف اس نظر سے کہ اُن کو ندامت ہوگی۔ جب وہ برچھا
اوکھاڑ کے چلے گئے تب آپ نے زخم کو دھو کے باندھا۔
اور حکایتین آپ کے تقوے کی اور اخلاق کی سیکڑون ہین۔ سب کے نقل کرنے سے
کتاب بہت بڑھجائیگی۔ الغرض بعد وفات ملا محمد غوث مغفور آپ کے جد کے کچھ نقدی
روزینہ بعد ضبطی جاگیرات وغیرہ کے غالباً دو روپیہ روز اہل وعیال کی پرورش کے واسطے
سلطنت سے مقرر ہو گئے تھے اوس کے عوض مین حضرت جد اعلے نے سند معافی موضع
دگھیا کی حاصل کی تھی اور بتدریج اوس گاؤن کی زمینداری بھی مول لے لی تھی۔ جب اوس
گاؤن کی معافی ضبطی عام مین شجاع الدولہ نے ضبط کر لی تب مدار معاش کی صرف اوس
گاؤن کی زمینداری پر رہ گئی تھی۔ جس پر جناب ممدوح مغفور نے اپنے ایام حیات تک
مع اعقاب کے اور چند طالب علمون کے بسر کی اور درس تدریس جاری رکھی۔ اگرچہ
بنظر شدت تقوے کے اور اس نظر سے کہ شاعریت علما کے واسطے بڑا کمال نہین ہے
اوس کی طرف بہت توجہ نہ تھی مگر طبیعت نہایت موزون تھی۔ کبھی کبھی کچھ ارشاد فرماتے
تھے لیکن جیسا شعرا کا دستور ہے تخلص بھی اپنا نہین قرار دیا اور نہ اپنے کلام کو کبھی جمع کیا
مگر مشکل قصاید کے معنے ایسے نازک اور دقت کے ساتھ بیان فرماتے تھے کہ دوسرا کوئی
نہ کہہ سکیگا۔ اور یہ ہمیشہ ارشاد ہوتا تھا کہ اگر کوئی مثنوی غنیمت کی سمجھ سے پڑھے تو کیسی ہی
اوس کی طبیعت غیر موزون ہو نظم کرنا مین اوس کو سکھا دون غرضکہ باوصف آپ کے
قلت شغل کے شاعریت کی طرف اور اپنا کلام جمع نہ فرمانے کے بھی کچھ تھوڑے بہت
اشعار مشہور ہین صرف تبرکاً یہان ایک شعر جو استغفار کے وقت مین آپ کی زبان سے

ے حاشیہ صفحہ گیا۔ ۱۲

نکلا ہے مین لکھتا ہون ؎

از بہر قطع کردن نخل حیات من | چون ارّہ دو دم نفس اندر کشاکش است

اور ایک دن آپ مظفر الدولہ بخشی الممالک ابو البرکات خان بہادر تہور جنگ عباسی جو آپ کی پھوپھی کے بیٹے تھے اون کی ملاقات کے واسطے تشریف لیگئے۔ شام کا وقت تھا کہ آفتاب کا قرص فاقد النور نظر پڑتا تھا بخشی صاحب نے کہا کہ ایک مصرعہ اس وقت موزون ہوگیا ہے دوسرا مصرعہ ہر چند مین فکر کرتا ہون اب تک خیال مین نہین آیا وہ مصرعہ یہ ہے مصرعہ می توان دیدن بوقت شام سوئے آفتاب ÷ آپ نے فی البدیہہ ارشاد کیا ؎ با خط شبرنگ دیدم روے اوراے حجاب ÷ می توان دیدن بوقت شام سوے آفتاب ÷

ولادت جناب جد اعلےٰ کی ساتوین رمضان ۱۱۳۲ھ تھی اور آپ نے غرہ ذیقعدہ ۱۲۱۵ھ مین قضا کی۔ ۸۴ برس ایک مہینا پچیس دن کی عمر مین اور علوم کی تصانیف کی طرف بھی آپ نے توجہ نہین فرمایا۔

ذکر مولانا و سیدنا قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خان بہادر مغفور کا

اور آپ کے اعقاب مین تین صاحبزادے رہے۔ سب سے بڑے ہمارے جدّ بزرگوار قاضی القضات مولوی محمد نجم الدین علی خان بہادر مغفور تھے۔ کمال علم اور فضل اور اوصاف حمیدہ آپ کے اگر مجموع نقل کیے جاوین تو ایک کتاب مبسوط ہو جاوے کچھ تھوڑے سے اوس مین سے یہان ہم نقل کرتے ہین ۔

پندرہ برس کی عمر مین حضرت جد امجد معقولات و منقولات سے فارغ التحصیل ہوئے

پندرہ برس کی عمر مین جو درس معمولی معقولات اور منقولات کا ہمارے بلاد مین ہے اوس سے آپ فارغ ہوکے تدریس کی طرف مشغول ہوے اور وفور ذہن و ذکا سے ہر علم مین کمال حاصل کیا اور فیض عام آپ کی تعلیم کا تمام جوار و دیار مین دور دور تک جاری اور ساری ہوا اور بہت سے آپ کے شاگردون مین سے علماے نامی ہوے۔ شوق تالیف اور تصنیف بہت نہ تھا مگر معقولات کے کتب پر کچھ کچھ حواشی متفرق دیکھنے مین آئے ہین کوئی کتاب بالاستیعاب معقولات

مین نہین لکھی۔ مگر جنایات فقہ فارسی زبان مین سلطنت انگریزیہ کے حکم سے
ایک کتاب لکھی تھی جو سرکار کے حکم سے چھپی بھی تھی اور جب تک ہندوستان
مین اجرائے حدود اور قصاص کا شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
پر رہا مفتیان عدالت کے واسطے بہت بڑی ہدایت کی کتاب تھی۔ اور
ایک رسالہ بتۂ جبریہ جبر اور مقابلے مین منظوم مع شرح کے نثر مین آپ نے
لکھا ہے وہ بھی کلکتہ مین چھپا ہے۔ اور بہت عمدہ آپ کے تصنیفات مین
ایک کشکول ہے جو بنام بیاض رشک ریاض مشہور ہے۔ جمیع علوم مروجہ سے
کچھ کچھ اوس مین بحث ہے اور تقسیم اوس کی محافل پر ہے مثلاً محفل اول علم تفسیر
مین محفل دوم علم حدیث مین۔ علی ہذا القیاس پندرہ یا اٹھارہ محفل اوس مین
ہین۔ اوس کو اور بڑھانا اور مرتب کرنا منظور تھا اس واسطے کہ وہ صرف
بطور کشکول کے مسودہ آپ کے ہاتھ کا ہے۔ مگر زمانے نے فرصت نہ دی اور
نہ ہم لوگون مین سے کسی کو اب تک توفیق ہوئی کہ اوس کو چھپوائین۔ جناب
ممدوح مغفور کو شوق شعر اور سخن کا بھی بہت تھا۔ بہت سے اشعار عربی اور فارسی اوسی
بیاض رشک ریاض مین مندرج ہین۔ کچھ کلام آپ کا اور کوائف کے ذکر کے بعد
منقول ہوگا۔ تاریخ آپ کی ولادت کی کسی نے لکھی تھی (نجم ثاقب است) جو پندرھوین
ربیع الاول ۱۲۵۷ھ مین واقع ہوئی۔ اسی تاریخ کی نظر سے ظاہراً آپ کا نام نامی
نجم الدین مقرر ہوا۔ اور آپ نے تخلص اپنا شاعریت مین ثاقب مقرر کیا۔ یا نام اور تخلص
کو جمع کر کے کسی نے شاعریت کی کہ تاریخ آپ کی ولادت کی اوس سے نکالی۔ اس کا
حال مفصل راقم پر نہین کھلا۔
ایک حکایت جناب ممدوح کی کچھ ترقی دنیاوی کی ذکر کے قابل ہے۔ نواب
شجاع الدولہ والی اودھ کو علم جفر کا بہت شوق تھا۔ ایک کتاب کوئی اس فن کی دانا

حضرت مجد کے تصانیف جنایات فقہ فارسی اور رسالہ جبریہ منظوم مع شرح اور بیاض رشک ریاض

ملی تھی کہ وہ بہت غلط تھی اوس کو وہ صحیح کرانا چاہتے تھے مگر یہ نہین روا رکھتے تھے کہ
کتاب باہر جائے جناب حضرت جد امجد مغفور کو فیض آباد مین اونھون نے طلب کیا
اور خاص دیوانخانے مین حکم اقامت کا دیا کہ وہین اون کے سامنے اوس کتاب کو صحیح
کرین اور ایک خوشنویس آپ کے ساتھ مامور ہوا کہ جس قدر آپ اوس کتاب کو صحیح کرتے تھے
وہ اوس کی نقل کرتا تھا۔ اور شجاع الدولہ کو اتنا اہتمام اوس کے اخفا مین تھا کہ وہان پہرا رہتا
تھا کہ کوئی ورق یا صفحہ اصل یا نقل دیوانخانے سے باہر نہ نکلے اور ہر روز تین چار مرتبہ
صبح سے شام تک خود دیوان خانے مین آکے آپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہوکے اور
دونون ہاتھ آپ کے شانون پر رکھ کے اور جھک کے کھڑے ہوتے تھے۔ اور جو آپ
لکھتے جاتے تھے اوس کو دیکھتے تھے۔ اور تعظیم کرنے سے منع کرتے تھے۔ اور ظاہرا آپ
اوس کتاب کو صحیح بھی کرتے تھے۔ اور کچھ اوس کے مضامین مجملہ کی شرح بھی کرتے تھے اور
اور جو اون کی سمجھ مین نہین آتا ہوگا اوس کو تحقیق بھی کرتے ہون گے۔ جب اوس کتاب
کی تصحیح اور شرح قریب تمامی کے پہونچی تب حضرت جد امجد نے یہ چاہا کہ اوس کے صلہ
مین درخواست معافی موضع دگھیا کی جو اون کے والد ماجد کی معافی مین تھا اور ضبطی عام
مین ضبط ہوگیا تھا پیش کرین۔ چنانچہ اس امر کا تذکرہ آپ نے صورت سنگھ سے جو
نواب شجاع الدولہ کے دیوان تھے اور اون کے مزاج مین محیط تھے کیا۔ اس واسطے کہ
وہی ظاہرا مقرب بھی آپ کے ہوئے تھے۔ صورت سنگھ نے اوس کے جواب مین کہا
کہ حضور آپ کی اس خدمت سے اتنے راضی اور خوش ہوئے ہین اگر آپ صلہ اس کا
حضور ہی کی رائے پر چھوڑ دیتے تو حضور کچھ بیش قرار ہوا جب آپ کے واسطے مقرر کرین گے
اور کوئی خدمت معقول آپ کو سپرد کرین گے۔ اور گاؤن کا معاف کرنا بسبب عہد مصمم
کے کہ ایک چپہ زمین کسی کو معاف نہ کرین گے بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ممکن ہے
کے بنظر نہایت خوشنودی کے آپ سے معاف کردیوین چونکہ آپ کو کسی دنیوی خدمت

ذکر معافی موضع دگھیا کا جو ضبطی عام سے حضرت جد امجد کی ضبط ہوا

انجام سے حصول گاؤن کی معافی کا نہایت مرجح تھا تا کہ اپنے گھر مین بیٹھے ہوئے تدریس
کیا کرین۔ دیوان صورت سنگھ سے آپ نے اوسی کی سعی اور سفارش کے واسطے اصرار
کیا۔ اونھون نے کہا کہ اگر یہ درخواست حضور نے قبول بھی کی تو اور صلے اور عطا سے
محروم ہو جائیگا۔ خیر آپ درخواست لکھ کے مجھے دیجیے بعد اوس صلے کے عطا کے
جو حضور خود تجویز کرین کوئی محل دیکھ کے مین درخواست آپ کی پیش کرون گا۔ آپ
اپنے ہاتھ سے ہرگز درخواست نہ دیجیے گا۔ آپ نے وہ درخواست اوسی خوشنویس سے
لکھوائی جو آپ کے ساتھ مامور ہوا تھا۔ اور ایک قصیدہ نواب شجاع الدولہ کی مدح مین اور
ایک حسابی صنعت مین آپ نے تصنیف کیا تھا کہ نواب شجاع الدولہ کے نام کے عدد
جس نام کو عالم مین فرض کیجیے اوس کے عدد سے مساوی ہو جاتے ہین۔ یہ قصیدہ بھی
اوسی خوشنویس سے لکھوایا۔ ان دونون کو یعنی گاؤن کی معافی کی درخواست کو اور اوس
قصیدے کو عمداً آپ نے اوس کتاب کے ساتھ رکھدیا تھا کہ نواب جب وہان آتے
تھے اوس کتاب کو اوٹھا کے دیکھنے لگتے تھے۔ تا کہ وہ دونون ازخود نواب کی نظر مین
گذر جائین یا آپ کے بلا خواہش صاف نویس نے اوس کتاب کے ساتھ رکھدیا تھا
سنا یہی ہے کہ آپ کے بغیر اطلاع کے صاف نویس نے اوس کتاب کے ساتھ رکھا تھا
مگر راقم کا گمان بعضے قراین سے یہ ہے کہ آپ ہی نے عمداً رکھ دیے تھے اس واسطے کہ آپ کو
حضوری دائمی جو درصورت کسی عہدہ کے مقرر ہونے کے ہوتی وہ پسند نہ تھی خانہ نشینی
مین معافی کو مرجح جانتے تھے اور یہ بھی خیال ہوگا کہ درصورت عطا اور صلے کے شاید یہ
درخواست نامنظور ہو جائے۔ اور صورت سنگھ کی راے معلوم ہو گئی تھی کہ وہ قبل اور صلے
کے ملنے کے وہ درخواست پیش نہ کرتے۔ اس واسطے آپ نے خود عمداً اوس کتاب کے
ساتھ وہ قصیدہ اور درخواست دونون کو رکھ دیا تھا۔ غرض نواب وہان آئے بیٹھ گئے
اور کتاب کو ہاتھ مین لیکے دستور کے موافق اوس کو دیکھنا شروع کیا دفعۃً وہ قصیدہ پہلے

ہاتھ مین آیا اوس کو خوب غور سے دیکھا بعد اوس کے خود آپ کی اعانت سے حضرت سید الانبیاء و سید الاولیاء و سلطین کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کے نامون کے عدد نکال کے اوس قاعدے کے بموجب عمل کیا تو اون کے نام کے عدد کے ساتھ برابر ہوگئے نہایت خوش ہوے اوسی خوشی کی حالت مین وہ درخواست ہاتھ مین آئی اوسکو پڑھا فوراً پڑھتے ہوے رنگ چہرے کا بدل گیا اور نہایت غیظ مین آکے تھوڑی دیر سکوت مین رہے۔ بعد اوس کے دوات اور قلم کو طلب کیا اور عرضداشت کی پیشانی پر دستخط کئے۔ عرضداشت بحضور اعلےٰ و اقدس بدرخواست معافی موضع دگھیا بنام سائل ارسال کردہ شود۔ یہ دستخط کرکے کسی کو دیا کہ دفتر مین دیدو اور خود اوٹھ کھڑے ہوے۔ چونکہ اوس زمانے مین نواب شجاع الدولہ اپنے تئین وزیر اعظم بادشاہ کا سمجھتے تھے۔ رئیس مستقل اپنے تئین نہین سمجھتے تھے۔ اور اس جنس کے احکام بموجب فرامین شاہ عالم بادشاہ کے جاری ہوا کرتے تھے وہان ارسال ہوا۔ وہ گاؤن تو معاف ہوا اور دوسری ضبطی مین یا ظاہراً نواب سعادت علی خان کے شروع عہد کے پھر ضبط ہوگیا۔ اور جیسا صورت سنگھ نے کہا تھا اور صلے سے محرومی رہی۔ مگر حضرت جد امجد مغفور نے شاکر اور قانع اوس معافی پر ہو کے وطن مین مراجعت کی اور ظاہراً غالباً اوس زمانے کے بعد یا شاید کچھ اوسکے قبل نواب الماس علی خان خواجہ سرا نے جو قریب ایک کرور روپے کے ملک کا اودھ کی سرکار سے اجارہ دار تھا ایک گنج قریب قصبۂ آسیون کے جو قریب بارہ کوس کے پچھم طرف لکھنؤ سے ہے ڈالا تھا۔ اوس مین ایک مدرسہ بھی مقرر کیا تھا۔ اوس مدرسے مین جناب ممدوح کو مدرس اول مقرر کیا۔ اوسی قریب زمانے مین جو اواخر اٹھارھوین صدی عیسوی اور شروع تیرھوین صدی ہجری کے تھے کمپنی انگریزی کی سلطنت مین ایک منصب قاضی القضات کا بنگالے مین قرار پایا جس کی شرح کچھ باجمال تیسرے باب مین ہندوستان کے ذکر

الماس علی خان نے میان گنج مین ایک مدرسہ مقرر کیا تھا اور اون حضرت جد امجد کو مدرس اول مقرر کیا تھا

تقرر حضرت صدر امجد کا منصب قاضی القضاۃ بنگالہ پر
ممالک محروسہ کے قاضیون کا تقرر آپ کے اختیار مین تھا

مین ہوئی ہے اوس منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔ قریب پچیس برس کے جناب ممدوح نے اس عہدے کو انجام کیا اوس کے بعد مستعفی ہوے۔ اوس عہدے کو جس دیانت اور امانت سے آپ نے انجام دیا اوس کی شرح کے واسطے دو حکایتون کا ذکر کرنا کافی ہے۔ ایک حکایت یہ ہے کہ ابتدا مین تقرر جمیع قضات کا سارے ممالک محروسہ مین آپ ہی کو سرکار کی طرف سے مفوض ہوا چنانچہ کتنے آدمیون کو آپ نے اپنے عزیزون مین سے اور بعضے اپنے شاگردون کو جو جو لوگ جہان جہان کے رہنے والے تھے وہین کا قاضی اون کو مقرر کیا اور جب ابتدا مین آپ مامور ہوئے تو بنگالے مین ایک صاحب بڑے نامور اور بہت دولتمند تھے جن کا نام منشی صدرالدین مشہور تھا وہ ایک روز آپ کی ملاقات کے واسطے آئے اور بموجب پچھلے دستور کے وہ سمجھے تھے کہ جو انتفاع قاضی القضاۃ کا ہے وہ آپ بھی لین گے اس واسطے اونھون نے بعد ملاقات کے ایک کاغذ پر جو لکھ کے لائے تھے وہ آپ کو دیا اوس مین لکھا تھا کہ اگر تقرر قضات کا میری تجویز کے بموجب ہو تو ہزار روپیہ سال مین داخل کرونگا۔ شرح اوس کی یہ کہ چونکہ یہ عہدہ قاضی القضاۃ کا اول ناظم بنگالے کے اختیار مین تھا۔ جب سرکار کمپنی نے ناظم کو بے دخل کر کے ملک مین اپنا تسلط کیا تو اوسی پچھلے دستور کے بموجب وہ عہدہ بھی قائم رکھا اور ایک وہی کام قاضی القضاۃ کا جو مفصلات مین قاضیون کا مقرر کرنا تھا وہ بھی بدستور مفوض کیا تو پچھلے دستور کے بموجب جب سے سلطنت تیموریہ مین فتور آیا اور عالم مین بددیانتی شائع ہوئی تو قاضی القضات کو ان قاضیون کے مقرر کرنے مین بہت کچھ انتفاع ہوتا تھا وہ انتفاع اگرچہ شرعًا رشوت نہ تھی مگر امر محظور اور ممنوع البتہ تھا اور اب انگریزی قوانین کے موجب اوس پر بھی اطلاق لفظ رشوت کی ہوئی جس کے واسطے اوس عہدے پر تقرر کے وقت حلف نامے پر مہر کروائی گئی تھی کہ کسی نہج کی رشوت ہم نہ لین گے آپ[1] نے منشی صدرالدین سے کہا منشی صاحب

آپ کو غلطی واقع ہوئی کہ آپ نے مجھکو مرتشی تصور کیا۔ اور وہ فرد پھاڑ کے پھینک دی
اور اون سے کہا کہ میرے تصور مین آپ نے مجھے گالی دی۔ لیکن چونکہ آپ مہربانی کر کے
میرے مکان پر تشریف لائے ہین۔ اخلاق مقتضی نہین ہے کہ مین اس سے زیادہ شکایت
کرون۔ بنظر پچھلے دستور کے آپ کو غلطی واقع ہوئی ہے کہ جب یہ عہدہ ناظم کے اختیار مین تھا
تو لوگ اوس کو اجارہ لیا کرتے تھے۔

[illegible] قاضیون کے تقرر کا [illegible] آپ نے اپنا اختیار کیونکر چھوڑ دیا

دوسری حکایت یہ ہے کہ بہت مدت تک تقرر قضات کا آپ کے اختیار مین
رہا اس عرصے مین ایک امر مکروہ پیش آیا جو نہایت آپ کے خلاف مزاج ہوا یعنی
کسی شخص نے قاضی القضاۃ کے کارگزارون مین ایک سند جعلی بدون آپ کی
اطلاع کے کسی جگہ کے قاضی کے تقرر کے واسطے جاری کر دی۔ اور خدا جانے
کس طرح سے مہر قاضی القضاۃ کی اوس پر ثبت کی اور دستخط آپ کے جعلی بنائے
جب آپ کو اوس کی اطلاع ہوئی تو وہ سند طلب کر کے منسوخ کی لیکن اوسی وقت
ایک درخواست لکھ کے صدر عدالت کے صاحب رجسٹر کے پاس پیش کی کہ حکام صدر
کے پاس گذران دیجیے۔ اوس درخواست مین لکھا۔ چونکہ ممالک سرکار کے بہت
وسیع ہو گئے اون سب ممالک دور دراز مین اتنی دور بیٹھے ہوے کسی شخص کی لیاقت کی
تحقیقات مین نہین کر سکتا۔ اور اگر امتحان کے واسطے یہان طلب کیجیے تو لوگون کو زحمت عظیم
ہو گی اور بغیر امتحان کامل کے اس ذمہ داری عظیم کو مین نہین چاہتا کہ میرے ذمہ مین رہے
اس واسطے مین چاہتا ہون کہ تقرر قضات کا صاحبان جج اضلاع کو یا جس کو سرکار
مناسب سمجھے اوس کو مفوض ہو کہ وہ مقرر کر کے درخواست یعنی رپوٹ کیا کرین۔ بموجب
اون کی رپوٹ کے مین سند لکھدیا کرون گا۔ صاحب رجسٹر اوس وقت مسٹر ہارنگٹن نام ایک
صاحب تھے اور آپ کے بہت دوست اور خیر طلب تھے وہ درخواست پڑھ کے اونھون
نے کہا۔ قاضی صاحب آپ اتنا بڑا اپنا اختیار ہاتھ سے دیتے ہین یہ درخواست جس وقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۲۳
اکتوبر ۱۹۲۷ء

چین میں آفت پر آفت

"آدم زاد" پھر بڑھتا ہے اور سلطنت جزائر جاپان کو مدافعت پر مجبور کرتا ہے"

رقم زدہ ہنری کرج نارٹن ——— مترجمہ محمد فخرالزماں

جب کبھی حدود چین کے اندر کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو سبب محرک معلوم کرنے کے لیے اکثر ملک کے گرد و نواح پر نظر کرنا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم گذشتہ تیس سال سے ہم مقام شورش پر کھڑے ہو کر روس اور جاپان کی ان متضاد مساعی کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جو منچوریا اور منگولیا کے شمال میں فوجی نقل و حرکت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نازک وقت میں بھی چین میں ابتدائی قوم پرستی کی اہمیت آنے والے جو فتح انقلاب، طلبا کی پُرجوش تحریک، یا تجارتی، مذہبی اور تمدنی شہنشاہیت کے خلاف جائز اظہار ناراضی کو بے قدر ٹھہرائے بغیر ہم کو اسی شمالی سرزمین میں تجسس کرنے سے غور و فکر کے لیے بہت مسالا ملے گا۔

روس و جاپان کی جنگ سے دونوں ممالک کی باہمی نزاع کا تصفیہ نہ ہوا۔ بلکہ یہ صرف وہ شکست تھی جس نے روس کو مشرق کے گرم پانی کی طرف مسلسل پیشقدمی سے باز رکھا۔ بغیر کسی لڑائی اور بغیر فوج کشی کے دریائے آمور کے شمال اور یوسوری کے مشرق میں کوریا کی سرحد تک تمام علاقہ روسی تصرف میں آگیا تھا۔ روس اپنے مدبرین کی غیر محتاط سازشوں کے

منچوریا میں بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۴ء کے آغاز میں اس علاقہ پر وہ نیز اُن اجارہ داری کی ریلوے سڑکوں پر جو منچولی سے ولاڈیو اسٹاک اور ہاربن سے پورٹ آرتھر کو اس سرزمین سے ہوکر جاتی ہیں پوری طرح قابض ہوگیا۔ آخرکار خرس روس یا کپلنگ "آدم زاد" (یعنی وہ ریچھ جو مثل انسانوں کے چلتا ہے) خوش خوش اپنے پنجے گرم پانی سے مَس کرنے لگا۔

لیکن جاپان نے اس امر کو فراموش نہیں کر دیا تھا کہ یہ روس ہی تھا جس نے اُسکو جزیرہ نمائے لاؤتنگ پر جسکے سرے پر پورٹ آرتھر بن رہا تھا متصرف ہونے سے روکا تھا۔ اور نہ جاپانی مدبرین ہی اُس خطرہ سے بیخبر تھے جو ایشیائی ساحل پر اس ریچھ کی آمد سے جاپان کی مستقبل عظمت کو لاحق ہوگیا تھا۔ اہل جاپان اُن چالوں کو بہ غور دیکھ رہے تھے، جن سے روس منچوریا میں اپنی چند روزہ اقامت کی مدت کو بڑھا رہا تھا۔ وہ اس کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے کہ چین نے روس کو جو قلیل عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دیدی تو اب باوجود چین کی طرف سے احتجاج بلند ہونیکے روس نے ایک لامحدود مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ جس وقت ریچھ کے پنجے کوریا میں دکھائی دینے لگے چین کے ساتھ جاپان بھی صدائے احتجاج میں شامل ہوگیا۔ لیکن جاپان نے جب دیکھا کہ سینٹ پٹرس برگ میں اس احتجاج سے تجاہل عارفانہ برتا جاتا ہے تو اُس نے بھی جان توڑ مقابلہ شروع کردیا۔ اور انجام کار یہ ہوا کہ بحر الکاہل کی حکومت کا خواب روسی دماغ سے ایک مستقبل بعید کے لیے نکل گیا۔ نہ صرف روس سارے جنوبی منچوریا سے نکال دیا گیا بلکہ جاپان نے اُسکو جزیرہ نمائے لاؤتنگ کی اجارہ داری اور ریلوے سے بھی محروم کردیا۔

روزویلٹ نے صلح پورٹسماؤتھ کو محض التوائے جنگ سے تعبیر کیا۔ اور اُنکی پیشینگوئی تھی کہ روس پھر آ پہونچے گا۔ جو روس و جاپان کے درمیان امور متنازعہ کا طے ہونا تو درکنار البتہ باہمی رقابت جو ایشیا میں غلبۂ تفوق کے لیے جدوجہد کا لازمی نتیجہ تھی اس جنگ سے واضح ہوگئی۔ اِدھر روس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنی سلطنت بحیرۂ زرد کے ساحل تک بڑھا کر رہے گا۔ کیونکہ ایک کروڑ روسیوں کے لیے جو سائبریا میں پہلے سے موجود تھے اور اور کئی لاکھ کے واسطے جو اس رقبہ میں آباد ہونے والے تھے مشرقی سمندر سے آزاد اور مستقل سلسلۂ مذاکرات اقتصادی حیثیت سے نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ اُدھر جاپان نے بیڑا اُٹھایا کہ یہ جسم عظیم جو اُسکی عسکری

اور اقتصادی عظمت کو معرض خطر میں ڈالنا چاہتا ہے اُسکے جزائر سے قریب ساحلوں پر ہرگز نہ پہونچنے پائے۔ ایشیائی ساحل پر قابو اور اُس کے بندرگاہوں سے گذرنے والی تجارت کی سرداری جاپان کے لاکھوں آدمیوں کے لیے جن کی تنگ جزیروں میں گنجان آبادی تھی ایسی ہی ضروری تھی جیسے روسیوں کے لیے سمندر سے قربت۔

اس طرح نقشۂ عمل کھینچ لیا گیا اور انھیں لائنوں پر ٹوکیو اور سینٹ پٹرس برگ کے مدبرین بین الاقوامی بساط پر چالیں چلتے رہے۔ منچوریا میں ریلوے کی تکمیل کے بارے میں امریکہ کی تجاویز نے حریفوں پر اس امکان کا اظہار کردیا کہ مبادا دونوں اپنی مستحکم گرفت کھو بیٹھیں۔ لہذا ۱۹۰۷ء میں دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ روس نے جنوبی منچوریا کو جاپانی حلقۂ اثر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔ اور اسی طرح اپنے مفاد کو شمالی منچوریا میں تسلیم کرانے پر فی الحال قناعت کی۔ بعد ازاں دونوں نے مسٹر ہیمن کی اُس جہاں گشت ریلوے اسکیم کی مخالفت میں جو روے زمین کے اس خطہ سے گذرنے والی تھی متفقہ مقابلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ ۱۹۰۹ء میں مسٹر ناکس سکریٹری آف اسٹیٹ نے منچوریائی ریلوں کو بین الاقوامی بنانے کی تجویز پیش کی جسکے بعد اس سے بھی زیادہ گہرا اتحاد ہو گیا۔ اس طرح دو ملوکیت پسند حکومتیں مال غنیمت کی تقسیم پر راضی ہو گئیں۔ لیکن دونوں سمجھتے تھے کہ اس قسم کی کوئی مفاہمت صرف عارضی ہے اور اس بیرونی مداخلت سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی ایک فیصلہ کن لڑائی آپس میں لڑنا پڑیگی۔ اس اثنا میں روس اور اطراف میں جد و جہد سے غافل نہ تھا۔ اگر اتفاق سے اُس کا منچوریا سے ہو کر پہونچنے والا راستہ منقطع ہو جائے تب بھی اسکے حصول مقصد کے لیے ایک دوسرا طریقہ موجود تھا۔ جھیل بیکال سے جو راستہ ارگا اور کلن ہوتا ہوا ٹین سن کے قریب سے سمندر کو جاتا ہے گو ایک ریگستانی سرزمین کو طے کرتا ہے مگر منچوریا والے راستہ سے زیادہ قریب اور فن جنگ کے اعتبار سے زیادہ قابل قدر تھا کیونکہ اس طرح سے خود پیکن روسی حلقہ میں آجائے گا۔ روس کی ریشہ دوانیوں سے متاثر ہو کر منگولیا کا جوش بڑھنے لگا۔ اہل منگول نے چین کے آخری فرماں روا خاندان کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے کو چین کا ایک جزو نہیں خیال کیا اور ایک بڑی حد تک آزاد رہے۔ لہذا چین کی روز افزوں سرگرمیوں سے جو انقلاب

مزید چینی باشندے گویا شاہان منگول کی خداوندی کے لیے تہدید تھے۔ لامحالہ روس کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہی چین کی اس مداخلت بیجا کے خلاف انکی حمایت و معاونت کرسکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جب انقلاب نے شاہان مانچو کے دست و بازو کو مفلوج کر دیا۔ تو روس نے فوراً منگولیا کی خود مختاری تسلیم کرلی۔ اور منگولی علاقہ میں اپنے مفاد کے حصول کے لئے گفت و شنید شروع کر دی۔ یہ ۱۹۱۴ء میں پختہ ہوگئی اور سینٹ پیٹرس برگ کو منگولین ریلوے کی تعمیر میں فیصلہ کن حق رائے دہندگی حاصل ہوگیا۔

لیکن جنگ عالمگیر روس پر پہلے ہی سے نازل تھی۔ اُدھر جاپان کے باخبر مدبر جنوبی منچوریا میں اپنی فتوحات کی مضبوطی کرنے کے بعد اور آگے بڑھنے پر تلے ہوئے تھے ۱۹۱۵ء میں "اکیس مطالبات" کے ذریعہ سے انھوں نے پورے منچوریا، مشرقی اندرونی منگولیا شان ٹنگ اور فیوکین پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ جنگ یورپ میں روس کی حالت کو توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اور جب ۱۹۱۶ء میں انھوں نے دیکھا کہ اب روس خوب اُلجھا ہوا ہے تو موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روس سے اُن تمام پیشقدمیوں کو جو اب تک عمل میں آئی تھیں مستحسن قرار دینے کی درخواست کی۔ اور روس کو اس پر مجبور کیا کہ وہ جاپان کو چینی مشرقی ریلوے کا وہ حصہ تفویض کر دے جو جنوبی منچورین ریلوے کے جنکشن اور دریائے سنگاری کے درمیان واقع ہے۔

اسکے بعد ہی انقلاب روس رونما ہوا۔ بالشویکی شورش کے بعد جو بدنظمی پیدا ہوئی اُسکو جاپان نے اپنے خطوط پیش قدمی کی اور دور تک مغرب میں توسیع کا وسیلۂ غیبی خیال کیا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں نکولائسک جو دریائے آمور کے دہانے پر واقع ہے چھین گیا۔ اور بحری فوجیں روسی بندرگاہ ولاڈیواسٹاک میں اتار دی گئیں۔ امریکہ نے اگست میں متفقہ مداخلت میں شرکت کی دعوت دی جو ایک بڑے بھاری خطرے کی علامت تھی۔ اس عہدنامہ کی آڑ میں کہ جاپان اور امریکہ ہر ایک کو سات ہزار اور دیگر دول کو برائے نام فوجیں بھیجنا چاہیے جاپان نے ستر ہزار سے زیادہ آدمیوں کی فوج سائبیریا میں لا ڈالی۔ اور اوباشی روسی کرایہ کے ٹٹوؤں کی وساطت سے تمام مغربی علاقہ پر جھیل بیکال تک قابض ہوگیا۔ اس عام پیشقدمی کے سلسلہ میں جاپان نے چینی مشرقی ریلوے بھی ہڑپ کرنے کی متواتر کوشش کی۔ لیکن یاران طریقت اُسکی نیت سے بدگمان ہو رہے تھے

لہذا اس قسم کی حرکات کا سدباب کرنے کے لیے انھوں نے ایک بین الاتحادی ریلوے کمیٹی کا تقرر کر دیا جس میں فن جنگ کے اعتبار سے تمام بڑے بڑے عہدوں پر امریکن انجینیر مقرر ہو گئے۔

اس اثنا میں چینیوں کی حکومت منگولیا میں بحال ہو گئی تھی اور مشرقی ایشیا میں روسی اثر و اقتدار کا آفتاب جس کا زوال ۱۸۹۶ء سے شروع ہو گیا تھا ۱۹۲۰ء کے اوائل گرما میں غروب ہو گیا۔ پیکن میں یا کہیں اور روسی حکومت نہیں تسلیم کی جاتی تھی۔ اہل چین نے منگولیا سے روسی اثر معدوم کر دیا تھا، اور جاپان پورے منچوریا اور تمام مشرقی سائبیریا پر چھایا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے "آدم زاد" اپنے غار میں بھگا دیا گیا۔

ایک مرتبہ پھر واقعات نے پلٹا کھایا۔ اور طاقتور ریچھ مغرب اور جنوب میں اپنے چھیڑنے والوں سے پیچھا چھڑا کر مشرق کی طرف پھرا۔ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں حلیف فوجیں ہٹا لی گئی تھیں۔ امیر البحر کولچک کی حکومت جسکا دارومدار ہمیشہ خارجی امداد پر رہتا تھا کچل ڈالی گئی۔ اور اُسکے قائد اعظم نشانہ تفنگ بنائے گئے۔ روسی رسالداروں کے دستوں نے جاپانیوں کو اور اُنکے کوسک مؤیدین کو صوبجات ٹرانسبیکال اور آمور کے اُس پار نکال دیا۔ موسم سرما تک کل روسی علاقہ بجز اُس خطہ کے جو دریائے آمور اور سخالن کے دہانے پر ولاڈیوسٹک سے ملحق ہے اِن لوگوں سے پاک ہو گیا۔ اس خطہ پر سوویٹ گورنمنٹ نے اپنا قبضہ نہیں جمایا تھا بلکہ جمہوریت مشرق بعید قائم ہو گئی تھی اور یہی عارضی طور پر اُسکا انتظام کرتی تھی۔

اسی اثنا میں مزاحمتی فوجیں ایک کوسک لیڈر کی کمان میں دار السلطنت منگولیا سے چینیوں کو نکالنے اور وہاں روسی علاقہ کے خلاف اساس کار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں دریائے سلینگا کے کنارے کنارے چل کر فوج نے جس حملے کا اقدام کیا تھا اُسکو روس اور جمہوریت مشرق بعید کے لشکر نے شکست دی۔ اس فاتح لشکر نے بھاگتے ہوئے مزاحمین کا تعاقب کیا۔ کچھ کو قید اور بقیہ کو منتشر کرنے کے بعد انھوں نے ارگا میں تسلط قائم کر لیا۔

روس نے یہ فتح اپنے قوت بازو سے حاصل کرنے کے بعد حکمت عملی کی طرف رخ کیا۔ اُسوقت سے اُسکی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی لیکن برابر جاری رہی۔ روسی مدبرین نے سوویٹ حکومت کے تسلیم کرانے کی آرزو میں چینی دار السلطنت کا ناطقہ بند کر دیا۔ چلی جان یہ تھی کہ زار کی طرز حکومت سے جو حقوق وراثتاً انکو ملے تھے ان سے دست بردار ہو گئے۔ ماسکو نے پیکن سے کامل

مساویانہ سلوک منظور کیا اور ذیل کے شرائط پیش کیے (۱) جو علاقہ زاران روس کے وقت میں دبا لیا گیا تھا واپس کر دیا جائے گا (۲) چینی مشرقی ریلوے بلا معاوضہ چین کے حوالہ کر دی جائیگی۔ (۳) تاوان باکسر سے دست برداری لکھدی جائے گی (۴) روسیوں کے لیے مزید ارضی مراعات منسوخ کر دی جائیں۔ (۵) اور جس قدر معاہدے عہد شاہنشاہی میں روس نے جاپان یا دوسرے دول سے چین کے خلاف کیے تھے سب ناجائز قرار دیے جائیں گے۔

اب بھی واقعی معقول بات چیت جسکے سننے کے لیے لوگ تیار تھے۔ چین کو ابھی حال ہی میں دول مغربی اور جاپان کے متعلق جو تجربہ ہوا تھا اُس سے چین کو ان ممالک سے لگاؤ یا اُنکے اغراض و مقاصد میں اعتماد ہونے کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے جرمنی کے خلاف جنگ میں محض دول متحدۂ امریکہ کی منت و سماجت پر حصہ لیا اور اس خیال سے بھی کہ صلح کانفرنس پیرس میں دوسرے رفقا کے ساتھ اُسکی برابر کی حیثیت ہوگی۔ اور واپسی شانٹنگ کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔ مگر اسکے بجائے اُس نے کیا دیکھا کہ شانٹنگ میں وہ حقوق جو جرمنی کو حاصل تھے جاپان کی طرف منتقل کر دیے گئے اور چینی جذبات ناراضی کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا گیا۔ صرف یہی نہیں کہ چین کو معاہدۂ صلح سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اُسکے وقتی دوستوں نے اُسکو ان قیادت اور پیشوائی کی زنجیروں سے جن میں تین چوتھائی صدی سے جکڑ رکھا تھا آزادی دینا بھی گوارا نہ کیا۔ علاقہ جات اجارہ داری، اداے تاوان، مزید ارضی وسعت، سفارتی ہمراہ ڈاکخانے اور تجارتی محصول سب جیسے کے تیسے رہے۔ ان سب باتوں سے چین تلخکام ہو رہا تھا کہ اس موقع پر روس آپہونچا اور ان تمام حقوق سے دست برداری اور چین کے ساتھ ہمسرانہ سلوک کے شرائط پیش کیے۔ لہٰذا اہل چین نے اگر روسی تجاویز کو توجہ سے سنا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لیکن اس قسم کی پیش قدمی کا چاہے عوام الناس نے خیر مقدم کیا ہو، چینی عملہ ضرور مخالف تھا۔ چین کے لیے روسی دوستی ہمیشہ سے مہنگی ثابت ہوئی۔ چنانچہ جاپان کو جزیرہ نماے لاؤٹنگ لینے سے باز رکھنے میں جو امداد روس نے دی تھی اُسکے بدلہ میں چین کو پورے منچوریا سے ہاتھ دھو لینا پڑا تھا۔ روس کے اظہار رفاقت کے بعد ہی اخراجات کا بھاری بل بننا لازمی تھا۔ لہٰذا یہ امر بہتر معلوم ہوا کہ روس کی بظاہر فیاضانہ تجویز کو قبول کرنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیا جائے کہ روس اسکے صلہ میں کس بات کی اُمید رکھتا ہے۔ ماسوا اسکے آیا ان پیش کردہ مراعات کے حاصل کرنے کے لیے کوئی معاوضہ دینے کی ضرورت ہے بھی؟ کیا اسکی وجہ سے دوسری اقوام

سے معاملہ کرنے میں ایک بُری مثال قائم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہے؟ کیا چین ازروے حق ان تمام چیزوں کا مستحق نہیں ہے؟ یہ باتیں سوچ کر چینی عمال نے حسب دستور اپنی پرانی چال یعنی لیت و لعل سے کام لیا۔ سوویٹ حکومت کو تسلیم کرنے کی زحمت سے باز رکھا گیا اور روس کی پیش کردہ بخششیں ایک ایک کرکے بطور حقیقت حاصل کرلی گئیں۔ ملکی مراعات بند کردیے گئے باکسر کے تاوان کا خاتمہ ہوگیا۔ روسیوں کے لیے مزید ارضی وسعت کی جگہ نہ رہ گئی۔ یہ سب جمہوریۂ ملیۂ اشتراکیۂ روس کو بے کسی قسم کے معاوضہ کے۔

اس طرح جہاں پکین میں سوویٹ ڈپلومیسی کو زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی وہاں ایک دوسرے اثر کی بدولت روسی مقاصد کو تقویت پہونچ رہی تھی۔ امریکن ذہنیت بالشویکی طرز حکومت کو نظر پسندیدگی نہیں دیکھتی تھی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ یہ محض انقلاب کا ایک عارضی منظر ہے۔ اور ایک دن دوسرا اور بالکل مختلف روس اُسکی جگہ لے لیگا۔ اس مہم روس کے لیے جو ہونے کو تھا آخر کیہ ایک طرح امین ہوگئی۔ اس روس کے لیے اُس نے اپنی ڈپلومیسی کی قوت ایشیا میں شہنشاہیت جاپان کے خلاف صرف کی۔ واشنگٹن کانفرنس منعقد کی گئی روسیوں کے مطالبۂ شرکت سے اغماض کیا گیا لیکن انجام اُنکے موافق ہوا اور اُنکو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا۔ انکے مفاد کی کافی طور سے حفاظت کردی گئی جس سے انھوں نے جلب منفعت کیا۔ روسی ایک سال کے اندر آمور کے دہانے پر ولاڈیواسٹاک میں واپس آگئے اور جمہوریت مشرق بعید کا پورا علاقہ سوویٹ روس نے ہضم کرلیا۔ بجز شمالی سخالن کے روسی زمین ایک اِنچ بھی جاپانی قبضہ میں نہیں رہ گئی۔

چین نے اپنے حقوق کا دوبارہ دعوے کرتے وقت ایک بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ اُن دول نے بھی جو واشنگٹن کانفرنس میں شریک تھے اِس معاملہ کو نہ چھیڑنا ہی مصلحت سمجھا۔ اور وہ تعرض تھا چینی مشرقی ریلوے کے بابت سے۔ اس میں دست اندازی کرنا گویا سوتی بھڑوں کو جگانا تھا اور آتش حسد و ہوس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو مشتعل کرنا۔ جسکو کانفرنس ہمیشہ کے لیے بجھا دینا چاہتی تھی۔ لیکن روس حتیٰ کہ سوویٹ روس نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس مسئلہ کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اور نہ طاق نسیاں پر رکھنے دیا۔ اس کہنے سے کہ چین کو بغیر معاوضہ ریلوے حوالہ کردی جائے روس کا کیا مطلب تھا، اسکی تشریح واضح طور پر اُس نے عرصہ ہوا کردی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ٹرانس سائبیرین ریلوے کا ایک جزو

ضروری ہونے کی حیثیت سے اس لائن میں روسی اہم مفاد کو نظرانداز کر دیا جائے۔ لہذا چین اس بارے میں عہد و پیمان لینے پر مُصر تھا۔ آخر کار چین کے عہدۂ وزارت خارجیہ پر دی کے ویلنگٹن آیا، جو صورتِ معاملہ کو روسی دوربین سے دیکھنے پر مائل کیا جا سکتا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو چین اور روس نے ایک بار پھر رشتۂ عہد و پیمان قائم کیا۔ چینی پندار و نخوت کے لیے روسی تملق آگ پر تیل کا کام کر گیا۔ اور اپنا ذاتی اثر و اقتدار بڑھانے کے لیے کراخان کو جو کسی دولت مغربی سے بھیجے گئے تھے بطور اپنے نمائندے کے سفیر اول بنا کر بھیجا۔ جبکہ دیگر دول کی نمائندگی وہ سفیر کرتے تھے جو وزیر مختار کے کمتر عہدے پر مامور تھے۔ اس سفیر نے جس معاہدے پر دستخط کیے اُسکی رو سے چین نے سوویٹ حکومت کو روسی حکومت تسلیم کر لیا۔ اور روس نے اُن تمام مراعات سے باضابطہ دست برداری لکھ دی جو چین نے اُس سے نکال لی تھیں۔ لیکن کل معاہدے کا دار و مدار چینی مشرقی ریلوے کے مسئلے پر تھا اور اس میں روس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اینٹی سوویٹ نگرانی کو جو انقلاب سے پہلے قائم تھی اب سائنو سوویٹ کی مشترکہ نگرانی کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ بورڈ آف کنٹرول پانچ چینی اور پانچ روسی ارکان پر مشتمل تھا۔ لیکن خاص سڑک کے انتظام میں اس شرط کے ذریعے سے روسیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا کہ منیجر اور منجملہ دو کے ایک اسسٹنٹ منیجر روسی ہونا چاہیے۔

بظاہر روس شاندار ترقی کر رہا تھا لیکن یہ گراں بہا شرائط نامہ افسرانِ متعینہ پیکن سے ہوا تھا۔ اور چینی مشرقی ریلوے منچوریا سے گذرتی ہے جہاں کا فرمانروا چانگسولن اُس وقت اور اب بھی پیکن سے کشیدہ خاطر تھا۔ اور مرکزی حکومت کی اطاعت اُسی حد تک کرنے کو تیار رہتا جہاں تک احکامِ بالا اُسکی ذاتی خواہشات سے متصادم نہیں ہوتے تھے۔ چانگ کے گہرے تعلقات اہل جاپان سے روز روشن کی طرح آشکارا ہیں۔ اُس کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ وہ ریلوے لائن روس کے حوالے کر دے جو اُسکے اور جاپانی مفاد دونوں کے منافی ہے۔ اُس نے معاہدہ اور نفاذِ معاہدہ کے لیے نمایندگان روس و پیکن کی مساعی سے قطعاً اغماض کیا۔

تاہم روس جس موقع کی تلاش میں تھا وہ جلد اُسے مل گیا۔ اگست ۱۹۲۴ء میں چانگ اور پیکن کے درمیان کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ عوام کے دکھانے کے لیے سوویٹ عمال نے اغیار کو متنبہ کر دیا کہ وہ کہیں چین کی پُر آشوب فضا سے فائدہ اُٹھا کر اُسکو مزید دست درازیوں

کا حیلہ نہ قرار دیں۔ ادھر ماسکو میں فوجیں ترتیب دی جا رہی تھیں اور اُدھر "چین سے الگ رہنا" کے مطالبات مشرق میں خوب مشتہر کیے جا رہے تھے۔ گو اُن سُرخ افواج کی تہدید خیز موجودگی کو شہرت نہیں دی جاتی تھی جو چانگ کے عقب میں پڑی ہوئی تھیں لیکن منچوری فرماں روا اِن سے بیخبر نہ تھا اور اُنکی اہمیت خوب سمجھتا تھا۔ اُسکے لیے دو ہی راستے کُھلے ہوئے تھے۔ یا تو ریلوے سے ہاتھ دھولے یا بالکل اپنا قلع قمع کرائے۔ ایک ایسی خردمندی سے جو نہ چینی کہی جا سکتی ہے اور نہ باریک بینی سے منسوب کی جا سکتی ہے اُس نے کمتر درجے کی بُرائی پسند کی۔ ستمبر میں ماسکو اور بحیثیت حاکم "خود مختار سہ صوبجات شرقیہ" چانگسولن کے کے مابین ایک مصالحت نامہ کا اعلان کر دیا گیا جسکی رو سے آخر الذکر نے اپنی رضامندی اُس انتظام سے ظاہر کر دی جو پکن سے بابت مشترکہ نگرانی چینی مشرقی ریلوے کیا گیا تھا۔

اس طرح اُس عظیم شریانِ ریلوے پر (جسے ریلوے کی جان کہنا زیبا ہے) جو مملکت روس کے وسیع اندرونی علاقے کو بندرگاہ ولاڈیواسٹک سے ملاتی ہے اور جنوب میں اس سے بھی زیادہ دورِ رس بندرگاہوں سے ملانے کا امکان رکھتی ہے روس کو پھر قابو حاصل ہو گیا۔ جس سے بے شبہہ اُسکے کثیر اقتصادی اور عسکری منافع وابستہ ہیں۔ سفیر کراخاں نے ۱۵ اکتوبر کو کہا "چینی مشرقی ریلوے پر سوویٹ یونین کے استحقاق کی بحالی چین کی اقتصادی اور سیاسی شرکت کے لیے کشادہ راستہ کھول دیتی ہے فی الحال اُس اہم ترین پوزیشن کی وساطت سے جو سوویٹ یونین کو حاصل ہے اور جس سے اُسکے اعدا اسکو محروم کرنا چاہتے ہیں مشرق بعید میں دولت اشتراکیہ روس کے قدم مضبوطی سے جمتے جا رہے ہیں"۔

مذکرۂ بالا چینی مشرقی معاملے کے متعلق روس کا طریق عمل بالآخر ہر اہل نظر پر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ مشرقِ بعید میں سوویٹ پالیسی کا ماحصل اپنے اصلی ارادوں میں قدیم شاہی پالیسی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آلۂ کار مختلف ہیں۔ طرز بدلی ہوئی ہے۔ لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ ہر نئی پالیسی فطری اظہار ہے اُس طاقتور اقتصادی جذبے کا جو روسی انبوہ کو کُھلے ہوئے سمندر سے آزادانہ قربت حاصل کرنے پر اُبھارتا ہے۔ طرزِ حکومت محض ایک سطحی چیز معلوم ہونے لگتی ہے اور چاہے جو حکومت کسی خاص زمانے میں ہو اُسکے عقب میں سابق روس اپنی ہمسایہ سلطنتوں پر وہی تشدد کرتا ہوا اور آہستہ آہستہ

اُن حدود فاصل کو جو ماسکو باہر نکلنے سے باز رکھنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اب سوویٹ پالیسی محض بالشویکی پروپیگنڈے ہی کا اظہار نہیں معلوم ہوتی ہے بلکہ گہرے معنوں میں یہ روس کے قومی مطالبات کا انکشاف کرتی ہے۔ اگر اور کہیں نہیں تو کم سے کم مشرق بعید کی پالیسی میں سوویٹ عمال روسی مدبرین کے جلا وطن گروہ کا مشورہ ضرور لیتے ہیں جو خوشی سے نہیں دیا جاتا ہے۔ روس میں اب کوئی اور انقلاب یا تبدیلی نہیں ہونے والی ہے جس سے یہ امید کی جا سکے کہ حکومت برسر اقتدار مشرق بعید میں اس سے کم غاصبانہ رویہ اختیار کرے گی۔ مشرقی ایشیا میں خرس روس بحیرہ زرد کی خوشگوار لہروں میں پھر اپنے پنجے ڈبوتے پر تُلا ہوا ہے خواہ وہ ٹوپی جو وہ پہنے ہوئے ہے زاری ہو یا بالشویکی، کیڈٹ کی ہو یا منشویک کی

لیکن روسی اپنا اصلی مقصد چھپانے میں ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مدبرین ماسکو نے جن کی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات وہ اعلیٰ تربیت یافتہ اشخاص جو دوسرے دول کی پالیسی تراشتے ہیں اُس سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ایشیا میں جارحانہ کارروائیوں کا ایک ایسا طریقہ نکالا ہے جو تین پہلو لیے ہوئے ہے۔ اول یہ کہ روس کسی ملک کی بظاہر بہت سی باتوں اور واقعتاً چند باتوں کو جائز قرار دیتا ہے تاکہ ملک متعلقہ کی "پامال رعایا" کے ساتھ بے پایاں اظہار ہمدردی کا وجود دکھانے کا موقع ملے۔ دوم یہ کہ دوسرے ممالک کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں سے منحرف ہونے کے لیے اُس ملک کی کسی نہ کسی تحریک کی مادی اعانت کرتا ہے۔ اور اُن ممالک میں شہنشاہیت، عسکریت، اور سرمایہ داری کے طومار باندھ دیتا ہے۔ اس طرح روس اپنی دوستی پر مائل کر لیتا ہے اور دوسرے ممالک کی طرف سے عداوت کا بیج بو دیتا ہے۔ اس خاطر خواہ موقع کی آڑ میں روس تیسری کارروائی کرتا ہے۔ یعنی حصول مقاصد ذاتی۔ پہلی دو کارروائیوں پر اس قدر شد و مد کے ساتھ زور دیا جاتا ہے کہ تیسری بکمال خوبی پوشیدہ رہتی ہے۔ اور روس دیگر دول کو بے بس کر دینے اور بعض اہم امور کے تسلیم کرا لینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔

ان سب باتوں کی تصریح چین کے معاملے میں بہت مؤثر طریقے سے ہوتی ہے۔ چین کی محبت، چینی مزدوروں سے محبت، انصاف سے محبت، الغرض بجز زمین، ریلوے جات اور بندرگاہوں کے ہر چیز سے محبت کے پُر جوش دعووں کی بوچھار ساری دُنیا پر کیجاتی ہے۔

ماسکو چین کے انقلاب حریت کو اسی عاشق مزاجی پر محمول کرتا ہے۔ دوسری قسم کے پروگینڈے سے
سے انکار کی صدائیں مختلف روسی صدر مقامات سے بڑی ہم آہنگی کے ساتھ آ رہی ہیں۔ سفیر
کڑاخاں کہتا ہے " اگرچہ یہ امر بالکل فطری ہے کہ اس مسئلہ کو کہ چین کی قومی انقلابی تحریک
میں سوویٹ یونین کا ہاتھ ہے بہت وقعت دینی چاہیئے تاہم یہ اثر سوویٹ پروگینڈے کا
نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ عموماً غلطی سے لوگ کہتے ہیں۔ بلکہ اس کا باعث اس سے کہیں زیادہ مؤثر
اور وقتی امر واقعہ ہے یعنی سوویٹ کی منصفانہ پالیسی زبانی اور عملی دونوں حیثیتوں سے جسکو
اُس نے سوویٹ چینی عہدنامے اور چین سے متعلق اپنی تمام کارروائیوں میں ملحوظ رکھا ہے۔"

غالباً یہ امر پوشیدہ نہ ہو کہ سفیر موصوف نے سوویٹ پروگنڈا کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے
اُس سے لوگوں کو اختلاف ہوگا۔ کینٹن کا بالشویت پسندی کی جانب رجحان عالم آشکارا ہے
اور کینٹن میں چینی کسانوں کی کانگریس" کے قیام پر ازدوشا نامی ایک جریدہ صدائے اہلاً وسہلاً
ومرحبا بلند کرتا ہے۔ اس کانگریس کے اراکین نے جو اشتہارات ملک بھر میں تقسیم کیے ہیں وہ
دنیا میں ماسکو کی دست اندازی کی تشہیر بآواز بلند یوں کرتے ہیں:۔

" آؤ کسانو! بین الاقوامی سوویٹ کے جھنڈے کے نیچے اپنی تنظیم کرو۔ سب کے سب
ہتھیار بند ہو جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے گانوں گانوں کمیٹیاں بناؤ۔ مزدوروں اور کاشتکاروں
کے اتحاد پر خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ اس سے چین کی آزادی وابستہ ہے۔ کسانو! کچھ کارنامے
دکھاؤ! اپنی اشتراکی جماعتیں بناؤ! ملوکیت پسند مشنریوں اور انکے گرجاؤں سے دُور دُور! ہماری
زمین لینے سے پرہیز کرو! چینی کسانو متحد ہو جاؤ۔"

خیال کرو۔ چینی کسانوں کی ایک ٹولی اپنے بھائی بندوں کو یہ حریت پسند ترانے
رزمیہ انداز میں سناتے ہوں، اس سماں کی تصویر کھینچنے کے لیے کس قدر تیز تخیل سے کام لینا
پڑے گا۔

ایک دوسرا واقعہ چینی معاملات سے الگ تھلگ رہنے میں ماسکو کی مسکینی اور اتقا
کو واضح کرتا ہے۔ ٹریڈ یونین کی بین الاقوامی کمیٹی ماسکو سے اسٹرائک کمیٹی شنگھائی کو ۲۰ ہزار
روبل (سکۂ روسی) بھیجے جانے کی اطلاع دیتی ہے۔ اسٹرائک کمیٹی اس امدادی رقم کی رسید کا
ان الفاظ اقرار کرتی ہے " دنیا کے آزاد ترین مزدوروں کو ہم تہ دل سے مبارکباد دیتے
ہیں اور چین کے مظلوم مزدور پیشہ طبقے کا وعدہ ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے۔"

چین کے حالات نے روسی پروپگنڈے کی نشر و اشاعت میں حیرت انگیز سہولیت بہم پہونچائی ہے۔ حکومت یکے بعد دیگرے ایسے جنگجو لوگوں کے ہاتھ میں رہی جن کا واحد مقصد پیکن پر قابو حاصل کرنے میں استعمال طاقت اور حصول دولت (جس پر قبضہ کے ساتھ ہی دسترس ہوجاتا ہے) ہوتا ہے۔ اس قسم کے وسائل جو جمہوریت کی "مایۂ ناز" حکومت کی سطح پر نمایاں ہیں اغیار و اجانب کو غیر محتاط سازشوں اور ناقابل محسوس دست درازیوں کی مستقل دعوت دیتے ہیں۔

اسی اثنا میں واقعات کے تسلسل نے عوام کی ذہنیت کو اس مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں وہ اندیشے سے ایک خاص طور پر متأثر ہوتی ہے۔ سالہا سال کی کارروائی نے جن کے دوران میں دول خارجہ نے چین کے حقوق سے اغماض کیا اور اپنی مرضی کا نفاذ بذریعہ شمشیر کیا بالآخر اپنا ناگزیر ثمرہ دکھا دیا ہے۔ چینی رعایا میں اہل علم و اہل فہم جنہوں نے اپنی اپنی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو ہر بار بیرونی مداخلت کا شکار ہوتے دیکھا بالآخر ایک پُرجوش قومی تحریک کی صورت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔

مطالبۂ آزادی پر تو وہ حد درجہ مُصر ہیں۔ لیکن کوئی اس گتھی کو نہیں سلجھا سکا کہ کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ صرف ایک امر کا انکو کامل یقین ہے یعنی یہ "دول" ہیں جو چین کی تمام مصیبتوں کا باعث ہیں۔ لہذا دول پر قطعی حملہ ہونا چاہیے۔

دوران جنگ میں اور اسکے بعد جاپانی عسکریت پسندوں سے جو ساعی پیہم اپنی بری مقبوضات کی توسیع کے لیے چینی اور روسی مفاد کے منافی ظہور میں آئیں اُس نے جاپان کی اس دست درازی کو ایک صریح اور آسمان بالا سے حملہ قرار دیدیا۔ باوجود اس تغیر کے جو حال میں جاپان کی پالیسی میں ہوگیا ہے اور جس کی رو سے وہ چین سے دوستی پیدا کرنے اور اُسکی رہنما جوئی کرنے کا واقعی متمنی ہے۔ جنوب میں جہاں قبضۂ ہانگ کانگ و کولون کی بندرگاہ کے قبضوں کے باعث برطانیہ عظمیٰ بھی جاپان سے کم سفاک دراز دست نہیں سمجھی جاتی ہے حملے کا رُخ آسانی کے ساتھ انتہا دیوں کے خلاف پھر گیا۔ علاوہ ان سیاسی چیرہ دستیوں کے جاپانی اور انگریزی سرمایہ دار چین کے مختلف حصوں خصوصاً شنگھائی میں فیکٹریاں چلا رہے ہیں جہاں مزدوری پیشہ طبقے کی حالت سے ماہر شورش پسندوں کی نسبت بہ تنخواہ رنگ آمیزی کا مسالا ملتا ہے۔ گو ان کی حالت ملک کے عام معیار سے مختلف

اور بے شبہہ ولایتی کارخانوں سے کسی طرح بدتر نہ ہوگی۔

پورا بالشویکی نقشۂ عمل جاپان اور اُس کی ہمدم دیرینہ (اور غالباً آیندہ ہمدم ہونیوالی) برطانیہ عظمیٰ پر اسی حملے کے مطابق اور موافق کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا۔ فوجی دست درازی اور سرمایہ دارانہ جلب منفعت جو چین میں نہایت قبیح صورتوں میں پائے گئے ہیں نقشۂ عمل نے ان دونوں کے استیصالِ کامل کا مطالبہ باواز بلند کیا۔ اس میں مظلوم اقوام کی حریت اور مظلوم جماعتوں کی آزادی پر بہت زور و شور کے الفاظ میں اصرار تھا۔ چین کے جو تعلقات "دول" سے تھے اُن پر اثر ڈالنے کے لیے یہ مطالبہ بھی بخصوصیت موزوں تھا۔ اسکی تصریح کہیں نہ کی گئی کہ سوویٹ فعل اور بالشویک قول میں ذرہ برابر بھی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ اور اگر حملہ بردار حکومتوں نے اس تناقض اور عدم مطابقت پر توجہ منعطف کرانا چاہی تو اُنکے احتجاجی نوٹ یا تو ناقابل یقین کہکر خارج کردیے گئے یا چرب زبانی سے اس بین الاقوامی منصفانہ پالیسی کے حوالے دے کر جو نئے روس کی خاصیت بتائی جاتی ہے پس پشت ڈال دیے گئے۔

صورت معاملات مخصوص طور پر حسب منشا ہو جانے کے باعث روسی کارروائیاں چین کی بہت سی تحریکوں میں روح پھونکنے اور اُنکو تقویت پہنچانے کے قابل ہو گئی ہیں۔ یہ تحریکیں باوجود قابل وقعت اور عظیم الشان ہونے کے ایک طویل میعاد لڑائی جاری رکھنے کے لیے از خود مشکل سے کام کر سکتی تھیں۔ چین میں تمام آفت کا الزام بالشویکی یا بعد میں کمیونسٹ کارروائیوں کے سر تھوپنا بھی غلطی ہے کیونکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدگی سے ملکیت اغیار کے خلاف جذبۂ ناراضی شامل ہے جو برسوں سے اُبھرتے اُبھرتے اب ایسے درجے پر پہنچ چکا ہے جس سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ بالشویکی کارروائی صرف [illegible] اور ہمت افزائی تک محدود رہی ہے جس نے اس جسم عظیم میں جان ڈالدی اور اُسکو متحرک کر دیا۔ مشکل سے یقین آتا ہے کہ روسی چین کی ناموافق زمین میں کمیونزم کی تخم ریزی کی بڑی امیدیں رکھتے ہوں۔ لیکن قوم پرستی کا آلہ اُنکے ہاتھ لگ گیا ہے جسکو وہ ویسی ہی مستعدی سے استعمال کرتے ہیں جیسے کمیونزم۔ لہذا وہ بالتخصیص چینی قوم پرستی کی پرورش کی جانب اپنی تمام کوششوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

سوویٹ طرز کی آڑ میں عہد زار کی پرانی اسکیم پر [illegible] کا نہایت عمدہ [illegible] ملتا ہے۔۔ [illegible] میں روسی اسکیم یعنی سازباز اور ریشہ دوانیاں جو اب مشرق کو دیکھ کر [illegible]

کھلوا دینے کی غرض سے کی جاتی ہیں۔

روس کا جو طرزِ عمل چین کے ساتھ رہا ہے اُسکے ممنونِ منت ہونے کا اعتراف اہلِ چین کرتے ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روس کے دعاوی محبت و خوش معاملگی کو محض اُنکی ظاہری صورت پر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اسی خیال میں مگن ہیں کہ روس نے تمام مراعات، تاوان باکسر، مزید ارضی وسعت وغیرہ سب سے دست برداری لکھ دی ہے۔ گویا روس نے سچے دل سے اور نادم ہوکر ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن ہم میں سے جو لوگ چین میں اُسوقت موجود تھے اُنکو یاد ہوگا کہ چین نے جب انھیں روسی حقوق کو بغیر اس امر پیا استفسار کیے ہوئے منسوخ کردیا تو روس اور جاپان نے کس قدر زور و شور سے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ مشکل سے اس کا یقین آتا ہے کہ چینیوں کی سی ماہرامور سلطنت اور دور اندیش قوم نے روس کی تجویز دوستی بے تامل منظور کرلی۔ یقیناً چین کے معمر اور کارآزمودہ افراد نے روسی چالوں کو اُنھیں کے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ وطن پرست نوجوان طلبا کی جماعت جو اجتماعی حیثیت سے "ینگ چائنا" (جدید چین) بناتی ہے اور جو قومی تحریک کی اعانت عقل سے نہیں بلکہ جوش سے کرتی ہے ممکن تھا کہ پہلی بار بہک جاتی۔ لیکن ان لوگوں کو بھی عرصے تک دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

بہرکیف چین قدیم ہو یا جدید پرانی چینی اسکیم یعنی اغیار کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ممکن ہے وہ بالکل تیار ہو۔ ممکن ہے چینی رہنمایان قوم دیگر دول کو یہ امر تسلیم کرانے کے لیے بالکل مستعد ہوں کہ روس عمداً اپنے حقوق سے دست بردار ہوگیا اور اگر پھر چین کی نظرِ عنایت اُنپر ہوئی تو اُنکو لازم ہے کہ جو کچھ روس نے کیا وہی وہ بھی کریں۔ ممکن ہے اس دھمکی سے فائدہ اُٹھاکر کہ "چین بالشویک ہو جائیگا" دیگر دول کو اپنے حقوق سے دست بردار ہو جانے کے لیے گھبرا دیں۔ بالفاظِ دیگر چین قدیم ہو یا جدید دیگر دول سے جو کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے ممکن ہے روسی ہوا کے ذریعہ سے حاصل کرلے اور بعد ازاں روس کے خلاف اُن کی مدد کا طالب ہو۔

لم باستثناء جاپان دول خارجیہ میں روس ہی ایک ایسا ملک ہے جو چین میں واشنگٹن بعد سفاکانہ دست درازیوں کا مجرم کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کے نہبت اور بڑی بڑی دست درازیاں کی ہیں دنیا کے سامنے قلمبند واقعات موجود

ہیں - ان کا تعلق ایک حلیف ملک میں محض تباہ کن بالشویکی پر ہی گنڈے ہی تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ پرانی طرز کی ملکی چیرہ دستیاں بھی ہوئیں جن پر زار کے عہد کا روس تو خوب ہی فخر کرتا۔ سب سے پہلے منگولیا کو لو۔ اس صوبے میں سوویٹ فوجیں ۱۹۲۱ء میں داخل ہوئیں جبکہ انجرن کے بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا تعاقب ہو رہا تھا۔ ان کو منتشر کرنے اور انکے لیڈر کو گولی مار دینے کے بعد بھی روسیوں نے مراجعتِ وطن کا قصد نہ کیا۔ سائبیریا میں انھوں نے "حکومتِ انقلابیۂ عامۂ منگولیا" پہلے سے قائم کر رکھی تھی۔ کامریڈ باڈو جو ارگا میں دفتر قنصل جنرل میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور سائبیریا کی آبادی سے کئی اور چیدہ نیم تعلیم یافتہ منگولی اس کے ارکین تھے۔ سوویٹ فوجوں کے قدم ارگا میں جمتے ہی کامریڈ باڈو مع اپنے مصاحبین کے طلب ہوئے اور مجلس وزرا کی صدارت مرحمت ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ نئی منگولی سوویٹ ریاست کے وزیر خارجہ کا جلیل القدر عہدہ بھی آپ ہی کو تفویض ہوا۔ اس نام نہاد "خود مختار حکومت" نے فوراً ایک سرکاری عرضداشت اس مضمون کی ماسکو بھیجی کہ "علاقہ منگولیا سے سوویٹ افواج اسوقت تک نہ ہٹائی جائیں جبتک دشمن کی طرف سے ذرا بھی خطرہ باقی رہے"۔ ماسکو سے جواب ملا کہ انکی درخواست کے موافق کارروائی کی جائے گی۔ چنانچہ پارٹیزن اور کوسک جنھوں نے شہر پر قبضہ کر رکھا تھا انکی جگہ لینے کے لیے مستقل سرخ سپاہ کی ایک رجمنٹ بھیجدی گئی۔ بعد کو یہ فوج کم کر کے ایک پلٹن کر دیگئی۔ اور "باہمی مصالحت نامہ کی رو سے" صرف برائے نام منگولی محکمۂ جنگ کے زیر نگرانی ہو گئی۔ ارگا میں ان لوگوں کا قیام کم سے کم مارچ ۱۹۲۵ء تک رہا۔ جبکہ سفیر قراخان نے چین کو سرکاری طور پر مطلع کیا کہ سرخ افواج ہٹالی گئی ہیں۔ اور یہ اس لیے کیا کہ پکین میں ریشہ دوانی کرنے کے لیے روس کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ منگولیا پر چینی شہنشاہیت تسلیم کرے۔ ممکن ہے اس کارروائی نے چین کی پریشانی اور تلون مزاجی کو سکون بخشا ہو۔ ب سننا چاہیے کہ مسٹر چیمبرلن اپنی رپورٹ میں کیا فرماتے ہیں جو آپ نے ۲۔ مارچ کو طفلس میں ین الاقوامی معاملہ کی انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ آپ کہتے ہیں "ہمارا اتصال منگولیا سے ست زیادہ پیوستہ ہے۔ ہم اس جمہوریت کو جمہوریت چین کا ایک جزو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم سکی خود مختاری کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قدر وسیع ہے کہ منگولیا نہ صرف چین کی طرف سے اپنی اندرونی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھتی ہے بلکہ اپنی خارجی پالیسی

میں بھی آزادوبے ۔ بے شبہ مسٹر چیچرن چین کے لیے جو شہنشاہیت چھوڑتے ہیں اُس کی
مثال بعینہ ایک جھڑیاں پشت ہوسکے پرست کی ہے ۔
روس کے بین الاقوامی انصاف کے دعووں کا پول کھلانے کی اس سے زیادہ مشکل
ضرورت ہوگی ۔ یہ واقعہ ہے کہ روس نے منگولیا کو چین سے بالکل جدا کر دیا ہے اور پورے
طور پر اپنے پنجۂ اقتدار میں لے آیا ہے ۔ آرگا میں موجودہ "حکومت" خود ساختہ سوویٹ حکومت
ہے جسکو روسی ایجنٹوں نے قائم کیا ہے اور جو انھیں کی حمایت کی دست نگر رہتی ہے ۔ اگر
یہ سچ ہے کہ متعینہ فوجیں ہٹالی گئیں (کیونکہ یہ امر ہنوز درجۂ یقین کو نہیں پہونچا ہے) تو بھی
موقع کو تاڑ میں رکھنے کے لیے کافی تعداد محافظین سفارت خانہ اور فوجی معلمین کی رہ گئی
ہے ۔ منگولیا اب چین کی سرپرستی میں نہیں ہے بلکہ سوویٹ حکومت کے ماتحت ہے ۔ اگر اس
حیثیت کے بدلنے کی کوشش کی گئی تو سوویٹ سپاہ جو سرحد سے دو سو میل (۲۰۰) سے کم فاصلہ پر ہے
آرگا میں اپنے مقام پر واپس کر دی جا سکتی ہے ۔

روسی دست درازی کی دوسری مثال منچوریا والی ہے جسکی بحث اس سے قبل چینی
مشرقی ریلوے کے سلسلہ میں کی جا چکی ہے ۔ روس نے چانگسولن سے ریلوے پر روسی قبضہ
تسلیم کرنے کا معاہدہ کرانے کے وقت چینی جذبات اور چین کی راستبازی کو اپنے قول کے
مطابق ملحوظ رکھنے میں جس خلوص کا اظہار کیا ہے اسکا ثبوت چانگ سے بحیثیت فرمانروائے
"خود مختار سہ صوبجات مشرقیہ" گفت و شنید کرنے میں ملتا ہے ۔ منچوریا کو جمہوریت چین
سے جدا کرنے کی کوشش میں چانگ کو اگر کسی دولت خارجیہ سے کبھی کوئی تائید ملی تو صرف
یہی تھی ۔

روسی دست درازی دور دراز صوبوں تک محدود نہیں ہے ۔ ادھر جلیل القدر
عیسائی جنرل فنگ یو شنگ نے اپنے سابق کمانڈر وو ۔ پی ۔ فو کو دغا دی نہیں کہ پیکن کی
ملکیت کے لیے چانگسولن سے لڑائی کے منصوبوں میں اُسکو روس کی شہ ملنے لگی ۔ فنگ مع
اسّی ہزار آدمیوں کے پیکن کے شمال مغرب میں قدم جمائے ہوئے ہے اور ایسے علاقہ پر قابض
فوجی رسد رسانی کے کافی ذرائع نہیں ہیں ۔ تاہم اُسکو بڑی مقدار میں رسد پہونچ
ریگستان گوبی میں موٹر کار سے سفر ملتوی ہے لیکن فنگ کو روسی اسلحہ و سامان
کے لیے موٹریں برابر دوڑائی جا رہی ہیں ۔ کالگن میں ایک بہت بڑی

میگزین قائم ہو چکی ہے اور وولن فوریں اس سے بھی بڑھی - جو افواج متعینہ پیکن کی تاخت سے
زیادہ محفوظ ہے - فنگ کے مفاد کے لیے روسی فکر و قلق کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہو جاتا ہے ستر ہزار
منگولی فوج بھرتی ہوئی ہے اور مسلح کر دی گئی ہے، جس کی تربیت پانچ ہزار روسی افسران کرتے
ہیں - جب وقت فنگ کو دشمن کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کی یا چانگسولن کو دیوار کے اُس پار
بھگانے کی ضرورت پڑیگی، یہ امدادی سپاہ اُسکے حوالے کر دی جائے گی - باوجود سفارتی تبلیغ
و تلقین کی ایسی باتیں محض محبت کی وجہ سے نہیں کی جاتی ہیں اور فنگ جانتا ہے کہ اگر
کسی وقت پیکن پر پورا دستِ قدرت حاصل ہو جائے گا تو اُسے یا چین کو کس قسم کا صلہ
دینا ہوگا -

روس واپس آرہا ہے - ریچھ کے توقف کا زمانہ قریب اختتام ہے - اور چین کی شمالی
فوجی نقل و حرکت میں "آدم زاد" دبے پاؤں بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے - منچوریا کا سفر منطقۂ
چینی مشرقی ریلوے سے ہو کر طے کر رہا ہے - منگولیا کی دار السلطنت ارگا میں اُسنے اپنا غار بنا رکھا
ہے - نیچے اُتر کر گوبی میں وہ ایک ایسے منگولی انبوہ کے ہمراہ مصروف خرام ہے جو چنگیز خاں
کے وقت سے اب تک دیکھنے میں نہیں آیا - پیکن کے پھاٹک تک وہ ایک چینی جنگجو کے بازو
کی آڑ میں جسکو وہ اپنے پنجۂ آہنی سے مرعوب کیے ہوئے ہے پاؤں گھسیٹتا جا رہا ہے - دور
دراز جنوب میں جہاں ریچھ کی آواز اس سے قبل نہیں سُنی گئی اُسکو ساٹھ ہزار کینٹونیوں پر بھروسہ
ہے کہ وہ لوگ اُس کے انگریزی رقیبوں کو ہانگ کانگ میں لوٹ لیں گے -

اس طرح صرف یہی نہیں ہے کہ چین کو فی الحال منگولیا سے ہاتھ دھولینا پڑا ہے
بلکہ خود چین اور منچوریا کو سنہ ١٩٠٤ء کے بعد سے زیادہ خطرہ روسی غلبہ کی طرف سے لاحق ہو گیا
ہے - جنگ عالمگیر کے بعد سے کسی قوم نے اپنے دوائر اثر کو اس قدر وسیع نہیں کیا ہے - کسی
حکومت نے اپنی غاصبانہ پالیسی کو اس قدر ترقی نہیں دی ہے جسقدر جدید روس کی حکومت
عویدار امن و انصاف نے - چینی راستبازی کو خطرہ عیاں ہے - جاپان کی سلامتی کو کچھ کم
خطرہ نہیں ہے - سلطنت جزائر جاپان پھر مدافعت پر ہے اور خرس روس کی پیشقدمی کا مقابلہ
کرنے کو قدم بڑھانا ضروری ہے -

کیا امام اعظمؒ پٹھان تھے؟

شہاب الدین احمد بن حجر الہیتمی نے ایک کتاب خیرات الحسان فی مناقب الامام ابو حنیفۃ النعمان امام اعظمؒ کے مناقب میں لکھی ہے۔ جس کا ایک قلمی نسخہ اسوقت کاتب الحروف کے پیش نظر ہے اس کتاب کی تصنیف کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی تھی کہ بعض متعصب فقہائے مذاہب غیر نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ذم بلکہ تشنیع تک کی تھی اور بعض جاہلوں نے محمود غزالی معتزلی کے کلام کو جو امام اعظمؒ کی ذم میں تھا، امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے امام اعظمؒ کی مخالفت میں گویا ایک بڑے آدمی کو اپنے ساتھ شریک کرلیا تھا۔ شہاب الدین نے جب یہ دیکھا تو کیا بنظر رد تشنیع مخالفینِ امام اعظمؒ اور کیا بنظر برأت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہ مختصر کتاب تالیف کی۔

اس کتاب میں امام صاحب کے حسب و نسب کے متعلق دوسری فصل ہے۔ جس کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"دوسری فصل آپ کے نسب کے ذکر میں۔ اس میں بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اکثر کا یہ قول ہے اور محققین کے نزدیک یہی صحیح ہے کہ آپ عجم کے تھے۔ خطیب (بغدادی) نے آپ کے صاحبزادے حماد کے بیٹے عمر سے روایت کی ہے کہ آپ کے والد ماجد کا نام ثابت بن زوطی (بضم زاء بروزن موسیٰ۔ یا بفتح زاء بروزن سلمیٰ) بن ماہ تھا۔ ماہ کابل (بضم الموحدۃ) کے رہنے والے تھے جو ہندوستان کے قریب ایک ملک ہے۔ اور بنو تیم اللہ بن ثعلبہ کے غلام تھے، جب ایمان لائے تو انھیں آزاد کردیا۔ ثابت آپ کے والد مسلمان پیدا ہوئے"

"ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ انبار (بفتح الھمزہ) کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے نسا (بفتح اولیہ و بالقصر) منتقل ہوگئے، وہاں ابو حنیفہ پیدا ہوئے۔ جب بڑے ہوئے تو انھیں ہمراہ لیکر دوسری جگہ انتقال مکان فرمایا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ ترمذ کے تھے اور یہ بھی محال نہیں معلوم ہوتا کہ آپ ان چاروں شہروں سے نقل کرتے رہے ہوں۔ اور جہاں جہاں جاتے اپنے ساتھ ابو حنیفہؒ کو لیجاتے۔ ترمذ (بتثلیث اولیہ ضم میم مع ذال معجمہ) دریائے جیحوں کی طرف ایک شہر ہے۔ نیز عمر مذکور کے بھائی اسمٰعیل ابن حماد

سے مروی ہے کہ (امام صاحب کے والد ماجد کا سلسلۂ اجداد یہ تھا) ثابت بن نعمان بن مرزبان (بفتح فسکون وضم الزای) اور ابناء فارسی کے ایک معرب رئیس اور آزاد تھے۔ اور خدا کی قسم غلامی سے ہماری آزادی حاصل کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ثابت حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی خدمت مبارک میں صغیر سنی میں حاضر ہوئے تھے اور حضور نے آپ کی اور آپ کی اولاد کے لیے برکت کی دعا فرمائی تھی۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ دعا قبول ہوئی۔ نعمان نے نیروز (نوروز) کے دن جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں فالودہ بھیجا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمیں ہر روز نوروز ہے۔ نیز ایک یہ قول ہے کہ مہرجان (عربی محبۃ الروح) کے دن کا یہ واقعہ ہے اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمارا مہرجان ہر روز ہے۔ اخیر کے ان دو قولوں سے ہمیں اختلاف ہے کہ ثابت کے والد کا نام نعمان یا زوطی تھا، بلکہ انکے جد کا نام مرزبان یا ماہ تھا۔ اس اختلاف کے بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے دو نام ہوں جیسے کہ ایک نام ہوا کرتا ہے اور ایک لقب۔ یا زوطی سے مراد نعمان اور مرزبان سے مراد ماہ ہو۔ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے متعلق جو انکار ہے اسکا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آزادی حاصل کرنا انکے جد کے لیے ثابت ہے اور انکار انکے باپ کے متعلق ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے اور ان کا غلام ہونا اور کابل سے آئے ہوئے قیدی ہونا ثابت ہے۔ انھیں بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خرید کر کے آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ثابت کے باپ کا نام طاؤس بن ہرمز تھا جو بنی ساسان میں کا ایک بادشاہ گذرا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عربی النسل تھے اور زوطی کے باپ یحییٰ بن زید بن اسد تھے۔ ایک نسخہ میں ابن راشد (نذاہد؟) الضاری لکھا ہے۔ اس سب کا رد ہو چکا ہے اور اصحاب مناقب کی ایک جماعت اسی قول کی طرف گئے ہیں جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔"

شہاب الدین کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو امور تسلیم شدہ ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) امام اعظم کے جد عجمی تھے۔

(۲) کابل سے آئے تھے۔

(۳) آپ کے والد کو جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی صحبت حاصل ہوئی تھی۔

کابل میں اس زمانہ میں مغل، شیخ و سید کا مجمع ابھی نہیں آیا اور بالکل اصلی قدیم باشندے وہاں

آباو تھے جنھیں پٹھان کہتے ہیں۔ پھر کیا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ امام اعظم کے اجداد پٹھان تھے؟ اور
ورکیا جس طرح ہندوستان میں پٹھان آکر ہندوستانی پٹھان ہو گئے ہیں، کوفہ میں جاکر
کوفی پٹھان نہیں ہو سکتے؟

پٹھانوں کے ایمان لانے کا زمانہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، مگر یہ سلسلہ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے زمانہ تک رہا ہے اور بعض لوگ جو اُسوقت اسلام نہیں لائے تھے، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد تک اسلام لاتے رہے۔ مگر حضرت امام اعظمؒ کے اجداد کے ایمان لانے کا زمانہ وہی ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہ اہل کابل سے تھے جو اُس زمانہ میں سب کے سب پٹھان تھے۔ تو پھر کیا اُنکے پٹھان ہونے سے کوئی شخص اختلاف کرسکتا ہے؟

م۔ ح۔ خان

غزل رقم لکھنوی

دل کیا ہے، جان کیا ہے، مرا جسمِ زار کیا
اے حسنِ یار تجھ پہ کروں میں نثار کیا

آکر نسیم چھیڑتی ہے بار بار کیا
افسردہ خاطروں کو خزاں کیا بہار کیا

فرقت کا کوئی دن بھی قیامت سے کم نہیں
کیا چیز روزِ حشر ہے روزِ شمار کیا

انساں کی سرکشی کی کوئی انتہا بھی ہے
اُڑ جائے گا فلک پہ یہ مُشتِ غبار کیا

ساقی نہ کر شراب کے دینے میں پیش و پس
میں ہوں خدانخواستہ پرہیزگار کیا

دیں عرضِ حال پر تو ستمگر نے گالیاں
ہے اور خواہش اے دلِ اُمیدوار کیا

کہلا کے تیرا بندہ ہوں محتاج غیر کا
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

اب تو دعا بھی کرتے ہوئے شرم آتی ہے
دوہرائیں ایک بات کو ہم بار بار کیا

حقگوئی پر ہے تازہ بہت آپ کو رقم
پھر تازہ ہوگا قصۂ منصور و دار کیا

بجلی کا قمقمہ

(ایک اتفاقی حادثہ سے ایک کروڑ ڈالر سالانہ کی بچت)

کلیولینڈ کانفرنس کا اجلاس منعقد ہے، سیکڑوں علماء و ماہران سائنس جمع ہیں، ڈاکٹر مارون پیکن اُٹھا، اور ۶ عدد الکٹرک لائٹ بلب (برقی روشنی کے قمقمے) میز پر رکھ دیئے۔ پھر اُنکا ایک اشارہ سے نیچے گرادیا۔ یہ اشارہ اعلان تھا اس امر کا کہ اہل امریکہ کو ایک کروڑ ڈالر سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

ایک عامی کی نظر میں یہ تجربہ ناقابل التفات ہوگا۔ ڈاکٹر کانفرنس میں چند قمقمے لیکر آیا تھا جو سُن کیے ہوے اور ہلکے سبز رنگ کے تھے اور بجائے بیرونی جانب کے اندر کی طرف سُن کیے گئے تھے۔ لیکن اس میں قابل اعتنا بات کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مارون پیکن نے وہ کام کیا ہے جسکے امکان پر علمائے سائنس بیس سال سے خندہ زن تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی ایجاد سے اُس صنعت کو مکمل کر دیا جو ہر سال تیس کروڑ بجلی کے لمپ امریکہ کی دوکانوں اور مکانوں کے لیے ساخت کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ امریکی خاندانوں کے لیے بہتر و ارزاں تر روشنی مہیا کر دی۔ اپنے لیے چارلس اے کافن والا قیمتی انعام حاصل کیا اور اپنی کمپنی کے لیے شہرت دوام پیدا کر دی۔ اڈیسن کے سب سے پہلے کاربن لیمپ کے بعد سے پچاس سال کے اندر روشنی میں جس قدر ترقی ہوئی اُسکو ڈاکٹر پیکن نے اپنے ایجاد سے درجۂ تکمیل کو پہونچا دیا اور آج روشنی کا اس سے بہتر ذریعہ موجود نہیں۔

ڈاکٹر پیکن نے جو کچھ کیا وہ ایک معاملۂ عشق و محبت، ایک پریشاں کن ٹیلیفون، ایک نیم مکمل قمقمے کے اتفاقی حادثہ کا ممنون ہے۔ ڈاکٹر پیکن نے زمانۂ شباب فلوریڈا میں گذارنے کے بعد الاباما پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی، اور کیمیکل انجنیرنگ میں خاص مہارت پیدا کرلی۔ لیکن اسکو پہلا کام سڑکوں کی تعمیر کا دیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں اس نے فوجی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور علم کیمیا میں مہارت خاص رکھنے کی وجہ سے اس کو نیلا پارک بھیجدیا گیا۔ جہاں چچا سام (امریکہ) جرمنی کے مہلک گیس کے جواب و مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھے۔

خاتمۂ جنگ کے بعد پکین کی ملازمت جاتی رہی۔ لیکن خوش قسمتی سے نوکری کے بدلے اسکو بیوی مل گئی۔ یعنی کلیولینڈ کی ایک لڑکی سے اس نے شادی کرلی۔ پکین نے اپنی بیوی سے فلوریڈا کی آب و ہوا اور مناظر قدرتی کی بڑی تعریف کی اور وہاں کے قیام پر اُسکو آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن بیوی نے کلیولینڈ کی حمایت کی اور وہیں کے قیام کو ترجیح دی۔ چنانچہ کلیولینڈ میں سکونت اختیار کی گئی۔ اگر آج بجلی کے لیمپ ہمیشہ سے زیادہ ارزاں اور بہتر ہیں تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس ترقی میں مسٹر پکین کا بڑا حصہ ہے۔ کیونکہ اُسی کی ترغیب و اصرار سے پکین نے کلیولینڈ کا قیام پسند کیا تھا۔

کلیولینڈ میں نیلا پارک واقع ہے جو نیشنل لیمپ ورکس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جس شخص کو مکان، دکان، اسکول، یا بازار کی روشنی کا معمہ حل کرنا ہوتا ہے سیدھا وہیں پہونچتا ہے۔ اور اُسکو اپنی مشکل کا حل تیار ملتا ہے۔ دنیا کے تمام حصوں سے بارہ ہزار آدمی ہر سال مشورہ کے لیے وہاں آتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "نیلا پارک وہ مقام ہے جہاں کل کی روشنی آج چمکتی ہے" یعنی روشنی کے مسئلہ کا ہر عقدۂ دشوار وہاں پہلے ہی سے حل کرلیا جاتا ہے۔ نیلا پارک کے انجنیروں اور محققین خصوصی نے کروروں ڈالر تجارت امریکہ کی نفع خیزی اور معیشت قومی کی راحت رسانی کے لیے صرف کیے ہیں۔ پچاس برس قبل صرف شمع کی روشنی بصارت نوازی کی کفیل تھی۔ لیکن اب بجلی کی روشنی شمع سے بدرجہا ارزاں ہے۔ بجلی کی روشنی اڈیسن کے پہلے لیمپ سے اکیس گُنی روشنی دیتی ہے اور دنیا بھر کی کسی کمپنی نے روشنی کی ترقی میں اس قدر نمایاں اور قابل قدر کام نہیں کیا جتنا نیلا پارک نے کیا ہے۔

پکین نے کلیولینڈ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد جب جستجو کی کہ لیمپ لیبوریٹری کے متعلق اسکی خدمات کی ضرورت ہے یا نہیں، تو اُسکو مشورہ دیا گیا کہ بجلی کے قمقموں کو اندر کی جانب سے سُن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب تک قمقمے باہر کی طرف سے سُن کیے جاتے تھے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ ان پر گرد جم جاتی تھی، اور صاف ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ اب ڈاکٹر پکین نے تجربہ شروع کردیا۔ باقی داستان پکین کی زبانی سنیے جو وہ مسٹر پین سے بیان کرتا ہے:-

"ہم اس اصول پر نہایت سختی سے کاربند تھے کہ تجربہ کے دوران میں قمقموں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یعنی اگر ایک تجربہ کسی قمقمے پر ناکام ثابت ہو تو اُسی قمقمے کو صاف کرکے

دوسرا تجربہ کیا جائے۔ اور یہی اصول اندر سے سُن کرنے کی کامیاب ترکیب کا باعث ہوا۔
موجودہ لیمپ ایجاد کرنے کے لیے جن تدابیر پر عمل کیا گیا وہ ظاہر ہیں۔ ڈاکٹر ڈبلیو ڈی کولج نے بجلی کے تار جو پہلے نہایت نازک چیز کے ہوتے تھے مضبوط دھات کے بنائے جو قدیم کاربن کے تاروں کے مقابلہ میں آٹھ گنی زیادہ روشنی دینے لگے۔ ایڈیسن نے اپنے ابتدائی تجربات میں نائٹروجن سے بھرے ہوئے بلب (قمقمے) استعمال کیے اور یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ برقی لیمپ کے اندر نائٹروجن کے سوا کوئی چیز نہ ہونی چاہیے۔ لیکن ہم ڈاکٹر ارونگ لینگ میور کے ممنون ہیں کہ اُس نے بعض اور قسم کے گیس بلب میں بھرے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تار زیادہ بلند ٹمپریچر تک گرم ہو سکتے ہیں اور بلب کو صدمہ نہیں پہونچتا۔ اسی طرح بیشمار ایجادیں کی گئیں اور بازار مختلف وضع و قطع کے قمقموں سے پٹ گیا۔ آخرکار صناعوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اور ایک جدید و سہل العمل لیمپ کی ایجاد پر غور کیا گیا۔ تاکہ کاریگروں کو اوضاعِ مختلفہ کی ساخت اور خریداروں کو تذبذب انتخاب کی زحمت سے نجات ملجائے۔
بلب کی ہوا نکالنے کے لیے قدیم نوکدار مُنہ کی جگہ گردن کی طرف سے خالی کرنے کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ سیدھے تاروں کی بجائے مُڑے تار بنائے گئے۔ غرض اب لیمپ کی ساخت اس نقطہ پر آگئی تھی کہ ایک مکمل لیمپ ایجاد کیا جا سکے۔ لیکن تکمیل ناممکن نظر آتی تھی
"ہر شخص چاہتا تھا کہ نئے لیمپ سے اُتنی ہی روشنی حاصل ہو جتنی شفاف شیشے کے بلب سے ہوتی ہے۔ اور آنکھیں تیز روشنی سے ایسی ہی محفوظ رہیں جیسی سُن کیے ہوئے بلب سے رہتی ہیں۔ اوپر سے سُن کیا ہوا بلب نہ صرف جلد میلا ہو جاتا ہے۔ بلکہ پوری روشنی بھی نہیں دیتا اور روشنی کی مقدار بلب کے اندر رُک جاتی ہے۔ لیکن اگر اندر کی جانب سے سُن کیا جا سکے تو بیرونی سطح صاف اور چکنی رہے گی اور روشنی بھی کافی دیگا۔ اس لیے کہ جو مقدار روشنی کی بلب کے اندر رُک جائے گی وہ غیر محسوس ہوگی۔
"جب میں نے لوگوں سے اس تدبیر کے امکان عمل کا ذکر کیا تو ہر شخص نے خندۂ ہمت شکن سے اس کا جواب دیا۔ اور ایک کاریگر کا حال بیان کیا کہ اس نے ریلوے کمپنی کو پچاس ہزار اندر سے سُن کیے ہوئے بلب مہیا کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ لیکن اس معاملہ میں اُس کا دیوالہ نکل گیا۔ اس لیے کہ دورانِ ساخت میں پچاس فی صدی بلب ٹوٹ گئے۔
بہرحال میں نے اپنے تجربات جاری رکھے۔ اور مختلف قسم کے ایسڈ کا مختلف وضع کے قمقموں

پہ تجربہ کرتا رہا۔
قاعدہ یہ ہے کہ بلب بنانے کے بعد اسکے اندر ہائڈرو فلورک ایسڈ کا قوی مرکب لگانے
سے بلب اندر کی جانب سے سُن ہو سکتا ہے۔ اس ترکیب سے سُن کرنے کے بعد اگر ایک ہلکا
مرکب بلب کے اندر ڈال کر تھوڑی دیر چھوڑ دیا جائے تو سُن کیا ہوا حصہ صاف اور شیشہ
حسب سابق شفاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر اُس پر نیا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ میں اسی طرح اکثر بلب
صاف کر لیا کرتا تھا اور انکو ضائع نہ ہونے دیتا تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں تجربہ
کر رہا تھا۔ ابھی صاف کرنے والا عرق بلب میں ڈالا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پریشان کن
آواز سے بجی۔ میں گھبرا کر اُٹھا۔ جلدی میں اتفاق سے بلب پر ہاتھ لگا اور وہ اُلٹ گیا۔ ا
عرق بلب کے صاف ہونے سے پہلے ہی گر گیا۔ جب میں ٹیلیفون کے پاس سے واپس میز پر آ
تو ایک پھر بلب کو ہاتھ لگا اور اس مرتبہ وہ اندر سے سُن کیا ہوا نیم صاف شدہ بلب لڑھک
زمین پر گر پڑا۔ بلب گرتے ہی ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ شفاف شیشے کا بلب بھی اس صدمہ
متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بلب جو سُن ہونے کی وجہ سے پہلے سے زیادہ نازک ہو گیا تھا بھا
آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور بالکل صحیح و سالم لڑھک کر میز کے نیچے چلا گیا۔ بس یہی واقعہ
میری ایجاد اور بلب کی تکمیل کا باعث ہوا۔"
اس کے بعد ڈاکٹر پیکن نے چند قمقموں پر تجربہ کیا۔ اور جب اطمینان ہو گیا تو چند بلب
ایک جلسے میں پیش کیے۔ سب کو میز پر ایک قطار میں رکھا اور پھر سب کو ایک ایک کر کے گرا
پہلا بلب حاضرین کی توقع کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور لبوں پر تبسم نمودار ہوا۔ لیکن اس کے
بعد تین بلب گر کر بالکل سالم رہے۔ آخری دو بلب کو ڈاکٹر نے زور سے فرش پر دے مارا
بلب گرتے ہی اُچھلے اور مجمع کا خندۂ زیر لب بھی غائب ہو گیا۔
لوگوں نے حیرت سے اس ایجاد کا راز دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے صداقت کے سا
اقرار کیا کہ مجھے خود علم نہیں۔ میں اس کے صحیح سبب سے قطعی نا واقف ہوں کہ بلب نا
شکست کیونکر بن گئے۔ البتہ میں اس طرح کے بلب اور تیار کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے
اور اب ہر سال کروڑوں بلب اسی ترکیب سے بنائے جاتے ہیں۔
دیکھیے معمولی سا اتفاقی حادثہ کس درجہ مفید ایجاد کا سبب بن گیا!

حامد حسن قادری لکچرار فارسی و اُردو۔ سینٹ جانس کالج آ

وکیل کا کارنامہ

(بنگال کے مشہور فسانہ نگار مسٹر پربھات کمار بیرسٹر کے ایک دلچسپ بنگالی افسانہ کا ترجمہ)

(۱)

بھوانی پور میں سبودھ چندر چار برس تک وکالت کرتے رہے، لیکن انکی وکالت نہ چمکی۔ انھوں نے جب قانون کا امتحان پاس کیا تھا تو لوگوں کا خیال تھا کہ آدمی ہوشیار ہے جلدی نام پیدا کریگا لیکن ان لوگوں کی امید یاس سے بدل گئی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ علم اور عقل کی کمی سے سبودھ بابو کی وکالت نہیں چمکی، کیونکہ بابو صاحب عقلمند ہونے کے ساتھ ہی بہت بڑے عالم بھی تھے۔ اب سبودھ بابو نے بھوانی پور کو چھوڑ کے ونیاج شاہی ضلع میں جاکر وکالت کرنے کا تہیہ کیا، کیونکہ انکو معلوم ہوا کہ ونیاج شاہی میں مقدمے بہت ملتے ہیں، وہاں وکیلوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔ سفر سے پہلے بھوانی پور کے ایک مشہور وکیل کے پاس سبودھ بابو گئے اور اُن سے کہا "میں آپ کے واسطے کچھ تحفہ لایا ہوں، آپ کو قبول کرنا پڑے گا"

جہاں دیدہ پُرانے وکیل نے مسکرا کر کہا "کیا تحفہ لائے ہو؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں"

سبودھ بابو نے آہستہ سے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے ایک سیاہ الپکے کا گون اور ایک نئی عمدہ پگڑی نکال کر وکیل صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا "یہ دونوں چیزیں آپ کے نذر کرتا ہوں"

وکیل صاحب نے کچھ سوچ کر کہا "اس کا کیا مطلب ہے؟"

سبودھ بابو نے ہنس کر جواب دیا "اِن دونوں نئی چیزوں کو لیکر براہ کرم آپ اپنا پُرانا گون اور پگڑی دیدیجیے"

اب وکیل صاحب سبودھ بابو کا مطلب سمجھ گئے اور قہقہہ مار کر کہنے لگے "واہ سبودھ بابو واہ، تم کو تو بڑی دُور کی سوجھی"۔

سبودھ بابو بولے "جی ہاں مجھے نئی جگہ جانا ہے، ایک تو یوں ہی بہت سے وکیل ہوگئے ہیں، اس پر اگر موکل نئی پگڑی اور نیا گون دیکھیں گے تو پاس بھی نہ آئیں گے"

وکیل صاحب نے سبودھ بابو کی تعریف کرتے ہوے کہا "مجھے پوری امید ہے کہ تمھاری

وکالت خوب چلے گی، تم اپنے باپ کے ہونہار لڑکے ہو۔"
اسکے بعد گون اور پگڑی کا تبادلہ ہوگیا۔ اپنی نوجوانی کو چھپانے کے لیے سبودھ بابو ایک دیدکی دوکان سے اپنے سر کے کچھ بال سفید کرنے کے لیے کوئی تیل بھی لے آئے، لیکن اپنی ناتجربہ کاری سے اس کا راز اپنی بیوی سے کہ دیا۔ دوسرے دن سُنا کہ بلّی نے اس تیل کی شیشی کو میز پر سے گرا کر توڑ ڈالا۔ اس تلخ تجربہ کے بعد سبودھ بابو کو پھر تیل لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ سبودھ بابو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر دیناج شاہی پہونچ گئے، لیکن ان کی بدقسمتی نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ سبودھ بابو ایسے ہوشیار اور عقلمند وکیل کو متواتر چار برس تک دیناج شاہی کی بار لائبریری میں حاضری دینے پر بھی کوئی موکل نہ ملا۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ سبودھ بابو اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے چینی موجود نہ ہونے کے باعث گُڑ کی چاے پی رہے تھے۔ سودیشی کی محبت کی وجہ سے سبودھ بابو گُڑ ہی کی چاے پیا کرتے تھے اور اپنے احباب سے فخریہ کہا کرتے تھے" دوکاندار بے ایمان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دیسی کے نام سے جو چینی بیچتے ہیں وہ اصل میں جاوا کی چینی ہے۔ اس سے میں گُڑ ہی کو اچھا سمجھتا ہوں"۔ چاے پی کر سبودھ بابو پیالہ لیجانے کے لیے " مہاراجن! مہاراجن" کہہ کر پکارنے لگے، لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ تب آپ ہی پیالہ اُٹھا کر مکان کے اندر رکھنے کے لیے چلے گئے۔ اندر جا کر بیوی سے معلوم ہوا کہ مہاراجن اپنی تنخواہ کے لیے جو کئی مہینے سے نہیں ملی تھی جھگڑا کر کے غصہ میں نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے اور کہ گئی ہے کہ نالش کر کے سب وصول کر لوں گی۔ ایک لمبی سانس لیکر سبودھ بابو نے اپنے ہاتھ سے چلم بھری اور گھر سے باہر چلے آئے۔ بعض مشہور وکیلوں کو حقہ پیتے دیکھ کر سبودھ بابو بھی حقہ پینے لگے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو روپیہ سیر والی تمباکو پیتے رہے لیکن جب روپیہ سیر کی تمباکو بھی پی کر انکو آمدنی نہ ہوئی تو ایک دن غصہ میں آکر تمباکو پینا چھوڑ دیا لیکن تمباکو نے ان کو نہ چھوڑا۔ دو ایک دن کے بعد پھر حُقے کو مُنہ لگانا پڑا، لیکن اب جو تمباکو پیتے ہیں وہ چار آنے سیر کی ہے۔

اتوار کا دن تھا، سبودھ بابو اطمینان سے بیٹھک میں آکر حقہ پینے لگے اور اپنی قسمت کے پیچ میں کھو گئے۔ ان کے پاس جو کچھ روپیہ تھا وہ سب خرچ ہو چکا تھا۔ بیوی کا گہنا بکنا شروع ہو گیا تھا۔ سبودھ بابو سوچنے لگے" اس طرح سے کیسے گذارا ہوگا۔ کیا ترکیب کروں، کچھ سمجھ میں

نہیں آتا۔ کئی جگہ نوکری کی درخواست بھی بھیجی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ دن بدن خرچ بڑھ رہا ہے۔ اور آمدنی تو بالکل نہیں۔ پہلے تو کمیشن ہی سے کچھ مل جاتا تھا لیکن اب وہ بھی نہیں ملتا"۔ جس طرح آسمان کی سطح کا اندازہ نہیں، جیسے دریا کے پانی کی مقدار معلوم نہیں، سبودھ بابو کے خیالات بھی اسی طرح بے انتہا تھے۔ بغیر موکل کے اکیلے کمرے میں بیٹھ کر سبودھ بابو نے چار آنے سیر والی تمباکو کی ایک چلم دھیرے دھیرے اُڑا ڈالی، لیکن پھر بھی ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع نہ ہوا۔ دفعتاً باہر کسی کے پاؤں کی آواز سنائی دی "کون آتا ہے، کوئی موکل تو نہیں ہے" یہ سوچ کر سبودھ بابو نے بوسیدہ الماری سے ایک پرانی "نظیر کی کتاب" نکال لی اور بڑے دھیان سے پڑھنے لگے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور سبودھ بابو کے ایک دوست جگت بابو ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ جگت بابو دیناج شاہی کے مشہور وکلاء میں سے تھے ان کی حالت سبودھ بابو سے بہت اچھی تھی۔

کتاب الگ رکھ کر سبودھ بابو اپنے دوست کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ "آئیے آئیے آج سویرے ہی سویرے اس طرف کیسے نکل آئے؟"

جگت بابو نے جواب دیا "کیا کریں بھائی آج اتوار کا دن ہے، گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو آپ کے پاس گپ شپ کرنے کے لیے چلا آیا"

"بہت اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میرا بھی جی گھبرا رہا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کیا آج کا 'بنگالی' ہے، دیکھوں تو سہی"۔ یہ کہہ کر سبودھ بابو جگت بابو سے اخبار لیکر "ضرورت ہے" دیکھنے لگے۔

جگت بابو نے سبودھ بابو سے کہا "میں نے سنا ہے کہ پرسوں فلر صاحب، بجے صبح کی گاڑی سے دیناج شاہی میں آجائیں گے"۔

سبودھ بابو نے مسکرا کر کہا "کیا ہمارے گھر نہ آئیں گے"۔

"اگر آجائیں تو کیا کوئی تعجب ہے"۔

"نہیں بھائی، ہاں اگر سودیشی ہے وہ یہاں کیسے آسکتے ہیں، اور اگر وہ آبھی جائیں تو اُن کی خاطر کیسے ہوگی"۔

"سبودھ بابو! بڑا ایک بات ہے، اگر تم فلر صاحب کی خاطر تواضع کرو تو تمہارا بڑا فائدہ ہو، آجکل تقسیم بنگال کی وجہ سے فلر صاحب کی کوئی آؤ بھگت نہیں کرتا۔ کوئی میونسپلٹی ایڈریس نہیں دیتی، کوئی ڈسٹرکٹ بورڈ خیر مقدم کے لیے تیار نہیں ہوتا"۔

سبودہ بابو ٹھٹھا مار کر بولے "خاطر کرنے سے اگر نوکری مل جائے تو میں بھی ایڈریس دے ڈالوں"

جگت بابو نے کہا "کیا تم نے نہیں سنا کہ مشرقی بنگال میں ایک وکیل صاحب قلر کی شان میں ایک قصیدہ لکھنے کی وجہ سے گورنمنٹ پلیڈر بن گئے۔"

سبودہ بابو کی زندگی میں ایک انقلاب ہونے لگا۔ ہنسی میں جو بات کہی تھی وہ دل میں لگی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچ کر بولے "اگر واقعی کچھ فائدہ ملنے کی امید ہو تو مجھے بھی کوئی ترکیب بتاؤ۔"

جگت بابو نے سمجھا کہ سبودہ بابو مذاق کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "انگریزی میں نظم لکھ سکتے ہو؟"

"میں نے کبھی تک بندی نہیں کی"

"جس طرح بھی ہو کوشش کر کے ایک نظم لکھو اور پھر اسکو خوبصورت کاغذ پر چھپوا کر جس روز قلر صاحب یہاں آئیں تقسیم کرا دینا، اور اس نظم کی ایک کاپی قلر صاحب کے پاس بھی بھیج دینا۔ فرید سنگھ کے ایک سرکاری وکیل نے میونسپلٹی کے چیرمین ہو کر بھی قلر صاحب کو اڈریس نہیں دیا، اگر تم میرے کہنے پر عمل کروگے تو ان کا عہدہ تم کو مل جائے گا۔"

سبودہ بابو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگے۔

جگت بابو نے پہلے کی طرح ہنسی میں کہا "کاغذ قلم لاؤ میں ابھی ایک قصیدہ لکھے دیتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا یقین مانو، کالج کا ہال سالانہ جلسوں میں میرے قصیدوں سے گونج اٹھتا تھا۔ مجھے کوئی معمولی شاعر نہ سمجھو۔"

سبودہ بابو نے آہستہ سے کہا "کیا تم مجھ کو پچاس روپیہ ادھار دے سکتے ہو؟"

جگت بابو مصنوعی غصہ کر کے بولے "تم بڑے گاؤدی ہو۔ میں تو بات چیت کر رہا ہوں نظم کی اور آپ فرماتے ہیں "روپیہ ادھار دے سکتے ہو" تم شاعروں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ شاعر بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں، جاؤ اب میں تمھارے لیے کوئی نظم نہ لکھوں گا۔"

سبودہ بابو نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "مذاق نہیں کرتا، مجھے پچاس روپیہ دے دو۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں"

"میں گورنمنٹ سے چال چل کر اپنا مطلب نکالوں گا۔ کامیابی یا ناکامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو"

"فلر صاحب کا استقبال کروں گا۔"

"کیا پاگل ہو گئے ہو۔ آخر تم کس شمار میں ہو۔ راجہ نہیں، زمیندار نہیں، کسی بڑے عہدہ پر نہیں۔ تم کو تو شاید اسٹیشن پر جانے کے لیے بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اجازت نہ دینگے، دربار تک پہونچنا اور گورنر سے ملاقات کرنا تو امر محال ہے۔"

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے، پھر بھی میں ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ فلر صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑ جائے گی اور پھر میرے سب کام بن جائیں گے"

بھگت بابو کے چہرہ پر بے بسی کا نشان نہ تھا، وہ بولے "کیا بے وقوفی کر رہے ہو، تمھارے ہم وطن تو فلر صاحب کا استقبال نہ کریں گے ایسی حالت میں کیا تم فلر صاحب کا استقبال کر کے ملک اور قوم کے دشمن کہلانا چاہتے ہو؟"

مسعود بولے "بھگت بابو! تم کیسی باتیں کر رہے ہو تمھارا کدھر خیال ہے۔ میں چار برس سے یہاں پڑا سڑ رہا ہوں بیوی کا گہنا بیچ کر گھر کا خرچ چلا رہا ہوں۔ کیا کبھی کسی لیڈر نے مجھے بلا کر اتنا بھی پوچھا ہے کہ "کیوں بھئی تمھارے گھر میں کچھ کھانے کو ہے کہ نہیں" چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے میں دودھ تک نہیں لے سکتا، وقت پر تنخواہ نہیں دے سکتا اس سے کوئی ملازم ٹکتا نہیں، محرر بھی سے بھاگ گیا، کوئی بھی نہیں، پانی بھرتے بھرتے اور برتن مانجھتے مانجھتے میری بیوی کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اس حالت میں اگر میں موقع پا کر اپنی بہتری کی کوئی راہ نکالوں تو کیا حرج ہے۔ اگر میں گورنمنٹ کو مغالطہ دے کر سرکاری وکیل بن جاؤں تو کیا برائی ہے۔ آخر میں کہاں تک بھوکوں کے تقاضے سہوں، پھٹا جوتا، میلے کپڑے پہن کر تو اب مجھ سے باہر نہیں نکلا جاتا۔"

بھگت بابو مسعود بابو کا حال سن کر بولے "آخر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں ایک ایسا محکمہ خوب سجاؤں گا"

"اس سے کیا تمھارا مطلب پورا ہو جائے گا؟"

"میری کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اس کے بعد میرے سب کام حسب مرضی ہو جائینگے"

"کامیابی تو جو ہوگی لیکن بدنامی بہت ہوگی"

"اس کے متعلق تو تم کوئی فکر نہ کرو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ میری مدد کروگے یا نہیں؟"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"جیسا میں کہوں گا تم ویسا ہی کرنا۔ میرے مکان کی آرائش کے بعد تم میری جگہ خوب بُرائی کرنا۔"

"یہ کام تو مشکل نہیں ہے مجھے منظور ہے۔"

"لیکن یہ خیال رہے کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ ہم تم دونوں دوست ہیں۔"

"اسکے لیے خاطر جمع رکھو"

"بس تو اب مجھے کچھ کہنا نہیں ہے، اب آپ آج ہی پچاس روپئے کا انتظام کر دیجیے۔"

"بہت اچھا، میں گھر جا کر آپ کو روپیہ بھیجدوں گا" یہ کہکر جگت بابو اُٹھ کھڑے ہوے۔ سبودہ بابو بھی ان کے ساتھ باہر تک آئے، رخصت ہوتے وقت جگت بابو نے کہا "مجھے تمہاری کامیابی میں شک ہے"

سبودہ بابو بولے "ایشور کی کرپا سے آسام گورنمنٹ کی ایسی ہی عقل تھوڑے دن بنی رہی تو میری کامیابی میں کوئی شک نہیں ہے۔ آگے میری قسمت۔"

"تمہاری کامیابی میں میرا بھی حق ہے" کہتے ہوے سبودہ بابو سے جگت بابو نے ہاتھ ملایا اور ہنستے ہوے اپنے گھر چلے گئے۔

(۳)

آج دوشنبہ ہے کل سویرے لاٹ صاحب دیناج شاہی میں رونق افروز ہوں گے لیکن شہر والے استقبال کی کوئی تیاری نہیں کر رہے ہیں۔ تقسیم بنگالہ کا صدمہ اور رنج سب کو ہے، اسی سے سب نے لاٹ صاحب کے استقبال میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ممبروں نے ایڈریس نہ دینے کا ریزولوشن پاس کیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں بھی مجسٹریٹ کو کوئی کامیابی نہ ہوئی وہاں بھی ووٹ نہ ملنے سے ایڈریس دینے کا سرکاری ریزولوشن پاس نہ ہو سکا۔ دیناج شاہی کے بڑے بڑے تعلقدار و رئیس جو ہمیشہ ہر کام میں حصہ لیتے تھے اچانک بیمار پڑ کر ہوا بدلنے کے لیے دوسرے شہروں میں چلے گئے۔

دوشنبہ کے دن صبح کے وقت شہر والوں کو ایک عجیب سین دکھائی دیا۔ سبودہ بابو کے مکان کی آرائش ہو رہی ہے۔ دس بارہ آدمی کام پر لگے ہوے ہیں۔ دیودارا اور جھاؤ کی پتیوں سے دیواروں پر قسم قسم کی بیلیں بنائی گئی ہیں۔ سبودہ بابو کے دروازہ پر بانس کا پھاٹک بنایا گیا ہے

اور اسکی زینت کیلیے کے پتوں اور گیندے کے پھولوں سے بڑھائی گئی ہے۔ رنگین کاغذ کی جھنڈیاں مکان کے چاروں طرف لگائی گئی ہیں۔ پھاٹک کے سامنے سڑک کے کنارے ہرے بھرے گملے رکھے ہوئے ہیں جنکو سرسبز رکھنے کے لیے ایک آدمی پانی چھڑک رہا ہے،
دن کے ایک بجے تک سبودہ بابو اپنے مکان کو سجاتے رہے اس کے بعد کھانا کھاکر ایک درخواست لکھ کر پولیس کے دفتر میں پہونچے۔ درخواست میں لکھا تھا "لاٹ صاحب بہادر کے خیر مقدم کی خوشی میں کل رات کو مجھے اپنے مکان کے سامنے آتشبازی چھڑانے کی اجازت دی جائے۔" درخواست پیش ہوتے ہی فوراً منظور ہوگئی اور سبودہ بابو اپنے گھر واپس ہوئے۔ یہاں آکر وہ پھر اپنے مکان کو سجانے لگے۔ ایک تختہ پر خوشنما سفید کاغذ چڑھاکر سنہرے حرفوں میں لاٹ صاحب کو "خوش آمدید" لکھ رہے تھے کہ کالج کے کچھ لڑکے ان سے ملنے کیلیے آئے۔ ایک لڑکے نے سبودہ بابو کو سلام کرکے بڑے ادب سے کہا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں"
سبودہ بابو نے بڑی نرمی سے جواب دیا "کل لاٹ صاحب آئیں گے انکے آنے کی خوشی میں اپنا مکان سجا رہا ہوں۔"
"یہاں کا کوئی آدمی بھی تو اپنا مکان نہیں سجاتا، آپ کیوں سجاتے ہیں۔"
"مکان سجانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔"
"تقسیم بنگالہ سے سب لوگوں کے دل دکھے ہوئے ہیں، یہ بھی کوئی خوشی کرنے کا موقع ہے؟"
"رنج کس بات کا، مجھے تو سب لوگ ہنسی خوشی میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔"
"کیا آپ تقسیم بنگالہ سے خوش ہیں؟"
اب سبودہ بابو بڑی مشکل میں پڑے۔ تھوڑے دن ہوئے شہر میں ایک جلسہ ہوا تھا اس میں سبودہ بابو نے لکچر دیا تھا کہ جب تک تقسیم بنگالہ کا بدلہ سرکار سے نہ لے لیا جائے گا اسوقت تک کسی کو خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سبودہ بابو نے لڑکوں کو کوئی جواب نہ دیا تو وہ سب ان کی خوشامد کرنے لگے "ہم سب آپ کے پاؤں چھوتے ہیں، آپ اپنا مکان نہ سجائیے"
سبودہ بابو نے جواب دیا "مکان کے سجانے میں میرا بہت خرچ ہوا ہے۔"
لڑکے بولے "سچ بتائیے آپ کا کتنا خرچ ہوا ہے۔ ہم لوگ سکول میں چندہ کرکے آپ کا نقصان پورا کر دیں گے۔ اگر اجازت ہو تو ہم ابھی آپ کی آرائش کو خراب کر دیں۔"
سبودہ بابو کو بہت برا لگا، غصہ میں بولے "جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ، دق مت کرو۔

تم لوگ خواہ مخواہ ہر ایک کام میں کود پڑتے ہو۔ جاؤ پڑھو لکھو تعلیم حاصل کرو یہی تمہاری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے" لڑکے ناامید ہو کر واپس چلے گئے۔ سبودہ بابو نے سوچا کہ لڑکے بہت شریر ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو آ کر آرائش کو بگاڑ دیں۔ یہ خیال کرتے ہی سبودہ بابو اسی وقت پولیس سپرنٹنڈنٹ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحب بہادر مجسٹریٹ صاحب کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سبودہ بابو مجسٹریٹ صاحب کے بنگلہ پر پہونچے اور اپنا کارڈ اندر بھیجدیا۔

سبودہ بابو فوراً اندر بلا لیے گئے۔ مجسٹریٹ صاحب کے کمرے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ سبودہ بابو نے دونوں افسروں کو جھک کر سلام کیا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ "کیوں بابو کیا چاہتے ہو؟"

سبودہ۔ "حضور کل لاٹ صاحب کے آنے کی خوشی میں میں نے اپنا مکان سجایا ہے۔ کئی آدمیوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسکول اور کالج کے لڑکے رات کو میری تمام آرائش کو خراب کر دیں گے۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ سوچ کر کہنے لگے "کیا آپ ہی نے آج آتشبازی چھوڑنے کی اجازت مانگی تھی؟"

"جی حضور"

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجسٹریٹ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا " انھیں بابو صاحب کے متعلق میں ابھی آپ سے ذکر کر رہا تھا۔

" سبودہ بابو آپ اسکے متعلق کوئی فکر نہ کریں، آپ کے مکان کے سامنے رات بھر پہرہ دینے کے لیے چار کانسٹبل تعینات کر دوں گا۔"

مجسٹریٹ صاحب نے سبودہ بابو سے مسکرا کر پوچھا " آپ وکیل ہیں؟"

"جی حضور"

" آپ کے دل میں سرکاری محبت دیکھ کر مجھے خوشی معلوم ہوتی ہے۔ آپ بہت عقلمند معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ کل دربار میں جانے کی خواہش رکھتے ہیں؟"

سبودہ بابو نے بڑے ادب سے جواب دیا "جی حضور۔ یہ تو میری بڑی خوش قسمتی ہوتی"

"بہت خوب" میں آپ کو دربار کا کارڈ دیتا ہوں — آپ کا نام ————"

سبودہ بابو نے اپنا نام بتایا اور مجسٹریٹ صاحب نے کارڈ پر سبودہ بابو کا نام لکھ کر انکو دے دیا۔ سبودہ بابو نے جھک کر سلام کیا اور کارڈ لیکر خوش خوش گھر واپس ہوئے۔
دوسرے دن ٹھیک وقت پر لاٹ صاحب بہادر تشریف لائے۔ جس وقت لاٹ صاحب کی موٹر سبودہ بابو کے مکان کے سامنے آئی سبودہ بابو نے سر جھکا کر سلام کیا۔ لاٹ صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سلام کا جواب دیا۔ سبودہ بابو کے آراستہ پیراستہ مکان کے پھاٹک پر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا

"خوش آمدید - زندہ باد لارڈ فلر"

لاٹ صاحب بہادر کی بھی اس پر نظر پڑی اور وہ مسکرائے۔ موٹر نظر سے اوجھل ہوگئی اور سبودہ بابو اپنے گھر میں گھس گئے۔

(۴)

دس بجے دربار کا وقت تھا۔ سبودہ بابو کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں ۹ بجے ہی پہونچ گئے اور گاڑی واپس کردی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ واپسی میں "پیدل ہی چلیں گے"
دربار میں بہت کم آدمی آئے تھے۔ تعلقداروں اور زمینداروں کی بہت کم تعداد تھی۔ زیادہ تر ملازمت پیشہ لوگ دکھائی دیتے تھے۔ جج، ڈپٹی، منصف وغیرہ سرکاری نوکروں سے دربار بھرا ہوا تھا۔ دربار بھرنے کے لیے کچہری کے عملہ کو بھی کارڈ دیدیا گیا تھا اس سے ان غریبوں کی جان بڑی مصیبت میں تھی۔ بیچاروں کی کم تنخواہ، اسی میں کسی طرح رو پیٹ کر گزارہ کرتے تھے۔ کچہری جانے کے لیے کل ایک جوڑا کپڑا تھا، وہ بھی دربار کے لایق نہیں، بہتوں نے مانگ کر کپڑے اکٹھا کیے، جن کو مانگنے پر بھی نہیں ملے وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے ہی پہنے دربار میں حاضر ہوئے، کیونکہ غیر حاضری کرنے میں برخاست ہو جانے کا ڈر تھا۔ وقت پر سفید بال والے ہنس مکھ فلر صاحب نے دربار میں قدم رنجہ فرمایا۔ سب لوگ فلر صاحب کی "جے" کہکر کھڑے ہوگئے اہل اسلام نے "مرحبا" کہکر اپنی خوشی ظاہر کی۔ لاٹ صاحب نے انگریزی میں ہر دیا۔ اسکے بعد رسم تعارف عمل میں آئی۔ مجسٹریٹ صاحب ایک ایک کرکے بڑے آدمیوں لاٹ صاحب کے سامنے پیش کرنے لگے۔ سبودہ بابو بھی ہمت کرکے مجسٹریٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ مجسٹریٹ صاحب نے انکو بھی لاٹ صاحب سے ملا دیا۔ فلر صاحب سبودہ بابو سے ہاتھ ملا کر بولے "کیا تم نے ہی میری آمد پر مکان سجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا؟"

"جی حضور"

"تمہارا مکان خوب سجا ہوا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی قدر کرتا ہوں۔ تم وکیل ہو؟"

"جی حضور"

"وکیل حکومت کے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ اُن سے میں بہت ناخوش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو سُریندر بابو کے اشارے پر بندر کی طرح ناچنا پسند نہیں ہے۔ تم مجھے سمجھدار معلوم ہوتے ہو"

"میں نے دوسروں کے بہکانے سے اپنا رویہ ترک نہیں کیا"

"بہت ٹھیک۔ تم شام کو ہم سے گورنمنٹ ہاؤس میں خاص ملاقات کرو" یہ کہہ کر لاٹ صاحب نے سبودھ بابو کو رخصت کیا۔ اس کے بعد دوسروں کی باری آئی۔ پھر دربار برخاست ہوا۔

سبودھ بابو جس وقت دربار سے باہر نکل رہے تھے اُسوقت مجسٹریٹ صاحب نے جلدی سے آکر لاٹ صاحب کی "خاص ملاقات" کا کارڈ دیا اور کہا "تمہاری قسمت اچھی ہے، لاٹ صاحب نے تم کو خود طلب کیا ہے۔ ٹھیک وقت پر پہنچ جانا" سبودھ بابو نے "اچھا حضور" کہکر سلام کیا۔

"خود بخود یہ کیا ہوگیا، دو تین دن ہوئے ملکت بابو نے مذاق میں کہا تھا "دربار کا کارڈ لے گا "خاص ملاقات" ہوگی۔ یہ تو سب کچھ ہوگیا۔ اب سرکاری وکیل ہی ہونا باقی رہ گیا ہے، تعجب کی بات ہے جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے اب میرے اچھے دن آگئے"۔ اسی قسم کی دل سے باتیں کرتے ہوئے سبودھ بابو اپنے گھر پہنچے۔ اور مکان کے سامنے کھڑے ہو کر آرایش دیکھنے لگے۔ لاٹ صاحب نے سجاوٹ کی تعریف کی تھی۔ ٹکٹکی لگا کر سبودھ بابو اپنی کارگزاری دیکھنے لگے۔ اس وقت ایک اُفتاد پڑی۔ سبودھ بابو کے مکان کے قریب ہی ایک وکیل کا مکان تھا، اُسکی چھت پر سے کچھ شریر لڑکوں نے ایک گملہ جس میں گوبر اور کیچڑ ملا ہوا تھا، سبودھ بابو کے سر پر پھینک دیا۔ سبودھ بابو نے چونک کر اوپر آنکھ اُٹھائی۔ کوئی ہنس کر کہہ رہا تھا "تمہارے باپ کو دھونے کیلیے گوبر کا پانی پھینکا گیا ہے، ایشور تمہارا منہ کالا کرے"

گوبر اور کیچڑ ملا ہوا پانی سبودھ بابو کی پگڑی سے بہکر اُنکے کوٹ پر گرا اور وہاں سے ہوتا ہوا وہ گندہ پانی پتلون کو خراب کرتا ہوا جوتوں میں بھر گیا۔ سبودھ بابو جوتا چھپ چھپ کرتے ہوئے جس قدر جلد ہوسکا اپنے گھر میں گھس گئے۔

(۵)

سبودہ بابو کے پاس ایک ہی سوٹ تھا۔ اب کیا پہن کر خاص ملاقات کے لیے جائیں۔ کچھ سوچ کر سبودہ بابو مسٹر ناتھ ڈپٹی مجسٹریٹ کے مکان پر گئے اور انکو اپنی حالت دکھا کر ایک سوٹ عاریۃً مانگا۔

ڈپٹی صاحب نے کہا "بھائی صاحب آپ کے پاس پوشاک نہ ہو تو میں بڑی خوشی سے دیدوں گا لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کے سر پہ بھوت کیوں سوار ہے۔ ہم لوگ غلامی کرتے ہیں ہمکو مجبوراً سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن آپ نے کیوں مکان سجایا تھا، دربار میں جانے کی کون ضرورت تھی۔ خاص ملاقات کے لیے آپ کو کیوں خلش ہے؟"

سبودہ بابو یہ سن کر سست ہو گئے اور کہنے لگے "میں کیا کروں۔ لاٹ صاحب بہادر نے خود بلایا ہے۔ اب اگر نہ جاؤں گا تو بہت برا ہو گا۔"

ڈپٹی صاحب کے دل میں اچانک یہ بات پیدا ہو گئی کہ سبودہ بابو سے اس قسم کی باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہوا، اگر یہ جاکر مجسٹریٹ صاحب سے کہدیں تو میری نوکری جاتی رہیگی۔ اس سے ذرا سنبھل کر بولے "اگر آپ کو لاٹ صاحب نے خود بلایا ہے تو ضرور جانا چاہیے، ٹھہریے میں آپ کو ایک عمدہ سوٹ لائے دیتا ہوں"

مختصر یہ کہ لاٹ صاحب سے سبودہ بابو کی "خاص ملاقات" ہو گئی۔ رات کو انکے مکان میں آتشبازی بھی چھوٹی۔ قریباً ۱ بجے رات کو جگت بابو سر پر چادر لپیٹے ہوئے سبودہ بابو سے آکر ملے اور کہنے لگے "شاباش! تم نے تو کمال کر دیا۔ جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ کیا لاٹ صاحب سے گورنمنٹ پلیڈری کا ذکر چھیڑا تھا؟

سبودہ بابو نے جواب دیا "کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ ابھی سے اگر میں نوکری کی درخواست کروں گا تو سب معاملہ خراب ہو جائے گا۔ زیادہ خوشامدی بننا بھی اچھا نہیں ہے ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"تار کا فارم ہے؟"

"ہے" جگت بابو نے تار کا فارم دیا۔ سبودہ بابو نے کہا "بنگالی" "امرت بازار پتر کا" "بندے ماترم" کو تار دیدوں گا"

"کس بات کا؟"

آپنی کارگذاری کا"

"یہ مطلب تو پورا ہو چکا ہے، کیونکہ "بنگالی" کے ایڈیٹر سکمار بابو نے تو لکھ دیا ہے کہ وینا ج شاہی کے وکیلوں میں صرف سبودھ بابو نے اپنے مکان کو سجایا تھا اور دربار میں بھی گئے تھے۔

"اور گوبر والی بات؟"

"شاید اس کا ذکر نہیں کیا"

"خاص بات تو یہی ہے۔ سکمار بابو نے اپنے اخبار میں مجھے بہت سی گالیاں نہیں دیں حالانکہ اسکی سخت ضرورت ہے۔ لڑکوں کا میرے اوپر گوبر اور کیچڑ ملا ہوا پانی پھینکنا، میرا مذاق اُڑانا، گالی دینا، یہ ایسی باتیں ہیں جن کو اخباروں میں چھپ جانا چاہیے" یہ کہکر سبودھ بابو نے تار کا مسودہ لکھا اور جگت بابو نے نقل کرکے اسی وقت روانہ کر دیا۔

دوسرے دن جب سبودھ بابو سو کر اُٹھے تو دیکھا کہ کوتوالی کے دو داروغہ حاضر ہیں۔ سبودھ بابو نے جب اُن سے آنے کی وجہ پوچھی تو اُنھوں نے کہا "جناب والا! ہم نے سُنا ہے کہ کل جب آپ دربار سے واپس آرہے تھے تو کسی نے چھت پر سے آپ کے اوپر گوبر کا پانی پھینک دیا تھا"

"جی ہاں"

"اسکی خبر صاحب لوگوں کو بھی مل گئی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر نے ہم لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اگر آپ مقدمہ چلانا چاہیں تو ہم لوگ گواہ اکٹھے کر دیں۔ افسوس ہے کہ یہ معاملہ پولیس خود نہیں چلا سکتی، ورنہ آج ہی ہم لوگ مناسب کارروائی کر لیتے اور جن لوگوں نے آپ کے ساتھ شرارت کی ہے انکو حوالات میں بند کر دیتے۔ خیر آپ آج ہی نالش کر دیجیے"

سبودھ بابو نے کہا "میں نے تو کسی کو گوبر کا پانی پھینکتے نہیں دیکھا، کس کے خلاف مقدمہ دائر کروں"

ایک داروغہ جی بولے "جس مکان سے آپ کے اوپر پانی پھینکا گیا ہے اُس میں جو لڑکے رہتے ہیں اُنکے نام معلوم کرکے ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ انکے باپ وکیل صاحب نے ضرور اُن لڑکوں کو مدد دی ہوگی اُن کا نام بھی لکھا دیجیے"

"سبودھ بابو نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا" سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میرا سلام کہنا اور کہدینا کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، شناخت کے وقت پہچان نہ سکوں گا، اس وجہ سے نالش کرنے میں

کوئی فائدہ نہیں ہے "

دونوں داروغہ رنجیدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ سبودھ بابو حقہ پینے لگے اور سوچتے رہے کہ جن لڑکوں نے میرے اوپر گوبر پھینکا ہے اُنھوں نے میری بڑی ہتک کی ہے' اسکی خبر اب تک شاید کلکتہ پہونچ گئی ہوگی۔ ان سب باتوں سے میرا کام نکل جائے گا۔ بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا "

سبودھ بابو نے جو سوچا تھا آخر کار وہی ہوا۔ تین دن کے اندر ہی گوبر والی بات مُلک کے چاروں طرف پھیل گئی۔ بنگالی اخباروں کے ایڈیٹروں نے گالی سے بھرے آرٹیکل لکھے کسی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ " سبودھ بابو ایسے غدار ملک اور قوم کے دشمن کو سوسائٹی سے الگ کر دینا چاہیے " ایک ہزل گو شاعر نے سبودھ بابو پر ایک نظم لکھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " گوبر بڑی ناپاک چیز ہے' لاٹ صاحب سے ہاتھ ملاکر سبودھ بابو نے پاپ کیا تھا لیکن وہ گوبر کے پانی سے دھل گیا" انگریزی اخباروں نے سبودھ بابو کی تعریف کی اور لکھا " مشرقی بنگال میں اب بھی بہت سے پڑھے لکھے آدمی سرکار کے سچے خیر خواہ ہیں "

دیناج شاہی میں بھی سبودھ بابو کی بڑی ذلت ہوئی۔ جب یہ بار لائبریری میں جاتے تھے تو وکلاء انکو جلی کٹی باتیں سنایا کرتے تھے۔ سبودھ بابو کی عدم موجودگی میں ایک وکیل نے جگت بابو سے کہا " کیوں جی تمھارے دوست کا کیا مطلب ہے۔ داروغہ بننا چاہتے ہیں یا ڈپٹی کلکٹر۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا "

جگت بابو نے غصہ میں جواب دیا " بھئی اُس کمبخت کا نام نہ لو' مجھے تو اُس سے نفرت ہے "

" تمھارے ساتھ تو بڑی دوستی "

" بالکل جھوٹ۔ میں ایسے آدمی سے دوستی کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہوں "

" کبھی تم نے اس پاگل سے کوئی بات چیت بھی کی ہے کہ نہیں "

جگت بابو نے مُنہ بناکر جواب دیا " میں نے تو اُسی دن سے بات چیت کرنا ترک کر دی ہے جس دن اس نے لاٹ صاحب کا خیر مقدم کیا ہے "

(۶)

لاٹ صاحب کے جانے کے ایک ماہ بعد دیناج شاہی میں ایک مشہور وکیل کشوری موہن کے لڑکے کا بیاہ ہوا۔ کشوری بابو بہت نیک اور ملنسار آدمی تھے۔ سبودھ بابو کا جب سے لاٹ گ،

مذاق اُڑاتے تو یہ اکثر سبودھ بابو کی طرفداری کیا کرتے تھے اور کہا کرتے "اس میں کوئی شک نہیں کہ سبودھ بابو نے اچھا کام نہیں کیا۔ جسکی وجہ اُنکی ناتجربہ کاری ہے۔ تم لوگ انکو زیادہ نہ دق کیا کرو۔ اخبار والوں نے ہی بیچارے کو اتنی گالیاں سُنائی ہیں کہ اگر کوئی اَور ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔ بہت کافی ہتک ہو چکی ہے اب زیادہ شرمندہ نہ کرو" غرضکہ جب کشوری بابو کے لڑکے کے بیاہ کا نیوتہ بانٹا جانے لگا تو انکے احباب نے بہت چاہا کہ سبودھ بابو کو شادی کی تقریب میں نہ بُلایا جائے لیکن نیکدل کشوری بابو نے ان لوگوں کا کہنا نہ مانا اور سبودھ بابو کو بھی نیوتہ بھیجدیا۔

شام کا وقت تھا۔ سبودھ بابو اپنی بیٹھک میں حقہ پی رہے تھے کہ اتنے میں اپنے منہ کو چادر سے چھپائے ہوئے انکے دلی دوست جگت بابو آ گئے۔

"آؤ بھائی آؤ۔ آج کل تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ کہیے کیا حال ہے"

جگت بابو نے کہا "تم نے ایسا کام ہی کیا ہے جسکی وجہ سے تمھارے پاس آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں مجھے تمھارے پاس کوئی دیکھ نہ لے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تمھیں سرکار سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا یوں ہی تمھاری قسمت میں گالی کھانا لکھا تھا"

"فائدہ ضرور ہوگا، استقلال سے سب کام بن جاتے ہیں"

"میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ فریدسنگھ کے سرکاری وکیل برخاست ہونیوالے ہیں، تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو، فوراً ایک درخواست لکھ کر قسمت آزمائی کرو"

"نہ بھائی، اتنی بدنامی اُٹھا کر اب مجھے وکالت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ سرکاری وکیل ہونے سے میری عزت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وکلا مجھ سے نفرت کریں گے، وکالت سے اب مجھکو دلی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی"

"تب کیا کروگے؟"

"اگر ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بہت اچھا ہو، کیونکہ اُس میں بڑی عزت ہے"

"تو پھر ڈپٹی کلکٹری ہی کی درخواست کیوں نہیں کرتے"

"ابھی نہیں، ذرا اور کارروائی کر لوں"

"اب کیا باقی رہ گیا ہے"

"تم لوگ مجھے برادری سے خارج کردو۔ اسکے بعد میرا مقصد حاصل ہو جائیگا اور

ڈپٹی کلکٹری مجھے بڑی آسانی سے مل جائے گی"

"میں اکیلے تمہیں برادری سے خارج کر دوں تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"

"کشوری بابو نے اپنے لڑکے کی تقریب میں تمہیں مدعو کیا ہے یا نہیں؟"

"ہاں - میں تو وہاں ضرور جاؤں گا، اور کیا تم نہ جاؤ گے؟"

"ضرور جاؤں گا"

"تمہارے پاس نوید بھیجنے میں لوگوں نے اعتراض کیا تھا لیکن کشوری بابو نے کسی کی بات نہیں مانی"

"یہ تو بڑا ہوا - خیر اب تم ایک کام کرو - جس وقت سب لوگ کھانا کھانے بیٹھیں تو تم گڑبڑی مچا دینا اور میں بغیر کھائے ہوئے کشوری بابو کے یہاں سے چلا آؤں گا اور اپنے گھر آکر اس کی خبر اخباروں کو بھیج دوں گا"

جگت بابو نے کہا "سبودھ بابو جانے دو، اب معاملہ کو زیادہ نہ بڑھاؤ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا" بہت کہنے سننے سے جگت بابو راضی ہوئے اور ایک پیالی چائے پی کر رخصت ہوئے۔

دوسرے دن کشوری بابو کی دعوت میں سبودھ بابو کی منشا پوری ہوئی۔ جگت بابو نے جب دیکھا کہ سبودھ بابو کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو انھوں نے کھڑے ہو کر برادری سے کہا "بھائیو معاف کرنا میں یہاں بھوجن نہ کروں گا۔ سبودھ بابو ایسے قوم وملک کے دشمن کے ساتھ بھوجن کرنا پاپ ہے" یہ سنتے ہی اور بھی کئی لوگ یہ کہتے ہوئے "ہم بھی سبودھ بابو کے ساتھ بھوجن نہ کریں گے" اٹھ کھڑے ہوئے۔ سبودھ بابو یہ رنگ دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "ایک آدمی کے واسطے آپ لوگ برادری سے کیوں باہر ہو رہے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں تاکہ میری وجہ سے برادری کی بدنامی نہ ہو" یہ کہتے ہوئے سبودھ بابو جلدی سے باہر نکل گئے۔ لیکن کشوری بابو نے انھیں روک کر کہا "سبودھ بابو، میں تمہیں الگ کھانا منگوائے دیتا ہوں"

"نہیں اب تو مجھ سے برداشت نہ ہوگی" یہ کہہ کر سبودھ بابو نے کشوری بابو سے زبردستی اپنا پیچھا چھڑایا اور اپنے گھر پہنچے۔ وہاں جا کر انھوں نے دوسروں کے نام سے کشوری بابو کے یہاں کا حال لکھ کر بھیج دیا۔ اخباروں نے پھر شور مچایا۔ بنگالی اخباروں نے لکھا "دیناج شاہی والوں نے جو سلوک سبودھ بابو کے ساتھ کیا وہ ہر طرح سے قابل تحسین ہے"

(۷)

ایک مہینہ اور بھی گذر گیا۔ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے سبودھ بابو، جگت بابو کو "انگلشمین" کا تازہ نمبر دکھا رہے ہیں، اس میں لکھا ہوا ہے "ہم کو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دیناج شاہی کے مشہور وکیل سبودھ چندر ہلدار کو آسام گورنمنٹ نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے لیے نامزد کیا ہے۔ پولیس کے محکمہ میں ایسے قانون داں وکیلوں کی سخت ضرورت ہے۔"

سبودھ بابو نے کہا "جگت بابو مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی آفت اٹھائی گالیاں کھائیں، اسکا انعام یہ ملا کہ پولیس کی نوکری نصیب ہوئی۔"

جگت بابو بولے "گورنمنٹ نے تو اچھا ہی سمجھ کر تم کو یہ عہدہ پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں تو ڈپٹی کلکٹری سے پولیس کا یہ عہدہ بڑھ کر ہے، اس میں تنخواہ بھی زیادہ ہے۔"

سبودھ بابو۔ اس میں شک نہیں کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی تنخواہ زیادہ ہے لیکن جب وقت آپڑتا ہے تو بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ تم خود دیکھو کہ میں نے تھوڑے ہی دن گورنمنٹ کی مصنوعی خیرخواہی کی ہے اسی میں میرا ناک میں دم آگیا ہے۔ پولیس کی نوکری کرنے سے تو مجھے علانیہ ملک کا دشمن بننا پڑے گا۔ کسی نے ولایتی نمک کہیں پھینکدیا "جاؤ پکڑ لاؤ" کسی لڑکے نے بندے ماترم" کہا "گرفتار کرلو" انھیں وجوہ سے مجھے پولیس کی نوکری پسند نہیں ہے، اس سے تو وکالت میں میرا ابھو کا مرنا اچھا ہے۔"

جگت بابو۔ میرے خیال میں تو اگر گورنمنٹ کو معلوم ہوجائے کہ تم ڈپٹی کلکٹری سے خوش ہوجاؤ گے تو وہ تمکو یہی عہدہ پیش کریگی۔ بہتر ہے کہ تم اپنی رائے سے گورنمنٹ کو مطلع کردو یا شیلانگ جاکر تم خود ایکدفعہ چیف سکرٹری سے مل آؤ۔"

"ابھی تو گزٹ میں کوئی اعلان نہیں ہوا۔ "انگلشمین" کا یہ نوٹ دیکھکر میں کیسے کوئی کاروائی کرسکتا ہوں"

"انگلشمین" کا یہ نوٹ ہی تم سرکاری نوٹ کے برابر سمجھو۔"

آخر کار یہی بات سبودھ بابو نے مان لی اور اسی دن انھوں نے شیلانگ کا سفر کیا۔ دوسرے ہفتے کے آسام گزٹ میں سرکاری طور سے اعلان کردیا گیا کہ سبودھ بابو ڈپٹی مجسٹریٹ بنادیے گئے۔

آجکل سبودھ بابو ڈھاکہ کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ خوش قسمتی سے اسوقت تک انکو کوئی سیاسی مقدمہ نہیں کرنا پڑا۔ اب وہ گڑگڑی چاے نہیں پیتے بلکہ عمدہ کاشی پور کی صبیحی استعمال فرماتے ہیں اور دو روپیہ سیر والی تمباکو کے کش لگاتے ہیں۔

اعظم کریوی، سابق ایڈیٹر اکبر

میزانِ رباعی

رباعی کے متعلق جتنے امور مشہور ہیں وہ یہ ہیں کہ بحر ہزج مثمن سے اختراع کی گئی ہے۔ اسکے دس رکن ہیں۔ ایک سالم مفاعیلن اور نو مزاحف مفعولن اخرم مفعول اخرب مفاعلن مقبوض مفاعیل مکفوف فاعلن اشتر فعل مجبوب فعول اہتم فع ابتر فاع ازل۔ ان میں سے چار وزن فع، فاع، فعول، فعل عروض و ضرب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چار مفاعیلن، مفاعلن مفاعیل فاعلن حشو کے ساتھ مخصوص ہیں بقیہ دو مفعول مفعولن صدر و حشو میں عام ہیں۔ اگر انکو آپس میں ضرب دی جائے تو دوسو اٹھاسی وزن پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اوزان کی نشستِ ارکان نامانوس ہے اس لیے ع

وتد پیئے وتد راست وسبب پئے سبب ہست

کا کلیہ قائم کیا گیا۔ یعنی جس رکن کا آخر وتد ہو اُس کے رکن ابعد کا آغاز وتد سے ہو اور جو رکن سبب پر ختم ہو اسکے بعد والے رکن کی ابتدا سبب سے ہونا چاہیے۔ اور مندرجۂ ذیل چوبیس وزن مروج ہیں :۔

اوزان اخرب الصدر و الابتداء	اوزان اخرم الصدر و الابتداء
(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل	(۱) مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۲) مفعول مفاعیل مفاعیل فعول	(۲) مفعولن مفعولن مفعولن فاع
(۳) مفعول مفاعیل مفاعیلن فع	(۳) مفعولن مفعولن مفعول فعل
(۴) مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع	(۴) مفعولن مفعولن مفعول فعول
(۵) مفعول مفاعلن مفاعیل فعل	(۵) مفعولن مفعول مفاعیل فعل
(۶) مفعول مفاعلن مفاعیل فعول	(۶) مفعولن مفعول مفاعیل فعول
(۷) مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	(۷) مفعولن مفعول مفاعیلن فع
(۸) مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع	(۸) مفعولن مفعول مفاعیلن فاع
(۹) مفعول مفاعیلن مفعول فعل •	(۹) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل •
(۱۰) مفعول مفاعیلن مفعول فعول	(۱۰) مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

(۱۱) مفعول مفاعیلن مفعولن فع (۱۱) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
(۱۲) مفعول مفاعیلن مفعولن فاع (۱۲) مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

اس کلیہ کے ماتحت چند اوزان متذکرۂ صدر غلط ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مفعولن اور مفاعیلن دونوں سبب پر ختم ہوتے ہیں لہذا انکے بعد والے رکن کی ابتدا سبب سے ہونا چاہیے مگر کالم اول کے نمبر ۴-۸-۱۲- اور کالم دوم کے نمبر ۲-۸-۱۲ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی گئی۔ مفعولن اور مفاعیلن کے بعد وتد مفروق فاع موجود ہے۔ مندرجۂ بالا اوزان کے علاوہ چند وزن اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے عدم صحت کی دلیل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ غیر مروج ہیں۔ اسکے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو والوں نے کالم اول کے ۹ لغایت ۱۲- اور کالم ۲ کے ایک لغایۃ ۸ وزنوں میں رباعی نہیں لکھی مگر وہ وزن اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی وزن پر رباعی یا کوئی مصرع رباعی لکھے تو ناموزوں نہ ہوگا مگر مندرجۂ ذیل اوزان کو سب غلط کہیں گے۔ حالانکہ از روے قاعدہ صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہوں :—

اوزان اخرب الصدر والابتدا	اوزان اخرم الصدر والابتدا
(۱) مفعول مفاعیل مفاعلن فعل	(۱) مفعولن فاعلن مفاعلن فعل
(۲) مفعول مفاعیل مفاعلن فعول	(۲) مفعولن فاعلن مفاعلن فعول
(۳) مفعول مفاعلن مفاعلن فعل	(۳) مفعولن مفعول مفاعلن فعل
(۴) مفعول مفاعلن مفاعلن فعول	(۴) مفعولن مفعول مفاعلن فعول
(۵) مفعول مفاعیلن فاعلن فعل	(۵) مفعولن مفعولن فاعلن فعل
(۶) مفعول مفاعیلن فاعلن فعول	(۶) مفعولن مفعولن فاعلن فعول

ان کے علاوہ ایک بھینا بطگی اور بھی برتی جاتی ہے کہ چار چار وزن ایک ایک رباعی میں جمع کیے جاتے ہیں۔ غرض جتنی بھینا بطگیاں ہو سکتی تھیں وہ سب برتی گئیں کچھ اوزان جو حقیقت میں داخل تھے خارج کیے گئے، کچھ بے قاعدہ بڑھا لیے گئے اور جملہ اوزان کا ذہن میں محفوظ رکھنا بھی مشکل۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا، اس لیے کہ اہل عروض نے تفصیل میں دھوکا کھایا اور ہماری قدامت پسندی نے نکتہ چینی کو عیب سمجھا۔ جو کچھ اسلاف سے ملا، بلاکم وکاست اُس کے حال پر رہنے دیا۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اجمال کی

تفصیل، تطویل کا اختصار کرتے موقع بموقع اپنی ایجادیں شامل کرتے فضولیات کو چھوڑتے - جن لوگوں نے اس طرف توجہ کی اُنھوں نے اسلاف کی ہر بات کو بُرا بتایا اور جدید شاہراہ اختیار کی - دونوں فرقوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوگئی ہے اگر انصاف سے کام لیکر خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کریں تو دونوں فرقے پھر ایک ہوسکتے ہیں -

رباعی کی بیقاعدگیاں تو اوپر تبلائی جا چکی ہیں اب قواعد سنیئے - رباعی کے دو وزن ہیں اور دونوں بحر ہزج مثمن سے اختراع کیے ہیں - ایک اخرب ملفوف مجبوب مفعول مفاعیل مفاعیل فعل دوسرا اخرب مقبوض ملفوف مجبوب مفعول مفاعلن مفاعیل فعل اس میں صرف تسکین اوسط کے زحاف سے کام لے کر نامانوس ارکان کو حسب ضابطۂ عروضیاں مانوس ارکان سے بدلا ہے - تسکین اوسط ایک معمولی زحاف کا نام ہے اور جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے تین متواتر حرکتوں کی درمیانی حرکت کے حذف کو کہتے ہیں - یعنی جب کسی رکن میں یا ایک رکن کے آخر اور دوسرے رکن کی ابتدا میں تین حرکتیں جمع ہوجائیں تو درمیانی حرکت کو حذف کرسکتے ہیں - اہل عروض کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب کسی رکن میں زحاف کرنے سے کوئی نامانوس کلمہ آئے تو اُسکو مانوس کلمہ سے بدل لیا جائے - ان اوزان میں جو تبدیلیاں واقع ہیں اُن کی تشریح درج ذیل ہے :-

(۱) اصلی وزن مفعول مفاعیل مفاعیل فعَلَ ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی -

(۲) اصلی وزن کے رکن ثالث ورابع کے درمیان تسکین اوسط سے کام لیا تو مفعول مفاعیل مفاعیلُفْ عَلْ ہوا اسکو مفعول مفاعیل مفاعیلن فع سے بدلا -

(۳) وزن نمبر ۲ کے رکن ثانی وثالث کے درمیان یہی زحاف ہوا تو مفعول مفاعیلم فاعیلن فع پیدا ہوا اُسکو مفعول مفاعیلن مفعولن فع سے تبدیل کیا -

(۴) وزن نمبر ۳ کے رکن اول و دوم میں تسکین اوسط سے مفعولم فاعیلن مفعولن فع پیدا ہوا اسکو مفعولن مفعولن مفعولن فع سے بدلا -

(۵) وزن نمبر ۲ کے رکن اول و دوم میں یہ زحاف کیا گیا تو مفعولم فاعیل مفاعیلن فع رہا اسکو مفعولن مفعول مفاعیلن فع سے تبدیل کیا -

(۶) وزن نمبر ایک کے رکن ثانی وثالث میں سکون وسط کی بدولت مفعول مفاعیلم فاعیل فعل پیدا ہوا اسکو مفعول مفاعیلن مفعول فعل سے بدلا -

(۷) وزن نمبر ۶ کے رکن اول و دوم میں پھر ہی زحاف عمل میں لایا گیا تو مفعولم فاعیلن مفعول فعل پیدا ہوا اسکو مفعولن مفعولن مفعول فعل سے بدلا۔

(۸) وزن نمبر ایک کے رکن اول و دوم میں بھی تسکین اوسط کی گئی تو مفعولم فاعیل مفاعیل فعل رہا۔ اسکو مفعولن مفعول مفاعیل فعل سے تبدیل کیا۔

(۹) دوسرا اصلی وزن مفعول مفاعلن مفاعیل فعل اپنی اصلی حالت پر ہے۔ عیلُمْتُ

(۱۰) وزن نمبر ۹ کے رکن ثالث ورابع کے درمیان سکون اوسط سے مفعول مفاعلن مفا عَلُنْ پیدا ہوتا ہے اسکو مفعول مفاعلن مفاعیلن فع سے بدلا۔

(۱۱) وزن نمبر ۱۰ کے رکن اول و دوم میں ہی زحاف کیا گیا تو مفعولم فاعلن مفاعیلن فع ہوا اسکو مفعولن فاعلن مفاعیلن فع سے تبدیل کیا۔

(۱۲) وزن نمبر ۹ کے رکن اول دوم میں تسکین اوسط کی وجہ سے مفعولم فاعلن مفاعیل فعل رہتا ہے اسکو مفعولن فاعلن مفاعیل فعل سے بدلا۔

اہل عروض نے اس امر کی اجازت بھی دی ہے کہ آخر مصرع میں حرف موقوف بڑھایا جا سکتا ہے اور اسکی وجہ سے نہ بحر بدلتی ہے نہ مصرع ناموزوں ہوتا ہے۔ لہذا ان کل اوزان کے آخر میں ایک ایک حرف موقوف بڑھایا جائے تو بارہ[۱۲] وزن اور پیدا ہوں گے اور سب مل کر مروجہ چوبیس وزن ہو جائیں گے اور جو بارہ وزن میں نے پیش کیے تھے وہ بھی پیدا نہیں ہوتے۔ مفعولن اور مفاعیلن کے بعد وتد مفروق فاع بھی استعمال ہو سکتا ہے اور غیر مربوط چوبیس وزنوں کا یاد کرنا بہت مشکل امر تھا اب بہت آسانی کے ساتھ یاد ہو سکتے ہیں اور حافظہ پر بھی بار نہ پڑے گا اور اس امر کی وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ رباعی میں چار وزن کیوں جمع ہو سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وزن کی اتنی شاخیں ہیں اس وجہ سے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور رباعی ایک ہی وزن میں ہوتی ہے نہ کہ مختلف وزنوں میں۔

فارسی زبان میں مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے چھ رباعیاں اس التزام سے کہی ہیں کہ چوبیس وزن ان میں استعمال کیے ہیں یعنی ہر وزن میں ایک مصرع ہے۔ اسی التزام سے میں نے اُردو میں تین رباعیاں کہی ہیں اور بارہ وزنوں میں بارہ مصرعے لکھے ہیں اور اُردو کے مروجہ وزن بھی یہی ہیں۔ اسکے علاوہ کسی وزن میں کوئی مصرع اُردو رباعی کا نظر سے نہیں گذرا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو ان رباعیوں پر ختم کروں ؎

کیا ممکن ہے محال امکاں ہو جائے — حسن اور مری نظر سے پنہاں ہو جائے
میں جسکا خیال دل میں کر لوں ہمدم — وہ شکل تصور میں نمایاں ہو جائے

دیگر

قسمت کا گلہ کاتب تقدیر سے ہے — کم بختی سب اسی کی تحریر سے ہے
یہ سب سہی لیکن سبب اسکا بھی کچھ — تقدیر کو میری ضد جو تدبیر سے ہے

دیگر

مسرور ہے جو آج وہ کل ہوگا ملول — ہے دنیا کا یہی ہمیشہ سے اصول
کلفت میں یاد حق ہر اک کرتا ہے — غافل نہ خدا کو عیش و عشرت میں بھول

احقر و افقر بندہ غضنفر کان اللہ امروہوی

غزل حبیب رامپوری

کیا ہے کیا عدو نے گر کچھ کمال پیدا — اک دن عروج ہی سے ہوگا زوال پیدا
مجھ کو سنا رہے ہو کیوں داستان دشمن — یہ باتیں وہ ہیں جن سے ہو اشتعال پیدا
دل کیا ہے جان تک ہیں ہم نذر کرنیوالے — کب تک نہ ہوگا انکے دل میں خیال پیدا
جو بات تم میں دیکھی وہ ایک میں نہ دیکھی — تم سا نہ ہوگا کوئی یوسف جمال پیدا
غیروں کی کر رہے ہو تعریف میرے منہ پر — اس طرز گفتگو سے ہوگا ملال پیدا
مغرور حسن پر ہیں سب سے وہ کہہ رہے ہیں — اللہ نے کیا ہے مجھ میں کمال پیدا
بے وجہ پھر کسی پر کاہے کو کوئی مرتا — ہوتا نہ گر جہاں میں حسن و جمال پیدا
خاطر سے میں تمہاری چاہوں گا گر عدو کو — پھر تو تمہارے دل میں ہوگا خیال پیدا
دل دیکے ان بتوں کو پچھتا رہا ہوں کیا کیا — خود ہو رہا ہے مجھکو اک انفعال پیدا
پیری کا وقت آیا انجام پر نظر ہے — یوں ہو رہی ہے دل کو فکر مآل پیدا
تم کو برا بتاؤ کس دن کہا ہے میں نے — بیکار ہو رہا ہے رنج و ملال پیدا
مقصود اس سے یہ ہے نکتہ نواز ہے وہ — رخسار پر کیا ہے انکے جو خال پیدا

ناحق حبیب اپنی کیوں عمر کھو رہا ہے
عزت جو چاہتا ہے کر کچھ کمال پیدا

عہد واجد علی شاہ کا ایک باکمال صناع

ہندوستان میں عجب عجب صاحب کمال لوگ گذرے ہیں، اور ہندوستان کے ہر دربار نے اُن کی بہت قدر کی، اور آج بھی معلوم نہیں کس کس فن کے اُستاد اور کاملین زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، لیکن افسوس اگلے زمانہ کے ایسے قدردان آجکل نہیں دکھائی دیتے جو اُن مصیبت زدوں کی کفالت کریں اور اُنکی سرپرستی کرکے زمانہ کے آگے پیش کریں۔ الغرض زمانہ کبھی کاملین سے خالی نہیں۔ تھا اور نہ شاید آیندہ رہے گا۔

اس وقت میں ایک باورچی کا ذکر کرتا ہوں۔ جب لکھنؤ کا آخری ستم زدہ تاجدار واجد علی شاہ، مٹیا برج میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا تو اُسوقت دکن حیدرآباد سے ایک باورچی روزگار ترک کرکے کلکتہ آیا اور اس یوسفِ بے کارواں کے دیدار کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ عرضی گزرانی اور شرفِ حضوری سے باریاب ہوا۔ جب بادشاہ سلامت کو اسکے کمال سے حاضرین نے مطلع کیا تو حکم شاہی سے مٹیا برج میں قیام کی جگہ ملی، اور ایک ماہ کے بعد اس باورچی نے سلطان عالم کی حضوری میں عرضی پیش کی کہ غلام حضور میں کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے، لہذا اشیائے ضروری کی اجازت کا خواہاں ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ بھئی کیا شے کھلاؤ گے؟ اُس نے ادب سے عرض کیا کہ آج سہ پہر کو آقائے ولی نعمت فلاں باغ میں جلوہ افروز ہوں، یہ غلام بھی پابوسیٔ شاہ کو حاضر رہے گا اور اُس وقت جہاں پناہ اپنے دستِ مبارک سے فلاں درخت سے نارنگیاں توڑ کر نوش فرمائیں۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی نے محظوظ ہو کر اُسکی التماس کو قبول فرمایا، اور داروغہ کو حکم دیا کہ اسکی ضروریات کو مہیا کردے۔ غرض باورچی نے پہلے داروغہ صاحب سے کہا کہ براہِ نوازش فلاں چمن کے گرد قناتیں لگوا دیجیے اور کوئی شخص وہاں نہ آئے۔ داروغہ صاحب نے قناتیں کھنچوا دیں اور حکم دیدیا کہ خبردار کوئی شخص وہاں نہ جائے۔ اب یہ باورچی اُس درخت کی نارنگیاں بنانے میں مصروف ہوا اور کئی گھنٹے کے بعد فارغ ہو کر باہر آیا۔ اور داروغہ صاحب سے کہا کہ قناتیں کُھلوا لیجیے۔ داروغہ صاحب نے قناتیں ہٹوا دیں۔ اور باورچی سے کہا کہ "ارماں سنو تو۔ وہ کونسا درخت ہے جس کی نارنگیاں بنائی ہیں؟ ذرا ہمکو تو بتاؤ"

اُس باورچی نے کہا کہ "آپ خود ہی کیوں نہیں ڈھونڈھ لیتے، مگر اب نارنگیاں نہ توڑیے گا۔" یہ کہکر باورچی چلا گیا اور داروغہ صاحب نے کئی گھنٹے تک چمن کی سیر کی اور درختوں کی نارنگیوں کو ہلایا، سونگھا، چھوا، لیکن پہچان نہ سکا کہ کون سی نارنگیاں بنائی گئی ہیں۔ وقت مقررہ پر سلطان عالم جلوہ افروز ہوئے اور باورچی کو طلب کیا اور پوچھا کہ فلاں درخت سے ہم نارنگیاں توڑیں؟ اُس نے دست بستہ عرض کیا کہ بسم اللہ کریں حضور عالی۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک نارنگی توڑی تو فوراً رس بہنے لگا اور ذرا سے دبنے میں بادشاہ کا پورا ہاتھ رس سے بھر گیا۔ اب اُسے سونگھا تو نہایت بھینی بھینی نارنگی کی خوشبو آرہی تھی۔ بادشاہ نہایت خوش ہوئے اور باورچی کی زبان مبارک سے بہت تعریف کی۔ اس عرصہ میں شاہی رکابداروں نے اُس نارنگی کو نفاست سے چھیل کر بادشاہ کے سامنے رکابی پیش کی۔ حضور عالی نے پھانک اُٹھا کر نوش کی تو لب بندھنے لگے اور ذائقہ بالکل تازی نارنگی کا سا تھا اور اوپر کے چھلکے کو دبایا تو رس پھوٹ نکلا۔ غرضکہ درخت سے کئی نارنگیاں توڑیں اور حاضرین کو مرحمت فرمائیں، لیکن ہر نارنگی مثل پہلی کے پائی گئی۔ سلطان عالم نے باورچی کی بہت تعریف کی اور پانچ سو روپیہ اور ایک بیش قیمت رومال انعام میں دیا۔ اور فرمایا کہ تم کو پچاس روپیہ ماہوار ملے گا۔ اُس نے آداب بجا لا کر انعام لیا اور دست بستہ عرض کیا کہ غلام نوکری کرنے سے مجبور ہے۔

اس صاحب کمال باورچی نے اُن نارنگیوں میں ایسی نفاست اور عمدگی سے شیرہ اُتارا تھا کہ کوئی نہ پہچان سکا کہ کونسی بنی ہوئی نارنگیاں ہیں اور کون سی بغیر بنی۔ اور نہ ان نارنگیوں پر کسی قسم کا نشان، چپچپاہٹ، نہ کوئی بوجھ تھا، بلکہ چیونٹیاں اور مکھیاں تک اُن پر نہ پہنچتی تھیں۔ ہر حال عجب باکمال شخص تھا۔

اسرار حسین خاں طباطبائی

"بچہ"

لختِ دل، لختِ جگر، آنکھ کا تارا تو ہے ماہ رُو، نورِ نظر، راج دُلارا تو ہے
راحتِ جانِ حزیں، جان سے پیارا تو ہے صاف ظاہر ہے کہ محبوبِ دلارا تو ہے

بچہ

باپ کے واسطے دلکش ہیں ادائیں تیری
ماں تو ماں، غیر بھی لیتے ہیں بلائیں تیری

گھر کی زینت ہے، تو ہی رونقِ کاشانہ ہے — گوشہ گوشہ ترے جلوے سے جلوخانہ ہے
ماں ہے شیدائی تری، باپ بھی دیوانہ ہے — تو ہے وہ شمع کہ گھر بھر ترا پروانہ ہے

روح پرور جو ہے معصوم تبسم تیرا
باعث وجد ہے اندازِ تکلم تیرا

ماں تری جانتی ہے چاند کا ٹکڑا تجھکو — رشکِ گل، مہر لقا، آئنہ سیما تجھکو
منتیں مان کے اللہ سے پایا تجھکو — ساری دنیا سے سمجھتی ہے وہ اچھا تجھکو

کیوں کہے کوئی کہ گورا نہیں کالا تو ہے
وہ تو کہتی ہے تجھے، گھر کا اجالا تو ہے

اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری — کعبۂ دل میں بھی موجود ہے مورت تیری
پوری کرتی ہے بصد شوق ضرورت تیری — شبھ گھڑی، پوچھتی پھرتی ہے مہورت تیری

لطف دے جاتی ہیں جو تیری ادھوری باتیں
وہ مزہ دیتی نہیں اور کی پوری باتیں

دل سے کرتی ہے دعا تو کبھی بیمار نہ ہو — کوئی آسیب نہ ہو، دکھ نہ ہو، آزار نہ ہو
گو کسی چیز کا تو منہ سے طلبگار نہ ہو — تیری چتون کو سمجھتی ہے کہ بیزار نہ ہو

دیکھتی رہتی ہے ہر وقت وہ صورت تیری
بے کہے تیرے سمجھتی ہے ضرورت تیری

تیری خدمت کے سوا اور اسے کام نہیں — صبح کی فکر نہیں اسکو غمِ شام نہیں
تو نہ آرام سے ہو تو اسے آرام نہیں — اور یہ لطف، شکایت کا کہیں نام نہیں

لب پہ ہے ذکر ترا، دل میں ہے داغِ الفت
تا قیامت نہیں بجھنے کا چراغِ الفت

باسط بسوانی

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف

ابھی حال ہی میں اہل ہنود نے مختلف مقامات پر مرہٹہ سردار سیوا جی کی سہ صدی سالگرہ منائی ہے - اس موقع پر اُن کے جرائد و صحائف نے اس سردار کی تعریف و صیف میں بے انداز غلو سے کام لیا - اُن کی موجودہ ذہنیت نے اس سردار کو پرماتما کا اوتار یا دیوتا تک تصور کرنے میں باک نہ کیا ، اور اُن اخباروں نے جو "قوم پرست" ہونے کے مدعی ہیں ، دیوتا تو خیر نہیں کہا لیکن سیوا جی کو قومی معمار تو ضرور تصور کیا ہے - اسی "بطل اعظم" کے متعلق دو قلمی تاریخیں ہندوستان کے ایک مشہور انشا پرداز کو دستیاب ہوئی ہیں ، جو مصلحت وقت کی بنا پر "خافی خاں" کے نام سے منصۂ شہود پر رونما ہوئی ہیں - یہ دونوں تاریخیں کسی مسلمان کی تحریر کردہ یا کسی "سازشی جد و جہد" کا نتیجہ نہیں ہیں ، بلکہ اپنے عہد کے مشہور وقائع نگار و انشا پرداز منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور لالہ گردھاری لال کی لکھی ہوئی ہیں - ان تاریخوں کے اقتباسات "معارف" کے تازہ نمبر میں شائع ہوئے ہیں - ان تاریخوں کے نام بساط الغنائم اور تاریخ ظفرہ ہیں - دونوں نام تاریخی ہیں - یہ دونوں کتابیں عہد مغلیہ کے دورِ انحطاط کے بعد تصنیف کی گئی ہیں - اس لیے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ مغلوں کی خوشامد میں لکھی گئی ہیں - "شفیق کا قلم متین ہے" اور گردھاری لال ملک کی تباہی کو دیکھ کر اس درجہ برافروختہ ہے کہ اُسکی تحریر سے بھی غصہ و غضب عیاں ہوتا ہے - ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جبکہ یہ تاریخیں لکھی گئی تھیں ، اہل ہنود سیوا جی کو "بطل" تصور نہیں کرتے تھے -

اب کتاب کی اصل عبارت میں واقعات ملاحظہ فرمائیے : —

"سیوا جی ... ازانجا (از رائے گڈھ) کوچیدہ و بر جالناپور کہ بست کروہا اورنگ آباد جانب مشرق واقع شدہ رویدہ دست تاراج کشاد چوں تکیۂ جان اللہ شاہ کہ از کاملان زمانہ بود آبرو بخشِ آبادی است مردم آبادی آں مکان را امن و پناہ دانستہ دراں خزیدند سیوا جی قساوتِ قلب را کار فرمودہ و پاس ادب نہ نمودہ ہمہ را غارت کرد بلکہ انجار ہم بریدہ نسبت بہ شاہ مذکور بے ادبی ہا روا داشت و ایں حرکت موجب آغاز ادبار او گشت - رنمست خاں منصب دار بادشاہی را کہ با جمعیت جزوی متعین جالناپور بود بحال بشارتِ غیب شد کہ بر کمیت فوج خود نظر نہ کردہ با سیوا جی مقابل شود کہ بلا شائبہ فتح ازان است - چنانچہ صباح

ایں رویا، رستم خاں خود را بیبا کانہ بلشکر سیواجی زد و با وصف قلت جمعیت غالب آمد مردم بسیار از سیواجی باسدوجی سردار عمدہ اش بقتل رسید نہ ہزیمت بلشکرش افتاد و سیواجی را پا از جا رفت و یارائے قیام در خود نیافتہ تا رائے گڈھ باز پس ندید - بالاجی راؤجی کہ بہ اورنگ آباد تاختہ بود نیز از انجا گریختہ بسیواجی ملحق شدہ" (ص ۵۵-۵۶)

(ترجمہ) سیواجی نے اس جگہ (رائے گڈھ) سے کوچ کرکے بالاپور کہ اورنگ سے ۲۰ کوس بہ شرق کی جانب واقع ہے دھاوا مار کر غارت گری شروع کی چونکہ جان اللہ شاہ جو کاملین زمانہ سے تھے، ان کا تکیہ اس آبادی کے لیے عزت بخش تھا، وہاں کے لوگ اسکو جائے پناہ سمجھ کر اس میں چلے گئے - سیواجی نے سنگدلی سے کام لیکر اور اس کا پاس ادب نہ کرکے سب کو لوٹ لیا، بلکہ درختوں کو بھی کاٹ ڈالا اور شاہ صاحب مذکور کے متعلق بے ادبیاں کیں اور یہ حرکت اسکے ادبار کا سبب بن گئی - رستم خاں شاہی منصب دار بادشاہی کو کہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ بالاپور پر متعین تھا، اسی رات کو غیبی بشارت ہوئی کہ اپنی فوج کی تعداد سے قطع نظر کرکے سیواجی کے ساتھ مقابلہ کرے، یقیناً اسکی فتح ہوگی، چنانچہ اس خواب کی صبح کو رستم خاں بیباکی کے ساتھ سیواجی کے لشکر پر ٹوٹ پڑا، اور باوجود فوج کی کمی کے غالب آیا، سیواجی کے بہت سے آدمی اسکے بہترین سردار سدوجی کے ساتھ قتل ہوئے اسکی فوج نے شکست کھائی - سیواجی کے پاؤں اکھڑ گئے اور ٹھہرنے کی طاقت سلب ہوگئی اور ایسا بھاگا کہ رائے گڈھ تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا - بالاجی، راؤجی بھی جس نے اورنگ آباد پر دھاوا کیا تھا اس جگہ سے بھاگ کر سیواجی کے ساتھ مل گیا -

اب دیکھیے کہ انھیں پنڈتوں کے متعلق جو آجکل سیواجی کو پرماتما کا اوتار مانتے ہیں، خود سیواجی کا خیال اور طرز عمل کیا تھا،

"......... سیواجی ...... یک قلم برہمناں را از کار و خدمت موقوف داشتہ گفت کہ ایں گروہ بدطینت گدا پیشہ نظر بہ بزرگ نہادی واجب الخدمت اند اما ازیشاں توقع خیر سگالی و آقا پرستی ہیچ نیست"

(ترجمہ) سیواجی نے .... یک قلم تمام برہمنوں کو ملازمت سے موقوف کر دیا کہ یہ بدطینت گدا پیشہ گروہ اپنی ذات کی بزرگی سے واجب الخدمت ضرور ہے لیکن اس سے خیر خواہی اور آقا پرستی کی کوئی توقع نہیں"

سیواجی کے اخلاقیات کی ایک دفعہ ملاحظہ ہو - سنبھاجی نے بھوپال گڈھ پر حملہ کیا اور اسکو جبراً قہراً مفتوح کرکے تقریباً ۷۰۰ قیدی جنکے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے، قتل کر ڈالے - دیکھیے ایک سفید لڑکے کی اس لیاقت و کارگزاری پر باپ کس قدر خوش ہوتا ہے

"...... سیواجی خبر رشادت فرزند دریافتہ مشتاق ملاقات شد، و در رائے گڈھ آمدہ از دیدار فرزند رشید ذخیرہ خورسندی اندوخت و وقت ملاقات یک پرتلہ مرصع با شمشیر و سپر بخشید"

(ترجمہ) سیواجی نے لڑکے کی اس لیاقت کی خبر پائی تو ملاقات کا اشتیاق ہوا اور رائے گڈھ

میں آکر نائق لڑکے کے دیدار سے مسرت اندوز ہوا، اور ملاقات کے وقت ایک مرصع پرتلہ تلوار اور ڈھال کے ساتھ عطا کیا۔

سیواجی کے موت کے واقعہ کو بساط الغنائم کا مصنف اس طرح لکھتا ہے :—

"... یکے از غمازان ذہن نشین سورا بائی زوجۂ سیواجی کہ مادر راجہ رام است ساخت کہ سیواجی سنبھاجی پسر خود را کہ از زوجۂ دیگر است میخواہد کہ ولیعہد سازد چنانچہ اورا ایں ارادہ از بنا لا طلبیدہ است و اغلب کہ عنقریب در رسد و مختار ریاست شود۔ زن مذکور ازیں کلمات سراسیمہ شدہ زہر در طعام سیواجی انداخت تا آنکہ او قالب خاکی گذاشت ......"

(ترجمہ) ایک چغلخور نے سیواجی کی بی بی سورا بائی (جو راجہ رام کی ماں تھی) کے یہ بات ذہن نشین کی کہ سیواجی اپنے لڑکے سنبھاجی کو جو دوسری بی بی سے ہے، ولیعہد بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس ارادہ سے اسکو بنا لا طلب کیا ہے اور غالباً وہ عنقریب پہونچکر مختار ریاست ہوگا۔ یہ عورت ان کلمات سے پریشان ہوئی اور سیواجی کے کھانے میں زہر ڈالدیا جسکو کھاکر وہ مرگیا۔

یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ شفیق کا قلم متانت سے نہیں گرا ہے لیکن گردھاری لال مصنف تاریخ ظفرہ قلم کا تیز ہے، اُس نے سیواجی اور سنبھاجی کے متعلق جو الفاظ لکھے تھے اُس سے کم از کم یہ تو معلوم ہی ہوجائے گا کہ وہ لوگ سیواجی کو کوئی "قومی معمار" یا بطل تصور نہیں کرتے تھے۔ تاریخ ظفرہ جسکے اقتباسات ہم پیش کرنے والے ہیں سیواجی کی وفات کے ۹۵ برس بعد، یعنے ۱۷۷۵ء میں لکھی گئی ہے، جبکہ کمپنی کا ابتدائی دور تھا اور ہیسٹنگز وسلفرسن کی حکومت تھی اور پلاسی کی لڑائی کو ختم ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے گردھاری لال کا قلم کس درجہ شوخ ہے :—

"..... سیوائے ناخلف بہ نیابت پدر بد سلف دراں دو پرگنہ (سوپہ و پونہ) می ماند — سیوا مردی کہ در بیباکی و جلادت و مکر و حیلہ بے نظیر بود و قابو یافتہ در ولایت کوکن غارتیا برانگیخت ..... آں شقی ..... آں غدار ..... نابکار ... مرزا راجہ بہ تلبیس آں ابلیس فریفتہ ..."

"سیوائے مقہور در سنہ ۱۰۹۱ھ سیوائے لعین ہم واصل جہنم شد"

(ترجمہ) سیوائے ناخلف اپنے بد صفت باپ کا قائم مقام ہوکر ان دونوں پرگنوں (سوپہ و پونہ) میں رہتا ہے۔ سیوا مرد وہ تھے کہ بیباکی بہادری اور مکر و حیلہ میں بے نظیر تھا، قابو پاکر کوکن نے صوبہ میں غارتگری کیں ... ... اور ۱۰۹۱ھ میں سیوائے لعین بھی جہنم پہونچ گیا۔

سیواجی نے جو عرضی شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بھیجی تھی، اُسکے لب و لہجہ پر خشمگیں ہوکر حسب ذیل عبارت لکھتا ہے :-

"برزبان الہام ترجمان گذشت کہ .... آں ناعاقبت اندیش (سیواجی) نخوت و تکبر را سرمایۂ حیات خود ساختہ عنقریب تلافی خود نمائی و بیجائی خواہد رسید

(عالمگیر کی) زبان الہام ترجمان سے یہ نکلا کہ ...... اس ناعاقبت اندیش نے نخوت اور تکبر کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنالیا ہے اس لیے اُسکو عنقریب اسکی خودنمائی اور بیجائی کا بدلہ ملے گا-

اس کے بعد ہی یہ حق پرست مورخ فرمان شاہی کا اثر ظاہر کرنے کے لیے لکھتا ہے :-

"چنانچہ آں سگ بے دُم و خر بے سُم واصل جہنم شد" (ترجمہ) چنانچہ وہ بے دُم کا کتا اور بے سُم کا گدھا واصل جہنم ہوا-

فی زمانتا ہمارے ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کی ساری داستان میں لے دے کے یہ یاد رہ گیا ہے کہ عالمگیر ہندوکش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

اُسی عالی مرتبت قدسی صفت عرش آشیانی بادشاہ کے متعلق ایک ہندو مورخ اُسکی زندگی میں جبکہ آہ اُسوقت جبکہ سطوتِ تیموری و شوکت بابری دم توڑ رہی تھی، دبدبۂ اکبری اور طنطنۂ شاہجہانی تاریخوں کے خزاں رسیدہ اوراق میں محض باقی رہ گیا تھا - اس بادشاہ کی موت پر حسب ذیل تبصرہ کرتا ہے - یہ جاننا چاہیے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی فردِ جرم امتداد زمانہ سے بہت طولانی ہوگئی ہے - اس نے متھرا و کاشی کے مندر بھی توڑ ڈالے ہیں، پالکیوں اور گھوڑوں پر ہندوؤں کو چلنے کی ممانعت بھی کی ہے، ہندوؤں کے استبداد اور مظالم کو موقوف کیا ہے، عالی ریاست میں اسلامی عنصر نمایاں ہے، ہندو ریاستیں بھی تباہ و برباد کی ہیں، سیواجی کو ذلیل بھی کیاہے، اُسی ظالم، ستمگر، ہندوکش بادشاہ کے متعلق شوخ نگار گردھاری لال کا قلم سفیدۂ قرطاس پر اس طرح رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ

" آں شاہ والا گہر در شیوۂ جہانداری بادشاہِ عادل و در پاس شریعت در ایشنسٹل کامل"

ترجمہ - وہ شاہ والا گہر فرمانروائی میں بادشاہ عادل تھا اور پاس شریعت اور ..... میں ..... کامل-

نگار :- مولانا عبدالسبحان صاحب ناظر نے ایک دلچسپ تاریخی مقالہ بعنوان آئین اکبری میں نگار

کے ستمبر نمبر میں سپرد قلم کیا ہے، مذہبی نقطۂ نظر سے اس میں بحث کی گئی ہے اور ۱۵۷۸ء سے ۱۵۹۵ء تک جو تغیرات اکبر میں اُس کے لامذہب حاشیہ نشینوں کی وجہ سے ہوئے وہ سب بدایونی کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر برائے نام مسلمان رہ گیا تھا، ورنہ حقیقتاً حاشیہ نشینوں کے ملحدانہ خیالات سے اُسکے قلب میں ایک خفیف علامت بھی اسلام کی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حج بند کر دیا گیا تھا۔ اگر نام سن لیتا تو قتل کا حکم دے دیتا۔ حد ہو گئی کہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ رائج کرنے کا ارادہ کر لیا گیا تھا لیکن فتنہ و فساد کے خیال سے یہ کلمہ محض قلعہ معلی کی چہار دیواری تک محدود رہ گیا چنانچہ ایک جگہ فاضل مضمون نگار صاحب رقم طراز ہیں کہ

"..... ۹۹۵ھ میں .... حج کرنے کی اجازت طلب کرنا قتل کا مستوجب ہوتا تھا.... تناسخ کے اصول نے خاص طور پر اسکے دل میں مضبوط جگہ پکڑ لی .... فاضل پادریوں نے انجیل مقدس پیش کی بادشاہ نے .... عیسائی مذہب کی حقانیت کو باور کر لیا ... اور شہزادہ مراد کو (جس کی عمر اسوقت ۸ سال کی تھی) ... انجیل پڑھنے کا حکم دیا۔ ان پادریوں نے سید المرسلین صلعم کی شان مبارک میں دجال (نعوذ باللہ من ذالک) کے اوصاف منسوب کیے ...... راجہ بیربل نے بادشاہ کے دل پر یہ بات نقش کر دی کہ آفتاب ساری کائنات کا مخزن اور اصل ہے۔ بادشاہ نے ہندوؤں سے تسخیر آفتاب کی دعا سیکھی اور صبح و شام بطور مذہبی وظیفہ کے اس کا ورد کیا کرتا۔ .... گائے ذبح کرنے کی ممانعت کر دی تھی .... سنہ کے پچیسویں سال اُس نے عام طور پر لوگوں کے روبرو آفتاب کو سجدہ کیا۔ شام کے وقت کُل درباری چراغ روشن ہوتے وقت تعظیماً کھڑے ہو جاتے ...... رفتہ رفتہ یہ خیالات پختہ ہو گئے ...... ۱۵۷۹ء میں بادشاہ کو سلطنت دنیوی کے ساتھ ہی خلافت دینی کے اختیارات بھی حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ کیونکہ دوسرے کی زبان اُسکو ناگوار تھی اس لیے جامع مسجد میں خطبہ پڑھنے کی کوشش کی اور فیضی کے ان اشعار پر خطبہ ختم کیا

خداوندے کہ مارا خسروی داد	دلِ دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد	بجز عدل از خیال ما برون کرد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر	تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

"... اگر مذہبی مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تو بادشاہ کا فیصلہ آخری اور قطعی حکم سمجھا جاتا۔ .... ۱۵۷۹ء کے آخر میں منجملہ اور باتوں کے شہنشاہ نے صاف طور پر جن و ملائک و عالم غیب جملہ دیگر چیزوں سے انکار کر دیا۔ بزرگوں کی کرامات اور پیغمبروں کے معجزات سے بھی منکر ہو گیا اہل مذہب کی گواہی، قرآن کے ثبوت، مرنے کے بعد روح کی بقا اور عاقبت کی جزا و سزا ان سب سے جہاں تک کہ وہ عقل کے خلاف تھے انکار کر دیا ...... پہلے مسلمان لمبی داڑھیاں رکھتے تھے، اکبر نے ارکین دربار کو حکم دیا کہ وہ داڑھیاں منڈوا کرا کے حاضر ہوا کریں۔ یہ واقعہ ۱۵۹۲ء کا ہے ..... بادشاہ کو یہ خیال پیدا ہوا [illegible] ۱۵۸۰ء

کہ ہزار برس کا زمانہ ہو چکا ہے اس لیے اب جدید شریعت کا ظہور ہونا چاہیے ....
..... یہ حکم ہوا کہ بادشاہ کے حضور میں سجدہ کیا کریں۔ زمیں بوس ہونا اس کا نام رکھا گیا
آگرہ میں شراب کی دوکانات کھلنے کی اجازت دی گئی۔ سور اور کتے اب پاک سمجھے جانے لگے۔
..... ایک شکاری کتے کا خوشنما مقبرہ تعمیر کیا گیا ـــــ غسل ..... جو روا تھا ضروری تھے
باطل ٹھہرائے گئے ـــــ چچا یا ماموں کی بیٹیوں سے شادی ناجائز ٹھہری .....
تا زوج کی ممانعت کی گئی۔ ـــ سنہ ہجری موقوف کرکے ایک نیا فارسیوں کا شمسی سال
جاری کیا گیا ..... اسلام کے کُل عقائد میں اشتباہ اور تمسخر ہونے لگا۔ دیندار خطرہ میں
تھے اور بے دین محفوظ۔

مسلمانوں میں ایک شخص ملا شیری تھا اس نے ایک قطعہ لکھا ہے، جو بہت دلچسپ و مضحکہ انگیز ہے
ہم یہاں اُسے نقل کرتے اور اس اقتباس کو ختم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بادشاہ کو ہندو اچھا
نہ کہیں گے تو کیا عالمگیر کو؟

تا بزاید ہر زماں کشور بر انداز آفتے	فتنہ در کوے حوادث کد خدا خواہد شدن
با عقاب قرضخواہ تیغ در ارباب شرک	بار سر از ذمہ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد	خرقہ پوش زہد را تقوی ردا خواہد شدن
شورش فراست اگر در خاطری از جاہلی	از خلائق بہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت بس کز ظرفگی	نقل بزم منعم از در گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعوئے نبوت کردہ است	گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

اُردو

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کے سہ ماہی نقیب اُردو کے تازہ نمبر میں
مولانا عبدالحق صاحب اڈیٹر رسالہ نے ایک مقالہ "قدیم اُردو" کے نام سے شائع
کیا ہے۔ یہ اصل میں بیجاپور کے اولیاء اللہ کے ایک شاعر خاندان کا دوسرا نمبر ہے۔ اس قسط میں
حضرت شاہ برہان الدین جانم کے حالات اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ برہان الدین
جانم حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند و خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی کا اکتساب
اپنے والد ماجد سے کیا۔ اپنے دور کے بہت بڑے عابد زاہد، مرتاض اور صوفی منش تھے۔ عوام
کو اُن سے بہت فیض پہونچا تھا۔ بہت سے رسالے سلوک اور تصوف میں بھی تحریر فرمائے۔ ہندی
زبان میں لکھتے تھے جسکو ہم لوگ آجکل ابتدائی اُردو کہتے ہیں۔ "تلقین بھی فرماتے تھے جو اُنکے رسائل
سے بھی ظاہر ہے۔ صاحب روضۃ الاولیاء بیجاپور نے انکی تاریخ وفات پانزدہم جمادی الاُخرٰے

لکھی ہے۔ سنہ غائب ہے۔ تذکرۂ اولیائے دکن کے مصنف نے آپ کو [illegible]ھ تک حیات لکھا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، اپنے والد ماجد ہی کے مقبرہ میں مدفون بھی ہوئے۔ ان کا عرس آج بھی ۱۶ جمادی الاخرٰی کو ہوتا ہے۔ انکا بہت سا منظوم کلام فاضل مدیر رسالہ اُردو کو مل گیا ہے جس پر اُنھوں نے فاضلانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ ایک جگہ پر تبصرہ کرتے ہوئے "تصوف" پر بحث کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ ہم ناظرینِ الناظر کے سامنے پیش کریں :-

"تصوف ہمارے ادبیات، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبہ میں رچا ہوا ہے، (شاید ہماری سیاسیات بھی اس سے خالی نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لاش ہے جس میں روح کا نام نہیں اور جسے ہم صدیوں سے چپٹے چلے آتے ہیں یا ایک شاندار درخت ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے دیکھنے کو درخت ہے، مگر صرف ایندھن کے قابل رہ گیا ہے، یا ایک خوبصورت اور نامور عمارت کا کھنڈر ہے، جسکی تعریف کر دینا ہی ہمارے ذوق سلیم کی دلیل ہے۔ یا ایک قبر ہے جو اپنے پُر عظمت گنبد کی وجہ سے بچ رہی ہے۔ بہت سوں نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ پیشہ کی بدولت بہت سی مقدس چیزیں کھیل تماشہ بن گئی ہیں۔ یہ بھی محفل کے گرمانے کے لیے ایک لطیفہ ہو گیا ہے۔ تصوف اب اسکا نام ہے کہ چند اصطلاحیں یاد کر لیں یا چند آمن یا ذکر رٹ لیے، اور نہیں تو کم سے کم لباس ہی میں جاذبہ پیدا کر لی۔ حسن و عشق کے چرچے میں جب کچھ مزا نہ رہا تو تصوف نے ہماری غزلوں میں چاشنی پیدا کر دی۔ کسی شعر میں تصوف کی اصطلاح کا آجانا ہمیں وجد میں لانے کے لیے کافی ہے۔ مایوسی اور ناکامی، غفلت اور کاہلی کا سہارا اب یہی رہ گیا ہے۔ اور کیا ستم ظریفی ہے کہ ریا کا دشمن خود ریا کے لباس میں جلوہ گر ہے۔ اور اب تو اس کی "لے" اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ شاید چند روز میں ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اسکے لیے کوئی ڈگری قائم کرنی پڑے۔ غرض تصوف ایک قسم کی روحانی منطق ہے جو لفظی داؤں پیچ اور مبہم بیانات کا مجموعہ ہو گیا ہے ......"

(۳) اسی پرچہ میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کی ایک مختصر نظم بھی شائع ہوئی ہے۔ جسکا عنوان صبحِ بنارس (جوگی کی صدا) ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ نذر ناظرین کی جائے :-

(۱)

یہ ستھری ستھری آنکھیں
یہ لمبی لمبی پلکیں ......
یہ تیکھی تیکھی چتون
یہ سندر سندر روشن ..... ہائے سب مٹی ہے

(۲)

یہ گورے گورے گال
یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن
یہ ابھرا ابھرا جوبن ... ہائے سب ماٹی -

(۳)

کُل جھوٹا ہے سنسار
اک سچا ہے سرجن ہار

ہمایوں

ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی سابق مدیر "اکبر" (الہ آباد) نے ایک دلچسپ تاریخی و جغرافی مضمون بعنوان کوئٹہ، ہمایوں کی تازہ اشاعت میں سپردِ قلم کیا ہے۔ کوئٹہ برٹش بلوچستان کا ہیڈکوارٹر ہے۔ ۱۸۷۵ء سے قبل یہ ایک غیر معروف مقام تھا۔ ۱۹۲۶ء میں یہاں ریزیڈنسی بنوائی گئی، اُسوقت سے یہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ اسکا ماخذ زیادہ تر گزیٹیر ہے۔ حیرتناک امر یہ ہے کہ اب تک کوئی جغرافیہ کوئٹہ کا نہیں لکھا گیا۔ آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی ہے۔ انکے رسم و رواج عجیب غریب ہیں۔ طلاق وشادی کے مراسم حد درجہ مضحکہ انگیز ہیں۔ انکا لباس وغیرہ بھی نرالا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں فاضل وقائع نگار ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں:—

"..... یہ دُنبہ کو جلد سمیت کھا جاتے ہیں، ذبح کرنے کے بعد اسکی جلد کو جھلس دیتے ہیں پھر اُسے بھون لیتے ہیں۔ وہ چمچوں سے نہیں کھاتے اور نہ خوان پر برتن رکھتے ہیں بلکہ زمین پر رکھ کر ہاتھوں سے کھا جاتے ہیں۔ ان کا لباس بھی عجیب وغریب مناسبت کا ہوتا ہے۔ دیہاتی لبادے کی طرح ایک لباس پہنتے ہیں جس کی آستینیں ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی ہوتی ہیں۔ اسے یہ لوگ (پٹھان) اپنی زبان میں کوسی کہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک دوسرا لباس ہوتا ہے اور آستینیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، اسے صدری کہتے ہیں۔ امراء کشمیری شال کے جُبّے اور سمور و سنجاب کی پوستین پہنتے ہیں۔ اکثر قبائل سر نہیں مُنڈاتے بلکہ لمبی لمبی زلفیں رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں بہت لمبے ڈھیلے کُرتے پہنتی ہیں۔ کرتے کے سامنے ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکتی ہوئی لمبی جیب ہوتی ہے۔ دیہاتی عورتیں باہر بے تکلف گھومتی پھرتی ہیں، لیکن شہر میں پردہ کا خاص لحاظ رکھتی ہیں۔ ..... جو پہاڑوں میں رہتی ہیں، اکثر گھوڑوں کی دُموں کے بال کاٹ کر اپنے بالوں کے ساتھ ملا کر گوندھتی ہیں۔ قبیلۂ غلزئی کی عورتیں اپنی پیشانی کے بالوں میں چھلّے ڈال کر گھونگھر والے بناتی ہیں اور پیشانی پر جھالر کی طرح لٹکا دیتی ہیں۔ اکثر عورتیں موٹے موٹے چاندی، پیتل اور سونے کے چھلّے پہنتی ہیں ..... شادی کا عجیب طریقہ ہے۔ ..... پہلے ایک عورت کو بھیجکر لڑکی دیکھ لی جاتی ہے ..... جب لڑکی پسند کرلی جاتی ہے تو لڑکا اپنے والدین اور کچھ اعزا و احبا کے ہمراہ لڑکی کے باپ کے پاس جاتا ہے اور روپال "ولور" (نذر جو لڑکے کو دینا پڑتا ہے) اور تحائف کا جو باپ اپنی لڑکی کو دیتا ہے فیصلہ کیا جاتا ہے ..... سمدھیوں کی رضامندی پر ولور کی تعداد مقرر کی جاتی ہے، تب لڑکی کی ماں ..... وہ لڑکے کے باپ کو ایک سوئی جسکے سوراخ میں ایک ریشمی تاگا پڑا ہوتا ہے نذر کرتی ہے، اسوقت بندوقیں چھوڑائی جاتی ہیں، دُنبے ذبح کیے جاتے ہیں اور دعوت ہوتی ہے..."

اسکو "کرا" کہتے ہیں ..... ایک ماہ کے بعد دلور کی کچھ رقم ادا کی جاتی ہے، اور تب کچھ لوگ لڑکے کے اعزہ و احباب میں سے لڑکی کے باپ کے گھر پر جاتے ہیں، جہاں لڑکی کا باپ اُنکو ایک ریشمی رومال نذر کرتا ہے جس کا رنگ عموماً سبز ہوتا ہے اور جسکے گوشوں پر کوئی ریشمی پھول یا طلائی کام ہوتا ہے۔ اس رسم کو کوزدا کہتے ہیں .... اس موقع پر رقص و سرود کا جلسہ کیا جاتا ہے ..... کوزدا کے بعد دولہا کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ساس کی رضامندی سے اپنی دولھن سے (تو) مل سکتا ہے لیکن وہ ایسا علانیہ نہیں کر سکتا۔ اس خفیہ ملاقات کو "گلا گردنی" کہتے ہیں ..... اگر لڑکی اپنے باپ کے گھر میں حاملہ ہو جاتی ہے تو شادی کی تاریخ جلد مقرر کر دی جاتی ہے اور لڑکے کو جرمانہ (جس کی تعداد پچاس سے لیکر دو سو روپیہ یا اس سے زیادہ حسب حیثیت ہوتی ہے) دینا پڑتا ہے۔

..... طلاق کا عجیب طریقہ ہے اگر مرد کو یقین ہو جائے کہ عورت بدمزاج ہے یا اُس نے کوئی چوری کی ہے تو وہ تین کنکریاں یا تین مٹی کے ڈھیلے عورت کے پیچھے پھینک دیتا ہے جس سے وہ سمجھ لیتی ہے کہ اُسکو طلاق دیدی گئی۔ زانی عورتوں کو نہایت سخت سزا دیتے ہیں ..... نوجوانوں کو جب کسی حسینہ سے عشق ہو جاتا ہے تو وہ اُسکی محبت میں ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ عشق و محبت کے اظہار کے لیے اپنے بزرگوں اور ناصحوں کو بھی قتل کرنے میں ذرا لحاظ نہیں کرتے۔

نیرنگ خیال مولانا محمد علم الدین سالک بی اے پروفیسر السنۂ مشرقیہ دیو سماج کالج لاہور نے نیرنگ خیال کے ستمبر نمبر میں ایک نہایت دلچسپ مضمون "مغل باغات" کے عنوان سے شایع کیا ہے، اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ تیموریوں کے نقطۂ نگاہ سے ہر باغ میں حسب ذیل خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے اِن مغل باغات کو "فردوس نگاہ" و "جنتِ نظر" بنا دیا تھا۔

"..... (۱) فصیل بندی - یہ مغلوں کی اختراع فائقہ ہے ..... اُنھوں نے (قدیم) چار دیواری کو مستحکم فصیل سے بدل دیا ..... اُسکے چاروں کونوں پر ہشت پہلو یا مثمن برج بنا کر اُسکے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے۔ اِن برجوں کے اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں اور بیٹھنے کے لیے جگہ بھی بنا دی جاتی تھی۔ دیوار کے ایک سرے سے لیکر اخیر تک مضبوط کنگرے لگائے جاتے تھے جنسے فصیل کی ظاہری زیبائش بڑھ جاتی تھی۔ (۲) ..... مغل اپنے باغ عموماً مستطیل یا مربع رکھا کرتے تھے ..... خوبصورتی میں اضافہ کرنے کی خاطر ..... چھوٹے چھوٹے مربع حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ حصے "خیابان" کہلاتے تھے۔

..... (۳) مغل اپنے باغوں کو درجوں میں تقسیم کیا کرتے تھے ..... ایک دوسرے سے کئی کئی فٹ اونچے واقع ہوتے تھے ..... کہ ایک شخص پہلے درجہ میں کھڑا ہو کر تمام

درجوں کی سیر کر سکتا تھا اور لطف یہ کہ بادی النظر میں اسے تمام درجے یکساں و ہموار نظر آتے تھے (۴) .... ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ باغ کے عین وسط میں شاہی خاندان کی نشست و برخاست کے لیے ایک نہایت خوبصورت بارہ دری بنائی جاتی تھی۔ یہ عام طور پر سنگ مرمر یا سنگ موسٰی کی ہوتی تھی۔ اسکی عمارت باغ کی وسعت کے مطابق تعمیر کرائی جاتی تھی۔ ..... بارہ دری کے چاروں طرف حوض .... اور فوارے لگائے جاتے تھے۔ عین مقابل میں ایک آبشار بنائی جاتی تھی۔ یہ بارہ دری مربع شکل کی ہوتی تھی۔ (۵) .... باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے نہریں کھدواتے تھے .... اسکی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کا پانی باغ کے ہر تختہ میں چکر لگا کر ایک خاص مقام کی طرف نکل جائے .... ایسی نہروں کی تعمیر میں بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا ...... (۶) باغات پھلدار درختوں سے بھی مزین کیے جاتے تھے .... انکی ترتیب و تنظیم میں نہایت سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ عام طور پر ایک باغ میں ایک ہی قسم کے درخت لگائے جاتے تھے ...."

مرقع

جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) نے ایک دلچسپ تحقیقاتی مضمون "زندریزے" کے عنوان سے مرقع کے ستمبر نمبر میں شایع کیا ہے۔ ہوا سمندر اور زمین میں ہزارہا باریک اور زندہ اجسام وتحتًا موجود ہیں، جن کے متعلق ہم کو کچھ علم نہیں ہے۔ بعض کے متعلق کچھ علم اب ہوگیا ہے۔ انھیں کو علمی اصطلاح میں زندریزے کہتے ہیں۔ انگریزی میں ایک نیا علم مرتب کیا گیا ہے جسکو بیکٹریالوجی کہتے ہیں۔ اس میں ان چیزوں کی تحقیقات کی جاتی ہے۔ ایک جگہ پر مولانائے محترم تحریر فرماتے ہیں کہ

".... بعض زندریزے نقطہ کی طرح گول ہوتے ہیں، انکو نقطیے کہتے ہیں۔ بعض لکیر سے ہوتے ہیں، یہ لکیریے کہلاتے ہیں، بعض علامات سکون و جزم کی شکل کے ہوتے ہیں انکو جزمیے کہتے ہیں۔ بعض دریا کی طرح لہراتے نظر آتے ہیں، یہ لہرائی کہلاتے ہیں اور بعض پیچیدار شکل کے ہوتے ہیں انکا نام پیچاں رکھا گیا ہے۔ جب وہ دو مل کر رہتے ہیں تو دوگانے کہلاتے ہیں اور جب کئی کئی مل کر جمع ہو جاتے ہیں تو انھیں گچھا کہتے ہیں۔ کبھی کبھی انکی قطار زنجیر کی شکل میں دکھائی دیتی ہے اس صورت میں وہ زنجیریے کہلاتے ہیں۔ یہ مجموعے گویا زندریزوں کی بستیاں ہیں جن میں وہ ایک خاص طریقۂ انتظام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ پچیس ہزار نقطیے ایک ساتھ جمع ہوں اور ایک قطار میں رکھے جائیں تو ایک انچ سے زیادہ انکی لمبائی نہ ہوگی۔ بیس ارب زندریزوں کا وزن ایک دانہ خشخاش سے زیادہ نہیں ہوگا۔ طاعون کا زندریزہ اسقدر ننھا اور باریک ہوتا ہے کہ اگر وہ سوئی کی نوک کے ایک کنارے پر ہو تو اس نوک کے دوسرے کنارے

تک پہونچنے میں اسے وہی وقت پیش آئے گی جو ایک انسان کو صحرائے افریقہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچنے میں پیش آتی ہے ..... زندریزے مضر بھی ہیں اور مفید بھی۔ ہوا اور پانی کے ذریعہ ہم ہزاروں زندریزوں کو نگلتے رہتے ہیں اور اُن سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر بیماری کے زندریزے انسانوں اور حیوانوں کے اندر پہونچ کر انکی جسمانی ساخت کو تباہ کردیتے ہیں .... آٹے میں خمیر اُٹھنا اور نشاستہ کو شکر کی شکل میں تبدیل کرنا انھیں زندریزوں کا کرشمہ ہے۔ انکی پیدائش اور بالیدگی کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ ایک زندریزہ بیچ میں سے کٹ جاتا ہے اور اُسکے دو زندریزے بنجاتے ہیں۔ قدمیں یہ دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح دو کے چار اور چار کے آٹھ ہو جاتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں انکی تعداد ۲ لاکھ تک پہونچ جاتی ہے۔ اس حساب سے ہیضہ کا ایک جرثوم جب ترقی کرتا ہے تو ایک دن رات میں اسکی نسل کی تعداد چار ارب اسی کرور تک پہونچ جاتی ہے۔"

کیف — کیف کی جلد اول نمبر ۳ میں "معرفتِ دنیا و آخرت" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ ایک حصہ اس قابل ہے کہ پیش کیا جائے۔ معلوم نہیں اسکے مصنف کون صاحب ہیں۔ پہلے تو دھوکا ہوا تھا کہ شاید امام غزالی علیہ الرحمہ کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے؟

"...... انسان کو دنیا میں دو چیزوں کی حاجت ہوتی ہے، ایک تو وہ جو دل (روح) کی اسبابِ ہلاکت سے نگہداشت کرے اور اس کی غذا حاصل کرے؛ دوسرے وہ جسم کو مہلکات سے محفوظ رکھے اُسکو غذا بہم پہونچائے۔ دل کی غذا خدا کی معرفت و محبت ہے کہ ہر چیز کی غذا اپنی طبع کی مقتضی ہوتی ہے اور انسان کی ہلاکتِ دل کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ماسوا اللہ کی دوستی میں مستغرق ہو جائے۔ تعہد دل کی غرض محض دل ہونا چاہیے کہ تن فانی اور جسم باقی۔ جسم کی مثال اُس شتر کی سی ہے جو حاجی کو حج کے لیے لیجاتا ہے .... حاجی کو بضرورت چارہ اور محمل کی فراہمی کے لیے شتر سے شرط وفا باندھنا چاہیے تاکہ جب کعبہ پہونچ جائے اسکے رنج سے رہائی پائے ...... تمام عمر صرف جسم سے پیمان وفا باندھنے، غذا مہیا کرنے اور اسکو اسباب ہلاکت سے باز رکھنے میں بسر ہوگی تو وہ خود اپنی ذات کی سعادت سے محروم رہیگا۔"

مشیر قادری

رسیدِ کتب

۱-	سفرنامۂ اندلس با تصویر	مرتبۂ میرو پیر قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری روبکاری ریاست بھوپال	
۲-	تذکرۂ مشاہیر کاکوری	" مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی	سے،
۳-	سیر المہاجرین	" مولوی حاجی معین الدین ندوی	بھر
۴-	برہان (تفسیر سورۂ نور)	از خواجہ محمد عبد الحی فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	عدر

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(ستمبر ۱۹۲۷ء)

معارف - اعظم گڈھ

مدینۃ الزہراء
مرہٹہ ہیرو
عرب قدیم پر مستشرقین کی ایک نئی کتاب

اُردو (سہ ماہی) اورنگ آباد دکن

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی
قدیم اُردو

نگار - لکھنؤ

سحرالبیان
اکبر آئین اکبری میں

جامعہ - دہلی

فلسفۂ خودی
ہندوستان کا قدیم تمدن

مرقع - لکھنؤ

زندہ ریزے
افادات میر

ہمایوں - لاہور

حمدۂ حالی
طامس گرے کے کلام پر ایک تنقیدی نظر
کوئٹہ

نیرنگ خیال - لاہور

کیا مغلیہ غیر ملکی حکومت تھی؟
مغل باغات

مخزن - لاہور

دولت ترکیہ کی مختصر تاریخ
ادب لطیف

نیرنگ - رامپور

بہترین غزل گو
شرح خاقانی پر دوسری نظر

کیف - اجمیر

معرفت دُنیا و آخرت
پلاٹ کس طرح سوجھا؟

بیداریِ ہند

مہاتما گاندھی کے اخبار ینگ انڈیا سے ہندوستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہے اردو داں اصحاب بھی گذشتہ آٹھ سال میں اخبارات میں باربار اس کا نام سُنتے اور اُسکے مضامین کے تراجم و اقتباسات پڑھ پڑھ کے اس سے واقف ہوگئے ہیں۔ ینگ انڈیا کے مضامین کے دو مجموعے ۱۹۲۲ء میں شایع ہوے تھے، اب میرٹھ کے لالہ مقصدی لال ہندی نے اُنکو اُردو کا لباس پہنایا ہے، اور بیداریِ ہند کے نام سے شایع کیا ہے، جس کی پہلی جلد پیش نظر ہے۔ مہاتما جی جس طرح اپنی معاشرت، اپنے ضابطۂ اخلاق، اپنے مطمح نظر اور اپنے اصول کار کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام رہنماؤں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اُسی طرح اُنکی تحریروں اور تقریروں کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ مہاتما جی کی انگریزی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سلیس وپاکیزہ انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملوں، سادی اور مختصر عبارت میں وہ اہم سے اہم معاملات پر رائے زنی کرتے اور عمیق سے عمیق خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔ ادبی حیثیت سے اُنکی تحریریں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ہندوستان کے مشہور ترین انشاپردازوں کا تو ذکر ہی کیا خود انگلستان کے اہل قلم بھی اس قسم کی تحریروں کے لکھنے پر قادر نہیں۔ اس لیے اُنکے مضامین کا کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا قریب قریب محال تھا۔ لالہ مقصدی لال صاحب لایق ستایش ہیں کہ اُنھوں نے اس دشوار کام میں ہاتھ ڈالا اور اپنی محنت وعرقریزی سے اُردوداں اصحاب کو مہاتما جی کے خیالات سے براہِ راست آگاہ ہونے کا موقع بہم پہونچایا۔

ایک زمانہ تھا کہ سارا ملک مہاتما جی کے قدموں پر عقیدت وارادت کی نذریں پیش کرتا، اُنکے نام کی جے، ہر مجمع اور ہر جلسہ میں پکاری جاتی، اور اُنکے حکم کی تعمیل میں چھوٹے بڑے سبھی کوشاں ہوتے مگر موجودہ دورِ رجعت میں عام طور پر ہندو مسلمان کوئی بھی اُنکی تابعیت کے لیے تیار نہیں۔ جوش کی حالت میں جس طرح افراد کے لیے مشکل ہے کہ وہ صحیح توازن عقلی قائم رکھ سکیں اُسی طرح قومیں بھی کسی خاص جذبہ کے ماتحت جہد وعمل میں مصروف ہوں تو طریق کار کی نوعیت یا راہِ عمل کی حقیقت سے واقف ہونے کی اُنھیں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ مگر آج وہ جوش وخروش مفقود ہے اور اُسکے بجاے ایک قسم کا جمود وسکون اس ملک کے باشندوں پر محیط ہے۔ ایسے وقت میں مہاتما جی کی تحریروں کا ہندوستان کی مشترکہ قومی زندگی [illegible]

شایع ہونا ایک فال نیک ہے - جو اصحاب مہاتما جی کی تحریک میں شریک رہے یا کم سے کم اسکو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے رہے اُنکو ان تحریروں کی روشنی میں اپنے موجودہ خیالات اور طریق عمل کے جانچنے کا بہت اچھا موقع ہے کہ شاید اس کتاب کے مطالعہ سے پھر اُن میں وہی روح عمل کارفرما ہو جائے، جو ترکِ موالات کے عہد شباب میں سارے ملک پر محیط تھی - اور جن لوگوں نے اُس دَور میں مہاتما جی کی رایوں سے اتفاق نہیں کیا یا جنھیں بالکل اسکا موقع ہی نہیں ملا کہ انکی رایوں پر پوری اطلاع کے بعد سنجیدگی کے ساتھ غور کر سکیں، اُنکے لیے قومی بیکاری کے موجودہ لمحوں سے فائدہ اُٹھا کر ایک اپنے ایسے ہموطن کے افکار و خیالات سے واقفیت بہم پہونچانا غالباً بے محل اور غیر مفید نہ ہو جسے ہندوستان کے کثیر التعداد افراد اور یورپ و امریکہ کے بعض عقلا دنیا کا بزرگ ترین انسان تصور کرتے ہیں -

خیال تھا کہ بیداری ہند پر بہت تفصیل سے تبصرہ کیا جائیگا، مگر وقت نے مساعدت نہ کی اور وعدہ کی میعاد ختم ہو رہی ہے اسلیے سرسری تعارف پر قناعت کی جاتی ہے - پھر بھی ناظرین کی آگاہی کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کا مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے - کتاب کے دو جزو ہیں - فہرست مضامین کے بعد ۵۸ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جسکے ۱۹ صفحوں پر مترجم نے مہاتما جی کے مختصر حالات زندگی لکھے ہیں - اور بقیہ اوراق میں مہاتما جی کے متعلق امریکہ کے مشہور پادری ہیو رنیالڈ جیے اچ ہومز اور فرانس کے مشہور عالم مصنف رومین رولانڈ اور بعض دیگر انگریزوں، امریکنوں اور ہندوستانیوں کے پُر عظمت خیالات درج کیے گئے ہیں - صفحہ ۵۹ سے ینگ انڈیا کے مضامین کا ترجمہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۴۲۰ پر ختم ہوا ہے - یہ مضامین چار حصوں پر منقسم ہیں - حصۂ اول (۵۹ تا ۹۸) میں ستیہ گرہ پر، حصۂ دوم (۱۰۱ تا ۱۳۸) میں مظالم پنجاب پر، حصہ سوم (۱۳۹ تا ۱۹۰) مسئلۂ خلافت پر اور حصۂ چہارم (۱۹۴ تا ۴۲۰) میں عہد ترک موالات کے متعلق مضامین ہیں - آخری حصہ میں نصف کتاب پر حاوی ہے، پہلے ترک موالات کے ابتدائی ... متعلق تحریریں ہیں ... اسکے بعد انسداد شراب نوشی، کونسلوں، عدالتوں اور سرکاری مدارس کے مقاطعہ، سودیشی ... اور چرخہ کی اہمیت و ضرورت، قومی اتحاد اور اچھوت ادھار کے ضروری مباحث پر مضامین درج کیے گئے ہیں - اور اس طرح گویا ستیاگرہ اور ترک موالات یا عدم تعاون کے مصنف ... کی زبان سے اُسکی سہ سالہ جد و جہد کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے - جس کا مطالعہ مستقبل کے لیے شاہراہ عمل متعین کرنے میں موافق و مخالف دونوں کے لیے اُمید ہے کہ نافع و مفید ہوگا - ملنے کا پتہ دار الاشاعت بیداری ہند میرٹھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۳ — دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

ماہیتِ مادّہ

موجودہ زمانے میں طبیعی سائنس کی ترقی حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ کوئی سال نہیں گزرتا جس میں کوئی نہ کوئی مہتم بالشان ایجاد نہ ہوتی ہو۔ ماہیتِ مادہ کی تحقیق بھی زمانہ حال کا ایک کارنمایاں ہے۔ اس مضمون میں ہم یہ بیان کریں گے کہ گذشتہ صدی کے محققین کا مادہ کے متعلق کیا تصور تھا۔ اور پھر ان معلومات کا ذکر کریں گے جن کی بنا پر اُس تصور میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اُنیسویں صدی کو مادیت کا زمانہ کہتے ہیں۔ اُس زمانے کے کثیر التعداد علما کا خیال تھا، کہ ہر ایک چیز کی علت مادہ ہے۔ حتیٰ کہ دماغ کے عمل مثلاً شعور اور تخیل بھی مادہ کی خاص ترکیب سے ظہور میں آتے ہیں۔ تجربات کے ذریعے مادے کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں ثابت کی گئی تھیں۔

۱۔ قانون بقائے مادّہ۔ اس قانون کا مفہوم یہ ہے کہ مادے کی مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی شروع سے جتنا مادہ موجود ہے، ہمیشہ اُتنا ہی رہیگا۔ ہم نہ کسی طرح مادہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اُسے فنا کر سکتے ہیں۔ کیمیائی ترکیب و تجزیے میں مادی اشیاء کی خاصیات بدل جاتی ہیں، مگر مادہ کی مقدار میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مادہ کی مقدار کا نام کمیت رکھا گیا۔ اس تصور کے مطابق کسی چیز کی کمیت مستقل ہوتی ہے۔ وہ نہ کم ہو سکتی ہے اور نہ زیادہ۔

۲۔ تمام عالم کی مختلف مادی شکلیں سادہ اکائیوں کی بنی ہوئی ہیں۔ جنکو عنصر کہتے ہیں۔ بہت سی

چیزیں جو ہمارے روزمرہ استعمال میں آتی ہیں، سادہ عناصر ہیں۔ ان مفید عناصر میں دھاتیں، مثلاً لوہا، تانبا، جست، سونا، چاندی شامل ہیں۔ مزید براں کاربن، گندھک، آکسیجن، فاسفورس وغیرہ بھی کارآمد عناصر ہیں۔

لیکن بہت سی اشیا جو ہمارے کام میں آتی ہیں، مرکب ہیں جو دو یا زیادہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے بنی ہوئی ہیں۔ عام اور کثیر الاستعمال مرکب پانی، نمک، شکر، کپڑے، مکانات کا تعمیری مصالحہ پودے اور حیوانات ہیں۔ ان میں بعض کی ترکیب سادہ ہے، یعنی وہ صرف دو عنصروں کے ملنے سے بنے ہیں۔ مثلاً پانی، آکسیجن اور ہائڈروجن کا مرکب ہے اور نمک ہائڈروجن اور کلورین کا۔ مگر بعض مرکبات کی ترکیب میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔

مرکب بیشمار ہیں۔ لیکن جن عناصر کی ترکیب سے وہ بنے ہوئے ہیں، اُنکی تعداد محدود ہے۔ جدید تحقیقات کی رُو سے کُل عالم میں ۹۲ عناصر ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات ان دعاوی کو غلط قرار دے مگر جہاں تک ہمارا علم ہے، ہائیڈروجن سب سے ہلکا عنصر ہے اور یورینیم سب سے بھاری۔ ان دو حدود کے درمیان سائنس کا دعویٰ ہے کہ ۹۲ عناصر ممکن ہیں۔ ان سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

۱۹۲۷ء تک ۹۲ میں سے ۸۸ عناصر معلوم ہوچکے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں پروفیسر ناڈک (جرمنی) نے دو اور عنصروں کی دریافت کا اعلان کیا۔ ان کے نام بھی رکھے گئے۔ مگر پروفیسر موصوف کے نتائج کی کُلی تصدیق نہیں ہوئی۔ اگر تحقیقات سے یہ دو عنصر بھی ثابت ہوگئے تو ہمیں ۲ پہلے سے [illegible] ۹۵ عنصر معلوم ہوں گے۔ باقی دو عنصروں کی تلاش جاری ہے۔ جب وہ دونوں معلوم ہوجائیں تو عناصر کی تعداد مکمل ہوجائے گی۔

۳۔ عناصر کو کائنات کی تعمیری اینٹیں کہتے ہیں۔ کیونکہ کائنات کی عمارتیں انھیں اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک عنصر کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کا نام جوہر یا جزوِ لایتجزّیٰ رکھا گیا۔ کیمیائی ترکیب میں ایک عنصر کے ایک یا زیادہ جوہر دوسرے عنصر کے جوہر کے ساتھ پیوست ہوکر مرکب کا ذرّہ بن جاتا ہے۔ اس ذرہ کا نام سالمہ رکھا گیا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ میں بیشمار سالمات ہوتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کی تحقیقات کے مطابق جوہر ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ ہر ایک عنصر کا جوہر دیگر عناصر کے جوہروں سے مختلف ہوتا ہے۔ جوہروں کے باہم ملنے سے مرکب بنتا ہے اور مرکب کے جوہر الگ [illegible] بلکہ جوہر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ایک عنصر کے جوہر

کو کسی اور عنصر کے جوہر کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں - ہر ایک قسم کے جوہر کی اپنی اپنی خاصیات ہیں - اس تصور کے مطابق قلب ماہیت یعنی ایک عنصر کا کسی اور عنصر میں تبدیل ہونا بالکل ناممکن ہے۔

لیکن بیسویں صدی کی تحقیقات نے ان سب خیالات کو بدل دیا ہے :

برقیے - ایک شیشے کی نلی لے کر اُس کی ہوا خارج کرتے ہیں - حتی کہ ہوا کی نہایت ہی قلیل مقدار اُس میں رہ جائے - اُسکے دونوں سِروں میں پلاٹینیم کے تار لگاتے ہیں اور تاروں کے اندر کے سرے چپٹے کر دیتے ہیں - پھر تاروں کا تعلق ایک آلۂ برقی کے ساتھ کر دیتے ہیں ، تو منفی برقیرہ (جو تار برقی مورچے کے منفی قطب کے ساتھ ملحق ہوتا ہے) سے شعاعیں نکلتی ہیں - یہ شعاعیں خطِ مستقیم میں گذرتی ہیں - تجربوں سے ان شعاعوں کی اور خاصیتیں بھی معلوم کی گئی ہیں جن میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ مقناطیسی اثر سے ان شعاعوں کی سمت بدل جاتی ہے - مزید براں برقی اثر سے بھی ان کی سمت بدلتی ہے نیز جس جسم پر یہ شعاعیں پڑتی ہیں - اُس میں منفی برقی قوت بھر جاتی ہے - اس وجہ سے انھیں منفی شعاعیں کہتے ہیں -

برقی اور مقناطیسی اثرات سے شعاعوں کا جو انحراف ہوتا ہے اُسے ناپا گیا اور یہ ثابت کیا گیا کہ شعاعیں فی الواقع نہایت ہی چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں - جو تیز رفتار کے ساتھ منفی برقیرہ سے خارج ہوتے ہیں اور اُن میں منفی برقی قوت ہوتی ہے - ان ذرّوں کا نام برقیے رکھا گیا - انحراف ناپ کر برقیوں کی کمیت اور رفتار دونوں معلوم کی گئیں - برقیے کی کمیت ہائڈروجن کے جوہر کی کمیت کا بھی $\frac{1}{1830}$ حصہ ہے -

تمام عناصر کے جوہروں میں سے ہائڈروجن کا جوہر سب سے ہلکا ہے - لیکن برقیہ کی کمیت ہائڈروجن کے مقابلہ میں بھی بہت ہی قلیل ہے - اور چونکہ برقیے منفی برقیرہ میں سے خارج ہوتے ہیں - اس لیے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مادّہ کی ساخت میں برقیے بھی شامل ہیں -

پروٹان - مذکورۂ بالا نلی میں منفی شعاعوں کے مقابل مثبت برقیرہ میں سے اور قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں - ان شعاعوں کا بھی احتیاط سے مطالعہ کیا گیا ہے - معلوم ہوا ہے کہ یہ شعاعیں مثبت برقی قوت سے بھرے ہوئے ذرات ہیں - ان کی رفتار منفی شعاعوں سے تو کم ہے لیکن اسکے باوجود بہت تیز ہے - ان کی کمیت کیمیائی جوہروں کی کمیت کے قریب قریب ہوتی ہے - ان کو پروٹان یا مثبت برقیے کہتے ہیں - اور چونکہ یہ بھی مادی اجسام میں سے خارج ہوتے ہیں - اسلیے ہم قیاس کرتے ہیں کہ مادّہ کی ساخت میں پروٹان بھی شامل ہیں -

ماہیت مادہ

اس قسم کے تجربات سے ہمیں بتدریج یہ علم حاصل ہوا ہے کہ برق دو قسم کی ہوتی ہے منفی برق یعنی برقیہ اور مثبت برق یعنی پروٹان۔ اور کسی قسم کی برق نہیں ہوتی۔ مادی عالم ان دونوں کی ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ برقیہ اور پروٹان ایک جوہر سے بھی بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ دونوں کا وزن ہوتا ہے۔ پروٹان کا وزن برقیہ کے وزن سے ۱۸۳۰ گنا ہوتا ہے۔ مگر اسکی جسامت برقیے سے بڑی نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ جس طرح برقیہ منفی برق کی اکائی ہے۔ اسی طرح پروٹان مثبت برق کی اکائی ہے۔ ممکن ہے کہ پروٹان کی ساخت بھی ملتف ہو، مگر ابتک وہ ناقابلِ تجزیہ ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح اب تک برقیہ کا تجزیہ بھی نہیں ہوسکا۔

یہ بات یقین کے درجے تک پہونچ چکی ہے کہ برقیہ اور پروٹان دونوں کی ترکیب سے تمام مادہ بنا ہوا ہے۔ ان برقی اکائیوں کا صحیح حجم معلوم ہے۔ مگر ان کی شکل اب تک دریافت نہیں ہوئی۔ قدرتًا انکی شکل کروی تصور کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ ہر ایک پروٹان کی شکل ایک سی ہے۔ اور اسی طرح ہر ایک برقیے کی شکل ایک سی ہے۔

گو پروٹان کا وزن ہائڈروجن کے جوہر کے وزن کے تقریبًا برابر ہوتا ہے۔ لیکن اسکا حجم ہائڈروجن کے جوہر کے حجم سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ برقیے کا حجم پروٹان کے حجم کے قریب قریب برابر ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا وزن پروٹان کے وزن کا $\frac{1}{1830}$ حصہ ہے۔

اگر ایک اِنچ کے کروڑ حصے کریں اور پھر ہر ایک حصے کے لاکھ حصے کریں، تو وہ حصہ برقیے کے قُطر کے تقریبًا برابر ہوگا۔

چونکہ برقیہ میں برقی اثر ہوتا ہے، اس لیے اسکی کمیت رفتار پر منحصر ہونی چاہیے۔ جب برقیے کی رفتار زیادہ ہو تو برقی اصولوں کے مطابق اُسکی کمیت بھی زیادہ ہونی چاہیے مختلف تیز رفتاروں پر برقیے کی کمیت حساب لگا کر معلوم کی گئی۔ بعد ازاں ریڈیم وغیرہ اجسام سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتاریں اور کمیت دریافت کی گئیں۔ تو نتائج بعینہ وہی نکلے جو حساب لگا کر قرار دیے گئے تھے۔

مقدار مادہ کی رفتار سے زیادتی اصول اضافیت کے مطابق ہے۔ لیکن وہ اصولِ اضافیت دریافت ہونے سے پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ نظریۂ اضافیت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر ایک قسم کے مادہ کی کمیت رفتار کے بڑھنے سے بڑھتی ہے۔ یہ مزید دلیل اس امر کی ہے کہ ہر ایک قسم کا مادہ برق سے بنا ہوا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ جوہر برقیوں اور پروٹانوں سے مل کر بنے ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جوہروں کی ساخت کس قسم کی ہے۔ یعنی برقی اجزا کس طرح ترکیب پا کر جوہر بنتے ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق قیاس یہ ہے کہ جوہر کی ترکیب نظام شمسی کی سی ہے۔ جس طرح آفتاب کے گرد سیارے گھومتے ہیں، اسی طرح جوہر کے مرکز میں پروٹان اور برقیوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جسے قلب کہتے ہیں۔ اور اس قلب کے باہر کچھ فاصلے پر برقیے گھومتے ہیں۔ قلب کو بمنزلہ آفتاب کے سمجھو اور برقیوں کو سیارے۔

سب سے ہلکا عنصر ہائڈروجن ہے۔ اسکے جوہر کے مرکز میں ایک پروٹان ہوتا ہے اور اسکے گرد ایک تابع برقیہ حرکت کرتا ہے۔ جس طرح قمر زمین کے گرد گھومتا ہے۔ گویا ہائڈروجن کا نظام سب سادہ نظام ہے۔

بہت مدت سے یہ معلوم ہے کہ جس وقت ہائڈروجن پیدا ہوتی ہے تو اس میں ایسی خاصیات ہوتی ہیں جو بعد میں زائل ہو جاتی ہیں۔ یہ خاصیتیں ہائڈروجن کے جوہروں کی ہیں۔ جب ہائڈروجن پیدا ہوتی ہے تو اسکے جوہر الگ الگ ہوتے ہیں۔ پھر دو دو جوہر مل کر ہائڈروجن کے سالمے بنجاتے ہیں۔ ان سالموں کا مجموعہ معمولی ہائڈروجن ہے۔ ہائڈروجن کیمیائی تیزی کے لئے مشہور ہے۔ ذرا آگ دکھائی جائے تو بھک سے اڑ جاتی ہے۔ مگر ہائڈروجن کے جوہر اسکے سالموں سے بھی بہت زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ کافی قوہ کی برقی رو ہائڈروجن کے سالموں کو پھاڑ دیتی ہے۔ اس طرح سے جوہر کثرت سے حاصل ہوتے ہیں اور انکی خاصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

کسی عنصر کے جوہر میں اندرون قلب اور برقیوں کے علاوہ اور بھی برقی ذرات ہوتے ہیں۔ ان ذرات سے محض جوہر کے وزن میں زیادتی ہوتی ہے، اسکی خاصیات پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ان ذرات کو جوہر کا جامد سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ توجہ ان برقیوں پر ہوتی ہے جو باہر گھومتے ہیں، اور یا ان برقی ذرات پر جو اپنی کشش کی وجہ سے نظام قائم رکھتے ہیں۔

کسی جوہر کے پروٹانوں کی تعداد فوراً نکل سکتی ہے۔ یہ تعداد جوہر کے وزن جوہر کے برابر ہوتی ہے۔ دلچسپ کام تو یہ معلوم کرنا ہے کہ ان میں سے برقی یا کیمیائی طور پر موثر پروٹان کتنے ہیں اور بے تاثیر کتنے۔ خاص تصورات کی بنا پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ موثر پروٹان ایک سے ۹۲ تک ہو سکتے ہیں۔ عناصر کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ انکے جوہروں میں پروٹانوں کی تعداد مختلف ہے مثلاً آکسیجن کے جوہر میں ۸ پروٹان برقی طور پر متاثر ہیں اور ان کے گرد ۸ برقیے گھومتے ہیں۔ ان کے

علاوہ ۸۰ پروٹان جامد ہیں۔ ریڈیم میں ۸۸ پروٹان مصروف ہیں اور ۸۸ برقیے اُنکے گرد گھومتے ہیں۔ سب سے بھاری عنصر یورینیم ہے۔ اس میں ۹۲ مصروف مثبت و منفی برقیے ہیں۔ کسی معلومہ عنصر میں اس سے زیادہ تعداد نہیں ہے۔ ۹۲ ممکن الوجود عناصر میں سے ۹۵ دریافت ہو چکے ہیں۔

پُرانا خیال کہ عناصر کی ماہیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، غلط ثابت ہو گیا ہے۔ تمام مادی اشیا کی اصل برقیے اور پروٹان ہیں۔ قلبِ ماہیت کے متعلق یہ اعتقاد کہ وہ ناممکن ہے، نظریۂ جدید نے متزلزل کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر پارے کو لیں۔ اسکے جوہر میں ۸۰ موثر پروٹان اور ۸۰ برقیے ہوتے ہیں۔ اگر کسی طرح سے ایک پروٹان جوہر میں سے خارج ہو جائے۔ ۷۹ رہ جائیں گے۔ اور سونے کے جوہر میں ۷۹ پروٹان ہوتے ہیں۔ گویا اُس صورت میں پارہ سونے میں تبدیل ہو جائیگا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا عناصر میں قلب ماہیت ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر اس بات کا ثبوت مل جائے کہ عناصر میں خود بخود تبدیلی ہوتی ہے تو پھر یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کسی طرح سے عناصر میں قلب ماہیت کر سکتے ہیں یا نہیں۔

طیف نما۔ اس مسئلہ کی تحقیق سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مختلف عناصر کی شناخت کس طرح ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی عنصر نہایت قلیل مقدار میں کسی مرکب میں موجود ہو تو ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ عنصر موجود ہے

اگر آفتاب کی روشنی کسی باریک شگاف میں سے گزار کر ایک منشور شیشی پر ڈالیں تو شعلے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اس شعلے کو طیف نما میں دیکھیں تو دو زرد خط نظر آتے ہیں۔ نمک کی ترکیب میں سوڈیم شامل ہے۔ یہ دو خط سوڈیم کے متعلق ہیں۔ اگر سوڈیم کے کسی اور مرکب پر تجربہ کیا جائے، تو بھی یہی دو خط نظر آئیں گے۔ جب سوڈیم تیز گرمی سے بخارات بن جاتی ہے تو یہ دو خط ہمیشہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اسی طرح دیگر عناصر کے بھی خاص خط ہوتے ہیں۔ جس عنصر کو شعلے میں ڈال کر بخارات میں تبدیل کیا جائے طیف نما میں اُسی عنصر کے مخصوصہ خط نظر آئیں گے۔ اور چونکہ ہر ایک عنصر کے خطوط مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہم اگر کسی جسم کو تیز گرم کر کے طیف نما میں معائنہ کریں تو خطوط کو دیکھ کر فوراً معلوم کر لیں گے کہ اُس جسم کی ترکیب میں کون کون سے عنصر شامل ہیں۔

نورافشاں اجسام - پروفیسر رانجن نے ۱۸۹۵ء میں شعاع 'لا' معلوم کیں۔ ان شعاعوں کی یہ خاصیت ہے کہ کثیف یعنی غیر شفاف اشیا میں سے گزر جاتی ہیں۔ شعاعوں کے دریافت ہونے کے بعد یہ شوق پیدا ہوا کہ اس قسم کی شعاعیں کسی اور طرح سے بھی پیدا ہوتی ہیں یا نہیں۔

بکرل نے یورینیم کا ایک مرکب لیا اور اسے سیاہ کاغذ میں لپیٹ کر فوٹوگرافی کی پلیٹ پر رکھ دیا۔ چند دن کے بعد پلیٹ کا انکشاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس پر شعاعوں کا اثر ہے۔ اس تجربہ کو بار بار کرکے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ یورینیم میں سے "لا" شعاعوں کے مشابہ شعاعیں نکلتی ہیں جو سیاہ کاغذ میں سے گذر جاتی ہیں۔ جس جسم میں اس قسم کی شعاعیں نکلیں اسے نور افشاں جسم کہتے ہیں۔ اور اس خاصیت کا نام نور افشانی ہے۔ تمام اشیا جن میں یورینیم پائی جاتی ہے نور افشاں ہیں۔ اگر کسی جسم کو سرد یا گرم کیا جائے تو بھی اس خاصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان سب باتوں سے پایا جاتا ہے کہ نور افشانی مادہ کے جوہروں کی اندرونی خاصیت ہے۔ کیونکہ طبیعی اور کیمیائی تبدیلی سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔

ریڈیم۔ تحقیقات جاری رہی۔ اور کچھ مدت کے بعد میڈم کیوری نے ایک ایسا عنصر قلیل مقدار میں الگ کیا جس کی نور افشانی یورینیم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اس عنصر کا نام ریڈیم رکھا گیا۔

ریڈیم میں سے خارج ہونے والی شعاعوں کا غور سے معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تین قسم کی ہیں انہیں ا۔ ب اور ج شعاعیں کہتے ہیں۔ ان کی خاصیات مختلف ہیں۔ ج شعاعیں مقناطیسی اثر سے بالکل منحرف نہیں ہوتیں، اور اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ ٹین کی بہت موٹی تہ میں سے گذر جاتی ہیں۔ ب شعاعیں مقناطیس کے اثر سے ایک طرف کو جھکتی ہیں۔ ان کے انحراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ برقیے ہیں۔ وہ ٹین کی باریک تہ میں سے گذر سکتی ہیں۔

ا شعاعیں مقناطیس کے اثر سے دوسری طرف کو جھکتی ہیں۔ انکے جھکاؤ سے پایا جاتا ہے ان میں مثبت برقی قوت ہے۔ وہ غیر شفاف اشیاء میں سے گذر بھی نہیں سکتیں۔ فی الواقع ا شعاعیں [illegible]ہ کے ذرات ہیں۔ ا ذرہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیم کی قلیل مقدار میں سے لاکھوں [illegible]ات خارج ہوتے رہتے ہیں۔

رتھر فورڈ نے ا ذرہ کی کمیت معلوم کی تو وہ ہیلیم کے جوہر کی کمیت کے برابر نکلی۔ اس تجربہ کی بنا پر رتھر فورڈ نے قرار دیا کہ ا ذرات ہیلیم کے جوہر ہیں۔ جہاں کہیں نور افشاں جسم ہوتے ہیں وہاں [illegible]یم بھی ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ نور افشانی میں اجسام کے جوہروں میں سے [illegible]م کے جوہر خارج ہوتے ہیں۔

اسی شہادت پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ مزید ثبوت کے لیے ریڈیم کو پانی میں حل کیا گیا، اور پانی کو [illegible]ات بنا کر ایک بند برتن میں جمع کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان بخارات میں سے ا۔ ب اور ج تینوں [illegible]کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ گویا پانی کے بخارات کے ساتھ کوئی ایسی چیز برتن میں آگئی ہے جو نور افشاں

ہے۔ اسکو ریڈیم گیس کہتے ہیں۔

جب ریڈیم گیس تیار ہوگئی تو اُسکا طیف معائنہ کیا گیا۔ اُس میں ہیلیم کے مخصوص خطوط بالکل نہ تھے۔ تین چار روز کے بعد طیف کا پھر معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہیلیم نمودار ہوگئی ہے۔۔ اس تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ ریڈیم گیس کے تجزیہ میں ہیلیم پیدا ہوتی ہے۔

یورینیم، ریڈیم، اور دیگر تمام نورافشاں اجسام میں سے ا ذرات خارج ہوتے ہیں ا ذرات ہیلیم کے جوہر ہیں۔ نورافشاں اجسام کے تجزیہ میں جوہر پھٹ جاتے ہیں اور ہیلیم کے جوہر اُن میں سے نکل آتے ہیں۔ نورافشانی کا عمل ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ وہ یا تو خودبخود ہوتا ہے اور ورنہ تو ہوتا ہی نہیں۔ بہرحال وہ بہت زور کے ساتھ ہوتا ہے۔ جوہر اس طرح پھٹتے ہیں جیسے کہ ایک بم کا گولہ پھٹتا ہے۔ اور کئی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے اُن میں سے گولیاں نکلتی ہیں۔

ہیلیم کے ذرات خارج ہونے میں بہت سی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ ایک گرام ریڈیم میں سے چار دن میں اتنی حرارت نکلتی ہے جتنی کہ ایک گرام کوئلہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا ایک سال میں ایک گرام ریڈیم اتنی حرارت خارج کرتی ہے جتنی ۹۰ گرام کوئلے کے جلنے میں پیدا ہوتی۔ کوئلہ جل کر راکھ ہوجاتا ہے مگر ریڈیم ایک سال کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے۔ ریڈیم میں توانائی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو سالہا سال تک ختم نہیں ہوتا۔

ریڈیم کا وزن جوہری ۲۲۶ ہے اور ریڈیم گیس کا ۲۲۲۔ ریڈیم کے ایک جوہر میں سے جب ہیلیم کا ایک جوہر جسکا وزن جوہری ۴ ہے خارج ہوجاتا ہے تو ریڈیم گیس کا جوہر باقی رہ جاتا ہے۔ ریڈیم گیس میں سے ہیلیم کا ایک جوہر نکل کر ریڈیم ا اور پھر اُس سے ریڈیم ب اور ریڈیم ج حاصل ہوتی ہیں۔ ریڈیم ب اور ریڈیم ج کا وزن جوہری برابر یعنی ۲۱۴ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ریڈیم ب میں سے ایک برقیہ کے اخراج سے ریڈیم ج بن جاتی ہے۔

ریڈیم ج میں سے ا ذرہ اور کچھ ب اور ج شعاعیں نکل جاتی ہیں تو ریڈیم بنتی ہے۔ ریڈیم س کو پولونیم کہتے ہیں۔ پولونیم کا وزن جوہری $\frac{1}{2}$۲۱۰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پولونیم کے بعد کیا چیز بنتی ہے؟ یہ تو معلوم ہے کہ پولونیم میں سے ا ذرات نکلتے ہیں۔ اگر ہیلیم کا ایک جوہر پولونیم کے جوہر میں سے نکل جائے تو باقی حصہ کا وزن جوہری $\frac{1}{2}$۲۰۶ ہوگا۔

اگر یہ ایک ایسی چیز ہے جو تبدیل نہیں ہوتی تو بہت مقداریں ریڈیم کے ساتھ جمع ہوچکی ہونگی۔

پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ریڈیم سے ذرات خارج ہو ہو کر آخر میں سیسہ بن جاتا ہے
مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ کم از کم نور افشاں اجسام میں قلب ماہیت ہو رہی ہے۔

لبرٹری میں قلب ماہیت - اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا لبرٹری میں بھی ہم ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں بدل سکتے ہیں یا نہیں۔

مدتوں تک کیمیا داں اس کوشش میں رہے کہ کسی معمولی دھات سے سونا بنائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ "پارس پتھر" ہر ایک چیز کو سونے میں بدل دیتا ہے۔ پارس پتھر کی بہت تلاش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسکے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ہر ایک عنصر کا جوہر الگ ہوتا ہے اور ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں بدلنا ناممکن ہے۔ تو یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

اب ۱۰۰ سال کے بعد یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تمام عناصر ایک ہی قسم کے ذروں کے بنے ہوئے ہیں۔ اور قلب ماہیت ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے علمائے سائنس کی توجہ اس کام کی طرف پھر مبذول ہوئی ہے۔

پروفیسر ماتیھے Miethe (جرمنی) نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اپنے تجربات شائع کیے۔ کوارٹز کے لیمپ میں پارے کے بخارات تھے۔ اُس میں بہت تیز برقی رو گزاری گئی۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر ماتیھے نے دیکھا کہ کوارٹز کے اندر ایک باریک سی تہ جم گئی ہے۔ اُس کا امتحان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سونا ہے۔ پروفیسر ماتیھے نے تجربہ کئی بار کیا اور ہر بار سونے کی تہ نمودار ہو گئی۔ ان تجربات سے پروفیسر ماتیھے نے نتیجہ نکالا کہ تیز برقی رو کے اثر سے پارے کے کچھ جوہر ہیئت بدل کر سونے کے جوہروں میں تبدیل ہو گئے ہیں

جب یہ تجربات شائع ہوئے تو جاپان کے ایک سائنس داں نے اعلان کیا کہ میں نے اس سے پہلے پارے کو سونے کے ذرات میں بدل رکھا ہے۔ اس کے باوجود علمائے سائنس نے پروفیسر ماتیھے کے نتائج کو فوراً تسلیم نہیں کیا۔

امریکہ اور انگلینڈ میں تجربات کا اعادہ کیا گیا تو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پارے کو سونے میں تبدیل کرنے کے جو اعلانات شائع ہوئے ہیں اُنکی تصدیق باقی ہے۔

ڈاکٹر سمٹس Smits اور ڈاکٹر کارسن Karosen نے ایمسٹرڈم (ہالینڈ) میں اسی قسم کے تجربوں سیسے کو پارے میں تبدیل کیا ہے۔ اُنکے تجربوں کی تصدیق بھی نہیں ہوئی۔

رتھرفورڈ کے تجربات - قلب ماہیت کے متعلق رتھرفورڈ کے تجربات [illegible]
[illegible]

ذرات نہایت تیز رفتار کے ساتھ ریڈیم میں سے خارج ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض نائٹروجن کے جوہروں کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔ نائٹروجن کے جوہر کا قلب ہائڈروجن کے جوہر سے ۱۴ گنا بھاری ہے۔ اور ذرہ ہائڈروجن سے ۴ گنا بھاری ہے۔ اس لیے یہ تصادم کوئی معمولی تصادم نہیں ہے ٹکر سے نائٹروجن کا جوہر پھٹ جاتا ہے اُس میں سے دو پروٹان نہایت تیز رفتار کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ گویا دو تیز رو ہائڈروجن کے جوہر حاصل ہوتے ہیں۔ اور باقی قلب ہیلیم کے تین جوہر ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔

ان تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نائٹروجن کا جوہر ہائڈروجن اور ہیلیم میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ تمام تجربات کا احصل یہ ہے کہ تمام مادی عالم مثبت برق یعنی پروٹان اور منفی برق یعنی برقیوں کی باہمی ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ یعنی مادہ برق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مادہ اور توانائی۔ مگر اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ موجودہ تحقیقات نے مادہ کو توانائی کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

اب تک یہ خیال تھا کہ مادہ اور توانائی کا ایک دوسرے کے ساتھ صرف یہ تعلق ہے کہ توانائی مادہ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن توانائی بذاتِ خود کوئی مادی شے نہیں۔ اسکی بہت سی شکلیں ہیں۔ مثلاً متحرک جسم میں توانائی بالحرکت ہوتی ہے، کمانی میں توانائی بالقوۃ ہوتی ہے، عناصر میں کیمیائی توانائی مخفی ہوتی ہے جو کیمیائی عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔ حرارت، نور، آواز، برقی رَو، سب توانائی کی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی توانائی کا دوسری قسم کی توانائی میں استحالہ ہو سکتا ہے۔ مگر توانائی کی مقدار کم و بیش نہیں ہوتی۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ برقیہ کی کمیت اسکی رفتار پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر برقیہ کی رفتار کم ہو تو اُسکی کمیت کم ہوتی ہے، رفتار زیادہ ہو تو کمیت بڑھ جاتی ہے۔ کسی جسم کی توانائی بالحرکت بھی اُسکی حرکت پر منحصر ہوتی ہے۔ حرکت زیادہ ہوگی تو توانائی زیادہ ہوگی۔ برقیہ کی رفتار کی زیادتی سے اسکی توانائی بڑھ جاتی ہے۔ اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اُسکے مادہ کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ توانائی کی زیادتی سے مادہ کی مقدار کی زیادتی ہوتی ہے۔ یا یوں کہو کہ توانائی ہی کمیت ہے

تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ برقیہ کی کل کمیت اس میں برقی قوت اور رفتار کی وجہ سے ہے گویا برقیہ کی مقدار مادہ اُسکی توانائی ہی ہے اور کچھ نہیں۔

تمام مادی اجسام برقیوں سے بنے ہوئے ہیں اور برقیے محض توانائی ہیں۔ اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ مادّہ بھی توانائی کی ایک قسم ہے۔ ہر عنصر کا جوہر توانائی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ جوہروں میں توانائی کی مقدار کا اندازہ نور افشاں اجسام کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ جب نور افشاں جسم کا ایک جوہر پھٹتا ہے تو اُس میں سے توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار خارج ہوتی ہے۔ اور وہ جوہر اس عمل میں فنا نہیں ہوتا بلکہ دیگر عناصر کے جوہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک گرام ریڈیم میں سے سال بھر میں اس قدر توانائی خارج ہوتی ہے جس قدر کہ ۹۰ گرام کوئلہ کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔

مادہ اور توانائی کو ایک ہی قسم کی ہستیاں تصور کرنے سے بہت سی باتیں جو گذشتہ صدی میں ناقابل حل معلوم ہوتی تھیں، بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر قانون بقائے توانائی کو لو۔ جب کوئلہ جلتا ہے تو اُس سے توانائی کی ایک خاص مقدار پیدا ہوتی ہے۔ وہ توانائی کہاں سے آئی؟ اگر احتراق کے عمل میں توانائی پیدا نہیں ہوتی تو جب کوئلہ ٹھنڈا تھا اُسوقت توانائی کہاں تھی؟ اُنیسویں صدی کے حکماء کا یہ جواب تھا کہ توانائی اُسوقت بھی موجود تھی، مگر وہ نظروں سے نہاں تھی۔ ایسی توانائی کا نام اُنھوں نے توانائی بالقوہ رکھا تھا۔ فی الواقع توانائی بالقوہ منطق یا تخیل نے قائم کی ہے۔ اس کا وجود سوائے انسانی دماغ کے اور کہیں نہیں ہے۔

موجودہ اصول کے مطابق توجیہ نہایت آسان ہے۔ جب کوئلہ جلتا ہے تو اُس کوئلہ کی ایک نہایت ہی قلیل مقدار حرارت اور نور کی توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ برعکس اسکے جب سبز پتہ پھلتا ہے تو اُسوقت آفتاب کی توانائی سے مادہ بنتا ہے۔ ان حالات میں مادہ اور توانائی کی قلب ماہیت نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے کہ ہم اُسکی پیمایش نہیں کر سکتے۔

کوئلہ کے جلنے میں مادہ کی کمی نہایت ہی قلیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم تمام دنیا کے کوئلہ کا خرچ ذہن میں رکھیں تو وہ اس قدر قلیل نہیں رہتی۔ تمام دنیا میں جس قدر کوئلہ سال بھر میں جلتا ہے، اُسکے جلنے میں بارہ من کوئلہ فنا ہونا چاہیے۔ پس کوئلہ کے جلنے سے عالم میں مادّہ کی مقدار کم ہو رہی ہے۔

یہ پہلے سے معلوم ہے کہ توانائی کا غیر کارآمد شکل یعنی حرارت میں استحالہ ہو رہا ہے۔ اور اب یہ دریافت ہوا ہے کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہو کر کم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ مادہ کی مقداریں اسی طرح کمی واقع ہوتی جائے، اور آخرکار تمام مادہ فنا ہو کر توانائی بن جائے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

منہاج الدین ۔ اسلامیہ کالج ۔ پشاور۔

سوز و ساز

پسِ پردہ کس کا ہے منتظر تو بشوقِ جلوہ طراز ہو
میں خلیلِ کعبۂ عشق ہوں تو عزیزِ مصرِ حجاب [illegible] ہو

یہ مرا نیاز یہ بیخودی یہ ترا غرور یہ شوخیاں
کسی خستہ دل کے نصیب ہے تری عمرِ حسن دراز ہو

اسی کشمکش میں ہے زندگی اسی دار و گیر میں ہے مزا
کبھی غیظ ہو کبھی لطف ہو کبھی سوز ہو کبھی ساز ہو

وہ غضب کی شانِ جمال جب نظر آئی عالمِ ناز میں
کوئی فرطِ شوق میں کہہ اٹھا کہ تمہیں خدائے مجاز ہو

وہ عشق کو جو میں [illegible] دوں تو قدم قدم پہ سجود ہوں
ترا نقشِ پا ہو پڑا جہاں وہیں خم جبینِ نیاز ہو

مرے عشق کی ہیں جو عظمتیں نہیں آہ ان سے وہ باخبر
اسے اعتبارِ نیاز کیا جو اسیرِ عشوۂ ناز ہو

یہ صعوبتیں تو ہیں ابتدا یہ مصیبتیں تو ہیں [illegible]
ہوں کچھ اور دور پہ غم نہیں مری راہِ عشق دراز ہو

کوئی رمز ہے تو کچھ اور ہے جو چھپا ہوا ہے [illegible]
اسے خود نمائی سے کیا غرض جو خود آپ [illegible] ساز ہو

جو محبتوں کا حصول ہے وہی زندگی کا اصول ہے
ترے دل میں کچھ کبھی گداز ہو تو نصیب ذوقِ نیاز ہو

پھر اسی نوا کی تلاش ہے جو ازل میں [illegible]
مری روح جس سے ہے آشنا وہی نغمہ [illegible]

یہ مقدرات عجیب ہیں یہ محبتیں ازلی سی ہیں
یہ تڑپ نہیں ہے وہ ذوق جو رہینِ حسنِ ایاز ہو

محمود احسن صدیقی بی اے
(علیگ)

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے - دہلوی)

بسلسلۂ گذشتہ

۳ - ترتیب

شعرا و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابو الفداء کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا - نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر اُن کی صورت گھر میں دکھائی دیتی - اس لیے اُن سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا - بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آہی گئی - ۱۴ - رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا - نواب صاحب کو دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے - گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی - ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا - کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں - کوئی کہتا کہ بھائی کوئی ہوں، مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے " میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے - سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے - مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، شمعوں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے - صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے - مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے - یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں - گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا" کہاں وہ بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ؛ واقعی تمھارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اُٹھا " - چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی، جسکی وجہ سے در و دیوار پڑے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے - صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے - تختوں پر دری چاندنی کا فرش، اُس پر

دہلی کا ایک مشاعرہ

شیہ، پیچھے گاؤتکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں،
ں اور گلاسوں کی بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت،
ی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا
یہ سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اُسکے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز
تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے، فانوسوں
ا سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے
ے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جس کے کونوں پر مقیش کے گھنے
لح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے
اروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر، اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں
ڈکر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک سفید
ری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار
یوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک
ب پانی کا انتظام تھا؛ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی
ں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا
ن سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے
ام مکان مشک، عنبر، اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے
ے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی؛ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان
خرید ہو کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں
اُن پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔
دن کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہ پھولوں کی آ گئی تھی۔ خاصدانوں
ابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے
ی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے
چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں عرقِ کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا۔
ہو الف لیلہ کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اِس

[illegible] کا شاہی رنگ تھا۔ + بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہٖ اسی پر

تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعدادِ علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ بہت رحمدل، خوش خُلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دغل فصل نام کو نہیں ہے۔ ملّاح کہا کرتے ہیں کہ "کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اُترے سب سے پیچھے"۔ انھوں نے اس مقولے کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے، لیکن یہ ٹھیرے وضع کے پابند، جب سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھانک جھانک کر آسمان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اُٹھے، مگر ایسا اندھیرا گھُپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا، پاؤں کیچڑ میں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اُس کا جوتا کیا تھا لیتڑے تھے، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے؛ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعے پہونچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا، جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجو"۔ آگے چل کر اس بدمعاش نے انکو بہت دق کیا، اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپے مار لاتا، مگر انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی؛ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لبِ فرش ان کا استقبال کیا "میں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے"۔ مرزا رحیم الدین حیا انکے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے "نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہوکر آئے ہیں اُن کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں

نہیں لاتے، پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا، اور تخت کی قسم تو وہ نسخے بٹیروں کے بتلائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ اُستاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ بھائی بھئی کیوں نہ ہو، تیرہویں صدی ہے۔ اُن کو بنارس بھیج کر میں تو مصیبت میں پڑ گیا، ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی۔" یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو بچا کر ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی اُن سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمن احسان کو جھرمٹ میں لیے آ پہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو، جگت اُستاد ہیں۔ پہلے تو قلعے کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مرتے دم تک نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا، اپنے زمانے کے ملجم باعور تھے۔ لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ اُن کی اُستادی کا سکہ زمانے سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا قتیل کے اُستاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہو گئی۔ وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے، اس لیے اسی نام سے قلعے میں مشہور تھے۔ مصرعے پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا، اور سند ایسی تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے ملنے [illegible]

انھوں نے فوراً عرض کی

نامناسب ہے میاں وقت سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقت سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شُد حرص جواں می گردد   خواب در وقت سحرگاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا۔ شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح

---

* ...زی تھا: خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید میں ہی کل بادشاہ ہو جاؤں۔ اسی لیے قلعے کے سب لڑکے خواہ وہ شاہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی اناج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

اُڑایا ہے۔

اے خالِ رُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا　　　　پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا۔ ابھی انکو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ چُم ننگے، نشے میں چُور، جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں مگر عجیب حال ہے۔ کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں، اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی اُستاد ذوق کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے؛ لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کرلی۔ مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے"۔ کہنے لگے "اصلی رنگ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے، آپ بیٹھیے تو سہی"۔ خیر ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے اُن پر ایک دوشالا لاکر ڈال دیا، اُنھوں نے اُٹھاکر پھینکدیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے اُسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لالاکر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے۔ اُن کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسۂ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں انکی ذاتِ بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں اسلیے خود شعر نہیں کہتے، مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کردینا گویا اُسکو دوام کی سند دیدینا ہے۔ کوئی ۴۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نوناتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائی انکو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنے کو آئے، انکے علم اور رُتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دُور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگادی۔ اُنکو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملاکر اُنکی عزت افزائی

کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا۔ فرمانے لگے "میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا، تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام ہے، دیکھ کر دل خوش ہوگیا، خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے"۔ میں نے عرض کی "مولوی صاحب میں کیا اور میری بساط کیا؛ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے"۔ فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے۔ چلو، من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اُترے۔ میر، علائی، سالک اور مجروح اُنکے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر خاں مجروح کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے؛ معلوم نہیں کہ کیوں انکا ایکی پٹنے چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہوکر انکا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں۔ دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

آہ مجروح سجھے یارانِ وطن بھول گئے
نہ تو نامہ ہی نہ پیغامِ زبانی آیا

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے۔ آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا"۔ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السّلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "اے لیجیے مرزا صاحب وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں؛ دیکھیے آج کس کے چونچ مارتے ہیں"۔ میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے، پورب کے رہنے والے ہیں، دلّی میں آکر حکیم آغا خاں عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ اُنکے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورہ سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ انھی کی تجویز سے چگی ڈاڑھی رکھی۔ سر منڈا کر انکو عمامہ باندھا۔ اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہوگئے۔ انھی کے ذریعے سے دربار میں پہونچے اور طائر الارکین، شہپر الملک ہدہد الشعراء، منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو انکے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ گر بعد میں انھوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو آخر آخر سب کو ان سے نفرت سی ہوگئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اُڑنے کے خود اُن کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب علانیہ تو انکی مدد کر نہیں سکتے تھے، خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلّی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے، اس لیے

تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں پر ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسلیے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا "بھئی میں تو انکے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔ "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے پیر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ انکے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹِک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا"۔ غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام قلعہ انکے ساتھ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعے والوں اور اُن لوگوں میں جن کا تعلق قلعے سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی گلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت اُن لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہو گی۔ امیر تیمور سے لگا کر اسوقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعے بھر کا ایک ہی لباس تھا* مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب سے سلیمان شکوہ کا اودھ کے

---

* اس مضمون میں جا بجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں۔ انکی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی نہ تاتاری۔ کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سی لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے۔ اس کے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبائی تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گرجا کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا کسی رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی، اندر استر دے لیا، چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے، جسکو اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہے اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا اونچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے (پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے ٹھیک (عرشی) کے نوکیلے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ دمے کو اونچا کر لے (دیکھو صفحہ [illegible])

دہلی کا ایک مشاعرہ

دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں - جو وہاں جاکر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے - اس طرح کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو لیتا ہے نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا - اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان ہی کو دیکھ لیجیے: جو شاہزادے لکھنؤ جاکر آئے ہیں اُنکے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کُرتا، اور تنگ مُہری کا پیجامہ ہے - جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُنکے جسم پر وہی پرانا لباس ہے - سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اُسکے اوپر مخمل یا مکھی دار جامہ وار کی ختائی، پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک برکا پیجامہ - جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں اُنھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے، چہرے کی ساخت سے تو اُنکو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع ہو تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں -

اُستاد ذوق سب سے مل ملاکر شامیانے کی دائیں طرف بیٹھ گئے - مشاعرے میں شعرا کو

پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور اُنکے سل جانے کے بعد جو پہل پیدا ہوئے ہیں اُنکو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں - اس طرح بجائے چار پہل کے ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں - خوبصورتی کے لیے دموں کے کنارے پر پتلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں - بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوتی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے - اس قسم کی ٹوپی کسی طرح پہنی جاتی تھی - قلعے والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ انکو کسی قدر دبا لیتے ہیں - جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اُس کے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دُمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بنجاتے ہیں - اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اسکا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے - اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے - اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں - ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا، نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چُنٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا - دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پہ دھری رہتی ہے - ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشیہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں - اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں، لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے - گوشوں کے اوپر کے حصے نوکدار ہوتے ہیں - بس سمجھ لو کہ جیسے فصیل کے کنگرے - نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے - یہ ٹوپی قالب چڑھا کر پہنی جاتی ہے - قالب چڑھ کر بس ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد - عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا - بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں (دیکھیے صفحہ آیندہ)

سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے - نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جسکو جہاں چاہا

اور بعض سوزنی کے کام یا فیتہ کے کام کی ہوتی ہیں - اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھاکر پہنتے ہیں -

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے - انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے - چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے ، اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیے آستینیں بہت چُست رکھتے ہیں - اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اُلٹ لیتے ہیں - انگرکھے کے نیچے کُرتا بہت کم لوگ پہنتے ہیں - قلعے والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے - بہت تکلف کیا تو اُس کے حاشیوں پر سمور لگا لیا ، نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں - بٹنوں کی بجائے صرف ایک تُکمہ اور گُھنڈی ہوتی ہے ، جس کو "عاشق معشوق یا چشمے" کہتے ہیں - اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں - قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے ، مگر شہر والے اس کُھلے ہوئے نیمہ آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں - انگرکھے کے اوپر چوکور شامی رومال سموسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں - اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" کہتے ہیں - کمر میں بھی بتی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے ، مگر بہت کم -

پائجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے - اکثر گلبدنی ، غلطے ، مشروع ، موٹرے ، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے - پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر ہی کا پائجامہ پہنتے ہیں ، مگر تنگ موریوں کے پائجامے بھی چل نکلے ہیں - سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے ، پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں - شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر کا لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو - ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے ، تیل پلاتے ، مینڈھی مل کر باورچی خانے میں لٹکاتے ، یہاں تک کہ اُس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی ، اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے - جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے - جس کا دیکھو ، چوڑا سینہ ، پتلی کمر ، بنے ہوئے ڈنڈ - شرفا میں تو شاید ڈھونڈھے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو ، اور بانک ، بنوٹ ، اور لکڑی نہ جانتا ہو - بچپن ہی سے ان فنوں کی تعلیم دی جاتی ہے ، مقابلے ہوتے ہیں ، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں ، اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں -

---

بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ نہ شکایت - اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُنکے خیال میں اُسکو نہ بیٹھنا چاہیے تھا تو بجائے اسکے کہ اُسکو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی، ذرا ایک بات تو سننا" وہ آکر اُن کے پاس بیٹھ جاتا، اُس سے باتیں کرتے رہتے؛ اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جسکو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے اُس سے کہتے "تشریف رکھیے، وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا اور اسی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں - پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں- ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں کسی سے کہتے "صاحب عالم، اِدھر آئیے"۔ کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے "کہتے "بیٹھو، بھئی بیٹھو" - غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جنکا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اُستاد اور اُنکے شاگرد - ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں - یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعے میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں، بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی تھیں - ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے جھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بودی ہے - ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں ہیں - جہاں چاہا جھکڑا لیگئے اور پدڑیاں اُڑا دیں، ایسی سدھی ہوئی تھیں کہ جھکڑے سے ایک بھی کٹ کر نہیں جاتی؛ انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں، انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک بہادر بھی آپہونچے اُنکے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے - میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی - رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نراہٹ ہے - بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی- جسم میں ساسٹیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدن کا پیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال- ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ- شہر بھر میں انکی غزلیں گائی جاتی ہیں- غرض ہوا اور فرش سے ملا دیا- پہلے میاں داغ

اُترے، اور اُتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انکے بعد مرزا فتح الملک اُترے، اُنکا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اُدھر عصا بردار تو اُنکے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیے۔ اس سلیقے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت ہے"۔ سب نے کہا "بسم اللہ بسم اللہ"۔ اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھیے، تشریف رکھیے"۔ سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُنکے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے خوشنوایانِ چمنِ دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرہ کی میر مجلسی۔ محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اسکے لیے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اسکی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی۔ جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر و مباہات کا دروازہ

٭ مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد اُن کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا۔ اور اسی نسبت سے داغ قلعے میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا۔)

٭ نواب فتح الملک بڑے پکے مسلمان تھے، کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے سب قلعہ والے انکو "ملّا" یا "ملّاجی" کہا کرتے تھے۔

بند کردیا ہے، اسی طرح دو شمعوں کے پڑھنے کی وجہ سے جو تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے، لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اسکے بعد میں اپنی غزل عرض کرکے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہکر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اُٹھا کر اُنکے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہکر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعوں کو لیجا کر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باواز بلند کہا "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے"۔

اس آواز کا سُننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہو گیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھدیں، نوکروں نے جھٹ پٹ حُقّے سامنے سے ہٹا دیے اور اُنکی جگہ سب کے سامنے اُگال دان، خاصدان، اور بُن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواص بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوے قلعے سے آیا۔ اسکے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی "حاضرین! حضرت ظل سبحانی صاحبقران ثانی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ بنایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمائیے"۔

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاسِ ادب سے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ

سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا - اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے - کبھی کبھی کسی کے مُنہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بیخودی طاری تھا - مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا - ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا - باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اُٹھایا - لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے :-

نہیں عشق میں اسکا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دَورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم، کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُسکو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا - زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظلِ اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی - خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کُھبا جاتا تھا - مرزا فخرو نے کاغذ لے کر ادھر اُدھر دیکھا - ملوک العلی نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا "صاحب عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظلِ سُبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ اُن نوازشاتِ شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیجکر شرکاے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں، بارگاہِ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے"- مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا، اُس نے عرض کی "قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہِ عالی میں پہونچا دوں گا" - خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحبِ عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ - چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا - بس تم سے زیادہ موزوں

دہلی کا ایک مشاعرہ

دہ کون شخص مل سکتا ہے"۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا، اُس نے آداب کرکے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سُنائی

دل سے لطف و مہربانی اور ہے	مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے	عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے رُکتے ہیں اشک	بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے لے وارا وہ کب ہوتے ہیں صاف	اُنکے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا، البتہ غالب اور مومن بالکل چُپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواص تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دونوں شمعیں لاکر میاں کے سامنے رکھدیں صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملینِ فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بنظر اصلاح عرض کرتا ہوں"۔

۱۔	غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا	درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
۲۔	حال کھُل جائیں غیر کے سامنے	پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
۳۔	درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر	بات کیا جسمیں کچھ مزا نہ ہوا
۴۔	وہ تو ملتا پر اے دلِ کم ظرف	تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا
۵۔	شکوۂ یار اور زبانِ رقیب	کھیل ٹھیرا کوئی گلا نہ ہوا
۶۔	تم رہو اور مجمعِ اغیار	میرا کیا ہے ہوا ہوا، نہ ہوا
۷۔	پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو	زمزا اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو

اپنی غزل پڑھتے رہے، مگر ان دونوں کو انہی دونوں شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزا آگیا۔" اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اس بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے شاہزادے کے سامنے سے شمع اُٹھا، سامنے کی صف میں میاں بِل* کے آگے رکھدی۔ نام تو انکا عبد القادر تھا، مگر شہر کا بچہ بچہ اُنکو میاں بِل کہتا تھا۔ انکو اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو انکے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی، پہلوانی کی نسبت سے بِل تخلص رکھا تھا۔

---

* اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز آکر اکھاڑے میں خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گذرا۔ شیخو والوں کے اُستاد حاجی علی جان نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، مگر داؤ پیچ میں طاق تھا۔ اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں بِل نے حسب معمول شیخو والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار، پھیترا بدل سامنے آگیا۔ اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں بِل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ اُستاد علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے، یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اِس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا۔" کہنے لگے "اُستاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس لونڈے کو پِسوانے سے حاصل؟" اُستاد نے کہا "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا۔ یہی ہوگا نا، کہ ہڈی پسلی ٹوٹ جائیگی، دوسروں کو آیندہ کو کان ہو جائیں گے۔" ہر حال دونوں ہاتھ مل گئے، تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس مشاعرے کے دو ہی چار دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے۔ دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر اُس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں بِل کی بیجا دھینگا مشتی کی وجہ سے ساری دلی اُس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگھیے پہن (دیکھیے صفحہ ۳۴)

مضمون بھی رندانہ باندھتے ہیں۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدانِ کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ انکو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے
ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے

دل اسکے بے طرح ہے پھنسا زلفِ یار میں
نکلے یہ کیونکہ دیکھیے قیدِ فرنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا سبز رنگ نے
ساقی نے پشت دی ہے صافی کو بنگ سے

آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا
یاری تو تم نے کی ہے پر اُس شوخ و شنگ سے

انکی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اُٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی۔ یہ بڑے گوڑے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ اِدھر شمع رکھی گئی اُدھر نواب زین العابدین خاں نے

چادریں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا، دو چار ڈھیلیاں کھائیں، کچھ بڑھ کر مٹی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آ گئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا، سوئی بھی گرے تو آواز سُن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں پَل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا، یہ کمر پر آ گئے۔ وہ چٹ غوطہ مار، ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے اُس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاوزوری کر کے اُس کو دبا تو لیتے، لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اُس کو دبا ہی بیٹھے۔ وہ چپکا پڑا رہا۔ انھوں نے ہتھے کس لیے۔ تھوڑی دیر تک اُسکو خوب رگڑا، وہ سہے چلا گیا۔ انھوں نے پہلو میں آ کسکر اُس کا سینہ کھولنا چاہا۔ وہ بھی موقع تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے، اُس نے ٹانگ پر باندھ جو اُڑایا، تو میاں چاروں شانے چت جا پڑے۔ لونڈا اُچک سینے پر سوار ہو گیا۔ "وہ مارا، وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ، لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں پَل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اُٹھ، چادر اوڑھ، منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے اُنکی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے، ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے۔ تھے بڑے غیرتمند، وہ دن اور آج کا دن، پھر اُنکی صورت نظر نہ آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

آواز دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً تاروں بھری گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اُس کو اوڑھا، ایک پلّو کا بکّل مارا دوسرا پلّو سامنے پھیلایا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑ لڑا کر اور اَڑ اَڑا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نزنت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کریگی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی کو جلانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا مگر جو ریختے کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جو اس تاکا	ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو	نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں تاکا تو اب تاکا
اگر اے نازنیں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے	چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دولہا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلی صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اسی طرف کا نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰)

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے اُستاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ لکھا ہے:—

فقط تو ہی نہ میرا اے بُتِ خونخوار دشمن ہے
ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ انکے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبداللہ خاں اوج کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پُرانے ۴۰، ۴۵ برس کے مشّاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی انکی سمائی مشکل ہے، اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو انکے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے، ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف

دہلی کا ایک مشاعرہ

لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آکر صفِ مجلس سے گز دو گز آگے نکل جاتے ہیں۔ انکے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر اُستاد بھی انکو اُستاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل ہوتا ہے جو انکو دیکھ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر اُستاد ذوق یا مرزا غالب

[۱۴۔ رجب ۱۲۶۱ ہجری کے مشاعرے میں شعراء کی نشست کا نقشہ]

ایجاد — حشمت — اشکی — فسوں — ماہر — نالاں — تسلی — شوق — بیدل — بسمل

رسا — رفعت — قناعت — حیا — ظہیر — صابر — داغ — احسان — ذوق — ظفر — غالب — مومن — آزردہ — شیفتہ — صہبائی — عیش — عارف — درخشاں — علائی — سالک

بیتاب — حضور — برق — میر صاحب — شور — آزاد — ثاقب — تسکین — تشنہ

جعفری — تنویر — یکتا — جوش — تجلی — کامل — قلق — تصویر — اوج — نازنین

عمل — عاشق — تمکین — تابش — اوج — تعشق — رقم — عزیز — شہرت — حزیں

نے داد دی - داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور انکے تیور بدلے - انکے غصے کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و نا چار تعریف کرنی پڑتی، تب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے - غزل ہوئی تھی

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا — بے پل صراط اُترے یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سرائے نفرت — سُم میں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا
کسبِ شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل — سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی میں باگ توڑتا ہوں — (رکھ کے) دیوی کے آستاں پر سمیں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے - کہنے لگے واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے - بھئی واللہ "الفاظ" رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں - یہ سب کا فر ہیں جو تمھیں اُستاد کہتے ہیں، میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپا ہوے جاتے ہیں - جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی - اُنکی عمر کوئی ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی - مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں - غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے - بات کرنے میں مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں - نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہونگے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے - غزل کہی تھی

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہردم پناہ تھا — کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہو جو ترا عشق بے حیا — ق آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکیں کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی - قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا - اُستاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے - مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ، بے اُستاد رہے تو بھٹک نکلو گے" - میاں تمکین نے مسکرا کر کہا "اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں - کل ہی انشاءاللہ اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں" - اُستاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا - بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے" - یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہونچ گئی - ان کو میاں بنّن بھی کہتے ہیں - الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت

غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے، بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آملے بھاری بدن، منڈھی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ، جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پائجامہ، اور پر سوسی ہی کا کرتا، کندھے پر بیٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی، بیچارے پنچ بندی پر گذر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں، اس لیے جو کچھ کہتے ہیں دل و دماغ میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یادداشت بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں، اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ انکو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی:

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب　　　وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی　　　اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا تو نہ کھنچیے صاحب　　　آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو　　　آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ، واہ، سبحان اللہ، کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھکر کہا "خاں صاحب! یہ میاں بجن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک انکے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بیساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہاں میاں بجن وہ شعر کیا تھا؟" میاں بجن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آگیا۔ مطلع تھا

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی　　　پہلو سے دل میں، دل سے کلیجے میں جا لگی

اور شعر یہ تھا:

دامن پہ وہ رکھنے نہ رکھنے دل رُبا لگی　　　لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں بجن! یہ خدا کی دین ہے، یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اسوقت دل خوش کر دیا۔"

اسکے بعد شیخ محمد جعفر آتش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، کچھ عرصے سے یہاں آ رہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری نے دلی لگا دی ہے۔ کوئی مشاعرہ نہیں

ہوتا جہاں نہ پہونچتے ہوں - غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں :-

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے   تو یہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو، پہ اے تابش   وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش بن پڑی ہے کہ سب کے مُنہ سے بیساختہ واہ، واہ نکلی - مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے -

تابش کے بعد اُلٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی - خدا ان سے محفوظ رکھے، بڑے چالاک آدمی ہیں - عبد العلی نام ہے، مدراس کے رہنے والے ہیں، کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے، بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے - ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا - انکی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں - شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں مگر دل کا خدا مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں - لکھا تھا

خم شراب سے خُم گردوں تو بن گیا   ساقی بنا دے ماہ پیالہ اُچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو   جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے گئی - انکی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جنکی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے :

آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہے   کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں   موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

انکے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی - یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص کرتے ہیں - مشاعرہ میں بھی اونچی بنکر آئے ہیں - غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں - کچھ تو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ کی جھلک ہے - انکی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں

مژگاں سے گر بچے دل ابرو کرے ہے ٹکڑے   یہ بات میں نے کہکر جب اُس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جسوقت ہو وے خالی   تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم محمد نشتر کے پڑھنے کا نمبر آیا - یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں - ۶۳ - ۶۴ برس کی عمر ہے - حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے - غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں - گرانے

---

* آیندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی طرف کی، بس یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا -

آپ نوبت دُور کھینچتے ہیں، اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں اُسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر بُرا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے مُنہ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی انکا کلام دیکھ لیجیے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر　　رحم اے فتنہ گر نہیں آتا

وعدۂ شام تو کیا لیکن　　کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تیرے بیمار کا ہے یہ عالم　　ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ انکے دل کو نہ لگی، اس لیے ذرا آزردہ ہو گئے۔

انکے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم　　یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلی نے　　کفن میں کھول دیں آنکھیں سُنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریفیں ہوئیں کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ انکو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تانتا باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی

بُجھانا آتشِ دل کا بھی کچھ حقیقت ہے　　ذرا سا کام تجھے چشمِ تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے　　گیا ادھر جو گزر پھر اُدھر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اُس مریض کی تیرے　　نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اسکی اُنھوں نے بہت تعریف کی۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی کہا "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو، دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو اُستاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ انکی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ انکی سخن گوئی

اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے، مگر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے۔ ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو:—

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
لے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے

اسکے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے! کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ کہتے ہیں:—

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا

کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا
منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا

ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پہ نماز کا

مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا
اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورتِ نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا "بھئی صہبائی، تمھارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے، خدا اسکی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا لگتا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو، ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین گویا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ سرکار سے خطاب پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان کے تلمیذ تھا، آجکل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے [illegible]

کہنا آیا ہے نہ آئیگا - میرا تو بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی - بڑے جلے ہونگے - بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرتا

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں — تو آسماں ہیں دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے — لب پہ ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر — آساں اگر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جسکے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے - یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت - گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر - بڑے بنے سنورے رہتے ہیں - پہلے انھی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے عرصہ سے بند ہے - مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں - کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں - بڑی پاٹ دار آواز ہے' پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے - ہر شعر پر تعریفیں ہوتیں اور کیوں نہ ہوتیں ہر شعر تعریف کے قابل تھا - غزل یہ ہے :-

ایک دن دو دن، کہاں تک تو بھی کچھ نقصان کر — یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہوگیا
ہے ترقی جوہرِ قابل ہی کے شایاں کہ میں — خاک کا پُتلا بنا، پُتلے سے انساں ہوگیا
کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بندِ نقاب — اسکے کُھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا
پہلے دعوےٰ خدائی اُس بتِ کافر کو تھا — کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہوگئے ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے " واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا، شعر کیا ہے اعجاز ہے - یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے - ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوےٰ خدائی اُس بتِ کافر کو تھا، کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا" - غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کردی تھی - لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سُناتے، مزے لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے - بڑی دیر میں جاکر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خاں تنویر کے سامنے گئی - یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے - بادشاہ سلامت انکو بہت عزیز رکھتے ہیں - میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ انکی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سُنی - غزل بھی معمولی تھی - صرف یہ قطعہ خاصہ تھا :-

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپِ غم — کہتا لوگوں سے وہ بنا ہر بتِ عیار ہے کیا

رنگِ رخ زرد ہے، تر چشم ہے، لب پر دم سرد — پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضعدار آدمی ہیں۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے

سبو سے منہ لگا بیٹھے اب اتنا صبر ہے کس کو — کہ بھر لے خُم سے بے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اُس روز مشاعرے میں پڑھی تھی اُسکے یہ دو تین شعر اچھے تھے:۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں — اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل
جل جل کے آخرش تپشِ غم کے ہاتھ سے — اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دکھلا رہا اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا — اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

اسکے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جسکا بھائی شاعر، جسکا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعرا نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعرا قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ انکی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ دو شعر لکھے ہیں:۔

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ — اے خدا ترس تو کہتے ہیں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر — نازِ ہر گل نہ اُٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دلی سے اُٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اسکو اب چھوڑتے جاتے ہیں۔

اسکے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار اُنکے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی۔ اور کہا "میں بھی کچھ عرض کروں"۔ سب نے کہا "ضرور فرمائیے"۔ انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی:۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع بھی گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر میاں تشنہ ہاتھ ٹیکتے ہوئے، اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اُسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ انکی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ واقعی کچھ بھی نہیں۔

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے"۔ شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد انکا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نومشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو:

دل تو نے ہم سے او بتِ کافر اُٹھا لیا — اس نازکی پہ پوچھ یہ کیونکر اُٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اُٹھا لیا
پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اُٹھا لیا

بہرحال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا۔ کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہونچ گئی۔ انکی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہوگی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ انکا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے؛ انھی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں۔ شعر بھی برا نہیں کہتے۔ لکھا تھا:-

۱- ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیِ دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
۲- شبِ وصال میں سُننا پڑا فسانۂ غیر — سمجھتے کاش نہ اپنا وہ رازدار مجھے
۳- وہ اپنے وعدہ پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے
۴- مرے تصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — دکھانا تھا تماشائے روزگار مجھے
۵- مزے یہ دیکھے ہیں اعجازِ عشق میں تسکین — کہ سوجھتا نہیں اپنا نال کا [illegible] مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے۔ اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، اُنھوں نے یہ غزل پڑھی :-

نگہ کی، چشم کی، زلفِ دوتا کی
ہے اک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گُل کی گلی تک جاسکے ہے
ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی

بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل
تمھیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھسپھسی تھی، بھلا اسکی کون تعریف کرتا - ہاں اسکے بعد جو غزل محمد حسین تائب نے پڑھی اُس میں مزا آگیا - میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے بھتیجے ہیں، اور فخرالشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد - چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ - اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی - غزل تھی

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا
پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا

کہیے اُس بت کو ثنا ہم کس کے
دیکھ کر جسکو خدا یاد آیا

عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ
آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے - جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بیچارے بڈھے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیزآبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں اُستاد ذوق نے انکو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی بھروسے پر یہ اپنے آپ کو اُن کا استاد کہا کرتے ہیں - اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں - غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا، باقی اسداللہ خیر صلاح لکھا ہوا ہے یہ اُس مہ جبیں کے پردے میں
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے میں

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی غرض جتنے اُستادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی - وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں - ذرا کسی نے واہ واہ کی، اور انھوں نے اُستاذ ذوق کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھا! شعر یوں کہتے ہیں"- وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے - اُنکے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا، مگر انھوں نے روک دیا -

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی - انکا نام الگزنڈر ہیڈرلے؟

قوم کے فرانسیسی ہیں۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہوکر الور گئے۔ کوئی ۶۲ سال کی عمر ہے، ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے، لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:۔

وہ گرم روِ راہِ معاصی ہوں جہاں میں — گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

کچھ پانوں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی — ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا

جہلم کو عیادت کیلیے وہ مری آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بیخبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی۔ بیچارے غریب صورت، فرسودہ لباس کوئی ۶۴، ۶۵ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانہ کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف میں جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُنکو دہلی میں کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھیے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر چڑھی ہے حضرتِ دل — پانوں پر اُسکے سر دھرو تو سہی

جب کہا میں نے تنبیہ مرتا ہوں ق — تم گلے سے مرے لگو تو سہی

بولے وہ کیا مرنے کی باتیں ہیں — خیر ہے کچھ، پرے ہٹو تو سہی

غیر کی کل وہ لگ کے چھاتی سے ق — مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی

اس لیے اسکے ہم گلے سے لگے — کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی۔ اسکے بعد جو دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہوگئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کول کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں اور نام جان جیمس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں، ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض　　　دیکھے سے اسکے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا　　　ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا　　　جس طرف سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

اسکے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی۔ بھلا اس نوّے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو انکو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی یادِ آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے　　　شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اس بُت کے سایہ پر بھی مجھے　　　رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہونچ گئی۔ شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں۔ بعض نے اُٹھ اور پانی کا چھپکا منہ پر مار آ بیٹھے۔ کیسی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو ابتک ایک پہلو پر بیٹھے تھے، انھوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا "میر صاحب یہ ٹھیک نہیں، آپ تو بیچ میں آکر پڑھیے"۔ یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دونوں شمعیں اُٹھا کر وسط صحن میں رکھدیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ عین شامیانے کے سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کونسا مشاعرہ ہے جو انکی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں انکے قدم کی برکت سے رونق نہیں آجاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں، ہم نے تو جب سُنا انکا نام میر صاحب ہی سُنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے، بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں، غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بٹیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، اونچا قد، غرض ان کے حُلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا بتا دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک برکا پیجامہ، سفید کرتا، اُس پر سفید انگرکھا۔ سر پر ارخچیں کی ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا، اور یہ بھی تڑسے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جائے۔ اس سے انکو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں بادشاہ سلامت

سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی۔ مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو، اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے، یہ بڑی اور یہ موٹی، بارہ جلدیں ہیں، بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہوگئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحرِ طویل میں نہیں، رباعی کی بحر میں ہے"۔ میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "واہ مرزا صاحب یہ سیدھا راستہ چلتے چلتے بھٹک گئے، رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں"۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چُپ ہوے تو خود میر صاحب نے کہا، "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کردیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین* پڑھیے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں"۔

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گذر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کردیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دَم ابھی آکر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہوئی" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں۔ بے مقطع کی یہ کیسی غزل"۔ میر صاحب نے فرمایا مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے کہ یہ غزل میری ہے؛ ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہوگیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی"۔ یہ کہتے کہتے انھوں نے اپنا جزدان گروانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اُٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہٗ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ کہا تھا:-

ہم بھی ضرور کعبے کو چلتے پر اب تو شیخ	قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہوگیا
ناصح کی بات سُننے کا کس کو یہاں دماغ	تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہوگیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں	اک پارسا، سنا ہے کہ میخوار ہوگیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا، اس لیے اس

* اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کردیا۔

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں آہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

انکے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی - یہ سکندرآباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے - سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارے دار پائجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں - پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے، پھر انکے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے - آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے - غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ واہ کہتے ہیں

بزم اغیار رہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے	ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو، ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے	ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا	چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک	میں خدا کسکو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے میں در گزرا	کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
بو نہ ہو بس میں کوئی کچھ نہیں اس کی پروا	دل بیتاب یہ لے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی - جب یہ مصرعہ پڑھا "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی - اور تو اور استادان فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے -

ابھی انکی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی - یہ نوجوان آدمی ہیں - مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں - ان کا کیا کہنا - زبان تو انکے گھر کی لونڈی ہے - گا کر غزل پڑھتے ہیں؛ پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں - انکی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں -

اللہ رے جذبۂ دل مضطر کہ تیر کا	باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ یہ مرا دل بیٹھا جائے ہے	ظاہر میں تو الہی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دیے ہیں - آخر کیوں نہ ہو، قلعہ کے رہنے والے ہیں -

انکے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی - یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں - کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید

لباس، بغل میں انگوچھا، کندھوں پر سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا تھا کہ انکو دیکھے جائے شمع سامنے آئی تو انھوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا، سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پانوں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت   جو اُٹھ کھینچیں دامن ہم اُس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے   کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پانوں میں طاقت" کہتے ہوے اُٹھے مگر پانوں نے یاری نہ کی، لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہ کر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں سے اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کے بجائے بیاختہ یہی نکل گیا "کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ اُستاد ذوق نے کہا "اُستاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے۔ ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے۔ لیے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیے"۔

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین آشکی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت، آدمی ہیں پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے، اب مفتی صدرالدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:۔

کچھ وجد نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف   کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویرِ بت آشکی   معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

انکے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی۔ ۳۰ - ۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انھی کے ساتھ مشاعرے میں آ گئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میخانے کی تقسیم اس خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہاے لکھا ہے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ   ساقی اگر نہیں ہے تو ہمے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ   یہ خم ہے یہ سبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا۔ نہ کلام اچھا ہے نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر انکو کون روک سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں۔ خوش ہوگئے۔ غزل یہ تھی

ترے بیمارِ ہجراں کا ترے بن ۔۔۔ یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے

مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے ۔۔۔ مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں انکے بعد جنکے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے؛ اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام پیدا کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سُنی جاتی۔ اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ انکو دُور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اُس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی، کلوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر، بس منجارا کے تُرک معلوم ہوتے ہیں، ہاں لباس اُن لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ موہری کا پاجامہ، سر پر سفید ال ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا انکے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستین اُلٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما، اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ اُدھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے؟" مرزا نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ الٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا۔ عرض کیا ہے"

انتہا صبر آزمائی کی ۔۔۔ ہے درازی شبِ جدائی کی

ہے بُرائی نصیب کی، کہ مجھے ۔۔۔ تم سے اُمید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے ۔۔۔ داستاں اپنی جبہہ سائی کی

ہے فناں بعد امتحان فغاں ۔۔۔ پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا نہ کرتا وصال شادیِ مرگ ۔۔۔ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی۔

راز کھلتے گئے مرے سب پہ ۔۔۔ حسبقدر اُسنے خود نمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں ۔۔۔ بندہ بندہ میں بو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک ۔۔۔ آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی - ایک ایک شعر بار بار پڑھوایا جاتا تھا۔
ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی - اُستاد ذوق نے تیسرے شعر پر
کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے، سب ہی جھوم سائی باندھتے آئے ہیں، تمھاری داستان کو کوئی
نہیں پہونچا - کیا کلام ہے، کیا روانی ہے، سبحان اللہ" حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک یہ
جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون 'تمھاری عمر پارسائی' کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں
کی باتیں نہ کیا کرو" میاں سالک نے جواب دیا "اُستاد میں تو جوانی ہی میں بوڑھا ہوگیا، دیکھیے
بڑھاپا، کمبخت نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کو کیوں چھوڑ دوں، بعد
میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے - ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائیگا۔"

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رُکا تو شمع مرزا رحیم الدین حیا کے سامنے آئی - یہ شہزادے مرزا
حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں - کوئی ۲۴-۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے
ہیں مگر پھیکے - ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں - گانا خوب جانتے ہیں - انکی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے
نہیں دیتی

بتخانے میں تھا یا کہ میں کعبے کے قریں تھا — اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں — ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا، ہاں اُنکے گانے میں مزا آگیا - گاکر پڑھنے کا یہ نیا رنگ
قلعے سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اسکو پسند نہیں کرتے۔

اسکے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی - اُنھوں نے بہت اونچی آواز میں
اپنی غزل سنائی - علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں، ابھی کم عمر ہیں، بڑے ہو کر اچھے
شاعر نکلیں گے۔

شمع کا سامنے رکھنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے - ایک بڑی لمبی غزل پڑھی
مگر ساری کی ساری بے مزا - نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی - تعقیدوں سے
اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا - انکے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا
کافی سمجھتا ہوں

بازار شاہ تجھ کو بہت عشوہ گر نہیں — کر ہم کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں

گو نزع میں ہوں میں ترے بن آئے جانِ من　　کرنے کی جان بھی [illegible] سے سفر [illegible]

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

یہ جو کہنے کا ہے خیال ہمیں　　ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آنے کو جو وعدے پر　　گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنی باقی　　کسی صورت نہیں زوال ہمیں

تیرے شعلے نے ایک دم میں کیا　　مرنے [illegible] ہزار سال ہمیں

طالع ہے نیّر درخشاں　　اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ شعر پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پہلے احسان کے شاگرد تھے اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ لکھا تھا:-

بیانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے　　کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا

نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک سے کہ ہم　　[illegible] دامن نہیں [illegible] کا

گنہ بھی تھی کون سی پست تشنہ لب کی وہ خاک　　کہ جس سے [illegible] شراب [illegible] کا

یہ ذوقِ یار کو دے نصیحت جا کے یہاں　　[illegible] عزم ہے طاقت کے آزمانے کا

ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جنگ و راز و نیاز　　اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں اداسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بچارے مشاعرے کے انتظام سے [illegible] فرصت تھی جو غزل لکھتے پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا۔ اس [illegible] گردش میں [illegible] لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی

اٹھتا قدم جو آگے کو [illegible] نہیں　　پیچھے [illegible] اٹھا تم نہیں

اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں　　[illegible]

بے التفاتیوں کا تری شکوہ [illegible]　　[illegible]

مقطع کی سب نے تعریف کی [illegible] بھی شعر [illegible] تھے

بڈھا ہو گیا ہوں لاکھوں شعر سُنے، لاکھوں سُنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے، اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔"

میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں، آستان کے شاگرد ہیں، اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہونگے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ پہ رشک آتا ہے — حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ — دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے

جنس دزدیدہ کی مانند ہے اُلجھاؤ میں جان — کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کی یاں — کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی، اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ اور لباسِ کمال سے پیراستہ، صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد، خوش اندام۔ سر پہ ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کُرتا، جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے اُنکے دوست بھی اُن سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہُدہُد کو پال کر انھوں نے سب سے لگا ڈی۔ شروع شروع میں تو اسکی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا، لیکن جب اس نے اُستادوں پہ حملے شروع کیے اُسوقت سے ہُدہُد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازہ والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کُھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا ہے جب اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو شعر ہی بے معنی ہے، یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو اُنکے شعر سمجھتے ہیں، پھر آپ نے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا"۔ مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعہ میں بھی شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد

دہلی کا ایک مشاعرہ

یہ دوسرا موقعہ تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے۔ میر صاحب نے ہُدہُد کے مقابلہ میں اعلان جنگ کیا تھا وہ سُن چکے تھے، اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر غزل پڑھی۔

صلح اُن سے تو یہاں کیسے ہی بنی — دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی

زہد و تقوی دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اُسکے مے پیے ہی بنی

لائے وہ ہاتھ غیر کو، ناچار — پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی

کس کا تھا پاس شوقِ ظلم، اے عیشؔ — ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلِ علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبارِ کدورت دور کردیا۔ اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہوگئے جو پہلے تھے۔ نہ اُن سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر کہیں پہلے میاں ہُدہُد کچھ چہک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہوجاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا، انھوں نے پہلے ہی اُس کھیرو کی زبان بند کردی۔ خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیاؔ کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیاؔ ہیں جن کی تعریف شاعرہ میں آتے ہی اُنکے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رساؔ نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو، اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی بھی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈی ہوئی، اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے، پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اب اپنا کلام اُستاد ذوقؔ کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں۔ پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شعر بھی اچھے ہیں، مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو فدا کردیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھکو راحت ہے

ہو چکا وصل، وقتِ رخصت ہے — اے اجل جلد کر کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا — ظلم تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش — جرسِ نالہ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — درد الفت نہیں قیامت ہے

تو کبھی اپنے حیا کو دیکھو تو آج اُس کی کچھ اور حالت ہے
پانچویں شعر پر اُنکے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جاکر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب
زبان بھی بدلدی، سانس کو مؤنث باندھ گئے"۔ حیا نے جواب دیا "جی نہیں قبلہ میں نے تو اُستاد
ذوق کی تقلید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد"۔ بھلا سامعلم
کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلہ میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہوسکتا ہے"
وہ جو چاہیں لکھیں۔ ہم تو قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث"۔ بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہوگئے۔
اب شمع مولانا صہبائی کے سامنے آئی۔ انکی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے
جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں، اُنکو اصلاح دیتے
ہیں، اور خوب دیتے ہیں۔ مگر خود انکا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی
انکی کوئی غزل دیکھی نہ سنی۔ اور مشاعرہ میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔
مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم	محرم خورشید گشتم تا خساں کم ساختم
مردم دو چشم مردم عالمے تاریک گشت	من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست	جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من از ہجر دوست	داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو سباد	مے ز خون دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے
تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا
کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

(۱) ہاہا! زبان کا لطف اُٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سنیے۔ ابھی ۳۰،
۳۲ سال کی عمر ہے، مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ اُستاد ذوق کی اصلاح نے
اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ انکی طبیعت اس
بلا کی ہے۔ قد نہ بہت لمبا نہ اونچا۔ چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی
ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن۔ گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری۔

---

(۱) قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

سر پہ پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ موہری کا سفید پائجامہ، سر پہ سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں، پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والے کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اُس کے آستاں کا — ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دل بیتاب نے دہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیرا آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقوے ہے کہاں کا

اور تو اور اُستادان فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔
تیسرے شعر پہ یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سامنے
ئی۔ ان کا کیا کہنا، یہ اُستادان فن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود اُستاد ہیں۔
ہنھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اُسکی وقعت بڑھی؛ یہ سُن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں
ی نظروں سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے
بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر، آواز ایسی اونچی کہ دُور اور پاس سب کو صاف سنائی دے
زل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی، انگرکھے کی آستینوں
چڑھایا اور یہ غزل پڑھی

رام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
ب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ — آئینے میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
نی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول — کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں
ت و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے — جوں آفتاب ذرہ و شئی آفتاب میں
ہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گُم ہوا — وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز — ملزم ہوا ہوں پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور — اسوقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کرسکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی - بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھائے ہیں، مگر جب اُستادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا، بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے اُن ہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بھی بیجا تعریف کردی جائے تو اس سے انکو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اُسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جسکو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اسکی تعریف ہونی چاہیے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف۔ اور وہی داد بھی دیتے ہیں۔ مشاعرہ کے باقی لوگ انکے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے کچھ حاصل بھی کرلیتے ہیں، انکے لیے یہ غزلیں کسی طرح اُستاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

انکے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی - یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے - ان کی شاعری کی قلعے میں بڑی دھوم ہے، خود انکو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے؛ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے - خود انھوں نے اپنے حالات ایک قطعے میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں -

قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و مومن — ہوئی احساں سے پھر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض — طبع باریک ہوئی انکی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب — اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فخر و ہنر ذات پہ ہے جن کی تمام — مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا — کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر انکو اُستاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں۔ مگر سارا شہر انکو اُستاد مانتا ہے؛ ہونگے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل یہ کہی تھی

نظارہ برق حسن کا دشوار ہوگیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہوگیا

محفل میں، میں تو اُس لب میگوں کے سامنے　　نامِ شراب لے کے گنہگار ہوگیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھیری نگاہِ شوق　　پردہ ہی جلوہ گاہِ رخِ یار ہوگیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پُرسش گناہ کی　　عاصی گنہ نکردہ گنہگار ہوگیا
اُسکی گلی میں آن کے کیا کیا اُٹھاے رنج　　خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہوگیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہو انصیب　　قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہوگیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے آئی - اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہو- اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہوجاتے ہیں- مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اُن سے کہیں زیادہ اُنکے تلامذہ شاعر ہیں- اور شاعر بھی کیسے، کہ بڑے پایے کے- مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں، مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالبعلموں کو سبق دے رہے ہیں- آواز بھی ذرا نیچی ہے- لیکن انکی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے، اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آوازیں- ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے- کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہوجاتی ہے- غزل ملاحظہ ہو- کیا پختہ کلام ہے-

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں　　کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند　　کس دن کھلا ہوا در پیرِ مغاں نہیں
شب اُسکو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح　　ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودا اے عشق میں　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق　　شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
کہتا ہوں اُس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ　　کہنے کو یوں تو ہیگی زباں اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اُس کے روبرو　　مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا؛ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے انکو اُستادوں میں جگہ ملی تھی، مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہوگئے- ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جراُت سے پڑھنا واقعی کمال ہے- میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی- ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ

دیکھیے اور داد دیجیے :—

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رُو آپ گو ہوئے لیکن لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب یہ مزا پاکباز کیا جانیں
جنکو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھالی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہو گیا ہو۔ اور کوئی نہ تھا جسکے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے الفاظ بےساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہونچ گئی اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختہ کے اُستاد کا کلام سننے کے لیے سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چُنّٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی :—

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
سَو زندگی نثار کروں ایسی موت پر یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ
بے پردہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھتے اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
اُسکی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خُلد ہے کس جا ہے مجھکو چھوڑ گئی موت، لا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر   مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام مزا لے رہے تھے۔ جس شعر میں انکو زیادہ لطف آتا تھا اُسکے پڑھتے وقت انکی انگلیاں زیادہ تیز سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دیکر مروڑنے لگے کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا، ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے، میں تو عرض کر چکا ہوں

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ   تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا"

اسکے بعد شمع شیفتہ کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ انکی آواز کیا خاک نکلے گی مگر شمع کے پہونچتے ہی وہ تو کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پہ چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر استاد ذوق کو، انکی عظمت لوگوں کے دلوں پر کچھ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جسکو انھوں نے متوجہ کیا اُسکو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا، مگر انکی استادی کی داد دینی چاہیے کہ ان شعروں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے، لکھتے ہیں

تو کیوں ہے گریہ کناں ... دلِ محزوں   نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رلائے خدا

بتاؤ تو، کیا تم خدا ہو ... گے جواب   خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا

رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف   جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچہ میں کہتا تھا کل یہی احساں   یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی شمع سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہکر ایسے دلکش اور موثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اسلیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزۂ و عشوۂ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا کہ "اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر اُن سے خدا سمجھے"۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے، اور کہنے لگے "غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے"۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا، اور شمع اُستاد ذوق کے سامنے پہونچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں؟ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی، لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی، شبِ ہجر کا مزا آ گیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے، اجازت ہو تو عرض کروں"۔ مرزا فخرو نے کہا "اُستاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے، غزل پڑھیے، رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے، قطعہ پڑھیے، غرض جو دل چاہے پڑھیے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور"۔ اُستاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج گئی اور اُنکے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب، مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت رکیا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یٰسین سرہانے بیکسی نے
گر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر" اسکے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے"۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا "صاحبو! کچھ عجب اتفاق ہے کہ فاتحۂ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحۂ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر انکے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات مشاعرہ ختم ہوا"۔ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے انکا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا کام بھی نکل گیا۔ اچھا خدا حافظ"۔

تقدیر

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے روز سب سامان اُٹھ گیا، اور پھر وہی چھاپے خانے کی گھڑگھڑ اور پریسمینوں کی گڑبڑ شروع ہوگئی۔ دوسرے مہینے میں پھر مشاعرے کا اعلان کیا، اشتہار بھی تقسیم ہوئے۔ مگر گنتی کے آدمی آئے، آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی۔ کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے۔ غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکا نے مجھ سے فریب کرکے مطبع چھین لیا۔ ہرچند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، حاکم بیشک میرا انصاف کرے گا لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا۔ اُس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں۔ اور کون چھاپتا ہے۔

(منقول از رسالہ اُردو)

حُسن میں ناز نہ انداز و ادا دیکھتے ہیں
آنکھ میں اہلِ نظر شرم و حیا دیکھتے ہیں

داغِ چیچک ترے اعجاز نما دیکھتے ہیں
مُصحفِ رُخ میں ہم آیاتِ شفا دیکھتے ہیں

وصل بھی تیرا زمانے سے جُدا دیکھتے ہیں
تیرے ہر ناز میں انداز نیا دیکھتے ہیں

تھی جنھیں تذکرۂ زلف سے اُلجھن کل تک
آج اُنکو بھی گرفتارِ بلا دیکھتے ہیں

پہرِ تفریح وہ آئے ہیں عیادت کیسی
کس طرح جان نکلتی ہے ذرا دیکھتے ہیں

ہاتھ رکھ کر دلِ مضطر کی تو حالت دیکھیں
نبضِ بیمارِ محبت کی وہ کیا دیکھتے ہیں

اے بتو تم سے تو کچھ کام نکلتا ہی نہیں
کر کے اللہ تعالےٰ سے دعا دیکھتے ہیں

بند ہو جائے درِ توبہ مگر اے واعظ
اب نہیں تاب کہ میخانہ کھلا دیکھتے ہیں

اور بڑھجاتی ہے پژمردگیِ غنچۂ دل
کھلتے پھولوں کو جو اے بادِ صبا دیکھتے ہیں

کر چکو قتل خدا کے لیے جھگڑا توٹے
تیغ کی طرح تمھیں روز کھنچا دیکھتے ہیں

اس مہینے پہ مہِ عید بھی قرباں ہے رقم
دیکھکر جلوۂ رُخ ماہ لقا دیکھتے ہیں

امیر علی رقم لکھنوی

نظرے خوش گزرے

دارالمصنفین کے کارکنوں نے ۲۶ء کے خاتمہ اور ۲۷ء کے آغاز میں علم دوست طبقہ سے درخواست کی تھی کہ دارالمصنفین کے کتبخانہ کی تعمیر کے لیے جس مالی امداد کی ضرورت ہے اسکی تکمیل اس طرح کی جائے کہ پانچسو اصحاب دارالمصنفین کے رکن بن جائیں۔ دارالمصنفین کا ماہوار رسالہ معارف جو اردو کے تمام علمی پرچوں میں سب سے بلند پایہ کا ہے اور سال بھر میں جو کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہوں وہ ہر رکن کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں، اس لیے درحقیقت یہ امداد کسی قسم کا چندہ نہیں، بلکہ خرید مال کے لیے پیشگی رقم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس تحریک پر دوسو اصحاب بیس بیس روپئے ادا کرکے رکن بنے اور ساڑھے سترہ روپئے انھیں دوران سال میں اس تفصیل سے وصول ہوگئے:—

چندہ معارف	صہ/
نفسیات ترغیب	عا/
نیٹشے	عہ/
خلفائے راشدین	[illegible]
تاریخ فقہ اسلامی	للعہ/
معارف ڈاک	عا/
میزان	[illegible]

تاریخ فقہ اسلامی ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، مگر اس ماہ کے آخر میں تیار ہو جائیگی اور جلد ارکین کو بھیجدی جائیگی۔ باقی ۸/ کے بارے میں منیجر صاحب دارالمصنفین نے اعلان کردیا ہے کہ کتب موجودہ دفتر دارالمصنفین میں سے جو کتاب ارکان چاہیں پسند کرکے طلب کرلیں۔ ساتھ ہی انکی درخواست یہ بھی ہے کہ گزشتہ سال جن شائقین علم نے دارالمصنفین کی رکنیت قبول فرمائی وہ آیندہ سال کے لیے بھی اپنی رکنیت قائم رکھیں اور عسہ روانہ کردیں۔ ہمیں امید ہے کہ علم دوست اصحاب انکی اس دعوت کو ضرور قبول فرمائیں گے اور جو اصحاب اس سال کسی سبب سے دارالمصنفین کے رکن نہیں بن سکے تھے وہ اب توجہ فرمائیں گے۔

شذرے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا کی ایک بزم انجمن اتحاد نے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان کیا ہے۔ عنوان حسب ذیل ہے:-

"۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان ہند کی تعلیمی جد و جہد اور اُس کے نتائج"

شرائط مقابلہ یہ ہیں:-

(۱) مضمون تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہو

(۲) ۳۱- مارچ تک ناظم انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر بھیج دیا جائے

(۳) طلبہ اور دیگر تمام حضرات اس میں حصہ لے سکتے ہیں

اصحاب ذیل مضامین کی جانچ فرمائیں گے:-

(۱) مولوی عبد الحق بی اے ناظم انجمن ترقی اُردو

(۲) مولوی عبد الماجد بی اے - مدیر سچ

(۳) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ

اور بہترین مضمون نویس کو جناب عبد العزیز انصاری وکیل بارہ بنکی کی جانب سے اُنکے مرحوم دوست اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز شیخ ولایت علی قدوائی (بمبوق) کی یادگار میں ایک پچاس روپے کا طلائی تمغہ دیا جائے گا۔ عنوان دلچسپ اور مفید ہے، امید ہے کہ جو اصحاب قلم وقت نکال سکتے ہیں، انجمن اتحاد کی اس دعوت پر ضرور لبیک کہیں گے۔

"دہلی کے مشاعرہ" نے اب کی بھی تقریباً سارا پرچہ گھیر لیا۔ مگر امید ہے کہ ناظرین کرام اُس سے لطف اندوز ہونے کے بعد محسوس کرینگے کہ اگر اس جزو کے بھی دو ٹکڑے کر دیے جاتے تو سخت بے لطفی پیدا ہو جاتی، اور اس بنا پر بھول جائیں گے کہ اس پرچے میں دوسرے مضامین نہیں ہیں۔

گذشتہ سال لکھنؤ سے ایک نیا رسالہ خیابان جاری ہوا تھا، تو ہم نے الناظر میں کسی موقع پر اُس کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی مدیر خیابان شہر کے ذی علم حضرات اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو اُردو کی خدمت پر آمادہ کر لینے میں کامیاب ہونگے۔ مگر افسوس ہے کہ زندگی کے پہلے ہی سال میں خیابان کے صرف چند پرچے شایع ہو سکے۔ اور غالباً گذشتہ پانچ ماہ میں اُسکا کوئی نمبر نہیں نکلا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

قصور البتہ برادر ممدوح سے ہوا کہ بعد امن کے اور غدر کے موقوف ہونے کے وہ خود اکبرآباد
مین نہ چلے گئے۔ اگر جاتے تو بلاشبہ عہدے پر بھی بحال ہوتے اور اب تک بہت ترقی ہوجاتی
اور مکانات وغیرہ کا نیلام بھی مسترد ہوتا۔ مگر ہرگز اونھون نے قدم باہر نہ نکالا اور گویا توکل کر کے
بیٹھ رہے۔ جب راقم لندن سے پھر کے آیا تب نہایت اصرار سے اون کو یہان سے اوٹھا لیا
اکبرآباد مین لیگیا۔ آنریبل دریمن صاحب اسکاٹ لینڈ کے ایک امیر زادون مین وہان کے کمشنر
تھے اور وہ اون کے آگرہ کے برخاست سے نہایت ملول تھے اونھون نے نواب محمد علیخان
ٹونک کے نواب کو سپرد کیا وہان دو سو روپیہ مشاہرے کا ایک عہدہ نواب نے اونکے
تفویض کیا قریب ایک برس کے وہان وہ رہے جب نواب محمد علی خان ریاست سے معزول
ہوے تب وہ بھی بعضے مصالح سے مستعفی ہوے۔ دریمن صاحب ممدوح اون دنون بریلی
کے کمشنر تھے وہان گئے وہان رام پور کے نواب نے سو روپیہ مہینا مقرر کر دیا اور نہایت
پاسداری اور اخلاق کرتے ہین اور کوئی عدالت اون کے تفویض کی ہے دو برس سے زیادہ
ہوے کہ وہین ہین خوش و خرم بسر کرتے ہین۔ صرف ایک بیٹا اون کا حافظ فصیح الدین ہے
کلام اللہ تو حفظ کیا تھا وہ بھی بظاہر خوب یاد نہین رہا کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا ہے رامپور کے نواب
نے بہت اصرار کر کے اون کے والد سے وہان اوس کو بھی طلب کر لیا ہے اور اوس کے نام پر
بھی کچھ مقرر کر دیا ہے۔ حافظ ریاض الدین خان سے چھوٹے ہمارے بھائی حافظ
وجیہ الدین خان نہایت ہوشیار اور لایق اور باہمہ اور بے ہمہ اور نہایت عالی ہمت
ہین جس طرف توجہ کیا اوس کو کر ہی کے چھوڑا اس امر مین صرف دو حکایتین
اون کی لکھنا کافی ہین۔ ایک یہ ہے کہ چھبیس دن مین کلام اللہ حفظ کر لیا اور اب
بخوبی یاد ہے حالانکہ کثرت اوراد اور اشغال سے سال بھر اون کو فرصت نہین
دتی صرف شعبان کے مہینے سے کچھ دور کر لیا کرتے ہین اور سال بھر کلام اللہ دیکھنے
کی نوبت نہین آتی مگر رمضان شریف مین دو تین ہفتے ختم کیا کرتے ہین دوسری حکایت

حافظ وجیہ الدین خان ہمارے چھوٹے بھائی کا ذکر

اون کی علو شان کی یہ ہے کہ جناب حضرت شاہ تراب علی قلندر ابن شاہ کاظم قلندر کے
سرہانے جنکے ہاتھ مین اونھون نے بیعت کی تھی اون کو خرقہ عطا کیا اور اجازت مرید کرنے کی
جو اون سے رجوع کرے دی ہے مختصرات عربی کی کتابین اونھون نے پڑھین اگرچہ
تکمیل کی نوبت نہین آئی لیکن فقہ وغیرہ مین بہت بخوبی استعداد ہو گئی کچھ ہیئت کے دو ایک
رسالے جناب چھوٹے چچا صاحب سے بھی پڑھے عمل بالاصطرلاب پر خوب مشق ہو گئی ہے
فارسیت مین نظم اور نثر پر بخوبی قادر ہین مگر شوق شعر کہنے کا نہین ہے ایک مثنوی اپنے
پیر کے اور درگاہ کے سوانح مین اونھون نے البتہ لکھی ہے تلاش معاش کے واسطے کہین
باہر نکلنے کا کبھی ارادہ نہین کیا اور سارا انتظام خانگی ہم سب بھائیون کا اونھین کے ہاتھ مین
ہے بادشاہی عہد مین کچھ دیہات ہاتھ آ گئے تھے ہزار بارہ سو روپیہ سال کی آمدنی تھی اوس
سے بخوبی اوقات بسر ہوتی تھی انگریزی مین وہ دیہات بھی نکل گئے۔ اب البتہ محض
توکل پر بسر اوقات ہے کثیر الاولاد ہین چار بیٹے اولاد ذکور مین ہین ظہور الدین نظام الدین
قیام الدین صمصام الدین۔ اللہ تعالے سب کو زندہ رکھے اور توفیق علم و عمل کی عطا کرے اولاد
دختری مین دو نواسے کم سن بھی ہین۔ اون سے چھوٹے ہمارے بھائی حافظ مولوی اثیر الدین
خان ہین کم سنی مین اون کو عارضہ صرع کا ہو گیا مگر اوس وقت دیر دیر مین ہوا کرتا
تھا یہانتک کہ اپنے شوق سے کلام اللہ بھی حفظ کیا اور مختصرات کتابین بھی پڑھین ذہن بہت
اچھا تھا شادی بھی ہوئی دو بیٹے پیدا ہوے بعد اوس کے جو عارضہ نے زور کیا تو اکثر
ہونے لگا اور منجر بجنون ہو گیا اب اکثر از خود رفتہ رہتے ہین بہت کم کبھی حواس بھی
درست ہو جاتے ہین عارضہ کا بھی دسوین پانچوین دورہ ہوا کرتا ہے۔ چھوٹا بیٹا پانچ چھ برس
کی عمر مین قضا کر گیا اور بڑا بیٹا مولوی زکی الدین خان نام نہایت لائق اور سعید ہوا فارسیت
مین تو اوس کو فی الجملہ کمال حاصل ہوا نظم اور نثر دونون بہت اچھی لکھنے لگا عربیت بھی
مختصرات کتابین پڑھ کے متوسطات کی نوبت آئی تھی فی الجملہ استعداد بھی ہو گئی مگر

حافظ اثیر الدین خان صاحب بہادر سے چھوٹے بھائی کا ذکر

کی فرصت نہ دی پھر اپنے شوق سے انگریزی شروع کی اگرچہ کچھ جہالت اوس
باقی رہی لیکن اوس مین بھی اب تک ناقص رہے حیدرآباد دکن مین گئے
اسا تعلق ہوگیا ہے اگرچہ مواجب کم ہے مگر عہدہ معزز ہے اللہ تعالے موافق حوصلہ
دین و دنیا کی ترقی نصیب کرے - اب جو موضوع اس خاتمہ کا ہے یعنی ذکر سوانح او
ت راقم کے اپنے ابتدائے ولادت سے آج تک کہ عمر اپنی ہفتاد و سالگی مین
ج کی اونکے صفحات خیر اس کتاب کے سیاہ کرتا ہے بزرگون سے تحقیق ہوا کہ راقم
ین یا سولھوین شب کو شعبان کے مہینے کی [illegible] مین پیدا ہوا تھا میرے بڑے چچا جناب
مغفور نے تاریخ میری ولادت کی بیدار بخت بے کم و کاست پائی اور اوسکو اس قطعہ مین موضوع کیا

چو آن نیک طالع بعرش وجود   شدہ جلوہ آرائے چون شہ بتخت

بتاریخ میلاد او از سعید   بدیہہ خرد گفت بیدار بخت

[illegible] زمانے مین کوہستان ہمالیہ یعنی شملہ مین گورنر جنرل ہندوستان کے ساتھ
شملہ مین مقیم تھا اور گورنر جنرل نے خطاب خانی اور بہادری کا مجھکو عطا کیا
وقت مین جناب والد ماجد مغفور کے خط سے اس مضمون سے مطلع ہوا کہ جب
ممدوح نے وہ تاریخ میری ولادت کی پائی تب حضرت جد امجد مغفور نے یہ
یہ لڑکا بالضرور بخت بیدار ہوگا چنانچہ جناب والد ماجد مغفور نے اوس خط مین لکھا کہ عطا
اس نہج پر کہ کلکتہ کے گیازٹ مین اور اور اخبارون مین حکم اوس کے طبع کا ہوا
صاحبان ملک کے واسطے سے ہم لوگون مین جو روزگار پیشہ ہین ابتدائے
رسے آج تک کسی کے واسطے سننے مین نہین آیا تو لا محالہ یہ نشان اوسی
جو جناب والد ماجد مغفور نے تیری ولادت کے وقت مین فرمایا تھا
ے مجھکو امید ہے کہ روز بروز ترقیات دینی و دنیوی تیری مین اپنی حالت
ہون گا - الغرض جب میراسن بلوغ کا ہوا تب بزرگون نے مکتب مین سپرد کیا

٣٦

اور آخوند شیخ قیام الدین مرحوم قصبۂ موہان کے رہنے والے جو ایک بڑے جہاندیدہ آدمی تھے اور صرف معلم نہین بلکہ ایسے عمدہ اتالیق تھے کہ کمتر مثل اون کے کوئی معلم ہوگا اس واسطے کہ وہ نواب حیدر بیگ خان جومدار المہام آصف الدولہ کی سرکار کے تھے مدت تک اون کی مصاحبت مین اور اون کے کتب خانے کے داروغہ رہے تھے اون کو جناب جد امجد مغفور نے ہمارے بھائیون کی اور سب بنی اعمام کی تعلیم کے واسطے مقرر فرمایا۔ اون کی خدمت مین حروف تہجی سے لیکر سارا قرآن شریف اور رسائل متداول فارسی کے کریما مقیمان آمدنامہ گلستان بوستان بہار دانش ابو الفضل دیوان غنی اور بعضے رسائل نظم و نثر کے راقم نے پڑھے کہ فی الجملہ طاقت لکھنے پڑھنے کی حاصل ہوئی۔ تب ۱۲۲۹ھ مین میزان الصرف جناب حضرت حاجی الحرمین حاجی امین الدین ہمارے جد امجد مغفور کے بھائی سے شروع کی ساری وہ کتاب اور منشعب اور پنج گنج جس کو تصریف بھی کہتے ہین جناب ممدوح سے پڑھی اور آخوند شیخ قیام الدین کے اہتمام سے اوس کی مشق ہوئی۔ اس عرصہ مین جناب والد ماجد مغفور اور جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور نے باہم بندوبست کر کے مولوی حسن بخش سنامی کو کہ جو بڑے عالم اور طبیب بھی تھے اور اسی قصبۂ کاکوری کے رؤسا مین جناب جد امجد مغفور کے تلامذہ مین سے تھے ہماری اور ہمارے بنی اعمام کی تعلیم کے واسطے مقرر کیا اون کی خدمت مین راقم نے زبدۃ الصرف اور صرف میر اور مائۃ عامل فارسی نظم اور شرح مائۃ عامل عربی اور مصباح اور ضریری اور کافیہ اور ضوء شرح مصباح کی اور کافیہ کی شرح ملا جامی کی جو شرح ملا مشہور ہے قریب نصف کے یعنے سارے اسم کی بحث تک پڑھی۔ پس عرصے مین جناب والد ماجد مغفور نے ہم سب بھائیون کو اکبرآباد مین طلب کیا قریب چار برس کے وہان اتفاق رہنے کا ہوا۔ جناب والد ماجد مغفور سے اور

آخوند شیخ قیام الدین موہان کے رہنے والا ہماری تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے

راقم نے ۱۲۲۹ھ مین میزان الصرف شروع کی اور مولوی حسن بخش صاحب جو سنامی تھے ہماری تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے

راقم مع سب بھائیون کے بجناب والد ماجد مغفور ۱۲۳۱ھ اکبرآباد مین پہنچا اور چار برس رہا

جناب مولوی امیر علی مرحوم سے جو سادات صحیح النسب بارہے سے تھے اور جناب والد ماجد
مغفور کے شاگرد رشید تھے نصف شرح ملا جامی کی یعنی بحث فعل اور بحث حرف کی۔ او
مختصر معانی اور شرح تہذیب المنطق اور قطبی مع میر کے حاشیے کے اور عبادات شرح وقایہ
اور شرح عقاید نسفی اور شافیہ اور خلاصۃ الحساب اور چند اشکال تحریر اقلیدس کے اول مقالہ
کے اور فارسی مین صرف قصائد عرفی کے پڑھے جس مین صرف شرح ملا کی مولوی امیر علی مرحوم
سے پڑھی تھی باقی سب کتابین جناب والد مغفور سے پڑھین مگر آپ کی عدیم الفرصتی کے سبب سے ہر
اکثر واقع ہوجاتا تھا یعنی ہفتہ مین دو تین روز کبھی سارا ہفتہ ناغہ ہوجایا کرتا تھا ۱۲۷۱ھ مین
جناب والد ماجد مغفور ہم سب بھائیون کو وطن مین لے آئے دو ایک مہینے کے بعد آ
اکبرآباد مین معاودت کی اور یہان ہم لوگون کی تعلیم کے واسطے جناب مولوی فضل اللہ صاحب
کو جو نوتنی کے رہنے والے بہت بڑے نامی علما مین تھے اور خود جناب والد ماجد
مغفور کو اور ہمارے اعمام کو اون سے تلمذ تھا مقرر کیا اون سے راقم نے جلدین اولین
شرح وقایہ کی تکمیل کی اور میبذی شرح ہدایت حکمت کی اور تصورات سلم کے متن او
شرح سلم تصدیقات مولوی حمد اللہ کے اور میر زاہد رسالہ اور میر زاہد ملا جلال اور نور الانوار
اور رد ایر اصول فقہ کے اور چند مقامے مقامات حریری کے اور فرایض شریفی تحصیل کی
اور اس وقت کچھ شبہ واقع ہوا ہے کہ شرح عقاید نسفی کی اکبرآباد مین جناب والد ماجد
سے پڑھی تھی یا وطن مین مولوی فضل اللہ صاحب مغفور سے پڑھی غالبًا ایسا
ہوا ہے کہ اکبرآباد مین شروع کی تھی اور مولوی صاحب ممدوح سے آکے ختم کی لیکن باقتضا
سن شباب کے اور توجہ کلی کے ملاہی اور ملاعب کی طرف بسبب فی الجملہ تنعم اور فراغت کے
جو بدولت والدین مغفورین کے حاصل تھی تحصیل ان سب کتب کی محنت اور مشقت طالبعلمانہ
سے جیسی چاہیے نہین ہوئی اور نفس امارہ حیلہ جو نے دل مین یہ کھٹکا ڈالنا شروع کیا کہ
جناب مولوی فضل اللہ صاحب مغفور جو بڑے عالم متبحر اور بابرکت تھے کتب مطولات کے

مولوی فضل اللہ مرحوم جونتی کے رہنے والے [illegible]

عـه مغفور [illegible] سے [illegible]

ہم کو نہین پڑھا سکتے اور اس عرصے مین ایک تفرقہ بھی اجتماع مین سب بھائیون کے
واقع ہوگیا کہ بڑے بھائی صاحب مولوی رضی الدین خان بہادر مغفور کو جناب
والد ماجد مغفور نے اکبرآباد مین طلب کرلیا اور بنی اعمام ہمارے بھی اپنے والد ماجد کے
پاس روانہ ہوئے وطن مین صرف راقم رہا کہ جناب مولوی فضل اللہ صاحب کی خدمت
مین تحصیل کرتا تھا۔ جناب ممدوح نے میرا توجہ زیادہ ملاہی اور ملاعب کی طرف دیکھا
اور میرے خطرۂ شیطانی کے متفرس ہوئے۔ بزرگوان کو اطلاع کی کہ اس روسیاہ نے
فضل الٰہی سے استعداد کلی حاصل کی ہے اب مناسب ہے کہ لکھنؤ کے علما اور
مدرسین نامی کے پاس مطولات کی تحصیل کرین اور از خود اپنے وطن کو یہان کا تعلق چھوڑ کے
تشریف لے گئے۔ اسی عرصے مین جب راقم جناب مولوی فضل اللہ صاحب مغفور سے
درس کتب کرتا تھا ایک شب کو خواب مین زیارت بابرکت حضرت جناب رسالت مآب
سے مشرف ہوا اور بموجب مضمون صداقت مشحون مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاٰنِیْ فَاِنَّ
الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ بِیْ عزت اور برکت حاصل کی اس صورت سے کہ آپ ہمارے
گھر کی مسجد مین نماز جماعت کی پڑھاتے ہین اور مین اوسی مسجد کی سفیل پر بیٹھا ہوا وضو کرتا ہون
اور بہت جلدی کر رہا ہون کہ جماعت کی نماز مین شریک ہو جاؤن لیکن اس قدر مجھے
محرومی حاصل ہوئی کہ جب مین جماعت کے قریب پہونچا تو آپ نے سلام پھیر دیا اور جماعت
کی طرف منہ پھیر کے دعا مانگنا شروع کی اوس مین مین بھی شریک ہوا لیکن چہرۂ مبارک پر
ایک برقعہ تھا کہ چہرہ کی زیارت بھی نہین نصیب ہوئی اونھین دنون مین کچھ قبل یا بعد
ایک شب کو حضرت باری تعالے جل شانہ کو خواب مین دیکھا ایک بہت بڑے
سانپ کی صورت پر مابین الجو طیران مین ہین۔ اس سے نہایت وحشت اور خوف
اوس وقت مجھے حاصل ہوا۔ خداوند تعالے نے مجھکو اپنے غرات اور نتائج قہر سے محفوظ
رکھے اور نتیجہ زیارت قدم مبارک کا اور کئی دفعہ اپنی حضوری کا خواب مین جس کو آگے

نقل کرون گا اور مشاہدہ مظہر جمال با جلال حضرت بے مثال تعالے شانہ وعم نوالہ کا مجھکو عقیدہ
واثق یہی تھا اور ہے کہ ساری ناموری اور ترقی دنیوی جس کی مجھکو لیاقت نہ تھی اور اپنے
امثال مین کمتر کسی کو ہوئی ہوگی مجھکو حاصل ہوئی۔ امید یہ ہے اور رات دن دعا کرتا ہون کہ
اوس کے برکات سے عاقبت بخیر ہو اور وہ سب ترقی نمونہ اوس ترقی کا ہو جو ایزد تعالے
محض اپنے لطف وکرم سے اوس عالم مین عطا کرے۔ غرض اس عرصے سے کئی برس
متصل بالکل میرے درس مین ہرج رہا مگر اوسی عرصے مین جناب مولوی مستعان
صاحب مغفور ہمارے وطن کے بزرگون مین صدیقی نسب تھے اور بہت بڑے
علماے نامی مین سر نکالے ہوئے تھے ارادہ ہوا کہ اون سے کچھ درس کیجیے چنانچہ
مطول مین نے اون سے جا کے شروع کی لیکن اس عرصے مین وہ نہایت کبر سنی سے قریب
پراگندگی حواس مین آگئے تھے اور تقریر مین بھی نہایت لکنت اور لغزش ہوتی تھی
پانچ چار سبق اون سے پڑھے طبیعت خوش نہوئی اور چونکہ نری بے شغلی تھی جناب
مولوی حسن بخش صاحب مرحوم سے سدیدی طب کی موجز کی شرح شروع کی دو تین جز
پڑھے تھے کہ اتفاق سفر کا اکبرآباد کی طرف بھائی صاحب مغفور مولوی رضی الدین خان صاحب
بہادر کے پاس ہوا کئی مہینے وہان ٹھیرنے کا اتفاق ہوا تھا کہ اس عرصے مین جناب والد ماجد مغفور
عدالت دایر وسایر کے دورے کے ذریعہ سے فرخ آباد مین تشریف لائے راقم کو اکبرآباد سے طلب
کیا دو تین مہینے یہان آپ نے تشریف رکھی وہان سے اوسی تقریب مین کانپور مین تشریف لائے
پانچ چھ مہینے یہان قیام ہوا جب آپ وہان سے ضلع مین پوری کے دورے کے واسطے روانہ ہوے
تب راقم کو اجازت دی کہ لکھنؤ مین اقامت کر کے کتب درسیہ بقیہ سے فراغت کرون۔ غرض راقم نے
جناب چھوٹے چچا صاحب مولوی خلیل الدین خان صاحب بہادر مغفور کے مکان پر لکھنؤ مین اقامت
کی اور جناب مرزا حسن علی صاحب مغفور محدث سے کہ ارشد تلامذہ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی
سے تھے صدرا قرارت شروع کیا اور بعضے طلبہ مطول پڑھتے تھے اوس کی سماعت کرتا تھا

کئی مہینے اس درس مین اشتغال رہا کہ ایک اور تفرقہ واقع ہوا یعنی جناب چچا صاحب کو عہدہ بادشاہ کی سفارت کا گورنر جنرل کے دربار مین مفوض ہوا وہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے اور جناب مرزا حسن علی صاحب کو نواب ذوالفقار بہادر نے باندے مین طلب کر کے اون کو اپنے یہان متعلق کر لیا مگر راقم نے وہین لکھنؤ مین اقامت کی اور جناب مولوی ظہور اللہ صاحب مغفور سے کہ فرنگی محل کے علمائے نامورین سے اپنے عہد کے تھے درس شروع کیا توضیح تلویح اور ہدایہ جلدین اخیرین اور شمس بازغہ اور دونون جز مسلم کے پڑھے اوسی عرصے مین مولوی حفیظ اللہ صاحب مرحوم جو جناب مولوی ظہور اللہ صاحب کے خویش تھے ارادہ ہوا کہ کتاب صدرا کی تکمیل اون سے کیجیے چنانچہ کئی سبق پڑھے تھے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب ممدوح نے کتاب کے مطلب سمجھنے مین غلطی کی اور راقم اوسکو سمجھ چکا تھا ایک دلیل ہندسی ابطال جزء لا یتجزے کے تھی اور مولوی صاحب ممدوح کو ہیئت وہندسے سے کچھ مناسبت نہ تھی اونھون نے ایک تقریر نری مہمل کی مین نے روکا اور غلطی پر اون کو متنبہ کیا مگر باوصف اس کے یا وہ سمجھے نہین یا تاویل اپنے کلام کی کرتے رہے اس سبب سے گفتگو رنجش آمیز اون کی طرف سے اور میری طرف سے طول ہو گئی مین اون کے پاس سے اوٹھ آیا اور اونسے پڑھنا ترک کیا وہ مقام اور مولوی صاحب کی تقریر اور اصل مطلب کتاب کا سب اب تک مجھے یاد ہے اوس کا لکھنا یہان مجھکو فضول معلوم ہوا غرض مین نے جا کے جناب مولوی ظہور اللہ صاحب مغفور سے وہ سب تقریر اور گفتگو نقل کی مولوی صاحب نے مشفقانہ فرمایا جیسے بزرگ لوگ اپنے لڑکون کو کہتے ہین۔ وہ کودن ہے تم نے کیون اپنی اوقات ضایع کی اوس سے پڑھنا شروع کیا۔ اوس کے بعد راقم نے جناب مولوی قدرت علی صاحب مرحوم مولانا عبد العلی بحر العلوم مرحوم کے نواسے سے صدرا شروع کیا وہ بہت بڑے نامی علماؤن مین تھے درسی کتب گویا اونکو سب حفظ تھے۔ مایعم الاجسام تک اون سے پڑھا۔ اسی عرصے مین جناب والدین مغفورین نے تقریب شادی راقم کی بڑے طمطراق سے جیسا اب زمانے مین مروج ہے

(فائدہ) بعد نسبت اظہار ... جناب والد ماجد مغفور کے راقم نے لکھنؤ مین ... کی کتب مطولات علمائے اعلیٰ کے حضور مین تحصیل کین

ذکر شادی راقم الحروف

رار دی جناب غلام حیدر خان صاحب مغفور کی منجھلی بیٹی کے ساتھ عقد نکاح باندھا گیا اون کے
پندرہ بیس دن کے بعد جیسا رواج ہے شادی ہوئی۔ ایک بزرگ مولوی محمود علی مرحوم حضرت
شاہ بدر علی صاحب قدس سرہ کاکوروی الاصل کے بھائی کے داماد تھے اونھون نے مادۂ تاریخ
میری شادی کا جو ماہ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ مین ہوئی یہ مصرعہ بے کم و کاست پایا۔ ہمایون وصل سہ
مشتری باد اوسکو ایک قطعہ مین منظوم کیا تھا وہ قطعہ مجھے یاد نہین رہا۔ بعد شادی ہونے کے کئی
مہینے متصل وطن مین قیام ہوا اس عرصے مین جناب مرزا حسن علی صاحب محدث مغفور لکھنؤ
سے تشریف لائے راقم نے بھی اون سے جا کے میر زاہد شرح مواقف شروع کی کئی جز پڑھے
پھر جو وطن مین آنے کا اتفاق ہوا اوس وقت سے کچھ اور درس کی نوبت نہ پہونچی اور نہ کبھی
استقلال تدریس کا اتفاق ہوا ساری ہمت تلاش روزگار کی طرف مصروف ہوئی مگر مطالعہ
کتب کا شغل البتہ احیاناً بے تعلقی مین بھی اور تعلق روزگار مین بھی رہا وہ بھی جم کے اور
استقلال اور بہ ترتیب کہ جو کتاب نظر پڑے اوس کو اول سے آخر تک دیکھ جایئے اس کی
نوبت نہین آئی چند مہینے جناب والد ماجد کے دورے کے ہمراہ سفر مین جب عدالت دائرہ سائرہ
شکست کے بعد آپ کی اقامت کانپور مین ہوئی تب اکثر آپ کے ہمراہ رہا اوسی عرصے
مین شرح چغمینی آپ سے پڑھی۔ اسی عرصے مین جناب بڑے بھائی صاحب نے مجھکو اکبر آباد
مین طلب کیا اوس کا سبب یہ تھا کہ جب وہان ۱۸۳۱ء کا بندوبست ہوا تو حکام نے
باوصف استحقاق کے اون کو صدر الصدور نہ مقرر کیا۔ گورنر جنرل کے حکم کے بموجب
ایک بڑے تعلقہ دار کو اوس عہدے پر مامور کیا اور بھائی مغفور کا عہدہ افتا کا بدستور
رکھ کے منصفی آگرے کے شہر کی اوس کے ساتھ ضم کر دی اور جو درماہہ قدیم تھا وہ
بدستور بحال رکھا۔ اوس پر جب بھائی صاحب نے حکام سے شکایت اپنے استحقاق کے
نہ ہونے کی کی تو اونھون نے معذرت کی تب بھائی صاحب نے کہا اگر اس مین عذر ہے تو
میرے بھائی کی پرورش کسی عہدے پر ہو۔ اس پر وہان کے کمشنر نے مسٹر کسوین نام جو صاحب اختیار

تھے اونھون نے ایما میری طلب کی کی۔ اِس نظر سے جناب والد ماجد مغفور نے راقم کو مجاز
اکبرآباد کی روانگی کا کیا قریب تین برس کے وہان اقامت ہوئی اور جناب بھائی صاحب
نے بمراتب زاید میرے اپنی کوشش سے میرے واسطے تعلق پیدا کرنے کے لیے تدبیر مین مصروف
ہوے مگر اوس عرصے مین کچھ کشود کار نہ ہوا حالانکہ وہان بہت سے انقلابات واقع ہوے
لیکن اثر وہین کے قیام کا اور جناب بھائی صاحب کی طلب کا تھا کہ بعد اوس کے بہت سی
ترقی نمایان ظہور مین آئی جس کی شرح آیندہ ہوگی اور وہ دو تین برس اکبرآباد مین نہایت
بے شغلی مین اور ملاہی او ملاعب مین بسر ہوے چونکہ اون دنون مین حکام انگریزی نے قوانین جارہ
مین بہت نسخ اور تبدیل کی تھی اور اہل ہند کے واسطے بہ نسبت سابق کے بہت ترقی کی مگر اسی کے
ساتھ اس بندوبست کی فکر مین تھے کہ بموجب پچھلے بندوبست کے جو عمال مین اخذ و جر بطریق
ارتشا کے بہت شایع تھا اور انگریزی حکومت مثل ہندوستانی حکومت کے بھی جو مدت دراز
سے بعد سلطنت کی تباہی کے چلی آتی تھی اوس کو موقوف کرین اس واسطے جمیع عہدون کے
واسطے چاہتے تھے کہ اشخاص لایق اور باعلم اور شرفا منتخب ہون اِس واسطے کہ البتہ بنظر
علے العموم لوگون کے اس جنس کے لوگ مختار رہتے تھے۔ اور مین جو اپنے تصور باطل مین
جمیع اشخاص سے جو اوس شہر مین موجود تھے اپنے تئین لایق اور فایق سمجھتا تھا۔ اور ایک
حاکم اعلے کی بموجب طلب کے وہان گیا تھا مجھکو یقین تھا کہ عنقریب کوئی صورت عمدہ
ظہور مین آویگی عجب کارخانہ قضا و قدر کا ہے کہ سب مزعومات اپنے باطل ہوگئے وہ اشخاص
جن کا کچھ بھی رتبہ اور لیاقت نہ تھی وہ حکام کے نزدیک کارکردہ متصور ہوے اون کے واسطے
معقول عہدے تجویز ہوئے اور میری طرف سے حکام کے زعم مین ناکردہ کاری ثابت ہوئی
بعینہٖ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ کا مصداق ہوا مگر جہالت اور ناواقفیت
قریب ہے کہ تم برا سمجھو ایک امر کو اور وہ تمھارے واسطے بہتر ہو
اون امور سے جو واقع ہوئے عدم ظہور اپنے مزعومات کا اوس عرصے مین نہایت موجب رنج
والم کا ہوا تھا۔ سبب اس عدم ظہور اپنے مزعومات کا عجیب اور غریب واقع ہوا چونکہ کا

وس عرصے مین ایک دوسرے سے ہر شخص کا حال اور بسر برد پوچھا کرتے تھے۔ ایک صاحب
مانے کے لوگون مین علے العموم ہمارے دوست مشہور تھے۔ اور غالبًا حکام کے اوپر بھی بہی
الی تھا۔ اوس عرصے مین ایک عہدہ مشترک سررشتہ داری کلکٹری و فوجداری کی ڈیڑھ سو روپیہ
شاہرہ کی قرار پائی تھی۔ صاحب کمشنر جس نے مجھے طلب کیا تھا اوس نے کلکٹر سے ایما کیا
راقم کو اوس عہدے پر مقرر کرے۔ کلکٹر نے اون بزرگ سے جو وہ خود پیشتر سررشتہ دار کلکٹری کے
تھے اور نئے بندوبست مین اون کو تحصیلدار کر دیا تھا اس نظر سے اون سے پوچھا کہ فلانا
نص اس عہدے کا انجام کر سکتا ہے۔ اون کو ایسا حسد نے لیا کہ راقم کی بہت علم اور لیاقت
تعریف کی مگر از جنس تاکید الذم بما یشبہ المدح۔ یعنی ظاہر ایسی تقریر کی وہ ہمارے صاحب زادے
ن اور بزرگ زادے ہین بڑے عالم فاضل ہین مگر یہ کام بہت مشکل ہے خصوص اب فوجداری
کام بھی اوس مین ضم ہوا۔ اور مین تو اون کی تعریف ہی کرونگا حضور خود سمجھ لیجیے اونھون نے
ب تک کہین کام نہین کیا ہے۔ غرض کلکٹر نے صاحب کمشنر سے جا کے کہا مین خود نیا کلکٹری
مقرر ہوا ہون اگر میرا سررشتہ دار بھی ناکردہ کار ہو تو کام کس طرح سے چلے گا اور اونھین صاحب
تقریر دلیل مین نقل کی۔ اگرچہ تفصیل مشرح اس خبر کی نہین معلوم ہوئی کہ اونھون نے کیا
ریر کی تھی۔ لیکن یہ امر خود صاحب کلکٹر نے بعد اوس کے جب میری کیفیت نالایقی کی اون پر
ملی اور پھر مدت تک وہین اکبرآباد مین اور بعد اوس کے گورنر جنرل کے ساتھ میرا اور اون کا
ابقہ رہا تو ایک دن اونھون نے ہنس کے ایک حاکم سے میرے سامنے انگریزی مین کہا
عجب اتفاق ہے کہ ان کے ایک خیر طلب دوست کی تقریر سے ہم کو ایسا دھوکا ہو گیا کہ ان کو
طلق کارکردگی کی لیاقت نہین ہے نرے ملّا ہین۔ پھر خود ترجمہ کر کے مجھ سے بیان کیا کہ ہم ان سے
کہتے ہین اور دونون صاحب خوب قہقہے مار کے ہنسا کیے۔ غرض کمشنر نے جب یہ امر سنا تو اوسکی
ے ہوئی کہ اکبرآباد کے مدرسے مین مجھے مدرس مقرر کرے وہان دو مدرس پچاس پچاس
روپیہ درماہہ کے تھے ایک عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک ریاضی پڑھانے کے لیے اور

حکام کی راے مجھ کو اکبر آباد کے مدرسہ مین مدرس کرنے کی جسپر کہ مین نے قبول نہ کیا اور جناب والد ماجد کے بہت ناخوش مزاج ہو

ایک ڈاکٹر مدرسہ کا مہتمم تھا اوس کی بد مزاجی کے سبب سے دونون نے استعفا
دیا۔ کمشنر نے جب ڈاکٹر سے میرے مقرر کرنے کے واسطے کہا۔ اس تقریر سے کہ
تمہاری بد مزاجی کے سبب سے ہمین بہت شبہ ہے کہ وہ قبول نہ کرین گے اگر
قبول کرین تو سو روپیہ مشاہرہ اون کا مقرر کرو اور دونون عہدون کا انجام
اونھین کو سپرد کرو۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کر کے کہا مین نے انکار کیا تب اوس نے
بھائی صاحب کو طلب کر کے نہایت اصرار سے اور سماجت سے کہا کہ اپنے بھائی کو سمجھائیے وہ
مدرسی قبول کرین اور بموجب بھائی صاحب کے اصرار کے مین اون کے پاس گیا۔ اور مین نے کہا کہ
مجھے ہرگز خوف کسی طرح کا آپ سے نہین ہے صرف اس سبب سے کہ سو روپیہ مین میری بسر نہین ہوگی
اور محنت اور مشقت بہت ہے مین نہین قبول کرتا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو مین دو آدمی اچھے
فاضل آپ کو بلا دون پچھلے دستور کے موجب ایک کو عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک کو
ریاضی کی تعلیم کے واسطے مقرر کیجیے اوس نے کہا بہت اچھا جلدی بلا دیجیے۔ نام مجھ سے پوچھا
کون سے دو صاحب آپ نے تجویز کیے ہین مین نے ایک مولوی بشیر الدین اپنے خالہ زاد بھائی کا
نام عربیت کے واسطے تبلایا اور ایک میر اولاد حسین نام شکوہ آباد کے رہنے والے جو مدت تک لکھنو
مین ہمارے ہم سبق اور ہمخانہ رہے تھے اون کا نام لکھوایا کہ ہیئت تعلیم کرین وہ نہایت ذکی الطبع
تھے اور بڑی محنت اور مشقت سے بہت اچھی استعداد حاصل کی تھی اگرچہ مذہب اون کا شیعہ
تھا لیکن راقم کو بسبب مدت تک یکجائی کے اون سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اور اوس عرصے
مین وہ ہگلی کے مدرسے مین اسی روپیہ مشاہرہ کے نوکر ہو گئے تھے وہان کے تیسرے یا چوتھے
مدرس بھی تھے اور وہان کے مسجد کے امام بھی مقرر ہوئے تھے اس سبب سے کہ میر سید محمد مجتہد
نے اون کو اجازت امامت یا شاید اجتہاد کی بھی دیدی تھی۔ تو میرا گمان یہ تھا کہ اگرچہ اون کا درماہہ
وہان زیادہ ہے لیکن بسبب قرب وطن کے خصوص میرے لکھنے سے وہ ضرور قبول کر لین گے
مجکو میرے نام بتانے کے اوسی وقت اپنے منشی کو بلا کے دو پروانے لکھوائے اور مجھے

حوالہ کیے کہ جلد دونون صاحبون کو بلوا دیجیے۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین تو آئے اور مدرسہ
مین اونھون نے پڑھانا شروع کیا اور وہین کی رو داری سے اون کو ترقی ہوئی کہ فتح پور
سیکری کے منصف ہو گئے۔ اور میر اولاد حسین نے پہلے تو قبول کیا اور لکھا مین عنقریب
آتا ہون۔ لیکن کلکتہ کے سارے شیعہ مذہب لوگون نے جو تجار وغیرہ بڑے بڑے دولتمند
ہین نہایت کوشش اور تدبیر کرکے اون کو وہین ہگلی کا مدرس اول یا دوم تین سو روپیہ
مشاہرے کا مقرر کروا دیا۔ الغرض جب اس واقعہ کی خبر جناب والد ماجد مغفور کو ہوئی آپ
بہت ناراض ہوے اور خط بہت عتاب کا مجھکو لکھا کہ ایسا عہدہ عمدہ خانداق تو نے قبول
نہ کیا نہایت خلاف عقل حرکت کی۔ اصل غرض آپ کی یہ تھی وہان مقرر ہونے سے میرے
علم کی تجدید ہوتی اور شغل مطالعہ کا ہمیشہ رہتا۔ الغرض جب حکام کے ذہن مین میری ناتجربہ کاری
متحقق ہو گئی حالانکہ بسبب اکثر ہمراہی جناب والد ماجد مغفور کے اور شوق ملاحظہ مقدمات کے
دیوانی اور فوجداری کا کام تو مین لوگون کو بخوبی سکھا دیتا اور چونکہ ہمیشہ قوانین بھی دیکھا کرتا تھا
کلکٹری کا کام بھی دشوار نہین معلوم ہوتا تھا۔ اس نظر سے جناب بھائی صاحب مغفور نے یہ فکر کی
کہ خود رخصت لی اور صاحب جج سے درخواست کرکے مجھکو قائم مقام مقرر کروایا تاکہ بذریعۂ افتا
کے جب حکام کے سامنے کام کرنے کا اتفاق ہو تو وہ زعم باطل اون کا نکل جاے دہی ہوا کم
قریب سات آٹھ مہینے کے جناب بھائی صاحب کی غیبت مین جو ہر طرح کا کام پیش آیا حکام
بہت راضی ہوے اور سمجھے کہ وہ زعم اون کا غلط تھا لیکن چونکہ نیا بندوبست سب اوس ضلع
مین ختم ہو گیا تھا کوئی عہدہ خالی نہ تھا کہ مجھے سپرد کرین۔ صاحب کلکٹر مجھ سے مبالغ تھے کہ تم یہان
ٹھہرو جو تحصیلداری خالی ہوگی اوس پر مین تمھین مقرر کرون گا مگر میری طبیعت ایسی منقبض ہوئی
کہ پھر وہان رہنے کا جی نہ چاہا مین وطن مین چلا آیا اور اکبر آباد کے ایام قیام مین دو امر عجیب
اور غریب پیش آئے کہ اون کا ذکر کرنا مصلحت معلوم ہوتا ہے ایک امر یہ ہے کہ ایک مقدمہ
بابت نزاع سرحد اور سوائے کے تین برس سے بھائی صاحب کی کچہری مین دایر تھا جس مین

اظہارات طرفین کے گواہون کے اور اسناد جو پیش تھے غالب ہے کہ وہ مثل پانچ سیر
مے وزن مین کم نہ ہوگی۔ اس واسطے کہ پچھلے قوانین کے بموجب جیسی اب تخلیص اور
تسہیل روبکاری مین ہے وہ نہ تھی۔ فضولیات بہت کاغذات داخل ہوا کرتے تھے
غرض میری حالت قائم مقامی مین صدر عدالت سے حکم اوس کے فوراً انفصال کا آیا
اور کیفیت التوا کی طلب ہوئی اوس کے بموجب صاحب جج نے میرے اوپر نہایت
تاکید اور تشدد کیا کہ اسی مہینے مین اوسکو فیصلہ کرو مین نے جو اوس مقدمہ کو روبکار کیا
اور متصل قریب ایک ہفتہ کے ہر روز کچہری مین وہ پیش ہوتا تھا اور پھر سب مثل کو مین گھر مین
لے آتا تھا آدھی رات تک مین تنہائی مین اوس کو غور کرتا رہا مطلق حقیقت کسی جانب کی میرے
ذہن مین نہ آئی کچھ اور تحقیقات اوس مین ضرور معلوم ہوئی میرا ارادہ تھا کہ اوس کو پنچایت
مین سپرد کرون مگر صاحب جج نے نہ مانا اور نہایت تاکید کی جس طرح سے ہو اسی مہینے مین فیصلہ
کرو۔ جہان تک ممکن تھا عقل لڑا کے کچھ استخارے کی تائید سے اوس کو مین نے فیصلہ کیا لیکن خود
میری بابت بھی اوس فیصلے سے تشفی نہ ہوئی بعد فیصلہ کرنے کے دفعتہً میری حالت متغیر ہوئی اور
خود بخود گریہ و بکا میرے اوپر طاری ہوا اور یہ تصور ہوا کہ اس قضا کے باب مین اسلاف کا قول
مشہور ہے مَنْ قُلِّدَ الْقَضَاءَ فَقَدْ ذُبِحَ بِلَا سِكِّيْنٍ مین کہ ایک جاہل بحت ہون بموجب
(جو شخص قاضی مقرر ہوا وہ ذبح کیا گیا بغیر چھری کے)
مضمون حدیث کے اَلْقَاضِيْ جَاهِلٌ بَيْنَ الْعَالِمِيْنَ محض دنیا کی طمع سے اپنے تئین اس بلا
(قاضی جاہل ہے دو عالمون کے بیچ مین)
مین مبتلا کیا ہے اور ایسی جگہ پر جہان فرصت تحقیقات کی اور غور و تامل کی نہین ملتی جس
طرح سے ہو سمجھین یا نہ سمجھین منازعات کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ اس کا مآل عقبے مین کیا ہوگا
اور کیفیت ایک اضطرار کی لاحق ہوئی کہ جو باعث اوسی گریہ و بکا کی ہوئی۔ اوسی حالت مین راقم
دست بدعا ہوا کہ یا الٰہ العالمین مجھے فاقہ قبول ہے مگر تو مجھکو ایسے عہدے اور نوکری سے
محفوظ رکھ۔ یہ میری دعا ایسی تیر بہدف ہوئی کہ اوس کے بعد ہر طرح کی ترقی نمایان حاصل ہوئی
اور حالانکہ بعضے ایام بے شغلی مین تجسس اور تلاش اس جنس کے عہدے کی بھی کی مگر آج تک

[illegible]

عنایت آلہی سے میسر نہ ہوا جناب اقدس آلہی تعالےٰ شانہ نے اوس بلا سے مجھے محفوظ رکھا

دوسرا امر عجیب یہ ہے کہ ایک شب کو مین نے خواب مین دیکھا کہ میری بائین طرف کی
مونچھ خود بخود جاتی رہی صبح کو جو سو کے اوٹھا آپ ہی آپ میرے دل مین یہ تعبیر
آئی کہ لفظ ہندی بال کے فارسی مین بازو کے معنے ہین معلوم ایسا ہوتا ہے کہ
کوئی اخوان مین سے جو قوت بازو ہوتے ہین اس عالم مین نہ رہا۔ اوسکے تین چار روز کے بعد وطن کے
خط سے معلوم ہوا کہ میری چھوٹی بہن صعوبت ولادت جنین توام سے قضا کر گئی۔ اور
چونکہ مونچھ مونث ہے تو بائین مونچھ کا جانا میری دونون بہنون مین چھوٹی بہن کے قضا کرنے پر جو تعبیر میرے ذہن مین گذری
تھی بعد وقوع کے مثل آفتاب نیمروز کے ظاہر معلوم ہوئی۔ انھین ایام مین قیام اکبرآباد کے چونکہ
اون دنون مین کچھ شوق علم ہیئت کا بہت ہو گیا تھا چنانچہ شرح چغمینی اوسی قریب زمانہ مین
مطالعہ کی تھی وہان بھی اوس کی سیر رہتی تھی تصور یہ ہوا کہ ہیئت جدید انگریزی کی چونکہ بہت تکمیل
ہوئی ہے اوس کو دیکھا چاہیے اس واسطے انگریزی کے حروف تہجی وغیرہ سیکھنے اور ہاتھ کی لکھی
ہوئی چٹھیان ایک انگریزی دان سے پڑھنا شروع کین غرض یہ تھی کہ پہلے انگریزی کے لکھنے پڑھنے
مین طاقت ہو جائے بعد اوس کے ہیئت کی کتابین دیکھیے ایک کتاب قصہ کہانی کی بھی
پڑھنے لگا تا کہ چھاپے کی کتابین بھی پڑھنے کی طاقت ہو جائے اکبرآباد سے روانگی سے تین
چار مہینے پیشتر یہ شغل شروع کیا تھا جب وہان سے روانگی ہوئی تو وہ شغل موقوف ہو گیا۔ اس
عرصے مین کچھ مشق نقل نویسی کی ہو گئی اگرچہ خط خام رہا اور سہل قصہ کہانی کی کتابین کتب لغت
کی اعانت سے سمجھ مین بھی آنے لگین مگر وطن مین پہونچ کے شغل تحصیل کا نہ رہا پھر جب الہ آباد
مین مجھے تعلق گورنمنٹ کے دفتر خانے مین ہوا تب بعضے ارباب دفتر سے پھر چند روز کچھ انگریزی
لغات پڑھ کے یاد کیا کرتا رہا لیکن جیسا چاہیے التزام سے نوبت انگریزی کی تحصیل کی نہ آئی ایسا
کہ جب مین میر منشی گورنر جنرل کے فارسی دفتر کا ہو گیا چونکہ اکثر انگریزی سے فارسی اور فارسی
سے انگریزی کرنے کی وہان نوبت آتی تھی کچھ کچھ مشق ہوا کی جب مین ولایت آمادہ روانگی کا ہوا

ایک عجیب خواب دیکھنا اور تعبیر سے دل پر ملال
چھوٹی بہن کا انتقال ہونا

انگریزی کا شغل شروع

اون دنون مین انگریزی کے بولنے اور سمجھنے مین بالکل طاقت نہ تھی مگر ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور چھاپے
کے اخبار اور کتابین جو بہت سہل سیدھے سیدھے ہوتے تھے وہ کتب لغت کی اعانت سے
سمجھ لیتا تھا اور نقل انگریزی کی ہاتھ سے بہت اچھی طرح سے کرلیتا تھا مگر مضمون چٹھی کا بنانے کی طاقت
نہ تھی - ولایت مین جاکے جب آٹھ برس قیام ہوا اتنی مدت مین باتین انگریزی سمجھنا اور خود باتین
کرنا تو خوب آگیا اور خط لکھنے پڑھنے مین بھی مشق ہوگئی کتابین ہر قسم کے علوم کی سمجھنے لگا لیکن
چونکہ درس انگریزی کا ترتیب معمولی سے نہین ہوا اور انگریزی زبان بہ نسبت ہم لوگون کے نہایت
عسیر ہے اور زیادہ عمر مین ہر زبان اور ہر علم کا سیکھنا دشوار ہے اوس مین مجھے کمال نہ حاصل ہوا
ناقص اور ناتمام رہا صرف یہ امر ہوا کہ اوس زبان سے جہالت مطلق رفع ہوگئی اور جناب اقدس
الٰہی نے جو میری تقدیر مین مقرر کیا ہے کہ کسی علم مین کمال نہ حاصل ہو اور کسی علم سے علوم متداولہ
مین سے جہالت مطلق بھی نہ رہے وہ ہوگیا - الغرض راقم نے جب سے مدرسے سے پاؤن نکالا
اور تلاش روزگار کی فکر مین پڑا لکھنؤ اور بریلی اور اکبرآباد اور کانپور سب جگہ مین کچھ نہ کچھ صورت
امیدواری نوکری حاصل ہونے کی ہوئی مگر ہر مقام پر کوئی امر بطور خیبت رجا کے ظہور مین نہ آیا
یعنی یاس بعد امید کے واقع ہوئی - اکبرآباد کی تلاش کے نتایج کا تو مفصل مین نے ذکر کیا ہے
اور سب جگہون کی امیدواری اور تلاش کی کیفیت مفصل مین لکھون تو بہت طول ہوجائے گا
مگر باجمال بعضے کوایف مین لکھتا ہون - اور اصل سب کی یہ ہے کہ جناب والد ماجد مغفور کو نہ دل
سے میرا نوکری کرنا پسند نہ تھا - آپ یہ چاہتے تھے چونکہ تحصیل کتب کی مین نے تازہ تمام کی ہے
صرف درس و تدریس مین بسر کرون - اگر نوکری کرنے کا اتفاق ہوگا تو درس و تدریس اور مطالعہ کتب
کا شغل چھوٹ جائے گا اس واسطے جو سعی اور سفارش اور تلاش میرے واسطے آپ کے اختیار
مین تھی اوس مین آپ توجہ کلی نہین فرماتے تھے بلکہ اکثر ٹال جاتے تھے - اور جو کوئی صورت مین
خود پیدا کرتا تھا یا جناب بھائی صاحب مغفور پیدا کرتے تھے اوس مین نہایت اکراہ طبیعت
بنظر میری شفقت کے تلاش مین مجاز کرتے تھے اور کہین کمال وضعداری اور متانت سے کسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۴

جنوری ۸

فارسی ڈراما

مضمون ذیل ایک فارسی ڈراما "وکلائے مرافعہ" کا مقدمہ ہے جو زیر طبع ہے

اب سے ایک صدی پیشتر فارسی ادبیات میں ڈراما (تمثیل) کا وجود نہ تھا۔ اگ
میں واقعات کربلا اسٹیج پر دکھانے کا دستور عرصے سے جاری ہے، جسے "رسم تعزیہ
مگر ہر سال ایک خاص جذبۂ انسانی (غم یا ہمدردی) کی برانگیختگی، ایک ہی اسلوب کلام
وضع و لباس، ایک سے سانگ، ایک ہی عبارت کی تکرار، مقررہ مقامات پر اتم سرا
نے اس رسم میں فرسودگی پیدا کر دی ہے۔ رسم تعزیہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے
ہے نہ ترقی پذیر۔ اس لیے اسے ڈراما سے کوئی نسبت نہیں۔ ڈراما یا تمثیل مختلف
غم، غصہ، خوشی، استعجاب، ہمدردی، جرات، غیرت کو حرکت میں لاتی، سوسائٹی
طبقات، حالات و مدارج کو آنکھوں سے دکھاتی، مختلف ملکوں اور زمانوں کے خصو
و اطوار کی تصویریں پیش نظر کرتی اور افراد و اقوام کے اخلاق پر دیرپا اثر ڈالتی ہے۔ غرض یہ
و ملی کے ہر پہلو کو محیط ہے اور دل و دماغ کے لیے ایک ایسی جولان گاہ ہے جسکی حدود
اسی لیے یورپ میں جب سے یہ فن معرض وجود میں آیا ہے، اسکی ترقی تمدن کے تمام شعبو
دوش بدوش نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے جب ایران یورپ کی مداخلت سے متاثر ہونے لگا اور ایران کا شمالی حصہ قفقاز اور وہ علاقے جن کو روسی ترکستان کہتے تھے، زار روس کے قلمرو میں داخل ہوگئے تو یہ تویں مغربی تہذیب وتمدن سے آشنا ہوئیں۔ صدر مقام تفلس میں ۱۸۵۰ء میں ایک تھیٹر قائم کیا گیا، جس میں روسی حکام کی تفریح کے لیے روسی زبان میں یورپی ڈرامے کھیلے جاتے روسی زبان کے جدید تعلیم یافتہ حلقے میں یہ اس قدر مقبول ہوے کہ اپنی زبان میں اس دلچسپ صنفِ ادب کی آرزو پیدا ہوگئی۔

اسی جدید تعلیم یافتہ گروہ میں قراجہ داغ کا ایک نوجوان کپتان مرزا فتح علی آخوندزادہ تھا۔ اس نے تھیٹر کے لیے اپنی زبان آذری ترکی میں جو فارسی اور ترکی سے مرکب ہے، چھ تمثیلیں لکھیں:

(۱) مُلّا ابراہیم خلیل کیمیاگر ۱۸۵۰ء میں

(۲) موسیو ژوردواں یا حکیم نباتات ۱۸۵۰ء میں

(۳) خرس قولدر باساں ۱۸۵۱ء میں

(۴) وزیر خان سراب ۱۸۵۱ء میں

(۵) مرد خسیس ۱۸۵۲ء میں

(۶) وکلاے مرافعہ ۱۸۵۵ء میں

انکے علاوہ ایک ناول "قصۂ یوسف شاہ سراج" ۱۸۵۵ء میں لکھا اور ۱۸۵۹ء میں ان سب کو یکجا شایع کیا۔ اس مجموعہ کی ایک جلد علم دوست شہزادہ جلال الدین مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ نذر کی کہ انکو زبان فارسی میں منتقل کرادیا جائے، مگر شہزادے کو مدت تک اسکی طرف توجہ کا موقع نہ ملا۔

قراجہ داغ ہی کا ایک صاحب ذوق اہل قلم مرزا جعفر شہزادہ جلال الدین مرزا کے علمی دربار کی زینت تھا۔ اسکی گوہر شناس نظر اس مجموعہ پر پڑی تو اس نے اس کا فارسی ترجمہ شروع کردیا۔ ۱۸۷۲ء میں مُلّا ابراہیم خلیل کیمیاگر اور موسیو ژوردواں کا فارسی ترجمہ تمام کردیا۔ اس اثنا میں شہزادہ کی بے وقت وفات نے مرزا کو بے پناہ کردیا۔ ایران کی فضا اور تھی۔ مغربی تہذیب وتمدن کا اس پر سایہ نہ تھا۔ اہل ایران مغربی تمثیل کے مزے سے ناآشنا تھے۔ فکر معاش سے [illegible] قدر دانی سے محروم رہ کر بھی یہ فدائے علم ہمت نہ ہارا۔ ۱۸۷۴ء تک مرزا فتح علی کی [illegible] کو طہران سے یکجا شایع [illegible]

توجہ نہ کی - یہ تمثیلیں نہ کسی تھیٹر میں کھیلی گئیں، نہ مدارس کے نصابِ تعلیم میں داخل کی گئیں - اس
ری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انکی زبان عام تکلمی روزمرہ اور سوقیانہ ہے، جسے پڑھنا پڑھانا
زباں عیب سمجھے - دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ان میں عام درویشوں، ملاؤں، نجومیوں کیمیا
ں کی ہجو اُڑائی گئی ہے - عام اہلِ ایران کے دلوں میں انکی عظمت جاگزیں ہے - وہ اس تضحیک
ب نہ لا سکتے تھے - پولیس اور عدالت کے طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں ہیں، جنکو شخصی حکومت گوارا
نہ تھی - غرض مصنف و مترجم کے مقاصد میں سے نہ اصلاحِ معیشت کا مقصد حاصل ہوا، نہ
اطفال کا - البتہ ایک غرض پوری ہوئی - ایرانِ حاضر کے روزمرہ اور جدید محاورات
للحاتِ زبان کی واقفیت حاصل کرکے اور ترکستان و ایران کے سرحدی قبائل کی معاشرت
ں کے معلوم کرنے کے لیے غیر اقوام نے انکو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھا
ما فارسیِ حال کے سیکھنے میں بے انتہا فائدہ اُٹھایا - فرانس، جرمنی، انگلستان میں انکی
ت ہوئی، ترجمے کیے گئے، فرہنگیں مرتب ہوئیں - ہندوستان میں اب تک تین تمثیلیں مع
حات و مقدمہ شایع ہوچکی ہیں - مرد خسیس اور حکیم نباتات لاہور[1] سے، اور تیسری تمثیل وکلاے
مرافعہ پٹنہ سے، جس کا مقدمہ یہ مضمون ہے -

مرزا جعفر ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ وفات پائی - خاتم الشعرا قاآنی
۶ء میں رحلت کرچکا تھا - مرزا جعفر کی موت پر ایران میں اُنیسویں صدی کی حرکاتِ ذہنیہ کا
ہوگیا - مگر بیسویں صدی کے آغاز نے ایران کی علمی جد وجہد میں ایک نیا باب کھول دیا - ۱۹۰۶ء
لاب مشروطی سے ایران ہر شعبۂ زندگی میں بیداری کے آثار ظاہر کرنے لگا ہے - اس عرصے
صلاحِ ملکی و معاشرتی پر متعدد کتابیں اور مضامین نظم و نثر میں شایع ہوے - ان میں چند تمثیلیں
ر آتی ہیں - مثلاً شہزادہ ملکم خاں نظام الدولہ متوفی ۱۹۰۸ء کی تین تمثیلیں، کچھ شیکسپیر کے ترجمے
مشاہیرِ تاریخ پر طبعزاد تمثیلیں فارسیِ حال میں موجود ہیں - اگرچہ اب بھی اس صنفِ سخن کو قبول
حاصل نہیں -

مغربی ڈراموں کے مقابلے میں قراجہ داغی کی متذکرہ چھ تمثیلات کوئی بلند رتبہ نہیں رکھتیں -
و در و بست (پلاٹ) عموماً سُست اور بے ربط ہوتا ہے - عشق و محبت کی واردات مجمل، ناقص
قدر خشک ہوتی ہیں - اصل افسانہ کے پہلو بہ پہلو کوئی ضمنی حکایت نہیں ہوتی - شاعری، موسیقی

---

[1] دونوں تمثیلیں ہمارے مکرم ... پروفیسر قاضی فضل حق ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور نے نہایت قابلیت اور
سے مرتب کرکے شایع کی ہیں - مسلم -

ناپید ہے۔ خاتمہ حیرت انگیز نہیں ہوتا اس لیے مسرت انگیز بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک بھی تمثیل مسبت (ٹریجڈی) نہیں، سبھی تمثیل بہجت (کومیڈی) ہیں۔ حالانکہ ایرانیوں کو بیانِ مصیبت میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی جس سے ٹریجڈی اور تمثیل (ایکٹ کرنے) دونوں میں اعلیٰ کامیابی کی توقع کی جاتی تھی۔

مگر ان فروگذاشتوں کے باوجود نقشِ اول کی حیثیت سے یہ نہایت مغتنم اور قابلِ قدر ہیں۔ زبان سیدھی سادی، روزمرہ، ہر تکلف اور تصنع سے پاک۔ ان میں ایک خاص صفت جو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ظرافت ہے شستہ و لطیف۔ اس میں باوقار طنز اور ملیح ہجو کی وہ پُر لطف چاشنی پائی جاتی ہے جو ایران کی قومی خصوصیت ہے۔ جدید فارسی شاعری میں وہ فراوانیِ تخیل، قدرتِ بیان، جدت طرازی اور موسیقیت موجود ہے کہ ان زیوروں سے آراستگی کے بعد فارسی تمثیل میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ذیل میں ایک فرانسیسی تمثیل نویس مولیر کی ایک تمثیل کے فارسی ترجمہ "گذارشِ مردم گریز" کا ایک منظر ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ تمثیل ۱۸۶۹ء میں قسطنطنیہ سے شایع ہوئی تھی، اور تمثیل منظوم کی کوشش کا نمونہ ہے۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے کہ نظم معریٰ کو مشرقی مذاقِ سخن قبول نہیں کرتا۔ صنفِ مثنوی میں خاصی روانی اور برجستگی پیدا کی جا سکتی ہے:۔

مونس۔ (بہ پیش فراش میرود) .... چہ ہست فرمائش؟

بیا بہ بینم

فراش۔ دارم دو حرف با سرکار

مونس۔ تواں دو حرف خودت را کنی بلند اظہار

فراش۔ رئیس دیوان آں را ابندہ ام فراش
مرا بدست بداوست حکم حاضر باش
تو ....

مونس۔ بکہ؟ بمن؟

فراش۔ آرے بتو

مونس برائے چہ کار

فراش۔ بحرمت صفت امیدی د حضرتِ سرکار

فتینہ (بناصح) پساں؟

ناصح ۔ امیدی داد گشتہ اند دست وبغل
بچند شعر کہ بگذاشت ست وقع ومحل
کنوں ز پیش بخواہند بست دارۂ کار

مونس ۔ من وعدہ ہا ہنہ ہرگز نمی کنم اقرار

ناصح ۔ ولیک علم چنیں رفتہ ہیں سجنب از جا

مونس ۔ میانِ اچہ بخواہند داد صلح وصفا
بگلہائے بزرگاں مگر بود تنسیق
کہ شعرہائے بدِ مردماں کنی تصدیق
از انچہ گفتہ ام انکار نیست زاں مرجع
براست ہرچہ بخواہی

ناصح ۔ ولیک مضمون نو

مونس ۔ نمی تواں گزرم شعر ہا پر وپیچ است

ناصح ۔ قبول رائے تو خواہند وجائے خواہش ہست
برو تو

مونس ۔ می روم اما نمی تواں ابدا
زرائے خویش بگردم

ناصح ۔ برو تو خود بنما

مونس ۔ گر بحکم شہی خاص گردد منسوب
کہ شعرہائے ستیزہ یافت باید خوب
وگرنہ ناش بگویم کہ شعرہاش بداند
باید ایں کہ چنیں شاعراں بدار کشند

(بہ نعماں بیگ و نعیم بیگ ہمیں کہ دید می خندند)

حقیقۃً کہ چنیں سخرہ ہم نبود گاں
کہ بودہ باشم وستم بکاں

ناصح - رواں شوہاں

فتنہ - کجا شما را باید ......

مونس - روم ولے دروم

بیا یم ایں جا تا کشمکش برہم از ہم[1]

ہندوستان کے سنجیدہ اہلِ قلم کی طرح ایران کے متین و موقر ادبا بھی اس صنفِ سخن کو علمی وقار و تمکنت کے خلاف سمجھتے ہیں - اِس کا نتیجہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے حق میں ایک ہی ہوا - فنِ تمثیل یا ڈراما ذلیل اور پست حالت سے کچھ زیادہ اُبھر نہ سکا -

محمد مسلم - ایم اے - ایم او ایل
از ہزاری باغ

---

[1] یہ تمثیل پروفیسر براؤن مرحوم کے کتبخانہ میں موجود ہے - اب نایاب ہے - یہ حصہ پروفیسر کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم سے منقول ہے - مصنف کا نام پروفیسر کے نسخے پر درج نہیں -

غزل

گُل بھی ہے میری قبر پہ شمعِ مزار بھی / وہ دیکھ کر ہنسے بھی ہوئے اشکبار بھی

عاشق بھی دخترِ رز کے ہیں اُمیدوار بھی / میخانے میں ہیں رند بھی پرہیزگار بھی

شوقِ وصال بھی ہے غمِ کوئے یار بھی / ہم بھی اُدھر چلے ہیں دلِ بیقرار بھی

انداز اپنے غنچۂ دل کا وہی رہا / گزرے خزاں کے دن ہوئی رخصت بہار بھی

جن نامیوں کا نام تھا سارے جہان میں / باقی نہیں اب اُن کا نشانِ مزار بھی

آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں بھی تم بناؤ / اور اپنے باغِ حُسن کی لوٹو بہار بھی

جو ہے وہ معتقد مرے پیرِ مغاں کا ہے / صحبت میں بادہ کش بھی ہیں پرہیزگار بھی

موسیٰؑ نے ہوش کھوئے تری جلوہ گاہ میں / دیکھا بھی مصطفےٰؐ نے رہے ہوشیار بھی

ہستیِ بے ثبات پہ ہنستے ہیں راہ میں / نقشِ قدم بھی دہر کے نقش و نگار بھی

صیاد ہم قفس میں نہ ہوتے اگر اسیر / رنگِ چمن بھی دیکھتے لطفِ بہار بھی

پوچھا کیے وہ شمع سے کچھ میری قبر پر / پڑھتے رہے نوشتۂ لوحِ مزار بھی

بیٹھے ہیں رکھ کے ہاتھ کلیجے پہ ہم جگرؔ / وہ دل کے ساتھ لے گئے صبر و قرار بھی

حکیم جگر صدیقی بسوانی

اخلاق و تصوف کی رباعیاں

(ـرت شفق رضوی عماد پوری کے مجموعۂ دلِ صد پارہ کا ایک غیر مطبوع ٹکڑا)

طلب مولےٰ

یا مانگوں کہ تجھ سے عقبیٰ مانگوں — کوثر مانگوں کہ خُلد و طوبیٰ مانگوں
ب کچھ تیرا، تجھی سے سب کچھ مولا — میں تجھ سے ترے سوا تبا کیا مانگوں

طلب مغفرت

ہر ہیں، کہ ہم صلے میں جنت مانگیں — مزدور نہیں کہ مُزدِ طاعت مانگیں
زشِ عصیاں ہو، بقدرِ رحمت — مانگیں تو باندازۂ ہمت مانگیں

توبہ و ندامت

کر کلمہ تائبِ عصیاں ہولوں — شرمندۂ غفلت ہوں پشیماں ہولوں
ہوں اجل سے کہ ذرا صبر تو کر — مرنا ہی ہے آخر تو مسلماں ہولوں

گریۂ آخرت

دانۂ اشک سبز ہونے کے لیے — نیکی کا تخم دل میں بونے کے لیے
یا کرو اِن سے آخرت کی کھیتی — آنکھیں پیدا ہوئی ہیں رونے کے لیے

مُزدِ طاعت

ت دنیا کی جب نہ قسمت میں ملی — راحت عقبیٰ کی مُزدِ طاعت میں ملی
ت میں ہوس کو کر لیا ہے شامل — جنت بھی تجھے ملی تو اُجرت میں ملی

گوشؔ و چشمؔ و قلبؔ و زبانؔ

کو بُرا بھلا سُنے ہیں دو کان — دو آنکھوں سے نیک و بد کو دیکھو اونادان
ایک کو ایک بات ایمان کی بول — سینے میں دل ایک، مُنہ میں ہے ایک زبان

رضائے معبود

بندہ سے ہو وہ بندہ پرور راضی — دنیا کے ہوں بندے اُس سے کمتر راضی
، ایک غلام کے اگر دو آقا — دونوں کو وہ رکھ سکے گا کیونکر راضی

تسبیح ریائی

طاعت میں ریا فریب شیطانی ہے — بیہودہ شغلِ سبحہ گردانی ہے
ناداں نہ بن تو ہو کے دانا زاہد — گنتا دانوں کا صرف نادانی ہے

سجدۂ ریائی

اسلام کا ننگ وہ مسلمانی ہے — جس سے بیگانہ ذوقِ ایمانی ہے
دل ہی میں نہ ہو جو نورِ ایماں زاہد — سجدہ ترا صاف داغِ پیشانی ہے

تنبیہ غفلت

غفلت لیے تجھکو جا بجا پھرتی ہے — غافل تری گھات میں قضا پھرتی ہے
دانا ہے تو گردشِ فلک سے ہشیار — ناداں ترے سر پہ آسیا پھرتی ہے

وزن تواضع

زیور سے تواضع کے اگر ہو عاری — زردار کو زر سے نہ ملے سرداری
تو عقل کی میزاں میں ذرا تول کے دیکھ — جھکتا ہے جو ہو وزن میں پلہ بھاری

تونگر بے ہنر

ایسا ہی ہے بے ہنر تونگر خالی — جیسے ہو نگیں سے خاتمِ زر خالی
شکل طبل تہی ہے ناداں منعم — باہر سے ہے پوست اور اندر خالی

خالی ظرف تہی مایہ

گل سے ہے چمن، چمن سے صحرا خالی — گوہر سے صدف، صدف سے دریا خالی
ہے گنبدِ آسماں تہی مایہ شفق — اتنا بڑا ظرف اور ایسا خالی

خمیر خاکساری

انسان میں کچھ نہیں جو ادراک نہیں — بیکار بشر ہے شر سے جب پاک نہیں
طینت کا خمیر خاکساری ہے شفق — جو خاک نہیں وہ آدمی خاک نہیں

دلیل انکساری

ملتی ہے ثمر سے کماں بھی جھک کر — دبتے ہیں پیر سے جواں بھی جھک کر
اونچی ہے یہ سب سے انکساری کی دلیل — چلتا ہے زمیں پہ آسماں بھی جھک کر

"ہندوستاں ہمارا"

ہندوستان محض ہمارا ہے - یا - محض آپ کا ؟ ـــــ ہمارا اور آپ کا مشترکہ ہے ؟ ـــــ
یا - (اور یہی زیادہ قرینِ قیاس ہے) نہ ہمارا ہے نہ آپ کا، بلکہ کسی اور کا ہے ؟ ـــــ
اِن سوالات کا جواب اگر پیچیدہ نہ ہوتا تو "ہندوستاں ہمارا" کے مصنف کو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر "سارا جہاں ہمارا" کی کینچلی نہ بدلنی پڑتی ۔ میں اُس سرزمین کی مردم خیز آب و ہوا کا یقیناً قائل ہوں جہاں "ہندوستاں ہمارا" - اور "سارا جہاں ہمارا" کی سرخیوں سے مشہور ہونیوالی نظموں نے جنم لیا ؛ میں کیا ؟ - کوئی ذی فہم اس خطۂ آبدار کی مردم خیزی سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ یہ ناممکن ہے کہ "امرت دھارا" سے "آبِ حیات" تک - اور "خضاب لاجواب" سے "ہمدردی کے کیس" تک، جس قدر گوناگوں ایجادات و اختراعات اِس صوبے سے وجود میں آئی ہیں اُن کو یک قلم نظرانداز کر دیا جائے ۔ مگر اِس اقبالِ خوش اعتقادی کے باوجود، سوالات مذکورہ کا جواب غالباً اُس سرزمین پر بھی ابھی تک عنقا ہی ماننا پڑتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اِن کا شافی جواب پنجاب تو درکنار ہفت اقلیم نہیں دے سکتی ؛ غالباً ایک درجن لالہ جی اور کوڑی بھر مالویہ نہیں دے سکتے ؛ ایک سینکڑہ عبدالرحیم اور ایک ہزار جناح نہیں دے سکتے ۔

ان سوالات کا جواب نہ دے سکنے کی وجہ سوالات کی اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر جواب دینے والوں کا ناقابلِ اعتماد "گرگٹ پن" ضرور ہے -

* * * * * * * * *

ہمارا مستقبل ہمیشہ ہمارے سر پہ منڈلایا کرتا ہے - یا - پسِ پشت سیٹی بجاتا معلوم ہوتا ہے ۔ ایک بچہ کہانی سننے میں محو ہو کر "ہنستا درخت اور بولتی چڑیا" - "سبز پری اور گلفام" - غرض ہر دلکش چیز اپنے پسِ پشت موجود تصور کر لیتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات "تنہائی یا اندھیرے میں" "کالے دیو - یا بھوت پلید" کے قرب کا احساس اُسے دفعتاً چیخ اُٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ پسندیدہ مستقبل کو اپنے پسِ پشت سمجھنے کا انسان فطرتاً عادی ہے ۔
پرستان کو دیکھنے کے لیے ایک بچہ دفعتاً اپنی پیٹھ کی طرف مڑتا ہے ؛ مگر وہ پرستانِ خیالی بھی اُس بچہ کے ساتھ ساتھ اُس کے پسِ پشت بھاگ جاتا ہے ـــ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ چکر کھایا

کرتاہے اور پرستان ہمیشہ اُس کے پسِ پُشت ہی رہتا ہے ۔ اسی طرح انسان بھی اپنی خواہشِ دِلی سے دوچار ہونے کی غرض سے، جس کو وہ پسِ پُشت موجود سمجھتا ہے، مسلسل پُشت کی طرف مُڑنے ۔ یا ۔ لٹو کی طرح چکر کھانے میں مصروف ہے ۔ ممکن ہے کہ خود کرۂ ارض کی محوری گردش کا راز بھی تلاش مقصد پر مبنی ہو ۔

* * * * * * * * *

سائنس اپنے مقاصد و متعلقات کے بُعد پر نازاں ہے اور شاعری و مذہب قربِ مقصد کا اعلان کرتے ہیں ۔

سائنس کو ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ کی مسافت، ایک حالت سے دوسری حالت کا عرصہ، ایک شے سے دوسری شے کا بُعد، نہایت لمبے اعداد میں بیان کرنے میں عظمت نظر آتی ہے ۔ شاعری و مذہب کو اس میں لطف آتا ہے کہ قیامت کو فردا کا قُرب حاصل ہو اور کراماً کاتبین ہر متنفس کے کندھوں پر سوار ہوں ۔ سائنس اور شاعری کے باہمی مناقشات کا فیصلہ کسی صورت سے ممکن ہو یا نہ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ عقل کے ذریعہ سے ناممکن ہے ۔

بذاتِ خود، مجھ کو اسی نظریہ میں لطف آتا ہے کہ میرا مقصدِ حیات میری شہ رگ سے بھی قریب تر ہو ۔ اگر میں اُس کو سات سمندر پار تصور کرنے کی کوشش کروں تو تمام زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ۔

قربِ مستقبل کے نظریہ میں سب سے بڑی نزاکت ۔ جو سائنس کی عینک سے حماقت ہو ۔ یہ ہے کہ فاقہ مست کو بھی کل صبح جاگنے پر "بیک گردشِ چرخ نیلوفری" مسٹر ہنری فورڈ بنجانے کی اُمید ہو سکتی ہے ؛ ایک نابینا کو بھی کسی پُراسرار ہستی کی پھونک سے آنکھوں کے گوہرِ شبچراغ ہو جانے کی ڈھارس ہو سکتی ہے ؛ اور ایک مبتلائے خمارِ آلام کو بھی یقین آسکتا ہے کہ ساقی کے زیرِ فیض وہ مینخانہ سے یہ پڑھتا ہوا برآمد ہوگا کہ :۔۔۔۔۔

صد سالہ دورِ چرخ ۔ ہے ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدہ سے تو عالم بدل گیا !!

* * * * * * * * *

ان معتقدات کے زیرِ سایہ، اس کا قطعی امکان ہے کہ میں صبح کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہوں اور شام کو دہلی ٹھہرنے پر معلوم ہو کہ پشاور آ گیا ۔ یا ۔ میں شام کو ٹہلتا ہوا کلب کی طرف چلوں اور

دو ایک موڑ کے بعد اپنے آپ کو ٹمبکٹو میں پاؤں ؛ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے اتفاقات کے واقعی پیش آ جانے پر مجھے ہرگز حیرت نہیں ہو سکتی ــ اور غالباً نہیں ہو گی ۔ میرے معتقدات کو اگر صدمۂ عظیم پہونچ سکتا ہے اور ناقابلِ بیان حیرت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے واقعۂ عجیب سے کہ میں لاہور کی ٹھنڈی ٹھنڈی سڑکوں پر چہل قدمی کے لیے نکلوں اور دائیں بائیں مڑتا ہوا ، ایک آدھ چکر کے بعد ، اپنے آپ کو فی الحقیقت ہندوستان میں پاؤں !!

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے مستقبلِ مفروضہ کے قرب میں لطف پاتا ہوں گر ماحول ماوی کے بُعد میں ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس اجمال کی تفصیل میں ایک واقعہ کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں ۔

ایک دن ، صبح کے وقت ، میں شکار کی غرض سے باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ ایک بے تکلف عنایت فرما ، مرگِ مفاجات کی طرح نازل ہوئے ۔ اس سے پیشتر کہ میں ان کی شانِ نزول معلوم کر سکتا ، انھوں نے اپنے سوالات کی چاند ماری سے مجھے مغلوب کر لیا ۔ کم بیش ۲۰ درجن سوالات کے بعد انھوں نے پوچھا "کس طرف کا ارادہ ہے ؟"

"اپنے گھر کا " میں نے جواب دیا ۔

" میں اِس جملے کی شوخی سمجھنے سے قاصر ہوں "

" اس میں کوئی شوخی نہیں ــــ محض اصلیت ہے " میں نے کہا ۔

" یعنی ؟ "

" یعنی ــــ میں ایک روز گھڑیال کے شکار میں تندواری کے قریب صرف کروں گا ، دو روز گڈریہ کے جنگل میں گلدار کی خاطر گذاروں گا اور چوتھے روز گھر واپس آؤں گا " میں نے جواب دیا ۔

" اب آپ کا پہلا جواب صحیح سمجھا جائے یا غلط ؟ " انھوں نے پھر کہا ۔

" قطعی صحیح ! " میں نے جواب دیا " آپ اگر لکھنؤ جانے کے ارادہ سے سفر اختیار کر رہے ہوں تو دریافت کیے جانے پر صرف لکھنؤ کا نام لیں گے ، درمیانی مقامات کے گنانے کے بعد دیگرے گنانے کی آپ سے اُمید نہیں کی جا سکتی ۔ میرا سفر گھر پر ختم ہوتا ہے اس لیے میرا ارادہ گھر کا ہے ۔"

" مگر منشائے سفر تو شکار ہے جو گھر سے باہر ہوگا ؟ " انھوں نے پھر اعتراض کیا ۔

"مجھے اول تو منشائے سفر میں بھی اختلاف ہے۔ دوسرے منشائے سفر کو تمام سفر بازی کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ عارضی طور پر گھر چھوڑنے کی اصلی غرض تنکا رہنی ہے تاکہ دوبارہ اس لعوری زندگی میں از سر نو دلچسپی پیدا کر سکے۔ گھر میں رہتے رہتے گھر کی زندگی کا لطف زائل ہو چلا ہے۔ اب چند روز گھر سے باہر رہتے ہیں، واپسی پر گھر کا لطف بڑھ جائے گا۔ تنکا دادو جنگل کے فوائد مقصد سفر نہیں بلکہ۔ وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ۔ منشائے نقل و حرکت ہے۔"

مجھے احتمال قوی ہے کہ وہ میرا مطلب سمجھ سکے یا نہیں، مگر میں اپنی بندوق اٹھا کر ان سے رخصت ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

خدانخواستہ اگر آپ گھر والوں پر، یا آپ پر گھر والے، بار ہونے لگیں تو سب سے سہل نسخہ تبدیل مقام ہے ــــ دفعتاً اور بلا اطلاع و اظہار ارادہ، پہلے چند روز، مفقود الخبر ہو جانا گوارا کیجیے، واپسی پر گھر والے آپ کے لیے اور آپ گھر والوں کے لیے مجموعۂ لطف و انبساط بن جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی دلکشی کا راز بُعد میں مضمر ہے۔ کشتی کی قدر اُسی وقت نظر آتی ہے جب امواج کا شکار بننے میں کشتی سے بُعد ہو جائے؛ عبادت خانہ کی عظمت اسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ ورِ سجادہ پر لکدکوب ساقی خانہ بدوش رہ کر ایک مدت عبادت خانہ سے بعید رہا جائے؛ راست بازی کی وقعت اسی ڈھنگ سے ذہن نشین ہو سکتی ہے کہ عرصہ دراز تک دروغ گوئی شعارِ حیات بنالی جائے؛ حکومت کا صحیح احساس اسی صورت سے پیدا ہوتا ہے کہ صدیوں تک غلامی کی زندگی بسر کی جائے!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہزاروں مادی اشیاء سے آپ کو اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان کی ظاہری و باطنی صفات آپ کی توجہ کا دامن پکڑا کرتی ہیں، لیکن دلچسپی ۔ یا قیام توجہ ۔ اُن ہی اشیاء سے پیدا ہوتی ہے جو ہر وقت آپ کے پس و پیش نہ منڈلایا کریں۔

مہوبہ کے باشندہ کو مہوبہ کے پان اُس قدر لذیذ نہیں معلوم ہو سکتے جس قدر دلی والے کو معلوم ہوتے ہیں؛ کالنجر کا رہنے والا کالنجر کے قلعہ اور پہاڑیوں میں وہ عظمت نہیں پاتا جو ایک سیاح کی آنکھ کو نظر آتی ہے؛ ہندوستانی کو ہندوستان کی اندرونی خوبیوں کا علم اُس حد تک نہیں

ہوسکتا ہے [illegible] ایک غیر ملکی کو ہو گا — بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ — ہندوستان میں رہنے والوں کو سرے سے ہندوستان کے وجود ہی کا احساس باقی نہیں رہتا۔

البتہ — بمبئی سے رخصت ہوتے ہوئے، جہاز پر سے ساحل ہند کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مشاہدہ کرنے سے ہندوستان کے احساس وجود کا آغاز ہو سکتا ہے۔ جزیرہ [illegible] گزرتے ہوئے روشنیوں کا دلکش نظارہ دیکھئے [illegible] پر [illegible] ہونے سے دکھائی دینے والی رنگ برنگی [illegible] کی روشنیاں اور بجلی کے [illegible] ستارے [illegible] اور [illegible] سے بھرا ہوا آسمان ہندوستان کی تاروں بھری رات [illegible] ہوئی فضا [illegible] نظر کر سکتا ہے — یہ سب اس وقت ممکن ہے جب ہندوستان سے دور ہو جائیے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ [illegible] کی سڑکوں پر چہل قدمی کرنے سے اگر مجھ میں ہندوستان کے وجود کا احساس دفعتاً پیدا ہو جائے تو کس قدر حیرت انگیز ہو گا؟

* * * * * * * *

ہندوستان کی اندرونی حالت ایک ایسا راز ہے جو [illegible] ہندوستانی آنکھوں سے نظر آنا ناممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس راز کا آج تک کوئی [illegible] معلوم ہی نہیں ہو سکا — ہندوستانی تو [illegible] بھی اندھیرے ہی [illegible] — اس کے صحیح انکشاف کا سہرا [illegible] کے سر رہنے والا تھا جو [illegible] کے واقعات نگار [illegible] نے پہلی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اس [illegible] کی حیثیت [illegible] کی [illegible] پیدا ہوتے [illegible] حقیقت پر پہنچے [illegible] کو ہندوستان سے بُعد بعید [illegible] — باستثنائے چند [illegible] — کوئی قریب ترین [illegible]

— [illegible] ہندوستان کے [illegible] سے ۲۵ برس تک [illegible] باقی ہے — اور — [illegible] ہندوستانی [illegible] سے صرف [illegible] کے لیے [illegible] اس کی عظمت [illegible] کا [illegible] سمجھتی ہے۔

مجھ کو [illegible] اختلاف ہو [illegible] شک نہیں [illegible] ہندوستان سے [illegible] دلچسپی [illegible] ایک [illegible] قیمت [illegible] کسی ہندوستانی کو [illegible] موجودہ [illegible] نہیں ہو سکتی [illegible]

کے متعلق ہندوستانی گئو صفت بیوی کی شہادت، جس کی تعریفِ مردمی محض اپنے ٹوٹے پھوٹے شوہر کے تجربہ پر مبنی ہوتی ہے، مطلق وقیع نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایسے مسئلہ کے لیے اُس آزاد ہستی کی تعریف مردمی قوابل ہیں ہو سکتی ہے جسکے تجربات و مشاہدات کافی طور پر وسیع ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس ہندوستانی نامردی کے معاملہ میں مس میو کا علم اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ اُن آزاد منش انگریزی اُٹھتی جوانی والیوں کی تائید پر بھی مبنی ہوگا جن کو ولایت جانے والے ہندوستانی نوجوانوں کی خلوت و جلوت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع لندن یا اُسکے مضافات میں مل چکا ہو۔

اب رہا دوسرا معاملہ ــــ یعنی ایک ۸ سالہ لڑکی کی محض گھنٹہ بھر کی علیحدگی میں عصمت دری ــــ اس کے متعلق بھی مس میو کے ذاتی زاویۂ نظر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مغربی کیفیتِ زندگی کی تصویر کھینچنے کے لیے مسٹر آئیر کے قلم کی ضرورت ہوگی ۔ میں صرف ایک لطیفہ پر اکتفا کرتا ہوں جو ایک ولایتی اخبار کے توسّل سے میری نظروں تک پونہچا تھا۔

ایک صاحبِ ثروت یورومین کو اپنی حسین بیوی اور اُن کے ایک معصوم دوست کے متعلق کچھ جہالت آمیز شبہات پیدا ہو چلے۔ اور رفتہ رفتہ اِس درجہ تک پونہچے کہ اُن صاحب کو اپنی بے گناہ بیوی کو طلاق دیدینے اور بہ یک بینی و دوگوش خانہ بدر کردینے کی دھمکی دینی پڑی۔ بیوی صاحبہ کے لیے میاں سے ۔ یا کم از کم میاں کی دولت و ثروت سے ۔ کنارہ کرنا ناقابلِ برداشت تھا اس لیے خانہ جنگی کا خاتمہ اِس صلح نامہ پر ہوا کہ بیوی نے میاں کی حکومتِ خود اختیاری قطعی طور پر تسلیم کرلی اور آئندہ کے لیے نہایت بھاری بھرکم الفاظ میں اپنے دوست سے کلیتاً ترک کردینے کا عہد و پیمان کیا۔ بڑے جتنے گھر کی فضا نہایت مسرت انگیز رہی اور میاں کو بیوی کے راہِ راست پر آجانے کا گمان ہو چلا۔ اتفاقاً میاں کو ایک ماہ کے لیے اپنے وطن سے باہر جانا پڑا اور چلتے وقت بیوی نے نہایت مایوسی اور چشمِ پُرآب کے ساتھ اُنکو خدا کو سونپا۔ اتفاق کہیے یا شومیٔ قسمت، میاں کو دفعتاً آٹھویں روز پردیس سے مکان واپس آنے کی ضرورت درپیش آئی اور گھر پونہچ کر بیوی کو غائب پایا۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور محض عدم موجودگی چنداں عتاب انگیز نہ ہوتی ۔ مگر نوکر چاکروں سے یہ معلوم ہونا غضب ہوگیا کہ بیچاری بیوی تنہائی کے عالم میں، محض اوقات گُشی کی خاطر، ممنوعہ دوست سے ہی تبادلۂ خیالات میں مصروف رہیں اور آج بھی اُن ہی کے ساتھ تبدیلِ آب و ہوائی خاطر تھیٹر تشریف لے گئی ہیں۔ میاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ریوالور

سنبھال کر تھیئٹر کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچے تو تھیئٹر کے دربان نے ان کی خشم آلود چشم و ابرو سے بہت کچھ بھانپ لیا اور باتوں ہی باتوں میں ان کا ارادہ دریافت کر لیا۔ ان کا مقصدِ قتل معلوم کر لینے پر اُس نے بہ لطائف الحیل ان کو اندر جانے سے باز رکھا اور اس بات پر راضی کر لیا کہ باہر والے بڑے دروازہ پر انتظار کریں اور جب تماشہ ختم ہونے پر ان کی بیوی اپنے دوست کے ساتھ باہر نکلیں تو دونوں کو بہ آسانی جہنم داخل کر دیں۔ اِدھر تو یہ دروازہ پر سایۂ دیوار کی طرح قائم ہوئے، اُدھر دربان نے تھیئٹر کے منیجر کو اس مصیبتِ ناگہانی کی خفیہ اطلاع دی۔ منیجر کی طرف سے میاں اور بیوی دونوں بھاڑ میں جائیں، مگر اُس کو اپنے تھیئٹر کی بدنامی کا خوف دامنگیر ہوا۔ اس بدنامی کو بچانے کی خاطر اُس نے ڈراپ سین کے موقعہ پر تھیئٹر کے اندر جاکر بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ "ایک صاحب بھرا ہوا ریوالور تھامے بڑے دروازہ پر اس ارادہ سے موجود ہیں کہ اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کو باہر نکلنے کے وقت ٹھنڈا کر دیں؛ اس لیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ اگر وہ بیوی اور اُن کے آشنا یہاں موجود ہوں تو براہِ مہربانی میرے پاس چلے آئیں تاکہ میں اُن دونوں کو ایک چور دروازہ سے باہر نکال دوں اور وہ بعافیت چلے جائیں"

اِس اعلان کے جواب میں، حاضرین کے انبوہ میں سے صرف ۶۵ جوڑے بیویوں اور آشناؤں کے کھڑے ہو گئے!!

غور کیجیے! ایک ایسے مُلک میں جہاں صرف ایک رات میں، اور صرف ایک تماشہ گاہ کے حدود میں، ۶۵ بیویاں اپنے دوستوں کے ساتھ، خلافِ مرضیٔ شوہراں موجود پائی جائیں۔ اور اُن کی عصمت دری کا کوئی خطرہ بعید بھی نہ کیا جا سکتا ہو، وہاں ایک ۸ سالہ لڑکی کی ماں کے دماغ میں محض ایک گھنٹہ کی جدائی سے کوئی احتمال پیدا ہو جاتا انتہائے جہالت، بلکہ مقتضائے بربریت نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟

. ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ .

ہندوستان کے لیے کوئی متفقہ رائے معلوم کرنا اُسی قدر محال ہے جس قدر طاعون کا عملی علاج دریافت کرنا۔ ہندوستان کے اندر والے اور باہر والے ہندوستان کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہمیشہ مختلف نتائج نکالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلط بیانی - یا - غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اندر والے دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں مگر باہر والے چاہتے ہیں کہ ہم سب تماشا بنے رہیں ——

باہر والے یہ جانتے ہیں کہ وہ سب شامل ہیں تماشہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی تماشائی نہیں۔

* * * * * * *

اس سوال کا جواب اب بھی باقی ہے کہ "ہندوستان کس کا ہے"؟ — اور غالباً اس کا جواب دنیا سائمن کمیشن کے حق میں محفوظ رہیگا۔

میری ذاتی رائے کی اگر اجازت ہو تو میں ڈنکے کی چوٹ کہنے کے لیے تیار ہوں

کہ

ہندوستان نہ ہمارا ہے اور نہ آپ کا — بلکہ بلا شرکتِ غیرے، محض اس مؤلف کی تمنا ملکیت ہے، جنھوں نے "نادرِ ہند" کی بیش بہا تصنیف میں، اس ناکارہ ملک کی صحیح تصویر کھینچی ہیں، صداقت و حقیقت نگاری کو اس خوبی کے ساتھ گل حکمت کیا ہے کہ باید و شاید!!

الا یا ساقیا اے وہ اے جانِ من پیالے دہ!
دمادم ہے خود رو بے وہ کہ می ترسم خمار آید!!

سلطان حیدر جوش

کلامِ اقدس

اُمنڈ جاتا اگر طوفان بلائے ناگہانی کا
نہ آتا پھر لبِ ساحل سفینہ زندگانی کا

نظر پھر کے پڑتی ہے مجھی پر اب زمانے کی
بکھر جانا قیامت ہو گیا رنگِ جوانی کا

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظارِ وعدۂ محشر
یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

بھیانک رات ہے دریا میں اور دور ہے ساحل
تھپیڑوں میں ہے موجوں کے سفینہ زندگانی کا

ہمیں واقف ہیں ایذائیں اٹھائیں ہر نفس جتنی
بھلا ہو دورِ الفت کے دورِ آسمانی کا

خدا معلوم آخر کب چھٹیں گے قیدِ ہستی سے
مقرر ہی نہیں ہے وقت مرگِ ناگہانی کا

ذرا اے بیخودیِ شوق اب مجھکو سنبھلنے دے
کہ پیہم کان میں آتا ہے نغمہ لن ترانی کا

دلِ ناعاقبت اندیش اب تو ہی بتا مجھکو
پس پردہ رہے گا راز کب تک زندگانی کا

ہمیں آماجگاہ ہونا پڑا صد رنج و غم ٹھہرے
ہمیں پر تنگ عرصہ ہو گیا ہے زندگانی کا

کبھی پرسانِ حال اپنا نظر آتا نہیں اقدس
گلی کوچوں میں ذکر پھیرے اُسکی جوانی کا

حیاتِ ابدی

مضمون ذیل، حیدرآباد کے ایک ہونہار نوجوان نے تحریر کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے زیر تعلیم اور فارغ طلباء کی تحریریں خاص ہمت افزائی کی مستحق ہیں۔ اسلیے کہ ان نوجوانوں نے مُلکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرکے ذہنی ترقی کی منزل کو اپنے اوپر آسان کر لیا ہے۔ اور یہ اُمید بیجا نہ ہوگی کہ مطالعہ میں وسعت اور تحریر میں مہارت پیدا ہو جانے کے بعد یہی لوگ اُردو زبان و ادب کو عروج و کمال پر پہونچا سکیں گے۔

فلسفیانہ تحریروں کے لیے الناظر کے سابق محرر خصوصی مولوی عبدالماجد صاحب اور جامعہ عثمانیہ کے معلم فلسفہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا اسلوب تحریر، اگر حیدرآبادی عزیز کے پیش نظر رہے تو اُنکی تحریریں انشاءاللہ زیادہ کامیاب رہیں گی۔

ایڈیٹر

تمام دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے کہ علوم مغربیہ اور فلسفہ جدیدہ نے تمام قدیم قیاسات وعقائد کا اس طرح استیصال کر دیا ہے کہ اب انکے جانبر ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی اور قدیم فلسفہ چونکہ زیادہ تر قیاسات و مفروضات پر مبنی تھا لہذا وہ اس معرکہ میں کامیاب نہ ہوسکا اس میں شک نہیں کہ انسان کی باہمی کشمکش کی بدولت آج ہمیں سیکڑوں ایجادات دکھائی دیتے ہیں اور اسکی متجسس نگاہوں اور عقلی کاوشوں کی وجہ سے وہ پنہاں راز جن کا خیال کرتے ہوے انسان گھبراتا تھا اور جنھیں خطرناک اور مقدس فرض کرتا تھا، آج ہمارے سامنے روز روشن کی طرح منور نہیں تو کم ازکم اس طرح عیاں ہیں کہ ہماری کچھ نہ کچھ تشفی ہو جاتی ہے۔
لیکن یہ کہنا کہ ہماری موجودہ جستجو وسرگردانی کے نتائج متقدمین کے خیالات کے بالکل خلاف اور ہر بات میں برعکس ہیں، ایک حد تک نازیبا ہے کیونکہ بعض وہی باتیں جو عقائد یا مذہبی احکام کی صورت میں زمانۂ سلف میں موجود تھیں، آج بھی جب ہم نئے علوم کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو بجاے اسکے کہ ہم اُنکا انکار کریں بلا خوف تردید اُنھیں تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
یہ عجیب بات ہے کہ اہل حقیقت نے اتنے اختلافات کے باوجود بعض مسائل کو کسی نہ کسی طرح بڑے پیچ وتاب کے بعد آخر تسلیم ہی کر لیا۔ فلسفہ نے کئی فرقے پیدا کیے لیکن یہ بعید

حیرت انگیز ہے کہ کم و بیش ہر فرقہ کے فلاسفہ نے ماہرانہ بحث کے بعد بالآخر وہی نتائج نکالے جو پہلے نکل چکے تھے

اس عالم ناپیدا کنار میں ایسے متخالف بلکہ متبائن خیالات و عقائد نظر آتے ہیں کہ اگر انسان اُن پر کافی بحث کرتا چلا جائے تو شاید اُس کی محدود عمر وفا نہ کرے لیکن انسانی فکر مضطرب اس نا امیدی پر قرار نہیں لیتی بلکہ کسی نہ کسی خیال کو اپنا مطمح نظر بنا کر اُس پر بحث کرنے کے بعد اپنی پیاس کو بجھا ہی لیتی ہے۔

انسان، خردمند انسان جب عالم طفلی سے وداع ہو کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ اسکے گوناگوں تغیرات اور نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور کرنے لگتا ہے، کبھی تو یہ مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور کبھی اس کے خیالات ایسی مایوسی کے بھنور میں گرفتار کر دیتے ہیں جس سے وہ گھبرا اُٹھتا ہے اور عدم یقین و شک کی نگاہ سے اپنے ماحول کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سوچنے والی اور خیال کرنے والی ذات نہیں چاہتی کہ چند روزہ محدود زندگی کے بعد فنا کے گرداب میں پھنس جائے، اسکا مجتہدانہ دماغ کبھی فانی ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ پس وہ اپنے انجام کے متعلق براہ راست اور واضح ترین علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر کسی نہ کسی طریقہ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ وہ فانی نہیں، بلکہ غیر فانی یعنی محدود نہیں بلکہ لامحدود ذات ہے۔ اب ہم اس خیال کی وضاحت کریں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف دماغوں نے اپنے آپ کو کس طرح تسلی دے لی۔

اگر تاریخ کی ورق گردانی کیجائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ "حیات ابدی" کا خیال نو پیدا نہیں بلکہ قدیم ہے۔ زمانۂ سابق میں بھی ماہرین فلسفہ نے اس پر کسی نہ کسی طرح سے بحث کر کے زیادہ تر اثبات اور بہت کم انکار کیا ہے۔ اگر اُنکے خیالات پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے جائیں تو شاید یہ مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کر لے، اس لیے ہم متاخرین و متقدمین میں سے بعض کے خیالات و رجحانات کو اجمالاً بیان کریں گے۔

یہ معلوم ہو چکا کہ انسان فنا ہونا نہیں چاہتا، لہذا وہ استدلال کر کے بالآخر مذہباً یا عقلاً یا وجداناً بقائیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ "بقائیت" یا "حیاتِ ابدی" نام ہے ایسی حالت یا صفت کا جو ہم کو فنا یا نیست ہونے سے بری کر دے۔ کانٹ[1] نے اسکو اپنے الفاظ

---

[1] Kant جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء)

میں یوں ادا کیا ہے کہ ابدیت یا بقائیت نام ہے استحکام شخصیت کا اور شخصیت سے مراد وہ بعقل شعوری وحدت ہے جو ایک فرد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تسلسل قائم رکھتی ہو۔[1] اس مختصر سی تشریح کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کیوں حیات ابدی کے اثبات پر مجبور رہا ہے۔

دیگر اشیا حسّی کی طرح حیات ابدی کی حقیقت عظیم کے انکشاف کا فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے اس لیے کہ ابتداءً بعض یونانی فلاسفہ نے اس پر کسی نہ کسی اسلوب سے بحث کی ہے۔ فیثاغورثیوں[2] کا خیال ہے کہ فرد چونکہ عناصر مادی کے عارضی اتحاد کی ایک نسبت کا نام ہے اس لیے وہ فانی ہے۔ کیونکہ وہ عناصر اتحاد بدلتے رہتے ہیں جسکا نام ہم مرض، انحطاط، اور موت رکھتے ہیں۔ لیکن اس ظرف شکستہ کا تصوری مظروف جو ایک مستقل اور غیر متغیر عدد ہے فنا سے محفوظ ہے جو موت کے بعد بھی اپنے اعمال کے لحاظ سے بہتر یا بدتر یا مساوی حالت میں ہوتا ہے اور اسی کا نام تناسخ[3] یا آواگون ہے۔ افلاطون[4] اپنی مشہور کتاب جمہوریت[5] میں لکھتا ہے کہ انسانی روح جسم کی طرح فنا نہیں ہوتی، بلکہ باقی رہتی ہے۔ ارسطو[6] کا خیال ہے کہ عقل فعال[7] یا عقل بسیط غیر فانی ہے جو جسم سے قابل انفکاک ہے اور اسکی توجیہ جسم کے افعال سے نہیں ہو سکتی ہے، وہ فطرت کی مخلوق نہیں بلکہ اس جسم سے پہلے بھی موجود تھی اور قطعاً غیر فانی، غیر مادی، اور ازلی ہے۔ اسکے بعد ابیقوریت[8] والوں کا دعویٰ ہے کہ روح تمام تر مادی شے ہے جو فساد مادہ ہی کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، موت کا خوف دراصل ایک مغالطہ پر مبنی ہے یعنی آدمی مرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مردہ تصور نہیں کرتا، بلکہ خیال کرتا ہے کہ موت کے بعد اسکو لذات زندگی سے محروم ہونا پڑیگا، لیکن دراصل موت کا وجود ہی نہیں۔ اس لیے کہ جب تک ہم زندہ ہیں موت نہیں، اور جب موت آئیگی تو ہم نہ ہونگے۔ ایک دوسرے سلک رواقیت[9] والوں کا خیال ہے کہ فنا کے معنی یہ نہیں کہ جوہر فنا ہو جاتا ہے بلکہ قطرہ (جزو) دریا (کل) میں مل جاتا ہے۔ ع

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

اب قرون وسطیٰ کے مشہور فلسفی فلاطینوس[10] کا بیان سنیے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم ذات مطلق

---

1 – سو کیو کینٹ کی کتاب "انتقاد عقل خالص" (Critique of Pure Reason) کتاب ۲، باب ۱۱، فقرہ ۲۔
2 – Pythagorean School
3 – Transmigration
4 – Plato ۴۲۹ سنہ تا ۳۴۷ سنہ ق م۔ قدیم یونانی فلسفی۔
5 – Republic
6 – Aristotle ۳۸۴ سنہ تا ۳۲۲ سنہ ق م۔ قدیم یونانی مشہور فلسفی
7 – Active reason
8 – Epicureanism
9 – Stoicism
10 – Plotinus

سے اس طرح پیدا ہوا جس طرح آفتاب سے روشنی، ہر چیز اُسی سے نکلتی اور اُسی کی طرف لوٹتی ہے۔ انسانی ارواح ہمیشہ سے اجسام میں مقید نہ تھے بلکہ یہ سماوی ارواح تھے جن کو خود خدا کے سوا اپنا بھی شعور نہ تھا لیکن خود غرضانہ انفرادیت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے حیات کلی سے اپنے آپ کو منفصل کر لیا۔ یہ انفصال ایک قسم کا تنزل تھا جو آزادانہ فعل کی سزا ہے۔ اب روح کا کمال ترقی یہ ہے کہ اس انفرادیت کے قفس سے آزاد ہو کر کُل میں مل جائے۔

ان مختلف متقدمین فلاسفہ کے خیالات معلوم کرنے کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں "حیاتِ ابدی" کا خیال کس طرح متغیر اور مستحکم ہوتا گیا۔ اسکے بعد جب مذہب عیسائیت کا ظہور ہوا تو حیات ابدی کے جاننے کا ایک دوسرا طریقہ ایجاد کیا گیا یعنی اُس نے عقل کے بجاے الہام کو اپنا مشعلِ راہ بنایا اور لوگوں کے سامنے دوزخ جنت کو پیش کر کے اس کا یقین دلایا کہ وہ فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اندھے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُسکو کسی نہ کسی طرح آنکھیں مل جائیں۔ اور بعض افراد کی اسی طرح تشفی ہو جاتی ہے، لیکن متجسس دماغوں کو اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اور وہ عقل و استدلال سے اسکو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بہر حال کرۂ ارضی سے لیکر مرکز آفتاب تک ساری کائنات تغیر بے ثباتی کا تماشہ ہی کیوں نہ نظر آئے، انسان اس سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ ان تغیرات با وجود بقا کا متمنی اور اس اعتباری پردہ کے پیچھے ثبات کا امیدوار رہتا ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کی ہمہ گیر واقفیت اور وسعت نظر کے لحاظ سے یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے کہ جدید حکما و فلاسفہ کے نتائج سے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے نہ مطمئن نہیں ہوتا بلکہ وہ ترقی کی جس حد تک پہونچ چکا ہے اس سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر لحظہ منزل مقصود کو اگرچہ نظر سے دُور پاتا ہے لیکن اس سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی کوشش میں اور اضافہ کر کے اسی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ یہی ہوس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی زمانہ میں چین نہیں لینے دیتی اور جس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ سامان آسایش جو پہلے میسر تھا اب راحت طلبی کا مادہ بڑھنے کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ گُر جو ماضی کو تاریک اور مستقبل کو روشن بناتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دُنیا کا کوئی حصہ چاہے ترقی یافتہ حصے سے کتنا ہی دُور کیوں نہ

اپنے داخلی سوالات کے حل کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، عالم ہو یا جاہل، افریقہ کا حبشی ہو یا یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ لیکن انفرادی رسائے خیال، اجتماعی و تمدنی حالات اور منطقی دلائل و استدلالات مختلف انسانوں کو مختلف راستوں پر چلاتے ہیں لیکن یہ بھٹکے ہوئے مسافر جب منزل مقصود پر پہونچتے ہیں تو سب کو ایک جگہ پاتے ہیں۔ اس طرح 'حیات ابدی' کے متعلق بھی مختلف گروہوں نے مختلف نظریات پیش کیے لیکن ان سب کا آخری نتیجہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

اب ہم اجمالاً میلان بقا کے ان نکات کو بیان کریں گے جو فی الوقت مختلف نظریات کی صورت میں موجود ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا مدعیانہ اصرار ہے کہ بقائے دوام کا تصور خود ہی اسکے وجود کا اہم ثبوت ہے جس طرح ڈیکارٹ[1] کا وجود مطلق کے متعلق استنباطی ثبوت تھا۔ یعنی جس میں معلول (تصور) سے علت (خدا) کا استنباط کیا گیا تھا۔

(۲) دوسرے گروہ کا خیال جو کسی قدر قدیم ہے یہ ہے کہ روح ایک ایسی روحانی شے ہے جسکا قیام ہمیشہ کے لیے ایک محدود مادی جسم میں نہیں رہ سکتا۔ پس وہ فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنے جسمانی لبادے کو بدلتی رہتی ہے۔ یہ لوگ تجربہ کہتے ہیں کہ

صد ہزاراں سال بودم در مطار — [illegible] اختیار

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم ز حیوان سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم
(مولانا روم)

ظاہر ہے کہ تشکیک کا سدِ باب کلی طور پر نا ممکن ہے اس لیے بعض دماغوں کی اس سے تسلی نہیں ہوتی اور وہ اپنی پیاس اس طرح بجھاتے ہیں کہ

(۳) اس کائنات میں روزانہ ہر لمحہ غیر شعوری تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کلی تغیر یکایک اور شعوری ہوتا ہے تو اسکو عجیب و غریب یا دوسرے لفظوں میں موت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسان اس سے گھبراتا ہے لیکن اگر حقیقت دریافت کی جائے تو اس

---

[1] Rene Descartes فلسفہ جدید کا مشہور فرانسیسی [illegible] (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

موت میں بھی ایک حیات جاوداں مضمر ہے جسکو ایک شاعر یوں بیان کرتا ہے کہ

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل

عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

(۴) اب چوتھی جماعت بقائے دوام کا اس طرح اثبات کرتی ہے کہ انسان کے خواہشات وجذبات جیسے جیسے وہ ان پر قابو حاصل کرتا جاتا ہے غیر محدود ولا متناہی دکھائی دیتے ہیں اس کا ماضی تاریک اور مستقبل شاندار نظر آتا ہے اور وہ خود کو گذشتہ کی بہ نسبت زیادہ عقلمند اور دُور اندیش پاتا ہے - اب یہ کہنا کہ وہ اپنے نصب العین کو پہونچنے سے پہلے فنا کردیا جاتا ہے خلاف عقل معلوم ہوتا ہے - وہ اس عالمگیر تاریکی کی پیشین گوئی کو ہرگز قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ فطرت پر یہ الزام لگانا کہ اس نے پیاس تو پیدا کی لیکن اسکی تشفی کا سامان مہیا نہ کیا، ایک بمعنی مفروضہ ہے - اس بیان کو عقل قبول نہیں کرسکتی کیونکہ تقاضائے فطرت کے پورے ہونے کے لیے بڑے قوانین موجود ہیں اور فطرت کا یہ حال ہے کہ علت کے ساتھ ہی معلول پیدا کردیتی ہے اور ضروریات کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی آلات بھی پیدا کردیتی ہے - تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہماری نا متناہی خواہشات کی تکمیل کا سامان ہی میسر نہیں - جدید حیاتیات بھی اس بیان کی اس طرح تائید کرتی ہے کہ قوانینِ فطرت مجبور ہیں کہ علت کے ساتھ لازمی طور پر معلول بھی پیدا کردیں - مثلاً عورت کے پستان میں ضرورت کے وقت فوراً دودھ پیدا ہوجاتا ہے - اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ روح موت نیست نہیں کرتی بلکہ جس طرح ایک تخم کو چند روز کے بعد گملہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اسی طرح بقول گیٹے[1] کے روح کی پختگی کے ساتھ جسم کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اور وہ اس قفس سے آزاد ہوکر دوسری جگہ تلاش کرلیتی ہے -

اس لحاظ سے مولانا روم کا خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہر چیز کائنات میں حاجت سے پیدا ہوتی ہے - جرمنی کا مشہور فلسفی ہیگل[2] لکھتا ہے کہ ہر چیز ایک نظام کے تحت پیدا ہوتی اور متغیر ہوتی رہتی ہے - اس بنا پر انسان دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر جو خسارہ اٹھاتا ہے اسکی تلافی نئے دائمی ابدی زندگی سے ہوجاتی ہے -

---

۱- Johann Wolfgang Von Goethe مشہور جرمنی شاعر ۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء

۲- G. W. F. Hegel ۱۷۹۹ء تا ۱۸۵۶ء

اس قسم کے اعتراضات سے بھی بعض اشخاص کی تشفی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایک اور طریقہ سے اس طرح اثبات کرتے ہیں کہ

(۵) فطرت زندگی کے بقا کی سخت کوشش کرتی ہے۔ وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کو پیدا اور فنا کرتی ہے بعض خاص شخصیتیں تو فنا ہو جاتی ہیں لیکن آنے والا چونکہ اپنے پیشرو کا قائم مقام ہوتا ہے اس لیے نوع باقی رہتی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ انسان فنا ہو جاتا ہے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اسی خیال کو بعضوں نے یوں ادا کیا ہے کہ فطرت حقیقی کامل انسان کی متلاشی ہے۔ لہذا جب وہ اپنی کوشش کے نتیجہ کو نامکمل پاتی ہے تو اسے مٹاتی جاتی ہے۔

(۶) ایک اور خیال یہ ہے کہ افراد نوع میں باقی رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کا نقش دوسروں کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو آبِ حیات کا کام کرکے انکی ابدیت کا باعث ہوتی ہے۔

(۷) اس نوعی بقائیت کے علاوہ ایک اور مشروط خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے عناصرِ ترکیبی زبردست ہوں تو ہم زیادہ ورنہ کم باقی رہتے ہیں۔ یعنی یہی وجہ ہے کہ بعض شخصیتیں دنیا کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہو کر خضرِ ثانی بنی ہوئی ہیں اور بعض طوفانِ فنا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس طرح غائب ہو گئی ہیں کہ ان کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابدیت یا بقائے دوام حقیقی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اقبال نے اسی خیال کو وضاحت کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ

اگر جانے بہ تن داری نہ میری　　بمیری گر بہ تن جانے نداری

بعض ہستیوں کو حیاتِ ابدی کے متعلق ان [illegible] کے معلوم کرنے کے بعد بھی وہ اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا جسکے حصول کی تمنا بادشاہ سے لیکر گدا تک کو ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ کو سمندر کا ایک قطرہ فرض کرکے اپنی موت کو سمندر میں جا ملنا قرار دیتے ہیں۔ بہرحال ہر گروہ نے کسی نہ کسی طرح سے ابدیت کی تائید ہی کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص بغیر [illegible] کی تائید کے بات لے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں [illegible] چند فلاسفۂ جدید کے خیالات بھی درج کیے جاتے ہیں۔ فلسفۂ جدیدہ کی [illegible] اپنے [illegible] وجودی فلسفہ کے با وجود کہتا ہے کہ انسانی ذہن [illegible] [illegible] ہو جاتا [illegible] ایک [illegible] باقی

رہ جاتا ہے جو ازلی اور ابدی ہوتا ہے۔ لائبنز[1] کا خیال ہے کہ انسان اپنے علاوہ مونادز[2] (روح)
اور محکوم مناوات (جسم یا مادہ) کا مجموعہ ہوتا ہے، اور ان مناوات میں جو تعامل نظر آتا ہے
وہ اسکی توجیہہ توافق مقدر سے کرتا ہے اس طرح اس کا دعوے ہے کہ انسان فانی نہیں
بلکہ غیر فانی ہے کیونکہ موت نام ہے انفصال مناوات کا۔ ایک دوسرا فلسفی پامپونازی[3]
کہتا ہے کہ بقاے دوام کی نہ تو ہم کلی طور پر تردید کرسکتے ہیں اور نہ اُسکو ثابت کرسکتے ہیں۔
جرمنی کی اعلیٰ ہستی ہیگل کا خیال ہے کہ انسان کی حقیقت نفس ہے اور یہ نفس پہلے فرد کی حالت
میں ہوتا ہے لیکن جب سیاسی اور اجتماعی زندگی میں وہ اعلیٰ التشفی نہیں ملتی جسکی وہ تلاش
کرتا ہے تو وہ روح مطلق بن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طبعی میلانات کی رہنمائی سے الگ ہوکر جب انسان عقل کی روشنی میں
حقائق کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو یا تو اس کا علم زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے یا
بجاے اسکے کہ سکون و طمانیت حاصل ہو اُسکو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال
مادیین کا ہے یعنی وہ اپنی پیچیدہ حیرانیوں میں سرگردانی کے بعد اپنے آپ کو پہلے کی نسبت
اور بدتری میں پاتے ہیں۔ یہ مسلک نہایت قدیم ہے اس کے پیرو بقا کے منکر ہوتے ہیں۔
کیونکہ ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مختلف مرکبات کے ناپائدار خواص میں تحلیل
ہو جاتا ہے اور وہ مرکبات ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو بقاے انسانی کے لیے مفید
نہیں ہوتے۔ اس مسلک کے علمبردار صرف خارج کو حقیقی سمجھتے ہیں اور روح کے سرے ہی سے قائل
نہیں ہوتے کیونکہ انکے یہاں ساری کائنات کی اصل ایک بے شعور و بے حس مادہ ہے جسکی ترکیب و
تحلیل سے مختلف صورتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

چونکہ یہ خیال ہماری زندگی میں ممد نہیں لہذا اسکے پیرو دنیا میں بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں اُنکے
متعلق بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اپنے اس دعوے پر وہ کس قدر کاربند ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا
بیجا نہ ہوگا کہ مادیت کے خلاف موجود ہے جسکو روحانیت کہا جاتا ہے۔ اسکے معتقدین
صرف روح کے وجود کے قائل ہوکر روح کے وجود ہی کو اسکے بقا کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔
بہرحال عام طور پر جب ہم دنیا کی دورنگی پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض

---

[1] Leibnitz [2] Monades [3] Pompanazzi

ـشان مکمنہ کوشش و مشقت کے باوجود آسایش و آرام سے محروم ہیں اور بعض بلا کسی فکر و
ـز دو کے مزے سے زندگی بسر کر رہے ہیں - اب اگر ان بدنصیبوں سے یہ کہا جائے کہ ان کا
ـستقبل تاریک ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی کوششیں ختم ہو جائیں گی - اور اس طرح دنیا
ـ خاتمہ ہو جائے گا - لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ انکی مشقتوں کا ثمرہ آنے والی ابدی زندگی
ـے، تو اس سے اُن کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور اس طرح اُنکی ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں -

اس بیان کا یہ مطلب نہیں کہ حیات ابدی کا خیال ہماری خواہش پر مبنی ہے، بلکہ
ـخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ہر نقطۂ نظر سے قرین عقل ہے - کیونکہ اگر یہ پیش نظر نہ ہو
ـزندگی بے مزہ ہو جاتی ہے اور ہم کھوئے سے جاتے ہیں - جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
ـ کا وجود ہیولیٰ کے سوا باقی نہیں رہتا - کیونکہ حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز ہی باقی نہیں
ـتی - آخر میں ارنسٹ رینان کے اس جملہ پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے، کہ

"جس روز حیات ابدی کا خیال مٹ جائے گا، اُسی روز اخلاقیت اور
روحانیت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا"

محمد مظہر حسین حیدرآبادی
(متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

غزل

ـچشم ظاہر- پھر دیکھ اگر نظر ہے — اس جسم و جاں کے اندر کیا نور جلوہ گر ہے
ـے اپنی غافل- او ماسوا کے مائل — ہے کس طرف ترا دل تو جا رہا کدھر ہے
ـمن ہے تجھ میں- رنگِ چمن ہے تجھ میں — ہر بانکپن ہے تجھ میں- اپنی تجھے خبر ہے ؟
ـیں کچھ نہیں ہیں- دل بھی نہیں ہے اپنا — اُسکو جو دیکھتے ہیں وہ بھی تمہارا گھر ہے
ـہے بیاباں ہر قطرہ بحرِ طوفاں — اِس دورِ ارتقا میں ہر طفل ابو البشر ہے
ـ، جہاں میں پست و بلند یکساں — صورت بھی ایک سی ہے جو زیر وہ زبر ہے

مہجور شکلِ نرگس باغِ جہاں میں ہم نے
کھولی ہیں جب سے آنکھیں اللہ پہ نظر ہے

سراج الدین احمد مہجور
(نبیرۂ صہبائی مغفور دہلوی)

آئینِ اُردو

(موٴلفہٴ مولانا محمد زین العابدین صاحب فرجاد کوٹانوی)

کتاب مذکور کی تالیف میں فاضل مولف نے بہت محنت کی ہے، اور اُردو کے غیر آئینی ملک کو آئینی بنانا چاہا ہے جس پر "عظیم دارالمصنفین اعظم گڈھ" مولانا سلیمان صاحب ندوی کی بایں الفاظ "تائید و تصدیق بھی شایع کی گئی ہے "میں نے ماہ رمضان کی فرصت میں آپ کی پوری کتاب (آئین اُردو) دیکھی۔ مجھے تو کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ ملی۔ زبان سہل اور طریقۂ ادا نہایت آسان ہے"۔ اس موقر ریمارک کو پڑھکر اور عظیم دارالمصنفین اعظم گڈھ کی زبردست شخصیت اور قابلیت پر نظر رکھتے ہوے مجھ ہیچمداں کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ آئین اُردو پر تنقید کرنے کا خیال کروں۔ لیکن تنقید کورانہ تقلید سے بالکل بیگانہ ہے۔ ہر نقاد کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ناقدین عظام کی رائے کا کتاب کے اصل مضمون کو پڑھکر احترام کرے، اور اگر اُسکی ناچیز رائے کچھ مختلف ہو، تو اُسکے اظہار میں پس و پیش نہ کرے۔ نیز مولانا الحاج ظفر الملک کا ارشاد بھی اس قابل نہیں ہے کہ میں اُس پر توجہ نہ کروں۔ بہر حال میں تنقید کے اہم فرض کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کروں گا۔ اور عظیم دارالمصنفین اعظم گڈھ سے اپنی اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں۔

مولانا فرجاد صاحب نے مصباح القواعد اور قواعد اُردو کو صرف و نحو اُردو کے لیے کافی خیال نہیں فرمایا، اس وجہ سے آئین اُردو کی تالیف کی زحمت گوارا فرمائی۔ اپنے اس دعوے کو مدلل بنانے کے لیے مولوی فتح محمد خاں صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب مؤلفان کتب مذکور پر ایک سلسلہ اعتراضات کا بھی شامل آئین اُردو فرمایا۔ باقتضاے بشریت اُن مؤلفان سے غلطی کا ہو جانا ناممکن نہیں ہے، لیکن اکثر جگہ اس سلسلۂ تعریض میں فاضل مؤلف آئین اُردو نے بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک اعتراض کی پڑتال کروں تو یہ تنقید خود ایک ضخیم کتاب بنجائے گی، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، تاکہ فرجاد صاحب کو معلوم ہو جائے کہ ہر آدمی سے لغزش ہو جانا ممکن ہے، اور کسی دوسرے شخص پر نکتہ چینی کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

آئین اُردو صفحہ ۳ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد کے صـ۲۶ پر تحریر ہے

"اور اس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

اس مصرع میں اِصباح کا کسرہ اُل کو دیا گیا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ اصباح بالکسر باب افعال کا مصدر ہے اور اسکے معنی ہیں صبح کرنا، اور اَصباح بفتح جمع ہے۔ اور اس مصرعہ میں جمع برتی گئی ہے نہ کہ مصدر۔ فی الواقع صبح اور اصباح بالکسر الف دونوں مصدر ہیں، اور حاصل مصدر کے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فرجاد صاحب کا اعتراض غلط ہے مصرعۂ مذکور میں اَصباح بفتح الف نہیں ہے بلکہ اصباح بکسرۂ الف ہے۔ سورہ انعام پارہ ۷ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ، وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ، ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ - آیۂ مذکورہ میں لفظ اِصباح کو مع لفظ فالق دیکھنے کے بعد یقیناً جناب فرجاد اعتراف فرمائیں گے کہ اُنکا اعتراض غلط تھا۔ لیکن اِصباح بالکسر الف سے مولف مصباح القواعد نے جس قاعدہ کا استنباط کیا ہے وہ صاف لفظوں میں نہیں بیان کیا گیا۔ مولانا فرجاد نے بھی اُس قاعدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے ہم بھی اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

آئین اُردو صفحہ ۴ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد صـ۴۴ پر تحریر ہے "بعض مصدر ایسے ہیں کہ لازم کچھ ہیں متعدی کچھ، جیسے پڑنا سے ڈالنا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں ڈالنا کا لازم ڈلنا بھی آتا ہے۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ مولف مصباح القواعد نے یہ نہیں لکھا تھا کہ بعض متعدی کچھ ہیں اور لازم کچھ۔ اس لیے فرجاد صاحب اگر پڑنا کا متعدی پاڑنا (صریحاً غلط ہے) بنا سکتے تو کافی تعاقب ہوتا۔ آپ نے ڈالنا کا لازم ڈلنا تلاش کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ میری محدود معلومات میں یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے پڑی کے بجائے ڈلی، یا پڑا کے بجائے ڈلا بولتے ہوئے کسی کو نہیں سنا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کسی حصہ میں ڈلنا اور اُس کے مشتقات، پڑنا اور اُسکے مشتقات کے بجائے استعمال کیے جاتے ہوں۔

فاضل مولف آئین اُردو نے دیباچہ میں مولانا فتح محمد صاحب پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایرین زبان یعنی اُردو کا لگاؤ سامی زبان یعنی عربی سے ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے" بایں ہمہ پھر بھی آپ نے عربی زبان ہی کے قواعد سے اُردو کو ملبوس کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں اس کوشش میں شدید ناکامی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۳۳ پر میں (فی) سے (من۔ و۔ عن) تک (الیٰ حتّیٰ) پر۔

پر - اوپر (علیٰ) واسطے - لیے (ل) کو کلماتِ جرّ یعنی جار اور اُس کلمہ کو جو اُن سے متأثر ہو، مجرور لکھا ہے - اس مد میں اور الفاظ بھی داخل کیے ہیں - اگر فرجاد صاحب انکو حروفِ روابط میں داخل رہنے دیتے تو اچھا ہوتا - لغوی معنی کی کھینچ تان سے انکا نام اُردو میں جار مجرور قرار دینا صحیح نہیں ہے - عربی اصطلاح میں جر زیر کو کہتے ہیں - چونکہ حرفِ جار اپنے مابعد لفظ کو زیر کا اعراب دیتے ہیں اس لیے ان دونوں کو جار مجرور کہنا صحیح ہے، اُردو میں بلکہ فارسی اور انگریزی میں بھی اعرابی عمل کا پتہ نہیں ہے اب فرجاد صاحب کی یہ جدت اگر عربی کی کورانہ تقلید نہیں ہے تو اور کیا ہے -

مولانا فرجاد نے اصطلاحی ناموں کے تجویز فرمانے میں اس قدر فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے کہ مبتدی یا منتہی کوئی بھی اُنھیں اپنے دماغ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا - مثلاً اضافت کے اقسام کو دیکھیے ص۲۲۶ - اضافت مطلق، اضافت ملک، اضافت ابنی اضافت ظرفی، اضافت بادنیٰ تعلق، اضافت توضیحی، اضافتِ مادی، اضافت علت، اضافتِ شبہی، اضافت استعارہ، اضافتِ وصفی - کیا فارسی اور عربی میں اضافت نہیں ہے، مولف خود ہی غور فرمائیں کہ دیگر اہل زبان نے کیا کام کیا ہے اور آپ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور آپ کے کام میں اختصار کی کس قدر گنجائش تھی - اسی طرح کلمات کی اصطلاحی افراط توجہ کے قابل ہے - کلمات جر، کلمات شمول، کلماتِ حصر و تخصیص، کلمات تاکید، کلماتِ قسم، کلمات تشبیہ، کلمات تفریع، کلمات تسلسل کلام، کلمات خلاصۂ کلام، کلمات عطف، کلمات تردید، کلمات اضراب، کلمات استدراک، کلمات استثناء، کلماتِ علت، کلمات شرط، کلمات جزا، کلمات ندا، کلمات جواب، کلمات ایجاب، کلمات تفسیر، کلمات تمنا، کلمات تحقیر، کلمات تزئین کلام، کلمات طبعی، کلمات تاسف و ندبہ، کلمات تحسین، کلمات نفرین، کلمات نفرت، کلمات سختی و شدت، کلمات تعجب، کلمات انبساط، کلمات تہنیت، کلمات قدوم، اگر ایسی ہی اولو العزمی سے کام لیا جائے تو کلمہ کے اضافت و اقسام اس سے کہیں زیادہ پھیلائے جاسکتے ہیں، کیونکہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے اگر بامعنی ہے تو کسی نہ کسی کیفیت کو لیے ہوتا ہے، اور اُس کیفیت کی نسبت سے اُسکو ایک نیا نام دیا جاسکتا ہے - لکھنے والا سب کچھ لکھ سکتا ہے لیکن یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ یاد کرنے والے پر کیا گزرے گی - مرکبات میں بھی اسمائے اصطلاحی کی ہی ریل پیل ہے -

---

* فاضل مولف آئینِ اُردو نے صفحہ ۲۱ - عربی کے خاص حروف ث - ح - ذ - ص - ض - ط - ظ - ع - ق - درج کیے ہیں اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ نو حروف ہندی یا فارسی لفظوں میں نہیں

آتے ہیں - اس کے علاوہ بطور حاشیہ ایک نوٹ بھی دیا ہے " بعض فارسی الفاظ میں جو ان حرفوں کے لکھنے کا رواج پڑگیا ہے وہ صحیح نہیں ہے جیسے گذرگاہ، گذشتہ، صد، شصت، طپش، طشت، چاقو، درحقیقت انکو یوں لکھنا چاہیے: گزرگاہ، گزشتہ، سد، شست، تشت، چاکو - لفظ خانقاہ میں جو کھاٹ ہے: فارسی لفظ گاہ کی جگہ نہیں ہے بلکہ قاہ ترکی لفظ ہے اور خان فارسی - خان کے معنی گھر اور قاہ کے معنی عبادت یعنی عبادت کا گھر - اب مقبرہ کے معنی میں مستعمل ہے"۔

اس موقع پر مولانا فرحاد کو زیادہ تفصیل سے کام لینا چاہیے تھا - گزرگاہ وغیرہ کی کتابت ذال اور زے دونوں سے ہوتی ہے لیکن بہتر ہے - (ز) سے لکھنا چاہیے - لیکن صد، شصت وغیرہ میں یہ طریقہ کتابت عمداً اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہی الفاظ سد، شست کے دوسرے معانی سے ممیز رہیں اس لیے اس ترمیم و تنقیح غلط کہنا مناسب نہیں ہے - فارسی زبان میں بہت سے الفاظ ترکی شامل ہوگئے ہیں اور اس زبان نے یہاں تک ان پر تصرف کرلیا ہے کہ اگر اب انھیں مفرس کہیں تو بیجا نہیں ہے - خود اردو میں بکثرت سے ترکی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں حروف مخصوصہ عربی کے موجود ہیں - مثلاً چاق چوبند، تاب، تاقی، قانون، قرقی، قرمزی رنگ، قزلباش، قشقہ، قندھار وغیرہ وغیرہ - اب اگر آئین اردو کا پڑھنے والا ان الفاظ کو عربی سمجھیگا تو غلطی ہوگی - اگر ان پر غلط ہونے کا فتویٰ لگائیگا تو بھی صحیح نہ ہوگا - اس وجہ سے فرحاد صاحب کو یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ حروف مخصوصہ عربی اردو زبان میں غیر عربی الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں - چاقو بھی ترکی لفظ ہے اور اہل فارس اسکو نظم و نثر میں چاقو ہی لکھتے ہیں چاکو نہیں لکھتے ہیں - خانقاہ کی بھی جو لغوی تحقیق محقق موصوف نے کی ہے اس سے بھی میں مطمئن نہیں ہوں - صاحب بار عجم اور دیگر مولفان کتب لغت کی رائے میں گاہ کا قاہ بنا لیا گیا ہے - اور یہ تصرف عرب سیاحوں اور عقیدتمندوں کا معلوم ہوتا ہے - خانقاہ اُس قیام گاہ یا نشستگاہ کو کہتے ہیں جس میں درویش لوگ ٹھہرتے ہیں یا مجلس سماع منعقد ہوتی ہے - مقبرہ کو خانقاہ نہیں کہا جاتا ہے - یہ ممکن ہے کہ کسی خانقاہ میں کسی بزرگ کی قبر ہو جانے کے بعد اسکو مقبرہ کہنے لگیں - لفظ کاغذ کا بھی روزمرہ اردو میں کثرت سے استعمال ہے - فاضل مولف اسکی بابت کیا کہیں گے - کیا اسکی کتابت بھی (ذ) سے ہونا چاہیے؟ یہ صحیح ہے کہ اصل میں کاغذ ذال کے ساتھ تھا - لیکن اب کاغذ ہوگیا اور کوئی طاقت لفظ کاغذ [illegible] کر سکتی۔

فاضل [illegible] انگریزی [illegible] مرحوم [illegible] اردو [illegible] تعمیر [illegible]

خارج ہو جائیں، یا فصیح اور غیر فصیح الفاظ میں کوئی حد امتیاز قائم ہو سکے تو بھی آپ کی تالیف کی ضرورت بآسانی ذہن نشین ہو سکتی تھی۔ مگر آپ نے تو لفظ "ہار" سے اسم فاعل بنانے کا قاعدہ ہی بنا دیا ہے۔ جو کسی وقت صحیح بھی ہو مگر اب موجودہ اُردو اُسکے جذب کرنے کو عموماً تیار نہیں ہے۔ مولانا فرجاد "مرن ہار" (مرنے والا) اور "جان ہار" (جانے والا) کو بھی اُردو زبان سے خارج فرما کر دائرۂ اُردو کو تنگ کرنا نہیں چاہتے۔

ان ترتیب و تحقیق کی بعض معمولی لغزشوں کے باوجود مولانا فرجاد نے جس محنت سے یہ کتاب تیار کی ہے، اُسکی داد نہ دینا حق فراموشی ہے۔

علم ہجا کی تعریف و تفصیل نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ کی ہے۔ اصطلاحیں قائم کرنے میں کچھ طوالت ضرور واقع ہوئی۔ لیکن کافی ذہانت صرف کی ہے۔ تذکیر و تانیث الفاظ کا کوئی کلیہ قطعی قائم نہیں ہو سکا، نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جس حد تک ہو سکا ہے انتہائی تحقیق سے کام لیا ہے۔ ضمائر پر بھی بلیغ بحث کی ہے۔ اسماء و افعال پر غائر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور اُردو زبان کو ایک سرمایہ دار زبان بنانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اُردو زبان میں آئین اُردو ایک اچھا اضافہ ہے خدا مؤلف کی مساعی کو بارآور کرے۔

کتاب کا کاغذ اور طباعت قابل تعریف ہے۔ ضخامت ۳۱۶ صفحے کی ہے۔ قیمت عہ ہے۔

کتاب نامی بکڈپو اور نامی پریس میرٹھ سے مل سکتی ہے۔

امیر تقا بدایونی

غزل رقم لکھنوی

جنونِ محبت کو رُسوا نہ کرنا — کبھی عقل و دانش کا کہنا نہ کرنا

کتابِ محبت کی تعلیم یہ ہے — کبھی فکرِ دنیا و عقبیٰ نہ کرنا

یہ ہے میرا مسلک یہ ہے میرا مذہب — کسی کو سوا تیرے سجدا نہ کرنا

نہیں خیر اب زُہد اور اِتّقا کی — ستم ہے حسینوں کا پروا نہ کرنا

نہ یوں بے حجابانہ پانی میں اُترو — کہیں خضر کو غرقِ دریا نہ کرنا

ہیں گستاخ بادِ بہاری کے جھونکے — کبھی باغ کی سیر تنہا نہ کرنا

سُنانا تو فرہاد و مجنوں کے قصے — مگر ہمنشیں ذکر میرا نہ کرنا

مبارک تمھیں شوقِ قتلِ دو عالم — فقط ایک خونِ تمنا نہ کرنا

تجھے کیا خبر کس کے ہیں زیرِ سایہ — ہما! ہم فقیروں پہ سایا نہ کرنا

حسیں دل تو لے لیں گے قیمت نہ دیں گے — رقم نادہندوں سے سودا نہ کرنا

نظرے خوش گزرے

۱۹۲۷ء کا اختتام دو المناک حادثوں پر ہوا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی نے دفعتہً رامپور میں انتقال کیا، اور ہندوستان ایک بڑے قومی سردار کی خدمات سے اس نازک وقت میں محروم ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب مرحوم کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک خاندانی نامور اور حاذق طبیب ہونے کے علاوہ وہ ایک وسیع الخیال و بلند حوصلہ رئیس، روشن خیال و خوش تدبیر اور ذی اثر و باہمت خادم ملک و ملت تھے اور گذشتہ ربع صدی کے اندر اس ملک میں جتنی قومی تحریکات رونما ہوئیں سب میں وہ نمایاں حصہ لیتے رہے اور اپنی ہوشمندی و معاملہ فہمی کے بدولت رفتہ رفتہ مسلمانانِ ہند کے قافلہ سالار قرار پائے۔

دہلی کا طبیہ کالج، آیورویدک و طبی کانفرنس، دائیوں کا مدرسہ اور ہندوستانی دواخانہ جن کے انتظامات و نشوونما میں حکیم صاحب کا بہترین عہدِ زندگی صرف ہوا، انکی طبی خدمات کے عظیم الشان کارنامے ہیں۔ اور جس فیاضی و ایثار سے اُنھوں نے ہندوستانی دواخانہ کو جسکی آمدنی سوا یا ڈیڑھ لاکھ سالانہ ہے، طبی کالج کے مصارف کے لیے وقف کردیا۔ اسکی بدولت اُمید ہے کہ انکے معزز پیشہ طبابت کی آنے والی نسلیں ہمیشہ اُنکے کارناموں پر بجا طور پر افتخار کر سکیں گی۔

عام اسلامی تحریکات میں سے ندوۃ العلماء، مسلم لیگ، ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی سب ہی اُنکی خدمت و اعانت کے رہینِ منت ہیں۔ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کی تو بنیاد ہی اُنکے ہاتھوں پڑی تھی۔ اور حق یہ ہے کہ انکی خدمت و اعانت میں حکیم صاحب نے اس درجہ شغف و انہماک ظاہر کیا کہ انکی صحت نے بالآخر جواب دیدیا۔

ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد ابتدا ہی سے اُنکے عزیز ترین مقاصدِ زندگی میں شامل تھا۔ پھر جب ترکی سلطنت کے مصائب و آلام اور پنجاب کے دردناک و ذلت آفریں واقعات سے متاثر ہوکر وہ سیاسیاتِ ملکی میں ہمہ تن منہمک ہوئے تو اُس وقت بھی اس مسلک کے سب سے بڑے علمبردار وہی رہے۔ اور ملکی آزادی کی جنگ میں جو نمایاں حصہ اُنھوں نے لیا اُسکی بدولت وہ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے سردار بن گئے۔ وہ اگرچہ گذشتہ چار یا پانچ سال کے

درد انگیز افتراق اور باہمی خانہ جنگیوں نے مرحوم کو بے حد دل شکستہ کر دیا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نازک سے نازک مواقع پر بھی حکیم صاحب مرحوم نے اتحادِ باہمی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا اور ہر ممکن ذریعہ سے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے جد و جہد کی تا وہ آخر وقت تک اپنا نصب العین سمجھتے رہے۔

حکیم صاحب مرحوم، خاندانی رئیس تھے، رئیسوں ہی کی صحبت میں رہتے تھے، مگر ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ماحول کے خراب اثرات کو اپنی طبعی سلامت پسندی و میانہ روی سے ہمیشہ قابو میں رکھا اور اپنے اثر و اقتدار سے نوعِ انسانی اور ملک و ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔ انکسار، و تواضع، حلم و بردباری، سیر چشمی و فیاضی، متانت و سنجیدگی، اور قدیم مشرقی تہذیب و شایستگی کے اعتبار سے انکی ذات اس دورِ انحطاط میں مغتنمات میں سے تھی۔

مبارک ہیں وہ لوگ، جو دنیا میں ایسی اچھی مصروفیتوں میں زندگی بسر کریں اور اتنی عظیم کامیابیاں حاصل کر کے رخصت ہوں۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

کے بموجب، جو کام انکے رہ گئے ہیں ان میں سے فوری توجہ کا مستحق جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی اٹھا لانے کے بعد حکیم صاحب مرحوم نے اسکی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں اور زندگی وفا کرتی تو اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ طبیہ کالج کی طرح یہ قومی یونیورسٹی بھی انھیں کے ہاتھوں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جاتی۔ مگر قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد نہایت بجا طور پر سردارانِ قوم و بہی خواہانِ ملک کی توجہ اس اہم کام کی طرف منعطف ہوئی ہے، اور امید کرنا چاہیے کہ انشاءاللہ بہت جلد اسکے لیے ضروری سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا۔ حکیم صاحب مرحوم جیسے باکمال بزرگ کے لیے حقیقتاً کسی قسم کی یادگار قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ انکی زندگی بجائے خود ایک یادگار رہے، لیکن اگر کوئی یادگار قائم کرنا ہے تو پھر اس قومی یونیورسٹی سے بہتر کیا یادگار ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب مرحوم میں منجملہ دوسری خوبیوں کے ایک بڑی صفت یہ تھی کہ سفارش کے ذریعہ سے وہ ہزاروں ضرورتمندوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف کو بھی مرحوم کی اس صفت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تھا، اس لیے یہاں اس کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا:

موسیو سیدیو فرانسیسی کی تاریخ عرب کا ترجمہ شایع کرنا منظور تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بھوپال جانے کا

اتفاق ہوا تو کاری محمد امین صاحب مہتمم تاریخ کے مشورہ سے علیا حضرت بیگم صاحبۂ بھوپال کی خدمت میں اسکی طباعت کے لیے درخواستِ اعانت پیش کی گئی۔ مگر علیا حضرت نے فرمایا کہ اسوقت موقع نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی دن حکیم صاحب مرحوم بھوپال پہونچے۔ رات کو محمد امین صاحب کی سیت میں میں بھی شرفِ نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب محل سلطانی سے واپس تشریف لائے اور اثنائے گفتگو میں محمد امین صاحب سے کہا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے درخواستِ اعانت پیش کی تھی سرکار عالیہ نے اُسکے لیے چھ سو روپیہ عطا فرمانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ بعد کو مرحوم کے بیان سے واضح ہوا کہ اگرچہ اُنکو اس درخواست کا کوئی علم نہ تھا مگر خدا معلوم کیسے بیگم صاحبہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ حکیم صاحب اس درخواست کے مؤید ہیں، اور چونکہ علیا حضرت کو اُن کی خاطرداری کا خاص خیال تھا، اس لیے حکیم صاحب سے ملاقات کے دوران میں ازخود فرمایا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے سفارش کی ہے اُس کے واسطے چھ سو روپئے منظور کیے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ خیال کر کے کہ کسی کا کام بن جائے گا، فوراً علیا حضرت کی اس عنایت و توجہ کا شکریہ ادا کیا اور لاعلمِ محض ہونے کے باوجود یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُنکو اس درخواست سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دلی دعا ہے کہ مرحوم کو جنت نعیم سے سرفراز کریں، اور اُنکے پسماندگان علی الخصوص اُنکے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خاں صاحب کو توفیقِ صبر عطا فرمائیں۔ آمین۔

اُمید ہے کہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب بھی اپنے پدرِ نامدار کے نقشِ قدم پر چل کر قوم و ملک کی خدمت میں درجۂ امتیاز حاصل کریں گے، اور اس طرح اہلِ ہند اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے وہ حکیم صاحب مرحوم کے نعم البدل ثابت ہوں گے۔

دوسرا حادثہ وہ بدبختانہ افتراق ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مسلمان سرداروں میں رونما ہوا۔ ایک طرف سائمن کمیشن کی تحقیر آمیز ٹھوکر نے اگر ہندوؤں کے بعض ایسے سرداروں کو راہِ راست دکھا دی جو کل تک فرقہ وارانہ جذبات برانگیختہ کرکے ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحادِ عمل ناممکن بناتے اور اس طرح اپنی گم گشتہ راہی نمایاں کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ لوگ جو کل تک ہندوؤں سے گفت و شنید کرنے اور اُن سے مسلمانوں کے حقوق منوانے کے لیے دوش بدوش کام کرکے جماعتی یکجہتی کی ایک اچھی مثال پیش کر رہے تھے آج نہایت ہی سطحی اور غیر واقع بنیادوں پر الگ ہوگئے اور ساری قوم کو دو گروہوں میں منقسم کرنے کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔

سر شفیع کی رہنمائی میں، نواب محمد یوسف (وزیر صوبہ متحدہ) ملک فیروز خان (وزیر پنجاب) اور مسٹر غزنوی (معزول شدہ وزیر بنگال) اور سرکار دولتمدار کے دو نامی قدرنگاروں خواجہ حسن نظامی اور اور مولانا انیس احمد موجد آل انڈیا مسلم فیڈریشن کی جد وجہد سے لاہور میں ایک جلسہ مسلم لیگ کے نام سے منعقد کر کے ایک نئی آل انڈیا مسلم لیگ بنائی گئی ہے۔ جس کا مقصد وحید یہ ہوگا کہ حکومت کے منشا و مقصد کے مطابق مسلمانوں کی جانب سے سائمن کمیشن کے مقاطعہ کو ناکامیاب بنایا جائے۔

اس جماعت سے توقع بھی اسی قسم کی حرکتوں کی ہونا چاہیے تھی۔ البتہ افسوس ہوتا ہے کہ حسرت و اقبال کی سی ہستیاں بھی اس تماشہ میں حصہ دار بننے پر رضامند ہوئیں اور لاہور کے جدید روزنامہ انقلاب نے جسکے لائق ایڈیٹروں سے ملک و قوم کی بہترین توقعات وابستہ تھیں، اس جماعت کی ہمت افزائی گوارا کی۔

حسرت خدا انکی منفرت کرے، عرصہ ہوا کہ سیاسی حیثیت سے مرحومین میں شمار ہونے کے مستحق ہو گئے ہیں۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی سے تو انکو عداوت تھی ہی، اب مسلم لیگ کے ساتھ بھی وہ اتحاد عمل نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ غریب نے لیڈری کا پیشہ اختیار کر لیا ہے، اس لیے ناممکن ہے کہ خاموشی کی زندگی بسر ہو۔ قوم کی خدمت سیاسی نہیں ہو سکتی تو سیاسی بھوت بنکر قومی سرداروں کو پریشاں کیوں نہ کیا جائے۔ العظمۃ للّٰہ

اقبال کا شاعری کے کمالات پر قناعت نہ کرنا اور سیاسیات کے اکھاڑے میں کود پڑنا مسلمانان ہند کی انتہائی بدنصیبی کی دلیل ہے، اور وضع شئی غیر محلہ کی اس سے واضح تر مثال ملنا آسان نہیں۔

اے خدا ہمیں ہمارے دوستوں سے بچا! ورنہ حسرت کو خانبہادر اور اقبال کو عدالت العالیہ پنجاب کا جج کر دے!

اس پرچہ میں مسٹر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی مصنف دنیائے افسانہ کا ایک تنقیدی مضمون بطور مستقل رسالہ کے شایع کیا جا رہا ہے۔ دنیائے افسانہ پر مفصل ریویو کی ابھی نوبت نہیں آئی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کے ادبی کارنامے کس قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، اور بوستان خیال جیسی کتابوں کو تعلیمیافتہ اصحاب نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا، بلکہ وہ محض عوام الناس کے دل بہلانے کا ذریعہ سمجھی جاتی رہیں، حالانکہ اگر سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو انکے مصنفین کی جانکاہی اور دماغ سوزی شاید ایسی عبث و بیکار نہ ظاہر ہو۔

احسان اپنے سر پر لینا باعث عدم توجہ کا ہوتا تھا چنانچہ اوس مین دو تین امر کو مین نقل کرتا
ہون۔ جس عرصے مین غازی الدین حیدر کے آخر زمانے مین نواب معتمد الدولہ برسرکار تھے اور
جناب چھوٹے چچا صاحب بادشاہ اودھ کے سفیر کلکتہ مین تھے تب نواب معتمد الدولہ
نے جناب ممدوح سے جب لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل کے ساتھ لکھنؤ مین آئے
زبانی کہا کہ مین چاہتا ہون کہ میرے اور تمھارے درمیان مین کوئی شخص میرا اور
تمھارا دونون کا معتمد مقرر ہو۔ جناب چچا صاحب نے جناب والد ماجد مغفور کا
ذکر کیا کہ اون سے بہتر کوئی شخص نہین ملیگا نواب معتمد الدولہ راضی ہوئے اور یہ قرار دیا
کہ ایک نیا عہدہ عدالت کا واسطے انفصال معاملات سرحدی بادشاہی اور
انگریزی کے ہزار روپیہ درماہہ کا مقرر کیا جائے وہ جناب ممدوح کے نامزد ہو
اس ذریعے سے جناب والد مغفور دربار مین حاضر رہین گے اور معاملات مخفیہ کی
تحریرات حضرت کے ہاتھ سے ہوا کریگی جب اس بندوبست کی جناب والد ماجد مغفور کو اطلاع
کی گئی تو آپ نے اس کو قبول اس شرط پر کیا کہ بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کے نام پر
تحریر آپ کے تقرر اور طلب کی کی جائے اور گورنر جنرل بموجب اس کے آپ کو تحریری
حکم دیوین اس صورت مین وہ عہدہ آپ کو قبول ہوگا۔ چونکہ اون دنون مین معاملات
سرحدی کی بدنظمی کی اکثر گورنر جنرل کی طرف سے شکایت ہوا کرتی تھی نواب معتمد الدولہ
اور چھوٹے چچا صاحب کو یہ موقع ملا کہ نواب نے یہان رزیڈنٹ سے اور چچا صاحب نے
کلکتہ مین دفتر فارسی کے سکرتر سے اوس کو تذکرہ کر کے منظور کروایا۔ رزیڈنٹ راضی ہوا
کہ بادشاہ کا خط جناب والد ماجد کے طلب اور تقرر کا گورنر جنرل کے پاس بھیج دین گے
اور سفارش اوس کی منظوری کی کرین گے اور سکرتر راضی ہوئے کہ جب ایسی درخواست
بادشاہ کی آویگی تو حکم تحریری جناب والد ماجد کے نام پر جائے گا۔ یہ امر تو بخوبی طے ہوگیا
صرف خط بادشاہ کا گورنر جنرل کے نام پر لکھنا باقی تھا اور اوس کا بھی مسودہ دفتر مین ہوا تھا

بندوبست جناب والد ماجد کے تقرر کا بادشاہ اودھ کی سرکار مین کہ اس
صورت مین یہ امر عہدہ وقتا ایسا پر مقرر ہو سکتا تھا اور آپ نے قبول نہ فرمایا

مگر اجرا اوس کا غازی الدین حیدر بادشاہ کی بیماری کے سبب سے ملتوی رہا اور بادشاہ اوسی بیماری
مین قضا کر گئے۔ جب میر فضل علی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے نایب ہوئے اور جناب
چچا صاحب کی عہدۂ سفارت سے برخاست ہوئی۔ اون کی جگہ پر جناب عاشق علی خان
بہادر جو قرابت مین راقم کے ماموں ہوتے تھے مقرر ہوے۔ میر فضل علی کو جناب والد ماجد
سے فی الجملہ محبت تھی۔ جب اون کے ہنگام قیام مین فرخ آباد مین جناب والد ماجد دورۂ عدالت
دایر وسایر کے واسطے آتے تھے تو میر فضل علی کی آپ کی فرودگاہ مین کثرت سے آمدورفت
رہتی تھی اور جناب عاشق علی خان صاحب مغفور واسطے رفع شکایت برادرانہ کے کہ جناب
چچا صاحب کی موقوفی کے بعد عہدۂ سفارت پر مقرر ہوئے۔ تھے کہ علی العموم موقوف کرانا
اونھین کی طرف منتسب تھا دونون صاحب نے آپس مین مشورہ کرکے یہ تجویز کیا کہ جو
بند وبست جناب والد ماجد کے واسطے ہوا تھا اور بنا اوس کی نواب معتمد الدولہ ڈال چکے
تھے اوس کی تکمیل کی جائے بموجب اوس کے ایک خط میر فضل علی کا اوسی مضمون کا جناب
عاشق علی خان صاحب کے خط مین ملفوف بریلی مین اوس عرصے مین پہونچا کہ جب
راقم بھی حضرت کے ہمراہ تھا اور عاشق علی خان صاحب اور سجان علی خان صاحب
کمبوہ جو میر فضل علی کے پیشدست تھے اُن دونون کا خط نہایت اصرار اور مبالغے کا اوس
عہدے کے قبول کا آیا اور راقم نے بہت اصرار سے عرض کیا کہ راقم کو یہان اپنا قایم مقام
مقرر کرواکے آپ تشریف لیجائین مگر جناب والد ماجد مغفور نے احسان اون سب صاحبون
کا ایسی حالت مین کہ چھوٹے چچا صاحب کی معزولی ہوئی ہرگز گوارا نہ کیا اور اون خطوط کا
جواب بھی نہ لکھا۔ اور حکیم مہدی علی خان جب پہلے نصیر الدین حیدر بادشاہ
کے عہد مین اور جب دوسری دفعہ محمد علی شاہ بادشاہ کے عہد مین مدار المہام
مقرر ہوئے۔ چونکہ وہ جناب جد امجد مغفور کے شاگرد تھے اس نظر سے اون کو
اور ہمارے اعمام کی طرف تو کچھ توجہ نہ تھا مگر جناب والد ماجد مغفور سے بہت

حکیم مہدی علی خان کی مدار المہامی مین لکھنو کی سیر [illegible]
واسطے معزول [illegible] ہو سکا تھا اسپر موقوف [illegible]

محبت اور تپاک کرتے تھے چنانچہ جب والد ماجد فرخ آباد مین دورے کے واسطے تشریف لاتے تھے ایک کوٹھی اپنے مکانات مین سے آپ کی سکونت کے واسطے خالی کر دیا کرتے تھے اور مکرر دعوت بھی کرتے تھے۔ کچھ اس مین شبہ نہ تھا کہ اگر آپ اون کی حالت نیابت اور مدار المہامی مین مجھے سپرد کرتے تو خواہ مخواہ کوئی عہدہ معقول مجھے دیتے باوصف میرے اصرار کے آپ کو اسطرف توجہ نہ ہوئی۔ اور نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین جب سبحان علی خان صاحب کمبوہ کو نہایت مداخلت تھی ایسی کہ گویا وہی مدار المہام تھے تو اوس عرصے مین خان صاحب ممدوح لکھنؤ مین ایک دن آپ کی ملاقات کے واسطے آئے۔ راقم بھی موجود تھا۔ سبحان علی خان نے از خود بغیر کچھ ادھر کی تحریک کے جناب والد ماجد مغفور سے کہا کہ ان کو بالفعل یہان وطن مین چھوڑ جائیے مین ان کے واسطے کچھ تجویز کروا دون آپ نے انکار کیا اور فرمایا ان کی مفارقت مجھے منظور نہین ہے۔ اوسی عرصے مین جناب چھوٹے چچا صاحب نے ایک عہدہ لکھنؤ مین میرے واسطے تجویز کروایا اور وہ عہدہ میری اپنی غلطی سے نہ ہاتھ آیا۔ یعنی جناب ممدوح نے مجھ سے اوس کے ظہور تک اوس کے اخفا کی تاکید کی تھی۔ اس خیال سے کہ بعضے اور اعزہ اگر سنین گے تو تمھارے اوپر مجھکو اون کی تقدیم کرنا پڑیگی۔ اور جب دفعۃً تمھارا تقرر ہو جائے گا تو اون کی گفتگو کا محل نہ رہے گا۔ یہ امر مین نے آپ کے ایک مشیر کار سے جس کی طرف میرا گمان تھا کہ وہ اوس راز سے واقف ہین اوس کا ذکر کیا حالانکہ آپ نے اون سے بھی مخفی کیا تھا۔ غرض اوھین کی زبان سے شہرہ ہو گیا اور وہ امر بھی واقع نہ ہوا۔ غرض ان سب خیبت رجا سے جو مکرر واقع ہوئین مین نہایت رنجیدہ اور متفکر رہا کرتا تھا مگر جیسا پیشتر ذکر ہوا ہے وہ سب خیبت رجا موجب بہتری کی میرے واسطے ہوئین اس واسطے کہ اون سب امیدواریون مین ڈیڑھ دو سو روپیہ مہینے سے زیادہ کسی مین امید ملنے کی نہ تھی اور اگر کسی ایک عہدے سے اون مین سے مین متعلق

سبحان علی خان کمبوہ جو نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین بڑے صاحب اختیار تھے خود بھی نواب صاحب سے زیادہ [illegible]
[illegible]

ہوجاتا تو ظہور اوس ترقی کا اور فلاح کا جو میرے واسطے ہوئی ہرگز نہ ہوتا۔ الغرض اسی عرصے
مین کہ مین کانپور مین جناب والد ماجد مغفور کے ساتھ تھا آگرے کی گورنری
بنگالے کی گورنری سے یعنی گورنر جنرل سے علیحدہ مقرر ہوئی۔ اور ایک گورنر مع جمیع
دفاتر کے جداگانہ مقرر ہوکے الہ آباد مین آیا اور پہلے مقر اوس کا وہی الہ آباد مقرر ہوا
اون کے ہمراہ مسٹر مکسوین جو آگرے کے کمشنر تھے اور جناب بھائی صاحب مغفور سے
بہت مواعید ترقی کے کرکے گئے تھے اور اونھین کے ایما سے بھائی صاحب نے
مجھکو آگرے مین طلب کیا تھا اور کوئی امر میرے واسطے ظہور مین نہ آیا سکرٹری ہو کے آئے اس واسطے
جناب بھائی صاحب مغفور نے اکبر آباد سے مجھکو لکھا کہ تم اس عرصے مین الہ آباد مین جاؤ اور
مسٹر مکسوین سے ملاقات کرکے میرے واسطے بھی یاد دہی کرو اور اپنے تقرر کے واسطے بھی
عرض کرو۔ چنانچہ مین نے الہ آباد کے سفر کی جناب والد ماجد مغفور سے اجازت طلب کی
آپ نے بنظر تحریر بھائی صاحب کے نہایت بکراہ اجازت دی۔ غرض مین الہ آباد مین پہونچا
اور بعد دو تین ملاقات کے حاکم ممدوح سے اگرچہ اوس عرصے مین صورت ترقی اور فلاح
کی بھائی صاحب کے واسطے نہین ہوئی مگر مسٹر مکسوین نے راقم کے تئین اپنے دفتر کے فارسی
کے کام کے واسطے منشی مقرر کیا۔ تقریب میرے تقرر کی عجیب و غریب ہوئی۔ دو تین ملاقات
کے بعد جب معلوم ہوا کہ کچھ مطلب اون سے نہین نکلتا تو ایک دن مین اون سے رخصت
ہونے کے واسطے گیا باتون باتون مین مین نے اپنے تعلق کا حال قائم مقامی مین عہدہ
انتما کے اکبر آباد مین مذکور کیا۔ کچھ اسناد انگریزی جو اوس عرصے مین متعلق میری کارگزاری
کے تھے اوس کی نقل مین نے اپنے ہاتھ سے کی تھی فی الجملہ اوس مین خامی تھی وہ نقول
مین نے اون کے دیکھنے کے واسطے پیش کین۔ اونھون نے وہ دیکھ کے پوچھا یہ کس کے
ہاتھ کی لکھی ہوئی ہین مین نے اپنے ہاتھ سے لکھنا بیان کیا۔ اون کی میز پر ایک
مسودہ دفتر کی ایک چٹھی کا ظاہر اونھین کا اپنا لکھا ہوا ہوگا رکھا تھا وہ مجھے دیا کہ اس کو

راقم کا تعلق آگرہ کی گورنری کے دفتر مین جو باعث تغیر گورنری کے ہوا

پڑھیو چونکہ بائبل کی انجیل چھوٹی چھپی ہوئی کے پڑھنے کی کچھ مشق مین نے کی تھی مین اوس کو اول سے
آخر تک پڑھ گیا۔ کچھ الفاظ نہین معلوم ہوئے وہ اونھین نے خود بتا دیے چونکہ اوس
عرصے مین حکام کی نہایت خواہش تھی کہ یہان کے شرفا انگریزی سیکھین۔ اور خصوص
اہل اسلام کے بڑے بڑے خاندانون کے لوگون کی نفرت انگریزی سیکھنے سے سب کے
دلون مین تھی۔ اسی قدر میری مشق اور توجہ انگریزی مین موجب نہایت اون کی مسرت
کا ہوا اوسی وقت مجھے دفتر مین حکم حاضر رہنے کا کیا اور اوس دن کا فارسی کا کام میرے
ہاتھ سے لیا پھر گورنر سے استجازت کر کے مجھکو اپنے دفاتر عدالت اور مال مین میر منشی
مقرر کیا۔ رپوٹ میرے تقرر کے واسطے جو گورنر کو لکھا تھا اوس کا مضمون یہ تھا۔ ہمارے دفتر
مین فارسی کام اتنا کم ہے کہ دس روپیہ مہینے کا ایک متصدی اوس کو انجام کر سکتا ہے
لیکن یہ دفتر بہت عالی ہے۔ کم رتبہ آدمی کا یہان رہنا مصلحت نہین ہے اور فلانا شخص
جس کو تین پشت سے مین جانتا ہون اگرچہ وہ اوس خاندان کا ہے کہ اطلاق لقب منشی کا
اپنے اوپر عار سمجھے گا لیکن اس بڑے دفتر مین خصوص میرے سکریٹری کے سبب سے البتہ
وہ قبول کریگا۔ مین چاہتا ہون کہ سو روپیہ ماہینہ اوس کے واسطے مین مقرر کر کے ان
دفاتر مین منشی مقرر کرون گورنر نے منظور کیا اور سنہ ۱۸۳۴ء مین راقم اوس عہدے پر مامور ہوا
قریب ایک برس کے اوس زمانے سے وہ سب دفاتر مع گورنر وغیرہ الہ آباد مین مقیم رہے
اوس کے بعد گورنری آگرہ کی جو پہلے ولایت سے منظور ہوئی تھی اوس کا تقرر پھیر
موقوف ہو گیا اور حکم ہوا وہان صرف لفٹنٹ گورنر ہندوستان کے گورنر جنرل کی معیت
مین رہے چنانچہ کچھ ذکر اوس کا تیسرے باب مین ہندوستان کے ذکر مین ہو چکا ہے مگر
اوس کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ مقر گورنری کا اکبر آباد مقرر ہو اس سبب سے سارے دفاتر
اکبر آباد مین منتقل ہوے اور راقم چند سال معیت اپنے بڑے بھائی کے بہت آسایش سے
رہا اگرچہ بسبب اپنی فضولیون کے اکثر زیر بار رہا مگر مشہور ہے خاک برداری از تودہ کلان

بہتر ہے اوس عہدے پر دو تین کام بہت عمدہ میرے ہاتھ سے بن پڑے۔ ایک مرتبہ
کان پور کے حکام نے تحریک کی کہ جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور
کی تبدیلی اوس ضلع سے کی جائے صدر کے حکام نے بموجب اون کی تحریک کے تبدیلی
جناب ممدوح کی میرٹھ کے ضلع مین قرار دی اور گورنر کے پاس رپوٹ کی جناب چچا صاحب
وہان کی تبدیلی سے اتنے ناراض تھے کہ مستعد استعفا دینے پر تھے اوس عرصے مین گورنر
مسٹر الگزنڈر اس نام ایک صاحب تھے راقم اون کے پاس گیا اور دو عرضیان ایک چچا
صاحب کی طرف سے اور ایک حضرت والد ماجد کی طرف سے لکھ کے لے گیا چونکہ صاحب
ممدوح بریلی کی عدالت دایر و سایر مین مدت تک رہے تھے اور وہان جناب والد ماجد
مغفور دایر و سایر کے قاضی تھے اس سبب سے اون کو بہت محبت جناب والد ماجد سے
تھی چنانچہ جب راقم کی اطلاع ہوئی مجھے بلا لیا اور پوچھا کہان آئے۔ مین نے عرض کیا کہ
ایک ظلم شدید جناب چچا صاحب اور جناب والد ماجد پر ہوا ہے اوس کی دادرسی کے
واسطے حاضر ہوا ہون۔ جواب مین جناب والد ماجد مغفور کا نام لے کے کہا کہ وہ میرے
بڑے دوست ہین ہرگز مین روا نہ رکھون گا کہ اون کو کچھ رنج پہونچے۔ جب راقم نے سب کیفیت
بیان کی تب اون کی میز پر ایک بکس کاغذات کا بھرا رکھا تھا اوس کو کھولا اور وہ رپوٹ
جو صدر عدالت سے اس باب مین آیا تھا دیکھا اور دیکھ کے کہا مجھکو دونون صاحبون کی
دیانت اور امانت مین کچھ شبہ نہین ہے لیکن اون مقدمات مین جو ایک محکمہ کا مرافعہ
دوسرے محکمہ مین ہوا البتہ متخاصمین کو محل گفتگو اور اعتراض کا ہوگا کہ بھائی کی خاطر سے
دوسرے بھائی نے اتفاق اون کی تجویز پر کیا اس سبب سے تبدیلی ایک کسی کی ضرور ہے
بعد اوس کے خود کہا۔ مولوی حکیم الدین خانصاحب کا عذر تبدیلی سے بیان کرو مین نے عرض کیا
بسبب قلت تنخواہ کے اور کثرت مصارف جو اس تبدیلی کے سبب سے پڑین گے اوس کے
وہ متحمل نہین ہو سکتے۔ بیس پچیس برس کے قیام مین کان پور مین ایک مکان سکونت کا بنایا تھا

تبدیلی جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان مغفور کی [illegible]

وہ ضایع ہوگا اور جہان جائین گے وہان مکان بنانا پڑیگا۔ اور یہان سے بسبب قرب وطن
کے بہت مصارف مین تخفیف تھی۔ ان عذرات کو قبول نہ کیا پھر خود کہنے لگے کہ اگر تمھارے
چچا کی بدلی ہو تو تمھارے والد کو کیا عذر ہے۔ مین نے عذر کیا کہ حضور کو غائبا معلوم ہے
کہ کان پور کے حکام نے پہلے عہدہ صدر الصدوری کا والد کے واسطے تجویز کیا تھا چونکہ
اوس مین استحقاق چچا صاحب کا فوت ہوتا تھا اونھون نے قبول نہ کیا اور اون کے تحت
چونکہ بڑے بھائی ہین صدر امینی کے قبول کرنے مین انکار نہ ہوا۔ اب اگر چچا صاحب
کی بدلی ہوگی تو غیر صدر الصدور کے تحت رہنا ہوگا۔ یہ امر بعد تیس برس سرکار کی نوکری
کرنے کے عمدہ عہدون پر منظور نہین ہے مجبوری سے استعفا دین گے فرمایا البتہ یہ عذر
تمھارے والد کا قبول کرنے کے قابل ہے لیکن اگر اون کی اپنی تبدیلی بہ ترقی کسی ضلع مین
ہو کہ وہ خود کہین کے صدر الصدور مقرر کیے جائین تو کیا عذر ہے۔ مین نے عرض کیا اس
صورت مین کیا عذر کی جگہ ہے یہ تو عین آرزو ہے فرمایا خاطر جمع رکھو اسی طرح سے تبدیلی
ہوگی اور اوسی وقت اوس رپوٹ پر حکم لکھا کہ بسبب معذرت قابل قبول مولوی علیم الدین خان
کے بالفعل تبدیلی مولوی حلیم الدین خان کی مناسب نہین ہے جب کسی ضلع مین
صدر الصدوری کا عہدہ خالی ہو تو وہ اوس عہدے پر مقرر کیے جادین اس جواب کے جانے
سے صدر کے حکام خصوص کان پور کے سب حکام بہت متعجب ہوے جب حقیقت حال
منکشف ہوئی تو اوس عرصے مین مسٹر کالڈکٹ نام ایک صاحب کان پور کے کلکٹر اور
مجسٹریٹ تھے اور ظاہرا وہی بہت محرک چچا صاحب کی تبدیلی کے تھے ایک دن چچا صاحب
سے کہنے لگے کہ ایک بیٹے قاضی علیم الدین خان صاحب کے بہت معتبر عہدے پر جو آپ
لوگون کے بڑے فائدے کا ہے نوکر ہین۔ اس عرصے سے قریب دو برس کے بعد اٹاوہ تین
نیا ضلع قرار پایا کہ وہان جج اور صدر الصدور وغیرہ نئے بھرتی کرنے کا حکم ہوا۔ صدر کے حکام
نے مولوی ولایت علی خان نام جو فرخ آباد کے رہنے والے اور وہین کے صدر امین تھے

تقرر جناب والد ماجد مغفور اٹاوہ کی

اون کے واسطے رپوٹ کیا کہ وہ اٹاوہ کے صدر الصدور مقرر ہون۔ جب یہ رپوٹ آیا تو
راقم نے ایک عرضی بجناب والد ماجد مغفور کی طرف سے لکھ کے اور الگزنڈر اس صاحب
کا پچھلا حکم جو چچا صاحب کی بدلی کی رپوٹ پر ہوا تھا دفتر سے نکلوا کے ولایت علی خان کی
نام کی رپوٹ کے ساتھ شامل کروا کے لفٹنٹ گورنر کے بکس مین رکھدی۔ اس عرصے مین مسٹر
تھامسن آگرہ کی گورنری کی موقوفی کے بعد بلقب لفٹنٹ گورنر معین ہوے تھے اونھون نے
سب کاغذات دیکھ کے حکام صدر سے ایک رپوٹ طلب کی اس مضمون کی کہ باوصف الگزنڈر
اس کے حکم کے درباب تقرر مولوی علیم الدین خان جو صدر سے تقدیم مولوی ولایت علی خان
کی ہوئی تو کیا اون کا استحقاق اور لیاقت اور دیانت مولوی علیم الدین خان سے زیادہ ہے
اس استفسار کی کیفیت جو جناب والد ماجد مغفور نے سنی بہت آزردگی کا خط مجھکو لکھا کہ
تم نے عبث یہ تحریک کی اگر حکام صدر نے اپنی پچھلی رائے کے بموجب تقدیم مولوے
ولایت علی خان کی کی تو نہایت موجب سبکی کا میرے واسطے ہے لیکن چونکہ اوس وقت
مین صدر کے حکام بہت پرانے اور فہمیدہ اور منصف تھے اونھون نے جواب مین لکھا کہ
کسی طرح سے مولوی علیم الدین خان پر ولایت علی خان کو ترجیح نہین ہو سکتی اور چونکہ اٹاوہ
کے ضلع کی تجویز کے وقت مولوی علیم الدین خان کا نام زیر نظر نہ تھا اور فرخ آباد مین قلت
مقدمات صدر امینی کی زیر نظر تھی اس واسطے وہ تجویز کی گئی تھی حقیقت مین تقرر مولوی
علیم الدین خان کا اٹاوہ کی صدر الصدوری پر چاہیے چنانچہ جناب ممدوح وہان مامور ہوئے

مولوی شہاب الدین خان مغفور والد ماجد کے چچا کا

اور تیسرا امر راقم کی کوشش کا تقرر جناب مولوی شہاب الدین خان مغفور کا جو بنی عم حضرت
والد ماجد کے تھے سہارن پور کی صدر الصدوری پر ہوا۔ اوس کی حقیقت یہ ہے کہ جناب
ممدوح اوس ضلع مین مفتی اور صدر امین پچھلے بندوبست کے تھے جب نیا بندوبست پیش
ہوا وہان کے جج کی تحریک سے حکام صدر نے تجویز کیا کہ اوس ضلع مین بسبب قلت مقدمات
کے نہ حاجت صدر الصدوری کی ہے نہ صدر امینی کی مفتی عدالت عہدہ افتا اور مفتی شہر

پر مقرر ہوں اور اون کا درماہہ بدستور باقی رہے۔ جناب ممدوح نے ایک عرضی اپنے فوت
استحقاق کی گورنر جنرل کے نام پر میرے پاس بھیجی۔ اوس عرصے مین مسٹر طامسن سکرٹری
آگرے کی لفٹنٹی کے تھے جس کا کام بھی لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل شملہ کے مقام مین کرتے تھے
مین نے وہ عرضی طامسن صاحب کے پاس پیش کی۔ اونھون نے کہا بڑا افسوس ہے کہ اوس
ضلع مین بسبب قلت مقدمات کے صدر الصدوری اور صدر امینی تجویز نہین ہے۔ مین نے
عرض کیا کہ صدر الصدوری تجویز نہ ہونے سے صرف تین سو روپیہ مہینے کی تخفیف ہوئی اگر
وہان قلت مقدمات ہے صرف وہان ایک صدر الصدور رہے اور ضلع میرٹھ سے متعلق
ہو جائے تو کئی ہزار روپے مہینے کی تخفیف ہوتی ہے چونکہ طامسن صاحب کے مزاج مین بڑی
گنجائش تھی یہ امر اون کے دل مین جم گیا اوس رپوٹ کے جواب مین حکام صدر کو لکھا گیا
بالفعل وہان صدر الصدور مقرر کیا جاوے اور اوس ضلع کے توڑنے کی فکر اور دیوانی کا کام میرٹھ وغیرہ
سے متعلق کرنے کا بندوبست آیندہ ہوگا۔ چنانچہ جب راقم عہدۂ میر منشی پر فارسی دفتر گورنر جنرل کے
مقرر ہوا اور کلکتہ کے جانے کے وقت رخصت ہونے کے واسطے اٹاوے مین جناب والد ماجد
مغفور کے پاس گیا آپ نے ارشاد کیا کہ جناب اقدس آلہی کو اصل تیرا تقرر اسی عہدے پر منظور
تھا اور پہلے اوس سے جو اکبراباد کی گورنری کے دفتر پر تیری ماموری ہوئی تھی صرف ان
تینون امور عمدہ کے اہتمام کے لیے ہوئی تھی۔ الغرض ۱۸۳۷ء مین جب لارڈ اکلنڈ گورنر جنرل
نے کلکتہ سے ممالک مغربیہ ہندوستان کا سفر کیا اور دستور کے موافق لفٹنٹ گورنر آگرے کے برخاست ہوکے وہ کام
بھی گورنر جنرل کے ذمے پر ہوا اور چونکہ وہ جا کے شملہ پر ٹھہرے تو وہان آگرے کی گورنری کے
دفتر بھی طلب کیئے راقم بھی بموجب طلب کے شاہجہان آباد مین لشکر کے شامل ہوا۔ چونکہ
سفر مین دستور ہے مشاہرۂ معینہ ہر شخص کا جو حضر مین ہوتا ہے گورنری کے دفاتر مین
بڑھ جایا کرتا ہے اس سبب سے اور بسبب سیر و سیاحت کے ایک گونہ تنعم حاصل ہوا مگر
کوہستان پر بسبب تنہائی بحت کے کچھ اوراد اور وظایف بڑھ گئے اور اوس کی برکت سے

رندمشربی اور آزادی جو طبیعت مین باقتضاے سن شباب تھی وہ جاتی رہی کچھ تقوے زیادہ ہوگیا۔ اور چونکہ جب سے شادی ہوئی تھی دو لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ کمسنی مین گذر گئے اوس کے بعد میرے گھر کے لوگون کو ایک ایسا عارضہ پیدا ہوا کہ مکرر سقوط حمل ہوا اور اولاد کی طرف سے ایک صورت یاس کی سی ہوگئی تھی وہین کوہستان مین خبر ولادت ایک لڑکی کی آئی کہ غرۂ جمادی الاول ۱۲۵۴؁ھ مین وطن مین پیدا ہوئی۔ یہ خبر سن کے راقم نے نہایت گریہ او زاری سے جناب اقدس الٰہی کے حضور مین دعا اوس کی حیات کی کی جس سے مین گویا مایوس ہوگیا تہا۔ کہ اللہ تعالے نے اوس کی زندگی مین بھی برکت دی اور اوس کی ولادت اتنی مبارک میرے واسطے ہوئی کہ اوس کے روز ولادت کے چوتھے یا پانچوین دن گورنر جنرل کی طرف سے مجھے خطاب خانی اور بہادری کا عطا ہوا اور پھر روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ تھوڑے دنون کے بعد خلعت کارچوبی اور سرپیچ مرصع عطا ہوا۔ اور اوس کی ولادت سے آٹھ مہینے کے بعد عہدہ میرمنشی فارسی دفتر گورنر جنرل کا عطا ہوا اور برکت اوراد اور ادعیۂ ماثورہ سے اوس عرصے مین طبیعت مین نہایت فرحت اور بشاشت رہتی تھی اور مدت سے جو ایک انقباض اور دل بستگی بسبب زیرباری کے تھی اگرچہ وہ زیرباری کچھ عرصے کے بعد رفع ہوئی مگر قبض اور دل بستگی اوسی عرصے سے رفع ہوئی اور نہایت بسط طبیعت حاصل ہونا شروع ہوا جو لامحالہ میرے عقیدے مین برکت سے اوراد اور وظایف کے او تقوے کے حاصل ہوا۔ غرض حکم میرے خطاب کے چھاپنے کا کلکتے کے گورنمنٹ گیازٹ مین اور دہلی گیازٹ مین اور آگرہ کے ایک انگریزی اخبار مین جو اوس عرصے مین بنام آگرہ اخبار مشہور تھا اس مضمون سے گیا کہ فلانے شخص کو خطاب خانی اور بہادری کا بنظر حسن کارگزاری اور دیانت اور امانت ذاتی اور حسن خدمت اور قدامت اون کے جد اقضی القضات قاضی نجم الدین علیخان بہادر اور اون کے والد مولوی علیم الدین خان بہادر اٹاوے کے صدر الصدور کے گورنر جنرل بہادر نے عطا کیا تا کہ ہر شخص اون کو اس خطاب کے ساتھ یاد

خطاب خانی اور بہادری کا [illegible] گورنر جنرل سے عطا ہونا اور اون کی [illegible]

کرے۔ چنانچہ دہلی گیازٹ کے آٹھوین اگست ۱۸۳۹ء کے پرچے مین اور آگرہ اخبار کے
گیارھوین اوسی مہینے کے پرچے مین اور گورمنٹ گیازٹ کلکتہ کے اٹھارھوین اوسی مہینے
کے پرچے مین یہ حکم مشتہر کیا گیا۔ ہر شخص کو اس امر سے بہت تعجب تھا کہ اوس زمانے تک
روزگار پیشہ لوگون کو کبھی اس نہج سے خطاب نہین ہوا تھا۔ مجھ سے پیشتر روزگار پیشہ لوگون
مین صرف دو آدمیون کو یہ خطاب ملا تھا۔ ایک مولوی صاحب علی خان مرحوم کو جو مجھ سے
پیشتر میر منشی تھے۔ اور ایک التفات حسین خان لکھنؤ کی رزیڈنٹی کے میر منشی کو مگر اون دونون کو
صرف سند ملی تھی گیازٹ وغیرہ مین وہ حکم نہین چھاپا گیا تھا۔ سند جو راقم کو ملی اوس مین آدھے
صفحہ مین انگریزی اور آدھے مین فارسی عبارت ہے اور فارسی عبارت کے اوپر گورنر جنرل
کی بڑی مہر ہے جو خطوط کے لفافون پر ہوتی ہے اور انگریزی عبارت کے نیچے گورنر جنرل کے
اپنے ہاتھ کے دستخط ہین۔ اس مقام پر صرف فارسی عبارت کی نقل مناسب معلوم ہوئی

سند نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ بنام مولوی مسیح الدین خان بہادر منشی دفاتر عدالت و مال علاقہ ملک مغرب

چون حسن خدمات و قدامت و نیکنامی بزرگان ایشان و نیز امانت و دیانت خود شان
بانجام امور متعلقہ عہدۂ ایشان پسندیدہ خاطر دریا مقاطر آمدہ بنابران درین زمان ازراہ
مزید عنایت و الطاف خطاب خانی و بہادری مرحمت گردیدہ سند ہذا اسمت مضا پذیرفت
لازم کہ بیش از بیش بدیانت و امانت مستعد انجام و انصرام امور متعلقۂ خود باشند و این سند را
ذریعۂ فخر و اعزاز بین الامثال خود شناسند تحریر فی التاریخ دوم ماہ اگست ۱۸۳۹ء مطابق
یازدہم شہر جمادی الاولی ۱۲۵۵ھ مقام شملہ۔ اب اس مقام پر نقل ایک حکایت عجیب کی ضرور
ہوئی جو حقیقت مین وہی واقعہ موجب عطاے خطاب کا مجھکو اور فی الجملہ موجب ترقی کا عہدۂ
میر منشی پر ہوا اور بعد اوس کے وہی واقعہ بانضمام بعضے اور وقایع کے موجب برخاست کا

میر منشی کے عہدے سے ہوا۔ چونکہ اس عرصے مین ہنری طارنس نام ایک ارباب قلم مین سے
نائب سکریٹری گورنر جنرل کے تھے اور اہتمام فارسی دفتر کا اونھین سے متعلق تھا اور لارڈ
آکلنڈ کو ایک شفقت خاص اون پر تھی اور اون کو بہت معتمد رکھتے تھے شملہ مین اونھون نے
الف لیلہ ولیلہ عربی کی مجھ سے پڑھ کے اوس کا انگریزی مین ترجمہ کیا تھا اس سبب سے
اون کو ایک توجہ باطنی میری طرف تھی۔ میرے بہت خیر طلب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی
عہدے پر میری ترقی ہو۔ اس عرصے مین لکھنؤ کے اخبار سے معلوم ہوا کہ التفات حسین خان
میر منشی لکھنؤ کی رزیڈنٹی کے قضا کر گئے۔ ہنری طارنس نے مجھ سے مطلق کچھ نہین کہا اور ایک
اپنی خانگی چٹھی مین کرنیل لو کو جو اوس عرصے مین لکھنؤ کے رزیڈنٹ تھے میری سفارش کی
لکھ بھیجی اس مضمون سے کہ مین ایک شخص بڑے عالی خاندان اور فاضل مستعد اور بالیاقت
کی تمکو نشان دیتا ہون جو بالفعل گورنر جنرل کے دفاتر مین متعلق ہے اگر تم اپنا میر منشی اونکو
کرو تو وضع شے کی اپنے محل پر ہو گی اور مین بھی تمھاری مہربانی کا ممنون ہونگا۔ مین نے
التفات حسین خان کے مرنے کی خبر بھی نہین سنی تھی۔ مولوی صاحب علی خان مرحوم جو اوس
عرصے مین میر منشی تھے اونھون نے آکے مجھے اس کی اطلاع کی اور چونکہ اوس عرصے مین
ہنری طارنس قائم مقام سکرٹری تھے اس سبب سے کہ ولیم جی مگناٹن سکریٹری مستقل چند
عرصے کے واسطے ایک اور کام پر گئے تھے اس سبب سے مولوی ممدوح کو یقین کلی میرے
تقرر کا اوس عہدے پر تھا اس واسطے اونھون نے آکے مجھے مبارکباد دی۔ مین نے جا کے
ہنری طارنس کے پاس نہایت اپنا امتنان ایسے حفظ الغیب کا بیان کیا اور چونکہ اوس
عرصے مین وہ منصب بہت با اعتبار اور اعزاز خصوص لکھنؤ کے ارباب اقتدار کے قلوب مین
تھا۔ اور کرنل لو نے ظاہر اکسی سے کچھ میرے کوائف بھی پوچھے ہون گے اور شاید وہ کیفیت
سفارش ہنری طارنس کی بھی نقل کی ہو گی کہ بعضے وہان کے مقتدر لوگون کے خطوط بطور
اشتیاف کے اس واقعے کی اطلاع کے واسطے اور حقیقت حال دریافت کرنے کے واسطے

...رزیڈنٹی کے میر منشی کا انتقال ہونا ... کے واسطے کرنل لو سے

میرے نام پر آئے۔ اور وہان کی کیفیت یہ تھی کہ کرنل لو نے بمجرد التفات حسین خان کے
انتقال کے مولوی اعز الدین مرحوم سندیلہ کے رہنے والے کو جو گوالیر مین رزیڈنٹی کے
میر منشی تھے اور وہان سے استعفا دیکے اور پنشن لے کے چلے آئے تھے اوس عہدے پر
مقرر کر دیا تھا۔ کرنل لو نے ہنری طارنس کے خط کا جواب نہ لکھا اور راقم نے خبر تقرر مولوی
اعز الدین مرحوم کی سن کے اون سے جا کے عرض کیا کہ آپ نے غائبانہ میرے حال پر شفقت
کی مگر اپنی شومی بخت کا کیا علاج ہے اوس عہدے پر دوسرا شخص مقرر ہو گیا چونکہ سررشتہ کے موافق
منظوری اوس عہدے کے تقرر کی گورنر جنرل کی طرف سے ہوتی تھی اور ہنری طارنس نوجوان آدمی
بت زود رنج تھے اونھون نے فرمایا اب تک تقرر نہین ہوا یہان منظوری کے واسطے رپوٹ نہین آیا ہے
ور کرنل لو بہت عاقل ہے ایسے آدمی کو جسکو کبرسنی سے اور ہاتھ مین رعشہ ہو جانے سے جب طاقت لکھنے کی
قی نہین رہی اوس وقت پنشن ملی ہے ہرگز ایسے عہدے پر مقرر نہین کریگا مطلب اونکا یہ تھا کہ اگر یہان رپورٹ
بھیجین گے تو وہ نامنظور ہوگی چنانچہ اس امر کو نہایت غصہ مین آکے پھر صاف کہا کہ اونکی وجہ نامنظوری کی
کھلی ہوئی ہے کسی کے واسطے رپورٹ وہ کرینگے ہرگز منظور نہین ہوگی مجھے کرنل لو چھوڑ کے کہتے ہین ہمارے خط کی کچھ
قعت نہ کی جواب بھی نہین بھیجا۔ اور فوراً گورنر جنرل کے یہان سے مجھے مخاطب خانی
ور بہادری کے خطاب کا کروا دیا تا کہ کرنل لو کے دل مین میری بہت وقعت ہو جاوے
ور ظاہرا ہنری طارنس نے یہ تقریر کرنیل لو کی شکایت کی جو مجھ سے کی تھی کسی اپنے دوست
و لکھنؤ مین بھی لکھ بھیجی تھی یا کوئی افسر لکھنؤ کا پہاڑون پر آیا تھا اوس سے زبانی کہا ہو کہ
بر کرنل لو کو ہو گئی اور اون کو خوف اپنی رپوٹ کی نامنظوری کا ہوا اس واسطے کمنا ٹن صاحب
معاودت تک اپنے عہدے پر اونھون نے رپوٹ نہ بھیجی جب وہ پھر اپنے عہدے پر
ئے تب رپوٹ بھیجی اور اوس کے ساتھ ہنری طارنس کے خط کا بھی جواب بھیجا اوس مین
ایت معذرت لکھی کہ چونکہ قبل آپ کے خط پہونچنے کے ہم نے فلانے شخص کو مقرر کیا
ر اوس کو برخاست کر کے ہم فلانے شخص کو مقرر کرتے تو علی العموم اہل ہند کے دل مین

آتا کہ گورنر جنرل نے ہماری تجویز کو نامنظور کرکے اپنے دفتر سے ایک شخص کو مقرر کرکے بھیجا
اوس مین قطع نظر میری سبکی کے ہندوستانی ریاست مین ایسے امور کے تصور سے احتمال
مفاسد کا بھی تھا۔ اس واسطے آپ کی مہربانی سے امید ہے کہ ہماری رپوٹ کو منظور
کروائیے اور میرے اوپر احسان کیجیے۔ اور رپوٹ مین لکھا کہ مولوی اعزالدین کو مین نے اس
نظر سے مقرر کیا کہ میرا بہت اعتماد اون پر تھا۔ او رچونکہ گوالیار مین مخالفت آب وہوا سے
وہ مریض ہوگئے تھے اپنے وطن جب آئے تو اون کو صحت ہوگئی۔ لہذا اون کے تقرر سے سرکار
کا نفع ہے کہ اون کی پنشن تخفیف کی مد مین آجائیگی۔ الغرض جب یہ رپوٹ اور ہنری طارنس
کے خط کا جواب آیا تو پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اب رپوٹ نامنظور کرانا بڑی نامردی ہے
خیر آپ کے واسطے انشاء اللہ تعالی کوئی اور فکر لطیف کی جائیگی۔ اور ظاہرا اوسی وقت
سے اپنے دل مین تصمیم عزیمت کرلی کہ دفتر فارسی کا میرمنشی راقم کو مقرر کرے اس واسطے
کہ مکناٹن صاحب کی روانگی کابل کی طرف زیر تجویز تھی اور وہ مولوی صاحب علی خان
مرحوم کو ساتھ لیجانے کے واسطے باہم قرار دے چکے تھے لیکن چونکہ اوس وقت تک یہ
امر کھلا نہ تھا شرح اوس کی نہین کی۔ اس عرصے مین کرنیل لو رخصت لیکے ولایت کو چلے
گئے اور اون کی جگہ پر کرنیل کالفیلڈ نام ایک صاحب مقرر ہوے اور اتفاقات سے مولوی
اعزالدین بھی قضا کرگئے راقم نے جاکے ہنری طارنس سے بیان کیا اور درخواست کی
کہ اب پھر موقع آیا ہے آپ میرے لیے اوس عہدے کے واسطے کوشش فرمائین میرے
نام پر مقرر ہو جائے گا۔ چونکہ صاحب ممدوح اپنے دل مین عزم مصمم میرے تقرر کا دفتر فارسی
مین کرچکے تھے اس امر کی طرف مین نے اون کو کچھ ملتفت نہ پایا مگر مین نے نہایت اصرار
کیا اس سبب سے کہ اپنے وطن مین ایسے معزز عہدے کے حاصل ہونے کو مین ایک
فوز عظیم جانتا تھا۔ اوس وقت اونھون نے فرمایا کہ ہمارا سفارش کرنے کا جی نہین چاہتا
اس واسطے کہ جو ہماری سفارش نہین مانتا ہے تو اوس سے ہم کو عداوت ہوجاتی ہے

مولوی اعزالدین کا انتقال کرنا اور کرنیل کالفیلڈ

ن خیر اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو گورنر جنرل کے نام پر درخواست لکھو ہم کوشش کرینگے
کو ہین سے مقرر کرکے بھیج دیوین۔ بموجب اون کے ایما کے مین نے گورنر جنرل کو
ایست دی۔ اب میرے اوپر یہ امر نہ منکشف ہوا کہ ہنری طارنس جو عزم مصمم میرے
کا میر منشی کے عہدے پر کر چکے تھے اس سبب سے اونھون نے اوس سعی مین جس کا
ہ کیا تھا قصور کیا یا گورنر جنرل نے خود مقرر کرکے بھیجنے مین مصلحت نہ سمجھی۔ میری
ست پر حکم لکھا جو اونھین ہنری طارنس کے خط کے ذریعے سے مجھے ملا کہ گورنر جنرل
ری دیانت اور امانت اور لیاقت اور علو خاندان پر یقین حاصل ہے لیکن چونکہ
صب مین جس کے تقرر کی درخواست مین کرتا ہون اول سفارش رزیڈنٹ کی ضرور
س واسطے مجھے چاہیے کہ مین رزیڈنٹ سے درخواست کرون یقین ہے کہ وہ بنظر
علم اور فضل اور علو خاندان کے ضرور میرے واسطے رپوٹ کرین گے اوس وقت
اسے منظوری ہوگی یہ حکم لاہور مین اواسط نومبر ۱۸۳۳ء مین صادر ہوا۔ لیکن چونکہ راقم نے
طارنس کو اس امر مین خوب مستعد نہ پایا بلکہ بعضے قراین سے یہ میری درخواست اون کے
مزاج معلوم ہوئی مین نے صاحب رزیڈنٹ کے پاس تین مہینے تک درخواست
جب اواسط فبرواری مین راقم لشکر کے ساتھ شاہجہان آباد مین پہونچا جناب
صاحب مغفور جو وہان کے صدر امین مقرر ہوئے تھے وہ میرے اس تامل سے
رخواست کے بھیجنے مین رزیڈنٹ کے پاس میری راے کا تخطیہ کیا اور تاکید کی کہ
ب چونکہ رپوٹ نہین آیا ہے مضایقہ نہین ہے اب بھی درخواست بھیج دو جب
درخواست لکھنؤ مین پہونچی اوس وقت وہ رپوٹ روانہ کر چکے تھے۔ مجھے ایک
خط لکھا کہ اون کو بڑا افسوس ہے میری درخواست کے پہونچنے سے پیشتر وہ رپوٹ روانہ
ور رپوٹ بھی حقیقت مین بھیج چکے تھے لیکن اوسمین لکھا تھا کہ ہمارے پاس اس عہدے کے واسطے بہت سی
الذی ہین اون مین سے چھ آدمیون کا نام ہم نے منتخب کیا ہے جن کی درخواستین اس

رپوٹ کے ساتھ ملفوف ہین ۔ ان چھ درخواستون مین ایک درخواست قاضی محفوظ علیخان
مرحوم راقم کے عمہ زاد بھائی کی تھی ۔ اور ایک درخواست مولوی مجید الدین خان مرحوم راقم
کے والد ماجد کے بنی عم بھائی کے بیٹے کی تھی اور چار درخواستین اور تھین ۔ غالب ایسا ہے
کہ اگر قبل رپوٹ روانہ ہونے کے میری درخواست پہونچتی تو میری درخواست بھی وہ بھیج دیتے
اور ظن غالب قریب بہ یقین ہے کہ گورنر جنرل میری درخواست کو منظور فرماتے ۔ اس
واسطے کہ اُن چھ درخواستون مین جس کی درخواست کو کرنل کالفیلڈ نے ترجیح دی تھی وہ گورنر
جنرل نے نامنظور کی ۔ اوس کی نامنظوری کا عجب قصہ ہے جس کو مین بیان کرتا ہون ۔
الغرض جب کرنل کالفیلڈ کی چٹھی میرے نام پر جس کا مین نے اوپر ذکر کیا آئی مین اوس
چٹھی کو لیکے مسٹر ہنری طارنس کے پاس گیا اوںھون نے وہ چٹھی دیکھ کے فرمایا کہ ہان رپوٹ
آئی مگر جس کے واسطے اوںھون نے رپوٹ کی اوس کا تقرر نامنظور رہا اب یقین ہے کہ وہ
تمھارے واسطے رپوٹ کرین گے ۔ مین نے کہا اگر ارشاد کیجیے تو مین پھر ایک درخواست اون کے
پاس بھیج دون اوںھون نے نہایت تاکید سے منع کیا کہ تم ہرگز اب درخواست نہ بھیجو رزیڈنٹ
اہل فوج سے ہے جو نہایت غصہ ور اور تنگ مزاج لوگ ہوتے ہین اوس کی سمجھ مین آوے گا
کہ نامنظوری اوس کی رپوٹ کی تمھارے ہی تقرر کے واسطے تھی تو وہ اپنی رزیڈنٹی چھوڑ دیگا
مگر تمھین ہرگز نہ مقرر کرے گا ۔ میری سمجھ مین اس مسٹر ہنری طارنس کی ممانعت کا کچھ اثر نہ ہوا
بلکہ بہ نظر اوس جواب کے جو اوس رپوٹ کا گیا تھا میری عقل مین یہ آیا کہ اگر مین دوسری
درخواست نہ بھیجون گا تو کرنل کالفیلڈ سمجھین گے کہ مین مطمئن ہون کہ گورنر جنرل مجھے مقرر
کر دین گے اور اگر مین دوسری درخواست بھیجون گا تو اون کے ذہن مین یہ آویگا
کہ مجھے یقین ہے کہ بغیر اون کے رپوٹ کرنے کے مین نہین مقرر ہو سکتا ۔
الغرض مین نے دوسری درخواست کرنل کالفیلڈ کے نام پر اس مضمون
کی لکھ بھیجی کہ آپ کا عنایت نامہ متضمن اس امر کے کہ آپ کو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۳۴ فروری سنہ ۱۹۲۸

اسبابِ اجتماع

(مترجمہ مسٹر حامد حسن قادری بچھرایونی لکچرار فارسی و اردو سینٹ جانس کالج آگرہ)

جماعت کا ارتقاے عمومی | سوسائٹی یا جماعت کی حقیقت کو سمجھنے اور اسکے اصول و قوانین منضبط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ارتقاے جماعت کا بغور مطالعہ کیا جائے تاکہ یہ واقعہ ہمیشہ ذہن نشیں رہے کہ سوسائٹی کا آغاز نہایت سادہ صورتوں سے عمل میں آیا ہے۔ اس کا ایک ایک جزو، ایک ایک عمل، آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہوا ہے، سوسائٹی ہمیشہ رو بترقی رہتی ہے، ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور متغیر ہوتی رہتی ہے۔ ساکن جماعت یعنی وہ سوسائٹی جسکی ترقی مکمل یا مسدود ہو گئی ہو اشیاء کے باہمی تعلقات و تناسبات کے اندازے کے لیے بے شبہ مفید ہو لیکن اصلی جماعت متحرک رو براہ ترقی جماعت ہی ہے جس کا مطالعہ صحیح و مستقل نتائج نکالنے کے لیے لازم و ناگزیر ہے۔

ارتقاے جماعت کی توضیح دشوار ہے، اس لیے کہ جماعت کے دائرۂ ترقی کے لیے کوئی ایک مرکز متعین نہیں ہوتا، بلکہ اسکی ابتدا مختلف خیالات سے ہوتی ہے۔ اسکی تعمیر کے لیے متعدد سنگ بنیاد رکھے جاتے ہیں، ہر خیال کے سنگ بنیاد پر جماعت کی دیوار اُٹھائی جاتی ہے۔ یہ خیالات کبھی باہم تعلقِ قریب رکھتے ہیں، کبھی الگ الگ عمل کرتے ہیں، اس لیے ارتقاء جماعت

کو سمجھنے کے لیے ہمارے سامنے کوئی ایسا دلائل صریح عمل موجود نہیں ہے جیسا کہ نشو و نما کے درخت سمجھنے کے لیے موجود ہے کہ بیج سے درخت بننے تک تمام درجات و منازل ایک خاص اصول کے پابند اور قطعی و یقینی ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمکو سوسائٹی کے مختلف اعمال و اشتغال حیات پر غور کرنا پڑیگا۔ مثلاً مذہب، حکومت، قانون، نظام سیاسی، صنعت و حرفت، خانگی زندگی۔ ان میں سے ہر چیز جماعت کی سادہ حالت سے پیچیدہ صورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور سوسائٹی کے استحکام اور اسکے اشتغال کی توسیع میں مدد دیتی ہے۔ اس مقام پر سوسائٹی کے اسباب آغاز اور ارتقائے جماعت کی نمایاں شکلیں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

حیوانات کی سوسائٹی | علم اجتماعیات یا سوشیالوجی کا موضوع جماعت انسانی سے بحث کرنا ہے، لیکن حیوانات کی جماعت کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تنظیم و جماعت پسندی کے جراثیم حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں، خواہ میزان حیات انسانی کے مقابلہ میں اسکا پلہ سبک ہو۔ اس سے سوسائٹی کی اعلیٰ تعمیر کے لیے نقطۂ آغاز ہاتھ آجائے گا اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سوسائٹی کی بے قاعدہ و بے اصول ابتدا بھی کسی نہ کسی طبعی بنیاد پر قائم ہوتی اور تناسب عقل کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ یہ ثابت کرنا دشوار ہے کہ حیوانات کے مشاغل اجتماعی نے مسلسل و تدریجی ترقی کرکے جماعات انسانی کے مشاغل اجتماعی کی صورت اختیار کرلی ہے اس لیے کہ ان دونوں انواع کے درمیانی فاصلہ کی پل بندی کے لیے ہمارے پاس سامان مہیا نہیں ہیں۔ لیکن مشاہدہ ہے کہ ادنے انسانی جماعتوں اور اعلےٰ حیوانی جماعتوں میں بہت سے وجوہ مشابہت و اشتراک موجود ہیں۔ ان دونوں میں خاص فرق صرف اجماع کے نوع و تغیر کا ہے۔ قانون تنازع حیات و بقائے اصلح پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون حیوانی جماعتوں اور انسانی سوسائٹیوں پر یکساں حاوی و مؤثر ہے۔ نیز اصول اجتماع بغرض حفاظت بھی دونوں میں مساوی ہے۔ خالص مصاحبت و یکجائی کا شوق البتہ حیوانات میں انسانوں سے کم پایا جاتا ہے۔ محبت جنسی یعنی ذکور و اناث کا انس باہمی دونوں جماعتوں میں عام خصوصی ہے۔ لیکن حیوانات اس امر میں بھی انسانوں سے کم رتبہ ہیں۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسانی گروہوں میں جذبۂ ایثار نفس نہایت سرعت سے ترقی پاتا ہے۔ اور ذہنی قوت نہایت وسیع ہوتی ہے جو تعاون عمل اور تنظیم کو اعلیٰ پایہ پر پہونچا سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہ سکتے ہیں کہ حیوانی جماعتوں میں صرف چند جماعتی اوصاف ابتدائی حالت میں مخفی ہوتے ہیں جو ترقی کے ادنی درجے

سے آگے نہیں بڑھتے اور انسانی جماعات میں وہ اوصاف اور انکے علاوہ اور بہت سے اوصاف ترقی یافتہ حالت میں پائے جاتے ہیں۔

سرسری تقسیم کے اعتبار سے حیوانات کے دو بڑے گروہ ہیں۔ غیر اجتماع پسند و اجتماع پسند۔ جو گویا گوشت خوار و غیر گوشت خوار حیوانات کے مترادف ہیں۔ نوع اول نہایت انفرادیت پسند ہے۔ تنہا شکار کرتی اور تنہا رہتی ہے۔ نوع ثانی حفاظت نفس کے لیے تعاون عمل کرتی اور خاندانی زندگی بسر کرتی ہے۔ اسی لیے اس میں ابتدائی اوصاف اجتماعی ترقی کے پائے جاتے ہیں۔

بعض مختلف النوع پرند خود بخود ایک جگہ رہنے لگتے ہیں۔ لیکن ہر نوع اپنے ہی افراد کی اعانت کرتی ہے۔ بعض متحد النوع پرند خالص اجتماع پسندی اور خانگی زندگی کی خاطر نوعی یا قومی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً انتقال مقام کے وقت سب مل کر سفر کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ڈاروِن نے صراحت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے تمام حیوانی اجتماعات میں اخلاقی احساس مفقود ہے۔ انکے اندر حالات گزشتہ پر غور کرنے اور گزشتہ کا موجودہ سے مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہے۔ اور اسی پر اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔

بارہ سنگھوں کا گروہ اتفاق و امن کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ انکے رہنما جماعات کو خطرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ہاتھی پانچ سے لیکر ڈیڑھ سو تک کی جماعت میں دیکھے گئے ہیں۔ یہ اجتماع خاندانی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے۔ دنیائے قدیم کے بندر خاندانی گروہ بنا کر رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک نوع خاص (سرکوپتھی کس) ایک رہنما کی قیادت میں سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں۔ رہنما تمام لشکر پر حکومت کرتا ہے۔ پاسبان مقرر کرتا اور احکام صادر کرتا ہے جنکو سب سمجھتے اور اطاعت کرتے ہیں۔ دوسری نوع (سائنو سیفلس) اس سے بھی بلند تر تنظیم کا اظہار کرتی ہے۔

غیر منظم جماعتیں

وہ جماعت انسانی جس میں کسی قسم کی تنظیم نہ پائی جائے خانہ بدوش جماعت کہلائی جاتی ہے۔ ان میں بھی ارتقائے اجتماعی کا ایک درجہ ضرور پایا جاتا ہے۔ مکمل خانہ بدوش جماعتوں کی زندہ مثال اب کہیں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ جنوبی امریکہ کے فیوجین اور ایشیا و آسٹریلیا کے بعض قبائل ایسے ہیں جن میں بہت کم تنظیم نظر آتی ہے۔ ان کا کوئی مستقل مسکن نہیں ہوتا۔ ہمیشہ نقل مکان کرتے رہتے ہیں۔ آج بڑی جماعت ہے کل کو چھوٹی ہو گئی۔ عارضی نیابت و رہنمائی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن مستقل نظم و ترتیب قطعاً مفقود ہے۔ انکی تمام زندگی عموماً عادۃً

و اتفاقات کے تابع ہوتی ہے۔ تاہم یہ جماعت انسانی سوسائٹی کے بنیادی اصول اپنے اندر رکھتی ہے اس لیے کہ اسی سادہ و یکرنگ سوسائٹی سے پیچیدہ و مخلوط سوسائٹی پیدا ہوئی ہے۔ اس غیر منظم گروہ کو سوسائٹی کا مادۂ حیات کہہ سکتے ہیں جسکے اندر مواد اجتماعی موجود ہوتے ہیں۔

اسباب جماعت بندی افراد کی جماعت بندی کے متعدد اسباب ہیں۔ جن میں سے زیادہ اہم و نمایاں یہ ہیں: خواہش مصاحبت جس میں جنسی کشش شامل ہے۔ اثرات آب و ہوا۔ ہم سائی غذا۔ قرابت و رشتہ داری۔ حیوانات و انسانات کے ضرر سے تحفظ۔ جوش غلبہ و قوت۔ مشاغل صنعت و حرفت۔ زمین کی طبعی حالت۔ یہ تمام اسباب انسانوں کی قدرتی جماعتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ انسان کی تنہائی پسند زندگی کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ برخلاف اسکے اجتماعی زندگی کے محرکات بہت ہیں۔

مادۂ اجتماع انسان کی غیر منظم و آوارہ جماعت کے اندر بھی چھوٹی چھوٹی اور بہت قریب کا تعلق رکھنے والی جماعتیں پائی جاتی ہیں جو سوسائٹی کے مواد تنظیم ہیں۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے صنعتی گروہ۔ خاندانی سوسائٹیاں، اور مذہبی جماعتیں موجود ہوتی ہیں۔ جو تدریجی ترقی کے ساتھ بے ترتیب جماعت میں ترتیب اجتماعی پیدا کر دیتی ہیں۔ قوت منظمہ کے یہ چھوٹے چھوٹے مرکز خود بخود بغیر ارادہ و کوشش کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر میں انکے تعلقات محدود ہو جاتے اور یہ مختصر گروہ خود مختار بن جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں تقسیم عمل ہی تفریق باہمی سے صنعتی گروہ پیدا کر دیتی ہے۔ چونکہ سوشل جماعتوں کی بنیاد مشاغل صنعت و حرفت پر ہے اس لیے عام تنظیم جماعت کے لیے تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جو کچھ تغیرات واقع ہوتے ہیں ان سب میں تنظیم جماعتی کا اثر ان مختصر و خودساختہ گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ اور نئے نئے گروہ اسی طرح بنتے جاتے ہیں جیسے درخت میں کلیاں پھوٹتی ہیں۔

تعلقات قرابت ابتدائی سوسائٹی میں خاندانی زندگی موجودہ حالت سے بہت مختلف یعنی محدود و باقاعدہ نہ تھی۔ ماں کی اولاد سے محبت اس زندگی کا سنگ بنیاد تھا۔ افراد مشترک کے تعلقات میں اضافہ ہونے کے سبب سے خاندانی جماعتیں زیادہ متحد و وابستہ ہوگئیں۔ ابتداءً افراد خاندان میں قرابت اور صلبی و بطنی تعلقات باعثِ اتحاد تھے۔ آخرکار خاندانی گروہ نظام جماعت کا ایک جزو بن گیا۔ خواہ اسکا سبب معاشرت باہمی ہو یا تعلقات نسلی کا احساس۔ قرابت نسلی نے تنظیم جماعت کے ابتدائی مدارج میں نہایت اہم کام انجام دیا ہے۔ متحد النسل اشخاص

ایک دوسرے کی حفاظت اور دوسرے قبائل کے ساتھ جارحانہ و مدافعانہ جنگ کرتے تھے۔ یہی اتفاق ترقی پاکر اتحاد نسلی و قومی تک وسیع ہو جاتا اور تنافر قومی کا باعث بن جاتا ہے۔

غیروں کو خاندان میں شامل کرنا

قدرتی پیدائش و افزائش کے علاوہ اور صورتوں سے بھی خاندانی گروہ میں وسعتیں پیدا ہوئیں۔ مختلف قبائل کی باہم جنگ آزمائی میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ مفتوح ہو کر شکستہ و منتشر ہو جاتا تھا۔ اور اُسکے بقیۃ السیف افراد جو صدمۂ جنگ کی تاب لاکر زندہ رہتے تھے اُنکے پاس اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ رہتا تھا۔ بجز اسکے کہ دوسرے قبائل میں شامل ہو جائیں۔ اس زمانہ میں کوئی سلطنت، کوئی سیاست، کوئی سیاسی حکومت نہ تھی۔ جو کچھ تھا خاندانوں یا قبیلوں کا نظام تھا۔ اس لیے جب کوئی ایک شخص یا چھوٹا سا خاندان تنہا رہ جاتا تھا تو اُسکے لیے سوا اسکے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یا تنہا دوسروں کے ساتھ جنگ کرے یا اپنی حفاظت کے لیے کسی خاندان میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ یہ رسم جاری ہوگئی تھی کہ زندہ و قوی خاندان و قبائل اس قسم کے بے یار و مددگار افراد یا خاندانوں کو اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔ صرف یہ معاہدہ لے لیا جاتا تھا کہ وہ لوگ اس قبیلہ کے قوانین و رسوم کی پابندی کریں گے۔ اس طور پر خاندانی گروہ قدرتی افزائش نسل اور دیگر قبائل کی شرکت کی وجہ سے وسیع ہوتے رہے۔ دوسرے افراد کسی خاندان میں شامل ہو کر اُسی خاندان کا جزو بن جاتے تھے۔ اُسکے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتے تھے۔ نقلِ مکان و ترکِ وطن میں اُنکے ساتھ رہتے تھے۔ اور اُسی قبیلہ کے پیشے اختیار کر لیتے تھے۔

مستحکم جماعات

سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں بھی چھوٹے گروہوں کو بڑے گروہ بناکر مستحکم و قوی کرنے کا میلان پایا جاتا تھا۔ اُسکے بہت سے اسباب تھے۔ مثلاً خارجی خطرات سے حفاظت کے لیے مختلف گروہوں کو متحد کرنا ضروری تھا۔ ہم قوم و ہم نسل اشخاص کو شناخت و امتیاز کی ضرورت تھی۔ تاکہ ہم نسل گروہ باہم اتفاق قائم رکھ سکیں۔ اور ہم خیال افراد آپس میں مل جل کر رہ سکیں۔ اور سب سے زیادہ مشاغل صنعت و حرفت کی وجہ سے اتحادِ عمل لازم تھا۔ عام گرسنگی کو سیر کرنے کی کوشش نے عام ہمدردی اور عام اتحادِ عمل پیدا کر دیا۔ یہ اتحادِ عمل زندگی کے دوسرے شعبوں تک وسیع ہوگیا اور جو گروہ الگ الگ رہ کر تباہ ہو جاتے اس طریقہ سے باہم متحد و متفق ہو کر مستحکم ہو گئے۔

زبان اور تنظیم جماعت

تنظیم اجتماعی میں زبان کو بھی بڑا دخل ہے۔ زبان مبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہے۔ اس لیے زبان نے چھوٹے گروہوں کی ترقی و استحکام اور بڑے گروہوں کے اتحاد و اتفاق

کے ذریعہ سے جلیل القدر خدمت انجام دی ہے۔ ہم زبان اشخاص باہم کشش رکھتے اور غیر زبان کے لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ مختلف انسانی جماعتوں میں جو مختلف زبانیں بولتی اور مختلف جذبات وخیالات رکھتی ہیں نظام اجتماعی قائم کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بھی جن بڑے شہروں میں مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے لوگ رہتے ہیں وہاں اجتماعیت کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ زبان معاشرت باہمی سے پیدا ہوتی ہے۔ مبادلہ خیالات کی کوشش ایجاد زبان کا باعث ہے۔ جو شخص سوسائٹی کی ایجاد وابتدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے اسکو ایک بڑا سبب (جو ایک عظیم الشان نتیجہ بھی ہے) زبان کی صورت میں ملے گا جو انسانی جماعت پر ہمیشہ موثر رہتی ہے۔

عام احساس اخلاق مختلف قبائل وجماعات کا اتحاد بڑی حد تک عام اخلاقی احساس پر مبنی ہے کسی قوم میں تعلقاتِ قرابت کے متعلق جو قیود ورسوم رائج ہوتے ہیں اُن کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمرشتہ اشخاص کی طرف کشش اور غیروں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر متمدن اقوام میں اخلاقی ترقی بہت سُست، لیکن اُسکے مطالبات نہایت سخت ہوتے ہیں۔ انکے رسوم وروایات قانونی و اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ زیادہ تر اخلاقی پہلو کے لحاظ سے قائم کیے جاتے ہیں۔ اور اکثر مذہبی انکا باعث ہوتا ہے یا ان میں مناسب ترمیمات کر دیتا ہے۔ نظام اجتماعی اپنے آغاز میں مذہب کا نہایت ممنون رہا ہے۔ مذہب کا اصل مقصد انسان اور مافوق الانسان ہستیوں کے درمیان تعلقات کا متعین کرنا تھا۔ لیکن تہذیب اخلاق اور تنظیم جماعت کے فرائض بھی اسکے مشاغل ہوگئے۔ ممکن ہے کہ بغیر اخلاق کے مذہب کا تصور کیا جا سکے۔ لیکن حقیقت میں مذہبی رسوم کی تعمیل اجتماعی حقوق وفرائض کی تشکیل وترقی کا باعث ہو جاتی ہے۔ لہذا اسباب جماعت میں سے ایک قوی سبب نوع بشر کے اخلاقی تعلقات بھی ہیں۔

قیادت جمہور کا آغاز انسان کی تمام تحریکات جن میں اتحادِ عمل پایا جاتا ہے۔ ان میں قیادت یا رہنمائی اور لیڈرشپ کا وجود میں آنا لازم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ قیادت یا لیڈری عارضی و اتفاقی ہو لیکن بجز اس صورت کے کہ عوام الناس عام جوش سے مغلوب ہو کر کام کریں تمام حالتوں میں لیڈرشپ کا پیدا ہونا ناگزیر ہے خواہ خاندان کی سیادت ہو یا قبیلہ کی سرداری یا جنگ کی سپہ سالاری۔ ظاہر ہے کہ نظام جماعت کا استحکام قیادت کی قوت واستقلال کے تناسب سے [illegible]۔ آخر میں یہ قائد خواہ بادشاہ کی صورت اختیار کر لے یا پارلیمنٹ اور کونسل کی شکل پیدا کر لے

کسی نہ کسی صورت میں حکومت اجتماعی کی نیابت و قائم مقامی ضروری ہے۔ گروہ، قبیلہ یا قوم کے استحکام و اتحاد کے لیے یہ بھی بڑی قوت ثابت ہوتی ہے۔

آغاز عدل و انصاف | عدل و انصاف سوسائٹی کی ساخت یا ترقی کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہے۔ جہاں نظام جماعت پایا جاتا ہے وہاں عدل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ بغیر عدل کے خواہ وہ محدود درجہ پر کیوں نہ ہو معاشرت انسانی ایک عام و مشترک بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔ قیام عدل سے قبل قوائے اجتماعی ایک دوسرے کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ افرادِ جماعت میں نزاعات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کا تصفیہ فطری یا قانونی عدل و انصاف کے ذریعہ سے لازم ہوتا ہے۔ عدل فطری کی رو سے قوتِ استحقاق کا ثبوت ہوا کرتی ہے۔ یعنی ایک شخص کا حق عدل فطری کے مطابق اسوقت قائم ہوتا ہے جب وہ اپنے دشمن پر غلبہ پا لیتا اور اپنے معاملہ کا فیصلہ اپنے نقطۂ نظر سے کر لیتا ہے۔ عدل قانونی ایک شخص ثالث کو درمیان میں لاتا ہے جو دو شخصوں کے مختلف باہمی تعلقات کی تحدید کرتا اور اُسکے درست مطالبات پورے کر کے اُسکے حقوق قائم کر دیتا ہے۔

قوت جنگ | غالباً کسی قوتِ عاملہ نے سوسائٹی کی ترقی میں اس قدر کثیر و عظیم انقلابات پیدا نہیں کیے جتنے جنگ نے کیے ہیں۔ جس طرح اقوام و قبائل کے باہمی معرکوں نے سوسائٹی کی قوت کو ترقی دی ہے اُسی طرح افراد کے باہمی مخاصمات و تنازعات نے انفرادی کیرکٹر کو ترقی دی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک یا دونوں فریقوں کا تباہ ہو جانا ممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جو فریق باقی رہ جاتا ہے وہ حیات اجتماعی کے عناصر کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ جنگ نے افراد، قبائل اور اقوام کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ لاکھوں جانیں اور بیشمار خزانے نذر جنگ ہو گئے ہیں۔ تاہم جنگ کی بدولت بہت سے علمی اور صنائع حیات میں ترقی پیدا ہوئی ہے۔ جنگ نے انسان کو اطاعتِ اصلح و اقوی کی تعلیم دی ہے۔ اور ضعفاء سے حسن معاشرت کی ہدایت کی ہے۔ جنگ بڑی ادب آموز ہے۔ وحشی اور غیر مہذب لوگوں کو مہذب حکومت کے قابل بناتی ہے۔ ان وجوہ سے جنگ بھی اسبابِ جماعت میں سے ایک نہایت قوی اور دُور رس سبب ہے۔

ثروت طبعی | آغاز جماعت کا ایک اہم سبب زمین کے طبعی حالات ہیں۔ قطع نظر اس واقعہ کے کہ احتیاج غذا نے ان مقامات پر لوگوں کا اجتماع پیدا کر دیا ہے۔ جہاں غذا آسانی سے بہم پہنچ سکتی

کیا ہے۔ مچھلی اور شکار کی تلاش میں دریاؤں کے کنارے گشت کرتے کرتے مختلف لوگ آپس میں مل کے
اور ساتھ رہنے لگے۔ کوہستانی سلسلوں نے ترک وطن اور نقل مکان کے راستے بند کر دیے اور
اُنکے نشیب یا قریب کی وادیوں میں لوگ آباد ہوگئے۔ اور آبادی زیادہ گنجان ہوگئی۔ سمندروں،
دریاؤں، جھیلوں کو عبور کرنے کی دشواریوں پر غالب آنے کی کوشش میں عرصۂ دراز تک سواحل
آب پر قیام کرنا پڑا۔ اور آخر وہیں مستقل مسکن بنا لیا۔ سخت طوفانوں نے غاروں میں پناہ لینے پر
مجبور کیا اور ابتدائی جماعتیں وہیں قائم ہوگئیں۔ شمالی سیل برف سے بچنے کے لیے جنوبی گھاٹیوں
میں آبادیاں بن گئیں۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ طبعی حالات نے بھی انسان کے اجتماع
و تمدن میں بڑی مدد کی ہے۔

اثر صحبت روئے زمین پر قبائل و اقوام کی نقل و حرکت نے بعض اقوام کو صفحہ ہستی سے
مٹا دیا۔ بعض کو توڑ کر منتشر کر دیا۔ لیکن بعض کو مستحکم و قوی بھی بنا دیا۔ خانہ بدوش قبائل کا اثر تہذیب
قدیم پر، مختلف ایرین گروہوں کا اثر یورپ پر، ہنز کا اثر ٹیوٹنز پر، مختلف یونانی و رومی اقوام
کا اثر ایک دوسرے پر یہ ہوا کہ تنازع حیات میں کامیاب قوموں میں زیادہ گہرا اجتماعی اتحاد پیدا
ہوگیا۔ یہ سوشل دباؤ مختلف قوموں کے درمیان اور ایک قوم کے افراد کے اندر آج بھی کارگر
موثر ہے۔ اور ذاتی حفاظت و سلامت کی خاطر ان میں تنظیم پیدا کیے ہوئے ہے۔ صدہا قدیم اقوام
تنازع حیات میں نیست و نابود ہوگئیں۔ اور انکے حالات صرف آثار صنادید یا باقیات زبان و
ادب سے دریافت ہو سکتے ہیں۔ برخلاف اسکے قوی تر قوموں نے تہذیب کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔
سوسائٹی کے اسباب ایجاد و تشکیل یہ ہیں۔ خاص کر ان ہی وجوہ و اسباب سے جماعت
وجود میں آئی ہے۔ رفتار ترقی میں البتہ اور بھی بیشمار دواعیات و موثرات عامل رہے ہیں۔

اشتغال جماعت

اشتغال جماعت اشکال جماعت سے مقدم ہوتے ہیں یہ امر بالکل واضح ہے کہ اشکال جماعت اشتغال جماعت سے پیدا
ہوتی اور ترقی پاتی ہیں۔ جس طرح کرم صدفی clam or
Shell-fish پیدا ہوتے ہی اپنا صدفی مسکن اپنے اوپر بنا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح
ہر شغل اجتماعی اپنے گرد ایک خاص شکل اجتماعی پیدا کر لیتا ہے۔ اشتغال و اعمال کے لیے کوئی

قدیم سا کنان جرمنی خصوصاً وہ قبیلہ جسنے ۱۰۲ قبل مسیح میں گال پر حملہ کیا تھا Teutons　of Huns　ہنز

منضبط قانون یا اصول قائم نہیں ہوتا جب تک کہ افراد یا اقوام کے اشغال اسکی ضرورت پیدا نہ کردیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر حالات میں عمل کے وجود میں آنے کے بعد از روے قانون اسکی ایک حیثیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اور ایک جماعت کا باقاعدہ قیام عمل میں آتا ہے۔ لہذا اشغال جماعت ہیئتِ اجتماعی کی اصلی قوت ہیں۔ ترکیب جماعت کا اندازہ اُسکے اشغال سے ہوتا ہے اور جماعت کے اعضا و ارکان کا اندازہ اُنکے افعال سے۔ وارڈ کی رائے ہے کہ اشغال اجتماعی کا مقصد انسانی جماعات کا قیام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً اشغال اجتماعی انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ظہور میں آئے۔ اور اُسکے بعد ہیئت اجتماعی رکھنے والی انسانی جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ جماعت کے اعضا و ارکان خصوصی کے خود بخود پیدا ہونے کے بعد اجتماعی سعی وجہد ظہور میں آئی اور اُسکے زیر ہدایت موثرات اجتماعی نے ہیئت اجتماعی میں تغیر و ترقی پیدا کردی۔

جذبات وضبطِ جذبات

ابتدا میں انسان کی پہلی عام سعی عمل احساسات و جذبات کے ماتحت پیدا ہوتی ہے۔ بھوک کا احساس انسان کو تسکین اشتہا کی سعی پر مجبور کرتا ہے۔ سردی کی تکلیف گرم مقامات کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہ نقل مکان کے ذریعہ سے ہو یا کوئی جاے پناہ بناکر۔ مصاحبت و رفاقت کی خواہش معاشرت باہمی کا تقاضا کرتی ہے۔ جذباتِ خوف و محبت بھی مختلف راہِ عمل نکال لیتے ہیں۔ شروع میں صرف نفع ذاتی مطمحِ نظر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی ذاتی منفعت عام اور اجتماعی منفعت تک ترقی پاگئی۔ اور جذبات کی تحدید وضبط سے اعتدال پیدا ہوگیا۔ یہ ضبط ابتدائی اعمال اجتماعی میں سے ایک اہم عمل ہے۔ انفرادی تحفظ وسعت پاکر اجتماعی تحفظ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اشغال انفرادی کے فوری اغراض کی باہمی ترکیب و آمیزش ہی جماعت کی اصلی غرض وغایت ہے۔ موجودہ زمانے میں ہیئت اجتماعی کی اصلی غرض دریافت کرنے کے لیے مکمل ہیئت اجتماعی مع اپنے تمام اشغال متحدہ کے ہمارے سامنے موجود ہے۔ لیکن ابتدائی اشغالِ اجتماعی میں یہ صورت نہ تھی۔ اُس زمانے میں انسان اپنی فطری خواہشات کا اتباع کرتا تھا۔ اور اپنی کوششیں جسمانی، ذہنی، اور اجتماعی ضرورتوں کے پورا کرنے میں صرف کرتا تھا۔ ہیئت اجتماعی پیدا کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ بہرحال موجودہ نقطۂ نظر سے یہ دریافت کرنا دشوار نہیں ہے کہ ان آزاد اور انفرادی اشغال نے جنکا مدعا محض فوری ضروریات کا پورا کرنا تھا کس طرح ہیئتِ اجتماعی کو مع اُسکے مختلف اعضا وارکان اور اعمال و اشغال کے مکمل کرکے ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد پورا کیا ہے۔ جذبات ابتدائی قوتِ عمل کی ایک صورت ہیں۔ اور

ضبط جذبات تنظیم اجتماعی کی تشکیل اور ہیئت اجتماعی کی تعمیر کا باعث ہے۔

تحفظِ جماعت

تحفظ افراد کی کوشش بہ تدریج تحفظ جماعت کی متحدہ کوششوں میں تبدیل ہو جاتی [illegible] افراد کا مادۂ حیات اپنے تحفظ وجود کے لیے عمل کرتا ہے۔ جماعت کا عمل اجتماعی جماعت کے تحفظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مدافعانہ جنگ جس میں سب لوگ متحدہ کوشش کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تحفظ جماعت کی ایک مثال ہے۔ نظامِ حکومت بھی تحفظ جماعت کی ایک شکل ہے جس میں افراد جماعت اپنے فوائد و اغراض کے تحفظ کے لیے سعی کرتے ہیں۔ [illegible] افراد میں باہمی اتحاد پیدا کرتی ہے۔ اور ہر فرد جو کسی جماعت میں داخل ہوتا ہے خواہ وہ اسی جماعت میں پیدا ہوا ہو یا باہر سے شامل ہو کر اس کا ایک فرد بن گیا ہو۔ اس جماعت کے معیار کا التزام اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ اور صاف محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ بلند تر طاقت کا مطیع ہے جسکے سامنے سب کے سر خم ہیں۔ اسکے جذبات اور خواہشیں نہ صرف قدرتی احوال کے سبب سے بلکہ ایک جدید اجتماعی احول کے اثر سے مقید و منضبط ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ قید و ضبط احکام و قوانین و اصول کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور تحفظ جماعت کے لیے ان قوانین کے لازم و لابد ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور اقتصادی عمل ہے جس میں وسعت پذیری کی تحریک [illegible] ہر فرد بلا لحاظ اپنے رفقا کے صرف اپنے لیے غذا تلاش کیا کرتا ہے۔ لیکن بہت جلد [illegible] بھرسانی غذا کا مسئلہ اجتماعی مسئلہ بن جاتا ہے۔ لوگ گروہ بنا کر شکار کرنے نکلتے ہیں اور اپنی متحدہ کوشش کے ثمرات میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک وحشی [illegible] شکار کی جاتی ہے، صرف اس ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتی جس نے اسکو دیکھا یا پکڑا ہے بلکہ تمام خاندان یا قبیلے کی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔ ایک کھیت جسکی حفاظت سب اہل گروہ کرتے ہیں، سب کی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور اسکی پیداوار میں سب شریک ہوتے ہیں۔ ایک مکان کی تعمیر عموماً چند اشخاص کی سعی سے عمل میں آتی ہے جو تمام جماعت کے قائم مقام ہوتے ہیں اسلیے مکان بھی قومی ملکیت متصور ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام اقتصادی زندگی میں انفرادی کوشش کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک فرد کا تحفظ صرف عمل اجتماعی کی بدولت مکمل ہو سکتا ہے۔ ارتقائے جماعت کے دوران میں نظام جماعت اور اقتصادی زندگی کے اشتغال وسیع ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سیاسی و اقتصادی زندگی

کی بلند ترین شکل موجود ہے۔ اقتصادی زندگی بحیثیت مجموعی واحد چیز فرض کی جا سکتی ہے لیکن اس کے الگ الگ اعضا و ارکان اور انکے مخلوط اغراض و مقاصد ہیں جو سب کے سب جماعتِ انسانی کے تحفظ کے لیے متحدہ کوشش کر رہے ہیں۔

بقائے جماعت

انسانی زندگی کی ترقی کے لیے بقائے نوعِ انسان قدرت کا بڑا مقصد ہے۔ یہ مقصد نہایت اہم ہے اور فوری خواہشات کے پورا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ امر یقینی نہیں ہے کہ ابتدا میں انسان کو اولاد کی خواہش تھی۔ لیکن معاشرت و مباشرت کے نتیجہ کے طور پر اولاد پیدا ہو گئی اور صاحبِ اولاد افراد کی مسرت و دلچسپی کا باعث ہوئی۔ انکی ولادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے تحفظ و بقا کے لیے ازسرنو کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچہ خانہ داری کا اصلی سبب ہے۔ بچہ کے طویل زمانۂ ضعف و بیچارگی نے جائے پناہ بنانے اور مستقل مسکن تعمیر کرنے پر مجبور کیا۔ اور ابتدا میں تمام اجتماعی محبتیں بچہ کے گرد جمع ہو گئیں۔ گھر اور وطن کی محبت بھی وہ چیز ہے کہ جماعتِ مجموعی کی بقا کے لیے بہت سی تحریکات کا باعث بن جاتی ہے۔ یکجائی کے سبب سے ایک گھر کے تمام افراد میں جذباتِ محبت و ہمدردی پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں جذبات کے اثر سے افراد میں خاندانی فخر و غرور پیدا ہو جاتا ہے جو اس جماعت کی بقا کے لیے اور اسکو دوسری جماعتوں کے حملہ سے محفوظ رکھنے کے لیے آمادۂ جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ قومی خیال ہمیشہ غالب رہتا ہے اور اس سے قومی زندگی اور حبِ وطن کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ ارتقائے جماعت کے دوران میں بقائے نوع کی کوششوں کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض رسوم و قوانین تعلقاتِ ازدواج کی تحدید کرتے ہیں۔ بعض حالات میں افراد کو اپنے قومی دائرہ سے باہر نکاح کرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ نیز دائرہ کے اندر بھی بہت قریب کے عزیزوں سے تعلقاتِ ازدواج قائم کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ بلکہ قومی دائرہ کے اندر وسیع تر اجتماعی گروہوں میں سے انتخابِ زوجات کی اجازت ہوتی ہے۔ اجتماعی گروہ اپنے حفاظتِ بقا و قیام کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اسکو ہمیشہ بیرونی دشمنوں سے جو اسکی تباہی کے درپے ہیں، مدافعت کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ امراض کے دفعیہ کے لیے ہر ممکن کوشش پر عمل کرنا پڑتا ہے اور ایسے قوانین و رسوم قائم کرنے ضروری ہو جاتے ہیں جو بقائے حیات کے بہترین ذریع ہوں۔ یہ اجتماعی سعی و عمل سوسائٹی کے وجود کے لیے قطعاً ناگزیر ہے۔ اور حیاتِ اجتماعی کی بلندترین و مکمل ترین اشکال میں یہ سعی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

ترقی جماعت

معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور اجتماعی گروہ کی قوت کو ترقی دینے کے لیے مختلف کوششیں عمل میں آتی ہیں۔ انھیں میں وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو انسان کے جسمانی ضروریات کے رفع و اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں۔ ذرائع غذا کی وسعت و کثرت اور جنس غذا کی بہتری و خوبی جسمانی زندگی کو زیادہ ہموار کر دیتی ہے۔ اور جماعت کو اصلاح و ترقی کا موقع مل جاتا ہے۔ سوسائٹی کی مادی حالت کی ترقی کے لیے سائنس اور ایجاد و اختراع بھی نہایت مفید اشتغال ہیں۔ قوت جسمانی کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی تعلیم اور حفظان صحت کی تدابیر بھی نہایت اہم اشتغال اجتماعی میں شامل ہیں۔ مسرور و پُرلطف زندگی بھی ترقی جماعت کے لیے ممد و معاون ہے، ہزاروں آدمی دوسروں کے لیے ذرائع مسرت بہم پہونچانے میں مشغول رہتے ہیں۔ کھیل کا عنصر قوم کی اعلیٰ ترقی اور بہترین فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ اجتماعی اشتغال اجتماعی کا یہ شعبہ افزایش نسل کے لیے کسی دوسرے شعبۂ عمل سے کم اہم نہیں ہے۔

اخلاقی تحریکات و اشتغال

ہر اعلیٰ منظم قوم میں چند اخلاقی قوانین ہوتے ہیں جو ضبط تحریر میں نہیں آتے۔ ان قوانین کا سوسائٹی کے اتحاد و ترقی پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ تنظیم جماعت کا کھلا مقصد قوم کے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے۔ استعمال شراب سے باز رکھنے والی سوسائٹیاں، ظلم حیوانات کو روکنے والی جماعتیں، رفاہ عام کی کثیر انجمنیں جو کسی خاص فرقے یا گروہ کی اصلاح و فلاح کو اپنا مقصد سمجھتی ہیں۔ اسی مقصد تنظیم سے تہذیب اخلاق کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔ ہر تحریک جس کا مدعا افراد قوم کی معاشرت کو پاکیزہ بنانا اور جمہور کی صفات حسنہ اور حیات طیبہ کو ترقی دینا ہو وہ سوسائٹی کو بلند تر معیار کی طرف رہنمائی کرتی اور اسکی قوت و جوش میں اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح کی کوششیں صرف معاشرت کو بہتر نہیں بناتیں بلکہ قوم کی استعداد محنت و سعی کو بھی ترقی دیتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی عمر طویل ہو جاتی ہے اور اسکو اپنی بقا کے لیے مواقع جلیلہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

تحریکات اخلاقی کے برابر ہی اُن تحریکات و اشتغال کا درجہ ہے جو حُب جمال[۱] یا حسن پسندی کو ترقی دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حُب جمال کا عام اثر حب صداقت و ترقی قومی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور اس ذوق کے فقدان یا قبح و بدصورتی کا عام نتیجہ سوا حیات اجتماعی کے تنزل و انحطاط کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ اُن

۱ـ الله جمیل و یحب الجمال۔

جذبہ و احساس کا صحیح استعمال شرط ہے کہ وہی باعثِ برکات و انعامات ہے۔ سو صحیح استعمال کی کچھ اسی موقع پر شرط نہیں بلکہ ہر کام، ہر تحریک اور ہر جذبہ میں صحیح استعمال ہی منتج نافع ہوا کرتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ فنون لطیفہ کا استعمال اخلاق و بداخلاقی دونوں کا متحمل ہے۔ فنون لطیفہ قوم کے سطح نظر کو وسیع اور خیالات کو بلند کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک ہنگری پر موسیقی کا یہ اثر ہوا کہ وہاں سُست جذباتی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہ بھی رائے ہے کہ جرمنی میں کثرتِ موسیقی، ہمیشہ جذبات پر اثر کرتے رہنے کی وجہ سے موجدانہ و منطقیانہ خیالات کو تباہ کر رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عام و مروج موسیقی سوا آلہ تفریح ہونے کے کوئی مفید اثر پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں؟ بے شبہ جس طریقہ سے اس کا استعمال جاری ہو گیا ہے وہ موسیقی کے بہترین اثرات کی تباہی کا باعث ہے۔ لیکن یہ مثالیں کلیہ مستثنیات میں داخل ہیں۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ اشتغال جو نیچر اور آرٹ کے حُسن و جمال کے مطالعہ میں مدد دیتے ہیں ترقی پذیر جماعت کے لیے لازم دنا گزیر ہیں۔

اشتغال تہذیب آموز

علم اجتماعیات میں تہذیب عبارت ہے تبدیل عقائد اور انقلاب سیرت سے۔ یعنی کسی قدیم عقیدے کو بدل کر جدید و بہتر عقیدہ اختیار کرنا اور خیالات و اعمال کی پرانی عادتوں کے بدلے نئے اور اعلیٰ خیالات و اعمال کی عادت پیدا کرنا تہذیب کہلاتا ہے۔ وہ اشتغال اجتماعی جو تہذیب جماعت پر بالواسطہ موثر ہیں مذہبی، تعلیمی اور مختلف اشتغال و تحریکات ہیں۔ ہزاروں اشخاص جو تبلیغ مذہب میں مصروف ہیں سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ عقائد مذہبی کو بدل دینے یا کسی خاص اصول کے مطابق عقائد کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہب ابتداءً عقیدے پر اور اسکے بعد سیرت و کردار پر اثر کرتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا اثر سوسائٹی سے متعلق ہے عقائد کو ادنیٰ سے اعلیٰ کر دینا اور کردارِ جماعت کو ان عقائد کے تابع بنا دینا مذہب کا اصلی کام ہے۔ اس حیثیت سے مذہب تنظیمِ اجتماعی کا نہایت زبردست آلہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جماعت بغیر مذہب کے بھی قائم رہ سکتی ہے لیکن مذہب ہمیشہ ترقی پذیر جماعت کا عنصر بنا رہا ہے۔ اور اقوام کے عقائد سلیمہ کا تنزل عظمتِ قومی کے تنزل کا مترادف رہا ہے۔

سوسائٹی کی ترقی کے لیے سب سے بہتر اور سب سے صحیح ذریعہ اشتغال تعلیمی ہیں۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ بجبر یا بہ رغبت رفع جہالت و تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ قوت شعور کو ایک خاص سطح پر قائم کیا جائے۔ معیار حیات

و مقصد زندگی کو بلند کیا جائے - جماعت کی قوتِ عمل سب سے زیادہ اسی میدان میں نمایاں ہوتی ہے - تعلیم ہی وہ چیز ہے جسکے ذریعہ سے جماعت کو عمل جدید کی شاہراہیں نظر آتی ہیں - سب سے سوسائٹی کی بلند ترین اشتغال میں سب سے زیادہ عالم گیر و زوردار اشتغالِ اجتماعی اُنکا مدد تعلیمی قوتوں سے ظاہر ہوتے ہیں - یہ قوائے تعلیمی جماعت کے اتحاد و استحکام اور ترقی کا باعث ہیں اور اُسکی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں -

سائنٹیفک تحریک بھی تعلیم کا ایک حصہ ہے - کیونکہ اگرچہ سائنس کا مقصد تحقیق حق اور تلاش صداقت ہے لیکن اسکی اصلی غرض و غایت نسل انسانی کی تہذیب و ترقی ہے - جس وقت سائنس کے ذریعہ سے کوئی صداقت دریافت ہوتی ہے تو فوراً اس بات کی انتہائی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں کہ اس حقیقت کو فوائد عامہ کے لیے استعمال کیا جائے - اس طور پر سائنس نسل انسانی کے مادی فوائد کے لیے ضروری ہے - جب کوئی قوم تہذیب جدید اختیار کرتی ہے اور اُس علم حیات سے کام نہیں لے سکتی جو سائنس تعلیم کرتا ہے تو وہ بجائے ترقی کے تنزل کرنے لگتی ہے - یہ اصول اُسوقت زیادہ عیاں طور پر مشاہدہ میں آتا ہے جب وحشی اور غیر متمدن قومیں تہذیب جدید کے زیر اثر آتی ہیں اپنے اختیار کردہ طرز معاشرت میں سائنس سے پورے طور پر کام نہ لے سکنے کی وجہ سے مہذب و شائستہ علوم و فنون کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں - وحشی اقوام کیلیے بجائے اسکے کہ بغیر حقائق سائنس کو اختیار و استعمال کیے مہذب بننے کی کوشش کریں یہی بہتر ہے کہ صرف فطرت و قدرت کو اپنا رہنما بنا لیں -

کوآپریٹو سوسائٹیاں یا جماعات تعاون عمل

عام اشتغال اجتماعی میں تعاون عمل کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں کا ذکر بھی ضروری ہے - ان کا منشا یہ ہے کہ حصول اغراض کے لیے مقصد و عمل دونوں میں اتحاد پیدا کیا جائے گروہوں کے مل کر کام کرنے سے ترقی جماعت کے لیے بیشمار اشتغالِ اجتماعی سامنے آجاتے ہیں - اس موقع پر مقاصد مقدم و مؤخر بالفعل و ما بعد میں امتیاز کرنا لازم ہے - ایک ایک جماعت جو لوہے کی ایک مقدار کثیر کو فراہم کرنے اور کارآمد بنانے کے لیے مقرر کی جاتی ہے اس کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ آمدنی پیدا کی جائے - لیکن سوسائٹی کی اصلی خدمت یہ ہے کہ عمدہ اور مفید قسم کا لوہا کثیر مقدار میں حاصل کیا جائے - جس سے تمام قوم کی مادی اور اجتماعی زندگی میں ترقی نمایاں ہو جائے گی - لیکن سوسائٹی کی ترقی کیلیے اس قسم کا تعاون عمل اُسوقت درست و کارگر ہو سکتا ہے جب ایک جماعت قوم کے اجتماعی و سیاسی فوائد کی توسیع و اشاعت کی غرض سے ایک شہری انجمن

[illegible] کرے۔ اس طرح کا تعاون عمل عام ہے اور اشغال اجتماعی کا ایک ممتاز شعبہ ہے۔
[illegible] اجتماعی [illegible] کا پتہ اسوقت چلتا ہے جب فلاحِ قوم کے لیے جذبات، خیالات
اور قوت ارادی میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ اجتماعی تعاون عمل کا خلاصہ یہی ہے۔ اسکی تعمیل کا انحصار
[illegible] ضمیر اور جمہور کی قوت ارادی پر ہے۔

کلام ریاض

[illegible] سے کچھ مرے دشمن نے کیا کہا
دشمن کی سن کے اس بتِ پرفن نے کیا کہا

[illegible] جو کڑک کر ہی اُٹھی
گل ہنس پڑے یہ بلبلِ گلشن نے کیا کہا

[illegible] دشمن تم [illegible] آ رہے ہو اب
کھل کھل کے تیرے سامنے جوبن نے کیا کہا

دکھلائی [illegible] کے مجھے یہ چھری سے آج
تو نے تو کچھ نہیں تری چتون نے کیا کہا

سنبل سے [illegible] باتیں جو دیکھی تمھاری زلف
دیکھی مسی جو لب کی تو سوسن نے کیا کہا

[illegible] مجھے وطن۔ پیچھے آ رہا ہو پھر نصیب
غربت میں مجھ کو لوٹ کے رہزن نے کیا کہا

[illegible] دکھائے حشر میں میرے لہو کے داغ
قاتل کی آستین سے دامن نے کیا کہا

[illegible] تم سے لب مسی آلودہ کا جواب
یہ چھوٹے منہ سے غنچۂ سوسن نے کیا کہا

[illegible] سمجھو تو ہم سے بدلا جو رنگِ رخ
جھک کر یہ تیرے کان میں دشمن نے کیا کہا

[illegible] کو۔ لوٹے جاتے ہیں۔ ہم دونوں ہاتھ سے
تو نے بھی کچھ سنا ترے جوبن نے کیا کہا

دامن کا چاک تھا جو ہنسا کچھ رفو کے وقت
بے منہ کی تھی وہ چپ رہی سوزن نے کیا کہا

[illegible] صبا اسیرِ قفس کو دیا پیام
جھک جھک کے تجھ سے شاخِ نشیمن نے کیا کہا

کچھ ہوش ہے [illegible] طور کس طرح
آتش [illegible] ایمن نے کیا کہا

[illegible] میں سو ساغر بڑھائے ہاتھ
آنکھیں دکھا کے ساقیِ پرفن نے کیا کہا

ہم تو خدا پرست بھی تھے بت پرست بھی
ہم کو ریاض شیخ و برہمن نے کیا کہا

مَن اَتَی اللہَ بِقَلبٍ سَلِیم؟

کون ہے انجمن آرائے چمن
کون ہے جلوہ گرِ خلدِ نعیم

گدگداتی نہیں غنچوں کو صبا
مسکراتی نہیں کیوں آج نسیم

دم بخود غنچے ہیں، گُل ہیں خاموش
منتشر حال ہے کیوں آج شمیم

داغِ حسرت ہے کہ لالے کا جگر
حالِ نرگس نظر آتا ہے سقیم

نذر مقبول زرِ گُل کی نہیں
آج بیکار ہے سب کا زر و سیم

لائقِ بزم نہیں کوئی جلیس
باریاب آج نہیں کوئی ندیم

ہمکلام آج نہیں ہے کوئی
آ گئے صیغۂ غائب میں کلیم

بے نیازی کی نمائش کیوں ہے
خاکساروں کا ہے احوال سقیم

بیقراری ہے پرستاروں کو
مضطرب حال ہیں احبابِ قدیم

قلب تصویر ہے حیرانی کی
چشمِ اُمّید ہے آئینۂ بیم

اذن پاتا نہیں کیوں آج کوئی
ہے کہاں وہ کرمِ عامِ کریم

آج مستور ہے کیوں شانِ کرم
آج محجوب ہے کیوں لطفِ عمیم

دل میں میرے جو یہ گزرے خطرات
مجھ سے گویا ہوا یوں حلمِ حلیم

کن خیالات میں تو ہے گستاخ!
وسوسہ زا ہے ترا نفسِ رجیم

باریاب آج بھی ہوگا ہر شخص
ہے وہی رحم و کرم شانِ رحیم

فیضیاب آج بھی ہوں گے سب لوگ
ہے بدستور کھلا بابِ کریم

نہ تو مستور ہے وہ شانِ کرم
اور نہ محجوب ہے وہ لطفِ عمیم

دیکھنا ہے یہ مگر "حسن" کو آج
کس کی قسمت میں ہے یہ فوزِ عظیم

عشق میں اپنے جو کامل نکلے
"حسن" کو نذر کرے قلبِ سلیم

ابو عمر

نقلِ مکان

ملکِ اطالیہ[1] کے صوبۂ انکونا[2] میں شہر انکونا سے پندرہ میل جنوب و مغرب شہر ماسیراتا[3] سے سو نہ میل شمال و مشرق اور بحیرۂ ایڈریاٹک[4] کے اطالوی ساحل سے تین میل جنوب۔ مشرقی کوہستان اپی نائینس[5] کے سلسلے کی ایک نیچی پہاڑی کی ڈھلوان سطح پر، دریائے میوسون[6] کے داہنے کنارے ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر آباد ہے، جسکا نام ہے لورئیٹو[7]۔

اس شہر کی عمر حقیقت میں تو پانچ سو برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن وضع قطع اور ہیئت تعمیر کہہ رہی ہے کہ ہے تو بہت پرانا اور تاریخی شہر۔ گو زمانے کا شباب سوز اور حسن گداز ہاتھ اسکی جوانی چھیننے میں ناکام رہا ہے۔ شہر کے گرد اونچی دیوار کا حصار ہے جس میں چاروں طرف پھاٹک لگے ہیں۔ مستقل آبادی تو بارہ تیرہ سو نفوس سے زیادہ نہیں مگر آنے جانے والے ہر ہفتے ہزاروں کی تعداد میں آتے جاتے ہیں۔ اور دسمبر کے آخر میں تو لکھوکھا آدمی حاضر ہوتے ہیں۔ آبادی کے اندر چوک تک، بڑی سڑک کے دونوں جانب دوکانوں کی قطار ہے جن میں صلیبیں، مالائیں، مذہبی تصویریں، انجیلیں، دعاؤں کی کتابیں، شمعیں، مُر اور لوبان اور اسی قسم کی چیزیں کثرت بکتی ہیں۔ چوک آبادی کے وسط میں ہے جسکے ایک طرف پہاڑی کی چوٹی، اور اُسکے مقابل گورنر کا محل ملوث ہے۔ باقی دو طرفوں میں سے ایک طرف دینیات کا دارالعلم اور دوسری طرف اساتذہ و تلامذہ کا دارالاقامہ ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر کنیسۂ اعظم[8] کی قلعہ نما عمارت ہے۔

اگرچہ اس کنیسے کی کُل عمارت۔ خوبیِ تعمیر اور کثرتِ تصاویر کے باعث مقابل دید ہے، اس لیے کہ دنیائے مسیحیت کے دینی فرماں رواؤں یعنی تقدس مآب پاپاؤں کی نیاز مندانہ نظر تین سو برس کی طویل و عریض مدت تک۔ اس کنیسے پر مبذول رہ چکی ہے اور اُنھوں نے کروڑہا روپیہ صرف کرکے اطالیہ اور فرانس کے ماہر فن معماروں اور کامل علم دستکاروں کے ہاتھوں۔ اسے اعجوبۂ ندرت بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے، مگر جو چیز اس عمارت کی، اور نہ صرف اس عمارت کی بلکہ ساری

Adriatic Sea ۴؎ Macerata ۳؎ Ancona ۲؎ Italy ۱؎

کلیسائے رومانی کی جان اور مرکز دائرۂ ایمان ہے وہ کنیسیائی قلعے کی آغوش حفاظت میں عین چوٹی کے اوپر۔ ایک چھوٹا سا مکان ہے جسے علماء و آبائے مذہب لفظاً و معناً کعبۂ مسیحیت کہتے اور سمجھتے ہیں۔

مالهم به من علم ولا لآبائهم كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا (سورۂ کہف)
(نہ اُن کو اسکا کچھ علم ہے نہ اُنکے آباؤ کو۔ بڑی (سخت) بات ہے جو اُنکے منہ سے نکلتی ہے۔ نہیں کہتے وہ سوائے جھوٹ کے)

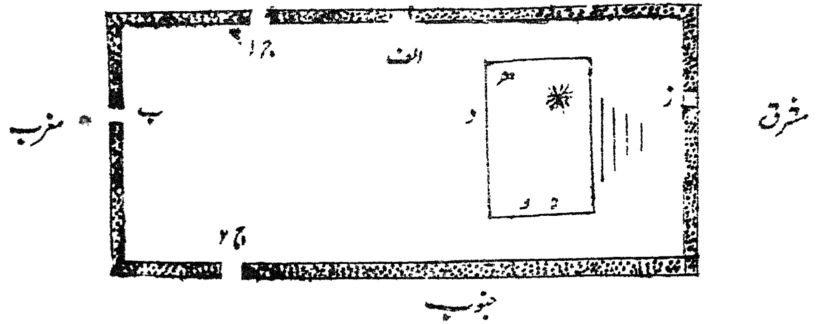
بے ادب پا منہ ایں جا

اس مکان کی ... دکار تو بہترین سنگ مرمر کی، نہایت مصور و منقش ہے مگر اندرونی رُخ نما جاتا ہے کہ پرانی پتلی اینٹ یا سیاہ رنگ کے کسی پتھر کا ہے، جس پر اعلیٰ درجے کی استرکاری ہے۔ اور استرکاری پر مذہبی تصاویر کے مرقعے، کمال صنعت مصوری کے ساتھ بنے ہیں ... دوں حیثیت مکان کا طول تیس فٹ آٹھ انچ، عرض چودہ فٹ نو انچ، اور ارتفاع کرسی اور منڈیر سمیت اٹھارہ فٹ ہے۔ شمالی دیوار میں آبنوسی چوکھٹ کا ایک پرانا دروازہ (الف) اور غربی دیوار میں، فرش سے پانچ فٹ اونچائی پر آبنوسی چوکھٹ کی ایک پرانی کھڑکی (ب) ہے۔ کھڑکی تو اب بھی کھلی ہے مگر دروازے کو اندر کی طرف جوں کا توں، ویسا ہی رکھ کر، باہر کی طرف، سنگ مرمر کی سلوں سے بند کر دیا ہے۔ اور اسکی جگہ شمالی دیوار ہی میں، کسی قدر غرب کو ہٹا کر ایک بڑا دروازہ (ج) اور اسکے مقابل جنوبی دیوار میں بھی اُسی عرض و ارتفاع کا دوسرا دروازہ (ج) لگا دیا ہے۔ مکان کے اندر صرف اسی ... کا فرش ہے۔ مشرقی حصے کے قریباً وسط میں نہایت چمکدار سنگ موسیٰ کی ایک قربان گاہ (د) بنی ہے۔ اس قربانگاہ کے سب سے اونچے مقام پر شمالی جانب چاندی کا ایک تابناک شعاع دار ستارہ (ہ) جڑا ہے اور جنوبی جانب پیالے کی شکل کا ایک پتھر (و) نصب ہے۔ کنیسیائی عمارت میں سب سے مقدس یہ مکان۔ اور اس مکان میں سب سے زیادہ مقدس۔ قربان گاہ کا یہ سب سے اونچا مقام ہے۔ مشرقی دیوار میں وسط سے کسی قدر شمال کو ہٹا ہوا، ایک

Latin or Western or Roman Catholic Church &
The Holy House by which Loreto became what has been, & not inappropriately, called the Christian Mecca. Enc: Britt: All Law

ھ ارض سینا و فلسطین مصنفہ ڈین اسٹینلی

طاقچہ (ز) ہے اس میں اُم و ابن[1] کا ایک چھوٹا سا چوبی بُت، جس میں جواہرات جڑے ہیں رکھا ہوا ہے۔ بجائے اسکے کہ میں تفصیل جزئیات سے آپ کا دماغ پریشان کرنے کی معافی چاہتا ہوں آپ سے بڑے زور سے کہتا ہوں کہ ادب کیجیے ادب! یہ کوئی ایسی ویسی معمولی عمارت نہیں بلکہ مکان مقدس (کاز اسینٹا[2]) ہے!



خوش اعتقادی کی بزرگترین مثال

یہ وہی اصلی اور حقیقی مکان ہے جو آج سے قریبًا دو ہزار برس پہلے فلسطین[3] میں صوبہ جلیل[4] کے قصبہ ناصرہ[5] کے جنوبی مشرقی گوشے میں اسی بنیاد اور انہیں آثاروں پر بنا کھڑا تھا۔ اسی میں مریم پیدا ہوئی تھیں پلی بڑھی تھیں۔ اسی کے اندر آکر جبرئیل نے انہیں حمل و ولادت مسیح کی بشارت دی۔ اسی میں خود مسیح نے نشو و نما پائی اسی کو بعد عروج مسیح اُنکے شاگردوں نے پہلا کنیسہ بنایا اور اسی میں ۱۲۹۱ء[6] تک برابر عبادت ہوتی رہی۔

دروازہ الف وہی اصلی دروازہ ہے جس میں ہو کر حضرت مریم اور حضرت مسیح مکان میں آتے جاتے تھے۔ ا ب سے احترامًا تیغہ کر دیا گیا ہے کہ جس آبنوسی چوکھٹ پر خدا کے بیٹے[7] کا مقدس قدم پہنچا ہے اب اس پر کسی کالی بھیڑ کا ناپاک پاؤں پڑ نہیں سکتا۔ کھڑکی ب چونکہ اونچی ہے لہذا بجنسہ کھلی رہنے دی گئی ہے۔ قربان گاہ کے سب سے اونچے حصے پر مقام ھ جسپر پہچان کے لیے نقرئی ستارہ جڑ دیا گیا ہے ٹھیک وہ جگہ ہے جہاں حضرت مریم کھڑی تھیں کہ کھڑکی کی راہ سے حضرت جبرئیل مکان میں آکر اس پیلپاٹے د پر بیٹھے جو ستارے سے جنوب کو نصب ہے اور وہیں سے حضرت صدیقہ کو ولادت مسیح کی بشارت دیکر کھڑکی کی راہ ہی سے چلے گئے۔

---

۱ Mother & child یا Madonna & child یعنی حضرت مریم و عیسیٰ علیہما السلام
۲ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا Casa Santa ۳ Palestine
۴ Galilee ۵ Nazareth ۶ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۷ یسوع کو کہیں۔

کلیسائے رومانی کے متبعین کا ایمان ہے کہ مکان مقدس مسیحی دنیا کی نہایت واجب الاحترام زیارتگاہ ہے۔ اُسکے وجود سے لورے ٹو کا اُتنا رقبہ جو شہر پناہ کے اندر ہے، فلسطین کی ارض مقدس کا اصلی ٹکڑا اور اس اعتبار سے یورپی ناصرہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں روزمرہ زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے جن کی تعداد ہر مسیحی زیارت گاہ کے حاضرین کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے۔

خادموں اور مجاوروں کی تعداد کثیر کے علاوہ، پورے ایک سو پادری اس کام پر متعین ہیں کہ ہر وقت قربان گاہ کے گرد، مکانِ مقدس کی تعظیم و عبادت کرتے رہیں۔ دونوں دروازوں پر دو سپاہی آٹھوں پہر ننگی تلواریں لیے پہرہ دیتے ہیں۔ زیارت صبح سے شام تک ہوتی ہے۔ اِدھر پو پھٹی اُدھر برجِ حصار سے توپ نے سلامی دی۔ توپ چھٹتے ہی پادریوں نے جو قربان گاہ کے گرد کھڑے تھے مناجات کا ترانہ شروع کر دیا کہ دفعتہً دروازہ کھلا اور داخلی شروع ہو گئی۔ زائرین چوکھٹ کے ٹکٹ دروازے سے لگے کھڑے تھے اندر قدم رکھتے ہی والہانہ انداز سے رکوع و سجود میں گر پڑے اور نہایت خشوع و خضوع سے رو رو کر دعائیں مانگنے اور مناجاتیں پڑھنے لگے اور جب فارغ ہو چکے تو مقدس مقام کو منہ اور دروازے کو پیٹھ کیے اُلٹے پاؤں نکل آئے۔ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ایاب و ذہاب کا یہی سلسلہ روزانہ رہتا ہے۔

مکانِ مقدس کا تذکرہ تحریراً و تقریراً ایسے الفاظ و عبارات میں کیا جاتا ہے جیسے حی القائم ذی مرتبت انسان کا کیا جائے۔ وہ شہر اور گرد و نواح کے مقامات کا حاکمِ مطلق اور قرب و جوار کی زرخیز اراضی و املاک کا مالک مستقل ہے۔ وہ صاحب خزانہ و توشہ خانہ ہے اور اُس کے پاس ضیاع و عقار، نقد و جنس، زر و جواہر، امتعہ و اقمشہ اور حشم و خدم سبھی کچھ ہے۔

اہلِ تحقیق کی واماندگیاں

اگر آپ جغرافیہ داں ہیں اور ایشیا اور یورپ کے نقشے پیش نظر رکھتے ہیں تو حیران ہونگے کہ کہاں برِ اعظم ایشیا اور کہاں یہ اعظم یورپ! کہاں ملک فلسطین اور کہاں ملک اطالیہ!! کہاں صوبۂ جلیل اور کہاں صوبۂ انکونا!!! اور پھر کہاں قصبۂ ناصرہ اور کہاں قصبۂ لورے ٹو!!!! آپ کو کسی طرح یقین ہی نہ آئیگا کہ قصبۂ ناصرہ میں بنا ہوا مکان مع عملۂ خشتی و چوبی و سنگی، دو ڈھائی ہزار میل سے زیادہ مسافت طے کرکے جس میں آبادی اور ریگستان، دریا اور پہاڑ، ندیاں، جھیلیں اور سمندر سبھی کچھ حائل ہیں۔ لورے ٹو

---

(۱) ٦٢ ارض سینا و فلسطین

کی پہاڑی پر پہونچ کیسے گیا؟ لیکن آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مسیحؑ کے ہر خلیفہ (پوپ) اور کلیسائے رومانی کے ہر متبع نے پچھلے پانچ چھ سو برس سے اب تک برابر اسی یقین کو اپنا جزوِ مذہب[1] سمجھا ہے کہ یہ وہی اصلی حقیقی اور واقعی مکانِ مقدس ہے جس میں "خدا کا کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا[2]"۔ کورسواد اور ضعیف الاعتقاد، وحشی اور جاہل، کالا اور احمق مشرق ہوتا تب تو آپ اُسکے ایسے یقین اور عقیدے کو ٹھکرا دینے میں حق بجانب تھے لیکن جب اجارہ دارِ علم و عقل اور خزانہ دارِ فہم و فراست، صحیح اللون اور صحیح الدماغ مغرب اپنی پانچ لاکھ اولادِ ذکور و اناث کو جس میں جنوبی ناپلس[3] سے لیکر صوبۂ ابروزی[4] کی "دخترِ رستاق زاد" تک سبھی شامل ہیں ہر سال اسی یقین اور عقیدے کے ساتھ لوریٹو بھیجے کہ مریمؑ و مسیحؑ کے اصلی مولد و منشاء کو سجدہ کرکے آسمانی بادشاہت میں شامل ہو جائے تو آپ اُسکی تضحیک و تحمیق کی جرأت کر سکتے ہیں؟

مکانِ مقدس کے سفر کی روایت

اِس مکان کے سفر کی روایت جو کتابوں میں مرقوم ہونے کے علاوہ، خود اُس کی شرقی دیوار پر تصاویر کی شکل میں مرتسم ہے حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے :۔

۱۲۹۱ء میں خدا کے فرشتے، اس مکان کو "بے دینوں[5]" کے حملے کے خوف سے، اسکی اصلی جگہ ناصرہ کی آبادی کی جنوبی شرقی حد سے اُکھاڑ کر اور اپنے کندھوں پر لاد کر ہوا میں لے اُڑے اور سب سے پہلے بحیرۂ ایڈریاٹک کے ہنگاروی[6] ساحل پر، صوبہ ڈالمیشیا[7] کے قصبۂ ترساتو[8] کی پہاڑی پر رکھ گئے جو فیوم[9] اور زینگ[10] کے درمیان ہے۔ یہاں کے باشندوں کو اس کی اصلیت کی تصدیق اور تقدس کا یقین تو اسی سے ہو گیا کہ چند روز بعد حضرت مریمؑ خود تشریف لائیں اور معجزات ظاہر ہوئے، لیکن مزید اطمینان کے لیے گورنر ڈالمیشیا نے اپنے قاصدوں کو بھیجکر، ناصرہ سے مکانِ مقدس کے تشریف لے جانے کی تحقیق و تصدیق کرا لی۔ مگر جب ترساتو میں مکانِ مقدس کی عظمت و حفاظت کا قرار واقعی انتظام و اہتمام نہ ہو سکا

---

[1] اسپینی کتاب الادعیہ سبق ششم [2] یوحنا کی انجیل باب ۱- آیت ۱۴ [3] Naples [4] Abruzzi

[5] مصلحت بیں اور موقع شناس یورپ اپنے کاروبارِ جہانگیری کی گرمی بازار کے لیے آج چاہے کیسے ہی فردوس گوش خطابوں کے جنت نگاہ تمغوں اور قباؤں سے مسلمانوں کے سینہ و دوش کی تواضع فرمائے ہمیں اب تک یاد ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عشرۂ رابع سے لے کر پندرہویں صدی کے آخر تک سبھی یورپ کے ہر مصنف، ہر مورخ، ہر مبلغ اور ہر مبارز کے دربار میں مسلمانوں کی قسمت میں صرف ایک ہی خطاب تھا، اور وہ تھا Infidel یعنی بے دین [6] Hungarian

[7] Delmatia [8] Tersato [9] Fium [10] Zengg

تو تین سال کے قیام کے بعد وہ پھر دوشِ ملائکہ پر سوار ہو کر یہاں سے بھی روانہ ہوا اور دریا کے کنارے اٹلی کے اطالوی ساحل پر - یعنی اُسی ملک میں جہاں تقدس آب پاپاؤں کا قیام ہے قصبۂ ریکانا کے قریب ۱۰ دسمبر ۱۲۹۴ء کو ایک باغ میں عارضی طور پر فروکش ہوا - اس عرصے میں فرشتے کسی خوشنما اور محفوظ تر مقام کی تلاش میں رہے ، اور جب موجودہ مقام ڈھونڈھ نکالا تو اوائل ۱۲۹۵ء میں باغ سے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر پھر لے اُڑے اور ہمیشہ کے لیے اُس پہاڑی پر رکھ دیا جس پر وہ آج تک واقع ہے
یا تو اس وجہ سے کہ مکانِ مقدس نے اس ملک میں آکر سب سے پہلے ایک باغ ہی میں عارضی قیام کیا تھا اور باغ کو لاطینی زبان میں لارےٹم[۱] کہتے ہیں ، یا اس وجہ سے کہ جس خاتون کی مملوکہ اراضی میں یہ مکانِ مقدس نے مستقل سکونت فرمائی اُسکا نام لارےٹا[۲] تھا ، مکان کے گرد جو بستی آباد ہوئی اُسکا نام لورےٹو ہی پڑ گیا[۳] -

ایک گزارش

روایت کے متعلق تحقیق و تجسس سے قبل میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میں بحمد اللہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اصل واقعۂ بشارت پر اُنھیں الفاظ میں اور اُسی حد تک اعتقاد رکھتا ہوں جن الفاظ میں اور جس حد تک اِس واقعے کو قرآن کریم (اللّٰھم ارزقنا تلاوتہ آناء اللیل وآناء النھار) سورۂ آلِ عمران کے پانچویں اور سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں بیان فرماتا ہے - اور اُنھیں معانی کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہوں جو علم الٰہی میں ہیں -

---

روایت کی تفتیش انجیل میں

مکانِ مقدس کے پرواز کی حکایت تو جس یقین و اعتقاد کی مستحق ہے وہ ظاہر ہے - لیکن آؤ دیکھیں کہ ایسا کوئی مکان فی الحقیقت ناصرہ میں موجود بھی تھا - اس بارے میں تفتیش و تجسس کی نگاہ سب سے پہلے مسیحی لٹریچر کی طرف جاتی ہے اور اُن میں اہم و اقدم درجہ اناجیل کا ہے -
مسیحی علماء نے عہد نامۂ قدیم[۴] اور عہد نامہ جدید[۵] کی کتابوں میں سے ہر ایک کی دو قسمیں کی ہیں ایک کینانیکل[۶] اور دوسری ایپاکریفل[۷] - ان قسموں کی تشریح و تفریق کی تو سطور ہذا متحمل نہ ہو سکیں گی

---

[۱] Laureta [۲] Lauretum [۳] Recunati [۴] انسائیکلوپیڈیا
[۵] Old Testament [۶] برٹانیکا اور نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا
[۷] Apocryphal [۸] Canonical [۹] New Testament

اتنا سمجھ لیجیے کہ علماء و احبار کی مجالس نے جو باوقاتِ مختلفہ منعقد ہوئیں بعض کتابوں کو الہامی تسلیم کرکے صحفِ سماوی کی فہرست میں شامل اور بعض کو الہامی تسلیم نہ کرکے خارج کر دیا۔ لہذا کلیسیائی اصطلاح میں اول الذکر کو کینانیکل اور ثانی الذکر کو اپاکرفیل کہتے ہیں۔ میں سطورِ ہذا میں پہلی قسم کی کتابوں کو مقبولہ اور دوسری قسم کی کتابوں کو مردودہ کہوں گا۔

عہد عتیق (قدیم) کی دونوں قسم کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بیکار ہے کیونکہ ان میں حضرت مسیحؑ کی ولادت کا تذکرہ کہاں۔ عہد جدید کی کتب مقبولہ میں اناجیل اربعہ، مراسلات حواریین اور مکاشفہ یوحنا ہیں۔ مراسلات اور مکاشفے میں حضرت مریمؑ و حضرت مسیحؑ کے ابتدائی حالات سے مطلق بحث نہیں۔ صرف اناجیل اربعہ ہی قابل استفادہ گئیں۔ انکا ماحصل نظر حاضر ہے:

متی کی انجیل[۱] میں حضرت مریمؑ کو فرشتے کے بشارت دینے کا کہیں تذکرہ نہیں بلکہ یوسف (نجار) کو خواب میں ولادتِ مسیحؑ سے اطلاع دینے کا حال درج ہے۔ (متی۔ باب۔ آیات ۲۰ تا ۲۴) اس انجیل میں ناصرہ کا تذکرہ سب سے پہلی مرتبہ، مسیحؑ کی مصر سے واپسی کے بعد ایسے الفاظ میں آیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف اور مریمؑ اس سے قبل یہاں کبھی رہتے ہی نہ تھے۔

مرقس کی انجیل[۲] کا آغاز یوحنا کے آنے اور استغفارِ معاصی کے بپتسمے کی منادی کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ حضرت مسیحؑ اور ناصرہ کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے:—

"ان دنوں ایسا ہوا کہ یسوع نے گلیل کے ناصرہ سے آکر یردن میں یوحنا سے بپتسمہ لیا" (مرقس باب۔ آیت ۹)

یوحنا کی انجیل میں جس کا نمبر حقیقتاً چوتھا ہے (حضرت مسیحؑ کا تذکرہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مبعوث ہو چکے تھے اور اکثر آدمی انکی شاگردی کا فخر حاصل کر چکے تھے۔ لہذا بشارت ولادت کی تلاش اس میں لاحاصل ہے۔

لوقا کی انجیل[۳] ہی میں (جس کا نمبر حقیقتاً تیسرا ہے) بشارت کا پورا واقعہ درج ہے۔ چنانچہ آیات متعلقہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:—

"جبرئیل فرشتہ۔ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا ۞ جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی۔ اور اس کنواری کا نام مریم تھا ۞ فرشتے نے اس کے پاس اندر آنے کہا۔ سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے ۞ وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے ۞ فرشتے نے اس سے کہا۔ اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے ۞

St. Luke [3] St. John [4] St. Mark [2] Gospel of St. Matthew [1]

اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اُس کا نام یسوع رکھنا ۰ وہ بزرگ ہوگا اور خدائے تعالےٰ کا بیٹا کہلائے گا، اور خداوند خدا اُس کے باپ داؤد کا تخت اُسے دے گا ۰ اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کریگا اور اُسکی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا ۰ مریم نے فرشتے سے کہا۔ یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی ۰ اور فرشتے نے جواب میں اُس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدائے تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالیگی اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائے گا۔" (لوقا۔ باب ۱۔ آیات ۲۶ تا ۳۵)

یہ مقام اِس بحث کا نہیں کہ "یہ انجیل بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے"[۱]۔ اس لیے کہ لوقا اس درجہ مجہول الاحوال شخص ہے کہ "اگر کوئی یہ دعویٰ کردے کہ یہ محض فرضی نام ہے، تو شاید عیسائیوں کو مشکل سے جواب بن پڑے گا"[۲] "مسیحی علماء کو" یہ امر مان لینا پڑا ہے کہ اُس نے جو کچھ لکھا اور بیان کیا سب آنکھوں کا دیکھا نہیں بلکہ کانوں کا سُنا تھا"[۳]۔ لوگوں نے اس انجیل کے متعلق یہاں تک شک ڈال دیا ہے کہ "آیا یہ وہی انجیل ہے جو لوقا نے لکھی تھی یا وہ کوئی اور انجیل تھی"[۴]۔ اِس انجیل کے مقام تحریر اور زمانۂ تصنیف کے متعلق قیاس کیا گیا ہے کہ "غالباً یہ انجیل قیساریہ میں ۵۸ء اور ۶۰ء کے درمیان لکھی گئی ہوگی"[۵]۔

میں کہتا ہوں کہ لوقا کے بیان پر شبہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لہٰذا سلسلۂ بحث کو آگے بڑھانے کے لیے مانے لیتا ہوں کہ اِس انجیل کی رُو سے مسیحؑ کی بشارتِ ولادت کا مقام ناصرہ ہی پایا جاتا ہے۔ مگر اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ بشارت کے وقت جنابِ صدیقہؑ ناصرہ کے فلاں مقام پر فلاں مکان میں تشریف فرما تھیں؟ اس فقرے سے کہ "فرشتے نے اندر آکے کہا" یہ نتیجہ نکالنا تو سہل ہے کہ حضرت مریمؑ کسی مکان کے اندر تھیں مگر وہ مکان کونسا تھا؟ اسکا کچھ پتہ نہیں۔ حالانکہ بحث کی ضروری کڑی یہی تھی، جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا۔

آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ولادتِ مسیحؑ کے وقت ہیرودؔ اعظم[۶] کے حکم سے بیت اللحم[۷] اور اُسکے قرب وجوار کے بہت سے نوزائیدہ معصوموں کے گلے پر چھری پھر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرتِ مسیحؑ کی تشریف آوری کا زمانہ اسی درجہ مخفی اور حالات ایسے مجہول رکھے گئے تھے کہ تاریخ، سنہ، اور مقامِ ولادت کا صحیح اندازہ اور پتہ آج تک نہ معلوم ہوتا تھا، نہ ہوا۔ زمانۂ دراز تک تاریخ ولادت اکتوبر کے مہینے میں مانی جاتی تھی[۸]۔ اُسکے بعد ۶ر جنوری مقرر ہوئی[۹]۔ ۲۵ر دسمبر جو آج یوم میلاد مانا جاتا

(۱تا۵) مسیح اور مسیحیت۔ مصنفہ مولانا محمد عبد الحلیم شرر لکھنوی۔ (۶) Herod the great (۷) Bithelhim

(۸و۹) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا۔ و سورس آف کرسچیانیٹی مصنفہ خواجہ کمال الدین۔

ہے حقیقت میں رومی دیوتا شال[51] کا یوم میلاد اور رومی بت پرستوں کے تیوہار کا بہت بڑا دن تھا۔ جب رومی دائرہ مسیحیت میں شامل ہوئے تو انھوں نے اسے بھولنا اور چھوڑنا نہ چاہا۔ لہذا کلیسائے رومانی نے پانچویں صدی عیسوی میں حکم دیا کہ جشن میلادِ مسیح آئندہ ہمیشہ رومی دیوتا شال کی پیدائش کے تیوہار کے دن یعنی ۲۵ دسمبر کو منایا جائے اگرچہ مسیح کے یوم ولادت کا کسی کو علم نہیں[52]۔ اسی طرح سنہ مسیحی جو آج دنیائے متمدن کا مرجع کار بنا ہوا ہے کہیں چھٹی صدی عیسوی میں جا کر متعین اور مروج ہو پایا ہے اور اس کا تعین اور ترویج کرنے والا ایک ختائی الاصل[53] پادری بتایا جاتا ہے جس کا نام ڈایونی سی اس ایگزیگوس[54] تھا —— یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے لایق ہے کہ مسیح کی ولادت ان کے سنہ ولادت سے چار سال قبل ہوئی! یعنی مسیحیوں ہی کے قول کے مطابق سنہ میلادِ مسیحی میں چار برس کی غلطی رہ گئی جو آجتک چلی آتی ہے[55]۔

میں کہاں سے کہاں چلا گیا۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ جب آپ کی ولادت کے متعلق لاعلمی کا یہ حال ہے تو حالاتِ ماقبلِ ولادت پر ظلمات بعضها فوق بعض کے کیسے موٹے موٹے پردے پڑے ہونگے۔ اگر کہا جائے کہ خود جناب مسیح سے اُن کے گھر کا پتہ چلا تو کلیسائے رومانی کے پاس اُنکے کسی حواری یا کسی حواری کے معاصر یا شاگرد یا شاگرد در شاگرد کی زبان سے ادا کی ہوئی ایسی کوئی روایت میرے علم میں تو ہے نہیں۔ بخلاف اسکے انجیلیں خود جناب مسیح کی زبان سے یہ الفاظ کہلواتی ہیں :-

> "لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے سر دھرنے کی کوئی جگہ نہیں"۔
>
> (متی باب ۸۔ آیت ۲۰ و لوقا باب ۹۔ آیت ۵۸)

اناجیل مقبولہ کا اصل مطالعہ آپ کے پیش نگاہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ معلوم ہو سکا کہ بشارت کا واقعہ قصبۂ ناصرہ میں کسی جگہ پیش آیا۔ بس اتنے سے تنکے پر رومانی کلیسا نے پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا۔ یعنی قصبے کے جنوبی شرقی گوشے پر ایک عالیشان فرانسسکی[56] گرجا تعمیر کر لیا اور اُسکے ایک حصہ میں ایک کھلی جگہ پر سنگ مرمر کی ایک تختی لگا دی جس پر لاطینی زبان میں بحروف زریں یہ فقرہ کھدا ہے:
"یہاں[57] کلمہ گوشت بنا"

---

[51] Sol [52] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا [53] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ [54] Syrian
[55] Dionysius Exeguus [56] انسائیکلوپیڈیا آف ... - تاریخ آف کرسچینٹی۔
[57] Franciscan church [58] ہیکس ریفرنس بک [59] یعنی کلمۃ اللہ نے کالبد
لحمی اختیار کیا۔ لاطینی الفاظ یہ ہیں۔ "Verbum Caro hic factum est"

رومانی کلیسیا کا دعویٰ ہے کہ اسی کھلی جگہ پر ان الفاظ ہی کو احاطہ کیے وہ مکان مقدس (Casa Santa) کھڑا تھا جسے فرشتے اپنے کندھوں پر سوار کرکے سرزمین اطالیہ میں پہنچا آئے - آیئے اب ذرا اناجیل مردودہ پر بھی ایک نظر ڈال لیں - ان میں ایک انجیل سینٹ جیمس[1] کی ہے جسمیں لکھا ہے کہ مریم ناصرہ میں چشمے پر پانی بھرنے گئی تھیں - وہیں فرشتے نے اُنھیں بشارت دی[2] - اسی انجیل کی شہادت پر یونانی کلیسیا[3] نے قصبۂ ناصرہ کے شمالی شرقی کنارے پر یعنی رومانی کلیسیا کے مقرر کردہ مقامِ بشارت کی مخالف سمت میں - ایک چشمے کے بالکل قریب[4] اپنا کنیسۂ بشارت[5] بنایا ہے - حسب بیان کلیسیائے یونانی یہی حقیقی مقام بشارت ہے - اور اسکی تصدیق جن روایات سے ہوتی ہے اُن کا سلسلہ چھٹی صدی عیسوی سے متواتر چلا آتا ہے[6] -

اناجیل مردودہ کے متعلق کچھ بھی کہو مگر اس میں گنجائش شبہ نہیں کہ "ارض مقدس کے متعلق قدیم ترین مقامی روایات، اور ولادت سے قبل یوسف و مریم علیہ کے حالات اور مسیح کے بچپن کے واقعات کے علم و اطلاع کا اصلی رحقیقی ماخذ یہی ہیں[7]" - سینٹ جیمس کی انجیل - بشارت کا مقام چشمے کے قریب بتاتی ہے - یہ چشمہ آج بھی اپنی جگہ موجود ہے اور قصبے کی عورتیں اُس پر آج بھی اُسی طرح پانی بھرنے آتی ہیں جس طرح حضرت مریمؑ تشریف لائی ہونگی[8] - لہذا یونانی کلیسیا نے بشارت کا جو مقام قرار دیا ہے اُسکے ثبوت میں اُسکے ہاتھ میں کم از کم ایک ایسی کتاب تو ہے جو آج بھی مبصرین کی نظر میں مقامات کا صحیح پتہ اور روایات کی اصلیت بتانے میں قابل وثوق ہے - بخلاف اسکے رومانی کلیسیا کے ہاتھ میں ثبوت کے نام خاک بھی نہیں - لہذا کوئی وجہ نہیں کہ بلا دلیل و برہان، رومانی کلیسیا کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ فرانسسکی گرجا کے اندر جو تھوڑی سی خالی جگہ دکھائی جاتی ہے وہاں ایک پختہ مکان بنا کھڑا تھا، اور اُسی میں حضرت مریمؑ کو فرشتے نے بشارت دی تھی -

تفتیش کے دوسرے گوشے

ا - رومانی کلیسیا - جس خالی جگہ پر - مکان مقدس کا "قبل انتقال" موجود ہونا بیان کرتا ہے اُس جگہ کی اور نیز مکان مقدس کی پیمائش کرنے سے یہ عقدہ کھلا کہ اطالیہ کی سمت آب و ہوا میں مکان مقدس نے ماشاءاللہ جسمانی ترقی بہت اچھی کی ہے اور اب اُس کے جسم پر بچپن کا پرانا کرتا ٹھیک آ ہی نہیں سکتا - خالی جگہ مقد

[1] St James [2] Greek or Eastern Church [3] ارض سینا و فلسطین -
[4] ارض سینا و فلسطین [5] Church of Annunciation [6] جروسلم مصنفہ ربینا لڈ سن بال
[7] ارض سینا و فلسطین - نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا [8] ارض سینا و فلسطین -

تنگ اور ایسی ناہموار چٹانوں سے گھری ہے کہ اس عرض و طول کا مکان اُس میں آنا دریا کا کوزے میں سما جانا ہے[1]۔ ایک رومن کیتھولک پادری ڈبلیو ایچ ہیچنس کی کتاب سے دونوں مقامات کا ایک ہی اسکیل پر کھینچا ہوا نقشہ[2] میرے سامنے ہے۔ جسے دیکھ کر میرے نزدیک یہ امر کہ پورے ثبوت الامکان کسی وقت ناصرہ کے فرانسسکی گرجا والی جگہ میں بنا کھڑا تھا امکانِ عقلی سے قطعاً خارج ہے۔

۲ - چوتھی صدی عیسوی سے سولھویں صدی تک جتنے مسیحی زائروں نے ناصرہ کے حالات لکھے ہیں اُن میں سے کسی ایک نے بھی، صراحۃً تو بڑی بات ہے کنایۃً بھی کسی ایسے مکان کا تذکرہ نہیں کیا۔ جس میں حضرت مریمؑ کو بشارتِ ولادتِ مسیحؑ ہوئی ہو اور وہ مکان وقتِ تحریر موجود ہو یا اُسکی موجودگی کسی زمانے میں روایۃً یا تحریراً پائی گئی ہو[3]۔

۳ - اطالیہ کے کسی دفتر میں کوئی تحریر قطعاً ایسی موجود ہی نہیں ہے جس میں پندرھویں صدی عیسوی کو قبل مکانِ مقدس کے وجود کے متعلق کسی قسم کا تذکرہ ہو[4]۔

۴ - مکانِ مقدس کے انتقالاتِ سہ گانہ کی روایت، جس آب و رنگ سے اب بیان کی جاتی ہے وہ سب سے پہلے اُس بُل[5] (فرمان) میں درج پائی جاتی ہے جو پوپ لیو دہم[6] نے ۱۵۱۸ء میں جاری کیا تھا[7]۔

امید ہے کہ سطورِ بالا نے آپ کو مطمئن کر دیا ہوگا کہ ایسے کسی مکان کا وجود ہی ثابت نہیں ہوتا جس میں تشریف فرما ہونے کے وقت حضرت مریمؑ کو فرشتے نے ولادتِ فرزند کی بشارت دی ہو اور وہ مکان بعد وفاتِ مسیحؑ و مریمؑ اس شہرت کے ساتھ قائم رہا ہو کہ اسی میں بشارت ہوئی تھی۔ اب یہ سہ گوشہ سوال سامنے آتا ہے کہ قدسیت کا یہ ۳۷ × ۲۸ فٹ مکعب مجسمہ، کس نے؟ کب؟ اور کس غرض سے؟ تیار کیا۔

فکر و نظر کے لمحے

اس بحث کے سلسلے میں فکر و نظر کا مطالعے اور دماغ سوز تحقیقات نے مجھے جن امور تک پہونچایا وہ یہ ہیں :-

(۱) ناصرہ میں جس خاص جگہ سے مکانِ مقدس کا اُٹھ جانا ظاہر کیا جاتا ہے اُسکے گرد فرانسسکی گرجا کی عمارت بنی ہے جو واٹیکن کلیسا کے ماتحت ہے۔ اور واٹیکن کلیسا ہی کے پادری اُس جگہ کی خدمت کرتے

---

[1] Dean Stanley ؎ ارضِ سینا و فلسطین ؎ پاپائے روم کا قصرِ حکومت یعنی Vatican

؎ Bull ؎ Leo X ؎ ارضِ سینا و فلسطین۔

اور زیارت کراتے ہیں۔

(۲) لورے ٹو میں جس کنیسے کے وسط میں مکان مقدس بنا ہے وہ بھی رومانی کلیسا ہی سے متعلق ہے اور مکان مقدس کے خدام و مجاورین بھی رومانی کلیسا ہی کے ماتحت ہیں۔

(۳) مکانِ مقدس صرف رومانی کلیسا ہی کے نزدیک واجب الاحترام ہے اور رومانی کلیسا ہی کے متبع وہاں زیارت و عبادت کو جانا ثواب اور کفارۂ ذنوب سمجھتے ہیں۔

(۴) رومانی کلیسا ہی کے سردار (پوپ) مکان مقدس کی تعمیر و تزئین میں حصہ لیتے اور وہاں کی زیارت و عبادت کے متعلق وقتاً فوقتاً فرامین و احکام صادر کرتے رہے ہیں۔

ان امور کو پیش نگاہ رکھنے کے بعد۔ کیا اس امکان کا شائبہ بھی ذہن میں آسکتا ہے کہ رومانی کلیسا کی یہ نہایت ہی محترم عمارت ناصرہ سے ہزارہا میل چل کر اطالیہ کی حدود میں۔ خود روما سے صرف سو سوا سو میل کے فاصلہ پر آکر ٹھہرے اور رومانی کلیسا کے سردار اعظم (پوپ) اسکے وجود سے بےخبر رہے ہوں؟ اگر نہیں، تو کیا یہ قیاس صحیح نہ ہوگا کہ مکان مقدس جس وقت سے اطالیہ کی حدود میں داخل ہوا اسی وقت سے اور اسی وقت سے پاپایانِ روما نے اپنی توجہ اس پر مبذول کی؟ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ جس زمانے سے پاپایانِ روما کا، مکانِ مقدس کی طرف توجہ کرنا ثابت ہو جائے ٹھیک وہی زمانہ اسکے سرزمین اطالیہ میں وجود میں آنے کا ہے؟ اگر نتیجہ مستخرجہ غلط نہیں تو اسکا پتہ لگانا میرے ذمہ ہے کہ سب سے پہلے کس پوپ نے مکانِ مقدس کی طرف توجہ کی۔

ارض سینا و فلسطین، مصنفہ ڈین آسٹلی اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جیسے معتبر شاہدوں کا بیان ہے کہ جس پوپ نے اپنی سعی و اہتمام سے لورے ٹو کی آبادی کے گرد نہایت مضبوط و مستحکم حصار تعمیر کرایا جو آج تک بجنسہ موجود ہے اور نیز مکانِ مقدس کے احترام و زیارت کے متعلق بُل (فرمان) جاری کیا جو ویٹیکن کی کتاب القوانین میں محفوظ رہے وہ پوپ سکسٹس چہارم تھا[1]۔ اس پوپ کا عہد حکومت ۱۴۷۱ء سے ۱۴۸۴ء تک ہے۔ اسکے بعد جن پوپوں نے مکان مقدس کے متعلق وقتاً فوقتاً اظہار عقیدت و دلچسپی کیا وہ ملخصاً درج ذیل ہے:۔

۱۔ انوسنٹ ہشتم (۱۴۸۴ء تا ۱۴۹۲ء) Innocent VIII نے ۱۴۹۱ء میں
۲۔ الگزنڈر ششم (۱۴۹۲ء تا ۱۵۰۳ء) Alexander VI نے ۱۵۰۲ء میں
۳۔ جولی اس دوم (۱۵۰۳ء تا ۱۵۱۳ء) Julius II نے ۱۵۰۷ء میں

} مکان مقدس کی تعظیم و زیارت کے متعلق فرامین جاری کیے جن میں

[1] Pope Sixtus IV

ظاہر کیا کہ مکان مقدس کو فرشتے ناصرہ سے اٹھا کر اور دریا پر اڑا کر بحیرہ ایڈریاٹک کے کنارے پہلے ہنگاروی ساحل اور پھر اطالوی ساحل پر رکھ گئے۔

۴ - لیو دہم (۱۵۱۳ تا ۱۵۲۱ء) LEO X اس پوپ نے مکان مقدس کے گرد کنیسے کی عمارتیں بنوائیں جن میں اطالیہ اور فرانس کے معماروں اور صنعت کاروں نے لاکھوں روپیہ کے صرف سے دستکاری کے اعلیٰ ترین نمونے دکھائے ہیں۔ اسی نے ایک بہت بڑا برنجی گھنٹہ جس کا وزن تین سو آٹھ من ہے، کنیسے کی نذر کیا۔ مکان مقدس کی بیرونی ردکار پر منقش و منبت سنگ مرمر لگوانا شروع کیا تھا کہ خود ہی چل بسا۔

۵ - ہیڈری ان ششم (۱۵۲۲ تا ۱۵۲۳ء) HADRIAN VI
۶ - کلیمنٹ ہفتم (۱۵۲۳ تا ۱۵۳۴ء) CLEMENT
۷ - پال سوم (۱۵۳۴ تا ۱۵۵۰ء) PAUL VII

پوپ لیو دہم نے بیرونی ردکار پر جو سنگ مرمر لگوانا شروع کیا تھا ہیڈری ان اور کلیمنٹ کے زمانہ میں انکی مسلسل امداد سے اس کا کام جاری رہا۔ تاآنکہ جب پال تخت نشین ہوا تو اس نے تکمیل کر دی۔

۸ - سکسٹس پنجم (۱۵۸۵ تا ۱۵۹۰ء) SIXTUS V اس نے گرجا کی خوشنما ردکار بنوائی اور ایک فرمان کی رو سے لوریٹو کی آبادی کو شہری حقوق عطا کیے۔ اس پوپ کا مجسمہ صدر دروازے کی سیڑھیوں پر نصب ہے۔

۹ - پال پنجم (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۱ء) PAUL V اس نے ام و ابن کا قد آدم برنجی مجسمہ جو اطالیہ کے ایک کامل الفن استاد کا نمونۂ صنعت ہے خاص بیاتک کی محراب کے اوپر نصب کرایا اور اندرونی عمارت میں تین منبت و منقش برنجی دروازے لگائے۔

۱۰ - انوسنٹ دوازدہم (۱۶۹۱ تا ۱۷۰۰ء) Innocent XII اس نے ایک فرمان کی رو سے بیت مقدس کے تبدیل مقام کا یوم عرس دس دسمبر مقرر کر کے اس کو اعیاد مذہبی کی تقویم میں داخل کیا۔

ٹ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و جیوئش انسائیکلوپیڈیا و ارض میعاد فلسطین۔

تخصات بالا سے ظاہر ہوگا کہ پوپ سکسٹس چہارم سے لیکر پال سوم تک یکے بعد دیگرے آٹھ پوپوں نے
بلا استثناء، مکانِ مقدس کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا اور انکے بعد والے پوپوں نے بھی سترہویں صدی
کے آخر تک مراسم توجہ و تعلق بجا لانا اپنا فرض مذہبی سمجھا - میں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے مقدور بھر تلاش و
تجسس کے باوجود مجھے مکانِ مقدس کے متعلق سکسٹس چہارم سے پہلے کسی پوپ کی کسی قسم کی توجہ اور دلچسپی
کا حال مطلق معلوم نہ ہو سکا - میرے اس بیان کے ساتھ اگر آپ ڈین اسٹینلی جیسے معتبر مذہبی مورخ اور سیاح
کی واضح اور فیصلہ کن عبارت کو پھر پڑھیں کہ "اطالیہ کے کسی دفتر میں کوئی تحریر قطعاً ایسی موجود ہی نہیں ہے
جس میں پندرہویں صدی عیسوی سے قبل - مکانِ مقدس کے وجود کے متعلق کسی قسم کا تذکرہ ہو" تو کیا اس یقین میں شک
و شبہہ کی ذرہ بھر بھی آمیزش سمجھی جا سکتی ہے کہ مکانِ مقدس پوپ سکسٹس چہارم کے زمانہ بلکہ اسی کے دماغ
کی ایجاد ہے - اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا کہ اس ایجاد کا باعث کیا تھا - اسی سلسلہ میں "کس نے" اور "کب"
کے جوابوں کے متعلق خفیف سا خفیف شبہہ بھی جو آپ کے دل میں رہ گیا ہوگا زائل ہو جائیگا انشاء اللہ تعالے -
اگر آپ پندرہویں صدی عیسوی کے یورپ پر سطحی اور سرسری نظر بھی ڈالیں تو مقامی جنگ و جدال اور سلسلی عروج
و زوال کی الجھنوں سے قطع نظر - دو باتیں خصوصیت کے ساتھ آپ کے سامنے آجائیں گی :—

۱ - پاپائی سطوت کا احیاء

پاپائی اقتدار کا چاند جو حروب صلیبیہ میں مسیحیت کی ناکامی کے بعد گہن میں آگیا تھا - پندرہویں صدی کے
عشرۂ رابع میں اس نے اپنا نور پھر حاصل کرنا شروع کیا - چنانچہ سنہ ۱۴۳۹ء میں جو کونسل فلارنس[۱]
میں منعقد ہوئی اُس نے یہ اصول طے کر دیا کہ "اسقفِ رومانی (پوپ) بلکہ مسندِ پاپائی کے حیطۂ اقتدار میں کل
ربع مسکون داخل ہے اور روما کا اسقف خود اپنی ذات سے قدوۃ الحواریین خلیفۃ المسیح پطرس ولی[۲]
کا حقیقی جانشین - اور اس اعتبار سے ساری کلیسیا کا سردار اور تمام مسیحیوں کا باپ اور مرشد ہے - نیز یہ کہ
شخصاً و جسماً خود اُسے بذاتِ خاص پطرس ولی کے توسط سے ہمارے خداوند مسیح علیہ السلام نے کلیسیا کے بقا و قیام
اور نظم و اہتمام کے متعلق تمامی حقوق و اختیارات تفویض و مرحمت فرما دیے ہیں"[۳] - اس اصول سے مسلح
ہو کر پوپوں نے اپنا گم کردہ وقار پھر حاصل کرنا شروع کیا - چنانچہ پوپ یوجینیس چہارم[۴] جو ۱۴۴۷ء
میں فوت ہوا "مرتے وقت دنیائے مسیحیت کی غیر محدود عقیدت و اطاعت تقریباً پھر حاصل کر چکا تھا"[۵] - ان
پوپوں نے حصولِ عقیدت و اطاعت کے لیے عوام و خواص سبھی کی افتادِ طبع اور رجحانِ مزاج کو پیش نظر رکھا -
یعنی جہاں ملکی و سیاسی معاملات میں بادشاہوں کے مرغوبات و مزعومات کا احترام کیا - مسائل علمی و عقلی کی تحقیق

[۱] Florence [۲] Peter [۳] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا [۴] Eugenius IV [۵] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

میں علماء و حکماء کے راستہ میں آسانیاں پیدا کر کے اُنھیں اپنا گرویدہ کیا وہاں عوام کالانعام کے ضعفِ اعتقاد اور شیفتگیِ مذہب سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا۔ جیسے انوسنٹ چہارم کا تذکرہ او پر کئی جگہ آچکا ہے اور آیندہ بھی آنے والا ہے اُسکے متعلق لکھا ہے کہ "وہ پہلا پوپ تھا جس نے جادوگری کے متعلق محکمۂ احتساب قائم کیا[1]"

۲۔ عثمانی سلطنت کا استحکام

غازی عثمان بن ارطغرل نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخری دنوں میں انگورا کے قریب جو "شجر حکومت[2]" نصب کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا طویل و تناور ہو گیا کہ اُس کا سایہ ۱۳۵۵ء میں ایشیائی حدود سے گذر کر گیلی پولی[3] کی یورپی سرزمین پر پڑا۔ اور آلِ عثمان کے چوتھے تاجدار سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) کی سلطنت کی سرحد، ایشیا میں دریائے فرات سے لیکر یورپ میں دریائے ڈینیوب[4] تک پہونچ گئی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد خان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۵۱ء میں تختِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء مطابق ۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کو مشرقی رومانی سلطنت[5] کے پایۂ تخت۔ یونانی کلیسا کے دارالارشاد و مرکزِ اعظم یورپ کے عروس البلاد، قسطنطین اوّل[6] کے معمورۃ الکبریٰ۔ یعنی رومۃ الحدیث[7] قسطنطنیہ کو قسطنطین یازدہم[8] کے مرعوب و مرتعش ہاتھ سے لیکر یورپ اور مسیحیت کی سب سے زیادہ طویل المدت شاہنشاہی کو ہمیشہ کے لئے آغوشِ فنا میں سُلا دیا۔ اس "فتحِ مبین" سے حروبِ صلیبیہ کے ہزیمت خوردہ یورپ کی نہ صرف آیندہ اُمیدوں کا قلعہ ہباءً منثوراً ہو گیا، بلکہ اُسے اپنی موجودہ زندگی ہی کے لالے پڑ گئے۔ "قسطنطنیہ کی فتح سے مسیحی دنیا کو ویسا ہی خطرہ لاحق ہو گیا جیسا آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں عربوں کی فتوحات سے ہوا تھا، جنھوں نے قریباً تمام ہسپانیہ اور پرتگال کو مغلوب کر کے فرانس پر دھاوا بول دیا تھا[9]" سلطان محمد خان فاتح نے اس خطرے کی اور تصدیق کر دی۔ قسطنطنیہ کی مہم سر کرنے کے بعد ہی اُس نے جزیرہ نمائے بلقان کی طرف رخ کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں موریا[10]، سالونیکا[11]، رومیلیا[12]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ [2] غازی عثمان کے خواب کی طرف اشارہ ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ انکے جسم سے ایک درخت پیدا ہوا جو دنیا کے تین حصوں پر چھا گیا۔ اور دنیا کے چار بڑے پہاڑ اور چار بڑے دریا اُسکے سایے میں آگئے۔

[3] Gallipoli [4] Danube [5] East Roman Empire

[6] Constantine I [7] New Roma [8] Constantine XI [9] تاریخ خانیہ Morea [10]

[11] Salonica [12] Rumalia

بلگیریا - ایپارس - البانیا، بوسنیا اور ہرزی گووینا تنورِ مملکت میں شامل کر لیے - سرویا
والیشیا اور مالڈے ویا، جو پہلے برائے نام فتح ہو چکے تھے پورے طور پر زیرنگیں ہو گئے اور اب
عثمانی ہلال پوری تابانی کے ساتھ ریاستہائے بلقان پر چمکنے لگا -

یہاں پہونچ کر - میری خاطر سے - ذرا اٹلس کے اس نقشے پر نظر ڈال لیجیے جس میں جزیرہ نمائے
بلقان کی مغربی حدود اور ملک اطالیہ کا پورا ملک ہو - آپ ملاحظہ کریں گے کہ البانیا اور اطالیہ کے درمیان
بحیرہ ایڈریاٹک کا تنگ ترین حصہ ہی حائل ہے جس کا عرض مشکل سے چالیس پچاس میل ہوگا -

یورپ اچھی طرح جان گیا تھا کہ جو شخص خشکی میں ناؤ چلانے کا حیرت انگیز کارنامہ اوراق تاریخ پر
ثبت کر چکا ہو وہ اس نالی کے پانی کو کب خاطر میں لانے والا تھا - لہذا سب سے پہلے جو ملک محمد فاتح
کے نام سے لرزہ براندام تھا وہ اطالیہ ہی تھا - "الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی"!

اطالیہ کو اختلاجِ قلب تو اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب یورپ کی متفقہ فوجی قوت ۱۳۹۶ء
میں شاہ ہنگاریہ کی مدد کے لیے دریائے ڈینیوب کے قریب شہر نکوپولیس میں جمع ہوئی اور سلطان
بایزید یلدرم نے اسے شکست فاش دیکر کئی سو بڑے بڑے امیروں اور سرداروں کو قید کر لیا اور جب یہ
قیدی سردار بارگاہِ سلطانی میں حاضر کیے گئے تو بایزید نے ان سے کہا تھا "آپ میرے علاقہ میں کیوں
گھس آئے، میں تو خود ہی عنقریب ہنگاریہ کے دارالحکومت کا محاصرہ کروں گا، اور جرمنی اور اطالیہ کو
مفتوح کر کے سینٹ پیٹر کے گرجے کی قربان گاہ پر اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں گا"۔

اپنے پردادا کے اس "قول" کی "تعمیل" کے لیے سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ دوسری مہموں سے چھٹکارا
پا کر ۱۴۸۰ء میں فتح اطالیہ کے لیے اٹھا اور اسکے عزم صمیم نے جنرل احمد پاشا کی شکل میں اودھر کا رخ

Servia — Herzigovina — Bosnia — Albania — Epirus — Bulgaria

Moldavia — Wallachia — اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ محمد فاتح نے یہ دیکھ کر کہ جب تک گولڈن ہارن
(شاخ زریں) کی بندرگاہ سے حملہ نہ کیا جائے، فتح قسطنطنیہ نہایت مشکل ہے - لیکن بندرگاہ کے دہانہ پر آہنی زنجیروں
اور محافظ بیڑے کی بدولت وہاں پہونچنا ناممکن ہے - ایک رات خاکنائے پر باسفورس سے بندرگاہ تک غلاطہ اور پیرا میں چربی
لگے ہوے چوبی تختے بچھوا کر، ان پر راتوں رات اسی جہازوں کا بیڑا کھلے بادبانوں کے ساتھ آٹھ نو میل تک
ہزاروں آدمیوں سے کھنچوا کر بندرگاہ میں ڈلوا دیا تھا - دیکھو ڈاکٹر ڈیوس کی شارٹ ہسٹری آف دی نیر ایسٹ -
Hungary — بازنطائن امپائر - تاریخ عثمانیہ وغیرہ — ڈاکٹر ڈیوس کی تاریخ -
Nicopolis — ڈاکٹر ڈیوس - نیز تاریخ عثمانیہ وغیرہ -

کیا۔ سمندر کی موجیں اُس کے اس عزم کی راہ میں کیا خاک سدِّ راہ ہوتیں۔ احمد پاشا نے بحیرۂ ایڈریاٹک کے بلقانی ساحل سے اطالوی ساحل تک کے آبی میدان کو روند کر صوبہ نیپلس کے مشہور تجارتی بندرگاہ اوٹرانٹو کے پھاٹک پر جا کر دم لیا۔ اور دم کے دم میں اسے مغلوب کر کے مورچہ بند کر دیا تاکہ باقی حصّۂ ملک کی فتح کے لیے صدر مقام کا کام دے۔

اوٹرانٹو کا فتح ہونا تھا کہ سارے ملک اطالیہ میں کھلبلی پڑ گئی کہ آخر "بے دینوں" کے ناپاک قدم پایۂ مسیحیت کے ملک میں آ ہی گئے۔ اب یقیناً مقدس پطرس کے گرجے کی قربان گاہ اُن کے گھوڑوں کا اصطبل بن کر رہے گی۔ اس فتح سے رومۃ الکبریٰ میں ایسا تہلکہ برپا ہو گیا کہ پوپ سکسٹس چہارم تک اپنا بوریا بستر باندھ کر ملک سے بھاگ جانے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ باسباب ظاہر وہ دن دور نہ تھا جب کہ اطالوی رومۃ القدیم اپنے بزنطینی رفیق رومۃ الحدیث کی قسمت میں شرکت کرے اور آپ باسفورس کی طرح آب ٹائبر کا سینہ بھی مساجد کے عکس سے منوّر ہو۔ مگر ۳۔ مئی ۱۴۸۱ء کی صبح نے سلطان محمد فاتح کی بے وقت وفات کے باعث مسیحیت کے دل سے عثمانی تلوار کا خطرہ زائل نہیں تو کم ضرور کر دیا۔ اور باشندگانِ روما نے اس موت کی خوشی میں تین دن متواتر جشن منایا۔

سلطان محمد فاتح مرتے دم تک فتحِ اطالیہ کے متعلق جو خیال ہر وقت رہتا تھا وہ اس سادہ مگر پُراثر جملے میں محفوظ ملکہ منقش ہو کر آج بھی اس کی لوحِ مزار پر ٹھیک قلب کے اوپر اُبھرے حروف میں نظر آتا ہے:۔

"میرا ارادہ مغرور اطالیہ کو مغلوب کرنے کا تھا"

—٭—

اس ساری داستان کو سُن لینے کے بعد، اب آپ کا ذہن، مکانِ مقدس کی ایجاد کی غرض و غایت کی طرف منتقل ہوا یا ابھی مزید صراحت کی ضرورت باقی ہے؟ اگر ہے تو اور سُن لیجیے۔ سرفروشی اور جاں بازی کے لیے سب سے زبردست محرک صرف مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا تجربہ آبائے مسیحیت کو حروبِ صلیبیہ کے زمانے میں خوب اچھی طرح ہو چکا تھا۔ سکسٹس چہارم ایک نہایت چالاک مدبر اور مفکر تھا۔ ترکوں کے کارناموں کو دیکھ [illegible] کے اس نے [illegible] اب اطالیہ کی سرزمین کا ہیروؤں کی

Bosphorus — Byzantium — تاریخ عثمانیہ — Otranto

تاریخ عثمانیہ

تیغ بے پناہ سے مفر نہیں۔ اور نا ممکن ہے کہ محض جذبۂ حبِ وطن اطالیہ کے حفظ و دفاع سے عہدہ برآ ہو سکے۔ لہذا ضرور ہے کہ اِس شراب کو دو آتشہ کیا جائے اور حبِ وطن کے ساتھ جوشِ مذہب بھی مقدار کثیر میں ملا دیا جائے۔ مگر مذہب سے عبارت مصوری و سنگ تراشی نہیں جو اطالیہ کی واحد خصوصیت ہے۔ پس جب تک مذہب کی کسی مقدس خصوصیت کو اطالیہ کے ساتھ مخصوص نہ کر دیا جائے اور پھر اُسے خطرے میں گھرا ہوا ظاہر کر کے مسیحیت کے جذبات کو ہیجان میں نہ لایا جائے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ اور چونکہ مسیحی دنیا میں معجزات اور ملائکہ اور اولیائے مذہب کی خدمات ہمیشہ کشود کار کا ذریعہ رہ چکی ہیں، لہذا اس سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی تھی کہ ناصرہ کا مقدس اور محترم ترین مکان، فرشتوں کے کاندھوں پر سوار کرا کے اوٹرانٹو ہی کے صوبہ نیپلس کے حدود میں لایا اور اس طرح اطالیہ کے مخدوش ترین حصے کو ارضِ مقدس کا ٹکڑا بنایا جائے۔ تاکہ اُسکی محافظت کے جوش میں نہ صرف اطالیہ، بلکہ ساری دنیا کی مسیحیت، سرباز‍ی اور جاں فروشی کے جوہر دکھائے۔ اور چونکہ پوپ کے الفاظ انجیل مقدس کی آیات کے مرادف مانے جاتے تھے لہذا ضرور ہوا کہ پاپائی فرمان کے ذریعہ اس معجزے کی تصدیق کر دی جائے تاکہ مکان مقدس کی عظمت و کرامت ہر کہ و مہ کے ذہن نشیں ہو جائے۔

اس انتخاب میں، بظنِ غالب، ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلمان چاہے عیسیٰ علیہ السلام کے مدفن کو کسی عزت و احترام کا مستحق اس لیے نہ سمجھیں کہ اُنکے مذہب کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا ہی صحیح نہیں، مگر ملائکہ کی وساطت سے حضرت مریمؑ کو ولادتِ فرزند کی بشارت دیئے جانے کا واقعہ تو خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ لہذا مسلمان کسی ایسے مکان کے انہدام و توہین کا اقدام ہرگز نہ کرینگے جسے مسیحیت، ہبطِ ملائکہ اور مولدِ مسیحؑ مان رہی ہو۔

چنانچہ مکانِ مقدس فتح اوٹرانٹو سے کچھ ہی قبل یا بعد، اگر فرشتوں کی معجزانہ طاقت سے نہیں تو معماروں کی صنعت گرانہ قوت سے، لورے ٹو کی پہاڑی پر موجود ہو گیا تاکہ اگر "ہیدیوں" کی فتوحات کا سیلاب شمال کی طرف پھیلتا آئے تو مذہبی جوشِ جہاد کی سدِ سدید ساحل ہی پر حائل پائے۔

یہ تھی مکانِ مقدس کی غایتِ ایجاد، جسکے لیے پوپ سکسٹس چہارم کا دماغ مستحقِ داد ہے گو جیسے متعلق یورپ کا منصف مزاج اور فلسفہ دان مسیحی مورخ و مصنف اور سیاح نہایت رحم لے پن سے صرف اسی قدر کہہ سکتا ہے کہ "لورے ٹو کا مکان مقدس محاربات صلیب کی آخری آہ کی تشکیل ہے۔"[۵۲]

یعنی یہ ایک یادگار ہے جسے یورپ کے اُن مجبور و مظلوم مسیحیوں نے جنھیں ظالم مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی فتح سے باز رکھا تھا سرزمین مقدس کی محبت تازہ رکھنے کے لیے اپنے ملک میں قائم کیا!

مسیحی زائرین پر مسلمانوں کے ظلم و ستم کے افسانوں کی تکذیب و تبکیت تو انشاءاللہ کسی دوسری فرصت میں، حروب صلیبیہ کے بیان کے سلسلہ میں کی جائیگی، سردست یہ سُن لیجیے کہ جب اطالیہ کی تقدیس کی لے زیادہ بڑھی، اور یورپ کی طباعی اور یورپ کی صناعی اُسے دوسرا فلسطین بنانے کی طرف متوجہ ہوگئی تو سوچا گیا کہ جو کام اس سے پہلے مذہب کے معجزوں اور فرشتوں کے کندھوں سے لیا گیا تھا وہ اب سیاست کی چالوں اور تدبیر کے جالوں سے کیوں نہ لیا جائے۔ چنانچہ

۱- پوپ سکسٹس پنجم (۱۵۸۵ء تا ۱۵۹۰ء) نے بابِ عالی سے درخواست کی کہ خداوند مسیحؑ کا مرقد مقدس چونکہ پیروانِ مسیح کی نظر میں نہایت ہی محترم شے ہے لہذا جس معاوضے اور جن شرائط پر مناسب سمجھا جائے وہ عمارت رومانی کلیسا کو عطا فرمادی جائے تاکہ اُسے انجنیروں کی مدد سے جسمًا بعلہٖ خشکی و تری یا پانی دارالحکومت رومۃ الکبریٰ کو منتقل کیا جاسکے۔ اس درخواست کا جو جواب سلطان مراد ثالث نے دیا ہوگا وہ اسی سے ظاہر ہے کہ مرقدِ مقدس آج تک ارضِ مقدس ہی میں ہے۔

۲- جب اصلی مرقدِ مقدس کو اُٹھا کر اطالیہ لے آنے میں ناکامی ہوئی تو اطالیہ کے شہر بولونا کے کنیسۂ سینٹ اسٹیفن کے اندر کنیسۂ مرقد مقدس کی ہو بہو اور مطابق النعل بالنعل نقل بنائی گئی۔ وہی ارتفاع، وہی نقشہ، وہی رنگ، وہی نقش و نگار، وہی خدام کی وضع و لباس، کنیسے کے اندر بھی، اصلی کنیسہ کی طرح اول سے آخر تک واقعۂ تصلیب (یعنی عدالت میں حضرت مسیحؑ کی پیشی سے لیکر برچھی لگا کر لاش ٹھنڈی ہو جانے تک کے واقعات) کے مرقعے دیواروں پر بنے ہیں، جنکی وجہ سے اس گرجے کو حقیقتًا اطالیہ کا یورشلیم مانا جاتا ہے۔

۳- شہر یورشلیم کے جنوب و مغرب میں ایک میدان وادیِ ہنوم ہے جو مقدس آبادی کے الحاق اور مقدس خطۂ یہودیہ میں شمول کے باعث نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی مقدس مٹی فرشتوں کے سر پر نہیں، بلکہ بڑے بڑے بادبانوں والے ترین جہازوں کی پیٹھ پر لاد کر لائی اور شہر پیسا کے ایک

Holy Sepulchre — ارض سینا و فلسطین — Bologne
Church of St Stephen — Jerusalem
Valley of Hinnom — Judea — Pisa

میدان میں بچھائی گئی - تاکہ جو مُردے اِس میدان میں دفن ہوں وہ ہجوم کی مقدس وادی ہی میں محوِ استراحت سمجھے جائیں اور اُن سے گناہوں کی پرسش چنداں نہ ہو - اس میدان کا نام کیمپو سانٹو ہے۔ ہے - ایک شخص برنارڈینو کائموتے نے ارضِ مقدس کی زیارت سے واپسی پر اطالیہ کے اندر ہی ارضِ مقدس بنانی چاہی تاکہ مسافتِ بعید و پر "بے دینوں" کے ممالک میں جانے اور صرفِ کثیر اور زحمتِ شاقہ اُٹھانے سے اپنے ہموطنوں کو بچالے - اس غرض سے اُس نے ریاست پیڈمانٹ کے اندر ایک مقام ورالو کو ارضِ مقدس سے اشبہ فرض کرکے دوسرا فلسطین قرار دیا اور وہاں تین پہاڑیاں منتخب کرکے ایک کا نام کوہچۂ طیبور دوسری کا کوہچۂ کال وری اور تیسری کا کوہچۂ زیتون رکھا - انکے نواح میں دو نہریں کاٹ کر اور پہاڑ سے پانی لاکر دو چشمے بنائے - جن میں سے ایک کا نام قدرون اور دوسرے کا یردن رکھا - مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق چونکہ حضرت مسیحؑ کو کوہچۂ کال وری پر جسے گلگوتھا بھی کہتے ہیں، صلیب دی گئی تھی - لہذا نام نہاد کوہچۂ کالوری واقع ورالو کو بھی اطالیہ بھر میں مقدس ترین مقام قرار دے کر اُس پر بصرفِ کثیر ایک عالی شان گرجا تعمیر کیا - اب اس گرجے کی پرستش وزیارت کے لیے لاکھوں آدمی اس یقین کے ساتھ آتے ہیں کہ یہاں کی عبادت و زیارت کا ثواب بالکل اُتنا ہی ہے جتنا خود ارضِ مقدس کی زیارت کا -

یہ ایک نہیں، دو نہیں، اکٹھی چار حقیقتیں کیا اسکا قطعی ثبوت پیش نہیں کرتیں کہ یورپ کی مذہبی ذہنیت کی سطح ایک زمانہ میں اس درجہ پست اور اُسکے دل میں صداقت کی مقدار اسقدر کم رہ چکی ہے کہ اگر موقع و مقام مقتضی ہوا تو اُسنے اپنے مذہب اور اساطین مذہب میں بھی دجل و خدع تک سے کام لیکر سوادِ اعظم کے معتقدات و خیالات کو مرعوب و مسحور کرنے میں پس و پیش نہیں کیا ہے؟

جب یہ بات ہے تو کیا اس میں کسی شک و ریب کی گنجایش ہو سکتی ہے کہ لورٹو کی پہاڑی بالامکانِ مقدس اہلِ یورپ کے خدع مذہبی کی بلند ترین مثال ہے؟ وما یخدعون الا انفسھم -

اس تصویر کے ملاحظہ کے بعد، کیا ہمارے وہ بھائی جنھوں نے ہند کے ایک حصہ کو عراق کا ٹکڑا بنا رکھا ہے اپنی شکل بھی ذرا آئینہ میں دیکھ لیں گے کہ کہیں کچھ مشابہت تو نہیں پائی جاتی؟

انّ فی ذٰلک لذکرٰے لمن کان لہٗ قلب او القی السمع ......

"شمع بے نور"

(مدینۃ الاولیا - محلہ مزینۃ السادات)

Pied mont ۱ Bernardino Caimo ۲ CampoSanto ۳
Mount Calvary ۴ Mount Tabor ۵ Varalo ۶
Golgotha ۷ Jordon ۸ Kedron ۹ Mount Olivet ۱۰

"شاما"

مصنفہ پنڈت کشن پرشاد کول صاحب[1]

مغرب کے تمدن کا جو زبردست حملہ مشرق پر ہوا ہے، اُس کا کوئی ایک ہی راستہ نہیں۔ تحریر، تقریر، تصویر، تماشہ، ہر ممکن ذریعہ سے مشرق کے دل و دماغ کو مغرب مسخر کر لینا چاہتا ہے، اور اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ پُرانے فاتحین کے حملے دوسری قوموں کے جسموں پر تلوار، تیر، اور بندوق کے ذریعہ سے ہوتے تھے، تہذیب جدید کے حملے قوموں کے دلوں، دماغوں اور روحوں پر ہو رہے ہیں، اور اسکے اسلحۂ جنگ کے نام، اسکول، کالج، یونیورسٹی، کلب، کانفرنس، ناول، اخبار، ڈرامہ، سینما وغیرہ ہیں۔ ان حملہ آوروں کو کامیابی اُسی گھڑی حاصل ہو جاتی ہے، جب یہ دشمن کو دوست، بیگانہ کو اپنا، اور حریف کو حلیف بنا لیتے ہیں۔ مشرقی کا گوشت و پوست، جسم و رنگ اب بھی مشرقی ہی رہتا ہے۔ لیکن جسم کے اندر روح مغربی ہو جاتی ہے، اور دماغ کے اندر خیالات "اپنے" نہیں، "اُنکے" ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتا اب بھی ہے، مگر "اُنکی" آنکھ سے، سنتا اب بھی ہے، مگر "اُنکے" کان سے، سوچتا اب بھی ہے، مگر "اُنکے" دماغ سے، اور بولتا اب بھی ہے، مگر "اُنھیں" کی زبان سے!

دنیا نو سی مسلمان آج اپنا سر پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کہ اُنھیں کے روشن خیال اور آزاد خیال بھائی اپنی قوم کو کہاں سے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ مصیبت تنہا اُنھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ میخانۂ مغرب میں جس کسی کا بھی گزر ہو گیا، وہ اُنھیں کی طرح مست ہی ہو کر باہر نکلا ہے

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
کہ مُلّا ہم سر بازار شد مست!

جاپان کو آج مہاتما گوتم بُدھ کی تعلیم سے کوئی لگاؤ باقی رہ گیا ہے؟ چین میں کنفوشس پر ایمان کے قائم رکھنے والے اب کتنے رہ گئے ہیں؟ تبت میں لاماؤں کی "لاامیت" اب کے دن کی مہمان ہے! ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنی قدیم تہذیب پر ناز، اور بڑی حد تک سچا ناز تھا۔ آج اُسی قبائے تہذیب کی دھجیاں، اور تو اور، خود پنڈتوں اور پنڈت زادوں کے ہاتھ سے اُڑائی جا رہی ہیں!

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔

---

[1] ضخامت ۲۰۵ صفحے۔ قیمت غالباً ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔

پنڈت کشن پرشاد صاحب کول، اپنی کشمیری برادری کے ایک ممتاز رکن، انگریزی کے اعلےٰ تعلیم یافتہ، مسٹر گوکھلے کے صحبت یافتہ، اور سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہیں۔ اپنے وطن سے، اپنی قوم سے محبت رکھتے ہیں، اور دل سے اُسکی اصلاح و ترقی کے خواہاں ہیں۔ اور نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ، ہزاروں دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی طرح، "ترقی" کے معنی وہی سمجھے ہوئے ہیں، جو اُستادانِ مغرب نے اُنھیں سمجھا دیے ہیں، اور "اصلاح" سے مراد بھی اصلاح سے لیتے ہیں، جو پیرس و لندن، اور نیویارک و واشنگٹن کی بول چال میں اصلاح کہی جاتی ہے!

مشرقی تہذیب، خصوصاً ہندی تہذیب میں عورت کا سب سے بڑا وصف شوہر پرستی سمجھا گیا تھا۔ قدر سب سے زیادہ اُس بیوی کی تھی، جو شوہر کے پسینے پر اپنا خون بہادے، عزت سب سے زیادہ اُس گھر والی کی تھی، جو خانہ داری کے انتظام اور شوہر کی خدمتگزاری میں اپنے کو فنا کردے۔ مغرب کے تخیل میں آج یہ صفات قابلِ مضحکہ ہیں۔ بیوی، شوہر کی خدمت کے لیے نہیں، اپنے شوق اور دلچسپیوں کے پورا کرنے کے لیے ہے۔ "چراغِ خانہ" نہیں، "شمعِ بزم" ہے۔ اُس کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری کے اندر، بچوں کی پرورش، شوہر کی خدمت، اور خانگی سلیقہ مندی نہیں، بلکہ کلب کی ممبری اور پارک کی سیر ہے۔ فرائض کی انجام دہی نہیں، بلکہ شوہر سے اپنے "حقوق" کا مطالبہ ہے، اور چہرہ کو شرما کر چھپانے کے بجائے، اسے طرح طرح کے پوڈروں اور Life stock سے آراستہ کرکے دوسروں کو دکھانا ہے۔ وہ دَور گزر گیا، جب سیتا جی اور ساوتری کے نمونے پیش کیے جاتے تھے، جب بالمیک اور تلسی داس کے دوہے رگوں میں شرافت کا خون دوڑاتے تھے، اب کلیوپیٹرا اور میڈم ڈی اسٹیل کا زمانہ ہے، اب ملکہ میری اور جوزفائن کا فسانہ دہرایا جاتا ہے، اب مل اور ایک دوسرے کی نکاحی بیوی اور مسٹر ٹیلر، اور لوئیس اور اُنکی بے نکاحی بیوی جانشین الیمیٹ کی ہا رہیں ہیں، اب شہرت و ناموری کی تاجدار، سینما کی "اسٹار"، تھیٹر کی ایکٹرسیں، "مقابلۂ حُسن" میں انعام پانے والیاں، اور ٹائمس آف انڈیا کے [illegible] competition میں حصہ لینے والیاں ہیں!

جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج!

ہمارے تعلیم یافتہ دوست پنڈت صاحب موصوف کا تخیل اصلاحِ نسواں بھی یہی مغربی تخیل

۱؎ ٹائمس آف انڈیا (بمبئی) کا وہ انعامی مقابلہ، جس میں اونچے اور معزز گھرانوں کی سیکڑوں جوان خاتونوں نے اپنی "ساق سیمیں" ہی نہیں، بلکہ پوری پوری ٹانگوں اور رانوں تک کے برہنہ فوٹو مقابلہ کے لیے بھیجے اور انعامات حاصل کیے!

سے ہے اور اپنی کوششِ اصلاح کو زیادہ کامیاب و کارگر بنانے کے لیے اُنھوں نے اپنے خیالات کو شاما کے نام سے ایک ناول کے پیرایہ میں ظاہر فرمایا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ شاما ایک اوسط درجے کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے، جسکی شادی سولہ برس کی عمر میں ایک خوشحال گھرانے میں کردی جاتی ہے۔ (مصنف کے نزدیک یہ بہت کمسنی کی شادی ہے، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ یورپ میں اس سے بہت زیادہ عمر میں شادی ہوتی ہے!) شوہر کے چلن خراب، اور ساس کا مزاج خراب۔ شاما تین برس کسی نہ کسی طرح سسرال میں گزارتی ہے۔ آخر ایک روز تنگ آکر باپ کے گھر الٰہ آباد بھاگ آتی ہے۔ باپ کے گھر آکر ایک نوجوان پرکاش سے رفتہ رفتہ محبت ہو جاتی ہے۔ تنہائی کے موقعے ملتے ہیں۔ پرکاش شادی کی درخواست کرتا ہے۔ شاما انکار کرتی ہے۔ آخر پرکاش بددل ہوکر اپنی شادی کہیں اور کر لیتا ہے۔ شاما دق میں مبتلا ہوکر نذرِ اجل ہو جاتی ہے، لیکن موت سے قبل دل کی بپتی دو طویل خطوط میں سنا ڈالتی ہے۔ غنیمت ہے، کہ مصنف صاحب نے سب سے بڑا اور اصلی مطالبہ مساواتِ حقوق ہی کو رکھا ہے، اور یہیں پہونچ کر وہ رک گئے ہیں۔ شاید اس کا اثر ہے، کہ مشرقیت کی روایات کو وہ ابھی تک اپنے دماغ سے پوری طرح دور نہیں کر سکے ہیں۔ ورنہ اگر مساواتِ حقوق کے مطالبہ سے بڑھ کر وہ بےحیائی اور بےعصمتی (جس کے لیے ”دانایانِ فرنگ“ کی ذہانت نے طرح طرح کے نئے نئے نام گڑھ لیے ہیں) کی بھی وکالت فرمانے لگتے، تو فرمایئے انھیں ٹوک کر ”تاریک خیال“ اور Reactionary کے خطابات کون حاصل کرتا؟

موجودہ ہندو معاشرت میں جو خرابیاں اور ابتریاں ہیں، اُن سے کسی کو انکار نہیں۔ عورت کو جس طرح حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، اُس پر ہر سمجھدار ہندو کو افسوس ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ دوست، اپنے جوشِ اصلاح میں جس منزل کی طرف اپنی قوم کو لیجانا چاہتے ہیں، وہ دوسری انتہا ہے۔ وہ اعتدال نہیں، بلکہ ایک دوسرے قسم کی، اور زیادہ خطرناک قسم کی، بے اعتدالی ہے۔ وہ راستہ امن، اصلاح، اور خانگی زندگی میں سکون پیدا کرنے کا نہیں، بلکہ فتنہ و فساد اور ”سوشل انارکی“ پھیلانے کا ہے۔ وہ منزل ”سیلف کنٹرول“ کی نہیں، ”برتھ کنٹرول“ کی ہے۔ برطانیہ، امریکہ، فرانس میں انھیں بے اعتدالیوں کے بدولت آج جو طوفان برپا ہے، وہ ہمارے لیے موجبِ رشک نہیں، باعثِ عبرت ہے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ جو لوگ اس طلسم کو حقیقت، اسی اندھیرے کو روشنی، اسی زحمت کو رحمت سمجھے ہوئے ہیں، اُن کی آنکھیں کوئی زبردستی چیر کر کیونکر کھول سکتا ہے!

نفس مضمون سے قطع نظر کرکے، کتاب ناول کی حیثیت سے اوسط درجہ کی ہے۔ کول صاحب اُردو کے مشاق لکھنے والے ہیں، جابجا اُنکے قلم نے انشا پردازی کا نمونہ دکھا دیا ہے۔ اپنے وطن کشمیر کے قدرتی مناظر جہاں جہاں اُنھوں نے دکھائے ہیں، پورا سماں باندھ دیا ہے، اور پڑھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ وہ کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ پڑھ رہا ہے، بلکہ یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ وہ خود گلشنِ کشمیر کی گلگشت میں مصروف ہے۔ جذبات نگاری بھی بعض بعض مقامات پر اُنھوں نے خوب کی ہے، مگر جذبات کی مصوری میں ہر جگہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ کہیں کہیں ایسے کیرکٹرز (اشخاصِ افسانہ) بھی لے آئے ہیں، جنکا Developement بالکل نہیں ہوا ہے، یا ناکافی ہوا ہے۔ مثلاً شاما کی لڑکی سروپ کماری کی ولادت کا ذکر کر دیا ہے، مگر افسانہ سے اسکا تعلق بالکل نہیں واضح ہو سکا ہے۔ اسی طرح شاما کے شوہر اور ساس کا جو کیرکٹر دکھلایا گیا ہے، اُس کے لحاظ سے شاما کے فرار ہو جانے پر اُنکا خاموش ہو جانا، اور کوئی شورش برپا نہ کرنا بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ شاما کے کیرکٹر میں بھی یہ نقص خاص طور پر قابلِ گرفت ہے، کہ وہ اپنے شوہر کو قائل معقول کرنے، یا اُسکی بری عادتوں کے سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ آخر میں یہ کاش سے جس طرح وہ صاف صاف بحثیں کرتی ہے، اور خطوط میں ساری دل کی بپتی سنا جاتی ہے، کیا شوہر غریب اتنی بے تکلفی اور اتنی کوشش اصلاح کا بھی حقدار نہ تھا؟

کشمیری پنڈتوں میں اُردو کے بعض بہت اچھے اور صحیح لکھنے والے پیدا ہو چکے ہیں۔ کول صاحب نے ان روایات کو ایک حد تک قائم رکھا ہے، لیکن ہر جگہ نہیں نباہ سکے ہیں۔ پہلے ہی صفحہ پر "فرصت ملی" یا "فرصت ملی" کے بجائے "فرصت آئی" ص۱۸ پر "آپے سے باہر" کے بجائے "آپے کے باہر"۔ اسی صفحہ پر "عورت ذات" کے بجائے "عورت کی ذات"۔ مختلف صفحات پر "آسانی" یا "نرمی" کے بجائے "سہولیت" ص۲۲ پر "بے محرم" ص۲۳ پر لڑکی کی ولادت کے موقع پر لفظ "حادثہ" کا استعمال، اور اسی صفحہ پر "شاما کے لڑکی پیدا ہوئی" کے بجائے "شاما کو لڑکی پیدا ہوئی"۔ یہ چند مثالیں اس قسم کی لغزش قلم کی ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بھی افسوس ہے کہ بڑی کثرت سے ہیں، جو باوجود ایک مفصل غلطنامہ کے بھی دور نہیں ہوئی ہیں۔ مثلاً "جامعۂ انسانیت" (ص۱۱) "بیوی کو دہتکنے" کے بجائے "بیوی کو دھتنے" (ص۳۰) "ترتیبت" کے بجائے "ترتیب" (ص۶) وغیرہ۔

زبان و فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے یقین ہے کہ کول صاحب کی آیندہ کوشش زیادہ

والے سے (جیسے وجود میں، خواہ ابھی اُنھیں کتنا ہی شک ہو) دعا ہے، کہ انکی انتہا پسندی اور جوشِ اصلاح کا رُخ بجائے معاشرتِ خانگی کے سیاستِ مُلکی کی جانب پھر جائے! اور جس آزادی کے ساتھ وہ اپنے ہاں کے سب سے مقدس بزرگوں رامچندر جی اور کرشن جی پر نکتہ چینی کر جاتے ہیں، ایسی ہی جرأت اور بیباکی انڈین سول اور ملٹری کے مقابلہ میں بھی پیدا ہو جائے!

عبدالماجد

اثر کا نام ونشاں نالہ و فغاں میں نہیں　　ٹھہر، کہ رازِ طلب سعیِ رائیگاں میں نہیں

وقارِ حسنِ طلب، گرمیِ بیاں میں نہیں　　متاعِ دستِ کرم، شورشِ زباں میں نہیں

کمی وفا کی دلِ زار و ناتواں میں نہیں　　بس امتحان کا ڈر ہے کچھ امتحاں میں نہیں

مری نظر میں تغافل ہے انتہائے ستم　　گر یہ آپ کا حصہ ہے آسماں میں نہیں

تری ادا ہے نویدِ بقا قضا بھی سہی　　یہ شان اور کسی مرگِ ناگہاں میں نہیں

ازل میں سرنوشتِ دلِ بے قرار کی خاطر　　ملی وہ بخت کو گردش جو آسماں میں نہیں

فسانہ گو کو شتاب، تو جا نگاہِ ناز سے سُن　　وہ داستاں کا ضمیمہ جو داستاں میں نہیں

وہ ڈھونڈھتی ہی پھری شعلگی وہ انکھڑیاں بے نقاب　　سنبھل، کہ ذوقِ نظر دیدہ امتحاں میں نہیں

تبھی پاسباں کو اگر سنگِ آستاں کی ہے رٹ　　تو شانِ عجزِ خداداد پاسباں میں نہیں

بچا تو دل ہی بچا، نذر سے لیں تری نگہ　　کسی نظر کا گذر اب بھی لامکاں میں نہیں

نسیمِ حیات دو روزہ بہت غنیمت ہے　　کہ اوجِ کشمکشِ عمر جاوداں میں نہیں

کہیں سے آہ اثر کو بھی کھینچ لائے گی　　اثر زباں میں نہ ہو کیا اثر جہاں میں نہیں

نگاہِ یاس یہ کیا کہہ گئی کہ ہم آخر　　اب اعتذار کی طاقت بھی نیم جاں میں نہیں

جنوں کو تنگیِ دل کا گلہ نہیں یا رب　　وہ وسعتیں اسے دی ہیں جو آسماں میں نہیں

عجیب مضطرب الحال تھی بہارِ شباب　　مگر وہ موجِ تلوّن اب اس خزاں میں نہیں

تری تلاش نظر کے لیے معمہ ہے　　کہ ہر مکاں میں ہے تو اور کسی مکاں میں نہیں

بجا ہے حسرتِ پنہاں کا رنگِ رُخ سے گلہ　　وہ کیوں کہا جو زباں پہ نہیں بیاں میں نہیں

نگاہِ ناز یہ سفاکیاں اشاروں میں　　کہ میرے قتل کا فتوے مری زباں میں نہیں

دلِ حزیں بھی ہے جانِ ضعیف بھی ہے امیر
مگر وہ ذوقِ غزل پیرِ ناتواں میں نہیں

امیر بدایونی

دیباچہ سیر المصنفین جلد دوم

اس کتاب کے بعض اجزا ۱۹۲۴ء کے آخر میں ہدیۂ ناظرین کیے گئے تھے۔ اور اُسوقت توقع تھی کہ ۱۹۲۵ء میں کتاب شایع ہو جائیگی۔ مگر اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی۔ اب کتابت ہو رہی ہے۔ امید کرنا چاہیے کہ سال رواں میں مکمل ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہونچ جائیگی۔

اڈیٹر

جس وقت ہم نے اِس کتاب کی پہلی جلد کتابت کے لیے دی تھی اُسوقت ہمارا یہ خیال تھا کہ ہم اِس کتاب کو دو جلدوں میں شایع کریں گے۔ چنانچہ دیباچہ جو پہلی جلد کے ساتھ شایع ہو چکا ہے درحقیقت پوری کتاب کے لیے لکھا تھا لیکن دورانِ کتابت میں آسانی اور سہولت اِسی کی مقتضی ہوئی کہ سیر المصنفین کو دو جلدوں میں تقسیم کیا جائے۔ پس ہم نے جلد اول میں پہلے دو دوروں کا حال بیان کر دیا ہے اور اِس جلد میں ہم صرف دَورِ سوم کا تذکرہ درج کریں گے۔ دورِ حاضر یا دَورِ چہارم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو گیا ہے اب تک مرتب نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ابھی ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اسے ترتیب دیں۔ بڑی دقت جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ دَورِ سوم کے جن برگزیدہ اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے اُنھوں نے ہماری زبان میں تصنیف و تالیف کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے اور ہم اپنے دَور کے اہل تصنیف کو اُس معیار تصنیف و تالیف کے لحاظ سے ہرگز ابھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ اُن کا ذکر بھی دَورِ سوم کے مصنفین کے دوش بدوش کیا جائے۔ حالانکہ ہماری دلی خواہش یہ ہے کہ دَورِ چہارم کے مصنفین کو ہم دَورِ سوم کے مصنفین سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر دیکھیں تا کہ ہماری زبان کا عنفوانِ شباب فی الحقیقت شباب کی اُمنگوں اور آرزوؤں سے لبریز نظر آنے لگے۔

دورِ حاضر کے اہل تصنیف ہمارے نزدیک مصنفین کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے ضرور تیار نظر آتے ہیں لیکن ابھی وہ اعلیٰ درجہ کے مصنفین میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ فنِ تصنیف میں اُنکی تصویر ناتمام ہے اور ناتمام تصویر کو مکمل کہکر پیش کرنا غلط بیانی ہے اور نافہمی کی دلیل ہے۔ بہترین تصویروں کا اقتضا ہے کہ ہمیں مرکزِ عام پر لاکر ہماری طرف لوگوں کو دعوت دو۔ لیکن ذرا وہ اور صبر سے کام لیں۔ لوگ خود بخود اُنکی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اور یہ خاکسار بشرطِ حیات اُنکی خوبیاں بیان کرنے میں کوتاہی نہ کریگا۔ اور اُسوقت سیر المصنفین کی تیسری جلد تیار ہو سکے گی۔

پہلی جلد کی اشاعت کے بعد سب سے بڑا اعتراض ہم پر نثر اُردو کی ابتدا کے متعلق کیا گیا ہے۔

فدائیانِ اُردو اِس بارے میں یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ اُردو کی پیدائش اور مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ دونوں مترادف الفاظ سمجھتے ہیں - اُن سے کم درجے پر وہ اصحاب ہیں جو تحقیق و تدقیق کے دلدادہ ہیں - اور وہ نثرِ اُردو اور نظمِ اُردو کی ابتدا اُن نثروں کی بنا پر جو دکن میں دستیاب ہوگئی ہیں ساتھ ساتھ بتاتے ہیں - حالانکہ دنیا کی کوئی تحریری زبان ایسی نہیں ہے جس کی نثر، نظم نے پہلے لکھی گئی ہو یا نظم کے ساتھ ساتھ ہی معرضِ وجود میں آئی ہو - بہر حال اس جدید تحقیقات[1] کا خلاصہ جہاں تک اُردو نثر سے متعلق ہے یہ ہے :-

حضرت زین الدین خلد آبادی نے جو ۷۷۱ھ ہجری میں فوت ہوئے اپنے ایک مرید خاص نصیر الدین بہ ہیری کی اس یاددہانی پر کہ حضرت اپنا خلیفہ کسی کو مقرر کر دیں، بوقت انتقال یہ فرمایا تھا کہ منجہ مت بلاوہ یعنی مجھے مت بلواؤ -

شیخ عین الدین گنج العلم نے اپنے اُردو رسالے آٹھویں صدی ہجری میں تصنیف کیے -

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دو کتابیں معراج العاشقین اور ترجمۂ نشاط العشق نویں صدی ہجری میں تحریر کی تھیں -

میراں جی شمس العشاق کے رسالے "جل ترنگ" اور "گل باس" وغیرہ دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہیں -

مولانا عبد اللہ نے ۱۰۳۲ھ ہجری میں احکام الصلوٰۃ تصنیف فرمائی - نمونہ حسب ذیل ہے :-

"روح قبض ہوا اسی وقت اسکیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہات دراز کرنا دونوں پہلو کے طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا ہور اسی کی تھوڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا اسے بزرگان بولتے ہیں یو سب سنت ہے ہور مرنی تے اوّل اسکی سر کوں قطب کے طرف کرنا سلانا ہور موئے بعد ازاں اسی غسل دینا اس طریق سوں"

اسی زمانہ کی ایک اور کتاب مفتاح الخیرات ہے اُس کا نمونہ بھی ذیل میں درج کرتا ہوں :-

"ایمان کی حکمان کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھانتا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اُسکے پچھان نی جیتکا ہے ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار تا ہویگا - اگر تجھے پوچھیں گے ایمان کیا ہے بول تو زبان اقرار کرنا ہے زن کے تئیں ہور استوار کرنا ہے دل میں خدائے تعالیٰ یکیب ہے بغیر اس کے خدا خارج دوسرا نہیں ہے"

[1] دیکھو دکن میں اُردو مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی (منشی فاضل) و تاریخ زبان اُردو مولفہ حکیم سید شمس اللہ قادری

ملّا وجہی نے غالباً حضرت وجیہ الدین گجراتی کی تالیف سے کتاب سبرس ترجمہ کی ہے۔ یہ تصوف کی بہترین کتاب ہے جو ۱۰۴۵ہجری میں مرتب ہوئی۔ کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:

"تمام مصحف کا معنا الحمد للہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کی نقطے میں رکھیا ہے کریم سمجھ دیکھ خاطر تامل حدیث میں یوں آئی ہے کہ العلم نقطہ وکثرہا جہال۔ یعنی علم ایک نقطہ ہے جاہلاں نے اسے بڑائے۔"

شمائل الاتقیا کا ترجمہ میراں یعقوب نے ۱۰۶۵ہجری میں ترتیب دیا۔ یہاں اسکی کچھ عبارت بطور نمونہ نقل کیجاتی ہے۔

"اپنی حیات کی وقت پہنچے اشارت کیے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیا دے تا ہر کسی کوں سمجھا جاوے اس وقت پہنچے پیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر اٹھوں سال کوں رحلت کیے پر ان کے بھانجے عارف حق رسیدہ عارف نور کیے فرزند کیا مصطفےٰ کے پیچھے ہور اور مرتضیٰ کے میں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زمان سے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں رسان لکھا جاتا تھا جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ہوا ہور حضرت شاہ کی حضور ہور محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل سکے اس کی بیکر مطالع فرماکر خوش کیے۔"

اسکے بعد میر فضلی کی کتاب دہ مجلس کا نمبر آتا ہے، جس کا ذکر ہم جلد اول میں کر چکے ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۴۵ہجری کی تصنیف ہے۔ نمونہ ذیل میں درج ہے:-

"اس کتاب کا سبب تالیف یہ تھا کہ قبلہ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے نواب شرف علی خاں ہر سال تازیہ ابو عبداللہ الحسینی کا بخلوص نیت اندرون محل بجا لاتا تھا اور بندہ روضۃ الشہدا کا خلاصہ سناتا تھا لیکن معنی اسکے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُر سوز وگداز بسبب لغت فارسی ان کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر یہ مذکور کرتیں کہ ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے۔"

۱۱۸۵ہجری میں مولوی محمد باقر آگاہ نے سیر، عقاید اور فقہ کی متعدد کتابیں لکھنی شروع کیں۔ انکی نثر کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"بعض علماے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں، تاکہ وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں۔ لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں اس لیے یہ عاجز بھی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے اور ہر رسالہ کے وزن علحدہ ہونے سے خواہش قاری و پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔"

شرف الملک مولانا محمد غوث نے جنکا انتقال ۱۲۳۸ھ ہجری میں ہوا کیدانی فقہ حنفی کا ترجمہ فرمایا۔ عبارت کا نمونہ ذیل میں ہے :-

"پوچ کہ تحقیق بندہ آزمائی جاتا ہے درمیان اسکی کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب پاوے اور درمیان اسکی کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے"

مولانا قاضی بدر الدولہ (خلف شرف الملک) نے بھی نثر میں مختلف کتابیں سیر، فقہ، عقائد اور تفسیر پر تحریر فرمائیں۔ آپ کی کتاب فوائد بدریہ کے دیباچے میں سے کچھ عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے :-

"لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہوگیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گزر گئے۔ اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کیجے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔ جن کو ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے انکے لیے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو خواہشمند بھی نہیں پایا۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے احوال سے واقف ہوکر انکی پیروی خوبی کے ساتھ کریں"

قاضی صاحب موصوف نے ۱۲۸۰ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔

مندرجہ بالا نمونوں سے ناظرین کرام خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ۱۲۴۵ھ ہجری سے قبل جبکہ میر فضلی نے اپنی کتاب دہ مجلس تصنیف کی جملہ تصنیفات کی نثریں بشکل اردو لکھی جا سکتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو ان مختصر نثروں کا نقل کرنا بھی اجیرن ہوگیا۔ طبیعت نہایت تنگ اور منغص ہوئی۔ جس طرح ابتدائی انگریزی زبان کو اینگلو سیکسن کہا جاتا ہے اسی طرح ان بزرگوں کی اردو کو اگر دکنی اردو کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ جس جانفشانی اور محنت و تلاش سے ان بزرگوں کی کتابوں اور نثر کے نمونوں کو دکن میں اردو کے مولف نے بہم پہنچایا ہے وہ ضرور قابل تعریف ہے لیکن اُن کا یہ کارنامہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق ہے۔ اگر ہم نے اپنی کتاب کی جلد اول میں دہ مجلس کو نثر اردو کی "غالباً پہلی کتاب" لکھدیا تھا تو ہم پر اور مرحوم کا مقلد کہکر ہم پر کیوں عدم تحقیق کا الزام لگایا گیا؟ کیا اب کوئی شخص ان نمونوں کی موجودگی میں اس بات سے انکار کرسکتا ہے کہ وہ مجلس ہی ایسی کتاب ہے جسکو اردو کہا جاسکتا ہے اور فی الواقع یہی اردو کی سب سے پہلی کتاب کہے جانے کی مستحق ہے؟ باوجود اسکے ہم فضلی مرحوم کو بھی مصنف کا لقب نہیں دے سکتے اور نہ مرزا رفیع السودا کو اپنی کلیات کا دیباچہ نثر میں لکھنے پر انکو شاعر بے بدل کی طرح ناثر بے مثال کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں صاحبان کی نثر بیانی کا نمونہ ہم نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں دیا ہے میر محمد عطا حسین خان تحسین وغیرہ کے مقابلے میں عدیم الفہم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحسین سے پیشتر اردو نثر سانچے میں ڈھل رہی تھی لیکن کوئی کمل صاحب طرز

نہیں ہوا تھا۔ ہم پر عدم تحقیق کا الزام بیجا ہے؛ ہمارے ذوق ادب نے رطب و یابس کو اُردو نثر میں شامل نہیں کیا اور نہ ہم آیندہ ایسی نثروں اور ایسے مصنفین کو اپنی کتاب میں جگہ دینے کیلیے تیار ہیں۔ ہمارے معترض دوست اگر کسی زبان کی تاریخ پہ غور ملاحظہ فرمائیں تو اُنکو معلوم ہو جائے کہ ادوار اُسوقت سے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ زبان ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی زبان مستقل صورت اختیار کر لے۔ پس جب تک نثر لکھنے کا طریقہ مروج اور عام نہ ہوگا اُسوقت تک نہ مصنف پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ دَور قائم کیے جا سکتے ہیں۔ بعض اصحاب جن کو ہم نے نظرانداز کر دیا ہے ہمارے اس نظریہ کے بیّن ثبوت ہیں۔

ہمارے زمانہ کی تمام ترشائستگی اور تہذیب دانایان فرنگ کی مرہون منت ہے۔ لہذا جس طرح اُنھوں نے اپنی اپنی زبانوں کی تاریخ کی تدوین میں قدیم اُٹھایا ہے اور جس طرح اُنھوں نے اپنی اپنی زبان کے ادوار قائم کیے ہیں وہ ہمارے لیے دلیل راہ ہیں اور ہم کو بھی اُنکے نقش قدم پہ چلنا چاہیے کیونکہ ایک متمدن قوم اپنے زمانۂ عروج میں کبھی غلط رستہ اختیار نہیں کرتی۔ پس انگریزی علم ادب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے۔ اُس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ نظم میں اُنکے یہاں سب سے قدیم اور مشہور انگریزی شاعر جیفری چاسر ہے جو ۱۳۴۰ء سے ۱۴۰۰ء تک زندہ رہا۔ اسکو "انگریزی شاعری کا باپ" کہتے ہیں اور وہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے انگریزوں کی قومی زبان کو نظم میں اظہار مطالب کا ذریعہ قرار دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے انگریزی کو لٹریری زبان بنایا۔ باوجود اسکے انگریزی شاعری کا دَور اول چاسر کے نام نامی سے خالی ہے۔ جس زمانہ کو انگریزی شاعری کا دَور اول خیال کیا جاتا ہے وہ اُس سے بھی ڈیڑھ صدی پیشتر ہو گزرا ہے۔ دَورِ اوّل ملکہ الزبتھ کے زمانہ سے تقریباً ۱۵۵۸ء میں شروع ہوا اور ۱۶۱۶ء میں ختم ہوا ہے"[۱]۔

اب انگریزی نثر کو لیجیے۔ اگرچہ چاسر سے پیشتر متعدد شعرا اور مصنفین جو نامور اور معروف تھے بھی ہیں گزر چکے تھے لیکن موجودہ انگریزی زبان کا سب سے پہلا شاعر چاسر ہی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ چاسر سے پیشتر انگریزی زبان پانچ چھ صدی سے رواج پا رہی تھی لیکن اس عرصے میں وہ برابر بدلتی رہی۔ اور مستقل صورت صرف چاسر کے زور قلم نے پیدا کی۔ چنانچہ اُسی زمانے سے نثر کے ادوار قائم ہوئے اور مصنفین کی تعداد میں بتدریج روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سچ ہے کہ زندہ زبانیں برابر بدلتی رہتی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔ اور جو زبان محدود دائرے میں بند ہو جاتی ہے وہ بہت جلد مردہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سنسکرت کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے تاہم دور قائم کرنے کے لیے زبان کی مستقل صورت کو جو

---

[۱] ماخوذ از شاعرانہ خیالات مترجمہ تنہا

پہلے پہل اُس نے اختیار کی، ہو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ پس ہم نے بھی اپنی زبان کی نثر کو میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے وقت سے ایک مستقل شکل میں پایا ہے ۔ اور اسی بنا پر اُسی زمانہ سے نثر کے ادوار قائم کیے ہیں۔

تاریخ زبان اُردو اور تذکرہ مصنفین اردو میں بھی فرق ہے ۔ بعض اصحاب دونوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں اور فوراً اعتراضات جڑ دیتے ہیں ۔ ہم نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں "اُردو کی پیدائش" کے نام سے ایک باب تحریر کیا ہے اور اُس میں دکھلایا ہے کہ کیونکر اختلاطِ الفاظ کی بنیاد پڑی اور کس طرح رفتہ رفتہ الفاظ کے اختلاط سے ایک دوسری زبان یعنی اُردو کی ابتدا ہوئی ۔ یہ سچ ہے کہ شاہجہاں سے پہلے بھی وہ زبان جسکو ہم اُردو کہتے ہیں بولی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ آناً فاناً کوئی زبان عرصۂ وجود میں نہیں آ سکتی ۔ تاہم شاہجہاں کے لشکر سے اس زبان کا منسوب ہونا اور اُردو کا نام حاصل کرنا ظاہر کر رہا ہے کہ اُسوقت سے اس زبان کو زبان سمجھا جانے لگا اگرچہ فی الواقع یہ محض روزمرہ کی ضروریات کو ادا کرنے کے لیے زبان تھی ورنہ زبان سے جو آجکل مفہوم ہے اُس سے کوسوں دُور تھی اور ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں آج بھی صفر کے برابر ہے ۔ البتہ اسکی روز افزوں ترقی سے اُمید ہے کہ جلد متمدن اقوام کی زبانوں کا مقابلہ کر سکے ۔ بہرحال زبان اردو کی تاریخ لکھتے وقت اسکی پہلی شکل یعنی اختلاطِ الفاظ کا بیان کرنا اور بہ تدریج اُسکی ترقی اور نشو و نما کا ذکر کرنا ضروری ہے جیسا کہ ہم نے اُردو کی پیدائش کے باب میں مختصراً کیا ہے لیکن تذکرہ مصنفین لکھتے وقت ہم اُس زمانہ کے مصنفین سے ابتدا کرنے کے لیے مجبور ہیں جبکہ زبان نے پہلے پہل مستقل صورت اختیار کی ۔ ہم ہرگز شیخ عین الدین گنج العلم سے اور اُنکے مابعد تحسین تک جو مصنفین گزرے ہیں اُن سے اُردو نثر کے ادوار قائم نہیں کر سکتے کیونکہ اُنکی دکنی اُردو درحقیقت اُردو ہی نہیں ہے ۔ ہمارے نزدیک تحسین سے پیشتر ایسی اُردو کا سراغ نہیں ملتا جسے بآسانی اُردو کہہ سکیں اور کھینچ تان کر کسی کتاب کو اُردو کہہ دینا اور بات ہے ۔

دوسری جلد جیسا کہ پیشتر عرض کیا جا چکا ہے عرصہ سے مسودہ کی صورت میں ہے اور اسکے کچھ اجزا رسالۂ اُردو اورنگ آباد دکن ، رسالۂ الناظر لکھنؤ اور جامعہ دہلی میں بھی چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۲۴ء سے اسوقت تک مسودہ میں موجودہ حالت کے لحاظ سے کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ تاکہ کتاب اپنے وقت اشاعت کی معلومات سے پیچھے نہ رہے۔

ہم ناظرین کی آگاہی کے لیے یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے جن کتابوں سے مدد لے کر یہ کتاب مرتب کی ہے اکثر وہی عبارت اور وہی الفاظ قائم رکھے ہیں ۔ البتہ اُن عبارتوں کو مختصر

کر دیا ہے، اور کہیں کہیں جہاں ضرورت ہوئی تبدیل کر دیا ہے یا اضافہ کر دیا ہے - بیشک مصنفین کی طرز تحریر پر جہاں دوسروں کی رائے نقل کی گئی ہے وہاں اپنی رائے کے اظہار سے بھی گریز نہیں کیا گیا-

اگرچہ ہم نے ایسے اصحاب کے حالات جن کا ذکر اس کتاب کے متن میں آگیا ہے حتی المقدور درج کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض ایسے اشخاص بھی رہ گئے ہیں جنکا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا یا تو اس وجہ سے کہ اُنکے ورثا نے خاکسار کی تحریرات پر کچھ توجہ نہ فرماکر اُنکے حالات قلمبند کرنے میں تساہل و تکاہل کو دخل دیا، یا خود اُن صاحبان نے اپنے آپ کو دورِ سوم کے مصنفین کا حاشیہ نشین ہونا پسند نہ فرمایا-

آخر میں ہم مسٹر سید انور حسین تنہا بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ) بانیٔ ہندوستان ریویو کلکتہ و سابق ممبر مالیات صوبہ بہار و اڑیسہ کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتے ہیں، جنھوں نے دلی خلوص کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت میں سعیٔ بلیغ سے کام لیا - اگرچہ

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

غازی آباد
٢٩ - نومبر ١٩٢٧ء

محمد یحییٰ تنہا

غزل

دل ہمارا عشق کے ہاتھوں بہت رنجور ہے
پڑ رہی ہیں اُس پہ وہ ضربیں کہ بالکل چور ہے

سختیوں کو ہجر کی کیا پوچھتا ہے ہمنشیں
سو بلاؤں میں پھنسا یہ عاشقِ رنجور ہے

میں عدم آباد تک مرمر کے پہونچا ہوں مگر
یہ نہیں معلوم کوئے یار کتنی دور ہے

دشمنوں کو اُنکے ہوتا ہے قیامت کا گماں
میرے نالہ کی صدا گویا صدائے صور ہے

ابتدائے عشق میں تھا دل میں اک چھوٹا سا زخم
اور اب سینے میں اُس دل کی جگہ ناسور ہے

چین کیا آئے بھلا اُس شمع رو کے ہجر میں
نیند بھی آنکھوں سے اپنی آج تو کافور ہے

میرا قصہ بھی حبیب الفت کا اُس سے کم نہیں
قصۂ مجنوں زمانے میں اگر مشہور ہے

حبیب اللہ خاں حبیب
(رامپوری)

سفرنامۂ اندلس

(۱)

کچھ خرابیِ صحت، جو اندلس کے اوپر محنت کرنے کا نتیجہ ہے، کچھ لاہور سے بُعد، وغیرہ وغیرہ نے اسپین کے متعلق اشتغال میں کمی کر دی تھی؛ مگر سفرنامۂ اندلس کے سامنے آتے ہی پُرانا ناسور یکایک پھر تراوش کر اُٹھا۔

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق　　　سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ملکِ اندلس کا یہ پہلا سفرنامہ ہے جو ہندی مسلمان، مخدومی میر امیر قاضی ولی محمد صاحب کا ہے۔ یوں جانے کو معدودے چند مسلمان وہاں گئے مگر سفرنامہ لکھنے کی اولیت کا تاج خدائے تعالیٰ نے اسی محترم سر کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ مجھے اندلس کے ہر ورق کا اتنا تجربۂ تلخ ہے کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جناب مصنف کی اس محنت سے جتنا میں ذاتی طور پر ممنون ہو سکتا ہوں اُتنی توقع اور مسلمانوں سے رکھنا بیجا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ اسکے اجر کے لیے اُنھیں صرف ذاتِ الٰہی سے اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ وہ کسی نیک کام کرنے والے کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ یقیناً اُن ارواحِ طیبات کی مدد اُن کے شاملِ حال رہیگی جنکو اُنھوں نے بے انتہا شفقت سے یاد کیا اور جلانے کی کوشش کی ہے۔

سفرنامہ کے صفحہ ۲۲ پر جناب مصنف نے اندلس کے متعلق میری جذبات کا نام لیا ہے، اور میری ارادت کا ذکر کیا ہے اور صفحات ۸۲ - اور ۹۳ پر پھر میرا ذکر فرمایا ہے

بہ غلامیِ تو مشہورِ جہاں شد حافظ　　　حلقۂ بندگیِ زلفِ تو در گوشش باد

مجھے اس کرم کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے؛ خصوصاً جب میں دیکھتا ہوں کہ اس ہندوستان میں کوئی مصنف یا مؤلف کسی غیر کی محنت کا اعتراف کبھی نہیں کرتا تو ناظرین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مصنف علام کی فراخ دلی اور فراخ حوصلگی کا میرے اوپر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس احسان نے میرے دل کی جو کیفیت ہے اسکو میں کسی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ یہ جو کچھ عرض کیا ہے محض انگریزی فیشن نہیں ہے بلکہ حقیقی دلی کیفیت ہے۔ وکفیٰ باللہ شہیدا۔ مجھ سے اگر کچھ بن پڑتا ہے تو صرف یہ کہ جناب ممدوح کے لیے دعائے خیر کروں اور بس۔

گفتم دعای دولتِ تو وردِ حافظ است　　　گفت این دعا ملائکِ ہفت آسماں کنند

اس اظہار احسان سے کوئی صاحب یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں نے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" پر عمل
کرکے انصاف کو بیچ ڈالا ہے۔ یہ سطور ذیل سے معلوم ہو جائے گا۔

اس شکر کے بعد شکایت بھی ہے اور بڑی شکایت ہے کہ جناب مصنف نے مجھے ہمراہ رکاب رکھنے
میں بخل کیا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے مجھے بستۂ فتراک سمجھ کر یوں ہی تڑپتا چھوڑ دیا ہو۔ لیکن میں
انکو یقین دلاتا ہوں کہ وہ مجھے بندۂ خدمت گزار پاتے اور میں کبھی بار خاطر نہ ہوتا۔ دوسری شکایت یہ
ہے کہ جناب ممدوح دل پر پتھر رکھ کر نہیں گئے۔ برخلاف اسکے وہ دل لے کر گئے جس میں سوا درد
کے کچھ نہ تھا۔ انکی آنکھیں زیادہ اشکبار معلوم ہوتی ہیں۔ وفور اشک سے یقیناً بہت سی چیزیں آنکھوں
سے اوجھل رہیں۔ اسکا مجھے افسوس ہے۔ میرے ~~ایک اور عزیز دوست میری ہی طرح آپ پر اس~~
وہ جناب میر دبیر سے بھی زیادہ کمزور دل رکھتے تھے۔ سیدھے غرناطہ پہنچے۔ اور جاتے ہی الحمراء گئے
قریباً ایک عشرہ وہاں روز جاتے رہے اور ہر بار سوا اسکے کہ رو کر چلے آئیں اور کچھ نہ کر سکے۔ ہزار
کوشش کرتے تھے کہ دل کو سنبھالیں مگر نہ سنبھال سکے۔ آخر مجبور ہو کر بھاگ آئے۔ یہ واقعہ انھوں نے
آکر مجھ سے بیان کر دیا اور یہی ان کا سفرنامہ تھا۔ اول تو کتنے مسلمان ہیں جنکو یہ توفیق ہے کہ ولایت جائیں
اور مسلمانوں کی تہذیب کے اس قبرستان کو دیکھیں۔ لیکن اگر کوئی نفوس قدسی ایسا کرنا چاہیں تو میرا یہ
مشورہ ہے کہ وہ دل دردمند کو کہیں اور چھوڑ کر صرف پتھر اپنے پہلو میں لگا کر جائیں ورنہ انکا جانا بالکل بیکار ہے۔

اس شکر و شکایت کے بعد میں اصل کتاب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے کتاب میں جو چیز
جاذب نظر و دل ہے وہ یہ ہے کہ جناب مصنف علام نے اکثر مقامات کا مقابلہ ہندوستان سے کر دیا ہے
جس کی وجہ سے کتاب بہت زیادہ دلچسپ اور ناظرین کے لیے بہت آسانی کا باعث ہو گئی ہے۔ دوسری
خوبی یہ ہے کہ کتاب بھر میں شہروں کے نام اول سے آخر تک عربی دیے ہیں اور اس نے آئندہ مؤلفین
کے لیے بہت کچھ آسانیاں بہم پہونچا دی ہیں۔ اسی ضمن میں بہت سی باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں۔ جب ایک
مسلمان یہ معلوم کرتا ہے کہ ٹریفالگر فی الحقیقت طرف الغار ہے تو اس کو ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی
ہے اور اسکے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں۔ اسپین کا جغرافیہ اس قدر مکمل و دل دیا گیا ہے کہ بظاہر اس سے
زیادہ کی ضرورت نہیں۔ ایک تشنہ کو اگر یہ تشنہ معلوم ہو تو وہ معذور ہے۔

صفحہ ۳ پر جناب مصنف نے صاف تحریر فرما دیا ہے کہ "ان اجزا میں ہسپانیہ کی تجارتی، تمدنی
سیاسی حالات نہ ملیں گے"۔ سیاسی حالات کے درج نہ فرمانے کی وجہ تو ظاہر ہے، لیکن اگر تجارتی و
تمدنی حالات اس میں ہوتے تو یہ کتاب بہت زیادہ دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ میں کوشش کروں گا کہ

اس کمی کو پورا کردوں۔

اسپین کے متعلق ہر چیز کو دیکھنے اور معلوم کرنے سے پہلے یہ فرض کرلینا چاہیے، کہ چونکہ یہ ملک یورپ میں واقع ہے اس لیے لازماً ترقی یافتہ ہوگا: بلکہ قدم قدم پر اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ یورپ بھر میں اسپین نہایت ذلیل اور ایسا ملک ہے کہ جہاں تہذیب و تمدن جدید کا بہت کم اثر پڑا ہے بعینہ ویسا ہی جیسا کہ ہندوستان پر؛ چنانچہ اوراق مابعد سے معلوم ہوگا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر یہ ملک عیسائی نہ ہوتا اور کسی غیر عیسائی قوم مثلاً مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اب تک اس قوم کو یورپ سے نکالا جا چکا ہوتا۔ جیسے ترکوں کو۔ زراعت کی جو حالت (صفحہ) بیان کی گئی ہے اس سے تعجب نہ کیجیے کیفیت یہ ہے کہ قریباً آٹھویں صدی ہی سے یہ ملک مسلمانوں کو نکالنے کی فکر میں شمشیر بکف رہا۔ اس نے سپاہی بہت زیادہ پیدا کیے اور زراعت و تجارت پیشہ بہت کم؛ یہاں تک کہ اسٹیریاس کے لوگ ان پیشوں کو بہت ذلیل سمجھتے رہے۔ یہ دونوں پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے۔ انھوں نے زراعت میں تو بالخصوص وہ معجزے دکھلائے ہیں کہ بعض وقت حیرت ہوتی ہے۔ موئدین (مسلمانوں) کو نکالنے میں کارپردازان اسپین نے اس پر قناعت کی کہ انھوں نے تمام ملک کو غیر عیسائیوں سے صاف کردیا، وہاں وہ یہ نہ سوچے کہ وہ اپنے ملک کی تجارت و زراعت کو، خاصکر موخر الاسم کو، تباہ کررہے ہیں۔ لیکن اکثر مبصرین کی یہ رائے ہے کہ مسلمان بھی اندلس کی تمام ... کا زور نکال چلے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ اگر وہ کچھ روز اور اس سرزمین پر زندہ رہتے تو خود بھوکے مرتے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اس سوا چار سو برس کے عرصہ میں زمین اپنا زور از سر نو پکڑ چکی ہے۔ اب یہ اہالی اسپین کا قصور ہے کہ اس زمین سے وہ ویسا ہی سونا نہیں اگلوا لیتے جیسا کہ مسلمانوں نے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی طرح وہ چپہ بھر زمین بھی ایسی چھوڑیں جہاں لہلہاتے ہوئے کھیت نہ ہوں۔ مگر یقیناً ایک مبغوض قوم ایسا نہیں کرےگی۔ وہ سرزمین جو اپنے پھل اور پھول لیکر یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے شہروں کے بازاروں کی باعث رونق ہوتی تھی اب دوسروں کی محتاج ہے۔ نفح الطیب ملاحظہ فرمائیے کہ اندلس کے پھل پھول کیسے ہوتے تھے۔ میں اگر تفصیل کرتا ہوں تو بہت طول ہوجائےگا۔

آپ اسپین کی ریل کا حال (صفحہ ۹ تا ۱۱) سن کر اس ملک کا اندازہ لگا سکتے ہیں، مگر صفحہ ۱۱ کی پہلی دو سطروں کے متعلق مجھے یہ توجہ دلانی ہے کہ "کھوٹے پیسے، ورسکے" یہ موئدین کی یادگار ہیں جب وہ تباہ ہونے لگے تو انھوں نے انتقاماً تمام ملک میں سکہ قلب پھیلا دیا جو اُنکے بعد چلا آرہا اور باوجود سلطنت کی ہزار کوشش کے اب تک چل رہا ہے۔ شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی۔

یم کے متعلق مجھے آگے کچھ تفصیل کا موقعہ ملے گا۔
پرتگال کے ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ حکم دیا کہ پرتگال کے باشندوں میں سے جنکی رگوں میں یہودیو ل
ور مسلمانوں کا خون ہے انکو خاص قسم کی ٹوپی استعمال کرنا چاہیے تاکہ انکو ہر کوئی پہچان جائے۔ ایک
سکرٹری کو حکم ہوا کہ کوئی ٹوپی تجویز کرکے پیش کرے۔ دوسرے روز وہ تین ٹوپیاں ایک ہی قسم کی لے کر
یا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تین ٹوپیاں کیوں ؟ سکرٹری نے کہا کہ "ایک حضور کے لیے، دوسری اپنے
لیے اور تیسری محتسب اعظم کے لیے!" یہ ایسا لطیفہ تھا کہ بادشاہ نے وہ ارادہ ہی چھوڑ دیا۔ جب پرتگال
کا یہ حال تھا تو اسپین کے متعلق تو کچھ لکھنے ہی کی ضرورت نہیں۔ جنوبی اسپین کے بالخصوص اور تمام ملک کے
بالعموم باشندوں میں عربی خون ملا ہوا ہے۔ زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے، عربی نقش بالکل ظاہر ہے ا
اس ملک کا حسن زنانہ اسی کا نتیجہ ہے۔

صفحہ ۱۴۲ پر جن نیم برہنہ وحشی قبائل کا ذکر ہے وہ دو قبیلے ہیں۔ ایک ہرڈی کہلاتے ہیں جو بہت
زیادہ وحشی ہیں، اور دوسرے بٹیوے۔ پہلے کے قبضہ میں پچاس میل لمبی اور تیس میل چوڑی زمین ہے اور
انکی آبادی چار ہزار کے قریب ہے۔ ۱۹۲۰ء میں ان دونوں کی طرف سلطنت کی نظر عنایت ہوئی تھی
مگر اسکا سوا اسکے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ ان سے ہر سال چالیس پچاس آدمی فوج کے لیے لیے جاتے ہیں۔ اور
سال کے آخر میں وہ پھر جنگل میں چلے جاتے ہیں۔ پادریوں نے کچھ کوشش کرنی شروع کی ہے، لیکن ابھی
تک یہ امید نہیں پڑتی کہ وہ تمدن کی طرف مائل ہونگے۔ انکے قبضے میں جو زمین ہے وہ نہایت زرخیز
ہے اور خیال یہ ہے کہ اس میں تلیم وغیرہ کی کھانیں بھی ہیں۔ یہ لوگ کپڑا پہننا نہیں جانتے۔ مرد و عورت
بکری کی کھال سے ستر پوشی کرتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ گندی ہیں۔ انکے تمام بدن
پر لمبے بال ہیں، اور بازو معمول سے زیادہ لمبے۔ ان ہی کی وجہ سے وہ درختوں اور پہاڑوں پر بہت جلد
چڑھ جاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اگر اہالی اسپین سے انکا حال پوچھیے تو انکو اسکی بھی خبر نہیں کہ وہ
علاقہ کہاں ہے اور یہ کون لوگ ہیں! مجھے ان کا حال گورنمنٹ کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا ہے۔
پہلے میں سمجھا تھا کہ یہ غریب بھی مولدین ہوں گے، مگر یہ خیال غلط نکلا۔

غالباً ملنسیہ کے علاقے میں کچھ خاندان ایسے ہیں جنکا لباس وطرز بود و بود تمام ملک سے علیحدہ
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ مولدین ہیں۔ انکے متعلق تحقیقات بہت ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مسلمان
ہی نکلیں۔ مصنف علام کو یقیناً اسکی فرصت نہیں ملی۔

مقدس پشنہ کلان خانقاہ (صفحہ ۱۶) کی آبادی بہت ہی گھٹ گئی ہے۔ اسپین کے زوال کے

اب یہاں سے ایک سبب - خانقاہیں بھی ہیں - شاید مجھے آگے اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کا موقعہ ملے
نہ ملے۔ کیا ان مقدس دیویوں کا بھاگ جانا یا بھگا لیجانا، اس کا تو شاید کوئی علاج ہو سکے، مگر ایک خاص چیز،
جو مذہب عیسوی کی لعنتوں میں سے ہے، وہ چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں، جو عموماً خانقاہوں کے تہ خانوں میں ہوتی ہیں۔
ان کا کیا علاج ہے؟ فنڈنگو ابھی اسی علت میں بند کیا جا چکا ہے۔

رقص زاہبند (صفحہ ۱۸) اس لیے حکماً بند کیا گیا کہ وہ "فحاش مولدین" کا رقص تھا۔ فنڈنگو بھی
اسی علت میں بند کیا جا چکا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رقص سیگیوڈلاس کیوں نہیں بند کیا جاتا۔ جو خالصاً
مسلمانوں کا رقص ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ملک اسپین ناچ کا گھر ہے۔ قومی ناچ کے علاوہ تقریباً ہر ایک شہر
کے رقص الگ الگ ہیں۔

ہوٹلوں (صفحہ ۱۹) کے متعلق مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے "شکم پُر" چیزوں
کے کھانے سے بہت احتیاط کرنا چاہیے کیونکہ اسپین میں عام دستور ہے کہ ہر کھانے مثلاً سکم مرغ وغیرہ
میں سُور کا گوشت بھرتے ہیں۔ سہ پہر کے ناشتے میں جو روٹی ہوتی ہے وہ شراب میں "بھگوئی" جاتی ہے۔
مولدین (مسلمانوں) کو بجبر سُور کا گوشت کھلایا اور شراب پلائی گئی تھی۔ یہ اسی زمانے کا تبرک ہے۔ اور
اہالی اسپین کی عادت ثانیہ ہو گئی ہے۔ میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ شاید کوئی متقی مسلمان آئندہ
وہاں جا پہنچے۔ گو اس کی امید نہیں ہے۔ بزرگانِ لکھنؤ و دہلی شاید یہ سن کر خوش ہوں کہ وہاں لال مرچیں
ملتی اور استعمال ہوتی ہیں۔

اصل کتاب (صفحہ ۲۲) سے شروع ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ سے محسوس ہوتا ہے کہ جناب مصنف
علام کے دل میں واقعی درد بھرا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کی ایک ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے
کہ ان کا دل پانی ہو کر بہہ جائے گا۔ ان کی آنکھیں اگر بصورتِ ظاہر نہ بہتی ہیں تو دل خون [illegible]
ہیں۔ میرے یہ الفاظ شاید جبھی پر مبالغہ معلوم ہوں، اگر جناب مصنف کے ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھیے تو
معلوم ہوگا کہ میرا عرض کرنا کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ مجھے ان پر رشک ہوتا ہے۔ کاش یہ دل
اللہ نے (مجھ سمیت) اوروں کو بھی دیا ہوتا۔

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرۂ دردے دلِ عطار را

اسی درد و غم و اندوہ کا نتیجہ ہے کہ بعض وقت ان کا قلم بہک جاتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۳ پر وہ فرماتے ہیں:

"۱۱½ بجے شب کو واپس ہوٹل پہنچا۔ اور بعد نماز عشاء [illegible]
کا تصور کرتے کرتے آغوش خواب میں چلا گیا"

سبحہ بکف توبہ بر لب دل پُر از شوقِ گناہ — معصیت را خندہ می آید بہ استغفارِ ما"

ممکن ہے کہ ولادو، اُم سعد، زمیکیہ کے اسماے مبارک کے ساتھ یہ شعر زبان پر آنا گوارا ہو۔ گر میں عرض کرتا ہوں کہ عقیدت کچھ اور چیز ہے اور محبت کچھ اور۔ انگریزی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے" میں اسکو لاباس بہ سمجھتا ہوں۔

بہتر ہوتا کہ ہر شہر کا حال شروع کرنے سے پہلے کم از کم مسلمانوں کے زمانے سے اُس کا مقابلہ کر دیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو کتاب کے حجم کے ساتھ دلچسپی بہت بڑھ جاتی۔

تصویروں نے کتاب کو بہت نظر فریب بنا دیا ہے۔ لیکن دل کی تڑپ کہتی ہے کہ قرآن نگاہ تو تشنۂ باز نگاہ ہے۔ کتاب بہر نوع از اول تا آخر قابل دید ہے۔ مسلمان اگر توجہ فرمائیں تو اُن کا احسان ہے خدا کرے جناب مصنفِ علام کی قسمت میں شرمندۂ احسان ہونا لکھا ہو، جو مجھے نصیب نہیں ہوا۔

جناب مصنف کے متعلق مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ممدوح نے ابن بطوطہ کا قصہ پارینہ کر دیا ہے۔ خدا اسے تعالیٰ اُنھیں جزائے خیر دے۔

محمد خلیل الرحمن

رسید کتب

محبت ۔ مترجمہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی ہند بک ایجنسی کلکتہ ۔ ۵ر

پلٹا زار " " " ۳ر

سیف بن ذی یزن " " " ۱۴ر

[illegible] ۔ " مولوی بدر الدین احمد " ۸ر

[illegible] انجام ۔ از محمد جمیل دہلی حاجی چراغ الدین سراج الدین لاہور ۸ر

[illegible] ۔ از گوشہ نشیں وزیر آباد ۱۰ر

لطائف الشعرا ۔ مرتبہ ابوالکمال احمد موی مراد آباد ۸ر

[illegible] وہابیہ ۔ ترجمہ ہدیۃ السنیہ ۔ از مولوی اسمٰعیل غزنوی ۔ امرتسر ۔ (۲ر کے ٹکٹ بھیجنے پر مفت ملتا ہے)

[illegible] شاعری ۔ از مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے (انجمن ترقی اردو) ۶ار

مثنوی در تعریف ہولی

(از کلیات نظیر اکبرآبادی)

دلا آج سچ کہہ تو ہے کیا سبب
کہ جوں غنچہ ہر دل ہے محوِ طرب

نہ گُل ایک پھولا سماتا نہیں
بہم لب کلی کا بھی آتا نہیں

ابھرتا ہے مستی سے مے کا حباب
ہے بالیدہ شادی سے موجِ شراب

نہیں آج حالت سے مستی کی دور
کہ جوں غنچہ اُبلے دلوں سے سُرور

ہے بھرپور مستی چمن یاں تلک
کہ نرگس کی گردن گئی ہے ڈھلک

ہزاروں لیے جام ہے آبشار
کھڑا ہے رکھے سر پہ خُم کوکنار

کہ گر محتسب کا ہو ایدھر گزر
پلا دیں اُسے ایک دو ساغر بھر

اُترنے کا ہے کیف لاسے کو بیم
مے سُرخ میں گھولتا ہے افیم

جہاں ہاتھ میں گُل کے دیکھا ہے جام
طلب میں پیالہ ہے غنچے نے کام

زبس اہلِ عالم ہیں محوِ شراب
ہے ممنوع اس دور میں صرفِ آب

نہ جوں شیشہ اک تن کو دیکھے گا تو
کہ ہو وے نہ مے سے وہ پُر تا گلو

ہے مستی سے یہ حالِ عالم تباہ
کہ ٹوٹا نے کم کی ہے مسجد کی راہ

مصلا جو زاہد کے یاں خاص ہے
ہے دوکانِ خمار میں رہنِ مے

جو اب دیر کی راہ سے آئے ہے
دبے پاؤں زاہد نکل جائے ہے

بہم رند و زاہد ہے آشام ہیں
مگر یہ کہ ہولی کے ایام ہیں

خوشا موسمِ عیش و عہدِ نشاط
کہ عالم کو ہے یاں تلک انبساط

جو بڑھیا غمِ قوت سے تھی خرف
بجاتی ہے دن رات چلنی سے دف

ہے کیا اندنوں تنگ دستی سے عار
اک عالم کا ہے فاقہ مستی شعار

اگر حال دریا پہ کیجے خیال
عجب کچھ ہے واں کے اعزہ کا حال

گھلا رہ گیا ہے وہاں حدت
لبِ جُو سے جاری ہیں مستی کے گیت

جو تو غور کرکے بہا کے اُسے موجِ آب
ہے پیچھے لیے نغمے کو حباب

نہ غالب ہے گرداب پر وجد و حال
کہ بجز رقص بھولا ہے سیدھی رو چال

عجب کیا جو یہ عاشقیں ہوں پڑے
نہیں عالم آب سے کچھ بعید

دفوں کا زمیں شور ہے ہر طرف
ہر اک کان باجے ہے انند وقت

نہ تنہا زمیں کو ہی زلزال ہے
یہی آسماں کا بھی احوال ہے

ستاروں نے ہر سمت کھینچی ہے صف
بغل میں لیے ماہ پھرتا ہے دف

نہ اک زہرہ ہے محوِ غنا گری
بجاتا ہے مریخ بھی خنجری

ہے خوشہ سے پروین کے روشن یہ بات
کہ اکٹھا ہوا جو چمکے گا یہ سات

جہاں گھر سے باہر ہو مہر منیر
~~ملے صبح چہرے کو اس کے عبیر~~

نہ مشرق کا گوشہ شفق سے ہو لال
ہے جھولی میں افلاک کی یہ گلال

جسے چرخ و انجم کہے ہیں عوام
ہے اک خوان پُر نعمتوں سے تمام

ہر اک سمت عالم میں ہے شور و شر
ہے ہر با خبر آپ سے بے خبر

نہ واعظ کو مسجد کے منبر سے کام
نہ مسجد میں اب مقتدی نے امام

ہے کوتوال شہر اس قدر بے وقار
کہ نت اس پہ بھٹیاریوں کی ہے مار

زمیں ہر گلی میں ہے لڑکوں کا شور
ہے کیچڑ میں ہر راہ رو شور بور

جو باآبرو یاں ہے وہ ناپ وار
نت اس کے گلے میں ہے جوتی کا ہار

لیے ہاتھ پچکاریں خوبرو
رکھے ہیں ہر اک سمت چھینٹیں غلو

کسی پر کوئی چھپ کے پھینکے ہے رنگ
کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ

کسو نے لگائی ہے کوٹھے پہ گھات
کہ بازی میں خلوت کی ہیں لاکھ بات

نگاہیں کسی کی ہیں یاں صرف جوش
ہے ابرو سے کوئی اشارت فروش

کسی کا کوئی کھولتا ہے نقاب
کوئی تو بازی میں ہے بے حجاب

ہے ڈوبا کوئی رنگ میں سر بسر
فقط آب میں ہے کوئی تر بتر

زمیں رنگ کی ہر طرف [illegible] ہے
جہاں یک قلم زعفران زار ہے

دعا پر کرے اب قصر قائم یہ حرف
کہ طولِ سخن سمجھے ہے بس شگرف

الٰہی ہے جب تک کہ یہ شور و شر
ہر عالم میں ہولی سے باقی اثر

کنور کے سبب چاندپور میں مدام
رہے برج سے چڑھ گئی دھوم دھام

نظرے خوش گزرے

"منقل نگاری" کے عنوان سے جو مضمون اس دفعہ شایع ہو رہا ہے، اُسے میں نے مسٹر رشید احمد صدیقی کی بے پناہ فرمایش کا شکار ہو کر سہیل کے لیے مخصوص کر دیا تھا، مگر صاحبِ مضمون نے جنکی تحریروں کی اشاعت کی سعادت بالالتزام الناظر کو حاصل رہی ہے، اسے گوارا نہ کیا کہ ناظرینِ الناظر اُس سے بالکل محروم رہیں، اور خاص زحمت برداشت فرما کر مضمون کی دو نقلیں کیں، اور اس ہدایت کے ساتھ مرحمت فرمائیں، کہ سہیل اور الناظر دونوں میں بہ یک زمانہ یہ مضمون شایع کیا جائے۔

دونوں نقول میں خفیف اختلافات اس بنا پر رہ گئے ہیں کہ مضمون نگار نے نقل کرتے وقت کہیں کہیں جملوں کی ترکیب بدل دی اور عبارت حذف یا اضافہ کر دی تھی۔ نقول کی باہم تطبیق، اگرچہ دفتر الناظر میں کر لی گئی تھی، لیکن ممکن ہے کہ بعض چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اب بھی نظر انداز ہو گئی ہوں۔

مضمون کے تیرہ مہینے بعد شایع ہونے کا افسوس ہے، جس کا کچھ ذمہ دار تو نقول میں مطابقت کرنے والا ہے، اور زیادہ تر ایڈیٹر صاحب سہیل جو اپنے ادبی کمالات کا مشتاق بنانے کے لیے، رسالہ کی اشاعت کو ہر قسم کی قید زماں سے آزاد رکھنے میں، جیسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص اہتمام کرتے ہیں۔

سہیل کے ایڈیٹر صاحب نفسیاتِ ترغیب کے ماہر ہیں، اور اُنکی اس مہارت نے مجھے یا کم سے کم الناظر کو سخت خطرے میں ڈال دیا ہے۔ الناظر کے قلمی معاونین کی تعداد کبھی تو اتنی تھی کہ چھ مہینے کے مضامین ہر وقت دفتر میں موجود رہتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ جس نسبت سے میں اُسکی خدمت کے لیے کم اہل و موزوں ثابت ہوتا گیا، تقریباً اُسی نسبت سے اُسکے قلمی معاونین کی تعداد محدود ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں یہ سمجھنے لگتا ہوں کہ اب الناظر کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ ایسی صورت میں اگر دوسرے مدیرانِ جرائد نے سہیل کی مثال سے فائدہ اُٹھا کر الناظر کی مختصر جھولی پر چھاپے مارنا شروع کر دیے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حشر ہوگا۔ اس لیے میں بے تکلف اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ سہیل کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اُسے ایک اضطراری اور استثنائی فعل سمجھا جائے اور برادری کے دیگر اصحاب ازراہِ کرم اپنے کمالاتِ ترغیب کا نشانہ بنانے سے مجھے معاف رکھیں۔ —— گو مجھے سُن گُن مل گئی ہے کہ ایڈیٹر سہیل کی اس کامیاب مہم نے اُنکے پڑوسی "بازیچۂ طفلاں" کو بھی اس شمع بے نور کا پروانہ بنا دیا ہے۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

پیشین گوئی کرنا کچھ زیادہ قرین مصلحت نہیں، اس لیے میں سردست تمام پرخطر احتمالات کو یک لخت نظر انداز کر دینا چاہتا ہوں کہ

مترس از بلائے کہ شب در میان است

انجمن ترقی اُردو کے جدید سہ ماہی رسالہ سائنس کا اشتہار دو ماہ سے الناظر میں شائع کیا جا رہا ہے، چند روز ہوئے کہ اُسکا پہلا نمبر بھی وصول ہو گیا۔

انجمن کے نظام سے گو مجھے دیرینہ اختلاف ہے اور اُسوقت تک رہیگا جب تک کہ اُسکا نظام نہ بدل جائے یا میرے خیالات میں ترمیم نہ ہو جائے، بر ایں ہمہ مولوی عبد الحق صاحب اپنی ذات سے جو کام کر رہے ہیں اُسکا اعتراف کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔ اور اگرچہ ابھی تک میں اسکا قائل نہیں کہ ایک شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ و بزرگ کیوں نہ ہو، انجمن کا مرادف تسلیم کروں، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکیلے مولوی عبد الحق صاحب نے جتنا کام انجام دیا ہے وہ بہت سی انجمنیں بھی نہیں کر پاتیں۔ اُردو میں سائنٹفک مضامین کی اشاعت کے لیے اب تک جو رسالے نکلے وہ اگرچہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن قوی امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو کا یہ رسالہ انشاءاللہ عرصہ تک مفید خدمات انجام دیتا رہے گا۔ اسلیے کہ گذشتہ چند سال کے اندر رفتہ رفتہ اس قسم کے کاموں کے لیے مناسب فضا پیدا ہو گئی ہے اور سائنس کو اپنے پیشروؤں کی طرح قلمی معاونین کی کمی یا مالی امداد کے فقدان کی شکایت بھی نہ ہوگی۔

ملک میں جو تعلیمی نظام تقریباً ایک صدی سے رائج ہے اور دنیا آج جس رفتار پر دانستہ یا نادانستہ چل رہی ہے اُسکے لحاظ سے سائنس کی عام اشاعت اہل ہند کے لیے مفید سمجھی جاتی ہے، اور اگر اس خیال کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اسکے ماننے میں چارہ نہ رہے گا کہ عام اشاعت کا بہترین ذریعہ ملکی زبان ہی ہو سکتی ہے۔ رسالۂ سائنس کا یہی مقصد ہے اور مولوی عبد الحق صاحب کی نگرانی میں اُمید ہے کہ وہ اپنے اس مقصد کو بحسن و خوبی انجام دے گا۔

ناظرین الناظر میں سے جو صاحب سائنس کے مضامین اُردو میں دیکھنا چاہتے ہوں یا اس قسم کے مضامین کی عام اشاعت سے دلچسپی و ہمدردی رکھتے ہوں، وہ سائنس کے خریدار بن کر اپنی قدردانی کا عملی ثبوت دیں۔

انجمن ترقی اُردو کے نام سے اور مولوی عبدالحق صاحب کے اہتمام سے جو رسالہ شایع ہو اُسکے مضامین کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں۔ چنانچہ سائنس کے تازہ پرچہ میں متعدد یورپ کے نامور سائنس دانوں کے مضامین درج کیے گئے ہیں اور امید ہے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ رسالہ کا سالانہ چندہ ۸ روپے ہے۔ دفتر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے ملے گا۔

مرحوم اخبار مساوات الہ آباد کے ایڈیٹر نذیر احمد صاحب نے حال میں ایک ہفتہ وار اخبار "کشاف" کے نام سے نکالا ہے اور اُسکے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"کشاف آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ سیاسیات میں کشاف کی پالیسی آپ کو پسند نہ ہوگی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنے ہندو بھائیوں سے جو تلخ تجربات ہوئے ہیں اُنھوں نے مجھے اس پالیسی پر مجبور کر دیا ہے۔ بہر حال یہ رائے کا معاملہ ہے۔"

یہ خط اگرچہ خانگی تھا، مگر اس کا ذکر بالقصد الناظر میں کیا جا رہا ہے تاکہ جو کچھ اس سلسلے میں عرض کیا جائے وہ اُن سب اصحاب کی نظر سے گزر جائے جو آج اسی قسم کے اسباب کی بنا پر سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں قوم پرور طبقے سے اختلاف کر رہے ہیں۔ اور براہ راست یا بالواسطہ دفتری اقتدار کو مدد پہونچا رہے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ کشمکش میں دو کے بجائے تین فریق ہیں۔ ہندو۔ مسلمان۔ اور انگریز۔ ہندوستان کے تمام اہل الرائے جن میں سر سید مرحوم بھی شامل تھے، یہ عقیدہ ظاہر کرتے رہے ہیں اور شاید موجودہ زمانہ کے اکثر انگریز دوست لیڈر بھی اسکے مدعی ہیں کہ اس ملک کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہندو مسلمانوں کے اتحاد پر ہے۔ تیسرا فریق جو اس مُلک کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتا ہے اس اتحاد کو ناممکن بنائے ہوئے ہے اور اپنے اس کھیل کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی مسلمانوں کو آلۂ کار بنا لیتا ہے، کبھی ہندوؤں کو۔ ۱۹۱۲ء تک مسلمان، انگریزوں کی خوشامد اور ہندوؤں کی مخالفت کرتے رہے۔ تقسیم بنگالہ کے استرداد اور اسلامی ممالک کے مصائب نے اُنھیں اس روش کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ اُس وقت سے ہندوؤں کی مخالفت ترک کر کے وہ برابر کوشاں رہے کہ اُنکے دوش بدوش رہکر مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ ۱۹۲۲ء تک یہی سماں رہا۔ اُسی سال کے آخر میں بعض ہندو، انگریزوں کی چال میں آگئے۔ اور اُنکی رہنمائی میں پانچ سال تک ہندوؤں کی ایک جماعت مسلمانوں سے برسر پرخاش رہی۔ بارے غنیمت ہے کہ سائمن کمیشن کی صورت میں جو مصیبت اس ملک پر نازل ہوئی اُس نے اُن ہندوؤں کی روش میں تبدیلی پیدا کرنا شروع کی اور یہ امید پیدا ہوئی کہ ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں باہم متحد ہو کر پھر ملکی آزادی کے لیے پوری مستعدی

اور جوش سے جد و جہد کر سکیں گی۔

دفتری اقتدار کی خوش قسمتی سے، مسلمانوں کی ایک جماعت پھر اسکی مقصد برآری کے لیے تیار ہو گئی ہے اور فکر و رائے کی غلطی یا خود مطلبی و غرضمندی کے باعث وہ اس تاریخی واقعیت کو نظر انداز کیے ہوئے ہے کہ اس سے پہلے جب تیس سال تک برابر ہندوؤں کی مخالفت اور انگریزوں کی خوشامد کی گئی تب بھی تو مسلمانوں کو بحیثیت جماعت کے کوئی نفع نہیں پہونچا۔ اور نہ اس ملک نے اقوام عالم کے مجمع میں کوئی قدر و منزلت حاصل کی۔

بے شبہہ ہندوؤں کی ایک جماعت کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے نہایت صبر آزما رہا اور ان "تلخ تجربات" سے مسلمانوں کا متاثر ہونا بھی خلاف توقع نہیں لیکن عامہ مسلمین اس سے ناواقف ہوں تو ہوں، بھائی نذیر احمد اور دوسرے تعلیم یافتہ مسلمان تو اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ "تلخ تجربات" اُس ذات کے ہو چکے ہیں جس نے سائمن کمیشن کو یہاں بھیجا ہے اور جس کے کھیل کو بعض مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت کامیاب بنانے کے لیے کوشاں ہے۔

برطانوی حکومت اور انگریزی قوم نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک گذشتہ صدیوں کے اندر کیا ہے، کیا بھائی نذیر احمد اور انکے برادر بزرگ ظہور احمد صاحب بیرسٹر و ممبر کونسل کو انکی تفصیل سے آگاہ کرنے کے لیے ایک مضمون ان ظروف میں لکھ کر پیش کیا جائے، تب ہی وہ سمجھیں گے کہ کون سے "تلخ تجربات" فراموش یا کم سے کم نظر انداز کرنے کے قابل ہیں اور کون سے یاد رکھنے اور ہر وقت پیش نظر رہنے کے لائق۔

سر شفیع، نواب یوسف اور اس قبیل کے جتنے حضرات ہیں انکی روش پر تو کم سے کم مجھے تعجب ہوتا ہے نہ زیادہ تاسف، لیکن اقبال، حسرت اور ظہور احمد (سابق سکرٹری خلافت کمیٹی و رکن سوراج پارٹی) یا مالک مہر، (مدیران انقلاب) اور نذیر احمد کے طریق کار کو دیکھ کر رنج بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ یاں جب یہ شعر یاد آجاتا ہے تو پھر کسی سے کچھ شکایت نہیں رہتی۔

میری تغییر رنگ پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے

• حیدرآباد کے نوجوان شاعر مولوی محمد عباس اقدس نے جنکا کلام کبھی کبھی درج الناظر ہوتا رہا ہے اور جنکی ایک غزل ابھی گذشتہ پرچہ میں شایع ہو چکی ہے، طاعون میں مبتلا ہو کر حال ہی میں انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم پہلے منشی احمد علی شوق قدوائی سے اور بعد ازاں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اللہ تعالی [illegible]

نہایت افسوس ہے کہ قبل میری درخواست کے پہونچنے کے آپ ریوٹ روانہ کر چکے موصول ہوا اور نظر شفقت کی اوس کے مضمون سے کمترین پر معلوم ہوئی۔ اسی نظر سے چونکہ اب مین نے سنا کہ جس کو آپ نے مقرر کیا تھا اوس کو پھر کسی وجہ سے معزول کر دیا اس واسطے مین امیدوار ہون کہ اب کمترین کو اپنے متوسل کر لینے سے سرفراز کیجیے۔ اس درخواست کے پہونچنے سے حقیقت مین جیسا مسٹر ہنری طارنس نے تصور کیا تھا وہ نہایت برہم ہوئے اور فوراً ایک انگریزی چٹھی میری درخواست کے جواب مین بھیجی۔ اوس مین لکھا کہ مجھے ہرگز تمھارا مقرر کرنا نہین منظور ہے اور اون کی ریوٹ کی نامنظوری کی وجہ یہ ہوئی کہ اون چھ درخواستون مین جو اونھون نے بھیجی تھین اوس مین ایک درخواست محمد حسین نام ایک شخص کی تھی جو سانڈی پالی کے رہنے والے تھے۔ اون کو کرنل کالفیلڈ نے لکھا تھا کہ مولوی اعوالدین کے مرنے کے بعد چونکہ محمد حسین پر مجھکو بہت اعتماد ہے اوس کو قائم مقام میرمنشی مقرر کر کے مین نے کام لینا شروع کر دیا ہے اس واسطے مین امیدوار ہون کہ اونھین کے نام پر وہ عہدہ منظور ہو۔ اور عجب اتفاق ہوا کہ یہ شخص جن کا نام اصل حسین علی تھا وہ کرنل کالفیلڈ کے ساتھ جب وہ کوٹے کے پولٹیکل اجنٹ تھے میرمنشی تھے جب کرنل کالفیلڈ کی کوٹے سے بدلی ہوئی تو جو صاحب اون کے قائم مقام وہان مقرر ہوئے اونھون نے ان حسین علی کو رشوت ستانی کی علت مین مقدمے کو بہت طول کر کے معزول کر دیا تھا اور اون کی معزولی کے حکم کی اپیل گورنر جنرل تک بھی نامنظور ہو چکی تھی۔ اس واسطے کرنل کالفیلڈ نے عمداً اون کا نام چھپا کے حسین علی کی جگہ محمد حسین لکھا تھا یا خود حسین علی نے اپنا نام بدل دیا تھا۔ اور کرنل کالفیلڈ کو اودھر توجہ نہین ہوئی تھی۔ اور طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ وہ حاکم جس نے حسین علی کو معزول کیا تھا اوس نے اون کے تقرر کی خبر لکھنؤ کی رزیڈنٹی کے میرمنشی کے عہدے پر سن کے بتخصیص شملہ مین آیا یا اتفاق وارد ہوا تھا۔ اوس نے وہ سب معاملہ گورنر جنرل کے سب سکرٹری [illegible] بیان کیا اور خبر گورنر جنرل کو بھی پہونچی۔ چونکہ لارڈ آکلینڈ کے ذہن مین

اخلاق اور مروت بہت تھی اس سبب سے اونھون نے کرنیل کالفیلڈ پر کچھ زیادہ تشدد
نہین کیا۔ اگر لارڈ ونبطنک یا لارڈ النبرا ہوتے تو خواہ مخواہ اون سے بہت بازپرس کرتے
اس کا بھی تعجب نہین ہے کہ کرنیل کالفیلڈ کو معزول کر دیتے اس واسطے کہ نام کا بدل دینا
ایک قسم کی جعل سازی تھی۔ اور اگر یہ حرکت کسی اہل ہند سے ہوتی تو چھوٹے حکام اوسکے خراب کرنے
مین [1] . . . بہرصورت اون کی رپوٹ کے جواب مین لکھا گیا کہ گورنر جنرل کو ایک اشتباہ
پیدا ہوا ہے کہ یہ محمد حسین جس کے تقرر کی تم درخواست کرتے ہو وہی حسین علی ہے جو کوٹے مین
تمھارے ساتھ میر منشی تھا اور بعد تمھارے رشوت ستانی کی علت مین معزول ہوا۔ اگر وہ
نہین ہے تو تمھاری رپوٹ اوس کے نام کی قابل منظوری کے ہے۔ اور اگر وہی ہے تو ایسے
شخص کا تقرر ایسے معزز عہدے پر بہت نامناسب ہے فورًا اوس کو برخاست کرو۔ دوسرا فقرہ
یہ لکھا گیا کہ گورنر جنرل کی خواہش ہے کہ اس عہدے پر جو شخص مقرر ہو بہت عالی خاندان۔ اور
نہایت عالم فاضل اور بڑا نامور آدمی مقرر ہو اور غالب ہے کہ اس جنس کے کسی آدمی نے
تمھارے پاس درخواست بھی دی ہوگی۔ ایسے آدمی کا منتخب کر کے رپوٹ کرو فقط یہ نظر
اسی جواب کے ہنری طارنس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کوئی درخواست نہ بھیجو۔ کرنیل کالفیلڈ
کو سوا تمھارے کون شخص اوس صفات کا ملے گا جس کے علم اور فضل اور لیاقت اور دیانت اور
امانت اور علو خاندان کی خود گورنر جنرل گواہی دیوین جس کو وہ مقرر کرین۔ یہ اشارہ اوسی حکم کی طرف
کیا جو لاہور مین نومبر ۱۸۳۸ء کے مہینے مین میری درخواست پر ہوا تھا اور اوس کا ذکر اوپر ہو چکا
ہے۔ الغرض جب کرنیل کالفیلڈ کی چھٹی میرے نام پر آئی تو باقتضاے بشریت کے مجھے
بہت رنج ہوا اس مقام پر ایک واقعہ عجیب لکھنا مجھے مناسب معلوم ہوا۔ وہ یہ ہے
کہ مین کلام اللہ کی تلاوت کرتا تھا اوس وقت ڈاک کے ہرکارے نے آکے وہ چھٹی کرنیل
کالفیلڈ کی مجھے دی جس مین لکھا تھا۔ ہم کو تمھارا مقرر کرنا اس عہدے پر منظور نہین ہے تلاوت
سے فراغت کر کے مین نے اوس چھٹی کو پڑھا باقتضاے بشریت کے مجھے ملال ہوا لیکن

[1] یہان ورق پھٹ جانے کی وجہ سے عبارت چھوٹ گئی۔ ۱۲

اب تک مین مایوس اوس عہدے کے تقرر سے نہین تھا۔ گمان یہ تھا کہ ہنری طارنس مجھکو ضرور اوس عہدے پر مقرر کروائین گے۔ کلام اللہ مین راقم نے فال دیکھی شروع صفحے سے یہ شروع ہوا تھا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا اوس دن سے غالبًا ایک ہفتہ نہین گذرا ہوگا کہ میر منشی فارسی دفتر خانے گورنر جنرل کا مین مقرر ہو گیا۔ الغرض لکھنؤ کی رزیڈنسی کے میر منشی کا قصہ تمام کرکے مین کیفیت اپنی ترقی کی نقل کرون گا تاکہ تہذیب واقعہ نویسی کی ہاتھ سے نہ جائے۔ جب رزیڈنٹ کے پاس جواب اون کی رپوٹ کا پہونچا تو اونھون نے پھر اور ایک رپوٹ کی اوس مین لکھا کہ واقعی محمد حسین وہی شخص ہے جو کوٹے مین میرے ساتھ میر منشی تھا۔ اور اوس کا نام حسین علی ہے غلطی سے محمد حسین لکھا گیا تھا اس واسطے اوس کو برخاست کر دیا لیکن یہان کے میر منشی کے عہدے کا عجب حال ہے کہ سیکڑون درخواستین اس عہدے کے خواستگارون کی میرے پاس گذری ہین مگر اکثر درخواست دینے والے وہ ہین یا اپنی ذات سے بڑے دولتمند اور متمول ہین یا وہ ایک جگہ پر اس عہدے سے زیادہ درماہہ پر نوکر ہین اور اس کم درماہہ کے عہدے کی درخواست کرتے ہین اور اس کثرت سے لوگون کی خواہشمندی سے میرے دل مین بہت شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہان لوگ بہت ناجایز آمدنی کے متوقع ہین۔ اس واسطے جب تک ایسا کوئی شخص کہ جس پر بذات خود مجھے نہایت اطمینان اور اعتماد ہو نہ ملے مین نہین چاہتا ہون کہ اس عہدے پر مقرر کرون۔ اور اب میرا کمال اعتماد ایک شخص پر ہے جس کا نام میر سید و مشہور ہے اور وہ بالفعل نواب ناظم مرشد آباد کے آتالیقون مین نوکر ہے مین امیدوار ہون کہ اوس کے نام پر یہ عہدہ منظور کیا جاوے۔ اس رپوٹ کا جواب گورنر جنرل کی طرف سے یہ گیا کہ گورنر جنرل کی راے مین مستحسن اور پسندیدہ معلوم ہوا کہ چونکہ تم کو بالیاقت اور باعلم لوگون کی طرف سے بسبب اون کے تمول کے یا بسبب اس کے کہ وہ ایک جگہ نوکر ہین اور پھر اس

نوکری کی درخواست کرتے ہین شبہ واقع ہوا اگرچہ وہ تھوڑے درماہے پر تھے اور نہ نظر اپنی
ترقی کے اس عہدے کی درخواست کی اس واسطے تم نے اون کے تقرر کی درخواست نہین
کی لیکن گورنر جنرل کو نہایت تعجب ہوا کہ نواب ناظم مرشدآباد کے اتالیق کو پانسو روپیہ مہینا ملتا
ہے اون کو دو سو روپے مہینے کے عہدے پر نوکر رکھتے ہو اوس نے اگر نصف سے بھی زیادہ
اپنے درماہے کی کمی قبول کی وہ کیون نہین تمھارے دل مین محل اشتباہ ہوا۔ اور اب ارشاد
گورنر جنرل کا یہ ہے کہ اگر یہ عہدہ تمھاری کچہری کے میر منشی کا ایسا محل اشتباہ ہے ایسے عہدے کا
باقی رکھنا کیا ضرور ہے میر منشی سے دو کام متعلق ہین ایک دربارداری بادشاہ کی اور دوسرے
تحریر دفتر کے کام کی۔ اوس عہدے کو برخاست کرو۔ دربارداری بادشاہ کی اپنے اسسٹنٹ
سے متعلق کرو اور دفتر کی تحریر وغیرہ کا کام اور اہالیان دفتر سے لیا کرو۔ پھر رزیڈنٹ نے اس
حکم کے خلاف پر اصرار نہ کیا اور بہ نظر اپنی پچھلی اطلاع کے تاکید سے لکھا۔ برخاست کرنا عہدہ
میر منشی نزدیکی کا نہایت مصلحت ہے اور درماہہ میر منشی کا اہالیان دفتر پر تھوڑا تھوڑا سا
تقسیم کرکے اوس کی اطلاع کی۔ یہ امر بھی نامنظور رہا اور حکم ہوا کہ گورنر جنرل کی اصل غرض
میر منشی کے عہدے کے برخاست سے یہ تھی کہ تخفیف ہو۔ جب تخفیف نہ ہوئی اور درماہہ بدستور
قائم رہا پھر کیا فائدہ برخاست کا ہے۔ غرض وہ مثل مشہور ہندی کی صادق آئی۔ گھوڑے
گھوڑے لڑین موچی کا زین ٹوٹے۔ اہل ہند کا ایک معزز عہدہ ناحق برخاست ہوگیا۔
اب انتظام واقعہ نگاری کے لیے کوائف مفصل اپنی ترقی کے اور اوس کے نتائج وغیرہ
لکھنا ضرور ہوا جب مولوی صاحب علی خان مرحوم کی روانگی مسٹر ولیم جے مکناٹن کے ساتھ
جو شجاع الملک کے ساتھ کابل کے ایلچی اور وزیر دولت انگلیشیہ کے مقرر کیے گئے تھے جن کا
ذکر مفصل چوتھے باب مین ہندوستان کے ذکر مین ہوچکا ہے اوس وقت مسٹر جی فریزر صاحب نے مجھے
کہا جو مین نے عزم تمھاری ترقی کا کیا ہے وہ اب مین تم سے مفصل کہتا ہون۔ بالفعل
جب تک ایام عزیمت ہین ایک اور شخص میر سید علی نام لکھنؤ کے رہنے والے ہین اون کو قائم مقام

میر منشی مقرر کرتا ہون صرف اس نظر سے کہ اوس کو خطاب خانی اور بہادری کا اور خلعت
یہان سے عطا ہو جائے جب سفر تمام ہوگا یا روانگی کلکتے کی ہوگی اوس وقت اون کی برخاست
کر کے تم کو مامور کرواونگا۔ مگر غالب ہے کہ تم کو معلوم ہوگا کہ مسنا الیہ نرے بے علم ہین وہ صرف
دربار کا کام کرین گے لکھنے پڑھنے مین تم اون کی اعانت کیا کرو۔ یہ شخص چھوٹے میر سید علی
مشہور تھے جناب والد ماجد مغفور کا اپنے تئین نہایت نیاز مند کہتے تھے جاہل بحت تھے
فی الجملہ حرف آشنا تھے وہ مامور ہوئے اور ایک صاحب مولوی سید محمد بنگالی مدت دراز
سے فارسی دفتر مین نائب میر منشی تھے جب آگرے کی گورنری جدا ہوئی تب وہ یہان کے
فارسی دفتر کے میر منشی ہو کے آئے تھے۔ اڑھائی سو روپیہ اون کا مہینا تھا وہ اپنے تئین
نہایت مستحق ترقی کا سمجھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اون کا استحقاق بنظر قدامت کے
مولوی صاحب علی خان مرحوم سے بھی زیادہ تھا مین تو اون سے نیچے نیا نوکر ہوا تھا اور
میر سید علی کو کچھ بھی استحقاق نہ تھا مگر مسٹر ولیم جی گنائن اور مسٹر ہنری طامس دونون اون سے
نہایت ناراض تھے میری دانست مین تو ناراضمندی اون کی بیجا تھی میرے وہ بہت
دوست تھے اور والد اون کے بہت بڑے علماے نامی مین بنگالے کے تھے۔ اس
سبب سے جب کبھی ہنری طامس اون کی شکایت کسی امر مین بیان کرتے تھے تو مین
جہان تک ممکن تھا اون کی رفع شکایت کرتا تھا۔ غرض جب لارڈ آکلنڈ نے آگرے کی دفتر
ضروری طلب کیا تو وہ بھی لشکر مین آکے شامل ہوئے۔ اور جس ناخشنودی دونون
صاحبون کی اون سے بسبب مولوی صاحب علی خان مرحوم کے تھی کہ وہ اون سے صاف
نہ تھے۔ اس واسطے جب وہ لشکر مین آ کے شامل ہوئے تو اون کو حکم ہوگیا کہ [illegible]
سب دفاتر کے ساتھ ٹھہرین لشکر مین اون کے ساتھ رہنے کی حاجت نہین ہے۔ فارسی دفتر
مین کارتحریر [illegible] کہ اس دفتر کا بھی کام ہوا کیا کہ اب جب میر سید علی فارسی دفتر کے میر منشی
ہوئے تو وہان قطع نظر فارسی تحریرات کے کبھی کبھی عربی ترجمہ بھی ہوتی تھی [illegible]

لے کے مسقط تک بہت سے شیوخ اور رؤسا ہین کہ اون کے ساتھ عہدنامے اور مکاتبات
عربی مین ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح سے مصر کے پاشا کے ساتھ اور بعضے جزایر بحر عرب اور
بحر روم کے ہین کہ وہان کے رؤسا بھی سلاطین کہلاتے ہین اون سب کے ساتھ مکاتبات
عربی مین ہوتے تھے اگرچہ مولوی سید محمد مرحوم بھی عربی تحریرات سے جیسا چاہیے عاری تھے
مگر مولوی کہلاتے تھے اور مدت دراز سے دفترخانے مین تھے کسی طرح سے کام انجام کر لیتے
یہ بیچارے میر سید علی فارسی تحریر سے بھی عاری تھے عربی کا کیا ذکر ہے اسی واسطے راقم کو مسٹر
ہنری طارنس نے اون کی اعانت کے واسطے کہا تھا۔ لیکن چونکہ مجھکو فارسی دفتر سے کچھ علاقہ
نہ تھا تو اعانت میری بطور خانگی کے تھی۔ یہ سمجھ کے مسٹر ہنری طارنس نے مولوی سید محمد کو
اکبرآباد سے طلب کیا اور فارسی دفتر کی تحریر کا کام بالکل اون کو سپرد کیا اور چونکہ وہ میرے
دوست تھے اور اوس وقت تک مجھکو بنگالے سے اور کلکتے سے نہایت نفرت تھی اور
بسبب بدآب و ہوا ہونے کے ہرگز یہ قصد دل مین نہ تھا کہ عہدہ میرمنشی کا قبول کیجیے اور کلکتے
جائیے اور ذہن مین یہ بات جمی تھی کہ جب حسب وعدہ مسٹر ہنری طارنس مجھکو میرمنشی کے
عہدے پر مقرر کرین گے تو مین اون سے اصرار کر کے مولوی سید محمد کو گورنر جنرل کے فارسی
دفتر مین میرمنشی کے عہدے پر مقرر کراؤن گا اور مین لفٹنٹ گورنر آگرہ کے فارسی دفتر کی
میرمنشی قبول کرون گا اسی نظر سے مین مولوی سید محمد کی طرف سے مسٹر ہنری طارنس کے
مزاج کو حتے المقدور صاف کیا کرتا تھا اور جب مولوی سید محمد مرحوم اکبرآباد سے لشکر مین
آ کے شامل ہوے تب کیفیت ہنری طارنس کے وعدے کی جو مجھ سے اوتھون نے کیا یہ تو
مین نے اون سے مفصل نہین بیان کی مگر یہ کہا کہ میر سید علی سے کام دفتر کا چل نہین سکے گا یقین
ہے کہ آپ عنقریب میرمنشی مقرر ہون گے اوس وقت مجھے امید ہے کہ آپ کا عہدہ مجھے ہو
اوتھون نے کہا کہ ہمارے دشمنون نے حاکم کا مزاج ہماری طرف سے برہم کر دیا ہے ہمین ہرگز
امید نہین ہے کہ وہ عہدہ ہمین دیوین اور مسٹر ہنری طارنس آپ کے شاگرد ہین یقین ہے کہ

آپ کو سررشتہ مقرر کروائین گے۔ اوس وقت مین نے اپنی نیت اور عزیمت اون سے
بیان کی اور وعدہ مستحکم کیا کہ اگر ایسا واقع ہوا تو حتے المقدور مین کوشش کرون گا کہ
آپ کے عہدے سے کیرے عہدے کی تبدیلی ہو اور باتون باتون مین اس امر کو مین
نے مسٹر ہنری طارنس سے اون کی تقریر کا اور اپنے وعدے کا ذکر کیا اگرچہ اونھون نے
انکار کیا کہ اون کو ہرگز مین سررشتہ مقرر نہ کرون گا اون کو ہرگز لیاقت نہین ہے ادسی
عرصے مین ایک عربی خط ہنزوان ایک جزیرہ ہے وہان کے رئیس کو لکھا گیا تھا
حقیقت مین اونھون نے برا لکھا تھا۔ اوس کی شکایت کرنے لگے کہ ایسا برا لکھا تھا مجبوری
سے ہم نے جاری نہین کیا اور بمبئی کی گورنمنٹ مین بھیجدیا کہ وہان سے جاری ہو یا این ہمہ
رفتہ رفتہ مین نے اون کا مزاج بہت مولوی صاحب کی طرف سے صاف کیا اور
مجھے امید تھی کہ جیسا مین مولوی صاحب ممدوح سے وعدہ کر چکا تھا اوس کا ایفا بخوبی
ہو جائے گا۔ اس عرصے مین دو امر پیش آئے ایک امر تو موجب کوتاہی کا میری طرف
سے ایفاے وعدہ مین ہوا۔ اور دوسرا امر یہ تھا کہ خود مولوی سید محمد سے ایک حرکت
بے جا واقع ہوئی کہ مسٹر ہنری طارنس کا مزاج اون کی طرف سے نہایت برہم ہو گیا
اول امر یہ تھا کہ مین نے ساری کیفیت مفصل مسٹر ہنری طارنس کے وعدے کی میری ترقی
کے واسطے اور اپنا عزم مصمم کلکتے نہ جانے کا اور مولوی سید محمد مرحوم سے وعدہ کرنے کا
جناب والد ماجد مغفور کو لکھ بھیجا۔ آپ نے اوس کے جواب مین مجھے بتاکید ممانعت اس
عزیمت سے لکھی اور ارقام فرمایا کہ حدیث شریف مین واقع ہوا ہے کہ جو کوئی چیز کسی شخص
کو بے طلب ملتی ہو اور وہ اوس کے قبول سے انکار کرے تو پھر وہ چیز اوس کو
کبھی نہین ملتی باوصف ذلت سوال کے اس نظر سے تم ہرگز اپنی طرف سے کوئی امر
ایسا نہ کیجیو جس مین عدم قبول اور انکار عطا سے ثابت ہو اور جب لشکر گھر سے گھومتے
شاہجہان آباد مین پہونچا۔ یہان جناب بھائی صاحب مغفور [illegible]

چکے تھے اونھون نے بھی باصرار اس عزیمت سے مجھکو باز رکھا اس نظر سے البتہ وہ
عزیمت جو میرے دل مین بالجزم تھی وہ باقی نہ رہی مگر مین متردد اور متفکر تھا کہ مولوی سید محمد
سے مین عذر ایفائے وعدہ مین کیا کرون اس واسطے کہ محبت اور میل جول اون سے
بدستور رہتا کوئی بات خلاف کی باہم واقع نہین ہوئی تھی۔ اور دوسرا امر جو خود اون کی
طرف سے موجب برہمی مزاج مسٹر ہنری طارنس کا ہوا وہ یہ تھا کہ جب سے وہ اکبرآباد
سے طلب ہوے فارسی دفتر کی تحریر کا کام وہی انجام دیتے تھے۔ اور روزمرہ حاکم کے
سامنے رہنے سے مسٹر ہنری طارنس اون کی طرف سے بہت صاف ہو گئے تھے وہ
نفرت جو پیشتر اون کے قلب مین تھی وہ باقی نہین رہی تھی۔ شاہجہان آباد سے جب کوچ
ہوا تب سر جربرٹ ماڈکینٹ سکرٹری مستقل مقرر ہوے اگرچہ فارسی دفتر بدستور مسٹر ہنری
طارنس کے اہتمام مین رہا مگر بعضا اہم کام فارسی کا سکریٹری مستقل میر منشی کو اپنے سامنے
بلا کے لیتے تھے اور فارسی کی تحریر بالکل مولوی سید محمد سے متعلق ہو گئی تھی وہ جا کے
انجام کیا کرتے تھے۔ مولوی سید محمد نے اپنے دل مین یہ فطرت سوچی کہ میر سید علی کی
عدم لیاقت کارگزاری کی سر جربرٹ ماڈک پر ثابت کرنا چاہیے اوس کی تدبیر اونھون
نے یہ کی کہ ایک مہینے کی رخصت طلب کی اگر ہنری طارنس چاہتے تو اون کی رخصت
نامنظور کرتے لیکن جب مولوی سید محمد نے درخواست اون کے پاس پیش کی اونھون نے
حکم دیا کہ صاحب سکریٹری کے پاس پیش کرو۔ ظاہر اوہ ایسا سمجھتے تھے کہ فارسی دفتر چونکہ
اون سے متعلق ہے صاحب سکریٹری وہ درخواست اون کے پاس بھیجدین گے اوس
وقت نامنظور کر دین گے۔ اور اس مین فائدہ وہ یہ سمجھے تھے تاکہ مولوی سید محمد حکم
نامنظوری کا صاحب سکریٹری کی طرف سے سمجھین جب مولوی سید محمد درخواست سر جربرٹ
کے پاس لے گئے اونھون نے حکم منظوری رخصت کا لکھدیا۔ اب مسٹر ہنری طارنس کے
دل مین ملال پیدا ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ مولوی سید محمد نے فطرت کی ہے اوس وقت ا[illegible]

ساکت ہو رہے اور مولوی سید محمد آگرے کی طرف روانہ ہوے اور مسٹر ہنری طارنس کو ظاہرا
یہ بھی گمان نہ تھا کہ میر سید علی سے مہینا بھی دن بھی کام نہ چل سکے گا۔ چونکہ لکھنؤ کے لوگ تقریر
مین طرار فرار بہت ہوتے ہین راقم کو بہت سے قراین سے یقین ہے کہ اونھون نے مسٹر ہنری
کے دل مین لمبی چوڑی یہ بات جما دی تھی کیا مشکل کام ہے کسی کی اعانت کی حاجت
نہین ہے مین خود سب کام انجام کر لون گا۔ الغرض مولوی سید محمد کی روانگی سے ایک ہفتہ
نہین گذرا تھا کہ ایک عہدنامے کے مسودہ کے واسطے سر ہربرٹ ماڈک نے میر سید علی کو طلب
کیا غالبا میر محراب خان بلوچ کلات کے رئیس کے بیٹے کے ساتھ وہ عہدنامہ تھا
انگریزی مسودہ گورنر جنرل کا لکھا ہوا سر ہربرٹ نے اپنے ہاتھ مین لیا اور ہندی مین اوس کا
مطلب اون کو سمجھانا شروع کیا کہ اس کو لکھو وہ بتلاوین کچھ یہ لکھین کچھ ایک فقرہ بھی پورا نہ لکھ
سکے سر ہربرٹ نے نہایت تنگ ہو کے مسودہ پھینک دیا اور مسٹر ہنری طارنس کو طلب
کیا اور اون سے کہا پہلے ہندی مین یہ کس گدھے کو تم نے میر منشی مقرر کیا ہے اتنی بات
سن کے مسٹر طارنس نے میر سید علی سے آنکھ سے اشارہ کیا کہ تم باہر جاؤ اوسکے بعد اونکے
تقرر کی کسی نہج پر بناوٹ کر کے سمجھا دیا کہ میر منشی تو حقیقت مین گورنر جنرل فلان شخص کو یعنی
راقم کو مقرر کر چکے ہین وہ حاضر نہین ان سے کام لیجیے اوس وقت وہ آمادہ پہاڑ پر چڑھنے
کے تھے اور اتفاقا مین پیشتر روانہ ہو چکا تھا اور شملے مین پہونچ گیا تھا اوس کے تیسرے یا چوتھے
روز سر ہربرٹ داخل ہوے اور ایک روز پیشتر مسٹر ہنری طارنس پہونچ گئے۔ مجھکو طلب کیا
اور میر سید علی کے سامنے مجھ سے کہا ماڈک صاحب سخت بد مزاج ہین اور مجھکو معلوم
نہ تھا ان مین بڑا عیب یہ ہے کہ بھلے آدمی کو بد کلمہ کہہ بیٹھتے ہین۔ میر صاحب کو ایسا
ایک کلام سخت کہا کہ اونھون نے استعفا دیا۔ مین نے اون کو اب خوب سمجھایا ہے
اب یقین ہے کہ آیندہ ایسا لغو امر کسی کو نہ کہین گے۔ کل سے آپ کام دفتر کا شروع کیجیے
اور میر صاحب سے سب دفتر سمجھ لیجیے۔ الغرض راقم پہلی اپریل ۱۸۳۰ء کو میر منشی

مقرر ہو گیا۔ اس عرصے مین جب مولوی سید محمد مرحوم رخصت تمام ہونے سے پھر کے آئے
مجھے البتہ ایک گونہ ندامت تھی کہ مین ایفاے وعدہ نہین کر سکتا با اینہمہ چونکہ میرے
دل مین مطلق نفاق نہ تھا جو امر واقعی تھا وہ مین نے اون سے کہدیا اگر اوس امر کو مین
چھپاتا اور ظاہر مین ایفاے وعدہ پر آمادہ رہتا تو بہتر تھا اس واسطے کہ یہ مجھے یقین ہو چکا
تھا کہ ہنری لارنس اون سے اتنے برہم ہو گئے ہین کہ وہ ہرگز اون کا تقرر قبول نہ کرین گے
چنانچہ پہلے یہی خیال کر کے بمجرد اپنے تقرر کے مین نے اون کو خط اکبر آباد مین لکھ کے بھیج دیا
کہ جیسا آپ نے تصور کیا تھا وہی ہوا حکام نے مجھکو میر منشی مقرر کر دیا لیکن مین ایفاے وعدہ
پر جو آپ سے کیا ہے اب تک موجود ہون اپنی طرف سے کوشش کرون گا آیندہ
رب اور آپ کے آپ دوانہ کا اختیار ہے مگر بعد اس خط کے لکھنے کے میری نیت
بدل گئی۔ ایک یہ تصور ہوا کہ اپنی طرف سے درخواست گو یہ نفاق ہو خلاف حدیث کے
حکم کے اور جناب والد ماجد مغفور کی ایما کے ہے اور ناحق مرتکب نفاق کا ہونا اور ایک
دوست کے ساتھ خلوص کو ترک کرنا کیا ضرور ہے جو امر واقعی ہے وہ اون سے کہہ دینا
چاہیے اور ایک نہج پر قصد ایفاے وعدہ کا بخلوص بھی ذہن مین رہا۔ یعنی جب وہ پھر
پلٹ کے لشکر مین آئے تب مین نے اون سے کہا کہ میرا وعدہ آپ سے ہے کہ اپنے حتی المقدور
مین ایسی فکر کرون گا کہ آپ کا عہدہ مجھکو ہوا اور آپ میر منشی ہون یہ وعدہ مین نے نہین
کیا ہے کہ مین میر منشی کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کرون گا آپ کو حکام میر منشی مقرر
کرین یا نہ کرین تو آپ پہلے کوشش اس مین کیجیے کہ حکام آپ کا عہدہ مجھکو تفویض کرین اگر
حکام کیطرف سے انکار ہو گا کہ فلانے کو ترقی دے چکے ہین اب بے سبب ہم اوس
کو تنزل کے عہدے پر نہین لائین گے اوس وقت مین عرض کرون گا کہ مجھے یہ تنزل
بخوشی اور رضامندی قبول ہے اور ابتدا اپنی طرف سے مین درخواست تنزل کی نہین کرون گا
اور سبب اوس کا جو واقعی تھا یعنی مضمون حدیث کا اور ایما جناب والد ماجد مغفور کی وہ

بھی اون سے بیان کردی۔ اونھون نے اپنی طرف سے درخواست لکھی اور اوس مین اپنا
دعوے اور استحقاق لکھ کے یہ بھی لکھدیا کہ فلانا شخص اس سے راضی ہے کہ میرے عہدے
پر مقرر کیا جاوے۔ اور مجھ سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو کہ تمھارے سامنے مین درخواست
پیش کرون۔ غرض مین بھی گیا اور اونھون نے درخواست دی مگر حکام نے کچھ توجہ نہ کی
باقتضاے بشریت کے اون کو بہت مجھ سے حسد اور رنج رہا مگر مین نے اپنی طرف سے جو نہج
ملاقات کا اون سے تھا اوس مین فرق نہین کیا۔ اور اون کو خطاب و خلعت کوشش کر کے
اپنے مساوی دلوایا مگر وہ مجھ سے صاف نہ ہوئے تا اینکہ اون کی تقدیر نے اتنی یاوری کی
کہ میرے برخاست کے بعد وہی میر منشی مقرر ہوے۔ بالجملہ راقم قریب چھ برس کے اوس عہدے
پر رہا اور اگرچہ وہ منصب نہایت موجب میری ناموری کا ہوا مگر کرنیل کالفیلڈ لکھنؤ کے
رزیڈنٹ اور سارے اون کے تباع مثل کپتان شکسپیر کے جو اون کے نائب تھے اور وہ
بعد کرنیل کالفیلڈ کی برخاست کے بھی مدت تک لکھنؤ مین رہے ایک یا دو دفعہ قائم مقام
رزیڈنٹ بھی ہوگئے تھے وہ سب میرے دشمن ہوگئے اور اکثر مجھکو زحمت اور تکلیف اون کے
سبب سے رہی کہ ہمیشہ جھوٹی جھوٹی خبرین میرے تلونات کی لکھ لکھ بھیجا کیے اور آخرش
وہین کے سب لوگ باعث میری برخاست کے ہوئے جس کی شرح بتفصیل مین آئندہ
لکھتا ہون اور ابتدا ہی مین میرے تقرر کے اس عہدے پر ایک واقعہ پیش آیا کہ وہ زیادہ موجب
عاندت سارے لکھنؤ کے رزیڈنٹی کے اہلکارون کا میری طرف سے ہوا وہ واقعہ یہ تھا کہ جناب
سر ہربرٹ ماڈکینٹ پچھلے دنون مین لکھنؤ کے رزیڈنٹ بھی رہے تھے اس سبب سے نسبت
ورریاستون کے وہان کے کوائف اور سوانح مفصل دریافت کرنے کی اون کو بہت خواہش
ہتی تھی اور جس عرصے مین فارسی دفترخانہ گورنر جنرل کا مستقل دفتر تھا دوسرے دفتر کے تحت نہ تھا
س عرصے مین ساری ہندوستان کی ریاستون کی خبرین وہان کے اخبار نویس بھیجا کرتے
تھے۔ جب سے وہ دفتر پولیٹکل دفتر کے تحت ہوا جس کو اب فارن دفتر کہتے ہین اوس وقت سے

رریاست کے رزیڈنٹ اور اجنٹ گورنر جنرل انگریزی مین خلاصہ ہر جگہ کے اخبار کا بطور
روزنامچہ کے لکھوا بھیجا کرتے تھے صرف لکھنؤ اور حیدرآباد اور گوالیر سے فارسی پرچے اخبار
کے بھی آیا کرتے تھے اور خاص لکھنؤ مین ایک اخبار نویس رزیڈنٹی مین رہا کرتا تھا ایک
لکھنؤ کی کوتوالی مین اور ایک فیض آباد مین نواب بہو بیگم نواب آصف الدولہ کی مان کے
محل سے مامور تھا ان تینون اخبار نویسون کو ستر روپیہ درماہہ ملتا تھا۔ اول کو جو رزیڈنٹی مین تھا
اوس کو تیس روپیہ مہینا ملتا تھا اور دو باقی کو بیس بیس روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ چنانچہ ایک دن
ہاڈک صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ ستر روپیہ درماہہ محض لغو صرف ہوتا ہے اور وہان کا
صحیح اخبار نہین پہونچتا۔ اگر تو چاہے تو وہان کا اخبار بہت صحیح پہونچ سکتا ہے۔ چونکہ اوس
عرصے میں جناب چھوٹے چچا صاحب مرحوم بادشاہ کی طرف سے اخبار کے داروغہ تھے۔ کہ
سارے ملک مین اون کی طرف سے اخبار نویس مامور رہتے تھے وہ خلاصہ اخبار کا
منتخب کر کے بادشاہ کے پاس پیش کرتے تھے۔ سر ہربرٹ نے کہا یہ ستر روپے تو لے اور اپنی
طرف سے کسی کو مامور کر دہ بہ اعانت بادشاہی اخبار کے داروغہ کے صحیح خبر سارے ملک
کی یہان پہونچا دے۔ مین نے عرض کیا بہت خوب مین یہی بندوبست کرون گا چنانچہ
مین نے یہ امر جناب چچا صاحب مغفور کو لکھا اور سر ہربرٹ نے خود صاحب رزیڈنٹ کو
اطلاع کی کہ ہم نے اس طرح کا بندوبست کیا ہے۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جناب چچا صاحب
نے تین مہینے تک کچھ جواب میرے خط کا نہ لکھا۔ اور رزیڈنٹ نے اپنے یہان کے
اخبار نویس کو جس کا نام لال جی تھا جناب چچا صاحب کے پاس بھیجا اور کچھ تحریری یا
زبانی پیغام دیا ہوگا کہ اون سے وہ خلاصہ اخبار کا جو بادشاہ کے پاس گذرتا ہے لے
بھیجدیا کرے اور بعد طیشان کے اوس طرف سے رزیڈنٹ نے لکھا کہ اخبار نویس ہمارے قدیم
نوکر ہین اون کی موقوفی مصلحت نہین ہے اور رزیڈنٹی کا جو اخبار نویس ہے اوس نے بادشاہی
اخبار کے داروغہ کے ساتھ بندوبست کر لیا ہے اب اخبار صحیح پہونچا کرے گا۔ الغرض جب

جناب چچا صاحب کی طرف سے میرے خط کا جواب نہ آیا ظاہرا اونھون نے بادشاہ
کے خوف سے اور وضعداری سے جواب لکھنے مین شش وپنج کیا اور اس قدر رجوع کرنا
رزیڈنٹ کا لال جی اخبار نویس کی معرفت غنیمت سمجھے۔ حالانکہ یہ بہت بڑی خطا رائے
کی تھی اگر وہ بندوبست جاری ہو جاتا تو سلطنت کے واسطے بہت مفید تھا کہ اخبار کا پہونچانا
گورنر جنرل کے پاس سہل ہو جاتا جس قسم کی منظور ہوتی بے تکلف پہونچ جاتی۔ اور اگر اوس
وقت مین ذمہ کر لیتا کہ اخبار صحیح مین پہونچا دون گا اور بدون توسط جناب چچا صاحب کے
اس کا بندوبست مین اپنے طور پر کر لیتا تو کچھ مشکل نہ تھا تو اوس صورت مین وہ تحریر صاحب
رزیڈنٹ کی قبول نہ ہوتی اس واسطے کہ گورنر جنرل کو اور صاحب سکرتر کو میرے اوپر بھروسے
اور اعتماد تھا کہ میری عرض خواہ مخواہ قبول ہو جاتی مگر کچھ ناتجربہ کاری سے اور کچھ بے پروائی
سے مجھے بھی اوس کی طرف چندان اعتنا نہ ہوئی مگر چند عرصے کے بعد جب راہ تسہیل اوس
بندوبست کی بدون توسط جناب چچا صاحب کے معلوم ہو گئی تو البتہ بہت حسرت
ہوئی اور ایسے امر کی تحریک سے اب رزیڈنسی کے اخبار نویس کو میری طرف سے بڑا
دغدغہ پیدا ہوا رزیڈنٹ وغیرہ تو سب میرے معاند تھے ہی وہ اخبار نویس بے طرح پیچھے
پڑا ہمیشہ جھوٹھی جھوٹھی خبرین میری طرف سے لکھ لکھ کے رزیڈنٹ کے پاس پیش کرتا تھا اور اخبار اور روزنامچہ
مین لکھی ہوئی یہان آیا کرتی تھین چنانچہ ایک بار عجیب اتفاق ہوا کہ ایک خط رسمی
بادشاہ کے نام پر ظاہرا کچھ تنخواہ وثیقہ مین مقرر کرنے کے واسطے ملکۂ جہان کے لیے جو
محمد علی شاہ کا ایک محل ہے لکھا گیا اوس خط مین میرے نایب کے سہو سے خطاب ملکۂ جہان
کا نہ لکھا گیا۔ صرف اون کا نام یا شاید حرم محترم کی لفظ اون کے نام کے بعد لکھی گئی
اس خط کو بادشاہ نے پھیر دیا اور کچھ شکایت لکھی۔ اگر وہ خط سہل مین مجھ تک آتا تو راقم اپنے سہو
کی اقرار کر کے اوس کو بدل دیتا لیکن کرنیل کالفیلڈ نے اوس کو بہت طول دیا یعنی دفتر
میری شکایت کے کھول دیے جناب سر ہربرٹ نے مجھ سے فرمایا اور ظاہر اوہی تقریر

گورنر جنرل کے سامنے کی ہوگی کہ کرنیل کالفیلڈ کو بسبب شدت عداوت کے مجھ سے
اپنے ناقص تحریرات کا بھی خیال نہین رہتا۔ ہمیشہ شکایت سازو آمیز کی بادشاہ
سے لکھتے تھے اب کی دفعہ بادشاہ کی نارضامندی مجھ سے لکھتے ہین۔ خیر اس مین پورا
خطاب ملکۂ جہان کا لکھ کے خط کو بدل دو۔ کچھ الفاظ بدل دیے مگر اصل جو اون کی غرض
تھی ملکۂ جہان کا لقب بنظر ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے لحاظ سے نہین لکھا گیا۔ ایک مرتبہ
کرنیل کالفیلڈ کو بادشاہ کے ایک خط مین شجاعت وتہور دستگاہ لکھا گیا تھا اور ہمیشہ سے
عادت تھی کہ رزیڈنٹ کو شہامت وعوالی مرتبت ابہت ومعالی منزلت لکھا جاتا تھا
حالانکہ بہ نظر اس کے کہ وہ ارباب فوج سے تھے کچھ قباحت نہ تھی مگر اس امر مین شرف الدولہ
محمد ابراہیم خان جو اوس عرصے مین بادشاہ کے مدار المہام تھے اونھون نے کرنیل کالفیلڈ کو
برانگیختہ کیا اور اون سے ظاہر کہا کہ اس خط کے آنے سے آپ کی وقعت بادشاہ کے
دل مین گھٹ گئی۔ اوس کا سبب یہ تھا کہ شرف الدولہ کو جناب چھوٹے چچا صاحب سے
ایک محاسدہ تھا اس نظر سے اور ایک امر اور بھی ایسا واقع ہوا تھا کہ جس سے وہ میری طرف
سے بدتھے۔ شرح اوس کی بہت طوالت چاہتی ہے مختصر یہ ہے کہ ایک جوڑا اونھون نے باندھا
اور صاحب رزیڈنٹ سے ایک تحریر گورنر جنرل کے نام پر کروائی تھی اوس مضمون کا ایک
خط چاہتے تھے کہ گورنر جنرل کی طرف سے بادشاہ کے نام پر لکھا جائے جو موجب اون کی
ترقی کا ہوتا وہ خط باوصف کرنیل کالفیلڈ کی مکرر تحریک کے نہ لکھا گیا اس وجہ سے اونھون نے
مزاج کرنیل کا میری طرف سے اور برہم کردیا کہ اونھون نے بے انتہا میری شکایت لکھی اس
شکایت پر سر ہربرٹ مجھ سے ناراض ہوے اور فرمانے لگے اس مین کچھ شبہ نہین کہ کرنیل
کالفیلڈ تمھارے دشمن ہین لیکن اس خط مین تم نے عمدًا اون کا لقب کم کیا اور اون کی
عداوت کا اپنے ساتھ بدلا لیا ہم کب تک دفتر خانے مین رہین گے کہ تم کو بچایا کرین۔ تم
انگلشیون سے بگڑتے ہو یہ آئندہ تمھارے واسطے بہت مضر ہوگا۔ جن نے اون کا اطمینان کیا

کہ ہرگز مین نے عمداً نہین لکھا چونکہ کرنیل کالفیلڈ کے واسطے پچھلے عہد مین یہی لکھا گیا
تھا اوسی نظر سے لکھا اور بہ نظر اہل فوج ہونے کے وہ الفاظ کچھ بد نہین ہین اور اب تک وہ
مستقل نہین ہوئے ہین تو کچھ قباحت نہ تھی۔ اب اگر وہ بادشاہ کے پاس سے خط پھر کے
واپس کرین تو بدل دیا جائے گا۔ سرہربرٹ نے یہی اون کو لکھ بھیجا اور لکھا عنقریب تمھارے
استقلال کی اطلاع کا خط جو بادشاہ کو لکھا جائے گا اوس خط مین القاب معمولی لکھا جائیگا
اور ایک دفعہ عجیب ایک شکایت لکھی کہ یہان بادشاہ کی مصاحبت مین ایک شخص ہے
مولوی خلیل الدین خان نام وہ ہمیشہ بادشاہ کو فریب دیا کرتا ہے کہ میرا بھتیجا میر منشی ہے
فارسی دفتر کا۔ کوئی امر رزیڈنٹ کا خلاف یہان کے چلنے نہین پاویگا۔ اس سبب سے اکثر
میرے مشورے بادشاہ قبول نہین کرتے ہین۔ اس پر سرہربرٹ نے وہ خط رزیڈنٹ کا
میرے آگے ڈال دیا اور کہا اس کا جواب تم سے طلب ہے۔ جب مین اوس کے مضمون پر مطلع
ہوا تو مین نے عرض کیا کہ جواب آپ طلب کرتے ہین یا گورنر جنرل۔ کہا جواب مین کیا فرق
ہے۔ مین نے عرض کیا مین دونون جواب بیان کرتا ہون حضور فرق سمجھ لیوین۔ گورنر جنرل
کا جواب یہ ہے مولوی خلیل الدین خان فریب دیتے ہین اور جواب مجھ سے طلب ہوتا ہے
اس کے کیا معنے ہین۔ اس پر سرہربرٹ بہت ہنسے اور فرمایا مین نے یہی تیری طرف سے
جواب دیا ہے۔ پھر مین نے عرض کیا کہ حضور مولوی خلیل الدین خان کی وضعداری اور
متانت سے خوب واقف ہین کہ وہ اس کوچے کے آدمی نہین ہین جو جوڑ بندیان کرین اور
فریب دیوین علاوہ اس کے اپنی نہایت وضعداری سے خلاف اوس سلطنت کے دستور
کے تین سلطنت سے برابر وہ وہان معزز اور محترم ہین اور ایسا فریب دینا اوس شخص کا کام
ہے کہ جس کا عروج وہان میرے سبب سے ہوا ہو اون کو حاجت میرے ذریعہ کی کیا ہے
جو اس نہج کے فریب ڈھونڈھین۔ غرض اس تحریر پر کرنیل کالفیلڈ کی کچھ اعتنا نہ ہوئی اور
جواب مسکت لکھا گیا۔ چند مرتبہ اور اسی طرح کے مزخرفات وہان کے روزنامچے مین درج

ہو کے آئے کسی طرح کا مجھکو ضرر نہ پہونچا یہان تک کہ کرنیل کالفیلڈ وہان سے الگ ہوئے
ور جنرل فاٹ بلقب انواے انڈ منسٹر وہان مقرر ہوے - رزیڈنٹ کا لقب موقوف ہوا
ون کے حضور مین اگرچہ مجھے کسی نہج کا تعارف نہ تھا مگر وہ ظاہرا بہت پختہ مزاج اور
فہمیدہ تھے - اس مین کچھ شبہ نہین ہے کہ اخبار نویس رزیڈنٹی کا اوسی طرح کی بدخبرین
میری نسبت پیش کرتا ہوگا مگر وہ جب تک رہے نہ کبھی میری شکایت کسی خط مین اونھون
نے لکھی نہ کبھی کسی روزنامچہ مین کچھ لکھا ہوا آیا جب وہ ولایت کی طرف روانہ ہوے اور جنرل
پالک اوسی عہدے پر مامور ہوئے پھر وہی کیفیت شروع ہوئی ایک مدت تک اوس کی
اعتنا نہ ہوئی - اب سر ہربرٹ کونسل مین بھرتی ہوے اور مسٹر جیمس طامسن سکریٹری مقرر
ہوئے - یہ صاحب ظاہر کے تو بہت بڑے خلیق اور بے تکلف تھے مگر دل اون کا اہل ہند
خصوص اہل اسلام کی طرف سے بہت بد تھا - اگرچہ مجھکو سابقہ اون سے بہت مدت سے
تھا جب سے وہ آگرہ کی لفٹنٹی مین سکریٹری تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بجز ریونیو یعنی مال کے
دفتر کے پولیٹکل وغیرہ کا کام بسبب اس کے کہ اون کو توجہ نہ تھی کچھ نہین جانتے تھے اور
آرل آف النبرا پر اون کی ناکردہ کاری اوس دفتر مین بہت ثابت ہو گئی بعضے امور ایسے
واقع ہوے کہ اون کو یقین ہو گیا کہ راقم کے سبب سے آرل آف النبرا کے دل مین وہ ناکردہ کاری
اون کی ثابت ہوئی ہے - اس جنس کے دو تین امر پیش آئے تھے کہ شرح اور تفصیل اوس کی
بہت طوالت چاہتی ہے اس نظر سے وہ میری طرف سے دل مین کچھ غبار رکھتے تھے جب
وہ آگرے کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہو کے دفترخانے سے الگ ہوے کچھ کوائف دفتر کے
سر فردرک کری سے جو اون کی جگہ پر سکریٹری مقرر ہوئے تھے بیان کیے اوس کے ضمن مین
میری نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ ہم کو اون کی طرف سے دل مین شک ہے - خدا جانے
اس پر اونھون نے کیا قرینے ٹھہرائے تھے - اب ایک انقلاب ہوا کہ آرل آف النبرا گورنر جنرل
اوس عہدے سے معزول ہوے سر ہنری ہارڈنگ نئے گورنر جنرل مقرر ہو کے آئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۳۴ — اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

مستشرقین انگلستان کی سب سے پہلی انجمن

(از مولوی حامد حسن قادری لکچرار فارسی سینٹ جانس کالج - آگرہ)

انگلستان کا تعلق ممالک مشرقی سے بہت قدیم ہے - لیکن حکومتِ ہندوستان نے اس تعلق کو جتنا قریب و وسیع کر دیا وہ پہلے میسر نہ تھا - ہندوستان نے نہ صرف انگریزوں کے جیبوں کے لیے اپنے خزانے کھول دیے بلکہ اُنکے تشنہ دلوں کی بھی اپنے علوم و فنون کے چشموں کی طرف رہنمائی کی - البتہ جس ذوق و شوق اور ہمت و مردانگی سے اُن تشنگانِ علم و ادب نے آبحیات تک راستہ پایا اور ظلمات سے نکال کر پیاس بجھائی وہ لائقِ صد آفریں ہے -

انھیں کوششوں کا ایک قدم یہ تھا جو غالباً اپنی نوع کا قدم اولیں بھی تھا کہ انگلستان میں سنہ ۱۸۲۰ء میں ایک سوسائٹی بنام "اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ" قائم کی گئی - جس کا مقصد تمام ممالک مشرقی کے علم و حکمت کے موتی رول لینا تھا - اسکے مربی و سرپرست انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم تھے - ناظمان مربی میں بائیس علما و امرا کے نام ہیں جن میں چند یہ ہیں :-

ہز مجسٹی بادشاہ بلجیم

ہز رائل ہائنس ڈیوک آف سکس

ہز رائل ہائنس ڈیوک آف کیمبرج

ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاسسٹر
ہز گریس لارڈ آرچ بشپ آف کینٹربری
ہز گریس ڈیوک آف ولینگٹن
لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل ہندوستان
سر رابرٹ پیل ممبر پارلیمنٹ
سر جان مالکم گورنر بمبئی۔

اس انجمن کے صدر مشہور مستشرق سر گور اوزلے تھے۔ نائبان صدر پانچ اشخاص تھے، جن میں پہلا نام ارل آف منسٹر کا ہے۔ آنریری سکرٹری جے۔ سی۔ ہائن اسکوائر ایم اے تھے۔

اس "فنڈ" کے ممبر بنانے اور چندہ وصول کرنے کے لیے کلکتہ، مدراس، اور روم (اٹلی) میں شاخیں قائم کی گئیں۔

ہمارے سامنے اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی جو فہرست مطبوعات ہے وہ صرف چار سال (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۲ء) کا کارنامہ ہے۔ اس میں ۳۰ کتابیں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ سات کتابیں زیر طبع ہیں، اور ۲۷ کتابیں زیر ترجمہ و تدوین ہیں۔ چار سالہ کارروائی کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، چینی، سنگالی (سیلونی)، جاپانی، تامل، بنگالی، ایتھوپین، سیریک (شامی) زبانوں سے ترجمے کیے گئے۔

۲۔ اصلی کتابوں اور نایاب قلمی نسخوں کی تدوین و تصحیح کر کے شائع کیا گیا۔

۳۔ علم ادب، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، سیرت، سفرنامہ، جغرافیہ، شاعری، فسانہ وغیرہ سب قسم کے مضامین کی کتابیں ترجمہ و تالیف کے لیے انتخاب کی گئیں۔

۴۔ بلحاظ السنہ منتخب کتابوں کی تعداد یہ ہے

(۱)	عربی	۱۴
(۲)	فارسی	۲۱
(۳)	ترکی	۶
(۴)	سنسکرت	۴
(۵)	چینی و جاپانی	۸

۶- بعض نادر مطبوعات مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) سفرنامۂ ابن بطوطہ - عربی مسودہ سے ترجمہ کیا گیا جو کیمبرج پبلک لائبریری میں موجود ہے اور جس پر تاریخ، جغرافیہ، نباتات، اثریات کے متعلق تشریحی حواشی درج ہیں - مترجمہ ریورنڈ ایس ڈی بی - ڈی پروفیسر زبان عبرانی کیمبرج یونیورسٹی -

(۲) سفرنامۂ میکریس پادری انطاکیہ جو اس کے رفیق سفر آرچ ڈیکن پال حلبی نے عربی میں لکھا حصہ اول سفرنامہ اناطولیہ، رومیلیا، مالدیویا - حصہ دوم سفر ولیشیا، مالدیویا - و ممالک کاسک - مترجمۂ ایس - سی - بیلفور -

(۳) ہن کونگ سو - ایک چینی افسانۂ غم - اصلی زبان سے ترجمہ کیا گیا - مع حواشی و نمونۂ اصل کتاب، مترجمہ جان فرانسس ڈیوس، ایف آر ایس -

(۴) ملفوظات تیموری - یعنی تیمور بادشاہ کے خود نوشت حالات - جو اصل چغتائی ترکی زبان سے ابوطالب حسینی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیے - مترجمۂ میجر چارلس اسٹیوارٹ سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کالج

(۵) سیرت حافظ الملک حافظ رحمت خاں موسوم بہ "گلستان رحمت" نوشتۂ نواب مستجاب خان بہادر ابن حافظ رحمت خاں - مترجمۂ چارلس ایلیٹ -

(۶) جبر و مقابلۂ محمد بن موسیٰ - مرتبۂ و مترجمۂ فریڈرک روسن -

(۷) تذکرۃ الواقعات - یعنی حالات شہنشاہ ہمایوں - نوشتۂ جوہر آفتابچی خادم شاہی - مترجمۂ چارلس اسٹیوارٹ موصوف الصدر -

(۸) جغرافیۂ ادریسی - مترجمۂ ریورنڈ جی - سی - رینارڈ - یہ کتاب عربی میں ۱۱۵۳ء میں لکھی گئی تھی - جس میں ایک نقرئی کرۂ ارض (جو روجر شاہ صقلیہ کے لیے بنایا گیا تھا) کی جغرافیائی تشریح کی گئی ہے، اور یونانی جغرافیہ دانوں کی مجوزہ ہفت اقلیم بیان کی گئی ہیں -

(۹) سانکھیا کاریکا - سنسکرت نظم کے ۷۲ بند جن میں سانکھیا فلسفہ مابعد الطبیعات کے اصول نظم کیے گئے ہیں - مترجمۂ ہنری طامس کول بروک -

(۱۰) لی کی - ایک قدیم چینی تصنیف جو کنفوشس کی طرف منسوب ہے، اور جس میں چین کے اخلاق

ورسوم کی بنیاد ہے اور اب تک اس ملک میں سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

(۱۱) تاریخ ابو الفتح ابن ابو الحسن السامری۔ یہ نادر عربی تصنیف جس کا واحد مکمل نسخہ یورپ میں موجود ہے۔ سامریہ فلسطین کی ابتدائے آفرینش سے وسط صدی چہارم تک کی تاریخ ہے

(۱۲) تاریخ بربری۔ مصنفہ ابن خلدون۔ مترجمہ ریورنڈ پروفیسرلی۔ یہ نہایت نادر وقیمتی کتاب ہے۔ جس میں ان شاہی خاندانوں کے حالات عروج وزوال درج ہیں جنھوں نے افریقیہ کے مشرقی ساحل پر حکومت کی۔

اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی مترجمات مطبوعہ میں سے ایک کتاب "تذکرۃ الواقعات (دیکھو مندرجہ فہرست بالا) اسوقت میرے سامنے ہے۔ اسکا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔ اسکے متعلق مترجم انگریزی میجر چارلس اسٹیوارٹ نے لکھا ہے کہ اسکا صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے اور وہ انگلستان میں موجود ہے۔ لیکن میری خوش قسمتی سے اس کا دوسرا نسخہ ہندوستان کے ایک قدیم کتب خانہ میں مل گیا۔ میں اس زمانہ میں علامہ شبلی کے مشورہ سے تذکرۃ الوقعات کے انگریزی ترجمہ کا اردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اصل قلمی فارسی نسخہ کو دیکھا۔ اس سے مقابلہ کیا۔ ضروری نوٹ لیے۔

ٹرانسلیشن فنڈ کے مطبوعہ ترجمۂ تذکرۃ الواقعات میں ٹائیٹل پیج سے پہلے ایک اور سرورق لگایا گیا ہے۔ جس پر فنڈ کا نام، سنہ تاسیس، نام سرپرست درج ہے۔ اور لکھا ہے کہ "یہ کاپی مارکوئیس کولمنڈی ممبر اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کے لیے طبع کی گئی" اس سرورق پر نہایت خوبصورت مشرقی وضع کی چوڑی بیل چھاپی گئی ہے۔ سرورق کے بعد شہنشاہ ہمایوں کی تصویر ہے جو معمولی مطبوعہ تصویروں سے کسی قدر غیر ہے۔ اگرچہ مشابہت وہی ہے۔ پورے قد کی تصویر ہے۔ تصویر کے مقابل دوسرا صفحہ ٹائیٹل پیج ہے۔ جس پر نام کتاب ومصنف کے علاوہ سنہ طباعت ۱۸۳۲ء درج ہے۔ اسکے بعد پہلے صفحہ پر انتساب ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:-

بجناب

رائٹ آنریبل ارل آف منسٹر

مائی لارڈ

میں نہایت فخر واعزاز کے ساتھ ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کے حالات

جسکے انقلابات سلطنت ہمارے شاہی اسٹوارٹ خاندان اور سابق بوربن خاندان

کے انقلابات سے شابہت تام رکھتے ہیں، جناب والا کے نام پر معنون کرتا ہوں۔
مجھے نہایت مسرت ہے کہ ان اوراق کا ایسی مستند ہستی سے انتساب کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے جو السنۂ شرقیہ سے واقف ہونے کی وجہ سے ان دشواریوں کا صحیح اندازہ کر سکتی ہے جو ایران و ہندوستان کے خیالات و محاورات کو یورپین زبانوں کا جامہ پہنانے میں پیش آتی ہیں۔
میں خلوص قلب کے ساتھ دست بدعا ہوں کہ جناب والا اس قابل قدر محکمۂ تراجم (جسکے حضور والا بانی ہیں) کی سرپرستی ہمیشہ فرماتے رہیں۔

رائل کورسینڈٹ باتھ — جناب والا کا نہایت مطیع و ادنیٰ خادم

یکم مارچ ۱۸۳۲ء — چارلس اسٹوارٹ

ڈیڈیکیشن کے بعد مترجم کا دیباچہ درج ہے۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔

دیباچہ مترجم انگریزی

میں جس زمانہ میں شہنشاہ جہانگیر کے حالات کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا میرے دوست میجر ولیم پرائس نے مجھے ایک فارسی قلمی کتاب بھیجی جس میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات درج تھے۔ ہمایوں مشہور بادشاہ بابر کا بیٹا اور اس سے زیادہ مشہور شہنشاہ اکبر کا باپ تھا۔ میرے دوست نے اس کتاب کے ترجمہ کی فرمایش کی۔ چنانچہ اپنے دوست کی فرمایش اور اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ کمیٹی کی درخواست پر میں نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔

چونکہ اس کتاب کا مصنف کوئی عالم آدمی نہیں ہے اس لیے یہ عالمانہ رنگ کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے میں نے اصل فارسی کتاب کا نمونہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مصنف نے اپنے زمانہ کے دستور کے موافق کتاب کو جا بجا آیات قرآنی، اشعار فارسی اور تمثیلات تاریخی سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن میں نے ترجمہ میں ان طویل اضافات کے اتباع کی تکلیف گوارا کرنا غیر ضروری سمجھا۔
یہ کتاب اس قدر خلوص و صداقت اور فطری سادگی و بے تکلفی سے لکھی گئی ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی درج کر دیے ہیں جس سے بادشاہ کی کسرشان ہوتی ہے۔ ایسے مجھے اس کتاب کے مستند و صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کتاب کا قلمی نسخہ لکھنؤ دارالسلطنت اودھ میں خریدا گیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی یہی ایک کاپی دنیا میں ہے جو اسوقت انگلستان میں موجود ہے۔ بد ... کی تقطیع کی کتاب ہے۔ خط معمولی ہے ... تقریباً ایک صدی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

اس موقع پر میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی یورپین شاعر کا کوئی خیال اور کسی مورخ کا کوئی مضمون ایسا نہیں ملا جسکا متقابل و مترادف مشرقی مصنفوں کے ہاں نہ ملا ہو۔ میں اُن ناظرین سے جو اس کتاب یا میرے دوسرے تراجم پر جرح و قدح کرنا چاہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اول اُن تراجم کا اُسی زمانہ کی انگریزی تصنیفات سے مقابلہ کرلیں۔ زمانہ حال کی مصنفات سے مقابلہ نہ کریں"۔

اسکے بعد مترجم نے مختصر مقدمہ لکھا ہے۔ جسکا ترجمہ پیش کرتا ہوں:-

مقدمہ مترجم انگریزی

"ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کا سلسلۂ نسب تیمور تک یہ ہے۔ ہمایوں بن بابر بن عمر شیخ بن ابوسعید بن محمد مرزا بن میران حسین بن تیمور۔

ہمایوں کی اولاد اور جانشین یہ تھے۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں۔ عالمگیر اورنگ زیب۔ بہادر شاہ۔ فرخ سیر۔ محمد۔ احمد۔ عالمگیر ثانی۔ شاہ عالم۔ اکبر ثانی۔

ہمایوں کابل میں ۹۱۳ھ / ۱۵۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اسی سال اسکے باپ بابر نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ ہمایوں کا دوسرا بھائی کامران تھا، تیسرا ہندال، چوتھا عسکری۔ ان سب کے ساتھ میرزا کا لقب ہے۔

جس وقت بابر نے ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں ہندوستان پر حملہ کیا، تو اپنی فوج کے میمنہ کا افسر ہمایوں کو بنایا۔ افغانوں کے مقابلہ میں بھی پہلا جنرل ہمایوں ہی بنایا گیا تھا۔ جنگ پانی پت کے بعد ہمایوں کو شہر آگرہ اور خزائن سلطان ابراہیم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جو فوج ممالک مشرقی دریائے گنگ کے امرا کی متحدہ فوج کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی اُس کا سپہ سالار بھی ہمایوں ہی تھا۔ ان تمام معرکوں میں ہمایوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اور باپ نے صلہ میں ایک کرور ستر لاکھ دام[1] اور آگرہ میں ایک محل مع ساز و سامان عنایت کیا۔ اس کے بعد ہمایوں نے شہر جون پور فتح کیا۔ اور وہاں سے واپس ہو کر قبل اسکے کہ بیانہ کے قریب ہندو راجاؤں کے ساتھ جنگ شروع ہو، شاہی فوج سے آکر مل گیا۔ اور اس میدان میں بھی بڑی شہرت و کامیابی حاصل کی۔

ان واقعات کا بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس کتاب (تذکرۃ الواقعات) میں ہمایوں کو تخت نشینی کے بعد کے حالات درج ہیں۔ اور اُس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بحیثیت بادشاہ کے

---

[1] چالیس دام کا ایک روپیہ۔

نہایت سست وجامد طبیعت کا انسان واقع ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر وہ بحیثیت انسان کے بدتر ہوتا، تو بہتر بادشاہ ثابت ہوتا۔

چونکہ مصنف تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی) نے کتاب میں واقعات کے سنہ درج نہیں کیے ہیں اس لیے میں نے مختلف کتابوں سے تلاش کرکے اس کمی کو پورا کیا ہے

ہندوستان میں خاندان تیموریہ "مغل" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ خاندان خود اپنے آپ کو مغل نہیں کہتا۔ یہ لوگ غالباً چغتائی تُرک تھے جو مغلوں یا تاتاریوں سے زیادہ معزز قبیلہ ہے۔ لیکن ترکانِ قسطنطنیہ سے متائز کرنے کے خیال سے اس کتاب میں اور "حالات تیمور" میں خاندان تیمور کے لیے مغل کا لقب قائم رکھا گیا ہے۔"

اسکے بعد کتاب کا ترجمہ شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے مصنف کا یہ مختصر دیباچہ ہے:-

دیباچہ مصنف

"بعد حمد و نعت و بعد انتساب کتاب بنام شہنشاہ ہمایوں خادم شاہی جوہر عرض کرتا ہے کہ مجھے خوش قسمتی سے آغاز شباب میں خدمتِ شاہی کا فخر حاصل ہوا۔ بادشاہ کی وفات تک خدمت کی سعادت نصیب رہی۔ اور ہر وقت و ہر حالت میں بادشاہ کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ اسلیے مجھے خیال آیا کہ اُن تمام واقعات کو ضبط تحریر میں لے آؤں جن کا میں عینی شاہد ہوں۔ تاکہ ان دلچسپ کوائف کی یاد باقی رہ جائے۔ میں نے اپنی بساط کے موافق انکو لکھنے کی کوشش کی ہے اگرچہ میری تحریر ان حالات کی عظمت وشان سے فروتر ہے۔ میں نے یہ کتاب ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں شروع کی اور تذکرۃ الواقعات نام رکھا۔

میرا یہ مدعا نہیں کہ عہد ہمایوں کے تمام حالات لکھوں، بلکہ صرف وہی واقعات لکھوں کا جنکا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے۔ اس لیے بادشاہ کی تخت نشینی کے زمانہ سے شروع کروں گا اور بادشاہ کی ایران سے مراجعت اور دوبارہ حصولِ سلطنتِ ہند پر ختم کردوں گا۔ میں اس تحریر میں دکھاؤں گا کہ بادشاہ نے کس ہمت و استقلال سے گوناگوں شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا۔ اور خدائے عزوجل کے

لے اگرچہ اس جگہ مصنف اپنے عہدہ کا نام نہیں لیتا، لیکن آگے چل کر اس نے بتایا ہے کہ وہ شاہی آفتابچی تھا۔ یہ آفتابہ برداری کا عہدہ قدیم زمانہ میں تمام یورپ میں رائج ومتعارف تھا۔ اور اب بھی ہمارے بادشاہ کے محکمہ خانگی میں قائم ہے۔ (مترجم انگریزی)

فضل وکرم سے دوبارہ سلطنت حاصل کی۔ امید ہے کہ یہ کتاب خاکسار مصنف کا نام زندہ اور ان عجیب واقعات کی یاد کو تازہ رکھے گی۔"

میجر اسٹیوارٹ مترجم انگریزی نے کاتب نسخۂ فارسی کا نام نذیر بن طالب حسینی اور تاریخ کتابت ماہ جمادی الاول سنہ ۹ جلوس لکھی ہے۔ اس سنہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا جبکہ میجر نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ ایک صدی پرانا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کتاب جوہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں کسی نے نقل کیا ہوگا اور وہ زمانہ اورنگ زیب کے بعد کا ہونا چاہیے۔ میں نے جو فارسی نسخہ دیکھا ہے اُس میں کاتب کا نام نہیں ہے۔ لیکن آخر میں لکھا ہے:

"در سلخ شہر رجب المرجب ۱۲۰۶ھ از مقابلۂ ایں کتاب کہ آں ہم غلط بود فراغ حاصل شد"

یہ نسخہ میجر کے نسخے سے بہت بعد کا اور اب سے صرف ستر سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے دیباچہ میں جوہر نے سنہ تصنیف وہی بتایا ہے جو میجر نے لکھا ہے۔ جوہر کا فقرہ یہ ہے:

"شروع ایں قصہ در ابتدائے سنہ خمس وتسعین وتسعمأته افتادہ"

۹۹۵ھ

جوہر نے ~~سنہ~~ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ع (سال تخت نشینی ہمایوں) سے ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ع (سال وفات ہمایوں) تک کے واقعات لکھے ہیں، اور تذکرہ کے آخری واقعہ سے ۳۲ برس بعد تصنیف شروع کی ہے۔

میجر نے ترجمہ کتاب کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ہمایوں کے ایران پہونچنے پر ایک حصہ ختم کر دیا ہے اور قیام ایران و مابعد کے حالات دوسرے حصہ میں رکھے ہیں۔ حصہ اول کے آخر میں تاریخ عالم آرائے عباسی کے اس حصہ کا ترجمہ شامل کر دیا ہے جس میں شاہ طہماسپ (جسکے عہد میں ہمایوں ایران پہونچا تھا) کے حالات درج ہیں۔

تذکرۃ الواقعات کی فارسی زبان نہایت معمولی لیکن صاف اور مطلب خیز ہے۔ بلکہ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی عبارت اسکے مقابلہ میں کہیں کہیں پیچیدہ و کاواک ہو جاتی ہے۔ تاہم تذکرۃ الواقعات اغلاط سے پاک نہیں۔ ایک جگہ عنوان فصل یوں درج ہے:

"فصل پانزدہم در مذمت کردن ہمایوں بادشاہ را ملازمان میرزا کامران نزد شاہ عالم پناہ"

یہ عبارت اس طرح ہونا چاہیے تھی "در مذمت کردن ملازمانِ میرزا کامران ہمایوں بادشاہ را" لیکن چونکہ کتاب غلط در غلط نقل ہوتی چلی آئی ہے، اس لیے اس طرح کی اغلاط کا ذمہ دار ناقل کو بھی قرار دیا جا سکتا

مصنف نے اپنی کتاب میں جو آیاتِ قرآنی اور اشعار فارسی درج کیے ہیں وہ سب کے سب مترجم انگریزی نے چھوڑ دیے ہیں، اُن میں سے عام تمثیلی اشعار کے ترک کا تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن بعض موقعوں پر جوہر نے ہمایوں کے اشعار بھی درج کیے ہیں، ان کا لکھا یا کم سے کم انکا ترجمہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس کمی کو اپنے دریافت کردہ نسخہ سے پورا کر دیا ہے۔

مثلاً جب ہمایوں بادشاہ سیستان علاقۂ ایران میں پہونچا تو خدام شاہی نے عرض کیا کہ چونکہ ہم اس ملک میں حکمراں کی بغیر اجازت آئے ہیں، ممکن ہے شاہِ ایران کو یہ امر ناگوار ہو، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے اجازت منگالی جائے۔ چنانچہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ کو خط لکھا اور اُس میں یہ قطعہ بھی لکھ کر شامل کیا

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم   قُلّۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلۂ گندم نمائے جو فروش   طوطیِ طبع مرا قانع بہ ارزن کردہ است
دشمنم شیرا ست و عمرے پشت با من کردہ بود   این دم از روئے عداوت رو بامن کردہ است
التماسِ این ز شہ دارم کہ با من آن کند   آنچہ با سلمان علیؑ در دشت ارزن کردہ است

جب ہمایوں شاہِ ایران کا مہمان ہو گیا تو میرزا کامراں برادر ہمایوں نے شاہ ایران کے پاس اپنے آدمی بھیجے اور یہ کہہ کر کہ ہمایوں آپ کے مذہب (تشیع) کا مخالف ہے، شاہ ایران کے دل کو ہمایوں کی طرف سے مکدر کرنا چاہا۔ بادشاہ کی بہن ہمایوں کی طرفدار تھی، اُس نے ہمایوں کی طرف سے شاہ کا دل صاف کرنے کی غرض سے ایک موقع پر ہمایوں کی یہ رباعی سنائی

مائیم ز جان بندہ اولادِ علی   ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی
چوں سرِّ ولایت ز علی ظاہر شد   کردیم ہمیشہ وِرد خود نادِ علی

میجر اسٹیوارٹ نے ہمایوں کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ واقعہ دہلی میں ۱۱۔ ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۵۵۶ء کو پیش آیا" اور فٹ نوٹ میں تاریخ ہندوستان مصنفۂ ڈوے مفصل واقعہ لکھا ہے۔ جوہر نے تاریخ نہیں بتائی بلکہ کاہی کا قطعہ تاریخ لکھ دیا ہے جس سے ۹۶۲ھ نکلتا ہے۔ اور یہی صحیح ہونا چاہیے۔

لکھتا ہے " تاریخ وفاتِ ہمایوں بادشاہ کاہی گفتہ :۔

ہمایوں بادشاہ آں آفتابے   کہ فیض شاملِ او عام افتاد
بنائے دولتش چوں بافت رفعت   اساسِ عمرش از انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب بلندی | بپایاں در نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم | خلل در کار خاص و عام افتاد

پے تاریخ او کاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

۹۶۲ھ

انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں تذکرۃ الواقعات کی تاریخی خصوصیتیں اور دلچسپیاں اور ایک دو باب کا ترجمہ پیش کروں گا -

زاہدہ

(اپنی ہفت سالہ بھتیجی کی نذر)

زاہدہ! تو سر بسر اک پیکر اخلاص ہے | گود میں آ بیٹھنا تیری ادا ے خاص ہے
تو ہنساتی ہے مجھے مغموم و تنہا دیکھ کر | بھول جاتا ہوں غم دل تجھ کو ہنستا دیکھ کر
وہ ترا رہ رہ کے مجھ سے پوچھنا ہر بات کا | اور بتانے میں وہ پیرا رو کنا جذبات کا
چپکے چپکے مجھ سے کچھ کہکر وہ زیر لب ہنسی | سچ بتا، سیکھی ہے کس سے یہ ادا ے دلبری؟
کس چمن کا روپ ہے کس دیس کا یہ آب رنگ ہے | دیکھ کر صورت کو تیری عقل انسانی ہے دنگ!
سادگی ہے تیری نظروں میں مروت دل میں ہے | اس دل مایوس کی تسکیں اسی منزل میں ہے

اشناے غم سے دور، درد ہجر کے نالوں سے دور | اپنے پیاروں، اپنے سہارے چاہنے والوں سے دور
دور سب احباب سے اس شہر غم آباد میں | ایک گوشہ میں پڑا ہوں، محو تیری یاد میں
تو کلی ہے گر تو میں اک بلبل مہجور ہوں | جس چمن میں کھل رہی ہے تو میں اس سے دور ہوں
دور رہ کر مجھ سے کتنا مجھکو تڑپاتی ہے تو | تجھکو مدت سے نہیں دیکھا ہے یاد آتی ہے تو
خوب ہیں یہ بھی ادائیں دل لبھانے کے لیے | مضطرب ہوں تجھکو سینے سے لگانے کے لیے
نو شگفتہ پھول! آ، آنکھوں میں میری گھر کے بیٹھ | پر وہ دل میں نہاں ہو، درد دل میں چھپ کے بیٹھ

ہاں، مری تخئیل تیری یاد سے معمور ہے
پھر سے دل سے تو بہت نزدیک ہے گو دور ہے!

جلیل قدوائی بی اے
(علیگ)

تنظیم الحیوٰۃ

ترجمۂ اکانومی آف ہیومن لائف

اس نام سے ایک مثنوی میری نظر سے گزری، جو جناب صفی لکھنوی رکن رکین شیعہ کانفرنس کی نتیجۂ فکر ہے۔ اس مثنوی کے اکثر مقامات پڑھے۔ مضامین کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ وہ حرف بحرف ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ مترجم صاحب خود فرماتے ہیں :-

اس ترجمہ کو بطرز نیکو ۔۔۔ شائع کرنے لکھا بطرز اردو

بنتا رہا صاحب سلیقہ ۔۔۔ ترتیب دیا نیا حدیقہ

اسکے بعد فرماتے ہیں

میں نے وہ گلِ فرنگ چمن کے ۔۔۔ ہر احباب ہار گوندھے

پھر یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں

یہ نظم نہیں ہے شاعرانہ ۔۔۔ دلکش ہو جس کا ہر ترانہ

تھا اصل کتاب کا جو مطلب ۔۔۔ چھوٹا نہیں نظم ہو گیا سب

مثنوی میں پہلے مخاطبہ و مناجات ہے، اسکے بعد حمد و منقبت اُسی فرسودہ رنگ پر جیسے قدماء کا دستور تھا۔ مگر ایک پختہ کار شاعر سے جس قدر توقع ہو سکتی تھی وہ ان مضامین کے بیشتر اشعار میں ہے۔ اسکے بعد اتحادِ مذہب و اخلاق اور موجودہ زمانہ کی حالت کا اظہار ہے، جس میں اس ترجمہ کا سبب اور اراکینِ اکاڈمی کی مدح سرائی ہے جو صفی صاحب کا خاص رنگ ہے۔ اسکے بعد یہ کتاب صفحہ ۴۹ پر ختم ہوئی ہے - اور اس میں فقط ترجمہ ہے۔ کہیں کہیں مصنف صاحب نے بھی ضرورت شعری کی وجہ سے کچھ اضافہ فرما دیا ہے - اس مثنوی کے جا بجا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایک قابل شاعر سے جس قدر توقعات تھے اُسکے خلاف بہت سی باتیں مجھکو نظر آئیں - چونکہ میں جناب صفی کی شاعری کا پایہ بلند سمجھتا ہوں، اس لیے اکثر وہ مقامات جو اس نظم میں کھٹکتے ہیں، بطور استفسار دریافت کرتا ہوں -

جناب صفی فرماتے ہیں

لہ نثر میں جو ترجمہ ہوا ہے اُس کا نام حدیقۃ الاخلاق ہے -

کچھ نثر سے کم نہیں روانی

متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے

اک جذبہ فرشتگی سے ملصق

انقار کو دعوے خدائی

رہتی ہے ہمیشہ غیر مفتوح

اور اس میں اک انتعاش اسکو

کرتا ہے وہ راہ خیر مسدود

یہ تشنۂ علم ہے یہ تحقیق

گہ اسکو خوشی کبھی تحزن

بیکار نہ کھینچ کر وہ بیٹھیں

گویا کہ ہیں اسکی شہ کے اروب

اندازۂ حسن و قبح اعمال

ممکن ہے سلاست و روانی کی تعریف ان اشعار پہ صادق آتی ہو۔

پ   ہر خطہ سواد کفر سے گھپ

یہ لفظ مستعمل ہے۔ مگر اہل زبان تنہا اس لفظ کا استعمال نہیں

ے "چھیٹواں باب" لکھا ہوا ہے۔ واں۔ ہندی کلمہ نسبت ہے

غیرہ یہ سب تو درست ہیں مگر یہ "چھیٹواں" کہاں کی زبان ہے؟

ئے تو لغت میں قیاس درست نہیں۔ کیا چوتھے کو چوتھواں

ردار   جس طرح سے ہے پسند لے یار

ں مگر اردو میں تو صرف گد کہتے ہیں۔ جلال لکھنوی نے اپنے

طرح سے "میں" سے "حشو ہے" اور "لے یار بھی" آپ کی زبان

اٹھا   گر جانتی چارہ میں ہے کاشا

لفظ

کچھ

کیا برے بیت الفاظ

واسطے ہے۔ عیب

تمام اشعار سے قطع نظر

(۱۴) بیم

"رجائیں" کیا۔ ہے

(۱۵) ہر

ارسال المثل میں ادنیٰ

وقت نظم مسلم ہے تو یہ

(۱۶) بہت سے مت

صرف لے کاش

تب' متروک۔

اوپر متروک۔

(۱۷) حشو وزوائد

(۱۸) تعقید لفظی:

تجربہ کاریوں

اہلِ زباں کا اتفاق ہے کہ آشنا ذِن کے ساتھ نہیں۔ لغاتِ اُردو میں بھی دیکھا گیا۔ ممکن ہے جناب حقی لسان القوم کے نزدیک صحیح ہو۔ اگرچہ زبان پر جمہور کا اتفاق ضروری ہے اسلیے محتاج سند ہے۔

(۶)

کیوں اپنے عدو پہ خندہ زن ہو
خود اپنے ہی حق میں زہر کیوں ہو

لکھنؤ کے حضرات تو ایسے موقع پر کانٹے بو نا بولتے ہیں۔

(۷)

ثابت قدم اس طرح کا انسان
بحر قلزم میں جیسے چٹان

چٹان مشدد نہیں۔ جناب لسان القوم اُردو لغات کی طرف توجہ کریں۔

(۸)

اُگتی نہیں جب چری چریں کیا
رہتا ہے مواشیوں کو فاقہ

چری لکھنؤ کی زبان میں چرنے کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے آتش نے کہا

سبزہ مری تربت کا ہرا خوب ہوا ہے
ایسے میں ہرن آئیں تو موقع ہے چری کا

گنوار البتہ جوار باجرے یا مکئی کے ہرے درخت کو کہتے ہیں۔ جناب لسان القوم دہقانیوں کی زبان کبھی نہ نظم فرمائیں گے۔ بلکہ اس میں کوئی خاص رمز ہوگا۔

(۹)

وہ خواہشِ انتقام سے دُور
نقصان رساں ہو تیرا شکور

کیا شکور اس معنی میں صحیح ہے؟

(۱۰)

اس میں نہیں دوسرے کا کچھ بس
تا کس نہ کھیں خواہ تو بنا کس

کیا "کس" بنانا اُردو کا کوئی محاورہ ہے؟ علاوہ اسکے ایک خواہ کی اس مصرعہ میں ضرورت ہی نہیں؟

(۱۱)

ہوگا وہ اسی قدر کا شایق
جس درجہ وفا کے خود ہے لائق

کیا شایق فاعل کے معنی میں آیا ہے۔ صاحبِ صراح و قاموس لکھتے ہیں الشائق ہو المشوق یعنے یہ فاعل مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ عوام میں بمعنی مشتاق مشہور ہے۔ ثقات شعرا کا عوام کی پیروی کرنا کیسا ہے۔ اسکے علاوہ "ہوگا وہ اسی قدر کا شایق" یہ مصرعہ بھی مجھے آپ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

(۱۲)

بریاں تیری عیوب تیرے
مرجائیں تمام تجھ سے پہلے

بریاں مرنا عیوب مرنا کیا زبانِ اُردو میں مستعمل ہے۔

(۱۳) صنعتِ تالیف و ایطا بھی اکثر اشعار میں ہے۔ مثلاً

اُس دوست کو جس میں راستی ہو
فوق اُسپہ ہے جو خوشامدی ہو

ایطا سے جلی ہے۔ مگر اُسکی نسبت استفسار مطلوب نہیں۔ اسلیے کہ [illegible] اور ایطا جزی کا خود مترجم نے اظہار فرما دیا ہے۔

لفظاً ہو چکا ہے صنعتِ تالیف — معناً نہیں اک ذرا بھی تحریف
کچھ لفظ برائے بیت بھی ہیں — کیا کیجیے برمحل وہی ہیں

کیا برائے بیت الفاظ بھی برمحل ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت جناب صفی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام اساتذہ کے واسطے ہے۔ عیب ہر حالت میں عیب ہے۔ یہ لازم نہیں کہ بغیر غلطی کے کوئی اشعار کہہ ہی نہ سکے۔ خیر ایسے تمام اشعار سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

(۱۴) ہیم بشریت آب و گل میں — مانند ملک رجائیں دل میں

"رجائیں" کیا۔ یہ جمع اردو میں صحیح ہے؟ اسی طرح ہمیں بھی کہیے۔

(۱۵) ہر نوش کے ساتھ ہے بیان نیش — قہرِ درویش و جانِ درویش

ارسال المثل میں ادنیٰ تصرف بھی جائز نہیں۔ مثل تو یوں ہے "قہرِ درویش بجانِ درویش۔ خیر جب وقتِ نظم مسلم ہے تو یہ اعتراض بھی بیکار ہے۔

(۱۶) بہت سے متروکات استعمال کیے ہیں جو اتفاقِ جمہور کے خلاف ہیں۔ "اے کاشکہ وس ہزار مجرم" صرف اے کاش مستعمل ہے۔

سچائی سے جب . . . واقفیت — تب عدل کی ہوگی قابلیت

تب متروک۔

لیکن پاؤ گے سب سے بڑھکر — اس کو بے رحم اپنے اوپر

اوپر متروک۔

(۱۷) حشو و زوائد کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

جس طرح سے بال تیرے سر کے — یا چرخ زمرد میں پہ تارے
ہر شخص کو خلق میں سراسم — اک روح ملی ہے اور اک جسم
باتیں ایسی جو ہوں ضروری — پھر کون سکھائے تجھکو پوری
پھر اس نے خرید لے بے تحاشا — سامان آرایشِ مکاں کا

(۱۸) تعقید لفظی:—

یا تجربہ کاریوں میں کامل — جنکو۔ کر پند اُن سے حاصل

تجربہ کاریوں میں جنکو کامل پا اُن سے پند حاصل کر۔

ہے باپ کا نام خوف اسکے — وحشت ماں اسکی خوب سن لے

اس کے باپ کا نام خوف ہے۔

جو شخص اپنے سکون دل کو — دیتا ہے تلاش مال میں کھو

(۱۹) قافیہ :-

کم ہے اعلیٰ صفات میں یوں — در پردہ ہے ورنہ کھوٹ میں کیوں

کیا تلفظ کے اعتبار سے دونوں قافیے صحیح ہیں

جس سے پہلے ہے گڑگڑانا — ہے بعد میں اس پہ بڑبڑانا

(۲۰) زبان کے پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دے اس کے خلاف کیوں گواہی — لا اس کے چلن پہ کیوں تباہی

بچ خلقی رفیق تیرا — عشرت کا کبھی کبھار پھیرا

کیا کبھی کبھار ثقات اور فصحا کی زبان ہے؟

جس کے اعزاز سے کہ ہر دم — بڑھے ترے دل پہ غصہ و غم

یہاں کاف بیانیہ کا کیا محل ہے؟

دنیا کی ہوا کے بستیوں کو — کرنے لگے..... پرستیوں کو

واجب باتوں میں کر نہ اہمال — ہو موت کا خوف بھی تو کر ڈال

(۲۱) خوش طعم بھنا ہوا وہ قیمہ — کھائے تو ہو حاملہ عقیمہ

بھنا ہوا قیمہ کھا لینے سے عقیمہ حاملہ بھی ہو سکتی ہے؟

(۲۲) پیاری دلکش وہ مسکراہٹ — شرمائے لجائے پاکے آہٹ

شیریں وہ ان لبوں کے بوسے — زنبور عسل بھی دل سے سوسے

سینے پہ [illegible] ابلے ہے — وہ پھول دھرے ہوئے کنول کے

حسینہ کے صفات حسن بیان فرماتے ہوئے یہ شعر بھی ارشاد ہوئے ہیں۔ کسی عشقیہ مثنوی میں یہ اشعار شاید بے محل نہ ہوتے، مگر ایک اخلاقی کتاب میں جس کی نسبت ارکان اکیڈمی سے یہ خواہش بھی کی گئی ہے کہ

بن کر جزو نصاب تعلیم — کا [illegible] خلق ہوں مفاہیم

یقیناً سب بچے پڑھیں گے اور لطف اندوز ہوں گے۔ اور مدرسین بھی نہایت بے باکی سے وضاحت سے سمجھائیں گے۔ کاش عفت و حیا کی تعریف پر اکتفا کی گئی ہوتی۔

(۲۳) [illegible] مگر ایک کہنہ مشق شاعر ہمیشہ اپنی نظم کو سلاست کا

کا لباس پہنانے کے لیے اس سے پرہیز کرتا ہے۔ مگر اس مثنوی میں بہ کثرت یہ خامی پائی جاتی ہے۔ بشیتر اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بتکلف ترجمہ کیا گیا ہے۔ تعقید، ایطا، حشو، ضعفِ تالیف، استعمالِ متروکات، یہ سب اس میں کثرت سے موجود ہیں۔

جناب صفیؔ کا کلام اسوقت تک نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر نہیں کسا گیا، دیوان وغیرہ شایع ہو تو حقیقت کا انکشاف ہو۔ اسوقت تک کانفرنس کے پنڈال کی آواز میں صوت کے دل و دماغ میں گونج رہی ہیں۔ یہ مثنوی ایک دوست سے عاریتًہ لی تھی۔ چنانچہ اُنکی طلب پر اُنھیں واپس کردی۔ اب پھر مل جائے تو اول سے آخر تک پڑھ کر اپنی ناچیز رائے ہدیۂ ناظرین کروں۔

سید مجتبیٰ حسن موسوی فاضل غازیپوری

غزل حکیم جگر صدیقی بسوانی

رو کے ہم گورِ غریباں کا سماں دیکھا کیے
دیر تک یارانِ رفتہ کے مکاں دیکھا کیے

دُور سے اے قاتلِ نامہرباں دیکھا کیے
قتل سب ہوتے رہے ہم ناتواں دیکھا کیے

باغباں تونے جلایا آشیاں جلتا رہا
اور ہم حسرت سے سوئے آشیاں دیکھا کیے

دَم نکلنے کا تماشا دیکھنا منظور تھا
دَم نکلتا تھا ہمارے مہرباں دیکھا کیے

قیدیِ کنجِ قفس ہیں کیا رہائی کی امید
حسرتِ گلشن میں خوابِ آشیاں دیکھا کیے

حشر میں پھر کچھ اشارہ اپنی رحمت سے کیا
پہلے وہ فردِ گناہ عاصیاں دیکھا کیے

لاکھ پردوں میں چھپایا تونے اپنے حسن کو
دیکھنے والے تجھے لے جانجاں دیکھا کیے

دل نہیں زخمی ہوا ناوک کلیجے پر پڑا
دیکھنا لازم کہ مصر تھا کہاں دیکھا کیے

نزع کا عالم رہا ہم کروٹیں لیتے رہے
اور بالیں پر مسیحِ مہرباں دیکھا کیے

رفتہ رفتہ ہو چلا پیدا نشیمن کا خیال
پہلے کچھ دن ہم نگاہِ باغباں دیکھا کیے

شمعِ جاں افروز ہو کر چارہ سازی کیوں نہ کی
آپ گل ہوتے چراغِ بزمِ جاں دیکھا کیے

دل کے ٹکڑے ہم تو رو رو کر جگر چنتے رہے
اور ہنس ہنس کر ہمارے مہرباں دیکھا کیے

سفر نامۂ اندلس

نمبر (۳)

اصل مضمون کو ہاتھ لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر چند ابتدائی باتیں ایسی بیان کر دی جائیں کہ وہ اُس کو سمجھنے میں کچھ مؤید ہوں۔

مالک الملک حقیقی نے اسپین کو کچھ ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں کہ اور ملک اُس سے محروم ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ قرنہا قرن گزر گئے کہ اس مُلک کے حدود اربعہ وہی ہیں جو شاید ازل سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اسکو قدرت کاملہ نے وہ فوائد عطا فرمائے ہیں جنکی مثال اور ملکوں میں کم ملتی ہے۔ ایشیا اور یورپ کے تمام مال تجارت کو اس ملک سے ہو کر جانا ناگزیر ہے۔ چونکہ اسکو تین طرف سے سمندر نے گھیر رکھا ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو صرف ملاح بننا بلکہ سپاہی رہنا پڑتا ہے۔ اراضی سیر حاصل ہیں اور آب و ہوا بمقابلہ یورپ کے گرم۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار نہیں ملے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں کی آبادی ایک کروڑ ننانوے لاکھ پچاس ہزار (یا دو کروڑ) تھی۔

پنجاب کے مقابلہ میں کم اور اور ممالک یورپ کے مقابلہ میں یہاں دریا زیادہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اور ممالک کمی تعداد پر بھی اپنے دریاؤں سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہلِ اسپین بہت ہی کم کام لیتے ہیں۔ یہی حالت یہاں کے بنادرگی ہے کہ باوجود ضرورت انکو تجارت بحری کے کام کا نہیں بنا سکے ہیں۔

پہاڑ بھی بہت ہیں اور بڑے کام کے۔ اُن سے فنیقیہ والوں اور مسلمانوں نے جو کچھ کام لیا وہ لیا لیکن آج کل تو وہ بیکار پڑے ہیں۔ یہی حال سطح زمین کا ہے کہ بقول مولوی حالی مرحوم کے

"خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر ہے"

وحشی اقوام کا تو حال معلوم نہیں کہ اُنکی کیا حالت تھی؛ مگر مہذب اقوام میں سے سب سے پہلے حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس پیشتر فنیقیہ والوں نے اس سرزمین پر قبضہ کیا اور یہاں کی قدرتی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ ایک وقت آیا کہ انکو یونانیوں سے لڑنا پڑا۔ مگر یہ بوجھی رہا تھا، کہ رومیوں کی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں "نہ نادر بجا ماندنے نادری" نہ فنیقی رہے نہ یونانی، رومی

اس ملک پر مسلط ہوگئے۔ لیکن حقیقی معنوں میں وہ پوری طور سے اس ملک سے بہرہ اندوز نہ ہوسکے تھے کہ شمال کی طرف سے وحشی گاتھوں نے آکر انکو نکال باہر کیا۔ گاتھوں کو بہت کچھ لڑنا بھڑنا پڑا۔ اور اس میں اب تک جتنی صنعت و حرفت ملک میں پیدا ہوگئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی تین سو برس تک گاتھ سپین کے لیے بلاے بے درماں بنے رہے۔ اس طویل عرصے میں ملک نے صرف کچھ اُبھا رہی لیا۔ گاتھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف اتنا تھا کہ اسپین کی عورتوں سے شادیاں کر لیں جس سے ملک کا کچھ کایا پلٹ ہوگیا

ایک مثل مشہور ہے کہ بارہ برس کے بعد گھورے کے بھی نصیب کُھلتے ہیں، یکایک غیرت حق کو جوش آیا اور اس سرزمین پر وہ رحمت الٰہی نازل ہوئی کہ جس۔ کے نشان نہ صرف اس زمین سے بلکہ تمام یورپ، بلکہ تمام دنیا سے نہ مٹنے والے ہیں نہ مٹیں گے۔ یعنی ۷۱۱ء میں مسلمان یہاں پہونچے اور انھوں نے جو کچھ کیا، یہ مجھ سے نہ پوچھیے مبصرین سے دریافت کیجیے۔ نہ معلوم وہ کیا گناہ تھے کہ آخر ۱۴۹۲ء میں اُنھوں نے کوس رحلت بجایا۔ عیسائی قوم کو پھر عنان دولت عطا فرمادی گئی۔ یہ بدبخت آئے تو اذا بطشتم بطشتم جبارین کے پورے مصداق بنے ہوئے۔ انھوں نے اپنی مفتوح قوم کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج وہی لوگ کہ رہے ہیں کہ اچھا اگر دیم بر خود ہیچ نا بنیا نہ کرد۔ اس کا شمہ اگر معلوم ہوسکتا ہے تو میری کتاب "مولدین" سے۔

جس سلطنت کی بنیاد ظلم و ستم پر رکھی گئی ہو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتی ہے! جبار و قہار احکم الحاکمین نے انکو ڈھیل دی، علم الٰہی نے عجیب و غریب اسباب تباہی پیدا کیے۔ ایک منسوخ و مسوخ دین کا غلو ہوا۔ امریکہ دریافت ہوا۔ صنعت و حرفت و تجارت سے غفلت اور محض سپاہیانہ شیخی پیدا ہوئی۔ بادشاہ کے دل میں اپنی عظمت کا غرور پیدا ہوا۔ اسکی کسی کو خبر تھی کہ دیر گیر و سخت گیر در مرتزا۔ اسپین نے ملکہ ایلزبتھ کے زمانے میں ایک بیڑہ انگلستان کے خلاف روانہ کیا، جو ایسا تباہ ہوا کہ اسپین ہی کو لے ڈوبا۔ یہ تاریخ موخرالاسم ملک کیلیے خونیں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ وہ دن اور آج کا دن کہ سلطنت نہ اُبھر سکی ہے نہ اُبھر سکے گی؛ اب چاہے اس میں پریمو ڈی ریویرا پیدا ہوں فرانس سے اتحاد ہو یا غازی عبدالکریم کو بے دست و پا کرکے بٹھا دیا جائے (انشاءالله تعالیٰ) بندگان اسباب و سبب اور حلقہ بگوشان علت و معلول اس ادبار کی کچھ ہی توجیہ کریں؛ لیکن اصلیت ہے تو صرف یہ کہ یہ سب کچھ رد عمل اور رجعت ہے۔ بیگناہوں کا خون رنگ لاکر رہتا ہے اور مظلوموں کی آہیں رد صدا کی طرح بطش الٰہی کو ساتھ لاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان بطش ربک لشدید۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا. فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا۔ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا

مختلف فاتحین نے ملک پر اپنا اثر چھوڑا۔ سب سے زیادہ مسلمانوں نے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی تباہی نے اس ملک کو تباہ کر دیا۔ اس پر غضب ہوا تعصب و غلوء مذہبی کہ آدمی سے زیادہ خلقت اندھی ہو کر خانقاہوں میں ہو نکلی۔ امریکہ دریافت ہوئی اور وہاں آبادی کا بڑا حصہ بھیجنا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کہ وہاں سے دولت آئی، مگر اس نے تعیش کو ترقی دی اور غفلت کو بڑھایا۔ اسکا نتیجہ افلاس ہوا، اور افلاس کا نتیجہ رشوت ستانی اور ملک کے فوائد سے چشم پوشی۔

سطور ذیل میں جو کچھ عرض کیا جائیگا وہ ۱۹۲۴ء کی سہ ماہی اول تک کی حالت کا صحیح نقشہ ہے اُسکے بعد سے اب تک کہ قریبًا چار برس گزر چکے ہیں "داماں خیالِ یار" کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ تاہم انشاءاللہ اس زمانے کے متعلق بھی جو کچھ آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ صحیح ہی ہوگا۔ اب میں سب سے پہلے ملک و قوم کی سب سے بڑی اور ضروری ضرورت تعلیم سے شروع کرتا ہوں۔

تعلیم

کسی ملک میں ان پڑھوں کی تعداد کی زیادتی کے یہ معنی ہیں کہ اُس ملک کی سوسائٹی، من حیث المجموع، ایک گناہ کبیرہ کی مرتکب ہو رہی ہے، اور اُسکی اُسے سزا ملنی چاہیے۔ اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کو اور حیوانات سے ممیز کرنے کے لیے اگر کوئی چیز ہے تو وہ نطق ہے، تو پھر یہ فتوے دینے میں کوئی بھی تامل نہ کرنا چاہیے کہ ملک کو جاہل رکھنا نافرمانیِ الٰہی ہے۔ کیونکہ ہم اُس میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہونے دیتے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچانے۔ پھر مخلوق الٰہی میں بذریعہ تبادلۂ خیالات، اتحاد نہ ہونے دینے سے سلطنت کا گناہ ہے اور اس سب کا بارِ جوابدہی سلطنت کے ذمہ آتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے، جلد یا دیر میں۔

اسپین میں ابتدائی تعلیم کی کمی کے متعلق جنوری ۱۹۲۱ء میں میڈرڈ کے ایک اخبار نے نہایت ماتم دوَل طریقے سے لکھا تھا کہ

"سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مملکت اسپین میں اس وقت دس ہزار ایک سو اڑتالیس ابتدائی مدارس کی کمی ہے۔ ان میں سے ۵۷۱ برسلونہ میں، ۴۳۰ میڈرڈ میں اور ۵۶۱ مرسیہ میں کھلنے چاہییں۔ اور جلیقیہ میں تو ۲۲۸۰ مدارس کی کمی ہے"

یہ وہ کمی ہے جو گورنمنٹ کے ایکٹ متعلقہ تعلیم عامہ کے موافق ایک یا دو سال کے اندر اندر کھلنے

ضروری تھے، مگر ۱۹۲۴ء تک کبھی نہ اس پر کسی نے توجہ کی - مدارس کی یہ کمی ایسی نہیں ہے جو نظر انداز کی جا سکے، اسی سے تو ملک کی تعلیم کا اندازہ لگ سکتا ہے - بلاشبہ اسکے ذمہ دار سلطنت کے ارباب حل و عقد ہیں کہ اعداد و شمار کے چابک سے بھی انکی آنکھیں نہیں کھلتیں - اپنے فرائض سے غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان پڑھوں کی تعداد گھٹنا تو ایک طرف رہا، بڑھتی چلی جاتی ہے - چنانچہ ۱۹۲۱ء میں صوبہ وار تعداد ان پڑھوں کی حسب ذیل تھی :-

صوبہ	فی صد آبادی
سان ٹان ڈیر	۲۶٫۱
بلباؤ	۲۶٫۳
میڈرڈ	۲۸٫۳
ولاڈالڈ	۳۲٫۹
برشلونہ	۳۴٫۹
سارا گوسا	۴۲٫۸
سیویل	۴۸٫۲
بلنسیہ	۵۲٫۳
مرسیہ	۶۲٫۰
لورکا	۸۲٫۵

۱۹۳۱ء میں جب اس کا اخباروں میں بہت شور مچا تو رکا سوا اسکے کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ بجٹ سے یہ جدول ہی اڑا دی گئی اور اب جو کوئی اس مضمون پر اطلاع حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو سخت سرگردانی کرنا پڑتی ہے -

ابتدائی تعلیم کے متعلق ذیل کے اعداد بہت دلچسپ ہیں -

مقام	خرچ تعلیم فی باشندہ	ان پڑھوں کی اوسط
جزائر کناری	۶ آنہ	۵۴
میڈرڈ (شہر)	۸٫۶ آنہ	۲۵
قادیز	۱۳ آنہ	۴۲
جاپان	۸٫۱۳ آنہ	۲۸

مدرسے	مدارس	۲۰
	۱۵ ور	۵۱
برشلونہ (شہر)	۱۹ و ۶	۸
برگوس	۴۶ و ۳	۳
الاوا	۴۹ و ۲	۵
لیون	۵۷ و ۴	۷
سوریا	۶۰ و ۷	۱۰

اگرچہ دارالسلطنت (میڈرڈ) میں ان پڑھوں کی تعداد ۲۵ فی صدی ہونا خود شرم کی بات ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کمی گورنمنٹ کی سعی و کوشش کی وجہ سے ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ عوام الناس نے اپنی مدد خود کی۔ بعض حالت اور مقامات، مثلاً یہاں، برشلونہ، برگوس کی ہے، کہ لوگوں نے پرائیوٹ اسکول کھول رکھے ہیں اور ان کا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔

یہ تو ابتدائی تعلیم کی کیفیت تھی، ثانوی تعلیم کی یہ کیفیت ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ثانوی مدارس ۰۰۰ میں طلبہ کی تعداد ۲۱۶۹۵ تھی۔ ان میں سے ۳۱ فی صدی مدارس سرکاری میں پڑھتے تھے۔ اور ۶۹ فی صدی پرائیوٹ اسکولوں میں۔ خود میڈرڈ میں کل ۱۵ فی صدی طالب علم گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتنے بڑے دار السلطنت میں صرف تین گورنمنٹ اسکول ہیں، حالانکہ ضابطہ کے موافق کم از کم دس اسکول ہونے چاہییں۔ اگرچہ اسپین اور انگلستان کا مقابلہ کرنا بیجا ہے، کیونکہ اگر ایک ذرہ ہے تو دوسرا آفتاب، لیکن صرف اندازہ لگانے کے لیے میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ انگلستان کی تعداد آبادی اسپین سے دوگنے کے قریب ہے۔ لیکن وہاں گورنمنٹ اسکولوں کی وہ کثرت ہے کہ کم از کم دس لاکھ طلبہ صرف گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ پرائیوٹ اسکول، یعنی وہ جو چندہ سے چل رہے ہیں اُن میں تعداد متعلمین بہت زیادہ ہے۔

بقول سینور لورنیزو کے یہ ظاہر ہے کہ صرف امراء کے لڑکے یا وہ کمبخت کے مارے جو یونیورسٹیوں میں پڑھنا چاہتے ہیں وہ تو ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں باقی ابتدائی تعلیم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اسکی حالت آپ کے سامنے موجود ہی ہے۔

اب اعلیٰ تعلیم کی کیفیت دیکھیے۔ تمام مملکت اسپین میں بارہ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان سب یونیورسٹیوں کے طالبعلموں کی مجموعی تعداد ۲۳۲۲۳ ہے۔ میڈرڈ کی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ تعداد طلبہ ہے، یعنی ۹۳۳۰۔ اور ۔۔۔ میں سب سے کم یعنی کل ۵۸۱

اساتذہ کی قابلیت کا بنا ہر کوئی معیار مقررہ نہیں ہے۔ کچھ خوشامد، کچھ چرب زبانی اور بہت کچھ فرقہ بندی پر دارومدار ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لیے پروفیسری تک ترقی یاب ہوگئے کہ وہ ایک خاص پولیٹکل خیالات کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسوقت برسر عروج تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جیسے ہی انکا زوال ہوا یہ پروفیسر بھی ختم ہو جائیں گے۔ ۱۹۲۳ء میں وزیر تعلیم نے اساتذہ کے تقرر وغیرہ کے لئے کچھ قواعد جاری کیے اور ایک بورڈ بنایا ہے۔ مگر جو لوگ کہ اسپین کے نظم و نسق کا تجربہ رکھتے ہیں وہ بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بالکل بے نتیجہ رہے گا۔

جن عمارات میں کہ اسکول ہیں اُنکے متعلق ایک اخبار نے بہت صحیح لکھا تھا کہ "یہ عمارات کیا ہیں خاصے اچھے نکرہ قید خانے ہیں، بہت تاریک، سخت گندے، یہیں طرح طرح کی وباؤں اور بیماریوں کے کیڑے پلتے ہیں اور ہماری تازہ نسلیں اُنکا شکار ہوتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سرٹیفکیٹ وغیرہ یہ طالب علم ان مدارس سے محنت کے بعد حاصل کرتے ہیں وہ اُنکے کس کام کے ہیں۔ کیونکہ ان عمارتوں سے نکل کر اُنکی عمر ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ جو لوگ ان مدارس کو جانتے ہیں وہ اسکے طلبہ کو سخت ذلیل سمجھتے ہیں۔ مجبوری تو صرف یہ ہے کہ ملک میں صرف یہی مدارس ہیں اور یہی طلبہ کہ انھیں کو ملازم رکھنا پڑتا ہے ......"

۱۹۲۱ء میں ملک محروسہ کے سرکاری اسکولوں کے ۱۹۰ انسپکٹر تھے۔ اتفاق سے یہ لوگ بہت دیانتدار اور محنتی لوگ تھے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے میڈرڈ میں ایک کمیٹی کرکے بہت سی اصلاحات تجویز کیں۔ عوام الناس سے بھی بہت سے اُنکے ساتھ شامل ہوگئے اور مختلف مقالات پر اس موضوع پر انھوں نے لکچر بھی دیے۔ لیکن شروع ۱۹۲۵ء تک تو یہ سب کچھ بے نتیجہ ہی رہا۔

دوران بحث و تحقیق میں ان انسپکٹروں نے یہ امر ثابت کر دیا کہ ۱۹۲۱ء میں اسپین نے بمقابلہ ۱۸۵۵ء کے کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ رجعت کی ہے۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں کل ۱۸ اگورنمنٹ اسکول درج فہرست تھے۔ اسی فہرست میں ہر ایک سکول کے اساتذہ کے نام بھی تھے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے شاید ایک ہی دو کو عالم وجود میں آنے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اُنکے لیے مکان ہی کوئی نہ تھا۔ (صحیح یا غلط) اندازہ ہے کہ اکیلے میڈرڈ میں بیس ہزار طالب علم ایسے ہیں کہ وہ اس وجہ سے اسکول نہیں جاسکتے کہ اُنکے [illegible] پڑھانے کی جگہ نہیں ہے۔

اب صنعتی تعلیم کو لیجیے - میڈرڈ کا ٹیکنیکل اسکول بہت اچھا ہے اور اسکا عملہ بھی لائق ہے
اور سامان بھی برا نہیں - مگر اس میں صرف کتابی تعلیم دی جاتی ہے - ایک کیتھیڈرل میں، جو تنگ ہونے
کے علاوہ اتنا پرانا ہے کہ برسات میں یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں پروفیسر اور طالب علم اسی کے نیچے
دب کر نہ رہ جائیں - عملی تعلیم کے لیے ورکشاپ اسکول کے قریب ہی ہونا چاہیے اور یہاں شاید
ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے - اور وہ بھی اتنا تنگ ہے کہ اس میں کل کلیں نہیں لگائی جا سکتیں -

اسپین میں بڑی مصیبت فرقہ بندی کی چلی آتی ہے - ہر چیز اور ہر عمل اسی سے وابستہ ہے -
غریب اساتذہ کی حالت اس فرقہ بندی کی وجہ سے متزلزل رہتی ہے - اس پر غضب ہے تعصبات
مذہبی، کہ جن کی وجہ سے اکثر مقامات پر استادوں کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے - استانی ہو یا استاد،
تنخواہ اچھی نہیں پاتے، اور جس مقام میں اسکول ہے وہاں کے رہنے والے انکی کوئی قدر نہیں
کرتے، بلکہ انکو تابعِ فرمان رکھنا چاہتے ہیں - ان غریب استادوں کو بہت کچھ اپنی ہی جیب سے
اسکول اور طالب علموں پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور وہ رقم انکو سرکار سے ملتی ہے نہ گاؤں والوں سے
وصول ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ اساتذہ اگر کچھ روپیہ اپنی گرہ سے خرچ کریں تو کس امید پر -

یہ ساری خواریاں تو دورانِ ملازمت کی ہیں - آدمی انکو بھی اس امید پر برداشت کر لیتا
ہے کہ بڑھاپا ہی بے فکری سے گزریگا - اسکی یہ گت ہوتی ہے کہ ایک استاد کو مرسینیہ واقع صوبۂ
اشبیلیہ سے ۴۹ برس کی ملازمت کے بعد پنشن ملی - انکی بدقسمتی کہ ان کے اور گورنر صوبہ کے پولیٹکل
خیالات نہیں ملتے تھے - یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ باوجود کوشش انکو زرِ پنشن وصول نہیں ہوا - اس سے
زیادہ بدقسمتی یہ کہ گورنر دس برس اس صوبہ میں رہے - آخر جب بیچارے بڑھے کے بھلے دن
آئے اور وہ گورنر تبدیل ہوئے تو انکو پنشن ملنے لگی مگر نصف، اور وہ بھی ایک شخص کی ذمہ داری،
لے لینے پر، کیونکہ دفتر خزانہ کو باوجود تلاش انکے کاغذات پنشن نہیں ملے -

ایک اور بڑا جرم پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم ہے - انگریزوں، جرمنوں، فرنسیسیوں وغیرہ نے
اسکول جاری کر رکھے ہیں - یہ ہمارے اسکول ملکی اسکولوں سے ہر طرح اچھے ہیں - مگر ظاہر ہے کہ یہ سارے
پروٹسٹنٹوں کے ہیں - دو سال اسی شور و شغب میں بیکار صرف ہو گئے کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ ان
تمام اسکولوں کو توڑ دے - اس میں ناکامی لازمی تھی، اور ہوئی -

تعلیم کی مصیبت تو الگ رہی اور اسکو غیر مذہب کے لوگوں سے حاصل کرنا کسی قدر خطرناک
ہے، مگر لطف یہ ہے کہ اسپین والے اپنے لڑکے Y.M.C.A. میں محض اس بنا پر نہیں [illegible]

دیتے کہ وہ پروٹسٹنٹ لوگوں کی تحریک ہے - اس ایسوسی ایشن نے اسپین میں اپنے پاؤں
نے شروع کیے تھے کہ جناب پوپ نے ایک فتوےٰ صادر کرکے اسکے خطرات سے ملک کو آگاہ
اور ایسی مفید ایسوسی ایشن کو وہاں نہیں چلنے دیا گیا - مذہبی خیالات کے متعلق شاید مجھے ابھی
کہنے کی ضرورت پڑے -

غرض تعلیم کی یہ صورت ہے اور یہ امیدیں ہیں - اس پر قتلونیہ میں سوراج کا شور مچا ہوا ہے -
یہ ہے کہ کیا اسی لیاقت پر ملک اُنکے حوالہ کیا جا سکتا ہے؟ آہ! یہ وہی ملک ہے کہ جہاں
دریا بہ رہا تھا، اور ہر کس و ناکس بلا لحاظ مذہب و قومیت و رنگ اُس سے مستفیض ہوتا
اسی ملک کے سائنس و فلسفہ سے یورپ اب تک سیراب ہو رہا ہے - یہاں کے علماء کے
میں آنکھیں بچھائی جاتی تھیں اور طالب علم آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے -

حفظانِ صحت، مکانات اور صفائی

کسی قوم کی شائستگی کا اندازہ اُنکے مکانات، حفظ صحت اور صفائی دیکھ کر لگ سکتا ہے -
ہے کہ اہالیِ اسپین اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے - اتنا ضرور ہے کہ اس سے راجا اور
حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - یہ بہت دلچسپ مضمون ہے - اسی سے معلوم ہوگا کہ
کا یورپ میں کیا درجہ ہونا چاہیے - میں ایک مرتبہ پھر یہ یاد دلاتا ہوں کہ میں اسپین کا مقابلہ
سے کر رہا ہوں، نہ کہ ہندوستان سے، جو غلاموں کا ملک ہے، اور یقیناً اکثر باتوں میں
سے بھی بدتر ہے - میں ذیل میں صرف میڈرڈ کا ذکر کروں گا اُسی سے اور شہروں کا اندازہ
سکتا ہے -

پچھلی جنگ میں دو ہی ملکوں نے سب سے زیادہ نفع اُٹھایا؛ جاپان اور اسپین نے -
ت یہ ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کمایا اُسکو بیشتر اپنے قصبوں یا شہروں کی تزئین میں لگایا - چنانچہ
قبل از جنگ کے میڈرڈ اور موجودہ میڈرڈ میں زمین و آسمان کا فرق ہے - اسپین کے اچھے
ملک کا ٹیکہ اُسکے بدنام دار السلطنت کی وجہ سے لگا ہوا تھا وہ بہت کچھ دھل گیا ہے -
ان خوبصورت مکانات بن گئے ہیں؛ کشادہ سڑکیں نکل آئی ہیں؛ پرانے مکانات کی مرمت اور
یاں ہوگئی ہیں؛ بجلی کی روشنی، بجلی کے لفٹ، ٹیلیفون وغیرہ لگ گئے ہیں؛ میونسپلٹی
لکھنؤ کی ویسی ہی میڈرڈ کی؛ میڈرڈ اور لکھنؤ کی سڑکوں میں بہت کم فرق تھا - اب ان دونوں

میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ میڈرڈ کی میونسپلٹی بہت جلد جاگ اُٹھی کہ اُس نے میڈرڈ کو شہر بنا دیا اور لکھنؤ کی میونسپلٹی ابھی خرّاٹے ہی لے رہی ہے، اور شہر کو گاؤں سے بدتر بنائے ہوئے ہے میڈرڈ کے ہوٹل جنگ سے پہلے لکھنؤ کی سرائیں تھیں اور اب حقیقی معنوں میں ہوٹل ہیں - غرض ہر جگہ "لیسا غنیمت" معلوم ہوتی ہے -

لیکن یہ جو کچھ ہے بیرونی و سطحی نمائش اور فریب نظر بندی ہے - کوئی شخص اگر کوئی مکان کرایہ پر لینے کے لیے بہت سے مکانوں کو دیکھتا ہے تو ہر جگہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتا ہے کہ اس مکان میں وہ اور اُسکا خاندان تندرست بھی رہ سکتا ہے یا نہیں ؟ اسی سوال سے تمام ترقیات کی قلعی کھل جاتی ہے -

۲۲ - نومبر ۱۹۲۱ء کے ایک اخبار میں ایک مشہور شخص نے ایک مضمون لکھا تھا - میں اُس کا خلاصہ لکھتا ہوں - اس سے ان تمام ترقیات کی کیفیت معلوم ہوگی :-

"جو مکانات کہ آج کل شہر (میڈرڈ) میں اتنی جلدی جلدی بن رہے ہیں، وہ فی الحقیقت پنجرے ہیں - ان پنجروں کی اکثر چار چار منزلیں ہیں - ان میں ایسا ناقص مسالا لگایا گیا ہے کہ اکثر یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ یہ چار منزلیں کس چیز کے زور پر کھڑی ہیں - ان میں لفٹ، ٹیلیفون اور غسل خانہ سب کچھ ہیں لیکن یہی آرام دہ چیزیں تکلیف اور مایوسی کا باعث ہو جاتی ہیں مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لفٹ میں اُتر یا چڑھ رہا ہے کہ بجلی بند ہو گئی - اب یہ شخص ہوا میں معلق لٹک رہا ہے، کیونکہ کوئی اور ذریعہ بوقت ضرورت لفٹ سے کام لینے کا نہیں بنایا گیا ہے - ٹیلیفون پر باری آنی مشکل ہے، اسکے استعمال کے لیے وقت کی کوئی تحدید نہیں - اسپین کے لوگ ٹھیرے باتونی، اب جو اُنھوں نے باتیں شروع کیں تو کسی طرح ٹیلیفون چھوڑنے کا نام نہیں لیتے - غسل خانہ یا حمام کی یہ کیفیت ہے کہ ایک پورا اقلیا کوٹوں کا خرچ کیجیے تو اُس سے فائدہ اُٹھایئے - ایک عورت دیوار میں کیل ٹھونک رہی تھی کہ دیوار میں آر پار سوراخ ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی سیروں مٹی فرش پر آ رہی - دیواریں اور چھتیں اتنی پتلی بنائی جا رہی ہیں کہ ایک گھر میں جو باتیں ہو رہی ہوں وہ دوسرے گھروں میں بے تکلف اور بخوبی سُنی جاتی ہیں - گانے بجانے کی آواز تو سرود خانۂ ہمسایہ سمجھ کر قابل معافی ہو سکتا ہے، مگر بچوں کے کھیلنے، کودنے، شور مچانے، ہر قسم کی شرارت کرنے کی آواز تو نیند میں خلل انداز ہوتی ہے - اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان نازک مکانات سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اب میاں بیویوں میں لڑائی ذرا سوچ سمجھ کر ہوتی ہے -

بعض محلہ کی آبادی کی یہ حالت ہے کہ ایک جگہ کے متعلق رپورٹ ہے کہ ۱۵ مکانوں میں ۴۲۲۵ آدمی رہتے ہیں! اس پر صفائی کی طرف سے بے اعتنائی جو نتیجہ پیدا کرے گی اُسکے قیاس سے بھی گھن آتی ہے! نتیجہ کیا ہے؟ یہ کہ تپ محرقہ کے جراثیم میڈرڈ میں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں تپ محرقہ سے جو اموات دار السلطنت میں ہوئیں وہ ماہ بماہ حسب ذیل ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ صحیح تعداد نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ وہاں اس مرض کو بہت کچھ چھپایا جاتا ہے :-

مہینہ	تعداد	مہینہ	تعداد
جنوری	۶۲	جولائی	۲۹
فروری	۲۹	اگست	۵۸
مارچ	۴۱	ستمبر	۴۲
اپریل	۶۵	اکتوبر	۴۱
مئی	۳۵	نومبر	۲۵
جون	۲۹	دسمبر	۳۹
میزان کل	۵۰۵	میزان کل	۵۰۵

میری رائے ناقص میں ایک ہزار آدمی سالانہ تپ محرقہ سے میڈرڈ میں ضرور مرتے ہیں۔ اور یہ سب نتیجہ ہے صفائی سے بے پروائی کا۔ لطف یہ ہے کہ اس پر بھی میڈرڈ بہت صحت افزا شہر سمجھا جاتا ہے! لاہور صاف شہروں میں نہیں سمجھا جاتا۔ میڈرڈ اور لاہور کی آبادی میں کچھ بہت فرق نہ ہوگا۔ لیکن مجھے امید نہیں پڑتی کہ وہاں اتنی اموات تپ محرقہ سے ہوتی ہوں۔ مگر یہ شرف صرف میڈرڈ ہی کو حاصل نہیں، تمام اسپین میں تپ محرقہ کی یہی حالت ہے۔ اسی سال (علاوہ میڈرڈ کے) تمام اسپین میں تعداد اموات اس مرض سے ۲،۰۳۹ تھی۔ اب اس صاف شہر کے پانی کا حال سنیئے۔ ۲۹ - دسمبر ۱۹۲۱ء کو ایک اخبار نے لکھا کہ "پینے کا پانی ایسے مقام سے لیا جاتا ہے کہ جہاں تمام میڈرڈ کے گندے نالے آکر ملتے ہیں۔ اس پانی کو صاف بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ شہر کی امانت سمجھ کر شہری کو پہونچا دیا جاتا ہے" یہ شکایت برسوں سے چلی آتی آتی ہے۔ اور کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ۱۹۲۱ء میں اس پر توجہ دلائی گئی۔ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوا۔

۲۔ چہ بچہ اور کچے گڑھے کوڑے کرکٹ کے لیے اب تک اکثر و بیشتر مکانات میں موجود ہیں۔

۳۔ جن میں پیشاب و پاخانہ جمع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک حکم جاری ہوا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر انکو ہٹا دیا جائے۔ مگر سنہ ۱۹۲۴ء تک اسکی تعمیل نہیں ہوئی، اور یقیناً اب تک نہیں ہوئی ہوگی۔ صفائی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز گاڑیاں آتی ہیں اور وہی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ گندگی اور بدبو پھیلتی ہے۔

تو مجبوری ہے اور بیماری بڑھتی ہے تو بڑھا کرے۔ جو لوگ کہ لاہور میں رہتے ہیں یا رہ آئے ہیں، وہ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ طریقہ کیا مصیبت لاتا ہے۔ ہندوستان گندوں کا ملک ہے اور لاہور غلاموں کے ملک کا ایک حصہ۔ یہاں تو ہندوستانیوں کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے، مگر یورپ کے ایک دارالسلطنت کے لیے تو یہ جتنا کچھ شرمناک ہے وہ قابل بیان نہیں۔

یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اسپین میں مہترانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ غریب اپنے سروں پر کوڑا اُٹھا کر لے جاتی ہیں، اور کوڑیوں پر پھینکنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے ایسی چیزیں نکال کر الگ کر لیتی ہیں جو بازار میں بک سکیں۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ناظرین اسکو گوارا نہ کریں گے تو میں بتلاتا کہ کیا کیا چیزیں علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی ہیں، لیکن سب صاحبوں سے معافی مانگ کر اتنا مجھے بتلانے دیجیے کہ وہاں یہ دستور ہے کہ باسی کھانا کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ مہتر کوڑے میں سے کھانا الگ کر لیتے ہیں، اور مزے سے وہیں بیٹھ کر اُس کو کھاتے ہیں۔ مسٹر ڈیکن کہتے ہیں کہ یہ ملک اسپین کے افلاس کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسیحیت کے بھی تو بہت سے نام ہوسکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہی مسیحی اتنے سخت مسیحی ہوتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ تاہم گراں چہ رسد۔ اس خصوص میں ایک یہ بات قابل تعریف ہے کہ ہندوستان کی طرح یہ لوگ اچھوت نہیں سمجھے جاتے! کوڑے کی گاڑیوں کے مالک اور اُن پر کام کرنے والے پنجاب میں رائین ہوتے ہیں اور اسپین میں مالی۔ بات ایک ہی ہے، صرف نام کا فرق ہے۔ دونوں جگہ اس سے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں سینور گارسیا کورٹیس نے اپنے ایک لکچر میں بتلایا تھا کہ "حدودِ شہر میڈرڈ کے باہر ایک لاکھ آدمی آباد ہیں، اور یہ آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ باوجود اسکے وہاں ایک بھی گندہ نالہ نہیں ہے۔ نہ گندگی جلانے کا کوئی انتظام" وہ وہاں کے باشندوں، گورنمنٹ اور میونسپلٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ تم لوگ ایک یوروپین سلطنت کے رہنے والے ہو مگر کون سنتا ہے کہانی میری۔

اس گھناؤنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے مجھے ڈون رابرٹو کاسٹرو ویڈو کے مضمون کا ایک فقرہ نقل کر لینے دیجیے۔ یہ مضمون لادوز ہے La Voz. اخبار میں چھپا تھا جو میڈرڈ سے نکلتا ہے :—

"باشندگان شہر (میڈرڈ) گندے اور گھناؤنے ہیں میں اپنے شہر کے رہنے والوں کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا، ورنہ میں کہتا کہ انکی عادتیں سوروں کی سی ہیں۔ کٹھملوں اور جھینگروں کے مارے

چٹائیاں (دریاں) قالین، بستر جھاڑے جاتے ہیں۔ یہ بستر اور دریاں اکثر اُن لوگوں کی ہوتی ہیں جو تپ محرقہ، سل، خسرہ یا لال بخار کے مریض ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف گندگی بلکہ جراثیم روٹیوں کے ٹکروں اور مٹھائیوں کی قابوں پر دانستہ ڈالتے ہیں، جو کھلے منہ بہتے ہیں۔ جو مکانات یا دوکانیں پہلی منزل پر ہوتی ہیں اور دوسری منزل کی کھڑکیوں وغیرہ سے گلیوں اور راستوں میں باسی کھانا، لیڈیوں اور بچوں کے بال، ہر قسم کے پھلوں کے چھلکے .... پھینکے جاتے ہیں۔ صفائی کی سخت ضرورت ہے؛ مگر جھاڑو سے نہیں، بلکہ لوگوں کو صفائی کی تعلیم دیکر۔ مدارس میں اسکے لیے خاص انتظام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور بہتر نگرانی کی۔ جرمانے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ اکثر با اثر لوگ جرمانہ نہیں ادا کرتے اور سفارشوں کے ذریعہ سے دوسروں کو ادا نہیں کرنے دیتے۔"

شرح اموات اگر حکام دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتے۔ یہی شرح اُنکی ناقابلیت اور لاپروائی کا پورا ثبوت ہیں۔ اب خواہ اس میں گورنمنٹ کے حکام ہوں یا میونسپلٹی کے۔

میڈرڈ کی شرح اموات کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹۱۱ء میں ۲۳،۴۰ فی ہزار تھی اور ۱۹۱۴ء میں ۲۶،۲۰۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک اوسط اموات ۲۴،۸ فی ہزار رہی ہے۔ اگلے پانچ برس میں ۱۹۱۷ء میں ۲۴،۰۲ اور ۱۹۱۸ء میں ۲۹،۰۲۔ اور اوسط اموات ۲۶،۰۷ فی ہزار رہی ہے؛ یعنی بقدر دو موتوں کے بڑھ گئی ہے۔ ان ہی سالوں میں یورپ کے اور تمام دار السلطنتوں کی شرح اموات میں برابر کمی آتی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں میڈرڈ کی شرح اموات ۲۲،۳۹ تھی اور لنڈن کی ۱۲،۰۶۔ اس سنہ میں کل تعداد اموات ۱۶۱۱۸ تھی۔ ان میں سے ۳۰۹۸ صرف ایک سال سے کم کے بچے تھے۔

میڈرڈ کی آبادی کم و بیش دس لاکھ کی ہے۔ اس میں ایک بھی حمام نہیں؛ اور ہو بھی کیونکر سکتے ہیں۔ یہ تو کُفّار (یعنی مسلمانوں) کی نشانیاں ہیں۔

ایک زمانہ میں، جو خواب و خیال ہوگیا ہے، قرطبہ بھی دار السلطنت تھا۔ اُسکی صفائی وغیرہ کا حال دیکھنا ہو تو میری کتاب اخبار الاندلس ملاحظہ کیجیے۔ مختصر یہ ہے کہ یہی زمانہ تھا جب اہالی اندلس کہا کرتے تھے کہ "یہ مسلمان بھی عجب احمق لوگ ہیں کہ عاقبت میں جنت کے

ھ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ مجھے "خسرہ" کہنا چاہیے یا "کھسرہ"؟ کوئی صاحب اسکو صحیح کرلیں۔

۵ شاید اصل لفظ "قصب" ہے۔

امیدوار ہیں۔ کیا قرطبہ اور اشبیلیہ میں انکے مکانات ہیں زندگی ہی میں جنت اور انکی حوریں حور رہتی ہیں؟ سچ ہے۔
ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم۔

سیاسیات اور رعایا

(۱)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی اپنی ایک عجیب و غریب مخلوق بنایا ہے۔ یہ کفور و ظلوم و جہول مخلوق کسی کے قابو میں نہیں آتی۔ دُور کیوں جایئے، جب خدا کی نہیں تو اور کس کی ہوگی۔ اگر اسکو ڈھیل دیجیے تو اسکو بغاوت کی سوجھتی ہے، اور اگر ذرا پیچ کس دیجیے تو شکایتوں کی بھرمار کرتی ہے ان تحملہ یلہث او تترکہ یلہث۔ اتنے بڑے ہاتھی کے لیے بڑے آنکس کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا رجحان وحشت کی طرف ہوتا ہے؛ گویہ نہ سوچے کہ وہاں بھی آزادی نہیں ہے۔(آزادگی حرفے است یہاں ہے نہ وہاں ہے) اس کی خیریت اسی میں ہے کہ یہ پابند ہوکر رہے۔ اور اسکے جکڑ بند سخت رہیں۔

اسپین میں وفور جہالت کی کیفیت معلوم ہو ہی چکی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں "پیشہ ور سیاست داں" بہت زیادہ ہیں۔ اور وہ لوگ ضرورت وقت کا احساس نہیں رکھتے۔ کنزرویٹو، لبرل، ری پبلکن تو ہیں ہی، کلیسیا کے اقتدار نے اور بھی کار فرما جزائی پیدا کر رکھی ہے۔ اول تو ہوشیار لیڈر۔ وہاں آٹے میں نمک ہیں، اور جو ہیں وہ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بہرحال سیاسی معاملات میں کچھ نہ کچھ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ وہاں کا کانسٹی ٹیوشن ایسا عجیب غریب ہے کہ دنیا میں اپنی آپ مثال ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے دماغ پر سخت زور ڈالنا پڑتا ہے میں اس سے قطع نظر کرکے موٹی موٹی باتیں اور اصلی حالت بیان کرتا ہوں۔

وہاں ایک گروہ نئے خیالات کو لے کر، بڑے بڑے دعووں اور اچھی اچھی امیدوں کا سبز باغ دکھا کر پیدا ہوا اور اپنی عظمت کا مرثیہ پڑھ چکا۔ ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ ہم غرباء کی مدد کریں گے اور لوگوں کی تکالیف و مصائب کم کریں گے۔ اتنا وعدہ بھی کافی تھا۔ غول کے غول اُنکے جھنڈے تلے آگئے۔ مگر چند ہی روز بعد اُنکی پول کھل گئی۔ اور لوگ اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہے۔ بدعملی پھر شروع ہوا۔ جو لوگ طاقتور تھے وہ پھر برسرکار آگئے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن لوگوں نے اس امید کو صبر نہیں کیا کہ کہیں ظلموں سے نجات ملیگی اور

اطمینان نصیب ہوگا۔ چنانچہ سوشلسٹ گروہ پیدا ہوا۔ انھوں نے ناکامیاب ری پبلکن سے بیزاری و
بے تعلقی ظاہر کی۔ خصوصاً اس لیے کہ ان کا طرز عمل شاہی اقتدار قائم رکھنے کی طرف مائل تھا اور
یہ اُنکے دعوے کا صریح منافی تھا۔ اس نئے گروہ میں وہ لوگ زیادہ تھے جو کمیونسٹ فرقہ کے
خیالات رکھتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا سفر بہت طویل تھا، اور یہ اسپین جیسے ملک کے مناسب
حال نہ تھا۔ آخر اُنھوں نے یہ دیکھ لیا کہ امن وامان کے ساتھ اصلاحوں کا حاصل کرلینا ناممکن
محض ہے۔

ری پبلکن پارٹی ضعیف ہو ہی چکی تھی گو اُنکا دعویٰ اور دم خم وہی تھا، مگر اُن میں سے جو ہوشیار آدمی تھے اُنھوں نے
اسی میں خیریت دیکھی کہ وہ "آزاد شاہ پسند" ہو کر رہیں۔ اسکی وجہ بظاہر یہی تھی کہ اُنھوں نے
یہ دیکھ لیا تھا کہ کنسرویٹو گروہ کے فولادی پنجے سے وہ چھوٹ نہیں سکتے کیونکہ یہ گروہ جو کچھ کرتا تھا
قانون کے اندر رہ کر۔ پچھلی لبرل گورنمنٹ یکایک بر روے کار آگئی، اُنکے لیے کوئی امید تو تھی
نہیں، مگر کنسرویٹو حکومت کی بے اعتدالیوں نے انکی یاس کو آس سے بدل دیا۔ یہ لبرل لوگ کلیسیا
اور کلیسائیوں کے اقتدار کی توچنداں پروا نہیں کرتے، مگر ایک مشکل یہ ہے کہ ان میں سے بعض
اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحات سے بھی بے اعتنائی کرتے ہیں۔ اور تاوقتیکہ اصلاح نہ ہوجائے
غربا پر جو ٹیکسوں کا بار ہے وہ کم نہیں ہو سکتا۔ مزدور گروہ کو مطمئن کرنے کی امید ایسی ہے کہ نہ
وہ لبرل گورنمنٹ کریگی نہ کنسرویٹو، اشک شوئی کے لیے کسی قانون کا پیش کردینا اور چیز ہے۔ مگر
جب یہ ہوگا تب ہی ان دونوں (لبرل اور کنسرویٹو) کے درمیان میں پوری گلخپ شروع ہوجائیگی۔
اس لڑائی کا نتیجہ مزدور پارٹی کے حق میں اچھا ہوگا اور وہ فوراً برسر حکومت آجائے گی۔ مگر کب!
اس کا جواب مشکل ہے۔

اگرچہ اسپین کے لبرل لیڈر کلیسیا کے اثرات سے بہت کچھ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں،
لیکن اُن کی حالت یہ ہے کہ بعض اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے،
کیونکہ اس کا بڑا اثر یہ ہوگا کہ ٹیکس زیادہ بڑھے گا۔ اور یہ تو امید ہی نہیں ہونا چاہیے کہ مزدور پارٹی
کی تسکین کے لیے کوئی قدم کسی کا بڑھے گا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مزدور پارٹی کو کوئی
امید باقی ہی نہیں رہی۔

اسباب کچھ ایسے ہیں کہ کوئی شخص یا اشخاص اسپین کو ایک خاص وقت میں جو انہیں
ہے، بدامنی اور بغاوت سے بچالے۔ اسکے بعد جو فرقے پیدا ہونے والے ہیں انکی نسبت

پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ انکا رجحان کیا ہوگا - اسوقت تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے کیونسٹ فرقہ کو بہت کچھ کامیابی ہو جائیگی - یہ امر آخر ہے کہ آیا وہ اسکو سنبھال سکیں گے یا نہیں -

میں نے کہیں اوپر کہا ہے کہ اسپین کی سیاسیات میں کلیسا اور کلیسائیوں کا دخل عجیب و غریب چیز ہے - یہاں کا کلیسا ہر وقت جناب پوپ کا دست نگر رہتا ہے اور اپنے ملک کے حالات سے روزانہ پوپ کو خبر پہنچاتا اور اسکی ہدایت کا منتظر رہتا ہے - یہ لوگ، جیسا کہ انسے توقع کی جاتی ہے، اسی فکر میں رہتے ہیں کہ سیاسیات کو دین سے وابستہ، بلکہ اس کا تابع فرمان رکھیں - حالانکہ مسیحیت، جو عاجز فقیروں کا دین ہے، اسکا متحمل نہیں ہو سکتا - لیکن چونکہ اس فرقہ میں بھی اکثر ہوشیار لوگ ہیں، اس واسطے کئی مرتبہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے قبل از وقت بعض خطرات کو محسوس کیا اور پوپ کے رعب و اقتدار کے ذریعہ سے اُس کا ازالہ کر دیا - ایک بڑا کام ان لوگوں نے یہ کیا کہ اپنے اثر سے کام لے کر کیتھولک ٹریڈ یونین قائم کرا دیں اور اس سے دینداری کی طرف مائل مزدوروں، بالخصوص زراعت پیشہ مزدوروں کو اپنے ساتھ ملا لیا - یہ بہت بڑا کام ہے - کیونکہ یہ فرقہ جاہل مطلق ہے - اسکا نہ سیاسیات نہ تمدنی معاملات سے تعلق ہے نہ وہ ان چیزوں کو سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کی عقل و تمیز سے بہت بعید ہے - انکے نزدیک بہترین تدبیر یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کلیسائیوں کے ہاتھ میں دیدیں -

یوں دونوں کی طاقت بڑھ رہی ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت رنگ لائے؛ گو ہوشیار لوگ اب بھی اسی قول پر عامل ہیں کہ "العلماء ابعد عن السیاستہ" بہرحال سیاسی اکھاڑے میں دو پہلوان خم ٹھونکتے نظر آتے ہیں - ایک کی وردی زرد ہے، یعنی کلیسائی فرقہ، دوسرے کی سرخ، یعنی کیونسٹ -

اب تک تو زرد پہلوان نے صرف اتنا ہی کام کیا ہے کہ جہاں کہیں ہڑتال ہوتی ہے وہ اسکا خاتمہ کر دیتا ہے - یوں دونوں کی رقابت بڑھتی جاتی ہے - اسپین جیسے اجہل ملک میں بظاہر پوپ کی پارٹی کو زیادہ کامیابی ہوتی نظر آتی ہے - اس سے لبرل خائف ہیں اور کنسرویٹو مطمئن -

شاہ پرستی کے جذبات بڑھتے چلے جاتے ہیں - اسکی وجہ خواہ کچھ ہو - بظاہر تو یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی جان لینے کے لیے بہت سے حملے ہوئے - گو وہ ایسا سخت جان بچا ہے کہ ہر دفعہ بال بال بچ جاتا ہے - لیکن اگر قتلو نیہ والے زندہ ہیں تو ہمیں یہاں تین تین گھنٹے تک ان میں گذر موجود رہیگا، وہ ہر دفعہ موچھوں پر تاؤ دے کر کہتے رہیں گے کہ یار باقی صحبت باقی - بہرحال بادشاہ کی حالت ہر وقت اتنی مخدوش رہتی ہے کہ شیخ اندشت دگر نہ زماند - اندرا سوختہ مقام

کا ہمدرد و حامی ہوتا ہے، اسی لیے جذباتِ شاہ پرستی کو تقویت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کنسرویٹو چونکہ غلامِ شاہ ہیں، اس لیے انکی حالت اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ امیر عبدالکریم جزاہ اللہ کی جنگوں میں ناکامی کی وجہ سے انکو ناکامی ہوئی اور انکی وقعت گھٹ گئی تھی؛ لیکن انکے دمِ خم چند روز رہی رہے۔ آخر ایک بلائے بے درماں ایسی آئی کہ جس نے بادشاہ کو شاہ شطرنج بنا دیا اور کنسرویٹو کو غلام گردش میں بیٹھنے والے ادنیٰ غلام۔ وہ بلا ہے ڈکٹیٹر پریمو ڈی ریویرا، جسنے فرانس کی مدد سے امیر عبدالکریم پر فتح پائی۔ گو خزانہ خالی ہو چکا اور سلطنت پر وہ بار پڑا ہے کہ جسکا خمیازہ کم از کم پچاس برس آیندہ تک اسپین اٹھائے گا۔ تقلونیہ والے تاک میں ہیں، اور وہ انشاءاللہ بہت جلد ری پبلک کرا کے رہیں گے جسکا تجربہ پہلے ہو چکا ہے کہ اسکی چند ساعت کی زندگی ہوئی اور اب بھی ہوگی۔ انشاءاللہ۔

یوں ملک آناً فاناً بدامنی و بدنظمی کی طرف جا رہا ہے، اور یہ ہو کر رہیگی، خواہ پریمو کے بعد ہو یا اُس کی زندگی میں۔

موجودہ سیاسی حالت اسپین کی یہ ہے کہ تمام فرقے، کنسرویٹو، لبرل، کمیونسٹ، کلیسائی موجود ہیں، مگر معطل۔ ملک بھر میں پریموڈی ریویرا کی دوہائی ہے اور وہ اپنے دشمن بڑھا رہا ہے۔

بادشاہ ایک فرمان پر دستخط کرکے اطمینان سے پیرس کے ہوٹلوں میں شراب پیتا اور وہاں کے قمارخانوں میں جُوا کھیلتا ہے۔ تقلونیہ والے اپنی فکر میں بدستور لگے ہوئے ہیں۔ "زندہ باد امیر عبدالکریم"

انتخابِ ممبران

(۲)

ہندوستان میں ہر تیسرے برس جو چہل پہل میونسپل کمیٹی اور لیجیلیٹو کونسلوں کے انتخابات کے زمانے میں ہوتی ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ کمیٹیاں کی جاتی ہیں، لکچر دیے جاتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، منتخب کرنے والوں کی خوشامدیں ہوتی ہیں، عین وقت پر تواضع و مدارات کا انتظام کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ اسپین میں ایسی کوئی "نوعیت" نہیں ہوتی۔ کیبنٹ وغیرہ کے انتخاب کے موقعوں پر بھی اتنی رونق اور اتنا جوش نہیں ہوتا جتنا ہندوستان میں میونسپل کمیٹی کے لیے ہوتا ہے۔ جو امیدوار ہوتے ہیں وہ نہیں بتلاتے کہ ہمارا پروگرام کیا ہوگا اور ہم کس مقصد کے لیے انتخاب ہونا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہاں

جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ کہ امیدوار یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں فلاں پولٹیکل گروہ یا شخص یا فلاں تنود کے آدمی
تعلق رکھتا ہوں۔ کمیٹیاں نہیں ہوتیں، تقریریں نہیں ہوتیں، کیونکہ اسکی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں
کو کہنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہو بھی تو سننے والے کہاں سے آئیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا
کہ ایماندار اور ہوشیار پولیٹکل آدمی وہاں بھی ہوتے ہیں؛ لیکن ایسے لوگ عوام الناس کے معاملات
میں دخل ہی نہیں دیتے۔ انکو یہی پسند ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں۔ زمینداروں کا فرقہ ایسا ہے کہ اسے پولیٹکل معاملات میں
زیادہ دخل دینا چاہیے لیکن وہ ایسا جامد فرقہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس تکلیف و کشاکش میں پڑنا بھی بیکار
ہے؛ حالانکہ ووٹ حاصل کرنے میں انکو زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ ایک دقت یہ ہے کہ آمد و رفت کی آسانیاں
ملک میں بہت کم ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کی اراضی یا جاگیریں ایک دوسرے سے دور دور
ہیں۔ غریب کاشتکاروں کو جو شکایات سفر میں پیش آتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ عدالتوں میں بہت دیر لگتی ہے
اور کسانوں کو شکایات رفع کرانے میں سخت مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ وہ اسی مصیبت میں غلطاں
و پیچاں رہتے ہیں؛ اور بجائے اسکے کہ وہ کسی امیدوار کا ساتھ دیں انکو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے
کہ کمیونسٹ لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور وہی رویہ اختیار کریں جو چند سال ہوئے کسانوں
نے ہندوستان میں اختیار کیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ کسانوں کو اگر کوئی شکایت نہیں ہے۔
وہ اپنی حالت پر قانع ہیں، بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انکی بے چینی اور آئے دن کے خلاف قانون
مظاہرات کیوں ہوتے۔ انتہا ہے کہ اندیشہ یہ ہے کہ وہ کسی روز بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ کمیونسٹ اسی
فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ کرا کے رہیں۔

باستثنائے چند، عام طور پر زمینداروں، اور بالخصوص اُن زمینداروں کو جو پشتہا پشت سے
جاگیردار چلے آتے ہیں اپنے مزارعین سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مزارعین
اپنی حالت درست کریں یا آرام سے رہیں۔ بلکہ انکو اس طرف مائل کرتے ہیں کہ جو روپیہ انکے ہاتھ
آئے اسکو فضولیات میں اُڑا دیں۔ مختصر یہ ہے کہ زمیندار ہرگز اسکو گوارا نہیں کرتے کہ انکے کاشتکار
منتخب ہو کر کیبنٹ وغیرہ میں انکے برابر بیٹھیں۔

ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کے زمانہ سے ہزاروں میل
پیچھے ہے۔ امرائے ملک کا اس میں ذرا سا بھی حصہ نہیں، بلکہ وہ ان کاموں میں پڑنے کو اپنا ہتک
سمجھتے ہیں۔ وہ اسکو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ کوئی کارخانہ دار یا کاریگر یا تاجر انکے برابر بیٹھے۔ چند
عمائد ایسے ہیں کہ جنھوں نے صنعت و حرفت و تجارت کو اپنی دولت بڑھانے کا ذریعہ بنایا ہے؛

مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی برادری کی نظروں سے ایسے گر گئے ہیں کہ وہ برابری و ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے - یہ صورت ایسی ہے کہ اوروں کو ان ہی کی راہ پہ چلنے سے مانع آتی ہے مگر یہ کوشش انکی طرف سے جاری ہے کہ وہ اثر و نفوذ پیدا کر لیں، اور اسکا انھوں نے یہ ذریعہ اختیار کیا ہے کہ ملک کی سیاست میں دخل دیکر اپنی وقعت بڑھائیں مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی اور سے بھی ہمدردی کریں - وہ خود بُری نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کا وہ انتقام یوں لیتے ہیں کہ وہ سب کے دشمن ہیں - اس کا آخری اثر پھر غربا اور بالخصوص مزارعین پر پڑتا ہے - یہ چیزیں اصلاح ملکی کے لیے سدِ راہ ہیں - ان لوگوں کی بےچینی بڑھتی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ بہت جلد بغاوت ہو جائے امیر عبد الکریم (جزاہ اللہ) کی وجہ سے ملک میں ہمدردی کی رو پیدا ہو گئی تھی - اور اب ڈکٹیٹر کی چیرہ دستیوں نے رعایا کو روک رکھا ہے ورنہ اس وقت مملکت اسپین بغاوت رفع کرنے کی فکر میں لگی ہوتی - اب بھی اگر خاص صورت بہتری کی نہ پیدا ہوئی تو بغاوت موجود ہے - نتیجہ جو کچھ ہو -

ایک اور خرابی یہ ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص منتخب ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے وہ انتخاب ہو کر ذاتی نفع اٹھانا چاہتا ہے - جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ شخص عوام کو یقین نہیں دلا سکتا کہ میں انکے فائدہ کی کیا کیا بات کروں گا - اسکے علاوہ لوگوں کا تجربہ بھی یہی ہے کہ یہ لوگ سوائے اسکے کہ ذاتی نفع اٹھائیں انکے کسی مصرف کے نہیں، اس لیے انکو امیدوار سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی - وہ ووٹ دیتے ہیں تو محض کسی دباؤ میں آکر - اسکے علاوہ ایک مشکل یہ ہے کہ اسپین میں رشوت کی وہ گرم بازاری ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس صوبۂ متحدہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں؛ حالانکہ پنجاب کے مقابلہ میں یہاں عمّال کی رشوت ستانی بدرجہا بڑھی ہوئی ہے - اس صوبۂ متحدہ میں ہر شخص کے حق بندھے ہوئے ہیں جو اسکو گھر بیٹھے پہونچ جاتے ہیں - اسپین میں ہر چیز اور ہر بات کے لئے گویا قیمت مقرر ہے - اس میں وہاں کے حکام تک آلودہ ہیں چہ جائیکہ عمّال - یہ کہنا بالکل بیجا نہ ہوگا کہ وہاں ایک بڑے وزیر سے لیکر ایک چپراسی تک اپنی قیمت مقرر کیے ہوئے ہیں اور ان کو بے منت (صوبۂ متحدہ کے "حق" کی طرح) گھر بیٹھے مل جاتی ہے - نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ واقعی ملک کی خدمت کر سکتے ہیں وہ خرچ کی زیادتی کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں نکلتے - دوسری طرف رعایا یہ سمجھتی ہے کہ امیدوار انتخاب خود رشوت ستانی کا مرتکب ہو جائیگا -

یہ تمام خرابیاں ایسی ہیں کہ کسی کے روکے نہیں رک سکتیں، اب اس میں چاہے خود سرکار ہو یا کوئی پولٹیکل فرقہ - اگر اس کا علاج کوئی کر سکتا ہے تو وہ خود رعایا، اور وہ اس قدر غافل و جاہل ہے کہ

کچھ نذر کرگئی۔

پولٹیکل خیالات و طریق کار

(۳)

جو کچھ کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، وہ اس امر کی کافی شہادت ہے کہ اسپین میں پولٹیکل اصلاح ہونا بہت مشکل ہے۔ اسکے علاوہ اور باتیں بھی ایسی ہوئی ہیں کہ صرف اسپین میں بلکہ ان علاقوں میں بھی جو امریکہ میں واقع ہیں اور اب تک بدقسمتی سے اسپین کے قبضے میں ہیں اسی حال میں گرفتار ہیں۔ یا تو وہاں پولٹیکل معاملات میں اتنی زیادتی ہوتی ہے کہ بدنظمی ہو جاتی ہے یا اتنا پرہیز کیا جاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے۔ سیاسیات کی طرف توجہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر "پیشہ ور سیاسی پیشہ" کی کچھ کمی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ووٹ دے سکتے ہیں، مگر وہ بہت کم ووٹ دیتے ہیں، یا بالکل دیتے ہی نہیں۔ وہاں یہ سوال نہیں ہوتا کہ منتخب شدگان اصولاً کیا کرینگے بلکہ پوچھا یہ جاتا ہے کہ انکی ذاتی حیثیت کی کیا کیفیت ہے۔ یہاں ضرورت نہیں ہے کہ اس شخص نے ملک کی کیا خدمت کی ہے یا اسکے پولٹیکل خیالات کیسے ہیں، وہی شخص کامیاب ہوگا جو روپیہ زیادہ خرچ کریگا، یا جسکے مزارعین زیادہ ہونگے۔ باقی رہا یہ امر کہ اس کا کیا پروگرام ہے یا وہ کیا بات وضع قانون یا حکمۂ سیاسی سے منظور کرانا چاہتا ہے ایک ثانوی سا سوال ہے کیونکہ فی الحقیقت وہ کوئی خاص غرض لیکر انتخاب کے لیے کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ انکی کامیابی کا کوئی ذریعہ ہے تو خود ان کا ذاتی دباؤ اور رعب نہ کہ قابلیت ذاتی۔ مگر آخر منتخب شدگان کا مقصد اصلی کیا ہے؟ صرف اپنی ذاتی وجاہت کو بڑھا کر روپیہ کمانا! باقی رہا ملک کا نفع ونقصان اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں! اسکا علاج تو سیٹ ڈگتاٹ کے پاس نہیں۔

ان حالات کا نتیجہ اسپین جیسے ملک میں کہ جہاں سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ملک کی نصف آبادی بالکل جاہل ہے) یہ ہے کہ جال کا ہر تار یا زنجیر کی ہر کڑی اس امید میں رہتی ہے کہ اس کا ہر کامیاب امیدوار یا ملک کا مربی اسکی خوراک کا نعمہ گھر بیٹھے پہنچا دیگا۔ زنجیر کی ہر کڑی جو اصل زنجیر سے زیادہ ملحق ہے اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ اسکو اچھی طرح پکڑ لیا جائے۔ اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ کامیابی کے لیے قابلیت وعدم قابلیت کا کوئی لحاظ نہیں رہتا، اور کامیاب آدمی اپنا اور اپنے بالادست مربیوں کا خرچ خود نکالتا ہے۔

کامیاب امیدوار یہی نہیں کہ خود نفع اُٹھاتا ہے، بلکہ اپنی کامیابی سے اپنے عزیزوں، دوستوں، ہموطنوں کو فائدہ پہونچاتا ہے - اُسکے وطن میں سڑکیں بنجاتی ہیں، لالٹین لگ جاتی ہیں، صفائی بڑھ جاتی ہیں۔ اور بعض وقت کوئی نیا مدرسہ کھل جاتا ہے یا کسی مدرس کے نصیب کھل جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیا یہ ملک اور اہل ملک کا فائدہ نہیں ہے؟ مگر اس سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمت میں کتنے نالایقوں کا اضافہ ہوجاتا ہے، کتنی بیہودگیاں بڑھ جاتی ہیں اور اُسکے اعزا و اقارب اپنے داب ناجائز سے خود کتنا فائدہ اُٹھاتے اور دوسروں کو نقصان پہونچاتے ہیں کیسی دوسرے مقامات کو، جہاں سڑکیں وغیرہ اشد ضروری ہیں محروم کرکے ایک خاص شہر یا قصبہ میں روپیہ کا ضایع کرنا، اگر ترقی کہلائے تو کہلائے، ورنہ نہ تجارت کو اُس سے نفع پہونچتا ہے نہ زراعت کو۔ باقی رہ گئے مدارس کا کھل جانا یا کسی مدرس کو فائدہ پہونچ جانا، یہ اس لیے بیکار ہے کہ طالب علم ہی اُس شہر میں نہیں ہوتے، اسکے مقابلہ میں وہ مقام محروم رہ جاتے ہیں جہاں طالبعلموں کی کثرت ہے اور تعلیم کا انتظام نہیں - غرض نہ کوئی پولٹیکل خیالات ہیں، نہ کوئی طریق کار!

اسپین کے ہوشیار لوگ اس اُمید پہ جی رہے ہیں کہ شاید کبھی وہ وقت آجائے کہ ہمارا ملک بھی اور مہذب و متمدن ملکوں کے طریق کار اختیار کرلے - یہ وقت آئے گا ضرور، کل آجائے یا دو برس کے بعد، بشرطیکہ کوئی اور امیر عبدالکریم نہ پیدا ہوجائے، جس سے ہم مایوس نہیں ہوئے ہیں- وما ذلک علی اللہ بعزیز-

قانون، تمدنی ترقی سے غفلت، فوجی حکومت اور اسپین

(۴)

جن حضرات نے میری کتاب "موڈرن" ملاحظہ فرمائی ہے اُنکو اندازہ ہوگا کہ ملک اسپین میں قانون بنا دینا یا احکام نافذ کردینا کتنا آسان ہے، مگر اُن پر عمل ہونا کس قدر مشکل بلکہ ناممکن بات ہے۔ اہالی اسپین کی سستی اور بےحسی یورپ میں ضرب المثل ہے - اُسکی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ اُن میں شرقی خون ملا ہوا ہے اور یہ اُس کا اثر ہے - "موڈرن" کے ناظرین یقیناً اس توجیہ کی تردید میں میرا ساتھ دینگے- تشریح بہت طولانی ہے - بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ قانون و قواعد وہاں لاحاصل ہیں اور کاہلی اُنکا روزمرہ - قریباً ساڑھے چار سو برس کا تجربہ بتلا رہا ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اسپین کے قوانین بہت سی صورتوں میں بہترین قوانین، اور اس قابل ہیں کہ

ہندوستان تو کیا یورپ کے اکثر ممالک کو چاہیے کہ انکو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ ملک ہی ایسا ہے کہ جہاں ہر بات میں تضاد موجود ہے۔ قانون بنا دینا اور چیز ہے مگر اُس کا نفاذ یا اُس پر عمل کرنا شے دیگر ہے۔ یہ مسلم کہ وہاں تعلیم کی کمی ہے، مگر جتنی اور جیسی بھی ہے وہ بُری نہیں۔ ذہانت و دور اندیشی کی وہاں کمی نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ملک کے قابل لوگ عضو معطل ہیں۔ یا اُن سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُنکے لیے غیر موزوں ہے۔ جہاں حرفت و تجارت کی کمی ہو وہاں بہترین چیز قانونی تعلیم ہے۔ قانون وہ چیز ہے کہ اُسکے گریجوایٹ ہر عہدہ پر لگائے جا سکتے ہیں۔ اہالی اسپین اکثر و بیشتر قانون کی طرف مائل اور اُس کی ڈگریاں لیتے ہیں۔ لیکن اُنکو کسی طرح یہ امید نہیں ہے کہ وہ وکالت کرکے اپنا پیٹ پال سکیں گے۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں مقدمہ بازوں کی کمی ہے، بلکہ نہ فریقین مقدمہ وکیل سے مدد لیتے ہیں نہ عدالتیں اسکو پسند کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عدم مزاولت قانونی سے وکیل کچھ لائق نہیں ہونے پاتے۔ اصل میں عدم واقفیت قانون کوئی عذر نہیں بن سکتا۔ بلکہ خرابی یہ ہے کہ جو کچھ بھی علم ہے وہ محض نظری ہے، عملی نہیں۔ ان لوگوں سے گفتگو کی جائے تو یہ عالم متبحر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا اُن سے کام لیکر دیکھیے تو نالائق محض ثابت ہوتے ہیں۔ اصول قانون کو سمجھتے ہیں، ملکی ضرورت کو جانتے ہیں، جو نقائص ہیں اُن کا احساس ہے، لیکن اُن سے ذرا قانون کا مسودہ کرا کے تو دیکھیے؛ یقین جانیے کہ دو چار ابتدائی دفعات بھی نہیں لکھ سکیں گے۔ بہزار خرابی مسودہ بھی تیار ہو گیا؛ مجلس واضعانِ قوانین میں بھی پہونچا؛ وہاں جو اُس پر بحث و اعتراضات ہوئے تو مسودہ کرنے والے حضرات کھوئے گئے۔ جواب ہی نہیں بن پڑتا۔ بدقت تمام قانون بن بھی گیا، نافذ بھی ہو گیا تو انجام یہ ہوا کہ وہ بھول بسر گیا اور اُسکو اُن ہی حضرات نے دیدہ و دانستہ توڑا اور خلاف ورزی کی، جنھوں نے اسکو بنایا، پاس کرایا۔ اس سے انکار نہیں کہ چند۔ اور محض چند روز کے لیے اُس پر عمل ہوا، اُسکے بعد وہی دستِ تظلم ہے اور وہی فریاد ہے کسی کو، یہاں تک کہ خود قانون بنانے والے کو یہ یاد نہیں آتا کہ اس خرابی کے انسداد کے لیے فلاں قانون بن چکا ہے۔

ان خرابیوں کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) گورنمنٹ سخت پست حالت میں ہے اور اُس پر بے حد قرض۔

(۲) ملک میں تعلیم کی کمی۔

(۳) اُن کا کانسٹی ٹیوشن ہے وہ اتنا لغو اور پیچیدہ ہے کہ نا قابل عمل ہے۔ اسکی بنیاد جمہوریت پر ہے مگر نہ کوئی اسکو سمجھتا ہے، نہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کانسٹی ٹیوشن میں

۱۸۷۶ء سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، نہ کسی نے اسکی پروا کی

(۴) ملک میں ذرائع آمدورفت اور تبادلۂ خیالات اتنے کم ہیں کہ ایک کو دوسرے کی تکلیف کی خبر نہیں ہوتی۔

(۵) خود اہل ملک سست اور غافل ہیں۔

(۶) فوجی طاقت اتنی اور ایسی نہیں کہ ملک پر اُس کا دباؤ پڑ سکے۔

(۷) یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے یہ مُلک بہت کچھ محفوظ و مصئون ہے اور ہر شخص کو اطمینان ہے کہ ملک کو زوال نہیں آسکتا۔ پابندیِ قانون لا حاصل ہے۔

۱۸۹۸ء میں اسپین اور امریکہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ اُسوقت اہالی اسپین کو اپنی حیثیت اور کمزوری پوری طرح پر واضح ہوگئی تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ اصلاح حال کریں گے، کچھ حرکت ذوحی ہوئی بھی تھی۔ مگر سُستی اور غفلت کا بھلا ہو کہ سب کچھ طاقِ نسیاں کے سپرد ہوگیا۔ پھوس کی آگ تھی کہ یکایک بھڑکی اور راکھ کا ڈھیر۔ جتنے پولٹیکل راہبر تھے اُن کا نفع ہی اس میں تھا کہ یہ آگ پھر نہ سلگنے پائے۔ رہ گئے مصلحین وبہی خواہان ملک، اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ملک میں کچھ اصلاح کرنا یا کرانا ہے، تو اس کا علاج بذریعہ بغاوت انقلاب ہے۔ اسکے لیے وہ بوجوہ تیار نہ تھے۔ یوں دفتری حکومت کو پھر فتح ہوئی۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو، نتیجہ بُرا نہ نکلا۔ تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کی آنکھیں کھُل گئیں، نوجوانانِ ملک کے دلوں میں آگ لگ گئی، اور وہ اپنے ملک کی بہبودی کی طرف مائل ہیں۔ اب کچھ امید ہے تو ان ہی سے۔ امیر عبد الکریم کے مقابلہ میں کچھ کیا تو ان ہی نے، ملک کو اگر کچھ امید رکھنا چاہیے تو ان ہی سے۔

یہ قصہ میری اُمید اور میرے ارادہ سے زیادہ لمبا ہوگیا۔ لیکن اس سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جائیگا کہ اسپین کی سلطنت نقش بر آب ہے اور دُور کا ڈھول۔ اگر ایک عبد الکریم اور پیدا ہوگئے اور اُنھوں نے اس عمارت کو ذرا سا بھی دھکا دیدیا تو یہ سب زمین پر آرہیگی۔ گو یہ یقینی بات ہے کہ عیسائی سلطنتیں ہرگز اسکو گوارا نہ کرینگی کہ مسلمان اس سرزمین پر فاتحانہ قدم رکھ کر یورپ بھر کو بھرشٹ کردے۔ آپس کی رقابتیں بھی اُسوقت بھلادی جائیں گی، جیسا کہ تجربہ ہو چکا ہے۔ اور جناب پوپ کی مشین اُسی طرح حرکت میں آجائے گی جیسی کہ کئی مرتبہ آچکی ہے۔ مگر خدائے تعالیٰ کی حکمتوں اور قدرتوں کو کون جانتا ہے۔ وہو الذی یحیی الارض بعد موتہا۔ مسلمان تو خود اپنے مرثیہ خوان ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ

رب الافواج اسی مردہ قوم میں جان ڈال دے۔ اس میں کسی طرح کا کلام نہیں کہ وہاں اگر کسی کو امید فلاح ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کو۔ وہاں کے درد کا علاج اگر کوئی ہے تو مسلمان۔ کامیاب ہو سکتے ہیں تو مسلمان۔

مجھ پر ایک بجا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ناظرین کا اتنا وقت ضائع کیا مگر اسپین کا کوئی صحیح نقشہ نہیں بتلایا۔ مجھے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ہے کہ میں اسکو نہیں سمجھا۔ وہ ہے ہی اتنا پیچیدہ کہ اس کو سمجھنا مشکل ہے اور اس کے بوسیدہ و فرسودہ ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔

محمد خلیل الرحمٰن

خوابِ طفلی

تنہا ہوں گو اغم ہوں اس عہدِ کمسنی کا | جس میں کہ تھا مہیا سامان دل لگی کا
وہ دلفریب راتیں وہ عشوہ بار راتیں | اے زندگی کہاں ہیں وہ خوشگوار راتیں

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مستی کی وہ اداؤں سے دل بستگی مجھے تھی | دل جانتا ہے اسکو جو کچھ خوشی مجھے تھی
بچپن کی زندگی کی راحت کہاں ملے گی | ایسی ہمیں سجائی جنت کہاں ملے گی

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

بچپن کے سیرِ گل کی پھر مجھ کو جستجو ہے | پھر باغ کی روش پر چلنے کی آرزو ہے
شبنم کی وہ طراوت سبزے کا لہلہانا | وہ اول سحر میں تاروں کا جھلملانا

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مجھ سے بگڑ گیا ہے عشرت نواز بچپن | یاد آ رہا ہے مجھ کو راحت نواز بچپن

گلہائے عیش سے تھا پُر دامنِ تمنا — کیسا ہرا بھرا تھا وہ گلشنِ تمنا

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

عیش و طرب کے ساماں کیا کیا تھے اُس فضا میں — تھیں گلشنِ ارم کی رنگینیاں ہوا میں
وہ دید کا سماں تھا یا عید کا سماں تھا — سرسبز گل زمیں تھی پُر جلوہ آسماں تھا

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

اک پل میں ہو گئی وہ بزمِ نشاط برہم — عیش و سرور کیسا ہے دل میں درد پیہم
اب اپنی زندگی کا جو گیت گا رہا ہوں — یوں اہلِ درد کو میں دُکھڑا سنا رہا ہوں

راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

اقدس حیدرآبادی
(مرحوم)

کلامِ اعظم

آنکھیں دکھا کے وہ پسِ دیوار ہو گئے — بیمارِ چشم اور بھی بیمار ہو گئے
کانٹے بھی راہِ شوق کے تھے ناوکِ نگاہ — تلووں میں چبھ کے دل کے مرے پار ہو گئے
کیا ہلے دل مرا چمنِ روزگار میں — جو پھول تھے نظر میں وہ اب خار ہو گئے
کرتے علاجِ دردِ محبت محال تھا — بیمار کو وہ دیکھ کے بیمار ہو گئے
آئینہ دیکھیے تجھے آرائشوں کے بعد — اب تو کچھ اور ہی مرے سرکار ہو گئے
اب تاک جھانک کی بھی توقع نہ رہ گئی — لو بند اُن کے روزنِ دیوار ہو گئے
کیا دل میں اب رہا نہیں لے چارہ گر لہو — کیوں خشک میرے دیدۂ خونبار ہو گئے
اے ضعف تو نے جامہ دری سے خجل کیا — یعنی ہمارے ہاتھ ہی بیکار ہو گئے
میں اس سے دیکھتا ہوں جھلک حسنِ یار کی — ناسورِ دل بھی روزنِ دیوار ہو گئے

اِن میں کچھ اور سنگدلی کے سوا نہیں
اعظم بتوں سے اس لیے بیزار ہو گئے

اعظم کُریوی (سابق مدیر ہمدم)

کرشن کُنوَر

— ایک ماخوذ ڈراما —

(ایک ایکٹ میں)

اشخاص ڈراما

(عورتیں)

مہارانی اودیپور	کرشن کنور کی ماں
مہارانی جودھپور	مان سنگھ و بھیم سنگھ کی ماں
چاند کنور	مہارانا اودے پور کی بہن
کرشن کنور	"کشتۂ نظرت عشاق"
لیلاوتی	رانا جے پور کی بہن
چندر کنور	رانا جودھپور کی لڑکی
سیتا	کرشن کنور کی سہیلی
سہیلیاں	
خادمہ	

(مرد)

ہلکر جسونت راؤ	مہاراجہ اندور
سیندھیا	مہاراجہ گوالیار
مان سنگھ	مہاراجہ میواڑ
امیر خاں سنبھلی	نواب ٹونک

+ اس ڈرامہ میں تاریخ اندور مصنفۂ خانی خاں مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ سے مدد لی گئی ہے۔ اس لیے اگر اس کتاب کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بہت بڑا اخلاقی جرم متصور ہوگا۔ (مرتب)

بھیم سنگھ ... راناجودھپور

مان سنگھ ... ولیعہد جودھپور

جگت سنگھ ... راناجے پور

ایسٹ انڈیا کمپنی۔

اجیت سنگھ ... سردار اودیپور

بہت سے سردار۔

طبیب شاہی اور پروہت

وزیر یا منتری۔ نورتن۔

ہرکارہ۔

قاصد۔

حاجب۔

سپہ سالار۔

دکنی رسالہ۔

وقت۔ ۱۸۰۵ء لغایت ۱۸۱۰ عیسوی

مقام۔ راجپوتانہ

[اپنے والد ماجد ادیب شہیر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے کے نام پر]

کمپنی بہادر کا آفتاب اقبال عروج پر ہے۔ بھرت پور کے تاریخی اور مشہور قلعہ پر کمپنی کے دانت
تیز ہو رہے ہیں۔ جنگ میں کبھی افواج کو شاندار پسپائی نصیب ہوتی ہے۔ راجہ بھرت پور کو صلح
و آشتی کے پیام دیے جاتے ہیں۔ ہلکر بھرت پور سے رخصت ہو کر سندھیا کی طرف عنانِ خیال موڑتا ہے
امید سے زیادہ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ ہلکر تازہ دم جرار فوج لیکر لارڈ لیک کی قابل فخر افواج اور ہلالی
پرچم کے ظل عاطفت میں دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے۔ پانسہ پلٹتا ہے۔ صلحنامہ لکھنے کی نوبت آتی ہے۔
مالوہ اور دکن کی سلطنتیں واپس کی جاتی ہیں۔ مسلسل لڑائیوں سے ہلکر کو نقصان عظیم ہوتا ہے اور [illegible]

عزت اسلاف بال بال بچا آتا ہوا جے پور کی محلسرا میں قیام کرتا ہے۔ ہلکر قسمت کا دھنی ہے اپنے میزبان سے کبھی کافی رقم وصول کرتا ہے۔ اس عرصے میں انکے اہل و عیال بھی آکر جے پور کے محل شاہی میں اُس سے ملتے ہیں۔

ایک نورنگا رآراستہ کمرہ۔ نیچے کے بڑے دروازہ سے سنگ موسیٰ کے زینے کا کٹہرا اور پائیں باغ کا ایک گوشہ۔ شب کا وقت۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ہلکر ہلکر اپنے اہل و عیال سے گفتگو میں مشغول ہے کہ یہ خبر آتی ہے کہ مانسنگھ والی میواڑ ملاقات کرانا چاہتا ہے۔

منظر اول - مجلس اول

ہلکر - مان سنگھ - منتری - نورتن

[ہلکر دلچسپی میں مشغول ہے۔ ایک حاجب آتا ہے]

حاجب - اَن داتا! مہاراجہ مان سنگھ والیِ میواڑ تشریف لائے ہیں

ہُلکر - مہاراجہ مان سنگھ اسوقت شب میں آئے ہیں ؟

حاجب - ان داتا - مہاراجہ کو کوئی ضروری کام ہے۔

ہلکر - اچھا جاؤ بُلاؤ - شب کے وقت کیا کام ہو سکتا ہے

[ہلکر تنہا رہ جاتا ہے، اُسکے اہل و عیال ہٹ جاتے ہیں۔ راجہ مان سنگھ ہلکر کے منتری و نورتن کے ساتھ شرف باریابی حاصل کرتا ہے اور ہلکر استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے]

ہلکر - مہاراجہ صاحب تشریف لائیے - مزاج تو اچھا ہے - کیسے شب میں کیسے تکلیف کی ——— خیریت ؟ کوئی ضروری کام ؟

مان سنگھ - مہاراج - اسوقت ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں، اچھا ہو تو عرض کروں

ہلکر - مہاراج شرمندہ نہ کیجیے - میں خانہ بدوش ہوں، آپ راج گدی کے مالک ہیں ——— اسکے علاوہ بھی آپ میرے محسن ہیں - کیونکہ آپ میرے اِن بچوں کو میرے پاس لے آئیے ——— جلد فرمائیے میں کس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں ——— آپ کا احسان بڑا ہے۔

مانسنگھ ——— مہاراج آپ تنک دھاری ہیں، شرمندہ نہ کیجیے۔ اس لیے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے سہائتہ کی پراتھنا کروں ———

ہلکر ——— مہاراجہ تبلائیے کس کے خلاف فوج کشی کا ارادہ ہے؟ کیا کمپنی بہادر کے؟

مان سنگھ ——— نہیں ——— راجہ جے پور کے

ہلکر ——— پرماتما ——— کیا سن رہا ہوں ——— مہاراج کس کے خلاف؟

مان سنگھ ——— مہاراج جگت سنگھ والی جے پور کے خلاف!

ہلکر ——— کیا محسن کشی جائز ہے؟

مان سنگھ - کیا وعدہ خلافی جائز ہے؟

ہلکر ——— نہیں نہیں ہرگز نہیں - تنک دھاری کی بات پلٹ نہیں سکتی - (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری سہائتہ کی ضرورت کیوں پیش آئی ——— ؟

مان سنگھ ——— مہاراج آپ کو معلوم ہوگا کہ مہارانا اودے پور کی ایک لڑکی حسن میں لاثانی ہے۔ اس سے مہاراجہ جودھپور کو عشق ہو گیا ہے - اور مہاراج جے پور بھی اسی فکر میں مبتلا ہیں ——— بس اتنی حقیر شے آپ سے میں طلب کرتا ہوں ——— کیا آپ اس میری پرارتھنا کو ٹھکرا دیں گے!!

ہلکر (قہقہہ لگا کر) جے پور کے خلاف امداد! لڑائی بھی کیسی پوتر - محسن کشی وعدہ خلافی ہلکر کے شایانِ شان نہیں ——— میں مہاراج آپکے "غیر متوقع" صلہ" کو سنکر شششدر ہوں

[دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے - یہ خبر لمحات میں حاشیہ نشینانِ سلطنت راجہ جے پور کو پہونچاتے ہیں جے پور کا راجہ ہلکر کو رقم مطلوبہ سے کہیں زیادہ رقم دے کر جان بچانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے - اللہ اکبر - ہاتھی کتنے ہزار پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا - ہلکر کا اب بھی وہ دبدبہ ہے کہ اسکی امداد پہ میواڑ کا رانا اصرار کر رہا ہے — ہلکر خود پس و پیش میں ہے کبھی محسن کشی کبھی وعدہ خلافی اور کبھی مطلوبہ رقم میں اضافہ مزید کا دلفریب تخیل، اور کبھی رانا میواڑ، راجہ جودھپور اور مہاراجہ جے پور کی آرزوؤں کا خیال ——— کچھ سوچ کر مان سنگھ سے کہتا ہے]

"...... رانا، آپ کا مطالبہ بہت ہی اہم ہے، آپ کی سرفروشانہ خدمات میرے سر آنکھوں پر ہیں - میں بات کا دھنی ہوں، آپ کا سوال یقیناً پورا ہوگا - پرنتو اس میں آپ کچھ تبدیلی

بھی پسند کریں گے ——؟

مان سنگھ - مہاراج پوتی خون میری رگ و پے میں دوڑ رہا ہے - کیا ایک چھتری بلوان اپنی بات سے پلٹ جائے، جان جائے لیکن آن نہ جائے

[پھر چند لمحات کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے]

ہلکر --- شاباش مہاراجہ شاباش - میں تمہاری ہمت کا امتحان لینا چاہتا تھا - آپکا قول پورا ہوگا - (تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر) میں قسم کھاتا ہوں آپ کی بات پوری ہو کر رہیگی - پرنتو ایک تلک و مہاری کی پرارتھنا آپ بھی منظور کریں گے ——؟

مان سنگھ —— مہاراج - شوق سے فرمایئے ——؟

ہلکر -- صرف یہ کہ کچھ مہلت دیجیے

مان سنگھ -- مہاراج منظور —— [مان سنگھ، منتری و نورتن جاتے ہیں]

[اس مکالمہ کے بعد دربار برخاست ہوتا ہے اور ہلکر اپنے دربار میں تنہا متفکر رہ جاتا ہے]

منظر اول مجلس دوم

[فطرت مسکراتی ہے اور ہلکر متفکر خیمہ میں داخل ہوتا ہے - پریشانیوں اور شکست کی وجہ سے کسی رسالہ کو برخاست کرنا چاہتا ہے - اس بڑے بغاوت کے اثرات رونما ہوتے ہیں - باغی جماعت ہلکر کے برادر زادہ کو راجگدی کے سبز باغ دکھاتی ہے وہ ہوشیاری سے انکار کر دیتا ہے - ہلکر کو خبر ملتی ہے وہ اُس رقم سے جو جیپور سے ملی ہے بغاوت کو فرو کرتا ہے اور وقتی بغاوت سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہی سہی حالت درست کرنے کے بہانے سے طرفین کی امداد سے انکار کر دیتا ہے - جے پور رستے ... ہوجاتا ہے - اسوقت ایک شاداب دامن کوہ میں خیمہ زن ہے - اس وقت راجستان کی سیاسی بساط پر ایک نیا مہرہ امیر خاں سنبھلی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - امیر خاں کے ہلکر پر بہت کچھ حقوق ہیں - اس بغاوت سے وہ بھی مستفید ہونا چاہتا ہے - اس وقت وہی ہلکر سے ملنے آیا ہے - اور ہلکر کو اسکا اپنا وعدہ یاد دلاتا ہے -]

(ایک شخص میر خاں کے آنے کی اطلاع کرتا ہے)

امیر خاں : ہلکر : سپہ سالار

ایک شخص - مہاراج ! امیر خاں سنبھلی ملاقات کرنا چاہتے ہیں -

ہلکر —— ہاں ہاں فوراً بلاؤ —— [نوکر جاتا ہے اور امیر خاں آتا ہے]

امیر خاں - مہاراجہ صاحب بندگی - کہیے مزاج تو اچھا ہے ؟

ہلکر دوست کیا بتائیں، آجکل پریشان ہیں —— تم نے بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔ —— کاش ——

امیر خاں۔ خیریت؟ کیا ہوا۔ کمپنی بہادر سے کیا پھر چھڑی! کیا ہوا؟

ہلکر۔ دوست کیا بتائیں۔ دکنی رسالہ کو برطرف کرنا چاہا تھا۔ بد امنی پھیل گئی ہے —— پریشان ہوں —— لوگ دوسرا راجہ مقرر کرنا چاہتے ہیں —— سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ جس قدر رقمیں بے پورے لی تھیں سب اسی مد میں صرف ہو گئیں۔

[وہی شخص دوبارہ اندر آتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ سپہ سالار صاحب تشریف لائے ہیں۔ ایا پاکر سپہ سالار کو اندر لاتا ہے]

ہلکر۔ سپہ سالار صاحب کہیے کیا ہوا —— سب کو توپ دم کرا دیجیے۔

سپہ سالار۔ ان داتا کا بول بالا رہے۔ سرکار کے اقبال سے بد امنی دور کر دی گئی ہے —— کچھ فکر کی بات نہیں ہے ——

ہلکر (خوش ہو کر) میں بہت خوش ہوں۔ جاؤ منتری سے ایک جاگیر لے لو

[سپہ سالار خوش ہو کر سلام کرتا ہوا خادم کے ساتھ باہر جاتا ہے]

امیر خاں۔ مبارک۔ مہاراجہ صاحب مبارک۔ فرمائیے، کچھ ہماری خدمات کا بھی صلہ دلوائیے گا

ہلکر۔ دوست۔ میری حالت سے واقف ہو۔ پھر بھی جو کچھ میرے امکان میں ہوگا اس سے دریغ نہ کروں گا —— بولو ——

امیر خاں۔ حضور کی یہ (ایک تحریر پیش کرتے ہوئے) تحریر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہلکر (تحریر پڑھ کر) منظور ہے۔ امیر خاں تمہاری لازوال، بے ریا، مخلصانہ سرفروشیوں کے صلہ میں ٹونک کی جاگیر مع خراج کوٹہ تم کو عطا کی جاتی ہے۔ لیکن ——

امیر خاں۔ مہاراج، اگر آپ اپنے وعدہ کا ایفا کر سکتے ہیں، تو پٹھان بھی اپنی بات سے نہ ٹلے گا۔ مہاراج کہیے —— تکلف نہ کیجیے

ہلکر (اٹک اٹک کر) لیکن —— شرم معلوم ہوتی ہے —— امیر خاں تم میرے دوست ہو تم میرے ہزاروں رازہائے پنہاں سے واقف ہو اس لیے تم سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں میں نے مان سنگھ راجہ جودھپور سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں انکی امداد راجہ جے پور کے خلاف کروں گا —— لیکن تم جانتے ہو، جے پور کا میں مہمان رہا ہوں اس نے مجھے

[illegible] کرنے کے لیے مدد دی تھی ——— کس طرح اُسکے خلاف مان سنگھ کی مدد کرسکتا ہوں۔
[illegible] ——— [illegible] ———

امیر [illegible] ——— کیا [illegible] مان سنگھ کی امداد سے [illegible] پور کی لڑکی جودھپور کے راجہ مان سنگھ کو
دو [illegible]

واہ امیر خاں، خوب سمجھے ——— میں نے تو ابھی نہیں تم خود ہی سمجھ
[illegible] ——— [illegible] میں کہنا چاہتا تھا لیکن شرم سے زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے
تھے۔ [illegible] وہ وقت [illegible] تھا میرے دل میں سچ تو امیر خاں یہ خیال اس
ٹوٹے ہوئے تیر کی طرح کھٹک رہا تھا جو قلب کے اندر رہ گیا ہو ——— میں وعدہ کرتے
[illegible] ——— امیر خاں واقعی تم میرے دوست ہو
امیر خاں ——— [illegible] ——— فکر نہ کیجیے دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔

[امیر خاں جاتا ہے]

منظر اول مجلس سوم

[مہارانا [illegible] پور اپنے عالیشان محل میں موجود ہیں۔ کرشن کنور کی نسبت کے [illegible] گفتگو ہو رہی ہے]
چاند کنور۔ [illegible] دیکھو۔
مہارانی۔ مہاراج۔ آخر میں کہتی ہوں۔ کرشن کنور کا بیاہ کب رچے گا۔
چاند کنور۔ مہاراج۔ اب تو کرشن کنور سولہ برس کی ہو گئی ہے کیا عمر بھر بٹھا رکھے گا۔ بھابھی سچ تو کہتی
ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے۔ آخر آپ نے بھی کچھ سوچا؟ کہیں سے کوئی بات چیت ہوئی؟
مہارانی۔ چاند کنور، بات چیت کا کیا کہنا جس گھر میں ہیرا ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ جودھپور
سے پیغام [illegible] ہیں —
مہارانا۔ تم سچ کہتی ہو [illegible] اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں۔ کرشن کنور کا اب بیاہ رچانا چاہیے
[illegible] ساتھ کرشن کنور بیاہی جائے ـ
چاند کنور۔ [illegible] کی بڑی تعریف سنی ہے۔ ——— میرے خیال میں تو ـ
[illegible] بیٹھنا چاہیے یوں جو مرضی جا بھی گی —
مہارانی ——— [illegible] سوچ بچار کرکے طے کرلو [illegible] انتظام کیا جائے مہاراج
[illegible]

مہاراج۔ میری منشا تو سچ پوچھو بھیم سنگھ ہی کی ہے ــــــــ

چاند کنور۔ مہاراج میرا دل تو یہی چاہتا ہے ــــــــ

مہارانی۔ پھر پروہت کو بلا کر جنم پترا وغیرہ دکھا لیجیے۔

چاند کنور۔ مہاراج یہ سمے اُتم ہے۔ پروہت جی کو بلا لیجیے۔

[چاند بائی خادمہ کو پکارتی ہے اور منتری کو بلانے کے لیے کہتی ہے]

مہاراج۔ چاند کنور تم کو بہت جلدی ہے۔ واقعی اس بیاہ کا سہرا چاند کنور ہی کے سر رہیگا۔ پرمیشور انجام اُتم کرے۔

مہارانی۔ بھگوان چاہیں انجام اچھا ہی ہوگا ــــــــ [منتری آتا ہے]

منتری۔ اَن داتا، حکم ؟

مہاراج۔ منتری جی، یہ طے پایا ہے کہ مہاراج بھیم سنگھ کے ساتھ ہماری راجکماری کرشن کنور کا سمبندھ کیا جائے۔ آپ پروہت کو بلا کر جنم پترا، کُنڈلی سب بچار لیجیے اور ایک خط مہاراجہ بھیم سنگھ کی ماں کو لکھ دیجیے کہ اُنکی بات پکی ہو گئی ہے اور فلاں فلاں مہینے میں پرمیشور چاہیا یہ سمبندھ ہو جائیگا۔

منتری۔ اَن داتا ایسا ہی ہوگا۔

[منتری باہر جاتا ہے اور چاند کنور بھی چلی جاتی ہے مہاراجہ اور مہارانی میں انتظامات کے متعلق گفتگو ہوتی ہے]

منظر اول مجلس سوم

اودے پور کی حور نژاد راجکماری کرشن کنور حسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ اُسکو دیکھ کر زمانہ ناضیہ کی ہونہار پدمنی، شکنتلا اور چندر کنور کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اُس کا نازک بدن، لانبے گیسو، شہابی رنگ، گھنی بھویں، سیاہ آنکھیں، رخساروں کی ارغوانی رنگت، ارباب کیف کے لیے کافی دلچسپی کا سامان تھا اُسکے حسن خداداد کے افسانے نسیم سحری کے دوش پر دُور دُور پہونچ چکے تھے، اور شعراکے دوادین خیر خواہی کی وجہ سے کرشن کنور کے عالم سوز و محشر آفرین حُسن سے مملو تھے ــــ چنانچہ اسوقت مہاراجہ بھیم سنگھ خوش ہے کہ راجپوتانہ کی سب سے زیادہ حسین عورت اسکی انیس عشرت بننے والی ہے۔

بھیم سنگھ۔ مہارانی جودھپور

بھیم سنگھ۔ ماتا جی۔ آپ نے کس کام کے لیے آج بلایا ہے۔ میں ابھی شکار میں جا رہا تھا۔

مہارانی۔ مہاراج اودے پور سے پتر ہو گیا

بھیم سنگھ (بیتاب ہوکر) اودے پور سے ! پتر آ گیا ؟

مہارانی۔ ہاں مہاراج پتر آ گیا۔ میں تم کو آشرباد دیتی ہوں

بھیم سنگھ۔ ماتا جی۔ مہاراج اودے پور نے کیا لکھا ؟

مہارانی۔ مہاراج انکو منظور ہے

بھیم سنگھ (خوشی میں) منظور! منظور!! کب تک ؟

مہارانی۔ یہ کچھ نہیں لکھا ہے۔ پروہت جی سے بچار کر وقت مقرر کرینگے — اسی لیے میں نے اس قدر سویرے تم کو تکلیف دی تھی — جاؤ پھولو پھلو —

بھیم سنگھ (ماں کے قدموں پر سر رکھتے ہوے) ماتا جی، میں آپ کی ان کوششوں کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں۔

مہارانی "تم نے میرے دودھ کا کیا بدلہ دیا ہے۔ جاؤ بھیم جاؤ، ماتا کی محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔ جو کچھ کیا میں نے اپنا حق سمجھ کر کیا —— جاؤ سر اٹھاؤ ——

میرے شیر (ہاتھوں سے سر اٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیتی ہے) میں آشرباد دیتی ہوں ہمیشہ خوش رہو، پھولو پھلو —— " [مہاراجہ بھیم سنگھ جاتا ہے]

منظر اول مجلس چہارم

کرشن کنور۔ سیتا۔ سہیلیاں

راجکماری اودے پور ایک آراستہ کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اُسکے چاروں طرف سہیلیاں جمع ہیں۔ وہ سب راجکماری کو چھیڑتی ہیں —— راجکماری شرمندہ ہوتی ہے —— آخر میں گانا شروع ہوتا ہے۔

سیتا۔ راجکماری صاحبہ مبارک۔

دوسری سہیلی۔ راجکماری صاحبہ مبارک۔

تیسری۔ جودھ پور کی رانی ہونا مبارک۔

چوتھی۔ ہاں میں تو بھول گئی تھی۔ مبارک۔ رانی ہونا مبارک۔

پانچویں۔ مبارک ہو مبارک بھیم سنگھ کی پدمنی مبارک۔

سب سہیلیاں - ہاں ہاں مبارک مبارک - راجکماری صاحبہ مبارک -
راجکماری - کیا مبارک مبارک لگا رکھی ہے (شرمندہ ہوکر) کوئی اور کام نہیں ہے - ہٹو جاؤ - ہر وقت دق کرنا - میں اتا جی سے کہ دونگی - سیتا تم نے کہاں کی ڈانٹوں کو لگا لیا ہے
(آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چھپتے ہوئے)
راجکماری صاحبہ - خفا نہ ہوجیے - مبارک باد ایسے ہی دی جاتی ہے —— پرمیشور کریں آپ جودھپور کی رانی ہوں —— ہم لوگوں کے بھی دن پھر گیا -
سب سہیلیاں - راجکماری صاحبہ مبارک - مبارک -
[آہ - قدرت کھڑی سرا ہنسے مسکرا رہی ہے - طرفین کی مُہر بوز "محضر نسبت" پر ثبت ہوچکی ہے - صرف وقت کی موزونیت کا انتظار ہے -- - اور طرفین اس غمناک ماتم نغمہ کو کرشن کنور کے پردہ میں مضراب حیات پر سننے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں جو فطرت انکو سنانے والی ہے]
سیتا - اچھا بہنو! ہم سب مل کر ایک مبارک باد گائیں - راجکماری کو خوب دق کریں —— ابھی تو موقع ملا ہے -
سب - مبارک - راجکماری صاحبہ مبارک		[گانا ہوتا ہے]

منظر اول مجلس پنجم

منتری - رانا بھیم سنگھ - مہارانی - طبیب شاہی - مان سنگھ
[رانا بھیم سنگھ بہت سخت علیل ہیں - مہارانی سراسیمہ ہے - طبیب شاہی موجود ہے]
مہارانی - حکیم صاحب تبلائیے میں بہت پریشان ہوں - میرے بھیم کا کیا حال ہے —— جلدی کہیے کیا آپ ماں کی ماتنا سے واقف نہیں ہیں —— بولیے جلدی بولیے
حکیم - مہارانی صاحبہ - آپ واقف ہیں کہ مرض خطرناک ہے لیکن انشاءاللہ مہاراجہ اچھے ہو جائیں گے —— فکر نہ کیجیے —— "
مہارانی - کوئی نا امیدی کی بات تو نہیں ہے ؟
حکیم - میرے خیال میں ذرا بھی نہیں —— [منتری طبیب سے علحدہ دریافت کرتا ہے]
منتری - حکیم صاحب تبلائیے کیا حال ہے - زندگی کی آس ہے یا نہیں ؟
حکیم صاحب - منتری صاحب سچ پوچھیے تو یہ مرض لاعلاج ہوگیا ہے زندگی کی امید کم ہے —— (روتے ہوئے)

منتری: کیا واقعہ ہے؟
حکیم صاحب: یہ مذاق کا کونسا موقعہ ہے؟
منتری: کیا میں راجہ مان سنگھ ولی عہد کو اطلاع دیدوں؟
حکیم صاحب: ضرور ——— علالت کو آج دو ماہ ہو گئے ——— اب تو چند گھنٹوں کا معاملہ ہے ——— خدا کرے بچ جائیں۔ میں تو یہی دعا کرتا ہوں ~~——~~ خدا میری سُن لے۔ ایسا راجہ تو جودھپور میں اب نہ ہوگا ———
مہارانی: حکیم صاحب۔ میرا بھیم کیسا ہو گیا؟ ——— دوا دیجیے
بھیم سنگھ: (رُک رُک کر) اب۔ کیا۔ کیا کیا فائدہ۔ دق۔ وقت پہ پورا ہو گیا۔
(مہارانی رونے لگتی ہے)
حکیم صاحب: فکر نہ کیجیے، انشاءاللہ اچھے ہو جائینگے۔ ضعف بہت ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔
[مان سنگھ ولیعہد جودھپور آتا ہے]
حکیم صاحب: راجکمار صاحب۔ مزاج اچھا ہے۔
راجکمار: ہاں۔ یہ تو کہیے، کیا حالت ہے؟ مہاراج کیسے ہیں؟
[اسی عرصہ میں بھیم سنگھ کو استفراغ ہوا]
مہارانی: مان سنگھ! دیکھو مہاراجہ کو کیا ہوا ہے؟ (مہارانی رونے لگتی ہے)
مانسنگھ: ماتا جی، میں بھی تو یہی دیکھ رہا ہوں ——— (وہ بھی روتا ہے)
بھیم سنگھ: (ہاتھ جوڑتے ہوئے) ماتا جی، ماتا جی ——— (کہتے ہوئے ہچکی آئی) ماتا جی، ماتا جی ——— (دوبارہ ہچکی آئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا)
[دم نکل گیا۔ خبر مشہور ہو گئی]
بھیم سنگھ مہارانہ جودھپور چل بسے، ولیعہد مہاراجہ مان سنگھ، راجگدی پر بیٹھ گئے ———

منظر اول مجلس ششم

کرشن کنور، سیتا، سہیلیاں

شب کے تین پہر گزر چکے ہیں۔ چاند اپنے انتہائی جمال و کمال سے کائنات کو منور کر رہا ہے۔ جگمگا رہا ہے۔ ملکۂ حسن کی فرماں روا "کرشن کنور" باغ میں متحیر، سرد و متفکر و سراسیمہ ٹہل رہی ہے

اسکے پریشان کھلے ہوئے بالوں سے فرشتہ تجلی (قمر) کی زریں شعاعیں شوخیاں کر رہی ہیں اور نسیم سحری کے خوش آیند سرد و لطیف جھونکے ساری کے آنچلوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں —— کرشن کنور چاندنی میں سر جھکائے ستار پر نغمہ سنجی شروع کرتی ہے —— اُسکی آواز میں بلا کی کشش ہے کہ جملہ حاضرات محو ہیں - ایک عجیب دلفریب سکون فضائے لطیف میں جاری و ساری ہے - گویا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساحرہ سحر کر رہی ہے اور اُسکے اثر سے کائنات کی روحیں جامد و ساکت ہوگئی ہیں دفعتاً وہ بے اختیاری سے مسکراتی ہے —— اُسکے صاف موتی سے زیادہ آبدار دانت بہت شان و شوکت سے چمکتے ہیں —— حاضرات کی آنکھوں کے سامنے ایک لحہ سطحی لہر بجلی سی کوندجاتی ہے —— آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں - العظمۃ للہ - کہیں حسن کے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے!

کرشن کنور سیتا سے کہتی ہے]

"سیتا" "سیتا" —— کچھ سُنا؟

سیتا راجکماری، حُکم؟

کرشن کنور سُنو —— (کہتے کہتے آنسو جاری ہو گئے)

سیتا راجکماری، کچھ کہیے بھی کیا ہوا؟ خیر ہے؟

سہیلیاں، اسی لیے تو رانی جی آدھی رات کو باغ میں آنے سے منع کرتی ہیں - ہو گیا —— شاید کسی چھچھی کا سایہ ہو گیا

سیتا —— خاموش رہو —— راجکماری بولیے کچھ —— تو میں جا کر رانی جی کو خبر کرتی ہوں —— " [جانے لگتی ہے - راجکماری پکڑتی ہے]

کرشن کنور (روتے ہوئے سکیاں لیکر) میں اسی لیے تم لوگوں کو منع کرتی تھی کہ زیادہ خوشی نہ کرو —— دیکھا —— (روکر) —— انجام —— مہاراج —— سُرگ باشی ہوئے

[سب سہیلیاں مغموم ہو کر کرشن کنور کے ساتھ غم میں شریک ہوتی ہیں]

اب سنا ہے ان سنگھ —— کا پتر آیا ہے —— کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ —— مہاراج بیکنٹھ باشی کے بعد —— جودھپور کے سنگھاسن پر راج کروں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا —— کبھی نہیں - میں جودھپور کبھی بھی نہ جاؤنگی چاہے ادھر کی سنسار اُدھر ہو جائے —— کیا راجستان کی دیویاں —— میرا ٹھٹھا نہ کریں گی

سیتا ۔ مہاراجا کے گزر جانے کا ہم سب ہی کو افسوس ہے ۔ اُنکے بعد —— جودھ پور ... نا ثابت
بے غیرتی ہے ۔ ایسے ... ہوگا ہی جو ایشور رچا ہیں ۔

کرشن کنور —— تم کل پتا جی کو میرا یہ سندیس ضرور پہونچا دینا ۔

سیتا —— کل میں نے رانی چاند کنور سے سُنا ہے کہ مہاراج جگت سنگھ کا بھی کوئی پتر آیا ہے ۔
سنا ہے مہاراج بیکنٹھ باشی کے بعد اس راجستان میں مہاراج جگت سنگھ سا سندر سجیلا سوا
دوسرا نہیں ہے ۔ ——

کرشن کنور —— میں اپنی جان سے عاجز آ گئی ہوں —— کچھ ہو میں جودھ پور نہ جاؤنگی
—— چاہے پران جائے ۔ سیتا ۔ سیتا ، سنو —— یہ کتے اسوقت کیوں
بھونک رہے ہیں —— میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے —— رام خیر کرے
کچھ آثار اچھے نہیں ہیں ——"

سیتا راجکماری آپ ان وسواسوں کی چنتا نہ کیجیے —— اب آپ محل میں چلیں ——
صبح کا ستارہ وہ دیکھیے (اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوے) نکل آیا ہے —— چلیے ——
محل میں چلیے —— آپ فکر نہ کیجیے ۔ میں یہ سندیس مہاراجہ کو بھور ہوتے ہی پہونچا دونگی ۔

کرشن کنور —— سیتا جاؤ —— نہیں ، سہیلیو تم جاؤ —— سیتا تم سے باتیں کرتی میں
ساتھ چلونگی ——

[خوبصورت مجمع منتشر ہو گیا ، گویا ستاروں کا جھمگھٹ غائب ہو گیا اور ماہتاب چمکنا شروع ہوا]
کرشن کنور اور سیتا دونوں پُر اُتر کر گفتگو کرتی ہوئی چور دروازہ سے محل میں داخل ہو جاتی ہیں]

(پردہ)

منظر دوم ۔ مجلس اول ۔

[مہاراجا جودھ پور کے انتقال سے اُدے پور میں تہلکہ پڑ گیا —— مہاراجہ جے پور اور مہاراجہ
جودھپور (جانشین) نے پیامات دیے ۔ یہی نہیں بلکہ سندھیا کی امداد مان سنگھ مہاراجہ جودھ پور نے
حاصل کی ، اور جے پور نے امیر خاں نواب ٹونک کی امداد سے ایک دوسرے پر چڑھائی کر دی ۔ مان سنگھ
کو شکست ہوئی ۔ راج پاٹ چھن گیا ۔ دوبارہ امیر خاں نے بلکہ کے خیال سے مان سنگھ کا ساتھ دیا ، راجگدی
دوبارہ ملی —— اسوقت مہاراجہ اودے پور دربار میں جلوہ افروز ہیں ۔ اُنکے وزراء اور امراء دربار

[مہاراجہ جودھپور کا خط قاصد لاتا ہے]

میں موجود ہیں ۔ مہاراجہ جودھپور کا خط

وزیر ۔ مہارانا اودے پور ۔ مان سنگھ مہاراجہ جودھپور کا خط

...جودھپوری موت نے میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے ۔

مہاراجہ جے پور کا پیام آیا ہے ۔ خیال ہوتا ہے منظور کر لیا جائے ۔ راجپوتانہ میں بھیم سنگھ کے

بعد مہاراجہ جگت سنگھ کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے ۔

وزیر ۔ بجا ، درست ۔ مہاراجہ جگت سنگھ کا کیا کہنا ۔ چندر مان ہیں ۔

[مہاراجہ جودھپور کا خط لے کر قاصد آتا ہے]

وزیر ۔ اَن داتا ۔ بڑا غضب ہوا

مہارانا ۔ کیا ——— ؟

وزیر ۔ مہاراجہ مان سنگھ کا یہ پتر آیا (دکھا کر پڑھتے ہوئے) ہے اس میں تو ایک عجیب بات لکھی ہے

مہارانا ۔ پڑھو کیا بات ہے میں بھی تو سنوں ——— کیا لکھا ہے ۔

وزیر ۔ (پڑھ کر) "راجکماری کرشن کنور کی نسبت جودھپور کے سنگھاسن سے ...... ہوئی تھی بھیم سنگھ سے نہیں ہوئی تھی ۔ اب میں سنگھاسن پر ہوں ، اس لیے میرا سمبندھ کرشن کنور سے ہوگا "

مہاراجہ ۔ بتلاؤ ۔ میں کیا کروں ۔ یہ معاملہ عجیب مشکل ہو گیا ہے

وزیر ۔ کچھ اور بھی میں نے سنا ہے ، رام کرے جھوٹ ہو !

مہاراج ۔ کیا ——— کہو ———

وزیر ۔ میں نے سنا ہے کہ مان سنگھ نے مہاراجہ سندھیا سے سہایتہ مانگی ہے ——— اور اَن داتا مہاراج جے پور نے نواب ٹونک امیر خاں سے مدد مانگی ہے اُنکی فوج تو جے پور سے چل چکی ہے

مہاراج ۔ اس معاملہ میں کیا کروں ——— جودھپور کو کیا جواب دوں ——— مشکل یہ ہے کہ کرشن کنور بھی جودھپور جانے کے لیے اب تیار نہیں ہے ——— اچھا انکار لکھدو ——— دیکھا جائے گا جو کچھ ہو ———"

وزیر ——— جواب لکھ دوں ——— سخت خونریزی ہوگی ۔ ہزارہا راجپوت سورما قتل ہوں گے ۔ ریاستیں برباد ہو جائیں گی ۔ ہزارہا بچے یتیم ہونگے ——— ہزارہا پتی برتا استریوں کے سُہاگ لُٹیں گے ——— جواب لکھدوں ۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے ، جو حکم ہو لکھ دوں ———

مہاراج ——— [ایک ہرکارہ خبر لاتا ہے کہ جے پور اور جودھپور کی فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی]
لکھ دو

[ختم شد]

منظر دوم مجلس دوم

امیر خاں - جگت سنگھ - مان سنگھ

[ادےپور کی رانا کی بیٹی کرشنا کا جواب آیا ہے - مان سنگھ کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی - جے پور کے شبستان شاہی تک اس پیکر وفا کی خبر فضائے حسن سے اڑ کر پہونچی - راجہ جگت سنگھ اس پیکر حسن کا دلدادہ عاشق، اس عشق و عاشقی کا قصہ جے پور کے شبستان شاہی سے باہر نکل کر اودے پور کی تنگ و تاریک گلیوں سے گونجتا ہوا مہاراجہ جودھپور کے کانوں تک پہونچا ——— کرشن کنور کو بھی علم ہوا جو دھپور کے مقابلہ میں جے پور کو ترجیح دی گئی ——— تعوق رنگ لایا ——— رقابت کی خوفناک آگ مان سنگھ کے سینے میں بھڑکی ——— دونوں سلطنتیں حسن و عشق کی جنگ زرگری میں مصروف ہو گئیں - نواب امیر خاں سرپنچ مقرر ہوئے ——— [امیر خاں نواب ٹونک کا دربار ہے جو بحیثیت حکم اپنا فیصلہ صادر کرنے والا ہے - تمام والیان ریاست یا اُنکے نمائندے دربار میں موجود ہیں]

امیر خاں - راجہ جگت سنگھ - کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی ؟
جگت سنگھ - ضرور -
امیر خاں - راجہ مان سنگھ - کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی ؟
مان سنگھ - مہاراجگی آپ ہی کی کرپا سے ملی -
امیر خاں - آپ دونوں میری بات مانیں گے ؟
جگت سنگھ - میں تو آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں
مان سنگھ - میں تو احسانمند ہوں
امیر خاں - بس میری خوشی یہی ہے کہ آج سے لڑائی ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے ——— کیا آپ لوگ منظور کریں گے ؟
جگت سنگھ - منظور
مان سنگھ - کوئی شرط ؟

آپ کی لڑکی کا کیا نام ہے ؟
امیر خاں - راجہ مان سنگھ - آپ کی لڑکی کا کیا نام ہے ؟
مان سنگھ - (حیرت سے) چندر کنور -
جگت سنگھ (متعجب ہو کر) لیلا وتی -
امیر خاں - ان لڑکیوں کے متعلق جو کچھ میں کہوں، آپ دونوں کو منظور ہوگا ؟ وہ یہ کہ جے پور کے راجہ کی شادی راجہ جودھپور کی لڑکی سے ہو —— اور راجہ جودھپور کی شادی لیلا وتی سے —— کیا آپ کو منظور ہے ؟
جگت سنگھ - مجھ کو جودھپور سنگھاسن کو اپنی بہن دینا منظور ہے
مان سنگھ - مجھ کو بھی منظور ہے -
امیر خان - میرا فیصلہ یہی ہے - اب آپ لوگ اسی پر قائم رہیے - یہ وہ رابطہ اتحاد ہوگا کہ آیندہ نسلیں مجھ کو دعاؤں سے یاد کریں گی اور کبھی بھی ان دونوں سلطنتوں میں جنگ نہ ہوگی - میں دعا کرتا ہوں کہ آپ لوگ خوش و خرم رہیں ....
مان سنگھ - یہ تو سب ہوا، لیکن کرشن کنور کا کیا حشر ہوگا ؟
امیر خاں - راجہ صاحب آپ کو اس معاملہ میں بولنے کا حق نہیں ہے - لیکن یہ خیال رکھیے کہ اس ناٹک کا آخری عبرتناک انجام وہی ہوگی -
[دربار برخاست ہوتا ہے مان سنگھ اور جگت سنگھ معانقہ کرتے ہیں اور باہر چلے جاتے ہیں]

منظر دوم - مجلس سوم

مہاراجہ اودیپور کا دربار ہے - ایک وفد سردار اجیت سنگھ کی سرکردگی میں امیر خاں کے سمجھانے بجھانے سے مہاراجہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کرشن کنور کو زہر دیدیا جائے، ورنہ ریاست میں بغاوت پھیل جائے گی —— اور جے پور پر سارا راجپوتانہ حملہ کریگا —— مہاراجہ خوفزدہ ہو کر امیر خاں کے اس نسخے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو گیا

مہاراجہ اودیپور - سردار اجیت سنگھ - دیگر سردار - چاند کنور - کرشن کنور

[ایک ہرکارہ وفد کی آمد کی اطلاع دیتا ہے]

ہرکارہ - ان داتا - سردار اجیت سنگھ کچھ سرداروں کو لیکر آپ سے ملنے آئے ہیں ——

مہاراجہ ـــــ بلالو ـــــ [ہرکارہ جاتا ہے۔ اور وہ ان کو بلا کر لاتا ہے]

مہاراجہ۔ سردار اجیت سنگھ۔ آج کیسے آئے؟

اجیت سنگھ۔ بہت ضرورت تھی۔ حکم ہو تو عرض کروں؟

مہاراجہ۔ ضرور۔ شوق سے بیان کرو ـــــ

اجیت سنگھ۔ مہاراجہ۔ راجپوتانہ تباہ ہو رہا ہے ـــــ جنگ کے شعلے اب بجھائے نہیں بجھتے ـــــ ریاستیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ جنگ کسی طرح موقوف ہونا چاہیے ـــــ

دیگر سردار۔ ہاں مہارانا۔ جنگ ضرور موقوف ہونا چاہیے۔

مہارانا۔ (تعجب سے یہ گفتگو سن کر) میں کیا کر سکتا ہوں؟

اجیت سنگھ۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ جنگ آپ کی راجکماری کرشن کنور کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ گلاب کا پھول مسل کر پھینک دیا جائے تو جنگ آج بند ہو سکتی ہے۔

مہاراجہ ـــــ کیا؟ کرشن کنور کا کیا قصور ہے؟

سب سردار۔ مہارانا۔ اس کا حسن ان جھگڑوں کا موجب ہے۔ اس کا قتل ملک کے لیے مفید ہے

مہاراجہ۔ اپنی بیٹی کو میں کس طرح قتل کر دوں۔ کسی نے یہ کہا ہے؟

سب سردار۔ آپ کو کرنا ہوگا (غصے میں چیخ کر) ہزاروں گھر برباد ہو جائیں، ہزاروں کے سہاگ لٹیں، ہزاروں گھر بے چراغ ہوں، لاکھوں باپوں کو ترسیں۔ ـــــ یہ ممکن ہے اور کرشن کنور کا قتل ناممکن ـــــ

مہاراجہ (غصے میں) یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

سب سردار۔ نہیں ہو سکتا ـــــ آپ کو دھوکا ہے۔ ہم کرشن کو آپ سے زبردستی چھین کر نواب امیر خاں کے سپرد کر دینگے، چونکہ یہ فیصلہ ہے کہ بغیر کرشن کنور کی موت کے جے پور اور جودھ پور میں فیصلہ نہیں ہو سکتا ـــــ "

مہاراجہ ـــــ کیا کسی اور طرح فیصلہ ممکن نہیں ہے؟

سب سردار ـــــ نہیں۔ یا تو سلطنت سے ہاتھ دھوئیے یا لڑکی کی محبت سے باز آئیے

اجیت سنگھ ـــــ آپ کو نواب امیر خاں والی ٹونک کی طاقت کا حال معلوم ہے ـــــ؟

مہاراجہ ـــــ کیا طاقت ہے! ایک لٹیرے کی طاقت ہی کیا ہو سکتی ہے ـــــ بلکہ ہم نے اپنی کمزوری سے ٹونک کا علاقہ بخش دیا ـــــ ورنہ اب تک وہ رحم پر رہتے ـــــ

میں اسے اٹھائی گیروں ——— کی گیدڑ بھبکیوں میں آکر اپنی آنکھ کی پتلی راج دلاری کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا ——— کیا ——— میں اپنی جوان لڑکی کے معصوم خون سے اپنے ہاتھ رنگوں ——— کیا پرتاتما ——— یہ پاپ ——— ان (اپنے ہاتھوں پر) ہاتھوں سے ——— کیا جس لڑکی کو ہزاروں آرزوؤں، ہزاروں منتوں سے پالا، اسکو اپنی آنکھوں سے تڑپتا دیکھوں ——— نہیں ——— نہیں، جاؤ ——— امیر خاں سے کہہ دو وہ جو کر سکتا ہے کر لے ——— کیا تم بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو الگ کر سکتے ہو ——— کیا تم بھی اپنی آنکھوں کو خود پھوڑ سکتے ہو ——— کیا اپنے پیروں میں تم بھی خود کلہاڑی مار سکتے ہو ——— جاؤ ——— میں کنیا کے خون سے ——— اپنی تلوار کو شرمندہ نہیں کروں گا ——— ایک راجپوت سے یہ نامردی ——— ناممکن

اجیت سنگھ ——— کیا راجپوتانہ کی محبت آپ کو نہیں ہے؟

مہاراجہ — ضرور ——— نہ ہونے کی وجہ؟

سب سردار ——— کیا اودے پور کی راجدھانی سے آپ کو محبت نہیں ہے؟

مہاراجہ ——— ضرور ——— راجدھانی کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے۔

اجیت سنگھ ——— کیا یہ منظور ہے کہ راجگڈھ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، اسکی گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ جائیں ——— ہزاروں پتی برت استریاں چتا کے بلند اٹھتے ہوئے شعلوں میں بھسم ہو جائیں، کروڑہا بچے ایک دن میں بے ماں باپ کے ہو جائیں، ہزاروں گھرانے بے دیا ہو جائیں ——— تمام راجگڈھ (رام نہ کرے) تہس نہس ہو جائے ——— کیا آپ کو یہ منظور ہے کہ مہاراجہ کا راج راجگڈھ سے اٹھ جائے؟ کیا کیمپنی بہادر کا راج اس بیکنٹھ میں رچتا ہوا دیکھ کر آپ کا دل نہ دکھے گا۔ کیا ان بے وارثوں کو روتا ہوا دیکھ کر آپ کانپ نہ اٹھیں گے؟ کیا بھوکے اور فاقوں کے ماروں کی بدنصیبی پہ آپ آرام سے سنگھاسن پر بیٹھ کر ——— راج کرینگے؟ کیا ان راج دلاریوں ——— کنواری کنیاؤں کا پاپ آپ پہ نہ پڑیگا جنکا ——— اب سنسار میں کوئی وارث نہیں ہے ——— کیا ایک پھول کی خاطر سارا باغ ——— سارا بیکنٹھ ——— پامال ہوتا ہوا آپ دیکھنا پسند کریں گے ——— کیا ان بے باپوں کی آہوں کا دھواں ——— بیکار جائے گا۔ ——— کیا آپ ملک کی خاطر ایسی معمولی قربانی بھی نہیں کر سکتے ——— کیا آپ

کرشن کنور کو بلیدان نہیں دے سکتے — کیا دیوتاؤں کے غصہ سے آپ ڈرتے نہیں ہیں۔ — اگر ایسا ہے تو کرشن کنور کی موت کے بغیر راجپوتانہ کی ان قدیم اور مشہور سلطنتوں یعنی جے پور اور جودھ پور میں صلح و آشتی نہیں ہو سکتی۔ سارا راجپوتانہ آپ کا دشمن ہے۔

[اس تقریر سے دربار میں سناٹا چھا گیا]

مہارانا (بہت دیر خاموش رہنے کے بعد) لیکن کسی نے اپنی جوان لڑکی کو اپنے ہاتھوں ذبح کیا ہے؟

سب سردار۔ لیکن آپ کو کرنا ہوگا — ملک کی خاطر — مہاراجگان جودھ پور و جے پور کی عزت کی خاطر کرشن کنور کو موت کی بھینٹ چڑھنا ہوگا — یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ مجبور ہوں گے —"

مہارانا۔ (بہت دیر غور و خوض کے بعد) — اچھا ایسا ہی ہوگا — جاؤ۔ کل تم کو کرشن کنور کی موت کی خبر ملجائیگی۔ (منظر بدلتا ہے)

[دفعتاً پردہ گرتا ہے]

چاند کنور۔ کرشن کنور

مہارانا اودے پور نے اپنی بہن چاند کنور کو بلا کر کل معاملہ بیان کیا۔ محل میں تہلکہ مچ گیا لیکن مہارانا طے کر چکے تھے وہ ہو کر رہنا چاہیے تھا — کرشن کنور کو زہر دینے کے لیے مہارانا نے چاند کنور کو تجویز کیا۔ [چاند کنور ایک جام بلوریں میں زہر لیے ہوئے کرشن کنور کے سامنے موجود ہے]

چاند کنور۔ کرشن کنور، یہ زہر ہلاہل کا جام بلوریں تم کو رانا کی عزت کی خاطر پینا ہوگا — اپنے پتا کی لاج رکھ لو۔ اودے پور کی لاج رکھ لو۔ جلدی کرو — میں تمھاری موت کی خبر سنانے کے لیے مقرر کی گئی ہوں —"

کرشن کنور (زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر)

[کس قدر حسرتناک منظر ہے کہ کشتۂ فطرت عشاق یہ کہکر]

یہی بیان میر تقی تقدیر میں لکھا تھا

[جام زہر اپنے ہونٹوں سے لگا لیتی ہے]

(پردہ)

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

(مشیر احمد علوی، بی اے (علیگ))

نظرے خوش گزرے

لکھنؤ کے مشہور شاعر صفی صاحب کی ایک جدید الطبع مثنوی پر اس پرچہ میں ایک تنقید شائع کی جا رہی ہے۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی عزت ہمیں حاصل نہیں، مگر اس تنقید میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، اگر طباعت کی غلطی یا صاحبِ تنقید کی غلط فہمی کو اس میں دخل نہیں تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت سے صفی صاحب کی شہرت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔

لکھنؤ کے ایک دوسرے نامور شاعر سے جب اس مثنوی کا ذکر آیا تو اُنھوں نے بھی دلی افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ صفی صاحب کی مثنوی غلطیوں سے لبریز ہے۔

صفی صاحب بڑے مشاق شاعر ہیں۔ اس وجہ سے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ وہ اس قسم کے اسقام کو رفع کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ پھر حیرت ہے کہ یہ مثنوی موجودہ شکل میں کیوں شائع ہونے دی گئی۔

اگر کوئی خاص سبب عجلت کا تھا، اور نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، تو اُمید ہے کہ صفی صاحب جلد سے جلد توجہ فرما کر غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے، اور اگر بعض دوسرے شعراء کی طرح درجۂ اجتہاد حاصل کرنے کی غرض سے دانستہ اس قسم کے اغلاط کو رواج دینے کی کوشش کی گئی ہے، تو ہم بادب اُنکے اس رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

صفی صاحب، ہندوستانی اکیڈمی کے بھی رکن ہیں، اور غالباً اُنکا انتخاب شعرائے لکھنؤ کی نمایندگی کی غرض سے کیا گیا ہے، اس لیے اُن پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور اہلِ لکھنؤ کی اُن سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب سے متاثر و مرعوب ہو کر زبان و ادبِ اُردو کی تخریب گوارا نہ فرمائیں گے۔

گذشتہ ماہ صیام میں مولانا محمد علی صاحب نے "فسانۂ غم دل" کے عنوان سے ایک مضمون اپنے اخبار ہمدرد کے متعلق شائع فرمایا تھا، جس سے ظاہر ہوا کہ ہمدرد کی وجہ سے گذشتہ دو سال (۲۶ء و ۲۷ء) میں تیس ہزار سے زائد کا خسارہ اُنھیں برداشت کرنا پڑا۔ اور ہمدردانِ ہمدرد سے درخواست کی گئی تھی کہ اس خسارہ کی ادائی کے لیے امدادی رقوم بھیجنے کے علاوہ دو ہزار

کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دوسرے مضمون کے سلسلہ میں مولانا نے بعض جملے ایسے تحریر فرمائے تھے جنکی بنا پر اندیشہ ہوا کہ اب ہمدرد کے جاری رہنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

مولانا محمد علی صاحب نے ملک و قوم کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور جس سرگرمی و انہماک سے وہ نہایت ناموافق حالات میں اسکی کوشش فرماتے رہے ہیں کہ حصول آزادی کی راہ میں، خانہ جنگی اور باہمی منافرت کی بدولت جو سنگ گراں حائل ہے۔ اُسکو دفع کرکے ہندوستان کو اُس شاہراہ پر لگادیں جس پر چل کر دنیا کی دوسری قومیں عزت و آزادی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ اسکے لحاظ سے اُنکے لیے قطعاً محال تھا، کہ وہ اپنے اخباری کاروبار کے نظم و نسق پر پوری توجہ کرسکیں۔ اور ضرورت اسکی تھی، کہ کوئی منتظم اُنھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کردے۔ مگر ایسے کارکن کی غیر موجودگی کے باعث افسوس ہے کہ اُنکا اخبار جو اُنکی رہنمائی و ادارت میں قیمتی خدمات انجام دے رہا تھا، معرض خطر میں پڑ گیا۔

دلی خواہش تھی کہ وقت نکال کر دفتر ہمدرد پر کچھ وقت صرف کیا جائے اور جو تھوڑا سا کاروباری تجربہ ہے اُسکی بنا پر ایسے مشورے دیے جائیں کہ ہمدرد کے نقصانات میں کمی ہو اور آمدنی کے نئے وسائل پیدا ہوں، تاکہ اخبار بند نہ ہونے پائے۔

جنوری میں جب مولانا محمد علی صاحب سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے تو اُسوقت بھی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا اور اُنھوں نے اسے پسند فرمایا تھا، مگر ہر کام کے لیے ایک وقت معین ہے۔ چنانچہ ایسٹر کی تعطیل میں ایک کاروباری ضرورت سے "مشرق" کے دارالصدر میں حاضری دینے کا تہیہ تھا، سفر کی تیاری ہو چکی تھی کہ ہمدرد کا یہ آخری مضمون کسی دوسرے اخبار میں پڑھا اور طبیعت بےچین ہو گئی۔ راہِ سفر فوراً تبدیل کرکے دہلی حاضر ہوا، اور دو تین روز تک ہمدرد کے حسابات آمد و صرف دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مناسب انتظام ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمدرد کو بند کرنا پڑے۔

ہمدرد کی اشاعت بہت زیادہ نہیں، اور اس زمانہ میں تقریباً تمام اخبارات کی حالت یہی ہے۔ تحریک ترک موالات کے زمانہ میں اور اُس سے پہلے جو جوش اہل ملک میں پیدا ہوا تھا، اب اُسکے رد عمل نے [illegible] ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے والے اخبارات اور ایسے جرائد جو قومی ضرورتوں اور اخبار نویسی کے اصولوں سے زیادہ اخبار کی آمدنی کو عزیز سمجھتے ہیں، ممکن ہے کہ اس

سرد مہری کے زمانہ میں بھی خاصی اشاعت رکھتے ہوں ورنہ ہماتما گاندھی کے اخبارات تک کی اشاعت زیادہ نہ رہی - برا نیم ہمدرد کی اشاعت اسوقت بھی اتنی ہے کہ اگر اس میں کوئی خاص کمی بیشی نہ ہو تو مناسب انتظام کی صورت میں اسکے آمد و صرف کو برابر رکھنا ممکن ہے -

مولانا محمد علی صاحب ہمدرد کے متعلق آخری فیصلہ کے لیے مولانا شوکت علی صاحب کی تشریف آوری کے منتظر تھے اس لیے قرار پایا کہ اس موقع پر میں دوبارہ حاضر ہوں تاکہ تمام امور پر ان کی موجودگی میں غور کیا جا سکے -

اس اثنا میں دفعۃً مولانا محمد علی صاحب کے لیے علاج کی غرض سے ولایت جانے کا سامان غیب سے ہو گیا اور جب عبدالماجد صاحب کی معیت میں دوبارہ دہلی حاضر ہونے کا موقع آیا تو اس نئی صورتِ حال کی وجہ سے مجبوراً ان تمام تجاویز کو عمل میں لانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی جن پر مولانا محمد علی صاحب کے زیرِ نگرانی عملدرآمد ہونا چاہیے تھا - ادارت کی نگرانی مولوی عبدالماجد صاحب کے سپرد ہے اور دفتر و مطبع کے انتظامات مجھ سے متعلق ہیں - اپنی نااہلیت اور مشاغل کی کثرت کے باوجود یہ ذمہ داری محض خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کرکے قبول کر لی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں - آمین

ہندوستانی ایکاڈمی

صوبہ متحدہ نے کچھ رقم اس غرض سے مخصوص کر دی ہے کہ اس سے اُن اردو اور ہندی کتابوں کی طبع و اشاعت کرے جن کو ایکاڈمی منظور کر لیگی - کتابیں خواہ کسی فن کی ہوں - جو لوگ اپنی کتابیں چھپوانا چاہتے ہوں، اُنکو اپنے مسودے ایکاڈمی میں بھیجنا چاہیے - اور طے کرنا چاہیے کہ کن شرطوں پر وہ اشاعت کے لیے دینا چاہتے ہیں -

مسودہ بالکل مکمل صورت میں اس طرح ہو کہ ایک صفحہ پر لکھا ہوا اور دوسرا سادہ رہے -

مسودہ دفتر میں ۳۱ - اگست تک پہونچ جائے

جنرل سکریٹری
ہندوستانی ایکاڈمی - الٰہ آباد

روانہ کیا اور مجھے لکھا کہ اوس کی نیابت مین کام انجام کرون یہ شخص کپتان اوزلی بعد
معزولی کے ہندوستان مین مجنون بھی ہوگیا تھا اور مشہور ہے مَن جُنَّ ساعۃً فقد جُنَّ ابداً
جو شخص گھڑی بھر سودائی ہوا وہ ہمیشہ سودائی رہتا ہے
حرکات اور سکنات اوس کے بالکل جنون کے تھے۔ لندن مین پہونچتے ہوئے
وزراے سلطنت کے پاس جا کے اوس نے درخواست کی کہ راقم کو بادشاہ نے عہدۂ
سفارت سے معزول کیا ہے اور اوس کو سفیر مقرر کیا ہے چونکہ دو تین دن اوس تاریخ مین
باقی تھے جو ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے دربار خاص کے واسطے مقرر ہوئی تھی غرض اوس کی
یہ تھی کہ ملکۂ کشور اور شاہزادون کے ساتھ وہی مجاز حضوری کا ہو اور راقم ممنوع حضوری سے ہو
لیکن اوس کی درخواست پر کچھ اعتنا نہ ہوئی اور جو بندوبست دربار کا قرار پا چکا تھا کہ سوا
ملکۂ کشور کے اور دونون شاہزادون کے اور راقم کے کوئی پانچوان آدمی مجاز حضوری کا نہین
ہوگا وہ بدستور قائم رہا اسی عرصہ مین وہ ذات شریف یعنی کپتان اوزلی مجنون سرشار ہوگئے اور ہسپتال
مین مقید ہوے۔ الغرض جب بادشاہ کے مقید ہونے کی خبر وہان پہونچی اور معلوم ہوا
کہ ہندوستان مین نہایت زور اور شور سے غدر شروع ہوگیا ہے۔ جو تدبیرین مقدمہ
کی درستی کی ہم نے کی تھین وہ سب برہم ہوگئین اور پارلیمنٹ مین جو درخواستین گذری
تھین اپنے مشاورین کی صلاح سے اون کو ملتوی کروایا یعنی پیروی اوسکی موقوف
کی حقیقت مین مقدمہ بادشاہ کا بہت اوبراہ تھا بہت قراین سے ہم کو نہایت امید ظفر کی تھی
مگر ہندوستان کے غدر نے اوس کو بگاڑ دیا پارلیمنٹ کے دونون ہوس کے بہت بڑے بڑے عمدہ
ممبر ہمارے معین اور مددگار تھے اگر کچھ نہ ہوتا تو اس مین شک نہ تھی کہ دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا
درماہہ ہوجاتا اور شہر لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہتے چنانچہ ابتدا مین جب
ہم ولایت گئے تھے ایک صاحب بہت جلیل القدر جو بورڈ آف کنٹرول مین تھے کہ کمپنی کے
اوپر وہ محکمہ حاکم تھا اونھون نے بطریق پرایوٹ یعنی خانگی طور پر مجھ سے کہا کہ تم نے ناحق اتنا
سفر دور دراز اختیار کیا اب جو یہان آئے ہو تو کمپنی کے ساتھ بندوبست کرو کمپنی بہت دولتمند ہے

ہندوستان کے غدر کے سبب سے تدبیرین مقدمہ کی برہم ہوگئین

دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا درماہہ کردیگی تم کو بھی تیس چالیس ہزار روپیہ کی جاگیر
دے سکتی ہے یہ خیال خام ہے کہ پارلیمنٹ سے ظفر حاصل ہو۔ اور چونکہ اول
سلطنت کی ضبطی کے وقت ایک عہدنامہ گورنر جنرل نے بھیجا تھا اوس مین لکھا
تھا کہ بارہ لاکھ روپیہ نقد بادشاہ کو دین گے اور تین لاکھ روپیہ کچھ سوار اور پیاؤں کی
فوج جلوسی کے واسطے اور کئی لاکھ روپیہ اقربا اور ملازمین کی پنشن کے لیے مقرر ہوگا
اور عزت اور وقعت بادشاہ کی بدستور رہیگی۔ اس کے ساتھ زبانی یہ بھی پیغام تھا کہ اگر بادشاہ اس پر
راضی نہ ہون تو اضافہ ہوجاے۔ اور جب ہم لوگ لندن مین پہونچے تو کمپنی کی طرف سے یہ بھی
تحریر گئی تھی کہ اگر بادشاہ چاہین تو چھ لاکھ روپیہ کا ملک واگذاشت کرو کہ اون کے قبضہ مین رہے۔
غرض یہ تھی کہ لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہین مگر پہلے تو ہندوستان کے غدر نے
معاملہ خراب کیا۔ پھر بادشاہ کی بے صبری نے بالکل سب ابتر کردیا کہ وہ عہدنامہ جو پہلے آیا تھا
اوس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسی عہدنامہ کے بارہ لاکھ روپیہ قبول کرلیے جو غالبا اونھین کی ذات
تک باقی رہین گے۔ اب کیفیت وہان کے معاملات وقوعی کی مین نقل کرتا ہون۔ جن
تدابیر سے کہ وہان مروج مین ایسا سامان ہوا کہ سیکڑون عرایض تمام ممالک سلطنت برطانیہ
اعظم سے پارلیمنٹ مین اور ملکہ معظمہ کے حضور مین گذرنا شروع ہوئے جس مین بعضی عرضیون پر پانچ ہزار
اور دس ہزار آدمی کے دستخط تھے کسی عرضی مین یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ پر بڑا
ظلم ہوا ہے اون کا ملک چھوڑ دینا چاہیے اکثر یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ کے مقدمہ کی تحقیقات
عدالت اور انصاف سے کرنی لازم ہے۔ جب لکھنؤ مین غدر بہت طول ہوا اور سیکڑون بڑے بڑے
افسر یہان مارے گئے۔ اب آرا علی العموم لوگون کے بدل گئے اور وہی بڑے بڑے ممبر دونون
ہوس کے پارلیمنٹ مین جو ہمارے معین تھے یہ تقریر کرنے لگے کہ اگر لکھنؤ فتح نہ کیا جائے تو ہماری قوم
کی ناک کٹ گئی اور جب علی العموم ہندوستان کی خبرین متضمن قتل اور خون بڑے بڑے افسرون
کے خصوص جو یہان کے حمقا اور جہلا نے عورتون پر اور لڑکون پر ظلم اور ستم کیے تھے پہونچنی شروع ہوئین

سب نیات عدل اور انصاف کے جو لوگون کے تھے منقلب ہو گئے۔ اب تقدیر نے اس حالت مین ہمارے اس مجمع سفارت مین فتور برپا کر دیا۔ وہ دربار ملکۂ کشور کا جو بڑی دھوم دھام سے ہر جمعرات کو ہوتا تھا اوس مین کمی شروع ہوئی اور ملکۂ کشور کا جو عارضہ دائمی استحاضہ کا تھا اوس مین کچھ زیادتی ہوئی وہ نہایت گھبرائین اور اونھون نے قصد مراجعت کا کیا لندن سے روانہ ہوئین پارس فرانس کے دار السلطنت مین پہونچی تھین کہ وہ وہان قضا کر گئین۔ تار کے ذریعہ سے جب لندن مین خبر آئی یہان سے راقم اور دونون شاہزادے وہان پہونچے اور اون کو دفن کیا پارس مین وہان کے شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا اون قطعات سے جو مقابر کے واسطے وہان موضوع ہین محاط کر کے اور اوس کے وسط مین ایک کمرہ بنام نہاد مسجد بنا دیا ہے اور وہ قطعہ محاط سلطان روم کے سفیر کے اختیار مین چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل اسلام مین سے اون کے ہمراہیون مین قضا کر جاے وہ وہان دفن ہو۔ مگر دستور کے موافق قیمت زمین کی جو متعلق میونسپل یعنی شہر کے منتظمین سے ہے داخل کرنا ضرور ہے اور زمین کی قیمت کا یہ حال ہے کہ اگر برس دو برس کے واسطے [illegible] مول ہوے تو قیمت کم دینی پڑتی ہے بعد برس دو برس کے ہڈیان مردون کی نکال کے کسی [illegible] ڈال دیتے ہین اور زمین خالی کر لیتے ہین اور اگر ہمیشہ کے واسطے زمین مول ہوے و قبر پر حظیرہ وغیرہ بنا دے تو قیمت بہت دینی پڑتی ہے غرض پہلے تو تجارت روم کے سفیر سے کی گئی بعد اون کی اجازت کے وہان پہنچا کے دفن کیا اوس وقت تک [illegible] مین کوئی مسلمان مدفون نہین ہوا تھا۔ چار پانچ [illegible] کا ایک قطعہ زمین کا [illegible] ارادہ تھا کہ اوس پر کوئی حظیرہ بنوایا جائیگا چنانچہ صرف ایک سنگ مرمر کا چبوترہ وہان بنوایا گیا تھا اوس مین تین ہزار روپیہ خرچ ہوے۔ لاش ملکۂ کشور کی [illegible] سے اوٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ مین ہوتین تو اس عظمت اور شوکت سے گمان نہین ہے کہ اوٹھتی۔ سلطان روم کے سفیر اور بادشاہ ایران کے سفیر اور [illegible]

کیفیت فتور کی سفارت کے مجمع مین در ملکۂ کشور کا قضا کرنا

پارس مین شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین محاط کر کے اور اوس مین ایک مکان [illegible] سلطان روم کے سفیر کے [illegible] ہمراہیون مین جو مرے وہان دفن ہو۔ [illegible]

[illegible]

سلطنت کے اور بہت سے امرا اور اجلہ وہان کے ہمراہ تھے سیکڑون گاڑیان سواری کے ساتھ تھین
اور اوس مہمانسرا سے جہان اقامت تھی مقابر تک قریب چار یا پانچ میل کا فاصلہ تھا چنانچہ
برابر اوس رستہ مین دورویہ تماشائیون کی ایک ٹٹی تھی مثل مشہور ہے کہ اگر تھالی پھینکتے تو سر ہی پر
پر جاتی بعد فراغت کے دفن سے جب اقامت گاہ پر پھر کے آئے اوس وقت شہنشاہ نے ایک
کسی کو اپنے وزراؤن مین سے تعزیت کے واسطے بھیجا اور پیغام دیا کہ شہنشاہ چاہتے
ہین کہ دونون شہزادون کو لیکے اون کے دربار مین راقم حاضر ہو چونکہ بدون توسط اپنی سلطنت
کے سفیر کے اور بدون اون کی اجازت کے راقم کی راے مین حضوری اون کی دربار
مین مناسب نہ تھی جواب اوس کا دوسرے روز پر ملتوی رکھا اور دوسرے دن راقم
قصر سلطنت مین حاضر ہوا ایک بڑے وزراؤن مین شہنشاہ کے تھے جن کو ہماری
ہندوستان کی اصطلاح مین عرض بیگی کہنا چاہیے اون کے پاس مین گیا جہان
وہ بیٹھے تھے وہ بہت بڑا دالان تھا بیچ مین ایک پردہ پڑا ہوا تھا پردہ کے اوس
طرف خود شہنشاہ بیٹھے تھے ظاہرا اس واسطے کہ جو کچھ گفتگو ہو وہ خود سنین - راقم نے
عرض کیا کہ ہمارے شاہزادون کو شہنشاہ کے حضور مین حاضر ہونا نہایت اون کا
موجب فخر اور اعزاز کا ہے اور گویا وہ تقریب نہایت مسرت کی ہے ایسی مسرت
کی تقریب مین ایسی اس حالت ماتم داری مین جس مین اللہ تعالے نے اون کو مبتلا
کیا ہے شہنشاہ کے دربار مین حاضر ہونے کو خلاف ادب سمجھتے ہین - امید یہ ہے کہ
اس عدم حضوری کو شہنشاہ معاف کرین - بعد اوس کے راقم نے عرض کیا کہ ملکہ کشور
کا اس سفر دور و دراز مین آکے شہنشاہ کے دار السلطنت مین قضا کرنا یہ دلیل اس پر ہے کہ وہ
مستغاثی اون مظالم کی جو اون پر واقع ہوے خدا کی درگاہ مین شہنشاہ کے ذریعہ سے ہوئی
ہین اس واسطے ہم لوگ امیدوار ہین کہ شہنشاہ ہم لوگون کی حق رسی کی اعانت فرماوین - مگر
اعانت دوستانہ سلطنت برطانیہ اعظم کے ساتھ ہمین مطلوب ہے معاندانہ اعانت کی درخواست

شہنشاہ فرانس کی طرف سے ایک وزیر تعزیت کے واسطے آئے اور راقم کو اور دونون شہزادون کو اپنے دربار مین طلب کیا

راقم کا قصر سلطنت مین فرانس کے شہنشاہ کے جانا اور بسبب ماتم داری کے شاہزادون کی حضوری کا عذر کرنا اور درخواست شہنشاہ کی مدد و اعانت کی مقدمہ مین

نہین ہے بعد اوس کے راقم نے اونھین وزیر سے کہا کہ مین امیدوار ہون کہ اس کا جواب شہنشاہ
دیوین اوس سے مجھکو اطلاع ہو دوسرے یا تیسرے دن ایک خط حسب الحکم شہنشاہ کے اونھون نے
مجھے لکھا اوسکا عجب گول گول مضمون تھا خلاصہ اوس کا یہ تھا کہ شہنشاہ کی دل سے خواہش ہے
کہ سارے عالم کے اقوام اپنے حق کو پہونچین اور اگرچہ اعانت ہماری موقوف بہت بکھیڑون پر
ہے مگر شہنشاہ کو یقین واثق ہے کہ سلطنت باشوکت برطانیہ اعظم کی خواہ مخواہ خود دادرسی
کریگی۔ بعد اوس کے جب ہمارے مرزا ولی عہد بہادر مجھ سے مخالف ہو گئے اوھون نے
پارس مین جا کے اقامت کی جس کی شرح مین آیندہ لکھونگا ظاہرا وہان اون کے ہمراہیون
نے فکر کی کہ شہنشاہ کے دربار مین اون کو لیجاوین اور درخواست اون کی شہنشاہ کے
پاس پہونچی۔ اون کی ملاقات تنہا شہنشاہ نے منظور نہ کی اور پھر اونھین وزیر کا خط حسب الحکم
شہنشاہ کے میرے پاس لندن مین آیا اس مضمون کا کہ آج کل شہنشاہ کو فرصت ہے۔ تم
اپنے شاہزادہ کو لیکے دربار مین حاضر ہو۔ مگر اوس عرصہ مین راقم ایسا حوادث غیر متوقعہ
مین مبتلا ہو گیا کہ نوبت وہان جانے کی نہ آئی الغرض وہان سے معاودت کرکے پھر لندن مین
آئے یہان مرزا جواد علی سکندر حشمت بہادر نہایت مریض ہوے اور پورے ایک
مہینے کے بعد ملکۂ کشور کے قضا کرنے سے وہ بھی قضا کر گئے اون کا عارضہ
عجیب اور غریب ہوا۔ ایک دنبل اون کے مبرز پر بہت پچھلے دنون مین نکلا تھا کہ وہ ناسور
ہو گیا تھا کبھی اوس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دنبل ہو کے پکتا اور پھوٹتا تھا پھر جب بہنے لگا
تو تسکین ہو جاتی تھی ایکدفعہ اوسی ناسور نے بڑا زور کیا کہ اوس کے سبب سے تپ محرقہ ہوئی
آخرش اوسی عارضہ مین قضا کر گئے۔ اس عارضہ کی اون کے کیفیت نہایت موجب عبرت ہے
مرزا سکندر حشمت مزاج کے نہایت خلیق اور بامروت تھے اور بہت سے صفات مستحسن کے
متصف تھے لیکن مذہب تشیع مین اون کو نہایت تعصب اور غلو تھا چنانچہ کمال جہالت سے
اونھون نے ایک طشت چاندی یا تانبے کا بنوایا تھا اوس پر خلفائے ثلثہ رضوان اللہ علیہم اور اور

[illegible]

مرزا سکندر حشمت کا قضا کر جانا اور ایک مہینے بعد ملکۂ کشور کے قضا کرنے کے

بزرگان دین کے نام کندہ کروائے تھے اور وہ طشت ہمیشہ پاخانہ کی چوکی مین لگا رہتا تھا
قطع نظر اوس بے ادبی کے بزرگان عظام کے اسما سے حروف وہ جن سے قرآن شریف لکھا جاے
میرے زعم مین شیعہ کے مذہب مین بھی یہ بے ادبی اون حروف سے جایز نہ ہوگی۔ بہرصورت
میرے عقیدہ مین اللہ تعالے نے اوسی بے ادبی کے انتقام کے واسطے اون کے میرزیرنا سور پیدا
کیا اور اوسی عارضہ مین قضا کر گئے تاکہ اور ون کو عبرت ہو واللہ علی کل شئی قدیر۔ الغرض اون کی
لاش کو راقم لندن سے پارس مین لے گیا اور اون کو بھی اوسی دھوم دھام سے جو ملکۂ کشور کی
لاش کے اوٹھانے مین ہوئی تھی اوخین کی ماں کے پہلو مین دفن کیا اور جب ہم لوگ سب
لندن مین پھر کے آئے۔ اب راقم عجب تشویش اور تردد مین مبتلا ہوا مفسدون نے ابتدا ہی مین
مرزا ولی عہد بہادر کو اور ملکۂ کشور کو میری طرف سے برہم کر رکھا تھا مگر صرف مرزا سکندر حشمت
البتہ مجھ سے موافق رہے اور وہ دونون بہت منحرف تھے اور انواع طرح کے وہان مفاسد برپا کیے
کہ شرح اون جزئیات کی بہت طول ہے لیکن بادشاہ کے احکام تاکیدی پہونچنے کے سبب سے کچھ
کسی کی چل نسکی تھی۔ اب ملکۂ کشور کے اور جنرل سکندر حشمت کے قضا کرنے سے ولیعہد جو
شروع شباب مین تھے یعنی سترہ یا اٹھارہ برس کی اون کی عمر تھی مفسدون نے اون کا
مزاج میری طرف سے برہم کرنا شروع کیا۔ ملکۂ کشور کا جو کچھ مال جواہرات اور نقدی تھا
وہ تو سب اون کے ہمراہی چکھ گئے تھے۔ اب درپے ہوے کہ جنرل سکندر حشمت کا مال اور
کچھ نقد روپیہ بادشاہی جو مقدمہ کے مصارف کے واسطے جنرل صاحب کی تحویل مین تھا
اوس کو بھی اوڑا وین۔ چونکہ مین نے خود کلکتہ سے روانگی کے وقت تحویل کا اپنے اختیار
مین لینا قبول نہین کیا تھا اس واسطے بادشاہ نے جنرل صاحب کو سب روپیہ سپرد کیا
تھا۔ اب مین یہ سمجھا کہ اگر مین اوس کی حفاظت نہ کرون تو بادشاہ مواخذہ کرینگے اس واسطے جو روپیہ
جنرل صاحب کی تحویل مین باقی تھا اوس کو اور کل اونکے اپنے اسباب کی فہرست لکھوا کے اپنے
قبضہ مین کیا اور ملکۂ کشور کے یہان کے لوگون نے بھی چاہا تھا کہ اُن کے متروکات کی بھی مین فہرست

مفسدون نے مرزا ولیعہد کا مزاج میری طرف سے برہم کیا

لکھواؤن لیکن اوس مین مین نے مداخلت نہ کی اس واسطے کہ وہان تغلبات علانیہ تھے کہ سچے
جواہرات کے عوض مین جھوٹے رکھے گئے تھے اور اون کی سرکار کے نقدی کے حساب مین
جرنل صاحب کی زندگی مین ایک بزرگوار آٹھ ہزار روپیہ نقد داخل کرنے تھے اور ایک فرد حساب
کی ساٹھ ستر ہزار روپیہ کی دیتے تھے اس شرط پر کہ اون کو فارغ خطی لکھدی جاے چونکہ مدات اوس
حساب کے سب مہمل تھے میرے مشورے سے جرنیل صاحب نے فارغ خطی دینے سے انکار کیا
اونھون نے جو روپیہ داخل کرتے تھے نہ دیا اب جرنل صاحب کے قضا کرنے کے بعد پھر مجھ سے
اونھون نے درخواست کی کہ اگر فارغ خطی مین لکھدون تو وہ روپیہ داخل کرین مین نے جواب دیا
کہ رسید البتہ اوس روپیہ کی مین دونگا اور حساب اونکا داخل کیا ہوا بادشاہ کے پاس بھیجدونگا اگر
وہان سے حکم فارغ خطی دینے کا آویگا اوس وقت مین فارغ خطی لکھدونگا غرض اونھون نے
وہ روپیہ بھی نہ دیا۔ اور چونکہ مرزا اسکندر حشمت کی سرکار مین چندان غبن اور تصرف نہ تھا اوس کو
مین اپنے اختیار مین لایا۔ اب مفسدون نے مرزا ولیعہد بہادر کو سمجھایا کہ سب مال و اسباب مرزا
سکندر حشمت کا وہ مجھ سے طلب کرین مین نے اون سے عرض کیا کہ [illegible]
کہ بادشاہ کے پاس سے جواب آوے سب مال و اسباب تو آپ ہی کا ہے آپ گھبراتے کیون ہین
مفسد لوگ جانتے تھے اور اون کو خود بھی یقین تھا کہ بادشاہ اون کی بے اختیاری اور میرا اختیار
لکھین گے اور سب لوگون سے محاسبہ سمجھنے کا مجھے حکم آویگا تو وہ سب چاہتے تھے کہ قبل حکم بادشاہ
کے آنے کے جو کچھ ہے اوس کو اوڑا اوڑا دیجیے مجھ پر جبر کیا جب مین نے نہ قبول کیا تو جھٹ عدالت مین
میرے نام پر نالش کروادی مین نے جواب دہی مین یہی لکھا کہ مین منتظر بادشاہ کے حکم
کا ہون اور بدون بادشاہ کے حکم کے مجھے احتمال بادشاہ کی بازپرس کا ہے۔ چونکہ
ظاہر مین راقم شخص اجنبی تھا ولیعہد کے موجود ہوتے ہوے مجھے جرنل صاحب کے متروکات
پر کچھ استحقاق نہ تھا اور ہندوستانی رئیسون کے دستورات سے وہان کے لوگون کو کچھ
اطلاع نہ تھی صرف بقدر میرے درماہہ کے اور میرے ہمراہی عملہ کے بابت چھ مہینے آیندہ کے عدالت نے

میرے ہاتھ مین چھوڑ کے حکم دیا کہ سب نقد عدالت مین جمع کردو اور سب مال و اسباب ولیعہد
کے سپرد کر دینے کا حکم کیا چونکہ سب جانتے تھے کہ عنقریب بادشاہ کا حکم میرے
تفویض اور اختیار کا آویگا ولیعہد کو بہکا کے سارا مال و اسباب لیکے لندن سے
روانہ ہوگئے اور پارس مین جا کے اقامت کی۔ بعد اون کی روانگی کے بادشاہ کا
حکم میرے نام پر سب مال و اسباب ملکۂ کشور کا اور جرنیل سکندر حشمت کا اپنے اختیار
مین لینے کا اور مواخذہ اور محاسبہ سب لوگون سے کرنے کا اور ولیعہد کی حفاظت کا اور
مفسدون کو اون کے پاس سے اخراج کرنے کا پہونچا اور گورنر جنرل کو بادشاہ نے
خط لکھا کہ ولایت کے حکام کو اطلاع کرین کہ وہ ہر طرح سے میری اعانت کرین مگر اب کیا
فایدہ ولیعہد مع سب مفسدون کے وہان سے چلے گئے تھے اگرچہ ممکن تھا کہ مین پارس
مین جا کے مفسدون کی دار و گیر کرتا مگر ایک تو آپس کے نزاع کو ایسی حالت نازک مین طول کرنا کہ
دوسرے سلطنت تک نوبت پہونچے اور ولیعہد کے موجب بدنامی ہو مناسب نہ تھا دوسرا یہ
کہ میرے پاس ایک حبہ باقی نہ رہا جو کچھ تھا ولیعہد لے کے چل دیے مین خود وہان مبتلا عسرت
مصارف مین ہوا پارس مین جا کے مقدمے لڑانے کی کس کو طاقت تھی مقدمہ کا صرف تو جدا رہا مین
اپنے مصارف ذاتی مین تنگ ہوا اور نوبت قرض لینے کی پہونچی اور اسی مجبوری سے مین
جعلسازون کے ہاتھ مین پھنس گیا اور چونکہ اوس ملک کے جعلسازون اور فریبیون
مین ہمارے ملک کے جعلسازون سے زمین آسمان کا فرق ہے اور میرا گمان یہ ہے
کہ فریبی اور جعلساز لوگون کو وہی پہچانے گا جو خود بھی اوس کوچہ سے عاری نہ ہو اور ہمارے
ملک کا کیسا ہی کوئی تجربہ کار کیون نہ ہو اون ممالک مین نئے تجربون کی حاجت ہے اس سبب
میرا پھنس جانا اون کے ہاتھ مین محل تعجب نہ تھا۔ الغرض جب مین ایسی تنگی اور عسرات مین مبتلا
جس شوکت اور عظمت سے وہان قریب دو برس کے گذرے تھے دفعۃً مصارف اوس کے
موقوف کر دینا عقل کے اور مصلحت کے خلاف معلوم ہوا اپنی جو کچھ جایداد ذاتی نقد کی جنس سے تھی

وہ سب خرچ ہوگئی ایسے وقت مین بعضے ایسے خیر طلب محبت سے اور اعانت سے پیش آئے کہ
مجھکو نہایت ممنون کیا ایک صاحب ان مین سے ایسے تھے کہ ہندوستان مین وزیری ناموری کے عہدہ
پر تھے اور لاکھون روپیہ کماکے یہان سے لے گئے تھے اگرچہ ہندوستان مین مجھسے اور اونسے ملاقات
نہین ہوئی تھی مگر اون کی ناموری کلکتہ مین راقم نے بہت سنی تھی اور لندن مین بہت بڑے بڑے
نامور لوگون کی آمدورفت اون کے یہان تھی وہ بھی لوگون کے یہان آتے جاتے اور نامور لوگ بھی اونکے یہان آتے جاتے تھے
بعضی بعضی پارلیمنٹ کے سردارون سے وہ ذریعہ میری ملاقات کے ہوے خواہ اپنے یہان دعوت کر کے
اون کو بلایا اور مجھے بھی شریک کیا یا وہ خود اون کے یہان مدعو ہوے اور مجھکو مدعو کروایا اور
بہت سی تدبیرین ہمارے مقدمہ کی درستی کی اونھون نے کین ایسے وجوہ سے کسی طرح کا شبہہ
جعلسازی کا اون کی طرف سے میرے دل مین نہ آیا اور جب میرا ارادہ ہوا کہ کچھ اپنا اسباب
منقولہ رہن یا بیع کر کے کچھ روپیہ بہم پہونچاؤن اونھون نے کہا استغفر اللہ اسباب کے رہن اور بیع
کی کیا حاجت ہے جس قدر روپیہ مطلوب ہے ہم بے تکلف دے دین گے چونکہ اوس وقت
مجھے پانچ ہزار روپیہ مطلوب تھا پانچ قطعہ کاغذ شام کے اونھون نے پیش کیے جس کو
وہان کی اصطلاح مین بل آف اکسچنج کہتے ہین اس غرض سے کہ سو سو پونڈ کے واسطے کہ ہزار ہزار
روپیہ ہے ایک ایک بل ہوگا اسکو دستخط کر دیجیے ہم روپیہ ابھی لے آتے ہین میرا گمان یہ
کہ وہ روپیہ اپنے گھر سے دیتے ہین مطلق جعلسازی کے ارادہ کا وہم بھی نہ تھا چونکہ وہان
کے دستورات سے بالکل ناواقفیت تھی اور بل آف اکسچنج کا حال بھی یہی سنا تھا کہ سادے کاغذ
پر لوگ دستخط کر دیا کرتے ہین اور قرض دینے والے اس نظر سے سادے کاغذ پر دستخط کرواتے ہین کہ
اگر قرضدار کچھ ادائے قرض مین بددیانتی کرے تو وہ بھی رقم قرض کی بڑھادین خصوص جب اجنبی
آدمی قرض کا خواستگار ہو تو ظاہرا اکثر ایسا کیا کرتے ہین ماحصل یہ ہے چونکہ اون لوگون پر نہایت اعتماد
ہوگیا تھا اور وہ دو آدمی سالے بہنوئی تھے اور اون کی بی بیان سب بہت بے تکلف ہونے کے
ساتھ ہوگئین تھین وہ سب اور اون کے لڑکے بالے سب مجھسے بہت محبت کرتے تھے کسی طرح کا کھٹکا

نہین آئی بعد رد و کد کے کہا صرف احتیاطاً مقید کیا ہے ۔ مین نے عرض کیا بہت مناسب ہے لیکن مکاتبات ہمارے ساتھ اون کے جاری رہین اور بادشاہ پر تکلیف کسی نہج کی قلعہ مین نہ ہو دونون امر کو قبول کیا مگر مکاتبات کے بارہ مین یہ شرط کی کہ کھلے ہوے خطوط ادھر سے بھی اور ادھر سے بھی آویں جاویں ۔ راقم نے ایک عرضی اوسی وقت بادشاہ کے حضور مین اس مضمون کی لکھی کہ حضور بے تکلف جو کچھ وہان واقع ہو لکھ کے اوسی طرح سے کھلا ہوا خط گورنر جنرل کے پاس بھیجدیا کیجیے اور کسی امر کے لکھنے مین خوف اور دریغ نہ کیجیے ۔ اور قلعہ مین تشریف رکھنے سے کچھ گھبرائیے نہین جو کچھ ہوا اوس وقت مین بہتر ہوا ۔ غرض بادشاہ نے جب تلک قلعہ مین تشریف رکھی برابر میرے عرایض اون کے پاس ہر میل مین یعنی جو ڈاک ہندوستان کی جاتی تھی پہونچا کیے ۔ اور بادشاہ کے حکمنامے میرے پاس آتے رہے اس عرصہ مین کمپنی کی حکومت ہندوستان سے موقوف ہوئی جس کی شرح چوتھے باب مین ہو چکی اور لارڈ اسٹانلے وزیر ہندوستان کے مقرر ہوے تھوڑے عرصہ کے بعد جب لکھنؤ کے فتح ہونے کی خبر بلوائیون کے ہاتھ سے پہونچی تب راقم نے بادشاہ کی رہائی کی وزرا سے درخواست شروع کی امروز فردا کا جواب ہوا کیا ۔ اتنے مین وزرا کنسرویٹو پارٹی کے معزول اور لبرل پارٹی کے وزرا مقرر ہوے اوس وقت لارڈ اسٹانلے جو وزیر ہندوستان کے تھے اونھون نے سر فریڈرک کیلی کے نام چٹھی جن نے ہماری درخواست استغاثہ کی پالیمنٹ مین پیش کی تھی اور وزراے معزول کے ساتھ اٹرنی جنرل تھے کہ وہ بھی ایک وزارت کا منصب ہے ایک چٹھی لکھی اس مضمون کی کہ آپ کی ڈاک جو ہندوستان سے آئی ہے اوس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کی رہائی زیر تجویز تھی یقین ہے کہ اگلی ڈاک مین خبر اون کی رہائی کی آویگی اور جو وزیر میری جگہ پر مقرر ہوا ہے اوس کو بادشاہ کے واسطے معقول بندوبست کرنے کا مین نے سمجھا دیا ہے اونھون نے وہ چٹھی اپنی چٹھی مین ملفوف کر کے میرے پاس بھیجدی راقم نے فوراً نقل اوس کی اپنی عرضی مین بادشاہ کے پاس روانہ کی اور لکھا مجھے امید ہے کہ یہ میری عرضی قصر سلطانی مین حضور کے پاس پہونچیگی مین امیدوار ہون کہ بجز قلعہ سے باہر

وزیر ہندوستان کی چٹھی آئی کہ بادشاہ کی رہائی
اگلی ڈاک مین خبر رہائی کی آئیگی

تشریف لانے کے مجھے اطلاع ہو کہ مین مقدمہ کی پیروی پھر شروع کرون - پہلا حکمنامہ میرے پاس
پہونچا کہ تا بدولت قلعہ سے باہر آئے اب تم مقدمہ کی پیروی شروع کرو - اوس کے دو ہفتہ کے
بعد ایک حکمنامہ پہونچا کہ کچھ ضرورت تمھارے حاضر ہونے کی یہان داعی ہوئی فورًا اپنے
تئین یہان پہونچاؤ معلوم ہوا بادشاہ نے پنشن قبول کرنے کی گورنر جنرل کو درخواست
دیدی اور چونکہ اوس کا عطا وہان سے محول میری معزولی پر عہدۂ سفارت سے ہو تیسرا
حکمنامہ میری معزولی کا جاری ہوا اور ظاہرا گورنر جنرل کی درخواست سے اخبارون مین
اشتہار دیا گیا کہ فلانا شخص عہدۂ سفارت سے معزول ہوا کوئی اوس کی درخواست اور
اوس کا دعوے بادشاہ کی طرف سے کسی محکمہ مین لایق پذیرائی کے نہین ہوگا اب راقم آمادہ مراجعت
کا ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے احباب نے اون پانچون قطعۂ اسٹام مین جعل کیا ہے - ایک قطعہ
پر چھ ہزار پانسو پونڈ کا ایک بل آف اکسچنج کا بنا کے ایک شخص سے روپیہ لیا جسکا
پینسٹھ ہزار روپیہ ہوا اور اوس شخص نے فورًا عدالت مین استغاثہ اوس کا میرے
اوپر پیش کر دیا اور چار قطعہ پر ہزار ہزار پونڈ یعنی دس دس ہزار روپیہ کا بل آف اکسچنج
بنایا مفصل ساری کہانی اس استغاثہ کی لکھنا ناحق ایک دردسر ہے - خلاصہ یہ ہے
کہ سب استغاثون کی جوابدہی کے سبب سے پانچ چھ برس مین گویا وہان مقید ہو گیا پہلا استغاثہ
جو پیش ہوا اوس مین جعل بخوبی ثابت ہوا اور چیف جسٹس عدالت کا من پلی نے باتفاق ارباب
اسپیشل جیوری کے تجویز کیا کہ اوس مقدمہ مین جعل بھی ہوا اور مدعی نے باوصف جعل سے
آگہی کے روپیہ دیا اس واسطے مقدمہ کو ڈسمس کیا مگر مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست
کی وہ اوسی عدالت کے اجلاس کامل مین پیش ہوئی - ایک اوس عدالت کے حاکم
کی رائے میرے مخالف تھی اس سبب سے تجویز ثانی منظور ہو گئی - اتنے مین ایک اور شخص
نے دس ہزار روپیہ کی نالش کی وہ بھی مقدمہ مدعی کی غیر حاضری عمدی سے نن سوٹ ہوا مگر
اوس کو اختیار پھر استغاثہ کا حاصل تھا اور اول مقدمہ مین جو حکم تجویز ثانی کا ہوا تو اوسی حاکم کے

بادشاہ سے پنشن قبول کرنیکی گورنر جنرل کو درخواست اور عہدۂ سفارت سے معزولی

میرا قطعہ اراضی ... جعل ... عدالت مین ...

تجویز ثانی کی درخواست ... منظور ہوئی

سامنے جس کی راے کچھ میرے مخالف تھی اور ایک دوسری اسپیشل جیوری کے سامنے ایک
برس کے بعد پہلے فیصلہ سے پیش ہوا اور پھر نئے سر سے تحقیقات شروع ہوئی ابکی دفعہ بارہو
آدمیون نے ارباب جیوری مین سے یہ تجویز کیا کہ اس مقدمہ مین جعل ہوا ہے مگر گیارہ آدمی متفق
تھے کہ مدعی مقدمہ کا جعل ہونے سے آگاہ تھا صرف ایک شخص اس امر مین مختلف الراے ہوا اور
اوس کے ذہن مین یہ جما کہ مدعی کو جعل کی اطلاع نہ تھی اور غالب گمان ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص مدعی کا
جانبدار ہوگیا۔ موافق دستور کے ارباب جیوری آدھی رات تک مقید رہے کہ ایک امر پر متفق الراے
ہوجائین وہ ایک شخص ہرگز اس امر پر متفق نہ ہوا اوس جیوری کی برخاست ہوگئی اور حکم ہوا کہ پھر
نئے سر سے مقدمہ کی تحقیقات ایک اور نئی جیوری کے سامنے ہو۔ اس عرصہ مین میری طرف سے
بڑی عدالت چنسری مین درخواست ہوئی تھی کہ وہ پانچون بل آف اکسچنج کے جو ایک شخص نے جعلی
بنائے ہین وہ عدالت مین طلب ہوکے باطل کیے جاوین۔ یہ دعوے ایک حاکم ماسٹر آف رال
کہلاتے ہین اون کے محکمہ مین پیش تھا پہلے اونھون نے صدور حکم کا اوس درخواست
پر اوس پہلے دعوے کے ختم ہونے پر ملتوی کیا۔ جب اوس دعوے کی وہ نوبت پہونچی جس کا
ذکر ہم نے کیا ہے تب اونھون نے وہ چار بل جو دس دس ہزار روپیہ کے تھے اون کو
تو عدالت مین طلب کرکے منسوخ کیا اور وہ پہلا بل جو پینسٹھ ہزار روپیہ کا تھا اوس کو
منسوخ نہ کیا اوس کے واسطے حکم دیا کہ بدستور نئے سرے سے کامن پلی کی عدالت مین
فیصلہ ہو۔ اب اس مقام پر ذکر اپنے تعلقات کا لندن مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ
اور بعد معزولی کمپنی کے ہندوستان کی حکومت سے وزراے سلطنت کے ساتھ جو تھا
ضرور ہوا اس واسطے کہ وہی تعلقات موجب میری بربادی اور تباہی کے ہوے جب
ابتدا مین راقم لندن مین پہونچا تب کورٹ ڈایرکٹرز کے محکمہ مین اس امر پر گفتگو ہوئی کہ راقم
فارسی دفتر گورنر جنرل کے میر منشی کے عہدہ سے برخاست ہوا ہے اس نظر سے سفارت
بادشاہ کی منظوری کے لایق ہے یا نہین۔ اس مباحثہ مین باتفاق یہ تجویز ہوا کہ چونکہ گورنر جنرل نے

چار تمسک جعلی عدالت کے حکم سے باطل ہوے مگر جسکی تجویز ثانی منظور ہوئی تھی اوسکے باطل کرنے کا حکم اوس کے ختم پر رہا

کوائف میرے تعلقات کے کمپنی اور وزرا سے جو باعث میری بربادی اور تباہی کے ہوے

اس امر پر کچھ اعتراض نہین کیا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ سفرا کی تعظیم اور توقیر مین کوئی امر فروگذاشت نہو۔ اور منجملہ کورٹ ڈیرکٹرز کے ممبرون کے ایک سرفرڈرک کری بھی تھے جنھون نے گورنمنٹ کے سکریٹری ہونے کی حالت مین مجھے برخاست کیا تھا اونھون نے وہان ظاہر اظہار کیا کہ میری برخاست اوس عہدہ سے قصور کے ثبوت سے نہین ہوئی چونکہ فارسی دفتر مین ایک فتور واقع ہوا تھا اور مین اوس دفتر کا سردار تھا اس واسطے میری برخاست ہوئی تھی۔ اس نظر سے میری سفارت منظور ہوئی اور ہر طرح کے مراسلات اور مطارسات کمپنی کے قیام تک کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بعد برخاست کمپنی کے اور اون کے حالت قیام مین بھی سلطنت کے وزرا کے ساتھ جاری رہے اور راقم کو جب بادشاہ نے سفارت کے عہدہ سے معزول کیا تب بھی مین مورد مراحم اور شفقت رہا چنانچہ انھین جعل کے مقدمہ مین جو راقم کے اوپر پیش تھے ہر طرح کی وزیر ہند کی طرف سے میری اعانت رہی پہلا مقدمہ جعل کا جب ڈسمس ہوگیا تو مین نے ارادہ کیا کہ فوراً لندن سے مین ہندوستان کی طرف معاودت کرون اس واسطے ہندوستان کے وزیر کے پاس مین نے ایک درخواست گذرانی کہ میرا ارادہ معاودت کا ہے لیکن مین یہان قرضدار ہوگیا ہون اگر پندرہ ہزار روپیہ نقد مجھے عطا ہون اور جہاز کی سواری کا اجازت نامہ ملے تو مین یہان سے روانہ ہوجاؤن۔ ہندوستان مین پہونچ کے یہ رقم مع جہاز کے کرایہ کے بادشاہ سے مین دلوادونگا اگر بادشاہ نہ دینگے تو جس طرح سے ممکن ہوگا مین اپنے پاس سے ادا کرونگا۔ اوس کے جواب مین ایک خط حسب الحکم وزیر ہندوستان کے میرے نام پر آیا کہ پندرہ ہزار روپیہ تمھارے قرض کے ادا کے واسطے بھی دیا جائیگا اور جہاز کی سواری کا بھی اجازت نامہ ملے گا اور ہندوستان مین تم سے مواخذہ اوس کی ادا کا نہین ہوگا مگر اس شرط پر کہ جعل کے مقدمہ کی جو مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست کی ہے جب وہ مقدمہ بالکل ختم ہوجائے تب تم یہان سے روانہ ہو۔ اس کے جواب مین راقم نے لکھا کہ مجھکو یہان توقف کرنے مین کچھ عذر نہین ہے لیکن بادشاہ نے میری اعانت سے

میرا عزم روانگی اور وزیر ہندوستان کا لکھنا
اور وزیر کا جواب بشرط اور ادائے قرض کا

ہاتھ کھینچا ہے میری یہان بسر کس طرح سے ہو گی۔ اوس کے جواب مین دس پونڈ فی ہفتہ میرے خرچ
کے واسطے معین ہوے جسکے چار سو روپیہ مہینہ سے کچھ زیادہ ہوا اور سارے میرے قرضخواہون کو
ایک اطلاع عام کی گئی کہ جو کچھ قرض فلانے شخص کے اوپر ہے وہ وزیر ہندوستان کے دفتر سے ادا
کیا جائیگا۔ بلکہ ایک مفسد نمک حرام نے جس کو مین نے نوکر رکھا تھا اوس نے ایک دعوے بیہودہ
میرے اوپر کیا تھا مسٹر ولیم کی جو ہندوستان کے وزیر کے دفتر مین دفتر پولیٹکل کے مہتمم اور سربراہ کار
ہین راقم کے وہ دوست بھی تھے اونھون نے ایک مجمع عظیم مین مجھ سے کہا کہ تم کو اپنے پاس سے تو
روپیہ دینا نہین پڑتا نا حق اس مقدمہ کی جواب دہی کرتے ہو مجھے اجازت دو مین روپیہ اوسکو دیدون
اور سب حضار کی طرف متوجہ ہو کے اونھون نے کہا کہ اگر مسیح الدین خان یہان لاکھون روپیہ کے
قرضدار ہونگے۔ سب روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا۔ اسی طرح سب میرے قرضخواہون سے اور جو میرا
وکیل عدالت مین تھا اوس سے بھی کہا بلکہ تحریری اطلاع اون کو دی کہ تمہارا قرض ادا کیا جائیگا
جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ ہوا ہے اور جب تجویز ثانی اوس مقدمہ کی منظوری ہو گئی اوس وقت
وزیر ہندوستان کے وکیل اور بیرسٹر کو حکم ہوا کہ میرے وکیل اور بیرسٹر کے ساتھ مشورہ کر کے کیفیت
مفصل اوس مقدمہ کی لکھے اوس نے ساری مقدمہ کی حقیقت دریافت کر کے وزیر ہندوستان
کے پاس ایک کیفیت بھیجی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اوس نے ابتدا سے انتہا تک سارے مقدمہ
کو دیکھا کسی طرح کا قصور اور فتور اوس مین مسیح الدین خان کی طرف سے ہرگز نہین ہے نرا اون کے اوپر
ظلم اور فریب ہے لیکن جمیع مقامات مین جو عدالت مین رجوع کرین جب تلک حکم اخیر
حاکم کی طرف سے نہ ہو کوئی شخص حقیقت فیصلہ کی کہہ نہین سکتا۔ اگر خلاف اون کے حکم ہو جاے
بلکہ سرکار نے کل مسیح الدین خان کے قرض کے ادا کا ذمہ کیا ہے سرکار کا بہت نقصان ہوگا
اس واسطے اگر مدعی اوس مقدمہ کا دس ہزار روپیہ لیکے اپنے دعوے سے ہاتھ اوٹھاوے
سرکار پر لازم ہے کہ اوتنا روپیہ ادا کر کے اس مقدمہ سے اون کا پیچھا چھوڑوا دے۔ اور اگر اوتنے
پہ پر مدعی راضی نہ ہو تب مقدمہ کی جوابدہی کیجائے اوس سے زیادہ دینا مصلحت نہین ہے

بموجب اس کیفیت کے پہونچنے کے وزیر ہندوستان نے میرے وکیل کو حکم دیا کہ مدعی سے موافق
اوس کے تصفیہ کرنے کا بندوبست کرے اگر وہ راضی ہو تو دس ہزار روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا
مگر چونکہ مدعی راضی نہ ہوا وہ بندوبست ملتوی رہا - دو مرتبہ تو جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے مقدمہ پیش
ہوا اور اوس کا نتیجہ لکھا گیا اور ایک دفعہ اور تیسرے مرتبہ پیش ہوا اوس دفعہ ارباب جیوری جو
مطلوب تھے اوس مین سے صرف گیارہ آدمی حاضر ہوے ایک نہین حاضر ہوا ایسی صورت مین
ایک دستور بندھا ہوا ہے کہ کوئی سرشتہ دار عدالت کا ایک لفظ پکار کے کہتا ہے ٹیلی یعنی متخاصمین
سے اجازت طلب کرتا ہے جو کوئی اجازت دیوے تو ایک کسی شخص کو جو محکمۂ عدالت مین حاضر ہین اوس
بارھوین آدمی کی جگہ پر بٹھلا دیتے ہین اس امر کو متخاصمین کے بیرسٹرون نے منظور نہ کیا اس سبب سے
اوس اجلاس مین بھی مقدمہ ملتوی رہا اور یہ دستور ہے کہ جب ایک اجلاس سے مقدمہ دوسرے
اجلاس پر گیا تو ایک سال کا بیچ مین وقفہ ہو جاتا ہے اس واسطے کہ صرف چھ مہینے ایام اجلاس
عدالت کے ہوتے ہین اور چھ مہینے تعطیل رہتی ہے اور ابتدا ہی مین قرار پاتا ہے کہ فلانا مقدمہ
بترتیب نمبر فلانے حاکم کے پاس پیش ہوگا جو رہ گیا یا اوس کی تجویز ثانی ہوئی تو خواہ مخواہ جب
دوسری دفعہ کچہریان کھلینگی جس کو ٹرم کہتے ہین تب فیصلہ ہوگا - راقم کی طبیعت ہر دفعہ مقدمہ کے
ناتمام رہنے کے سبب سے سخت گھبرائی - ایک بہت بڑی عدالت ہے جہان دو حاکم اجلاس کرتے
ہین اون کو لارڈس جسٹس کہتے ہین وہ عدالت جنسری کی ایک شاخ ہے اور وہی دونون حاکم
عدالت پریوی کونسل مین بھی اجلاس کرتے ہین اور تیسرے باب مین مذکور ہو چکا ہے کہ
جنسری عدالت کا ٹرم یعنی ایام اجلاس ایک مہینا زیادہ ہوتا ہے اور اوس عدالت مین
اوس ٹرم مین مقدمہ کم تھے اس واسطے وہان کے حاکمون نے حکم دیا تھا کہ جس عدالت
کے فریقین متخاصمین چاہین اوس عدالت مین مقدمے اوٹھوا لائین راقم چونکہ تاخیر
انفصال سے بہت گھبرایا تھا اپنے وکیلون کو حکم دیا کہ مدعی کے ساتھ بندوبست کرکے
مقدمہ اوس عدالت مین اوٹھوا لیجائین اس خیال سے کہ اوسی ٹرم مین مقدمہ کو وہ حاکم فیصلہ کر ڈالین

مصنف کے مقدمہ کا رجوع ہونا لارڈز جسٹس کی عدالت مین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۷ — مئی ۱۹۲۸ء

مہاراجہ صاحب محمود آباد کی غلط فہمی

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ایک عزیز شفیق نے بمبئی سے واپس آ کر یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے وہاں مولانا شوکت علی صاحب مدظلہٗ سے اس بات کی بڑی شکایت کی کہ آپ لوگوں نے اخبار ہمدرد کا انتظام ظفر الملک جیسے میرے سخت دشمن کے سپرد کر دیا۔

مہاراجہ صاحب سے مجھے جن امور میں اختلاف رہا ہے اُن کا ذکر بار بار الناظر میں آ چکا ہے۔ لیکن اُن اختلافات کے باوجود میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ مہاراجہ صاحب کا یا جن دیگر حضرات کے طریق کار سے اختلاف ہوتا رہتا ہے اُن میں سے کسی کا بھی میں دشمن نہیں ہوں اور نہ مجھے کسی سے کوئی پرخاش ہے۔

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مہاراجہ صاحب کو بخوبی علم ہے کہ میرا اُن سے اختلاف کسی ذاتی معاملہ کی بنا پر نہیں۔ وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اُس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اُن سے اور بعض دیگر تعلقداروں

اور رؤسا سے میرے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات ضرور ہیں، اور جہاں تک کہ حدودِ شریعت اور قوانین اخلاق اجازت دیتے ہیں میں اُن تعلقات و مراسم کو حتی الامکان نباہتا بھی ہوں، لیکن میری زندگی کا سطح نظر اور میرا طرزِ ماندوبود دونوں، اُن سب سے اتنی منافرت رکھتے ہیں کہ ایسے اختلافی مسائل میں جنکا تعلق خانگی معاملات سے ہو، میرے لیے کوئی موقع ہی اس کا نہیں کہ میں ایک جانب یا دوسری جانب کھڑا ہو سکوں۔

مہاراجہ صاحب پر غالباً یہ امر بھی اچھی طرح واضح ہوگا کہ زندگی کی کسی منزل میں میرے ذاتی نفع و نقصان کا اُنکی ذاتِ گرامی سے بعید سے بعید تعلق بھی نہیں رہا۔ ابتدا میں جب مجھے اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، تو اُسوقت ممکن ہے کہ میرے دل میں یہ اُمنگ موجود ہو کہ میں رسالۂ الناظر کے لیے اُن سے کوئی اعانت حاصل کروں؛ لیکن جلد ہی مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ مہاراجہ صاحب یا دوسرے رؤساء کا ابرِ کرم جب کسی اخبار نویس یا قومی کارکن کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے تو اُسے اپنے ضمیر و ایمان کو سلامت رکھنا دشوار ہو جاتا ہے لہٰذا اس سارے طبقہ کی طرف سے میری توقعات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو گیا اور غالباً اُن تمام قومی کارکنوں میں جو مہاراجہ صاحب کے سیاسی عروج کے زمانے میں اُنکی بارگاہِ عالی میں حاضری دیا کرتے تھے اس عاجز کے متعلق مہاراجہ صاحب کو خود بھی پورا اطمینان ہوگا کہ قومی اغراض کے سوا کبھی کسی خفیف سے خفیف ذاتی ضرورت کے لیے بھی مجھے آستانہ بوسی کا شرف حاصل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ میں نے یہاں تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ ایک دفعہ اردو کانفرنس کے سلسلے میں دوسرے رفقائے کار کے ساتھ مجھے مہاراجہ صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑا۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ دسترخوان بچھا اور میرے اکثر ساتھیوں نے اُس میں شرکت کی مگر میں عذر کر کے اُٹھ آیا۔

ذاتی طور پر، مہاراجہ صاحب سے اس قدر بیگانہ رہنے کے باوجود میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک زمانے میں مجھے جناب ممدوح سے بہت کچھ عقیدت و ارادت حاصل تھی۔ اور جب تک پے بہ پے ایسے واقعات نہیں پیش آئے کہ مہاراجہ صاحب کا اصلی رنگ رُخ ظاہر ہو، سالہا سال تک اُنکی جانب سے عظمت و احترام کے جذبات میرے نہاں خانۂ دل میں پرورش پاتے رہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مہاراجہ صاحب کے متعلق عقیدت و احترام کی بنیاد صرف اُنکی وہ خدمات گرامی تھیں جو بظاہر وہ قوم و ملک کی انجام دیتے رہے تھے یا محض راقم الحروف کی ناتجربہ کاری

عدم واقفیت ۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جب مہاراجہ صاحب نے ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی
کے چندہ میں ایک لاکھ کی رقم خطیر شامل کرنے کے علاوہ صوبۂ اودھ کی چندہ فراہم کرنے والی کمیٹی
کی معتمدی کا بارگراں اپنے ذمہ لیا اور ملک کے دیگر حصص میں فراہمی چندہ کے لیے دورہ کرنے میں
غایت درجہ کا جوش وانہماک ظاہر فرمایا، ایران میں روسی مظالم اور انگریزی ریشہ دوانیوں کے
خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں پیش پیش رہے، طرابلس اور بلقان کے مصیبت زدگان کے
لیے گراں قدر عطیے مرحمت فرمائے اور مسلمانان ہند کے ساتھ ترکوں سے اظہار ہمدردی میں نمایاں
طور پر حصہ لیتے رہے، مسجد کانپور کے قضیہ میں مردانہ وار سر جیمس مسٹن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے رہنما
بنگئے، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ
کرا دینے میں مستعدی، فیاضی اور اولوالعزمی ظاہر فرمائی، اور ترکی خلیفہ کے باغی شریف حسین کی غداری کے
خلاف، فرنگی محل کے تذبذب اور شریعت کی ہاشمیت و سیادت کے باوجود لکھنؤ کے پرزور مظاہرہ کی
صدارت کر کے برطانوی دسیسہ کاری کو بے نقاب کرتے ہوئے احرار مسلمین کی ہم نوائی فرمائی، تو ہر موقع
پر راقم الحروف اور مسلمان آزاد شہروں کی ساری جماعت نے مہاراجہ صاحب کے ان عظیم الشان کارناموں
کی دل سے داد دی ۔ اور ہم میں سے ہر شخص نے اپنی بساط کے بموجب مہاراجہ صاحب کی ان تمام
مہموں میں شرکت کی اور مہاراجہ صاحب کی سالاری و سرداری میں ایک ادنیٰ رضاکار کی طرح
مصروف خدمت رہنا اپنا فرض جانا ۔

عین دسمبر ۱۹۱۶ء میں جبکہ ہندوستانی سیاست کے نقطہ نظر سے مہاراجہ صاحب کا
نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک عزیز محترم نے، جو اب افسوس کہ زندہ نہیں ہیں، پہلی بار مجھے اس
حقیقت سے آشنا کیا کہ مہاراجہ صاحب کی فیاضیاں اور اولوالعزمیاں کسی اعلیٰ جذبہ خدمت قوم
و ملک کے باعث نہیں بلکہ انکی رائے گرامی میں مہاراجہ صاحب کی حیثیت ایک ہوشمند سیٹھ، ساہوکار
یا سرمایہ دار کی تھی جو نفع و نقصان کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اور پائی پائی سے [illegible] نفع کا اندازہ
لگا لینے کے بعد بالکل ایک کاروباری آدمی کی طرح قومیات کی تجارت میں اپنا روپیہ لگاتے ۔

مہاراجہ صاحب کے متعلق جو حسن عقیدت اس زمانہ تک میرے دل میں جاگزیں تھا اسکی
بدولت مجھے اس رائے کے قبول کرنے میں کچھ عرصے تک بہت تذبذب رہا، باوجودیکہ وہ رائے ایک
ایسے بزرگ کی تھی جو میرے بہ نسبت مہاراجہ صاحب کو زیادہ عرصے سے جانتے اور زیادہ قریب سے
جانچتے رہے تھے ۔ اور جنکو بلحاظ دماغی و معاملہ [illegible] دل سے [illegible] عقیدت کا

بادل چھٹتا گیا اور چند روز کے تجربے کے بعد مہاراجہ صاحب کی جماعت پیدا ہو گئی۔

مہاراجہ صاحب کی زرفشانی، آزاد منشی اور حسنِ اخلاق نے تنہا اس عاجز ہی کو نہیں بلکہ مسلمان آزاد خیالوں کی اکثریت کو اور دوسرے کثیر التعداد مسلمانوں کو بھی عرصے تک مہاراجہ صاحب کا گرویدہ بنائے رکھا۔ لیکن جیسے جیسے آزمائش و امتحان کے نازک مواقع آتے گئے، مہاراجہ صاحب کے جوہر نمایاں ہوتے رہے، اور اب مشکل ہی سے کوئی ایک شخص ہماری قلندروں کی جماعت کا ایسا بتایا جا سکتا ہے جو مہاراجہ صاحب کی رہنمائی کو قبول کرتا یا اُنکے ساتھ سیاسیاتِ ملکی و قومی میں اگلی سی ہم آہنگی رکھتا ہو۔

البتہ اپنے مصلحت پسند دوستوں کے مقابلہ میں، میری آنکھیں کسی قدر یا کہنا چاہیے کہ سب سے پہلے کھلیں۔ اور بسبب اسکے کہ ملکی و قومی امور کے متعلق اظہارِ رائے میں میرا قلم ہمیشہ بیباک رہا ہے، شاید مہاراجہ صاحب کے متعلق سب سے زیادہ مجھ ہی کو لکھنے کا موقع ملا۔ بایں ہمہ جو کچھ مہاراجہ صاحب کے متعلق میں نے لکھا ہے اُس میں سے سوا اُس حصہ کے جسکے بارے میں ناظر کے دورِ جدید کے ابتدائی پرچہ میں اظہارِ معذرت کیا جا چکا ہے، ایک حرف کو بھی اپنے لیے بغیر میں پورے وثوق و اطمینان کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میرے دل میں مہاراجہ صاحب کی طرف سے کبھی دشمنی کا کوئی جذبہ نہ تھا، اور سوائے مفادِ عامہ سے تعلق رکھنے والے معاملات کے جن پر تنقید و تبصرہ کرنا ہر ضمیرِ انسانی کا مسلّمہ فریضہ اور جنکے متعلق موافق و مخالف جد و جہد کرنا ہر انسان کا غیر مشتبہ حق ہے، کبھی کسی ایسے معاملے سے میرا تعلق نہیں رہا جو مہاراجہ صاحب کے ذاتی و خانگی امور میں داخل ہو یا جسکو کسی ذاتی یا شخصی عناد پر محمول کیا جا سکتا ہو۔

مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں مہاراجہ صاحب نے اپنے سابقہ مواعید کو بھلا کر اور ہمارے ہی دوستوں میں سے بعض کو ملا کر حکومت کے مصالح و منشا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تو میری رائے ناقص میں مہاراجہ صاحب کی یہ کارروائی نہایت غلط اور مسلمانوں کے مفاد کے قطعی خلاف تھی۔

۱۹۱۷ء میں جب ہوم رول کی تحریک کو دبانے کے لیے مسز بسنٹ نظر بند کی گئیں تو ہندوستان کے کثیر التعداد باشندوں خصوصاً بنگال کے پُرجوش کارکنوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ کانگریس کی صدارت پر اُس خاتونِ محترم کو فائز کریں۔ مہاراجہ صاحب کے احباب وہوا خواہ اصرار کر رہے تھے کہ دوسرے تمام لیڈروں کی طرح وہ بھی کانگریس کی صدارت سے مسز بسنٹ کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور بنگال میں مسٹر [illegible]

سنی آرہ اس کی جماعتوں میں جو نزاع برپا تھی اپنی دست برداری سے اُس کا خاتمہ کر دیں مگر مہاراجہ
صاحب نے ایک نہ سنی، اور باعزت دست برداری پر ووٹوں سے شکست پانے کو ترجیح دی۔
میری ناچیز رائے میں مہاراجہ صاحب کا یہ طریقِ کار بھی کثیر عزیز دانشمندانہ اور ہندوستان کے مفادِ
عامہ کے لیے مضر تھا۔

۱۹۱۰ء میں سید وزیر حسن صاحب کی غفلت و بے توجہی سے مسلم لیگ کے حالات ابتر
ہو رہے تھے اور اُنھوں نے بالآخر میرے مشورہ سے یا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے مطالبہ پر اخبارات میں
یہ اعلان کر دیا کہ وہ آیندہ سکرٹری نہیں رہنا چاہتے۔ قوم کو اس کا پورا موقع تھا کہ جدید انتخاب
کر کے مسلم لیگ کی خراب و خستہ حالت کو سدھارنے پر توجہ کرے اور مسلم لیگ کی کونسل کے بہت سے
پُرجوش ارکین کی بھی یہی خواہش تھی مگر مہاراجہ صاحب کی اس ضد نے کہ اگر سید وزیر حسن صاحب
سکرٹری منتخب نہ کیے جائیں گے تو میں بھی صدارت قبول نہ کروں گا - ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ
کو مجبور بنا دیا اور اُنھیں اپنے بعض رفقاء کار کی رائے کے خلاف پہلی بار کے انتخاب کو مسترد کرا کے
دوبارہ کوشش کر کے سید وزیر حسن صاحب کو منتخب کرانا پڑا۔ مہاراجہ صاحب کی اس ضد کو میں نے
یقیناً مفادِ اسلامی سے بے پروائی اور شخصی و ذاتی جذبات کی نگہداشت کا مرادف سمجھا۔

مسلم لیگ کے اسی دہلی والے اجلاس کے موقع پر ترکوں کے معاملات سے متعلق جو اہم ترین
تجویز تھی مہاراجہ صاحب نے کونسل کے جلسہ میں وعدہ فرمایا کہ اُسے وہ خود پیش کرینگے۔ جس روز وہ
تجویز اجلاس عام میں پیش ہونے والی تھی مہاراجہ صاحب کا غیر حاضر ہو جانا اور آگرہ کی سیر کیلیے تشریف لیجانا
کسی ایسے شخص کو پسندیدہ نہیں معلوم ہوا جو اُس جلسہ میں شریک اور ان حالات سے واقف تھا۔

مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کے تین مہینے کے اندر مہاراجہ صاحب کا استعفا دینا
اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اُنکی صدارت کی خاطر سید وزیر حسن صاحب کو سکرٹری بنواکر خود اپنے
بعض رفقا کی ملامت مول لی تھی جس قدر شاق ہوا ہوگا اُسکا اندازہ کچھ دشوار نہیں ہے۔

۱۹۱۹ء میں مسئلہ خلافت سے متعلق لکھنؤ میں ایک جلسہ تمام ہندوستان کے مسلمانان اہل حل و
عقد کا منعقد کیا جانے لگا تو مہاراجہ صاحب نے جلسہ کے اعلان پر دستخط چھپ جانے کے بعد اس
جلسے سے بے تعلقی اختیار کی - اور یہی نہیں کہ [illegible] سے دستخط واپس لے لیے بلکہ جلسہ کے معاونت
اور انتظامات تک میں شرکت گوارا نہیں کی [illegible] اپنے استغنا نیز تحقیر آمیز رویہ سے مولانا
محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ وغیرہ کو سخت ناگواری و برہمی کا موقع دیا۔

تحریک خلافت میں مہاراجہ صاحب نے کوئی حصہ نہ لیا تا آنکہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں مہاراجہ
صاحب نے گورنمنٹ کی ملازمت ترک کرکے اپنے تئیں سیاسیات ملکی سے بالکل منقطع کر لیا۔ اُنکی
اس کارروائی کے متعلق دو رائیں ہونا ممکن ہے۔ جو لوگ گورنمنٹ سے اتحادِ عمل کرنا پسند کرتے ہیں
جیسے لبرل یا معتدلین، اُنکے نزدیک تو یہ طرزِ عمل غلط نہیں ہو سکتا، لیکن مہاراجہ صاحب نے ہمیشہ
اپنے تئیں نیشنلسٹ کہا اور اس جماعت کے لوگ اس قسم کی سرکاری ملازمتوں کو قطعًا ناپسند کرتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں مہمان سرائے شاہی میں مقیم تھا۔ ڈیڑھ سال بعد جب دوبارہ قومی و
ملکی تحریکات میں حصہ لینے کا وقت آیا تو ممکن تھا کہ مہاراجہ صاحب کے اس عہد کے بعض کارناموں
پر تبصرہ کیا جاتا، لیکن ایک تارکِ موالات کو اول تو حکومت کے معاملات سے چنداں سروکار نہیں
دوسرے یہ خیال کرکے کہ مہاراجہ صاحب دانستہ یا نادانستہ تحریکاتِ عامہ سے الگ ہو گئے ہیں،
اُنکے اعمال و کردار سے کسی قسم کا تعرض مناسب نہیں سمجھا گیا۔

ہوم ممبری سے واپسی کے بعد مہاراجہ صاحب نے ابن سعود کی مخالفت پر کمر باندھی
اور اگرچہ پُرانے رفقائے کار میں سے ایک بھی اُنکا ساتھ نہ دے سکا تاہم اُنھوں نے اپنی سی تو
کر ہی ڈالی۔ حجاز کانفرنس کے انعقاد سے لیکر وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے اور ملک معظم
کے نام اپنی جانب سے ایک تار دینے اور اُسے مسلمانانِ لکھنؤ کے جلسہ کا پیام قرار دینے تک کی
کُل کارروائی دنیا کے سامنے موجود ہے۔

بیشک اس تحریک میں بعض ایسے مسلمان بھی اُنکے شریک کار رہے ہیں جن سے زیادہ دانشمندانہ
طرزِ عمل کی توقع کی جا سکتی تھی، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں نے اُنکی کارروائی
کو سخت ناپسند کیا۔ اُنکے دوستوں علی برادران تک نے وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانے یا
ملک معظم کے پاس تار بھیجنے کو پسند نہیں کیا۔ اِس عاجز کی رائے مسئلہ حجاز میں واضح طور پر نہ صرف
مہاراجہ صاحب اور خدام الحرمین کے خلاف تھی، بلکہ ابتدائی مراحل کے بعد سے محترم علی برادران
اور اُنکے رفقاء سے بھی مختلف رہی، اور اسی سبب سے اس باب میں میری جد و جہد دونوں کی
نگاہوں میں مردود قرار پائی۔

مہاراجہ صاحب نے نئے دورِ عمل میں قدم رکھتے ہی ایک روزانہ انگریزی اخبار نکالنے
کی جد و جہد شروع کی۔ مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک I. D. T. (انڈین ڈیلی ٹیلیگراف)
رہا ہے اور مجھے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اب بھی اگر مہاراجہ صاحب کا کوئی ذاتی

اخبار نکلتا تو کسی کو زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہ تھی - گو اخبار شایع ہونے کے بعد اُسکی پالیسی وغیرہ کا معرض بحث میں آنا ناگزیر ہے - مگر راجہ صاحب کی کوشش چونکہ یہ رہی کہ پبلک کے روپیہ سے اخبار نکلے - اس لیے ہر قومی کارکن کو اخبار کے متعلق رائے زنی کا پورا حق حاصل ہے -

انگریزی اخباروں کی ضرورت تقریبًا ہر پڑھا لکھا مسلمان محسوس کرتا ہے - لیکن جس طریقہ پر مہاراجہ صاحب اخبار نکالنا چاہتے ہیں اُس سے مجھے اور اکثر اصحاب کو اختلاف ہے، بر این میں نے بالقصد اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا - مگر اتفاق سے ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ بعض اصحاب کے طرز عمل نے مجھے اپنے اختلاف کے اظہار پر مجبور کر دیا - اکتوبر گذشتہ میں پراونشل لیگ کا جلسہ میرٹھ میں تھا، میں بھی شریک ہوا - آخری اجلاس میں جبکہ پراونشل لیگ کی کونسل کے اکثر ارکان اور صوبہ کے بیشتر معززین رخصت ہو چکے تھے اور جلسہ بالکل چراغ سحر ہو رہا تھا، دفعۃً مولوی محمد یعقوب صاحب وکیل مراد آباد و ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک تجویز مہاراجہ صاحب کے اخبار کی تائید میں پیش کر دی - مجالس کے دستور کے مطابق، جلسۂ عام میں کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی جب تک کہ مجلس مضامین نے اُسے منظور نہ کر لیا ہو یا کم سے کم اگر کوئی مجلس مضامین کی اکثریت کی رائے کے خلاف بطور ترمیم کے اُسے جلسہ عام میں پیش کرنے کی پہلے سے اطلاع نہ دیدی گئی ہو -

لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ صاحب اگر مجالس عامہ کے قوانین و دستور سے کسی مصلحت کی بنا پر تجاہل عارفانہ برت رہے تھے، تو صدر جلسہ کا فرض ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کھلی ہوئی بے ضابطگی کو روک دیتے - لیکن لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ کی مرعوب کن شخصیت کا اثر تھا یا جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر صدر صاحب نے معذرتًا ظاہر فرمایا، اُنکو اندیشہ تھا کہ مہاراجہ صاحب اسے ذاتی رنجش کا نتیجہ نہ قرار دیں - انہوں نے باوجود کئی بار ضابطہ کے اعتراضات کیے جانے کے معزز محرک کو اپنی تجویز پیش کرنے کی اجازت دیدی - اور اس طرح مجھے مجبور ہونا پڑا کہ برسر عام تجویز سے اختلاف ظاہر کروں -

اُس جلسہ میں تو میری مخالفت کا صرف یہی سبب تھا - لیکن میں اس موقع پر مختصرًا وہ وجوہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں جن کی بنا پر مجھے اس اخبار سے اختلاف ہے -

(۱) مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد اگرچہ اب اتنی کافی ہوگئی ہے کہ انگریزی کے روزانہ اخبار ہر بڑے صوبہ سے نکلنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اس جماعت میں خودغرضی اور بے حسی

اس درجہ کی ہے کہ غیر معمولی جدوجہد کے بغیر کسی روزانہ اخبار کو چلانا آسان نہیں ہے۔

(۲) مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک ایک انگریزی روزنامہ رہا جسکے خریداروں کی تعداد بہت محدود رہی اور جسے مالی حیثیت سے کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ نئے اخبار کے لیے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہونے سے رہا۔

(۳) اخبار کے لیے سب سے اہم سوال پالیسی اصول و رائے کا ہوتا ہے۔ مہاراجہ صاحب اپنے تئیں نیشنلسٹ کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ نیشنلسٹ جو کبھی اُن کے دوش بدوش کام کرتے تھے اب اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُنکے سامنے مہاراجہ صاحب اور معتدلین ہم پلہ قرار دیے جا سکتے ہیں بلکہ شاید بعض امور میں معتدلین بھی مہاراجہ صاحب سے آگے نکل جائیں۔

مہاراجہ صاحب کے ساتھ جو حضرات اس اخبار کے انتظام میں شریک ہیں بعض اُن سے بھی کم درجے کے نیشنلسٹ ہیں اور بقیہ وہ ہیں جو نیشنلزم کو یا تو سمجھتے نہیں یا سمجھتے ہیں تو اُس سے دُور بھاگتے اور موقع ملے تو اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ ہمارے دوست چودھری خلیق الزماں صاحب سوراجسٹ بھی محض اس غرض سے اخبار کے بورڈ میں رکھ لیے گئے ہیں کہ آزاد خیال طبقہ کی برائے نام نمائندگی بھی قائم رہے۔ اب ہر شخص خود سوچ اور سمجھ لے کہ جس اخبار کی انتظامی جماعت اس ملغوبہ سے تیار ہوئی ہو اُس کی پالیسی کیا ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کا موجودہ عام رجحان یہ ہے کہ ہندوؤں نے جو مخاصمانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کا ترکی بترکی جواب دیا جائے۔ اور یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم مخالفت اور مخاصمت کے جذبات کو اشتعال ہی دیا جائے۔ اور آج وہی اخبار کامیابی سے چل رہے ہیں جو اس فرقہ وارانہ مخاصمت کے جذبہ کا اتباع کرتے ہیں۔ مہاراجہ صاحب کے اخبار سے اسکی توقع نہیں کیجا سکتی کہ انکا اخبار فرقہ وارانہ جذبات کی تابعیت کرے گا اور اسلیے یقینی ہے کہ اسکو مسلمانوں میں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ ہوگی جو ایک کامیاب اخبار کے لیے ضروری ہے۔

(۴) مہاراجہ صاحب خود رئیس ہیں اور اُنکے شرکاء میں سے ایک کے سوا جو ایک کامیاب ملک التجار ہیں، کوئی صاحب انگریزی اخبار اور انگریزی پریس کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔

(۵) آئی ڈی ٹی تو انگریزی اخبار تھا، روزنامہ ہمدم کو بھی یہ لوگ کامیابی سے نہ چلا سکے اور ہمیشہ نقصان اُٹھاتے رہے۔ البتہ جب سے خان بہادر سید احمد حسین رضوی مالک کارخانہ تمباکو

ہے - اور اگرچہ یہی خان بہادر صاحب اس انگریزی اخبار کے منتظم بھی قرار دیے گئے گرشتہ کے کا
وجوہ ہیں کہ وہ بھی اس کام کو بہ احسن وجوہ انجام نہیں دے سکتے - اور اب تو سنا جاتا ہے
کہ وہ بھی اس درد سری سے دستکش ہو گئے ہیں -

(۶) ہمارے صوبہ میں الہ آباد کے روزنامہ انڈیپنڈنٹ سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہر دلعزیزی
حاصل ہوئی ہو - لیکن اس کا حشر کیا ہوا؟ اسکی داستان پنڈت موتی لال نہرو صاحب سے سنئے
یا عدالت کی مثل ملاحظہ فرمائیے - جہاں تک مجھے علم ہے تین لاکھ روپے کا سرمایہ اس میں غرق
ہو گیا -

الہ آباد کا دوسرا روزنامہ لیڈر بھی سالہا سال تک نقصان سے چلا یا گیا ہے - اور اگر
پنڈت مدن موہن مالوی، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر چنتامنی کے سے قومی لیڈر اسکے معاون و کارکن
نہ ہوتے تو اس کا بقا و قیام بھی مشتبہ رہتا -

مسلمانان بنگال کا دیرینہ خادم مسلمان آج تک انھیں اندیشوں سے روزانہ نہیں کیا جا سکا
اور پنجاب کا مسلم آؤٹ لک، احمدی جماعت کی اولوالعزمیوں کے باوجود اسوقت تک خسارہ سے
نکل رہا ہے - ان حالات میں مجوزہ انگریزی روزنامہ کا نکالنا بعض اشخاص کے لیے ممکن ہے کہ مفید مطلب
ہو، مگر قومی اغراض کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اندیشہ ہے کہ نقصان پہونچا دے گا -

---

سطور بالا میں اجمال کے ساتھ ان تمام واقعات کا ذکر کر دیا گیا ہے، جن کی بنا پر مجھے مہاراجہ
صاحب کے طریق کار پر نکتہ چینی کرنے یا انکی کوششوں کا توڑ کرنے کے لیے مخالفانہ جد و جہد کرنے
کے مواقع حاصل ہوے - اور باوجودیکہ مہاراجہ صاحب کی طرف سے کسی بلند وسیع کارنامہ کی اب
کوئی توقع باقی نہیں رہی تاہم میں اتنا حسن ظن ضرور رکھتا تھا کہ مہاراجہ صاحب اپنی عالی ظرفی کی
وجہ سے اس قسم کے اختلافات کو ذاتی و شخصی مخالفت کی بنیاد نہ قرار دیں گے اور سائمن کمیشن وغیرہ کے
معاملات میں یا اور ایسے معاملات میں جن میں وہ اپنی محدود آزادی کے حدود میں رہ کر کچھ کام کرنا
چاہیں گے ہم قلندروں کے ساتھ اشتراک عمل کر سکیں گے - لیکن جو اطلاع مجھے پہونچی تھی
اس کی بنا پر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مہاراجہ صاحب اپنی اعلیٰ منزلت سے
اتنے نیچے اتر آئے ہیں کہ میری نکتہ چین نگاہ بھی اب تک وہاں نہ پہونچ سکی تھی - اور میں بے خوف
تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری توقعات کے خلاف اس بارے میں سید وزیر حسن صاحب کا طرز عمل

اُن سے بہت بہتر رہا۔ ۱۹۱۷ء میں رفاہ عام ہال کے ایک جلسہ میں جب عہدہ دارانِ مسلم لیگ کے خلاف میں نے ملامت کا ووٹ پیش کیا تو اُس کا اثر براہِ راست اور سب سے زیادہ اُنھیں پر پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے اُسی وقت استعفاء دیدیا اور اُس وقت تک استعفاء واپس نہ لیا جب تک مسلم لیگ کے بہت سے معزز ارکین اور صدر جلسہ مرحوم سید آل نبی کی درخواست پر میں نے وہ تجویز ملامت واپس نہیں لی۔ ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی دوبارہ صرف اُنھیں کے خلاف تجویز ملامت پیش کی گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ کے حسابات کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا گیا۔ اور جنوری ۱۹۱۹ء کے الناظر میں جو کچھ میں نے اُنکے متعلق لکھا اُس کی بدولت بالآخر اُنھیں مسلم لیگ سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ لیکن میں اُنکی شرافتِ طبع کا معترف ہوں کہ اسکے بعد اُنھوں نے کبھی میرے ساتھ بیگانوں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ آج تک جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس طرح ملتے ہیں جیسے میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف کبھی رونما ہی نہیں ہوا تھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اُنکے مسلم لیگ سے علٰحدہ ہو جانے کے بعد میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف باقی بھی نہیں رہا۔ مہاراجہ صاحب جیسے بلند مرتبہ رئیس میں یقیناً اس سے بہت زیادہ رفیع الخیالی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن اگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکتے تو انکو چاہیے کہ قومیات و سیاسیات کے اکھاڑے سے الگ رہیں۔ جب وہ بوم بمبئی سے واپس آئے تھے تو سُنا گیا تھا کہ اب وہ خاموشی کے ساتھ اپنی ریاست میں رہ کر زمینداری کے کاموں میں مصروف رہیں گے۔ اگر ایسا وہ کر سکتے تو شاید اُنکے لیے اور قوم و ملک کے لیے بہتر ہوتا۔ سیاسیات قومی و ملکی میں اب اُنکو وہ جگہ حاصل نہیں ہو سکتی جو ۱۹۱۸ء تک حاصل رہی۔ مہاتما گاندھی کے میدانِ عمل میں آنے کے بعد سے ہندوستان کی سیاسیات اب رئیسوں کا مشغلہ اور کرسی نشینوں کا کھلونا نہیں رہ گئی ہے۔ اور اگر کہیں اس کا سامان ہے تو شوق سے مہاراجہ صاحب وہیں اپنی لیڈری اور سرداری کا سکہ جمائیں۔

رہا ہمدرد کے انتظام کا معاملہ، تو یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنا اخبار مجبور ہو کر بند کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔ حالانکہ اگر مہاراجہ صاحب کی فیاضانہ امداد انکو حاصل ہوتی رہتی، تو اسکی نوبت شاید نہ آتی۔ اور گو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا محمد علی اب مہاراجہ صاحب کے کام کے نہیں رہے اور مہاراجہ صاحب جو روپیہ اُنکے اوپر یا اُنکے کاموں پر صرف کرینگے وہ تجارتی اصطلاح میں بٹے کھاتے میں جائے گا۔ لیکن پھر بھی اگر صرف اس لیے کہ مہاراجہ صاحب سے اختلاف رکھنے والا اور اُسکے اظہار کی جرأت کرنے والا یہ عاجز ہمدرد کا منتظم نہ رہے مہاراجہ صاحب

میرا ناچیز مشورہ قبول فرمالیں اور ایک ہزار روپیہ ماہوار ہمدرد کا مقرر کر دیں تو ہمدرد بغیر کسی خسارہ کے چلایا جا سکے گا۔ اور ضرورت نہ رہے گی کہ میں لکھنؤ سے جاکر اُس کے انتظامات کی نگرانی کروں۔

مہاراجہ صاحب سے جو اختلافات رہے، کم و بیش اسی قسم کے اختلافات سر محمد شفیع اور بہت دوسرے حضرات سے بھی رہے ہیں۔ خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے معاملات کی وجہ سے بزرگانِ علیگڑھ کی رایوں اور طریق کار سے بار بار مجھے اختلاف کرنا پڑا ہے۔ سر شفیع پنجاب میں رہتے ہیں اور اس سبب سے اُنکی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کے مواقع شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں، لیکن دیگر حضرات سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میری روش اور تحریروں سے سخت ناراض ہونے کے باوجود اُن میں سے کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو مجھے اپنا دشمن تصور کرتے ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی صاحب کے دل میں یہ خیال ہو تو میں باوب عرض کرونگا کہ وہ بھی غلطی پر ہیں۔

ایمرسن کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اختلافِ رائے کے سوا انسان کا ہر گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں کہ مہاراجہ صاحب اور دوسرے حضرات جن سے میں اختلاف کرتا رہا ہوں، حق بجانب ہونگے اگر میرے اس گناہ کو ناقابلِ عفو تصور فرمائیں۔ مہاراجہ صاحب کے مقابلہ میں میرا یہ گناہ اور بھی زیادہ سنگین ہونا چاہیے کہ لکھنؤ اُنکے اثر و اقتدار کا مرکز ہے۔ جہاں اُن کے ہر طبقہ کے اعوان و انصار موجود ہیں اور اس سبب سے شاید اُنکے لیے یہ امر بالکل خلافِ توقع وقوع پذیر ہوا کہ اُنکے کثیر التعداد دوستوں اور ہوا خواہوں کے علی الرغم ایک نہایت حقیر و ناچیز ہستی نے جلسۂ عام منعقد کرکے اُنکے خلاف ملامت کی تجویز پیش کی اور وہ اُنکے بعض نادان دوستوں کی مخالفت کے باوجود منظور ہوگئی۔

لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس ملامت کرنے والی جماعت یا اُنکو دعوتِ اجتماع دینے والے کو اپنا دشمن قرار دیں، اُنھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اس قسم کی تحریک کیوں پیدا ہوئی اور اُنکے وسیع ترین حلقۂ اثر کو نظر انداز کرکے کیسے کامیابی کی منزل سے گزر گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ صاحب کے طریق کار اور طرز عمل نے کثیر التعداد مسلمانوں کے قلوب اُنکی طرف سے پھیر دیے ہیں۔ لوگ اپنے ذاتی تعلقات، اپنے شخصی اغراض، یا اپنے فطری ضعف کی بدولت ممکن ہے کہ دلوں کی بات کو زبان پر لانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، یا نقصان کے خطرہ سے ایسی کسی تحریک میں عملی شرکت گوارا نہ کریں جس کا مقصود یہ ہو کہ مہاراجہ صاحب کی روش کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔" ردِ دل

یقین رکھتے ہیں اور خانگی صحبتوں میں بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے ہیں کہ مہاراجہ صاحب غلطی پر ہیں، اور اس سبب سے مہاراجہ صاحب کے خلاف جو مظاہرے کیے جائیں وہ اُن سے ہمدردی رکھتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اُنکی مخالفت پسند نہیں کرتے۔

بے شبہ فرنگی محل کے اصحاب اور بہت سے دوسرے لوگ جو سلطان ابن سعود کی مفروضہ وہابیت سے سخت بیزار ہیں، دل سے مہاراجہ صاحب کے ساتھ تھے۔ لیکن فرنگی محل والے بھی اسکے لیے تیار نہیں کہ اس باہمی نزاع میں انگریزوں کو دعوتِ مداخلت دیں۔ اور لکھنؤ کے کثیر التعداد مسلمانوں کو تو خود فرنگی محل والوں سے شدید اختلاف ہے کہ اُنھوں نے اس معاملہ میں شیعہ مجتہدین اور شیعہ رؤسا کے ساتھ شرکت کرکے اہل سنت کی تذلیل و دلآزاری کا سامان فراہم کیا۔ میرے مصلحت پسند احباب، ایسے مواقع پر دیدہ و دانستہ خاموش رہتے ہیں اور بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ

"گُفتن آئینِ ہوشیاری نیست
دگرچہ دانستن اختیاری نیست"

لیکن میں نے قومی و ملکی معاملات میں، خصوصاً جب کبھی امرِ حق کے اظہار کی ضرورت ہو، ہمیشہ "ہوشیاری" پر بے ہوشی کو ترجیح دی ہے۔ اور خدا سے دعا ہے کہ اسی مشرب پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بایں ہمہ اُن اُمور میں اپنے احباب کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے میں کبھی مجھے عذر نہیں وتا جن میں اُنکی روش کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور نہ وقتی و فروعی اختلافات کی بنا پر ایسے بزرگانِ م و ملک کی عظمت و عقیدت میں فرق آتا ہے جنکا اخلاص غیر مشتبہ اور جنکی خدمات مسلّم ہیں۔

مہاراجہ صاحب کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی مسلمان نہیں، "وہابی" بھی نہیں، اس صوبہ ے رہنے والے بھی نہیں، زر و زمین کا زور بھی اُنکے پاس نہیں، اُن علوم کے عالم بھی نہیں، ن کی وجہ سے ایک مسلمان یا "وہابی" اُنکی عظمت کر سکے، لیکن باوجود اسکے نہ صرف یہ حقیر بلکہ ں جماعت کے کثیر افراد جو کبھی مہاراجہ صاحب کے لوائے سرداری کے نیچے جمع رہتی تھی۔ ی دل سے قدر کرتے اور اُنکی سرداری کو اپنے لیے باعثِ فخر جانتے ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا صرف ی لیے نہیں کہ اُنکی بے لوثی اور اخلاص مسلّم ہے۔ اور اُن کا ایثار اور جذبۂ حریت پسندی غیر مشتبہ۔ مہاراجہ صاحب کو اگر قومی و ملکی کارکنوں کی جماعت میں وہی عزت و منزلت حاصل کرنا

مقصود ہے جو ۱۹۱۶ء تک انھیں حاصل رہی تو وہ شوق سے آزمایش گاہِ سیاست میں تشریف نہ لائیں اور آنکھوں کے آنسوؤں یا زبان کے بولوں سے نہیں بلکہ اعمال و کردار سے لوگوں کے دلوں میں اپنی بے نفسی و اخلاص مندی، قوم پروری و وطن دوستی، آزادی و حریت پسندی کا یقین و اعتماد پیدا کریں تو دوسرے احباب کے ساتھ بلکہ انشاءاللہ اُن سے کچھ آگے رہ کر میں بھی عظمت و احترام کی نذر بارگاہِ معلیٰ میں پیش کرنے کے لیے کمربستہ نظر آؤں گا۔

البتہ بے موقع نہ ہوگا اگر انھیں خواجہ حافظ کا وہ شعر اس وقت یاد دلا دیا جائے جو ۱۹۱۶ء میں مسز سروجنی نائیڈو نے سر جیمس مسٹن کی موجودگی میں تقریر کرتے ہوئے قیصر باغ کی بارہ دری میں پڑھا اور پڑھ کر تمام سامعین کو مسحور کر لیا تھا۔ وہ یہ تھا

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اور اگر مہاراجہ صاحب کو صرف میرے زبان و قلم پر منّت پذیر ہونا منظور ہے تو میں اس کے لیے بھی بخوشی حاضر ہوں، لیکن یہ نذرانہ بھی غیر مشروط نہیں۔ [illegible]

(لین دین) کا اصول اس دنیا میں عام طور پر رائج ہے۔ میں بھی اپنی خاموشی کی قیمت چاہتا ہوں۔ اور قیمت بھی ایسی نہیں کہ اُن کے امکان سے باہر ہو۔

یعنی صرف اسقدر کہ وہ قومی و ملکی معاملات میں اپنی سرمایہ و ارانہ روش کو ترک فرما دیں۔

اُن کا تعلقہ، اُن کی خان بہادری، اُن کا کے سی ایس آئی [illegible] سب اُن کو مبارک رہے، بلکہ اگر اُن کو حکومت [illegible] کا خطاب عطا کر دے یا کسی [illegible] کی گورنری دیدے، یا مہاراجہ بنارس کی طرح محمود آباد کا خود مختار والیِ ملک بنا دے جسکی تمنا ہے جیسا سُنا ہے کہ اُن کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تب بھی چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ ہمیں تو صرف اپنی قوم و ملک کی فلاح و بہبود سے سروکار ہے۔ اور اُن کی روش نے چونکہ ثابت کر دیا ہے کہ اُن کے موجودہ مطمحِ نظر اور طریقِ کار سے قوم و ملک کو نقصان پہونچتا ہے اس لیے اُن سے خطاب کرنے کی جرأت کرنا پڑتی ہے۔ وہ ان چیزوں سے بے تعلق ہو جائیں یا جو بظاہر ناممکن ہے پھر اپنی روش بدل دیں۔ حالانکہ اگر یہ [illegible] کے بموجب چیتے کی کھال سے نقش [illegible] ہم بڑی خوشی سے اسکے لیے تیار ہونگے کہ آپ نے غلط [illegible] [illegible]

اگر یہ دونوں غیر ممکن یا نا قابل قبول ہیں تو ہمیں اختلاف کرنے پر بھی مجبور و معذور جانیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

لیکن خواہ موجودہ اختلافات قائم رہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وسعت حاصل کرلیں یا اُن کی روش میں تبدیلی پیدا ہونے کی وجہ سے بالکل رفع ہو جائیں۔ مہاراجہ صاحب کو اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس فقیر کو خدانخواستہ اُن سے دشمنی و عداوت ہے

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر وہ بھی تو ابن سعود کے خلاف امکانی جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ عقیدہ کا اختلاف اس کا باعث ہو یا حجاز کی سیاست۔ لیکن ابن سعود کا بڑے سے بڑا حامی یا کوئی کٹر سے کٹر "وہابی" بھی یہ تو نہیں کہتا کہ مہاراجہ صاحب کو ابن سعود سے عداوت و دشمنی ہے یا اُسکو تخت حجاز سے گرا کر وہ خود ارض حجاز کے والی و حکمران بنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ چونکہ وہ بکا موحد ہے اور مقابر و آثر کی عظمت کرنے میں مہاراجہ صاحب اور اُنکے ہم خیالوں اور ہم مشربوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لیے وہ اُسے حکومت حجاز سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگرچہ مغربی سیاسیین کی طرح ابن سعود کے مخالفین عموماً حرب عقائد کا سارا الزام اُسی غریب کے سر تھوپتے ہیں لیکن جن لوگوں کی بصیرت پر حماقت یا تعصب نے پردے نہیں ڈال دیے ہیں وہ تو اس قسم کی ابلہ افریبیوں میں مبتلا نہیں ہوسکتے کہ ابن سعود کے مخالفین کے دلوں میں محض اہل حجاز کی محبت کے جذبات ہیں، عقائد کو کچھ دخل نہیں۔

پھر اگر مذہبی معتقدات یا سیاسی تخیلات کے اختلاف کی بنا پر مہاراجہ صاحب اور اُنکے شرکاء کار یا محترم علی برادران اور اُن کے متبعین حق بجانب ہوسکتے ہیں کہ ابن سعود کے خلاف ہر قسم کی مخالفت زدوں کا اظہار کریں، مظاہروں کا سامان کریں، حتیٰ کہ التواء حج تک کا اعلان کردیں، وائسرائے سے جاکر عرض معروض کریں، جارج پنجم کی دہائی دیں، اور سارے ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلامی تک میں اپنی مخالفت کا ڈھنڈورا پیٹیں تو اس فقیر بینوا سے کیوں اسکی توقع کی جاتی ہے کہ وہ مہاراجہ صاحب کی غلطیوں اور کرشمہ سازیوں پر پردہ ڈالتا رہے اور اُنکی بے مہریوں اور بدعنوانیوں کو نظر انداز کرتا رہے۔

ظفر الملک

۲۳۔ اگست ۱۹۲۵ء

دائرۂ سیاسیہ

اُردو زبان میں یوں تو خدا کے فضل و کرم سے ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں کا ذ[خیرہ]
موجود ہے اور اس ذخیرے میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہے، لیکن ایسی کتابیں جن کے مطا[لعے]
سے غیر انگریزی داں اصحاب کو سیاسی مسائل سے پوری آگاہی ہو، اُردو میں اتنی کم ہیں کہ نہ ہو[نے کے]
برابر ہیں - اور اب تک اس اہم ضرورت کی طرف ہمارے اہل قلم اور قومی کارکن دونوں
سے کسی کی توجہ نہیں -

ہندوستان کو اگر آزاد کرانا ہے، یا سیاسی حیثیت سے ہندوستانیوں کو کسی قسم کی بھی ترقی
کرنا ہے تو تھوڑے سے انگریزی داں اصحاب کی سیاسی واقفیت سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ لازمی ہے
کہ وہ کثیر التعداد طبقہ جو انگریزی نہیں جانتا اور جسکی اعانت و تائید کے بغیر اس ملک میں کوئی تحریک
کامیاب نہیں ہوسکتی، سیاسی امور میں پوری دلچسپی لینے لگے - اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب وہ
سیاسی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جائے -

اب تک عام باشندگان ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ اخبارات او[ر]
مجالس عامہ رہی ہیں - لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کافی نہیں - ضرورت اسکی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو
سیاست کے متعلق زیادہ ٹھوس واقفیت حاصل ہو اور مسائلِ سیاسی کی علمی و اصولی حیثیت اُن کے
ذہن نشین ہو جائے کہ ملک میں جو تغیرات ہوئے، ہو رہے، یا ہونے والے ہیں، [illegible] کو
وہ پوری طرح سمجھ سکیں، اور اُنکی اہمیت کے لحاظ سے جہاں ضرورت ہو اپنی رائے کا استعمال
کرسکیں -

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کیا گیا ہے کہ سیاسی مسائل پر کتابیں اور رسائل شائع
کرنے کی غرض سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جسکا طریق کار فی الحال حسب ذیل تجویز کیا گیا ہے

(۱) جو صاحب اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں وہ بلا لحاظ مذہب و ملت یا سیاسی فرقہ بندی کے
اس دائرہ کے رکن بن سکتے ہیں - مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے -

(الف)- جو صاحب کم از کم عہ سالانہ چندہ ادا کریں وہ دائرۂ سیاسیہ کے [illegible] ہونگے -

ب - جو صاحب کوئی مفید کتاب لکھیں اور اُسکے حقوق طبع و اشاعت بغیر کسی معاوضے کے

دائرہ کو ہبہ کردیں وہ دائرہ سیاسیہ کے رفیق متصور ہونگے۔

(۲) دائرہ سیاسیہ کی تمام مطبوعات جملہ اراکین و رفقاء کو سال بسال بغیر کسی قیمت کے بھیجی جائینگی۔ البتہ جن اصحاب کے ذمہ چندہ باقی رہیگا انکو تا ادائے رقم بقایا کتابیں نہ بھیجی جائینگی۔

(۳) کتب و رسائل کی فروخت سے جو آمدنی دائرۂ سیاسیہ کو ہوگی وہ مسلسل مزید کتابوں کی اشاعت پر صرف کی جائیگی اور موقع ہوگا تو دائرہ کی جانب سے ایک ماہوار سیاسی جریدہ جاری کیا جائیگا۔

(۴) سردست ادارہ کی جملہ خدمات دفتر اخبار ہمدرد دہلی سے متعلق رہیں گی، اور جس وقت اراکین و رفقاء کی تعداد سو سے زائد ہو جائیگی اُسوقت سب کے باہمی مشورہ سے دائرہ سیاسیہ کا ایک مستقل دستور العمل مرتب کیا جائیگا۔ اور اُسکا سارا انتظام خود اراکینِ دائرہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔

جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہوں اور اس ضروری کام میں اتحادِ عمل کرنا چاہتے ہوں، اُن سے استدعا ہے کہ دس روپیہ ارسال فرماکر اپنا نام نامی ارکین دائرہ کی فہرست میں درج کرائیں، اور جو صاحب قلمی اعانت فرمانا چاہتے ہوں وہ بھی دفتر کو اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ پیش نظر کاموں میں اُنکی اعانت حاصل کی جائے۔

دائرۂ سیاسیہ کے متعلق جملہ مراسلات و ترسیلِ زر کا پتہ یہ ہوگا:—

"مہتمم دائرہ سیاسیہ" دفتر روزانہ ہمدرد۔ دہلی"

داعیان

(مولانا) حسین احمد غفرلہ (دیوبند)	(ڈاکٹر) مختار احمد انصاری (دہلی)	(سر) عبدالقادر (لاہور)
(مولانا) ابوالکلام (کلکتہ)	(مولانا) حسرت موہانی (کانپور)	(ڈاکٹر) سیف الدین کچلو (لاہور)
(ڈاکٹر) سید محمود (چھپرا بہار)	(نواب) اسمعیل خاں (میرٹھ)	(پنڈت) جواہرلال نہرو (الہ آباد)
(پنڈت) کشن پرشاد کول	(مولانا) عبدالماجد	ظفر الملک (لکھنؤ)

سفرنامۂ اندلس

(۴)

عدالت، دادرسی و دادرسانی

وہ زمانہ تو اب اہلِ اسپین کے خواب و خیال سے بھی بعید ہے کہ جب وہاں قاضی جایا کرتا تھا۔ مقدمات پیش ہوتے تھے۔ وکلاے فریقین شرع یا قانون کی ہندی کی چندی نکالتے تھے شہادتوں پہ جرح و تعدیل ہوتی تھی۔ اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے اندر مقدمہ کا فیصلہ اور فوراً ہی ڈگری یا حکمِ آخر کا نفاذ ہو جاتا تھا، اور ہر فریق اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے گھر جا بیٹھتا تھا۔ عدالتہاے مرافعہ کھلی ہوئی تھیں اور ہر شخص کو بادشاہ تک پہونچنے کا حق و موقع تھا۔

یہ صورت تو زمانۂ وحشت یا کُفّار (مسلمانوں) کی علامت سمجھ کر مٹا دی گئی اور اب صرف زیب (یا بدزیبی) قرطاس رہ گئی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ وقت بھی اسپین پر نہیں آیا، کہ مثلاً فوجداری میں، پولیس کو سخت جوابدہی کرنا پڑتی ہے کہ مجرم ایک عرصۂ معینہ سے زائد کیوں زیرِ حراست رہا اور مجسٹریٹوں سے بازپرس ہوتی ہے کہ اتنا عرصہ مقدمات کیوں زیرِ تجویز اور ملزم کیوں زیرِ حوالات رہا ہے

اس وقت یہ حالت ہے کہ عدالتوں کا نظم و نسق و طریقِ کار زمانۂ حال سے اگر صدیوں نہیں تو بیسیوں برس پیچھے ہے۔ انصاف یا دادرسی صحیح معنوں میں وہاں مفقود ہے۔ اگر کوئی انصاف پسند اور رحمدل مجسٹریٹ صحیح و واجب فیصلہ بھی صادر کرے تب بھی یہ حالت ہے کہ غریب ملزم اپنے جرم کی انتہائی سزا سے زیادہ حوالات میں سزا بھگت چکا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جرم کی انتہائی سزا ایک سال قید سخت ہے، تو ملزم دو سال زیرِ حوالات رہ چکا ہوتا ہے۔ یہ نہ کہیے کہ یہ صورت شاذ واقع ہوتی ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہزار ملزموں میں سے شاید ایک ہی ایسا خوش قسمت ہوتا ہو کہ جو جلدی چھٹکارا پا جاتا ہو۔

فوجداری مقدمات کے دیر میں فیصلہ پانے کے خلاف برسوں لوگوں نے شکایتیں کی ہیں، مگر بے نتیجہ۔ ۱۸۸۲ء میں کچھ اصلاحیں ہوئیں، مگر حسبِ معمول وہ عمل میں نہیں آئیں۔ باوجودیکہ وہ اب تک اوراقِ قواعد کی زیبائش ہیں۔ ان کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس پہ زور کے ساتھ بار بار توجہ بھی دلائی جاتی ہے، مگر بے اثر۔

مگر زمانہ وہ چیز ہے کہ وہ سب کو اپنی راہ پر ڈال لیتا ہے۔ قریباً دس سال ہوے کہ لوگوں نے حقیقی طور سے اس طریق کار کے خلاف بغاوت شروع کی ہے۔ اخبارات میں اس کے خلاف مضامین چھپتے ہیں۔ لیکن اگر مجسٹریٹ خود کسی طاقتور فریق متعلقہ وزارت کا فرد یا پٹھو ہوتا ہے تو وہ اخبار سنسر کیا جاتا ہے۔ بڑا اثر ٹریڈ یونین کا پڑا ہے جو ایسے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ گو وہ اپنی برادری ہی کی حمایت کرتے ہیں، مگر ضمناً اس کا فائدہ اوروں کو بھی پہونچ جاتا ہے شاید یہ صورت کسی وقت کارآمد ہو جائے۔ علامتیں تو یہی ہیں۔ گو دس برس کا تجربہ تو بہت اچھا نہیں۔ ہائیکورٹ بھی اس طرف متوجہ ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ نے ایک گشتی حکم سخت تہدید آمیز الفاظ میں جاری کیا تھا، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) بشرطیکہ محکمہ سیاسیات کی طرف سے مداخلت نہ ہو عام طور پر مقدمات (دیوانی یا فوجداری) اتنی مرتبہ ملتوی کیے جاتے ہیں کہ جو سخت شرمناک ہیں۔

(۲) اضلاع میں یہ حالت اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔

(۳) وہ لوگ جن کا تعلق سلطنت سے محض سیاسی ہے اپنے اثر و نفوذ سے اس طرح مقدمات فیصل کرا لیتے ہیں کہ کسی فریق کو حق اپیل باقی نہیں رہتا۔

(۴) عام عدالتیں بالکل عدالتِ کلیسائی بنی ہوئی ہیں کہ جن پر اب بھی بجا طور سے مذاق اُڑایا جاتا ہے اور شعراء اپنے قصائد ہجویہ میں اپنا زور کلام دکھلاتے ہیں۔

(۵) جن مقدمات میں جیوری سے مدد لی جاتی ہے یا سشن میں پیش ہوتے ہیں اُن میں بار بار التواء کیا جانا سخت شرم کی بات ہے۔ فریق مقدمہ کو تکالیف ہوتی ہیں۔ جیوری کو تکلیف ہوتی ہے بعض وقت اہالی جیوری مر جاتے ہیں یا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے حاضر نہیں ہوتے۔ اس سے یا تو مقدمہ از سر نو شروع کرنا پڑتا ہے یا انصاف نہیں ہوتا۔ سشن روز روز اپنا اجلاس نہیں کرتا، اور مقدمات برسوں فیصل نہیں ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی گشتی حکم میں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا گیا ہے جو سرقہ کا تھا، اور جس میں تین آدمیوں کی جانیں ضایع ہوئی تھیں۔ یہ مقدمہ پانچ برس کے بعد فیصل ہوا! کہا گیا ہے کہ "یہ مقدمہ اپنی آپ ہی مثال نہیں ہے بلکہ ہزاروں ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں"۔

ہی کافی ہے ۔ انکے علاوہ زمیندار اپنے اقتدار کی رو سے عدالتوں کو اپنا فٹ بال بنائے رہتے ہیں۔ ممبروں کے احکام سے عدالتیں سرتابی کر سکتی ہیں مگر زمینداروں کی تعمیل اشارہ اگر نہ کی جائے تو مجسٹریٹ یا منصف کا برجا قائم رہنا ناممکن ۔ بعض وقت تو ان کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گیا ہے ۔

برسوں کی چیخ پکار اور محنتِ شاقہ کے بعد رعایا کو حق جیوری عطا کیا گیا ۔ قطع نظر اسکے کہ عدالتوں نے اسکو پسند نہیں کیا ، صوبہ برشلونہ و دیگر مقامات میں تو پہلے ہی سال یہ ثابت ہوگیا کہ اس میں کامیابی نہیں ہوگی ۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں جیوری کے ممبروں کو اتنی تخویف کی گئی کہ وہ غریب کسی کو ملزم قرار دیتے ہوے اپنی جان سے ڈرتے تھے ۔ اس کے ثبوت میں سارا گوسا کا ایک مقدمہ اس قابل ہے کہ اسکو کسیقدر تفصیل سے بیان کیا جائے :—

سارا گوسا میں اسٹرائک ہوا ۔ مزدوروں نے پولیس کے کئی سپاہیوں اور افسروں اور ایک مجسٹریٹ کو قتل کر دیا ۔ مقدمہ قائم ہوا جس میں ایک فریق سرکار اور زمیندار تھے اور دوسرا فریق یہ مزدور ۔ جیوری مقرر ہوئی ۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اُن میں سے ہر ایک کے پاس کئی کئی خطوط اس دھمکی کے پہونچے کہ اگر اُنھوں نے ملزموں کے خلاف رائے دی تو وہ قتل کر دیے جائینگے ۔ گورنمنٹ کی طرف سے اُنکی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ مقررہ پر اٹھارہ آدمیوں (جیورس) نے ڈاکٹری سرٹفکیٹ بھیجدیے ۔ وکیل سرکار بھی عین وقت پر بیمار ہو گیا ۔ مجبوراً مقدمہ ملتوی کرنا پڑا ۔ دوسری پیشی پر (جو پانچ روز بعد مقرر ہوئی) بیالیس گواہوں میں سے صرف ایک حاضر ہوے اور جیوری کے پھر ڈاکٹری سرٹفکیٹ آگئے ۔ اس واقعہ پر ایک اخبار نے جو نوٹ لکھا تھا وہ یہ ہے کہ "سارا گوسا میں جو وبا یکایک پھوٹ پڑی ہے نہ اُسکی تحقیقات کی ضرورت ہے نہ محکمۂ صفائی کے لیے فکر کی بات ہے ۔ مگر اس واقعہ سے عوام الناس کو تشخیص مرض میں بڑی مدد ملی ہے ۔"

بڑی مصیبت رشوت ہے ۔ جو بنام نہاد "قیمت" اسپین بھر میں بلاے بے درماں بنی ہوئی ہے ۔ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمام حکام بد دیانت ہیں ۔ اِلّا ماشاءاللہ ۔ دوسری آفت یہ ہے کہ اکثر حکام کسی نہ کسی سیاسی آدمی کے آوردہ ہیں ۔ اُن سے یہ اُمید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بے رو و رعایت کام کریں گے ۔ محکمۂ دیوانی کی حالت اور بھی بدتر ہے ! مگر محکمۂ جیل بدترین ہے ۔ نہ صرف اُن مجرمین کے لیے جو زیر تجویز ہیں ، بلکہ اُن ملزمین کے لیے بھی جو اپنی سزاے اعمال پا رہے ہیں ۔ ان سب پر مستزاد یہ غضب ہے کہ پولیس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ اُنکی داد و فریاد کہیں نہیں ۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں جیلخانوں کا خرچ بمقابلہ سنہ ۱۶-۱۹۱۵ء کے قریباً ۱۲۸ فی صدی بڑھ گیا ۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اصلی وجہ یہ ہے

کہ افسران محکمہ پولیس کے حکم سے ہزاروں ایسے آدمی جیل میں بھیج دیے گئے جو عدالت میں محض اس لیے نہیں پیش کیے گئے تھے کہ اُن کے خلاف اثبات جرم کے ایسے کافی دلائل موجود نہیں ہیں کہ عدالتیں انکو سزائیں دے سکیں، مگر حکام پولیس کو اُنکے ملزم ہونے کا یقین کامل ہے! ایک سوشلسٹ ممبر کونسل نے اس واقعہ کی طرف سیڈ اوڈ کے میئر کو توجہ دلاتے ہوئے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک تھیٹر میں تماشا دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اُن سے ٹکٹ مانگا گیا۔ یہ سخت توہین تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ پولیس سے دریافت کرلو کہ میں کون ہوں۔ وہ غریب دریافت کرنے گیا تو گرفتار کرلیا گیا اور پولیس کے افسر اعلیٰ نے اُس شخص پر تین سو روپیہ جرمانہ کردیا۔ چونکہ جرمانہ فوراً ادا نہ ہوسکا، اسلیے وہ جیل بھیجدیا گیا! میئر نے اس پر توجہ فرمانے کا وعدہ کیا، مگر نہ معلوم کیا انجام ہوا۔

کسی کنسٹبل پولیس سے بگاڑ لینا تو دوزخ کو مول لینا ہے۔ ایک حلال خور سے بھی چشمک ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ تمام میونسپلیٹی کو اپنا دشمن بنا لیا گیا۔ جو فریق کہ برسر اقتدار ہو اُسکے خلاف ووٹ دینے یا اسکی تیاری کرنا بھی جرم ہے۔ اسکی سزا کسی نہ کسی بہانے سے پانا پڑتی ہے۔

مفصلۂ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُس مُلک میں زندگی وبال جان ہوگی اور ہر شخص کو ہر وقت جیل جانے کا اندیشہ رہتا ہوگا۔ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے۔ نیک چلنی اور احتیاط اپنا پھل لاتی ہے۔ البتہ بعض موقعے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو خائف رہنا چاہیے۔ مثلاً سنہ ۱۹۲۱ء میں جب سینور ایڈوارڈ وڈاٹو وزیر اعظم مارا گیا تھا تو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہ گیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ گرفتار ہوے اور پولیس کی معمولی و مشہور تعزیریں اور عدالتوں کی سُستی و کاہلی کی سزائیں پائیں۔ اس موقعہ پر جس شخص پر ذرا سا بھی شبہہ پولیس کو ہوا، نہ صرف وہی پکڑا گیا، اور اُسکی سسرال تک کا تمام خاندان گرفتار و پامال ہوا۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ اس پولیٹیکل قتل میں قصور خود پولیس کا تھا۔ کیونکہ اُسے پیشتر ہی سے مُخبرین نے اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کا یہ عذر ہے کہ وزیر اعظم بوقت قتل موٹر پر سوار تھے، اور پولیس کو کوئی ایسی سواری گورنمنٹ کی طرف سے مہیا نہیں کی گئی تھی۔ (مقابلہ کیجیے اس واقعہ کا دہلی کے اُس واقعہ سے جب لارڈ ہارڈنگ پر بم کا گولہ پھینکا گیا)

لہ کان فصاحت لکھنؤ کے ایک اخبار نے **Mayor** کا ترجمہ "ابو البلد" کیا ہے۔ میں بھی یہی لکھنا چاہتا تھا مگر شاید سمجھا نہ جاتا۔ اس لیے معافی مانگتا ہوں۔ ایک اور موقعہ پر اسی جانِ فصاحت لکھنؤ کے اخبار کی دتیاج میں میں نے کابل کی ملکہ "ثوریہ" کو "ملکہ ثوریہ" لکھا ہے۔ اس اصلاح کی بابت اُس معزز و موقر اخبار سے معافی چاہتا ہوں میری رائے ناقص میں لفظ "ثوریہ" زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ثور کے معنی ہیں بیل۔ اسکا مؤنث ثوریہ یعنی گائے یقیناً صحیح ہوگا۔

یوں تو اپنے اپنے ملکوں کی رعایا کی ہر سفیر حفاظت کرتا ہے، مگر رعایائے گورنمنٹ برطانیہ (خواہ وہ ذلیل ملک ہندوستان کی ہو یا کناڈا اور آسٹریلیا کی) بہت کچھ مصئون و محفوظ ہے۔ ہماری گورنمنٹ کو یہ بجا شکایت ہے کہ سفیر برطانیہ کا زیادہ وقت اسی میں خراب ہوتا ہے۔

جن دنوں کہ اسپین میں بوجہ حرفتی مقابلہ کے کشاکش ہوتی ہے وہ زمانہ بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اُس وقت ہر شخص کو سخت احتیاط رکھنا چاہیے۔ بہت سے بے گناہ تکلیف پا چکے ہیں اور بعض بےقصور دو دو برس جیل میں پڑے سڑتے رہے ہیں، اور اسکے بعد بھی دور دراز مقامات کی جیلوں میں اپنی ہی سزا بھگتنے کے لیے بھیج دیے گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُن غریبوں پر ان چار برسوں میں کسی عدالت نے جرم قائم نہیں کیا!

جو حضرات ہندوستان کے جیلوں کے انتظامات پر نکتہ چینی کر رہے ہیں، مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اسپین کے جیلوں کے حالات بھی مختصر طور پر سُن لیں سینور روسی اور گل جیل کمیٹی کے ممبر نے ایک جیل کا ملاحظہ کرنے کے بعد لکھا ہے:-

عورتوں کے جیل میں بہت سی عورتیں تو وہ ہیں کہ جو حُسن فروش کہلاتی ہیں، اور اپنے فرقہ کی معمولی بیماریوں سے خوب اچھی طرح سرفراز ہیں۔ انکے سوا بہت سی بھکاری عورتیں ہیں، اور وہ گھر ستنیں ہیں جو کسی قانونِ میونسپلٹی کی خلاف ورزی میں قید ہیں۔ ان سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جن پر ابھی کسی عدالت نے جرم بھی قائم نہیں کیا۔ ان سب کے لیے صرف ایک کوٹھری مہیا کی گئی ہے۔ اُن کو اپنا بستر لانے کی اجازت نہیں۔ ٹاٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انکو دیے گئے ہیں، وہ اُنھیں کو بچھاتی ہیں۔ چونکہ جگہ کم ہے اس لیے ایک دوسری سے گویا ہم بغل ہو کر سوتی ہیں۔ محکمۂ صفائی کے انسپکٹر سے لے کر گورنر تک کو یہ حال معلوم ہے۔ اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ابھی تپِ محرقہ اور حسن فروشوں کی مشہور بیماریوں کی ملک میں کمی ہے کہ وہ اُن کا اور زیادہ شیوع چاہتے ہیں؟

مردانہ جیل میں ۱۵-۱۶ برس کے لڑکوں سے لیکر بڈھے اور اندھے تک اپنے دن گن رہے ہیں۔ زیادہ تعداد اُن لڑکوں کی ہے جو قماربازی یا بھیک مانگنے کے جرم میں گرفتار ہیں۔ اور باقی قیدی چھوٹے جرموں سے قتل و غارت کے جرموں کے مجرم ہیں۔ یہ سب ایسی کوٹھریوں میں بند کیے جاتے ہیں جن میں صرف ایک روشن دان کُھلا ہے۔ کوٹھری نہ صرف تاریک ہے بلکہ نم دار بھی ہے۔ فرش کچا ہے۔ سب کے لیے ایک ٹاٹ ہے۔ رہا شدہ قیدیوں کے کپڑے اُنھیں

پہننے کو ملتے ہیں۔ اُنکے دھونے یا ڈس انفکٹ کرنے کا کوئی سامان نہیں، کوٹھریوں کے ڈس انفکٹ کا کیا ذکر ہے۔ ان میں سے جو بدبو نکلتی ہے وہ دُور دُور تک گوارا نہیں ہوتی۔ ہر قسم کے موذی کیڑوں کی بھرمار ہے۔ بدکاری کا سامان مہیا ہے۔ اب بھی اگر شہروں میں وبائیں پھیلیں تو حکام جیل کا قصور نہیں ہے۔ میں مجسٹریٹوں کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ان بدقسمتوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس پر کوئی عدالت اثبات جرم کر چکی ہو یا سزا دے چکی ہو۔ ان میں سے بہت سے لیے ہیں کہ تین تین برس سے یہاں پڑے سڑ رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ بیگناہ ہیں۔ اگر اسکو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ مجرم ہیں، تو کیا ابھی اُن کے جرموں کا کفارہ نہیں ہو چکا ہے؟ ....
کیا کوئی ایسا ہے جو میرے اس بیان کی تردید و تکذیب کرے؟ کیا کوئی ایسا ہے جو اصلاح حال میں میرا ہم نوا ہو؟

اہالی اسپین میں سے شاید کوئی بھی ایسا آدمی نہ نکلے جو اس بات کو تسلیم نہ کرلے کہ اسپین کے جیل بالکل وہی ہیں جو قرون وسطے میں تھے۔ ڈلکے ٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز میں اسلوب پیدا کر دینگے۔ کوئی اور محکمہ تو شاید اُن کا شکر گزار ہو، مگر محکمہ جیل تو بد سے بدتر ہوئے چلا جاتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ بہت سے زیر تجویز قیدی رہا کر دیے گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ محض اس لیے کہ پولٹیکل قیدیوں کے لیے جگہ خالی ہو۔

مزدور

تمام دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نفرت و عداوت اس شدت کے ساتھ شروع ہوئی ہے کہ (العلم عنداللہ) انجام یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار اُس سے زیادہ حقیر و ذلیل ہو جائیں گے جتنے کسی زمانہ میں مزدور تھے۔ مزدوروں کی طاقت روز افزوں ہے اور سرمایہ دارو کی یہ کیفیت ہے کہ وہ حیران و پریشاں مُنہ تاک رہے ہیں۔ وہ وقت بہت قریب ہے کہ ایں کشند نازچوں بندہ۔ دُور کیوں جائیے اس تاریک و غلام مُلک ہندوستان میں ہوشمندوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ باورچی، خدمتگار، سائیس کہاں سے اور کس مشاہرہ پر ملیں گے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ماہ فروری گذشتہ کے اخیر میں بمقام الہ آباد ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ ایک حلال خور (مہتر) بڑے بڑے بازاروں میں اپنی صوتِ جہیر کے ساتھ پکارتا پھرتا تھا کہ "صدیاں ہو گئیں کہ ہندو اور مسلمان ہم سے غلیظ سے غلیظ کام لیتے رہے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اُن سے ہی

کام لیں" وغیرہ وغیرہ - کسی کی یہ مجال نہیں ہوئی کہ اُس سے کچھ سوال کرلے، روکنا تو امر آخر ہے۔ یہ ہندوستان کا حال ہے؛ یورپ میں تو بڑے بڑے اہم اور اصولی سوال پیدا ہیں اور سرمایہ دار پریشان ہیں - لیکن اگر اسکا اثر نہیں ہے تو اسپین میں - وہاں اب بھی یہ کیفیت ہے کہ کارخانہ داروں کے وہی خیالات ہیں، جو صدیوں سے چلے آتے ہیں کہ ہمارے مزدور ہمارے زیردست ہیں - زمینداراں امرا اسی پرانی ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور وہ اپنے زیردستوں پر پرانے ظلم روا رکھتے ہیں اور ویسے ہی غرور سے پیش آتے ہیں - یہ کیفیت نہ صرف اُن ہی مزدوروں کی ہے جو اپنے گاڑھے پسینے کی روٹی کھاتے ہیں، بلکہ اُن کی بھی جو سوداگروں کے نوکر ہیں یا کسی حرفتی کارخانہ میں کام کرتے ہیں اسکو ذرا تعمیم کے ساتھ یوں کہنا چاہیے کہ اسپین کا ہر مرد و عورت اُس شخص کو حقیر سمجھتے ہیں جس سے وہ تنخواہ یا مزدوری دے کر کام لیتے ہیں - وہ اپنے کردار و گفتار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک مزدور یا تنخواہ دار کا کوئی حق، سوائے ہاتھ کی اُٹھائی چیز کے، اُن پر نہیں ہے - وہ اس امر کو کبھی خیال میں بھی نہیں لاتے کہ اُنکی آرام و آسایش، عزت و آبرو ان ہی مزدوروں یا نوکروں کے صدقہ میں ہے - اپنے فرائض کی ادائگی کا کوئی خاص صلہ یا اُنکی خدمت کا پورا معاوضہ ہرگز نہیں ملتا - ہر سرمایہ دار اپنا حق سمجھتا ہے کہ مزدور سے سب سے زیادہ کام لے اور سب سے کم مزدوری دے - وہ مزدور پر ظلم کرے اور وہ اُسے سہے اور اُف نہ کرے - ہر سرمایہ دار کی بیوی اپنی ماما یا نوکر کو یہ سمجھتی اور وہی سلوک کرتی ہے جو کوڑے کرکٹ سے ہونا چاہیے - یہی وجہ ہے کہ اسپین کے نوکر یا مزدور اپنے آقا کو پورا کام کرکے نہیں دیتے - اور مُگرے، سُست، بے پروا اور نا قابل ہوتے ہیں - ایک معمولی مزدور دس آنے مزدوری پاتا ہے - جوان، مضبوط، تندرست کاریگر کو دو شلنگ پانچ پنس سے لیکر ایک شلنگ ۸ پنس تک مزدوری ملتی ہے - ایک کلرک کو ۲۴ پونڈ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار ہو - ظاہر ہے کہ یہ بہت قلیل مزدوری ہے - اور مزدور اس سے بھی کم کام کرکے دیتا ہے - جنگ کے بعد سے نہایت قدرے قلیل مزدوریاں اور تنخواہیں بڑھ گئی ہیں، وہ بھی اُس وقت کہ جب اسٹرایک ہوئیں اور یہ لوگ خم ٹھونک کر مرنے مارنے پر تیار ہوگئے -

ملک اسپین کی ایک بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہا - وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے پہلے ہی کم ہے اور بیواؤں اور یتیموں کی تعداد نہیں بڑھی کہ اُنکو مردوں کے مقابلہ کا حوصلہ نہیں ہوا - نہ وہاں فیشن کی انگلستان و فرانس جیسی بدہضمی ہے - عورتیں اب بھی وہاں مردوں کی دست نگر ہیں اور گھر کا کام کاج کرتی ہیں - ورنہ خدا جانے کیا آفت آتی -

مزدوروں کی بڑی دشمن پولیس ہے (شاید اس میں وہ پولیس شامل نہیں ہے جن کو خود بہت ہی کم تنخواہ ملتی ہے - وہ قواعدداں بھی واجبی ہی ہے اور سخت بدتہذیب - اُنکی وردیاں بھی ایسی پھٹی ہوئی ہیں کہ وہ خود مزدور معلوم ہوتے ہیں- یہ پولیس ہی ہے جو مزدوروں کو آزاد نہیں ہونے دیتی - اور اُن سے ہر جگہ اس طرح سلوک کرتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ روز روز فساد کیوں نہیں ہوتے اہالی پولیس آن پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں- انکی زبان ایسی سخت ہے کہ وہ مزدوروں سے بغیر گالی کے بات نہیں کرتے - ایک ذرا سے خیالی جرم پر عورتوں، مردوں اور بچوں کو ہتکڑی لگاکر بازار میں لیے پھرتے ہیں، جس سے مزدوروں کی آبرو میں فرق آتا ہے اور وہ اور بھی بے حیا ہوجاتے ہیں -

اسپین کے حکام کو اپنے اختیارات کی جا و بیجا نمایش کرنے کا بہت شوق ہے- مزدور اپنی تکلیف رفع کرنے کے لیے کوئی حلیہ کرتے ہیں تو مجسٹریٹ پولیس کی ایک فوج کی فوج لیکر پہونچ جاتے ہیں، اُنکی حرف گیری کرتے ہیں ؛ انکو غصہ آتا ہے اور پولیس کی ہتکڑیاں فوراً کام میں آنا شروع ہو جاتی ہیں- اس کا انجام بعض وقت فریقین کے قتل پر ہوتا ہے - اور انتقام کا سلسلہ اسی طرح شروع ہوجاتا ہے جیسا کہ ہمارے یہاں کے سرحدی پٹھانوں میں - یہ دیکھ کر جو ہوشدار ہیں وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ ایسا ملک کبھی ترقی کر بھی سکتا ہے یا نہیں - خصوصاً ایسی حالت میں کہ متوسط الحال لوگ اپنی ہستی کا کوئی اثر گورنمنٹ پر پیدا نہیں کرسکتے - ٹریڈ یونین اور اسی قبیل کی اور انجمنیں اب بھی وہاں عملی طور پر خلافِ قانون ہی سمجھی جاتی ہیں -

پادری صدیوں سے اپنی تمام بلاغت اسپر صرف کرتے رہے ہیں کہ انسان کو خدا پر توکل کرنا اور اپنے حال میں خوش رہنا چاہیے - اسپین کے غربا نے اس پر بہت کچھ عمل اور اپنی حالت پر صبر کیا، مگر یکایک ملک روس کی طرف سے کچھ اُمید کی کرنیں اُنکو نظر آئیں - اس وقت کی حالت یہ ہے کہ بیشتر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو لینن کو اپنا معبود مانے ہوے ہیں - انکی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے - باوجود اسکے سخت مشکل یہ ہے کہ ان مزدوروں میں بھی برادریاں قائم ہوگئی ہیں - ایک برادری کا آدمی دوسری برادری والے کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتا - ایک دوسرے کو ذلیل جانتا اور اپنا رقیب سمجھتا ہے - اتفاق و اتحاد نہیں تو نتیجہ معلوم -

گورنمنٹ کے ہاتھ میں ایک بڑا کاری ہتھیار رجال وطنی ہے - جہاں کہیں سرمایہ دار اور مزدوروں

ہیں کہ سرسری تحقیقات کے بعد دونوں فریق میں سے جو مجرم معلوم ہو اسکو جلا وطن کر دیں۔ سرمایہ دار دونوں ہیں وہ کیوں جلا وطن ہونے لگے تھے، خمیازہ غریب مزدوروں ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ جلا وطنی میں نہ مردوں کو دیکھا جاتا ہے نہ عورتوں کو نہ بچوں کو حتیٰ کہ بعض وقت دس برس کی عمر کے بچوں کو بھی جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تحقیقات سرسری ہوتی ہے اور اس میں بھی اثبات جرم کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اور لوگ جلا وطن کر دیے جاتے ہیں۔ انکی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔ بعض وقت تو ایک ایک ضلع سے سیکڑوں کی تعداد میں جلا وطن ہوتے ہیں۔ اور وطن سے سیکڑوں میل پہونچا دیے جاتے ہیں۔ اعزا و اقارب کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں۔ راستہ کے مصائب اُن پر ایسے ایسے پڑتے ہیں کہ اگر تفصیل بیان کی جائے تو دل پگھل جائیں۔ میرا دل پتھر کا ہے کہ اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ کے قانون انتقام کا یہ ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ یاد کرو اُن مصائب کو جن میں تم ہی نے مولدین کو مبتلا کیا تھا۔ تمھارے اخبار تمھاری زبان بن کر آج گلا پھاڑ پھاڑ کر تمھارا مرثیہ پڑھتے اور تم پر روتے ہیں اور کوئی شنوا نہیں۔ کبھی تم نے اُن بے زبان مولدین کی فریاد بھی سُنی تھی جو آج تک فضائے آسمانی میں گونج رہی ہے۔ اللہ ہی سب سے بڑا بینا ہے اور وہی منتقم حقیقی ہے۔ تم نے مولدین کی ماؤں کی گودوں سے بچے چھینے ہیں، آج تمھاری ماؤں کی گودوں سے بچے چھینے جاتے ہیں۔ تمھاری حالت توریت کی اس آیت کی مصداق ہے کہ "میں تجھ سے، تیری اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے بدلہ لوں گا"

مزارعین

ہمارے ہندوستان کی طرح اسپین کا بڑا حصہ زراعتی ہے۔ اگر برسلونہ اور بلباؤ کو مستثنیٰ کر دیا جائے، جہاں کچھ کارخانے کھل گئے ہیں تو تمام ملک میں زراعت ہوتی ہے اور لوگ اسی پیشہ کی بدولت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

ہر زراعتی ملک میں مزارعین کو حاصل زمین بہت زیادہ عزیز ہوتے ہیں، اور اسی اُمید پر وہ محنتہائے شاقہ برداشت کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسپین میں جو زراعتی ملک ہے مزارعین اپنی محنت سے برومند ہوتے ہیں یا زمیندار؟ اسکا مختصر جواب یہ ہے کہ غریب محنت کش مزارعین گھاٹے میں رہتے ہیں اور سب سے بڑا حصہ زمیندار لے جاتے ہیں۔

ہر زراعتی ملک میں زمینداروں کے حقوق کو گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ یا تو ملکیت زمین بطور انعام جاں نثاری حاصل کرتے ہیں یا

یا مدت العمر کی کمائی سے زمین حاصل کرتے ہیں۔ زمیندار خواہ پہلے فرقے کے ہوں یا دوسرے کے بہرحال گورنمنٹ کے دست و بازو ہوتے ہیں اور آڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ یہ لوگ بقدر اپنے مال کے وقعت و عزت پیدا کر لیتے اور اس سے فائدہ اُٹھاتے اور پہونچاتے ہیں۔ مگر شدہ شدہ انکی چیرہ دستیاں بڑھ جاتی ہیں اور انکی طرف سے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ ایک سوال یہ بھی ہے کہ جب اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ تمام اراضی ملک کی مالک سرکار ہے (ان الارض للہ یورثہا من یشاء) تو یہ درمیانی کڑی زمینداری کی کہاں سے آگئی؟ اور کیوں قائم رکھی جائے؟ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہمارے بندوبست نے جلدی کی اور اسی بنا پر زمینداروں کے خاندانوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے کا ارادہ کیا۔ منجملہ اسباب غدر کے ایک سبب یہ بھی تھا۔ غنیمت ہے کہ اب اس میں یہاں بہت کچھ کمی واقع ہوگئی ہے۔ اسپین میں اس قسم کے سوال نہ پیدا ہوئے نہ ہونگے۔ وہاں زمینداروں کے حقوق اس درجہ تسلیم کیے جاتے ہیں کہ غریب مزارعین کی موت ہے۔ زمیندار مالکان زمین ہی نہیں ہیں بلکہ صحیح طور پر اپنی ملکیت کے حدود میں بے سامان بادشاہ ہیں، اور چھوٹے چھوٹے زمیندار بوجہ حاشیہ بوسانِ وزارت، بادشاہی کر رہے ہیں۔ قوانین ان کی بیجا مراعات کرتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ مزارعین، جنکی تعداد بہت زیادہ ہے، گورنمنٹ کے شاکی ہیں۔

میں ذیل میں جنوبی حصہ اسپین پر نظر ڈالتا ہوں، جہاں تعلقات مابین مزارعین و زمیندار زیادہ خراب ہیں۔ اور ایک مدت سے خراب چلے آتے ہیں۔

اسپین میں ہر چیز کا دارومدار روایات و مراسم قدیمہ پر ہے۔ وہاں کے باشندے اب بھی عملی طور پر اسی ہوا میں اُڑ رہے ہیں جس میں انکے بزرگ صدیوں پیشتر اُڑتے تھے۔

اراضی کے متعلق جتنے جھگڑے ہیں، میں خوش ہوں کہ وہ نتیجہ ہیں اُن بے انصافیوں اور بے ایمانیوں کا جو عیسائیوں نے اُسوقت کی تھیں کہ جب اس ملک کو اُنھوں نے مسلمانوں سے فتح کیا تھا۔ انکے نقش قدم اب تک اندلس سے نہیں مٹے اور مزارعین کی رگوں میں تو اُنہی کا خون دوڑ رہا ہے۔ پھر اسپینی بنیا اور چیز ہے۔ جب مسلمان یہاں سے نکالے گئے تو اراضی ملک تعلقہ داروں[5] کو بطور انعام خدمات جنگ بے سوچے سمجھے ایک ہی جگہ عطا کر دی گئیں۔ اس سے ایک ایک آدمی بڑی بڑی جاگیرات کا مالک و زمیندار ہو گیا۔ اسکے علاوہ انکے بہت سے حقوق

۵۔ میں نے Feudal barons کا ترجمہ تعلقہ دار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان دونوں کی حیثیت میں بڑا فرق ہے، مگر اختصار کے لیے لفظ تعلقہ دار اختیار کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تسلیم کیے گئے - یہی حقوق مزارعین کا خون چوسے جا رہے ہیں - مسلمانوں نے بھی یہی کیا تھا (اور ہر فاتح یہی کرتا ہے) مگر انھوں نے ایک ہی جگہ ایک ہی آدمی کو بڑی جاگیر نہیں دی اور مزارعین کے حقوق کو تسلیم کرایا - اس کے علاوہ ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کو آباد رکھا کہ جاگیردار زور نہ پکڑیں اور مزارعین کے حقوق کی حفاظت رہے، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان - مسلمانوں کے زمانہ میں نہ جاگیرداروں کو شکایت ہوئی نہ مزارعین کو - ہر ایک اپنے اپنے حال میں خوش تھا - یوں ایک قوم کی قوم پروری اور دوسری کی دوراندیشی اپنا اپنا پھل لائی -

ان حقوق کے علاوہ جاگیرداروں نے اور اراضی خرید کر بھی پیر پھیلائے، سیاسی مظالم الگ رہے - ان ہی مظالم کی بدولت عام طور پر جاگیرداروں کو "قزاق" کہا جاتا ہے - میں بھی آئندہ یہی لفظ استعمال کروں گا -

ایک اخبار نے قزاقوں اور کسانوں کی متقابل تصویر یوں کھینچی ہے :-

اگر سیکڑوں نہیں تو بیسیوں قزاقوں نے اپنے علاقوں کو جا کر دیکھا بھی نہیں - ان کے مختار، عامل، یا وکیل، یا ماسٹر گھر بیٹھے انکے لگان بھیج دیتے ہیں، اور یہ شہروں میں بیٹھے گلچھرے اڑاتے ہیں - اگر کوئی قزاق اپنے علاقہ میں جاتا ہے تو اپنے بیسیوں احباب کو لیے ہوئے سیر و شکار کے لیے - ان کا جانا غریب مزارعین کے لیے اور بھی مصیبت کا باعث ہوتا ہے، کہ کھیت روندے جاتے ہیں اور تذر نذور کے علاوہ رسد بہم پہنچانا پڑتی ہے - اس کی کہیں داد و فریاد نہیں - قانون مزارعین کے لیے نہیں - مزارعین کی یہ حالت ہے کہ وہ گویا روز پیدائش سے اسی زمین پر رہتا ہے جس پر محنت کرتے کرتے وہ وہیں پیوند خاک ہو جاتا ہے - قوانین مال اور شرائط پٹہ سے اسکے ہاتھ پیر بندھے رہتے ہیں - ہر چیز کا بار ذمہ داری اس پر ہے - لگان کے ادا کرنے میں وہ دیر نہیں لگا سکتا، اگر بارش نہ ہو، یا کوئی اور آفت ارضی و سماوی آئے، یا قزاقوں کے گھوڑوں کے ٹاپ اسکی کھیتی برباد کر دیں، تو وہ تخفیف لگان کی امید نہیں کر سکتا - اگر وہ اراضی میں کوئی ترقی کرتا ہے تو وہ قزاق کی ملکیت ہوتی ہے اس کا کوئی نفع مزارع کو نہیں ملتا -

یہ سب کچھ بیان کر کے وہ اخبار یہ رائے دیتا ہے کہ "مزارعین کے حقوق و تکالیف کی طرف بہت جلد

توجہ کرنا چاہیے، کیونکہ ہمارے ملک کی فلاح و دولت ان ہی پر منحصر ہے۔ انکی خدمات اور احسانات ایسے ہیں کہ فوراً ایسا قانون بنایا جائے کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ اس میں سستی نہ کرنا چاہیے۔ جو بات آج ہم بخوشی خاطر کرسکتے ہیں اس کو بغاوت اور انقلاب ہونے تک کیوں چھوڑ دیا آج گورنمنٹ سستی کرسکتی ہے، مگر بغاوت کے بعد وہی کچھ جلدی میں کرنا پڑیگا۔ اس میں گورنمنٹ ہی کا نقصان ہوگا۔" یہ محض دھمکی ہی نہیں ہے بلکہ شدنی ہے۔

لگان اور شرائطِ پٹہ ہی وہ چیزیں ہیں ... جو مزارعین کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ انکی عزت و آبرو بھی تو کچھ نہیں سمجھی جاتی۔ ناچار وہ ایک جاگیردار کی زمین چھوڑتے ہیں اور دوسری جگہ اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں امن و عافیت ملے، مگر آسمان سب جگہ ایک ہی ہے۔

مزارعین نے اپنی ایک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہی۔ ضلع [illegible] میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی وہاں کے حاکم ضلع وہ شخص تھے کہ جن کی جاگیر اور زمینداری اس ضلع میں تھی۔ انھوں نے ایک نہ چلنے دی۔ مزارعین نے پیروی مدد لی۔ ایک صاحب پیڈرو سینول نے صاحب ضلع کو اسکے متعلق لکھا۔ چھ مہینے تک جواب ہی نہیں ملا۔ بمشکل یہ جواب آیا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کے انتخاب کے بعد اس پر غور کیا جائیگا۔ وہ وقت بھی آگیا، اور جو قواعد بنائے گئے تھے وہ انھوں (صاحب ضلع) نے منظور کرلیے، مگر خفیہ طور پر ہدایات جاری کردیں کہ اس پر کوئی توجہ نہ کی جائے بلکہ رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ اس پر اخبارات میں بڑے بڑے مضامین چھپے۔ مگر مارچ ۱۹۲۱ء سے غالباً اب تک معاملہ وہیں کا وہیں ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔

غریب مزارعین کو بڑی مصیبت اُس وقت ہوتی ہے کہ جب کوئی قزاق کونسل کے انتخاب کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ آفت کا سامنا اُس وقت ہوتا ہے کہ وہ منتخب ہو جاتا ہے۔ اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہر شخص خود قیاس کرسکتا ہے۔

بعض ایسوسی ایشن کے ممبروں کے زور دینے پر ایک قانون کونسل میں پیش کیا گیا کہ بڑی بڑی جاگیروں کو کسی طرح حصص میں تقسیم کردیا جائے اور قزاقوں کی چیرہ دستیوں کی روک تھام کی جائے۔ یہ قانون بالکل نیک نیتی پر مبنی تھا، مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں اس قانون کا مسودہ ایسی بے احتیاطی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا کہ اس سے مزارعین کو بجائے فائدہ کے نقصان ہی پہونچا۔ قزاقوں کے گروہ نے اس سے مخالفت نہیں کی اور دوسرے ممبروں نے اُس پر غور نہیں کیا اور [illegible] تقریروں کے بعد ۱۹۱۹ء میں پاس ہوگیا۔ ۱۹۲۱ء میں اور مسودہ بنایا گیا معلوم نہیں

کہ اُسکا کیا حشر ہوا - بہرحال اُمید پڑتی ہے کہ اگر اس معاملہ کی طرف اسی طرح توجہ دی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا -

مزارعین کی شکایات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ڈکٹیٹر کو اس طرف توجہ کرنا چاہیے - مگر مشکل یہ ہے کہ ڈکٹیٹر صاحب فوجی افسر ہیں، اور اُنکے بڑے بڑے جنرل قزاقوں کے فرقہ سے ہیں - اگر وہ مزارعین کی تکالیف رفع کرتے ہیں تو یہ قزاق کیا کھا کر جئیں گے - ظاہر ہے کہ اس سے بغاوت کا اندیشہ ہے اور اُب آپ اسکے لیے شاید اب تیار ہو گیا ہو، کیونکہ امیر عبدالکریم کا خطرہ ٹل گیا ؛ گو مزارعین کے دل کی جلن میں کوئی فرق نہیں آیا - اور یہ خود مخدوش ہے -

مسلمانوں کے انتظامات اراضی و محکمۂ مال کی خوبی کا یہ ثبوت ہے، کہ علاقہ اندلوشیہ (جنوبی اسپین) میں اب مزارعین اور اُنکے مددگار ایسوسی ایشنوں کا ... یہ مطالبہ شروع ہوا ہے کہ موجودہ انتظامات میں تبدیلی کر کے بعینہ وہی صورت پیدا کر دی جائے جو مسلمانوں کے زمانہ میں تھی -

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

صوبۂ قتلونیہ میں ہوم رول وغیرہ کی تحریکات

یہ بہت نازک سوال ہے اور اسپین کو سخت پریشان کیے ہوئے ہے - اس میں اور ہندوستان کی موجودہ تحریکاتِ آزادی میں بہت کچھ مماثلت ہے - اگر ہندوستانی وہاں کی تحریکات پر غور کریں تو شاید بیجا اور خالی از فائدہ نہ ہو گا - مگر اسپین کچھ اتنا پست ملک ہے کہ ہم ہندوستانی باوجود اپنی ذلت و غلامی کے اُس طرف نگاہ نہ کریں گے - غرور و غلامی ایک عجیب طرح کا مرکب ہے ! میں اس مضمون کو انتہائے اختصار سے لکھوں گا - گو میں اسکو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ محتاج تفصیل ہے -

اگر غور سے دیکھا جائے تو قتلونیہ ایسا علاقہ ہے کہ جسکا اسپین سے بہت کم تعلق ہے - خیالات، رسم و رواج، زبان، تاریخ وغیرہ وغیرہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے - اگر کسٹائل والے صرف سپاہی ہیں، تو یہ بلند نظر ہیں - مسلمانوں کی گرفت ان پر اتنی سخت رہی کہ یہ جوش کام نہیں لا سکے - اسکے ساتھ حقیقۃً مسلمانوں کے عدل و انصاف کی وجہ سے وہ خاموش بھی رہے، ورنہ اُنکے جو ہر اب کھلے ہیں وہ پہلے سے اُن میں موجود تھے -

جب اُنھوں نے مسلمانوں سے علاقہ چھینا ہے تو خیال یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت الگ قائم کریں گے - چند روز تک رہی بھی، مگر بلگیا ہوں کا خون رنگ لایا اور یہ ملا دیئے - اسپین نے

ان پر یہاں تک ظلم کیا کہ انکی زبان تک کو مٹا دیا - انیسویں صدی کے ثلث اول (۱۸۳۳ء) میں ان لوگوں کو کچھ زیادہ ہوش آیا - وہ دن اور آج کا دن کہ انکے مطالبات بڑھتے جاتے ہیں - گورنمنٹ کی طرف سے اس میں اغماض ہوا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیٹکل قتل شروع ہوئے - وزراء پر بم پھینکے گئے اور سخت جان بادشاہ اسپین تو ہر وقت معرض ہلاکت میں رہتا ہے - جیسا کہ آئے دن معلوم ہوتا رہتا ہے - کمیونسٹوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - روس کی سوویٹ گورنمنٹ اپنا لاسلکی لیے ہوئے ہر وقت موجود رہتے ہیں - مطالبات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - وہ ہوم رول چاہتے ہیں مگر اس خوبصورتی کے ساتھ کہ گویا آزادی کامل ان کا نصب العین ہے - اسوقت ان کے مطالبات یہ ہیں کہ :-

(۱) قتلونیہ کو سلیف گورنمنٹ دیکر ایک الگ ریاست تسلیم کر لیا جائے اور اسکو اپنے معاملات میں کامل اختیارات دیدیے جائیں -

(۲) قتلونیہ میں پارلیمنٹ یا لیجسلیٹو اسمبلی قائم کرلینے کا اختیار دیا جائے جس کو اسپین سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ صرف اپنے ہموطنوں کو جواب دہ ہو -

(۳) قتلونیہ کو اکزیکٹو کونسل قائم کرنے کا اختیار دیا جائے جو اپنی ہی پارلیمنٹ یا اسمبلی کو جواب دہ ہو -

(۴) قتلونیہ کے قدیم قوانین اور کانسٹی ٹیوشن کو اسمبلی کی معرفت پھر نافذ کردیا جائے -

(۵) قتلونیہ اپنی ہائیکورٹ خود قائم کرے - اس کا حکم ایسا ناطق ہو کہ بادشاہ تک کو اسکے مرافعہ سننے کا اختیار نہ ہو -

(۶) قتلونیہ کی زبان ہی زبان عدالت ہو - اسی زبان میں جج کی خط و کتابت ہو اور قتلونیہ کے متعلق تمام سرکاری مراسلات لکھے جائیں - (حامیان اردو کے لیے شاید یہ مطالبہ کچھ سبق رکھتا ہو)

(۷) قتلونیہ صرف معاملات خارجہ، بحری و بری فوج، سکہ، اوزان، پیمانہ، تجارت، محاصل بحری، ذرایع آمد و رفت وغیرہ وغیرہ میں اسپین کے ساتھ سردست متحد و متفق رہیگا، مگر دست نگر نہ ہوگا -

یوں کہنا چاہیے کہ انکی جدوجہد اب شروع ہوئی ہے - ڈکٹیٹر صاحب نے ۱۹۲۳ء تک ادھر توجہ نہیں فرمائی تھی - قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس معاملہ کو انھوں نے اہم نہیں سمجھا - دلوں کی جلن بڑھتی جاتی ہے اور معاملات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں - امید نہیں پڑتی کہ ڈکٹیٹر قتلونیہ والوں سے بہ ہمدردی پیش آئیں گے - بالخصوص اس لیے کہ امیر عبدالکریم کی مہمات کا تمام خرچ قتلونیہ

سے وصول کیا گیا تھا اور انھوں نے اسپر سختی سے احتجاج کیا تھا - [illegible]
بھی اہم تھی - اور اس میں ذرا بھی چون و چرا کرنے والوں کے پرلے سخت ترین دشمن ہو جاتے
اور [illegible] کتلونیہ والوں کے پاس اتنی فوج نہیں کہ وہ اپنی ہستی کا ثبوت دے سکیں - ورنہ
اب تک انھوں نے فیصلہ کرا لیا ہوتا - بہر حال کچھ ایسے مواد موجود ہیں کہ بھک سے
اڑنے کو تیار رہیں -

یہ ظاہر ہے کہ اگر کتلونیہ نے ہوم رول لے لیا تو اسپین کا بازو ٹوٹ جائے گا - دونوں طرف
کشیدگی موجود ہے - انجام اللہ کے ہاتھ ہے - خدا شرے برانگیزد -

اخبارات

باستثنائے اسپین قریباً تمام یورپ کے اخبارات پڑھتے زمانہ کی عربی شاعری کا درجہ رکھتے
ہیں کہ دل و دماغ کو بدل دیتے ہیں - اسپین اس معاملہ میں بھی یورپ سے ہزاروں میل پیچھے ہے
کہتے ہیں کہ کسی ملک کے اخبار اس ملک کا آئینہ ہوتے ہیں - یہ اصول (اگر اسکو اصول
کہا جائے) اسپین پر بہت زیادہ منطبق ہوتا ہے - وہاں کے اخباروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ جنوبی
و وسطی امریکہ کے اسپینی اخباروں سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں - اسپین کے عوام شوق سے
نہیں دیکھتے اور حکام ان پر چنداں توجہ نہیں کرتے - اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں
میں نہیں - باوجودیکہ قابل و ہوشمند و سیاست داں آدمی انکے ایڈیٹر اور مالک ہیں مگر ملک زیادہ
توجہ نہیں کرتا - اول تو اسپین میں اخبار نویسی (میرا مطلب ایڈیٹری سے ہے) کوئی وقیع پیشہ نہیں
کہ کوئی بھلا مانس اور ذریعہ معاش چھوڑ کر اسکو اختیار کرے - دوسرے اسپین کے عوام الناس اسکو
تسلیم ہی نہیں کرتے کہ کوئی شخص اتنا بے وقوف یا اس دل و دماغ کا آدمی ہوگا کہ وہ زندگی سی پیاری
چیز اور اپنی تمام طاقتیں ایسی چیز پر خرچ کرنے جو سب کے لیے نفع رساں ہو یا وہ کسی خاص اصول
پر ہمیشہ اڑا رہے - اور اپنی زندگی اس پر فدا کردے ہر شخص کا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو
شخص یہ پیشہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی ذاتی غرض سے - یہ خیال ان لوگوں سے نفرت پیدا کرنے
کے لیے بالکل کافی ہے - جو کوئی اخبار پڑھے گا وہ اس میں یہی کچھ ڈھونڈھے گا اور پالیگا - اور اخبار
کو نفرت سے اٹھا کر پھینک دے گا - اب اس کی وجہ خواہ یہ ہی ہو کہ تمام اسپین کے عوام میں ناکافی تعلیم ہو -
یہ کیفیت ہے کہ کوئی اخبار خاص کر روزنامہ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا - اسکو کسی متمول

شخص سے مدد لینا پڑتی ہے اور وہ اخبار اُسی کا مداح یا اُسکی رائے کو سر ہنے اور پڑھانیوالا ہوتا ہے اور وہ خیال کہ اسکی سطروں میں کوئی خود مطلبی پنہاں ہے صحیح ہو جاتا ہے - اسکول یا کالج کے لڑکے نکلتے ہیں اُنھیں فوراً کسی شغل اور آمدنی کی فکر ہوتی ہے - وہ اخبار نویسی شروع کر دیتے ہیں یا کسی اخبار میں (جیسا کہ کسی زمانہ میں پیسہ اخبار تھا) ملازمت کر لیتے ہیں - آمدنی کم ہوتی ہے اور تنخواہ کم ملتی ہے - یہ لوگ ہری چُگ ہوتے ہیں چند ہی روز میں اچھی جگہ مل جاتی ہے اور وہ چڑیوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں - ظاہر ہے کہ ایسا آدمی کیون دل لگائے اور اسکی رائے کی کیوں وقعت ہو - رہ گئے پرانے اخبار نویس اُنکو تجربہ اتنا ضرور سکھا دیتا ہے کہ اسپین کے پولیٹکل معاملات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی اصول رکھتے ہوں - اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی اخبار جو آج عوام الناس کا ہمدرد اور گورنمنٹ کا شاکی ہے کل اسکے برعکس مضامین لکھتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قلم اُس شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اُنکو زیادہ دے -

مملکت اسپین کچھ بہت چھوٹی سی نہیں - اور پھر وہ یورپ میں واقع ہے - اس پر اُسکے اخبارات کی تعداد اشاعت ملاحظہ فرمائیے :-

سہ ماہی چھپنے والے		۶۱
ماہوار	″	۷۱۶
مہینے میں دو بار	″	۳۲۰
مہینے میں ۳ بار	″	۱۰۱
ہفتہ میں دو بار	″	۵۶۳
ہفتہ میں تین بار	″	۳۶
روزانہ	″	۲۹۰
دیگر موقت الشیوع		۳۴
وقت اشاعت نامعلوم		۱۲۶
میزان	میزان	۲۲۴۶

روزانہ اخبارات زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں نکلتے ہیں - اُنکی کمی اشاعت پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کئی کئی روزانہ اخبار کیوں خریدے - مگر اشاعت کی کمی کی وجہ اور بھی ہو سکتی ہے - ایک تو ابھی بیان ہو چکی ہے - دوسرے جہالت ، جسکی مزدوروں اور متوسط الحال لوگوں

میں کمی نہیں۔ تیسرے اہالی اسپین کی اخباروں کی طرف سے عام بے پروائی، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں۔ جنگ نے کچھ شوق پیدا کیا تھا، مگر اس پودے کی آبیاری ختم ہو رہی ہے وہ مر رہا ہے اور چند روز میں مر جائے گا۔ اسپین کے اخبارات اب اپنے اخباروں کو زیادہ دلچسپ بنا رہے ہیں۔ اُنھوں نے ممالک غیر میں اپنے نامہ نگار بھیج رکھے ہیں، جو لوگ یہاں آتے ہیں اُن سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں، مگر ابھی تک نتیجہ صفر ہے۔ اگر جہالت اور غفلت پر اخباروں کے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کو ایزاد کیا جائے تو یہ اُمید نہیں پڑتی کہ اشاعت میں کچھ ترقی ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ میڈرڈ کے دو روزانہ اخبار اس کا دعوے کرتے ہیں کہ اُنکی تعداد اشاعت دو لاکھ روزانہ ہے۔ اور کوئی اخبار تو ایک لاکھ چھپنے کا بھی دعوے نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں اُنکی آمدنیاں بھی خرچ کو مکتفی نہیں ہو سکتیں۔ خاص کر اس لیے کہ اشتہارات کا رواج یہاں اب تک ابتدائی حالت میں ہے، اور اخبارات میں کم ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جتنے اچھے اخبار یہاں نکلتے تھے اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنا خرچ خود برداشت کر لیتا۔ گورنمنٹ اُنکو امداد دیتی تھی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ آدھ آنہ سے زیادہ قیمت نہیں بڑھا سکتے۔ (شاید اس لیے کہ اس سے زیادہ میں کوئی شخص نہیں خریدتا) حالانکہ اُن دنوں کاغذ اتنا گراں تھا کہ آدھ آنہ سے زیادہ کا کاغذ میں خرچ ہوتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کی امداد بھی رُک گئی، مگر اخباروں کی قیمت کم سے کم ایک آنہ کر دی گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اشاعت کم ہو گئی۔ اسپین کا بنا ہوا کاغذ خراب اور گراں پڑتا ہے اور دیگر ممالک سے آیا ہوا گراں تر۔ حالانکہ گورنمنٹ نے محصول معاف کر دیا ہے۔ باوجود اس کے اخبار ارزاں ہی فروخت کیا جا سکتا ہے۔

اسپین کے اخبارات کی غیر ہر دلعزیزی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ اوّل تو کاغذ خراب، دوسرے چھپائی اتنی خراب کہ اوّل تو پڑھنے والے کے ہاتھ اور کپڑے سیاہ ہو جائیں، دوسرے آنکھوں پر زور دے کر بھی نہ پڑھا جائے۔

اسکے علاوہ ذرائع آمد و رفت اتنے کم اور متعسّر ہیں کہ ایک اخبار ہفتہ ہفتہ بھر کے بعد بعض مقامات میں پہونچتا ہے۔ اور بیکار ہو جاتا ہے۔ ریل ملک میں ہے مگر اُس سے مسافر بھی نالاں ہیں، چہ جائیکہ ڈاک۔

اخبارات کی بے قدری ایسی نہیں ہے کہ اہالی اسپین بالکل مایوس ہو جائیں۔ زمانہ اپنا اثر کر رہا ہے اور انکی حالت روز بروز درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر آفت ارضی و سماوی کا ذکر نہیں ہے

نتیجہ یہ کہ ذرا سی ملکی خلش میں تمام اخبارات پر سنسر بیٹھ جاتے ہیں۔

حکومتِ فوجی

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا وہ اسپین کا اگرچہ بالکل صحیح نقشہ ہے مگر ایسا کہ اس میں سوائے پستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر خواہان اسپین خود سخت پریشان ہیں اور آل کار سے بدگمان۔ ملک پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی، اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ اولے اب پڑے کہ پڑے۔ یہ بھی برکات دم عیسوی ہیں کہ بیرونی خطرہ نہیں، اگر کوئی خدشہ ہے تو یہ کہ اندرونی تخم نہ پھوٹ جائے۔ اس تاریکی میں اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو وہ حکومت فوجی ہے۔ اسکو میں کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا کیونکہ اسکا حال ہندوستان میں کم معلوم ہے۔ نیز اس سے اور امور پر بھی بہت کچھ روشنی پڑیگی۔ اگر نازک طبائع پر بار ہو، تو میں معافی خواہ ہوں۔

تمام ممالک نے بعد از تجربہ یہ قرار دیا ہے کہ حکومت میں لامرکزیت پیدا کرنا چاہیے کہ ہر قسم کی سہولت بھی ہو اور استحکام بھی۔ مگر اسپین کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں مرکزی حکومت میڈرڈ ہے اور ہر قسم کے اختیارات صرف ناظمان میڈرڈ کو حاصل ہیں۔ صوبجات دور افتادہ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ رعایا کی شکایات کو سن کر ان کا سدباب کریں۔ حکام صوبہ و اضلاع کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ذاتی منافع و پالٹکس میں اتنے گرفتار ہیں کہ کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تمام خرابیاں جو ایک بدنظم گورنمنٹ میں ہونا چاہییں مجسم ہو کر اسپین میں موجود ہیں۔ دوسری طرف شمالی مشرقی اسپین میں جو نہایت خفیف سی ترقی تعلیم ہوئی اس کے تمدن نے بھی اسی حصہ رساری سے ترقی کی۔ حرفت کی چھوٹی سی ترقی نے مزدوروں کے دلوں میں ہیجان پیدا کیا۔ محاصل کی تخفیف نے ملک کو کسی قدر امداد پہونچائی۔ جنگ میں ملک نے غیر طرفدار رہ کر کچھ تمول میں ترقی کی۔ ہوشمند لوگوں نے غیر ممالک میں جا کر وہاں کی حالت کو اپنے ملک سے مقابلہ کیا۔ ان تمام باتوں کا متفقہ نتیجہ یہ ہوا کہ سوتے والوں نے ذرا کروٹ لی۔ اب بھلا مزدوروں سے یہ کب امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نیم غلامانہ زندگی بسر کرنے پر قناعت کرینگے۔

ملک میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی وہ ان فسادات سے ظاہر ہوئی جو کٹلونیہ اور دیگر حرفتی اضلاع میں ہوئے۔ کٹلونیہ میں اپنی بھولی ہوئی قومیت یاد آگئی اور اپنے ہی علاقہ کو ترقی دینے کا خیال پیدا ہوگیا۔ وہ مقامات ہیں کہ جو جبر تسلط سے منہدم کر دیے گئے ہیں۔ خود کٹلونیہ قدیم ہی کی حالت متزلزل تھی۔

اندلوشیہ، نیون، اور ایسٹریمیڈورا میں مزارعین کی حالت نے کچھ ایسا رُخ پڑا تھا کہ تباہی اور بغاوت کے
تمام اسباب مہیا تھے۔ ہر طرف سے یہ صدا آ رہی تھی کہ مرکزی حکومت بالکل جمود کی حالت میں ہے۔
ارباب بست و کشاد اس طرح کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ اُن تک رعایا کی شکایات نہیں پہنچتیں
اور وہ تحفظ حقوقِ شہریت کے متعلق ادنیٰ سا کام بھی نہ کرتے تھے۔ لبرل اور کنسرویٹو گروہ کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے اس طرح ہو گئے تھے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی ڈفلی الگ لیے ہوئے اپنا ہی راگ الاپ رہا تھا
یہاں تک بھی غنیمت تھا، مصیبت تو یہ تھی کہ ہر شخص کو اپنے اپنے پیٹ کی فکر تھی۔ ملک کی خوش قسمتی
تھی کہ یہ لوگ ابھی تک ری پبلکن، ریفارمسٹ، فیڈرلسٹ، سوشلسٹ اور کامیونسٹ، فرقوں سے
نہیں جا ملے تھے اور ان فرقوں میں خود ایسے اختلافات تھے کہ ملک اُنکے خیالات سے بچا ہوا تھا۔ [illegible]
نے اُنکو بھی ویسا ہی سگِ زرد سمجھا جیسا کہ وہ اپنے پرانے مریدوں کو شغال جانتے تھے۔

غرض ملک کی حالت کچھ ایسی نازک ہو گئی تھی کہ چارۂ کار صرف فتنہ و فساد معلوم ہوتا تھا۔
اور اسپین بھر میں یہ اندیشہ تھا کہ اس حالت کے دفعیہ کے لیے تلوار میان سے نکلا ہی چاہتی ہے جس کا نتیجہ
یہ ہوتا کہ کمیونسٹوں کے لیے دروازہ کھل جاتا اور بغاوت کی آگ سلگ اُٹھتی۔ ملک کے مصلحین (یعنی
صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کرنے والوں) کو یہ تو اُمید تھی کہ کلیسا ہمارے ساتھ ہو جائے گا، مگر یہ توقع
نہیں تھی کہ فوج ہمارا ساتھ دیگی، کیونکہ بہت سے جنرل فرسودہ خیال تھے اور موجودہ حالت کو برقرار
رکھنے میں اپنا ذاتی نفع سمجھتے تھے، گو اُنکو بھی اپنے ماتحت افسروں اور سپاہیوں پر اعتمادِ کُلی نہ تھا کہ وہ
اُن (جنرلوں) کا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہ لوگ بجبر بھرتی کیے جاتے تھے۔ فوج کی عام حالت یہ تھی کہ وہ خود
مرض بے ترتیبی اور بددیانتی میں گرفتار تھی۔ ریف میں اسپینی فوج کی تباہی سے پہلے، یعنی ۱۹۲۱ء میں
ایسی علامات نظر آ رہی تھیں کہ جنرلوں کے سوا تمام فوج میں سرکشی و بغاوت کے خیالات پیدا ہو چکے
ہیں؛ ریف کی مصیبت کے بعد تو یہ بالکل صاف ظاہر ہو گئے تھے۔ چنانچہ امیر عبدالکریم کے مقابلہ میں نہ صرف
فوج نے، بلکہ وزارتِ فوج نے اپنی نالائقی اور اپنا تذبذب ظاہر کر دیا تھا۔ اس محکمہ کا یہ حال تھا کہ وہ
امیر سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر مقابلہ کیا جائے۔ اب یہ بھی افواہیں
اُڑنے لگیں کہ فوج اس لیے اپنے بادشاہ سے ناخوش ہے کہ اُس نے تمام کاروبارِ سلطنت اُن لوگوں
کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے جو اس تمام بدنظمی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا، کیونکہ کانسٹی ٹیوشن ہی ایسا
ہے کہ اسکے سوا بادشاہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال فوج یہ چاہتی تھی کہ وہ زور ڈال کر بادشاہ کو تخت
سے اُتار دے اور ولیعہد (پرنس آف اسٹریاس) کو تخت پر بٹھا دے۔ یوں ناتجربہ کار نوجوان بادشاہ

کہ اپنی کٹ پتلی بنا کر اُس سے اپنی پالیسی پر عمل کرالیں۔

اس تمام بے چینی کا مرکز تتلونہ کا صدر مقام بارسلونہ تھا۔ کیونکہ یہاں اس وجہ سے فوج زیادہ رکھنا پڑتی تھی کہ وہاں سنڈیکلسٹ، کمیونسٹ، انارکسٹ وغیرہ کا زور تھا۔ ڈون میگوئیل پریمو ڈی ریویرا، مارکوئیس ڈی ایسٹیلا ۱۲ ستمبر ۱۹۲۳ء سے پہلے یہاں حاکم فوج تھے۔ انھوں نے اپنے اور جنرلوں کو ساتھ ملا کر یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ ۱۵ ستمبر کو انقلاب کے لیے بغاوت کر دی جائے۔ یہ خبر اڑ گئی، اس لیے انھوں نے ارادہ کیا کہ بجائے ۱۵ کے ۱۲ ستمبر ہی کو یہ کاروائی کی جائے۔ ۱۹۲۱ء میں امیر عبدالکریم نے جو فاش اور شرمناک شکستیں اسپین کی فوج کو دی تھیں انکے متعلق یہ قرار نہیں دیا جا سکا تھا کہ انکی ذمہ داری محکمہ فوج پر پڑتی ہے یا محکمہ ملکی پر۔ ۱۹۲۳ء میں اُس نے بڑی صورت اختیار کر لی۔ گورنمنٹ نے جو اسکے متعلق فیصلہ دیا تھا وہ اس قدر غیر تشفی بخش تھا کہ بیشتر وررہبران ملک کے خلاف جو کچھ بھی کیا جاتا عوام الناس اُس سے بہت خوش ہوتے۔ یہ بات انقلاب کرنے والے لوگوں کی اور بھی تقویت کا باعث ہوا۔ ۱۳ ستمبر کو پریموڈی ریویرا نے ایک بیان شایع کیا، جس میں لکھا تھا کہ "گورنمنٹ کی بدنظمیوں سے ملک کو بچانے کے لیے" اسپین کی فوج نے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اپنی کیبنٹ سے استعفا لے لے۔

شاہ الفانسو سیزدہم نے اسوقت بڑی عقل سے کام لیا۔ جس وقت پریموڈی ریویرا نے یہ مطالبہ پیش کیا بادشاہ سان سابسٹائن میں تھا۔ اُس نے وہیں تحقیقات کر کے یہ معلوم کر لیا کہ فوج واقعی بغاوت پر آمادہ ہے اور تمام رعایا اُسکے ساتھ ہے۔ اسکے بعد وہ میڈرڈ گیا اور وہاں جا کر وزرا اور کمانڈر فوج متعینہ میڈرڈ (جنرل کاولنٹی) سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ وزیر اعظم (الہوسماس) نے ایک حکم تحریری اس مضمون کا شاہی دستخطوں کے لیے پیش کیا کہ "بوا دید بغاوت فوجی پریموڈی ریویرا کو معزول کر کے گرفتار کیا جاتا ہے"۔ یہ حکم کانسٹی ٹیوشن کے موافق تھا۔ مگر بادشاہ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وزیر اعظم نے استعفاء دیدیا اور فوراً منظور کر لیا گیا۔ پریموڈی ریویرا کو بھی استعفاء دینے کا حکم دیا گیا، مگر جب اُس نے انکار کیا اور صاف صاف باغی ہو گیا تو اُسکو بذریعہ تار طلب کر کے وزارت کا کام سپرد کر دیا گیا۔ انھوں نے آکر بحیثیت پریزیڈنٹ فوراً چند جنرلوں کی ایک کونسل عارضی بنا لی۔ اور انکے تمام ماتحت افسران پورے متفق الراء تھے۔ ملک نے کوئی مخالفت نہیں دکھائی؛ صرف اتنا ہوا کہ بلباؤ میں ایک پندرہ روزہ اسٹرائیک ہو کر رہ گئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس عارضی کونسل کو موقوف کر کے دوسری مستقل کونسل بنائی گئی اور بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ

جسکی روسے تمام نظم ونسق پریمو کے ہاتھ میں دیدیا گیا، سوا وزرائے محکمۂ فوج وخارجہ کے تمام وزراء موقوف کردیے گئے، پارلیمنٹ توڑدی گئی، کانسٹی ٹیوشنل ضمانتیں موقوف کرکے تمام اسپین میں مارشل لاء جاری کردیا گیا، وغیرہ وغیرہ

اس نئی فوجی حکومت نے بروے اختیار مارشل لا[۱] سب سے پہلا یہ کام کیا کہ تمام دفاتر کا وقت ۹ بجے صبح سے ۲ بجے شام تک مقرر کیا اور حکم دیا کہ جو کوئی سوا نو بجے تک اپنے دفتر میں نہ پہونچ جائیگا وہ سزا پائیگا - نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں ایسے کلرک دفتر میں آموجود ہوے جنکی کبھی صورت بھی نہ دکھلائی دیتی تھی - یہ کلرک اکثر وزراء کے آوردہ یا پروردہ تھے - انکے نام تنخواہ [illegible] ضرور تھے، مگر وہ دفتروں میں صرف تنخواہیں لینے کے لیے آتے تھے - ان میں سے اکثر ایسے تھے کہ اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں فرماتے تھے اور اپنے ملازموں کو بھیجکر تنخواہ منگوا لیتے تھے - ان میں سے اکثروں کو فوراً موقوف یا معطل کردیا گیا - اس سے عوام الناس میں خوشی ہوئی، مگر ان غریبوں کے گھروں میں کہرام مچ گیا -

تمام مقامی کونسلوں کو توڑدیا گیا اور میمبروں کو موقوف کردیا گیا - لوگوں کو جتنی خوشی اس حکم سے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے - مگر اس سے بھی زیادہ رنج اس حکم نے پہونچایا جسکی روسے جوری کا قاعدہ توڑدیا گیا - رعایا نے برسوں کی مشقت کے بعد اسکو پایا تھا - جو بیک گردش قلم ختم کردیا گیا - ایک ہائیکورٹ بنایا گیا جسکا پریزیڈنٹ ایک ایرا لبحرہے اور تین جنرل جج ہیں، اور دو مقامی آدمی ہیں - اس نے عدل وانصاف کی رہی سہی کمر توڑ دی -

انکے علاوہ اور بہت سی اصلاحیں ہوئیں، انکی تفصیل کی ضرورت نہیں - بہت سے وعدے کیے گئے - مثلاً سول گورنمنٹ پھر بحال کی جائیگی اور قزاقوں کا زور توڑ دیا جائیگا، وغیرہ - مگر دیکھیے یہ وعدے کبھی ایفاء بھی ہوتے ہیں یا نہیں - کئی احکام تو ایسے ہیں جن پر اسپین کے معمول کے موافق عمل نہیں ہوا اور بھول بسر گئے -

.. کمیونسٹ، سوشلسٹ، انارکسٹ فرقے اس فوجی حکومت کے دشمن ہیں - مزدور چند روز

---

[۱] خوش قسمت ہیں وہ اصحاب کہ جو مارشل لا کے معنی اور اسکی ہمہ گیری کو نہیں سمجھتے - راقم بدقسمتی سے مارشل لا کے ایام میں لاہور میں تھا اور اسکی سختیاں دیکھے ہوے ہے -

[۲] کوئی بوڑھے بزرگ شاید بتلا سکیں کہ شاہان اودھ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا یا نہیں - کیونکہ انہیں کا زمانہ بدنظمی میں مشہور ہے -

خوش ہے، لیکن چونکہ وہ وعدے جو اُن سے کیے گئے تھے وہ ایفا نہیں ہوئے اس لیے اُن کی ناراضی بڑھتی جاتی ہے۔

اس حکومت فوجی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یہ تمام تحریک تطوان سے شروع ہوئی اور اسی صوبہ نے اس میں بڑی مدد کی، مگر یہ حکومت اُسی صوبہ کی بلند نظری کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے۔ یہ مسلّم کہ مارشل لا ہمیشہ اُس دہشت کو رفع کرتا ہے جو عوام کے دلوں میں کسی خاص فرقہ یا گروہ کی طرف سے پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دہشت کا علاج دہشت انگیز کارروائیوں سے نہیں ہوتا بلکہ استمالت کرنے اور حقیقی اسباب شکایات کو رفع کرنے سے ہوتا ہے۔ اس میں یقیناً پریمو ڈی ریویرا نے کچھ زیادتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا، اور باوجود اُن کی دہشت کے وہاں تخریبی کارروائیاں شروع ہو گئیں جو سلطنت کے لیے بہت خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ کمیونسٹ اور انارکسٹ فرقہ کے قدم جمنے اور انکی گرفت اور عظمت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات کچھ پوشیدہ نہیں رہی کہ عوام الناس کی ناراضی بڑھ رہی ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ ہے۔

امیر عبدالکریم اسپین کے پہلو میں آہنی کانٹا تھے۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ (۱) اُنھیں کو تباہ کرنے کے لیے یہ اصلاحیں کی گئی ہیں (۲) رعایا کو اس میں مدد دینا چاہیے، اور (۳) بادشاہ کا وفادار رہنا چاہیے۔ اس خاص معاملہ میں کلیسا سے مدد لی گئی۔ مسلمانوں کے خلاف یہ وہ پرانا ہتھیار رہے کہ صدیوں اس سے کامیابی کا کام لیا گیا ہے۔ اسی کو پرانے اسلحہ خانے سے نکالا گیا اور صیقل کر کے اسپین کے سامنے پیش کیا گیا۔ جیسا کہ یقین کیا گیا تھا، اس حربہ نے پورا کام دیا۔

امیر عبدالکریم کی مہمات اور اُنکے حالات ایسے نہیں جو بھولے جا چکے ہوں۔ یہ کل کی بات ہے کہ اُنھوں نے اسپین کی فوج کو مولی گاجر کی طرح کاٹ پھینکا۔ ایک دفعہ نہیں، بارہا۔ سپاہی اُنکے مقابل جانے سے ڈرتے تھے۔ اُنکے نام کی وہ دہشت تھی کہ فوج کی فوج کو اپنے کشتوں کا پشتہ چھوڑ کر بھاگنا پڑتا تھا۔ قریب تھا کہ افریقیہ سے اسپین کی عظمت و اقتدار کا جنازہ اُٹھ جائے، کہ یہاں پریمو ڈی ریویرا برسرِ کار آ گئے۔ سازشیں ایسی چیز نہیں ہیں کہ جنکی کوئی شکایت کرے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مرتا سب کچھ کرتا ہے۔ پریمو نے اُدھر اپنی فوج کا دل بڑھایا، اُدھر سازشوں کا جال بچھایا۔ امیر کو ایسے قبیلہ پر حملہ کرنے پر مجبور کیا جو بہت کچھ لے کر اسپین کا ہو چکا تھا، مگر فرانس کی رعیت تھا۔ بس یہ قیامت ہو گئی۔ پریمو نے فرانس سے سازباز کیا، اُس سے فریاد کی، اور دُنیا کو امیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ امیر نے جو کچھ اُس وقت تک کیا وہ معجزہ سے کم نہ تھا۔ اسپین کی تو

مجال نہ تھی کہ اُن سے آنکھ ملالیتا، مگر فرانس کا شامل ہوجانا امیر کے لیے غضب ہوگیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسپین تو کچھ مال نہیں، مگر فرانس کا مقابلہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ اُنکے کارناموں کا آخری اعلان یہ تین فقرے تھے (۱) میں اُسوقت تک ہتھیار نہیں ڈالوں گا کہ جب تک میرے خاندان کا بچہ بچہ نہ کٹ جائے (۲) فرانس کی مالی حالت ایسی خراب کردوں گا کہ دُنیا سے اُسکی ساکھ اُٹھ جائیگی (۳) اسپین کی ملکی و سیاسی اقتدار کو مٹادوں گا۔

افسوس کہ پہلا دعوے اس لیے پورا نہ ہوا کہ امیر نے باوجود اپنی ہوشیاری کے غدار قبیلۂ مسعودہ پر اعتبار کیا اور انھوں نے اُنکو گرفتار کرادیا۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود اسی کا نام ہے۔ افریقہ و اندلس کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ بارہ سو برس کا یہ تجربہ ہے کہ اس قبیلہ (مسعودہ) پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا [illegible] ہے۔ اس فرعون کے لیے موسیٰ کی ضرورت ہے۔ موسیٰ بن عمران (علیٰ نبینا و علیہ السلام) کی نہیں، بلکہ موسیٰ ابن نصیر (رحمۃ اللہ علیہ) کی۔

دوسرے دعوے کے پورا ہونے کو حضرات ناظرین نہ بھولے ہونگے کہ فرانس کی حالت اس درجہ متزلزل ہوگئی تھی کہ ایک مہینہ میں تین تین وزارتیں بدلی ہیں اور علاج نہ ہوسکا۔ سلطنت کا دیوالہ نکلنا معمولی بات نہیں۔ عوام نے سلطنت کی بہت مدد کی تب جاکر یہ خطرہ مٹا۔ گو اس واقعہ کو آج پانچ برس گزرگئے اب تک دنیا کے بازار میں فرانس کی ساکھ برقرار نہیں ہوئی۔

تیسرے دعوے کی یہ کیفیت ہے کہ اسپین کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہوچکی ہیں۔ اقتدار بالکل ختم ہوچکا ہے، اور یہ عمارت، جو پریمو ڈی ریویرا کے سر پر کھڑی ہوئی ہے، ممکن ہے کہ جلد ہی روز میں زمین پر ہو۔ یقین جانیے کہ اگر برکاتِ رحم عیسوی اُس کے شاملِ حال نہ ہوتیں تو وہ اسکا ساتھ دیدیتی۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

اب کلیسا نے جو کچھ چاہا تھا اُسکو ایک مرتبہ پھر [illegible] اور دوسرا مطالبہ پورا ہوگیا پہر مطالبہ، جو سب سے زیادہ اہم تھا اُسکا یہ انجام ہوا کہ پریمو ڈی ریویرا کی چیرہ دستیاں [illegible] ہیں کہ آخر انھوں نے شاہ الفانسو سیزدہم سے اُس تاریخی [illegible] پر دستخط کرا لیے کہ جسکے رو سے وہ ڈکٹیٹر بن گئے۔ اب سیاہ و سفید کے وہ مالک [illegible] جناب الفانسو

ہم فرانس کے ہوٹلوں میں یا شہر میں چلتے پھرتے اور وہاں کے تمام خانوں میں جو [illegible] پھرتے ہیں۔ [illegible] پریمو ڈی ریویرا سے [illegible] امید یہ ہے کہ [illegible] ختم ہوکر رہیگی۔ [illegible] اپنے ساتھ کس کس کو لیکر ڈوبتے ہیں۔ [illegible]

میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں - یہ بات الگ ہے کہ خدا تعالیٰ میں یہ بھی قدرت ہے کہ وہ مُردے میں جان ڈال دے - اور وہ اپنے نبی حضرت عیسٰے (علیہ السلام) کے ذریعہ سے یہ کرتا رہا ہے - یہ ہے موجودہ اسپین کی مختصر کہانی -

"ہندوستاں ہمارا"

ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں ہر مذہب (میرا مطلب دین سے ہے) اپنے پورے زوروں پر ہے اللّٰھم زد فزد - اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ مجھ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ "جس ملک سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو آٹھ سو برس کے بعد نکالا ہے' وہاں اسلام اور مسیحیت کا کیا حال ہے؟' اس سوال کے پہلے جزو کا جواب تو میں تیقن کے ساتھ دے سکتا ہوں کہ "اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ حتٰی کہ قبریں تک نہیں رکھی گئیں - مگر مسلمانوں کی ارواحِ طیبات ہر زندہ مسلمان سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ اُنکے لیے دعاے مغفرت کریں اور اُن کا انتقام لیں"- میں اپنے علم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کہ اُنکے حق میں دعاے مغفرت کرنے والا شاید دنیا بھر میں کوئی نہیں - الّا ماشاءاللہ - انتقام کا ممکن ہے کہ کسی کسی کو خیال ہوتا ہو -

رہ گئی عیسائیت - میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک بھر کیتھولک مذہب کا پیرو ہے، جو بُت پرستی کا دوسرا نام ہے؛ مگر اصل مذہبِ عیسوی جو سینٹ جان نے سکھایا یہی ہے -

۱۹۳۱ء میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت مخدومی قاضی ولی محمد صاحب بالقابہ اسپین تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں - اُنھیں دنوں میں نے جناب ممدوح سے عرض کیا تھا کہ وہاں کی مذہبی حالت کو بغور ملاحظہ فرمائیں - بالخصوص یہ دیکھیں کہ آیا مسلمانوں سے اب بھی ویسے ہی تعصبات برتے جاتے ہیں، جیسے کہ آج سے تین چار سو برس پہلے تھے - جناب موصوف نے مجھے اسکے متعلق اطلاع دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا - میں ایک مرتبہ پھر جناب معزی الیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میری التماس پر توجہ فرماکر میری دو تین درخواستیں پوری کیں - جنکا سفرنامہ میں ذکر فرمایا ہے - مگر بدقسمتی سے اسی اہم سوال کا جواب نہیں ملا - میرا منصب شکایت کرنے کا نہیں ہے؛ بالخصوص اس لیے کہ ممدوح الشان کے عہدۂ جلیلہ کے کارہاے متعلقہ اتنے ہیں کہ نہ معلوم یہ سفرنامہ بھی کیونکر مرتب ہوگیا - نیز میں قیاس کر سکتا ہوں کہ ممدوح کے پاس وقت کی اتنی کمی تھی کہ دورانِ سیاحت میں وہ اسکو تحقیق نہ فرما سکے - مجھے جتنا بھی علم ہے وہ یہ ہے کہ اُنکی مذہبی حالت وہی ہے جو جہلا کی بالعموم ہوا کرتی ہے -

کہ اپنے خیالات میں غلاظ وشداد ہیں، لیکن فی الحقیقت مذہب کی انھیں کوئی واقفیت نہیں، اور ایک ادنیٰ سے بیرونی حملہ کی تاب نہیں لاسکتے۔ لیکن تعصب مذہبی کا یہ عالم ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ اپنے سوا تمام دنیا کے کیتھولکوں کو نہ صرف کافر بلکہ ناپاک سمجھتے ہیں۔ ایک یہ واقعہ میرے علم میں ہے کہ ایک شخص کا لڑکا ایک قصبہ کے پرائیوٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ بدقسمتی کہ اس اسکول میں پراٹسٹنٹ مذہب کے مصنف کی ایک ریڈر پڑھائی جانے لگی۔ اس میں بعض خیالات بھی اسی مذہب کے تھے۔ اتفاق سے باپ کو معلوم ہوا تو اس نے بیٹے کو بہت سخت سست کہا؛ وہ ریڈر پھاڑ ڈالی اور دوسری صبح کو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو استاد وہ ریڈر پڑھاتا تھا اسکو قتل کر آیا![1] یہی واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس حلیم پیغمبر (علیہ السلام) کی بھیڑوں پر اسکے حلم وانکسار کا کوئی گہرا اثر نہیں۔ جہالت انکی معبود ہے اور انتہائی عصبیتِ مذہبی انکی راہبر۔

بلاشبہ انھوں نے بجبر مسلمانوں کو سور کھلایا۔ جسکا کھانا اب اہلِ اسپین کی عادتِ ثانیہ ہوگئی ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو بھول بسر چکے ہیں۔ موخرالذکر کے جو آثار انکے ملک میں رہ گئے ہیں وہ گویا نشاناتِ فتح ہیں کہ جن پر فخر کیا جاتا ہے۔ انکو یہ بھی خیال نہیں آتا کہ ہم میں سے اکثر کے نام عربی (بگڑی ہوئی ہی سہی) کیوں ہیں[2]

مجھے دو ایک واقعات ایسے معلوم ہیں کہ جن کو اس کا خیال دلایا گیا، وہ اگر مسلمان نہیں ہوئے تو کم ازکم انکو مسلمانوں کی طرف رجحان بلکہ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ یہ ہمارے ہندوستان کے سیاحوں

---

[1] اس واقعہ پر مجھے سرحد کا ایک واقعہ یاد آیا، جو جہالت کی بہترین مثال ہے۔ سرحد کا ایک نوجوان باشندہ حضرت خاتم المحدثین مولانا سید نذیر حسین صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی شاگردی سے اپنے وطن میں تازہ وارد ہوا۔ کچھ طالبعلمانہ جوش کچھ عادت کہ اسنے تشہد میں انگلی اٹھادی۔ ایک بوڑھا اجہل پٹھان اسکے برابر ہی نماز پڑھ رہا تھا۔ اسنے اس طالب علم سے دریافت کیا کہ یہ بدعت کیسی؟ طالب علم نے جواب دیا کہ حدیث میں یوں ہی آیا ہے۔ بوڑھا پٹھان اٹھا، اپنے گھر سے تلوار لایا اور اس بیگناہ طالب علم کو قتل کر ڈالا۔ وہ تلوار کا وار کرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ دیکھو حدیث شریف میں یوں آیا ہے۔

[2] چنانچہ ایک کاؤنٹ الفارہ تھے کہ اپنے خاندانی تحقیقات کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان خاندان کے آدمی ہیں۔ وہ مسلمان ہوگئے۔ اسلامی ممالک کی انھوں نے سیاحت کی۔ ہندوستان بھی آئے تھے اور یہاں (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو) حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت سے مشرف ہوئے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب کو انکی ذات سے بہت دنیوی فائدہ ہوا۔ پیرس میں رہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب انتقال فرماگئے۔ خدا تعالیٰ

کی بدولت ہوا

این شعلہ ہند گرم خیز است — انجاست کہ آفتاب تیز است

یہی ہندوستانی اس فرض کفایہ کو ادا کر کے دوسروں کو سبکدوش کر دیتے ہیں، ورنہ دوسروں کی تو
یہ حالت ہے کہ وہ قرطبہ کی مسجد کو دیکھ کر بھی ہنستے کھیلتے نکل جاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھیے کہ امیر عبدالکریم اور اُنکے شرکاء کارزار کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے وہ
نقش ملک پر چھوڑا ہے کہ جلد مٹنے والا نہیں۔ جس طرح یورپ کی ترقی کا ایک راز جنگ صلیبی کو بتلایا جاتا
ہے، ٹھیک اسی طرح امیر عبدالکریم کی پچھلی جنگ اسپین پر، بذریعہ قیدیان جنگ اثر ڈالے بغیر نہیں
رہی۔ آج وہاں کے بہترین دل و دماغ اس طرف لگے ہوئے ہیں کہ اسپین کو مسلمانوں کے زمانہ
کے نمونے پر ڈھالا جائے۔ نجی صحبتوں میں اس پر بحث ہوتی ہے، اخباروں میں اس پر مضامین
لکھے جا رہے ہیں، کاشتکار اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، ارباب سیاست اس پر غور کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس
اور [illegible] بہترین انتقال کر چکے ہیں۔ اُن سے اُمید تھی کہ وہ اپنے علم و فضل سے کام لیکر صحیح معاملات کی طرف
رہنمونی کرتے۔ ایک دو کالجوں میں عربی کی تعلیم کا انتظام ہے؛ مگر طالب علم [illegible] چاہییں
کہ وہ کارآمد ہو سکیں۔ قیدی سلطان حفیظ سے، یا ملک الشعراء مصر سے (جو ہسپانیہ میں مقیم ہیں) یہ
اُمید رکھنی بیکار ہی ہے کہ وہ کچھ مددگار ہو سکیں۔ سلاطین ترک نے مسلمانان اندلس کو تباہ ہوتے
دیکھا اور ایک انگلی نہیں اُٹھائی (حالانکہ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے) شاہان مصر دور سے بیٹھے تماشا
دیکھتے رہے اور اُف تک نہیں کی۔ مراکش خود مرا ہوا ہے، اُس سے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ
جنبش بھی کرے۔ کچھ امید ہو سکتی ہے تو مسلمانان ہندوستان سے، جو غلام ہیں مگر ایک باہیبت و
بااصول گورنمنٹ کی رعایا ہونے کی حیثیت سے غیر ممالک میں بہت کچھ ذی عزت اور محفوظ و مصئون ہیں۔

دنیا کے ایک بہت بڑے (ہندوستانی) فلسفی کی رائے ہے کہ "یہ ممکن نہیں کہ اسلام کو اسپین
میں کامیابی نہ ہو، بشرطیکہ وہاں باقاعدہ اُس ملک کے حالات و ضروریات کو دیکھکر تبلیغ کیجائے۔"
میں یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا، نہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں تبلیغی کوششیں نہ کی جائیں، یا مسلمانوں کو
مسلمان نہ بنایا جائے۔ خدا تعالیٰ احمدیوں اور سید غلام بھیک اور اُنکے شرکاء کو ضرور اسکی جزا
خیر دیگا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر مسلمانوں کی گرہوں کو بچا رہے ہیں۔ لیکن آج یورپ کو کریم کارساز
نے وہ چیز بنا رکھا ہے کہ وہاں جس چیز کو کامیابی ہو وہ دنیا بھر میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسپین میں تبلیغ
بہترین نتائج پیدا کر سکتی ہے، وہ جس خوش قسمت کے نصیب میں لکھی ہو۔ بظاہر تو یہ فرض کفایہ اگر

کوئی دوا کر سکتا ہے؟ ہندوستان

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور آج طلبائے مسلمانانِ اندلس و صقلیہ ہر زندہ مسلمان سے اسی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ جس کو وہ انتقام سمجھتی ہیں۔ اور حقیقتاً اگر کوئی صحیح انتقام ہو سکتا ہے تو یہی۔

میں سالہا سال سے بڑے بڑے آدمیوں سے یہی درخواست کرتا پھرتا ہوں، مگر ابھی تک کوئی گوش شنوا نہیں ملا۔ مولانا محمد علی صاحب (امیر جماعت احمدیہ لاہور) سے التماس کیا، مگر ممدوح نے کمی خرچ کا عذر فرمایا۔ کئی برس متواتر حضرت خلیفۃ المسیح سے تحریری و زبانی عرض معروض کیا، مگر التفات توجہ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ میں غیر احمدی ہوں۔ غرض

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفتِ خوشحالاں و بدحالاں شدم

ابھی تک راہ کامیابی بالکل مفقود ہے۔ اور نہ ہی کسے اُمید ہے کہ کوئی یہ سطور پڑھے گا، لیکن الناظر کے ذریعہ سے میں ایک مرتبہ تمام مسلمانانِ ہندوستان کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ شاید کوئی اہلِ دل نکل آئے۔ اگر کوئی تیار ہو تو تدبیر و ترکیب بتلانے اور انکے ہمرکاب ہونے کو میں تیار ہوں۔ اگر میں بوڑھا اور ناتواں نہ ہوتا، تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا اور چل دیتا۔ مگر اب ضرورت ہے عصائے پیری کی۔ کاش وہ بہم پہونچ جائے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

محمد خلیل الرحمن
مترجم اخبار الاندلس وغیرہ وغیرہ

غزل قائم چاندپوری شاگردِ سودا

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزباں نے کیا کہا — کیا کہا پھر کہہ تو نامہرباں نے کیا کہا
غیر سے ملنا تمہارا سُن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا
اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح — گل نے کیا پوچھا تھا شبنم، باغباں نے کیا کہا
سب تواجِ مصر دیکھ تھا زلیخا کو یہ پیچ — مول یوسف سے بشر [illegible] ناداں نے کیا کہا
قائم اُس کو چھے شب مجلس میں نہ آنا تھا تو نہیں — کیا کہوں تجھ سے کہ [illegible] نے کیا کہا

ابن خلدون

ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں بمقام شہر ٹیونس (Tunis) پیدا ہوا، اور بمقام قاہرہ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴۰۶ء میں راہی ملکِ بقا ہوا۔ عرب کے تاریخ نویسوں میں اس کا رتبہ بہت بلند ہے بلکہ ایشیا میں اُس کا ثانی شاید کوئی شاذ و نادر ہوگا۔ تاریخ نویسی پر جو مقدمہ اُس نے لکھا ہے تاریخ نویسوں کے لیے سبق آموز اور رہنما ہے۔ اس قابل عالم کی زندگی مصیبت اور عزت کا مجموعہ ہے۔ اسکے سوانحِ عمری پڑھ کر اس میں شک نہیں رہتا کہ یہ عالم استقلال طبع کا مالک تھا اس کا دماغ روشن اور معلومات کا معدن تھا۔ تاریخ نویسی کے وہ اسلوب جو زمانۂ حال میں صحیح سمجھے جاتے ہیں شروع میں اسی نے وضع کیے تھے۔ اخبار اسٹیٹس مین (Statesman) مورخہ ۲۶ جون ۱۹۲۶ء میں اس مورخ کی زندگی کے بعض حالات شایع ہوئے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہم مختصراً چند حالات اُردو میں حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

سویل (Seville) کے ایک معزز اور باسوخ خاندان کو ساتھ ابن خلدون کی رشتہ داری تھی۔ بیس سال کی عمر میں وہ سلطان عبدالاسحاق ثانی کا پرائیوٹ سکرٹری تھا۔ یہ سلطان جو حافص خاندان سے تھا کم از کم نام کے لیے ٹیونس پر حکمراں تھا۔ یہ عہدہ ابن خلدون ترک کر کے فیض کو چلا گیا جو اُس وقت مرنی خاندان کے سلاطین کا دار الخلافت تھا۔ سلطان ابو عنین کے دفتر میں اُس نے ملازمت اختیار کر لی لیکن یہاں ناچاقی ہوگئی اور وہ مقید کر لیا گیا۔ سلطان کی وفات پر چند واقعات ایسے ظہور میں آئے کہ نہ صرف اُسکو قید سے رہائی مل گئی بلکہ وہ سلطان متوفی کے جانشین کا سکرٹری مقرر ہوگیا۔ لیکن رعایا کی بغاوت کی وجہ سے اسکی حالت مخدوش ہوگئی۔ اس کا آقا برطرف کردیا گیا۔ لاچار اُسکو ہسپانیہ واپس جانا پڑا (۱۳۶۲ء) سلطان ابو احمر نے جسکی وہ خدمات کرچکا تھا اُس کی آؤ بھگت کی اور بطور سفیر کے اُسکو اُسکے وطن سیویل کو بھیجدیا۔ یہ شکایت پیٹر شاہ کیسٹیل (Castile) کے دربار میں تھی۔ شاہ مذکور نے اُس سے اُسکی اجدادی جائداد کے واپس دینے کا اقرار کیا اور اس کا اچھا استقبال کیا۔ گر وہ غرناطہ چلا گیا جہاں وہ امن سے کچھ عرصہ رہا۔ زان بعد اپنا خوش آیندہ ظہور میں آیا۔ یعنی وزیر ابن خطیب نے اُسے افریقہ جانے پر مجبور کیا۔ (۱۳۶۵ء) میں اُس نے بجایا میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں اُسے حافص خاندان کے سلاطین کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ یہاں بھی قسمت نے

امن نہ ملا۔ ایک ہمسایہ شاہزادہ کنسٹیل نے شہر پر دھاوا کرکے اُسے فتح کرلیا ناچار ابن خلدون کو تلمیس جانا پڑا جہاں وہ کبھی شاہزادہ ابوحمون کا سکرٹری تھا، مگر جہاز سے اُترتے ہی مرینی خاندان کے سلطان عبدالعزیز نے اُسے گرفتار کرلیا۔ پھر معمولی تحقیقات کے بعد وہ رہا کردیا گیا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ اُس سے کام لے۔ کیونکہ خانہ بدوش عربی قوموں میں اس کا بہت رسوخ تھا چنانچہ سلطان کے فرزند ابوبکر سعید کے عہد تک وہ وہیں ملازم رہا۔ اِن دنوں شہزادہ کی نابالغی میں وزیر مدارالمہام تھا۔ اس شہزادہ کی نابالغی کے زمانے میں شاہ غرناطہ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے تئیں تخت کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نابالغ شہزادہ برطرف کردیا گیا، اور اسی خاندان کا ایک اور شہزادہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ خلدون نے منت سماجت کی کہ اُسے ہسپانیہ جانے کی اجازت مل جائے۔ بجائے اجازت دینے کے اُسکے سابق مربی شاہ غرناطہ نے اُسے شہر بدر کردیا۔ جب وہ افریقہ آیا تو اُس کی حالت اور مخدوش ہوگئی۔ اِدھر تو وہ مرینی خاندان کے علاقہ میں جا نہیں [illegible] کے سلطان سے بدمزگی ہوچکی تھی۔ تاہم جب سلطان مذکور نے بلایا تو اس نے [illegible] اور اسکے پاس چلا گیا۔ درویشوں کے حجروں میں اُس نے سکونت اختیار کی۔ مگر جب موقعہ ملا یہاں سے وہ چلا گیا۔ اور صوبہ جدید اوران کے ایک قصبہ میں جو ایک گوشہ میں تھا وہ مع اپنے کنبہ کے رہنے لگا۔ اس قصبہ کا نام لمقاب الوسلا یا تھا۔ ایک پرانے قلعہ میں آرام سے بیٹھ کر اُس نے چار سال میں مسلم تہذیب کی تاریخ تصنیف کی۔

شہ۷۷۶ء میں وہ ٹیونس گیا تاکہ ایک بسیط تاریخ کے واسطے مسالہ جمع کرے یہاں سلطان ابوالعباس سے اُسے بہت مدد ملی۔ مسجدوں اور درسگاہوں میں بہت سی کتابیں تھیں۔ عوام کو بھی شوق کتب بینی کا تھا۔ چنانچہ یہاں اُس نے بربر اور زناتی اقوام کی تاریخ مکمل کی۔ ابھی چار سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اُسکے خلاف سازش شروع ہوگئی۔ حج کے لیے اجازت لیکر وہ سکندریہ پہنچا سکندریہ سے وہ قاہرہ گیا۔ یہاں وہ قاضی القضات مقرر ہوگیا (۱۳۸۴ء) اور ایسا عمدہ انتظام کیا کہ درویش جو معاملات سرکاری میں دخل دیا کرتے تھے اوس سے کانپنے لگے۔ اُس نے حکام اس قسم کے جاری کیے کہ اُسکے دشمنوں کا شمار بڑھ گیا۔ ایک مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کا کنبہ ٹیونس جاتا ہوا بحری طوفان میں تباہ ہوگیا۔ عہدۂ قضا سے اُس نے استعفا دے دیا [illegible] میں وہ والی مصر کے ہمراہ ایک مہم میں تیمور لنگ کے خلاف تجویز ہوا تھی شامل [illegible]

مقید ہو گیا۔ کسی نہ کسی حیلہ سے اس نے یہاں سے مخلصی حاصل کی اور پھر قاہرہ چلا گیا جہاں ایک مرتبہ سے زیادہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور رہا۔ اس مورخ نے سلطنتوں کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے، عوام کی حالتیں بدلتی دیکھیں، اپنے مصائب و آلام استنے: یکھے کہ کبھی عرش پر کبھی تحت الثرا میں۔ اسکی طبیعت نے جدید طرز تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی، مورخوں کو تعصبات اور غلط واقعات سے متنبہ کیا۔ اسکی تاریخ میں نہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے بلکہ سوسائٹی کی حالت بھی وہ شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔

ہم کو اس کے مقابل کا ایک شخص صرف کلن مصنف راج ترنگنی معلوم ہوا ہے۔ جنے کشمیر کی تاریخ آزادانہ لکھی۔ حال کے تواریخ نویسوں کو ابن خلدون کا دیباچہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

شمیم

غزل

جو ڈالے عکس اپنا وہ بت بے پیر پانی میں
نظر آنے لگے خورشید کی تنویر پانی میں

لب دریا کبھی پہونچا جو اُن زلفوں کا سودائی
تو اُسکے واسطے ہر موج تھی زنجیر پانی میں

کھڑے ہیں وہ لب جو اور برپا اک تلاطم ہے
تڑپتے لوٹتے ہیں سیکڑوں نخچیر پانی میں

بہیں جب سوز غم سے اشک تو رخسار جلتے ہیں
نہ دیکھی آج تک یہ آگ کی تاثیر پانی میں

پڑا ہے عکس قاتل جو ہلال عید قرباں کا
نظر آتی ہے سربازوں کو اب شمشیر پانی میں

اڑاتا ہے لب دریا جو تو خاک اپنے کشتہ کی
بہاتا ہے عبث لے ستمگر اکسیر پانی میں

دم تحریر نامہ جو حبیب آنسو ٹپکتے ہیں
ہو ہی جاتی ہے نادان سب تحریر پانی میں

حبیب اللہ خاں حبیب رامپوری

۱۔ علامہ ابن خلدون کی سوانح عمری چھپی ہوئی موجود ہے اور ہر جگہ الناظر بک ایجنسی سے مل سکتی ہے۔ ایڈیٹر

سرکار کا دربار

مصنفہ احمد الیاس مجیبی (فرخ آبادی)

(صفحات ۱۵۲ - قیمت عہ/ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی)

دنیا میں صرف دو ہستیاں ایسی ہیں جو کسی دوسرے کو اپنے سے زیادہ قابل، زیادہ مالدار، زیادہ خوش و خرم، غرضکہ ہر حیثیت سے زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ اور وہ ماں اور باپ ہیں۔ جن کی صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہر شعبۂ زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھیں بلکہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی امکانی کوشش اٹھا نہیں رکھتے ڈانٹ ڈپٹ سے، پند و نصیحت سے، لاڈ پیار سے، غرض ہر طرح سے وہ اسکی کوشش کرتے ہیں کہ انکے بچے برائیوں سے محفوظ رہیں اور اچھائیوں کو اختیار کریں۔ کیونکہ انکا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اس کم سنی میں جبکہ بچوں کی حالت موم کے مانند ہوتی ہے کہ جس سانچے میں ڈھالو، ڈھل جاتے ہیں۔ انکے اخلاق کی درستی ہی کامیابی کی کلید ہے۔

بچوں کے اخلاق درست کرنے کے بہترین ذرایع کیا ہیں؟ یہ مسئلہ ہمیشہ سے ایک نہایت ہی معرکہ آرا مسئلہ چلا آتا ہے۔ اور ماہرین علم النفس نے اس موضوع پر بڑے بڑے مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے قریب قریب سب متفق ہیں کہ سختی یا خشک وعظ و تلقین تو کجا، بچے کو اسکا احساس بھی نہ ہونا چاہیے کہ اسکو نصیحت کی جا رہی ہے۔ ورنہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ بچوں کی فطرت ہمیشہ خشک نصائح سے بغاوت کرتی ہے۔ اسی لیے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں، بچوں کے سامنے اس پیرایہ میں پیش کی جائیں کہ وہ ان میں خود بخود امتیاز کرنے لگیں جس سے انکے کیرکٹر کی تعمیر پر [illegible] اثر پڑے، [illegible] تربیت کا مقصد بغیر کسی براہ راست کوشش کے بہ آسانی حاصل ہو جائے۔ [illegible] طریقہ نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان سراپا عمل نہیں ہو سکتا، [illegible] کی مکمل ترین [illegible]وں کے کارنامے اس انداز اور ایسی زبان میں انکے سامنے پیش کیے جائیں [illegible] طرح مد نظر ہیں اور کسی طرح انکی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں۔

مسلمانوں کے نزدیک حضور سرور کائنات رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات [illegible]

سے زیادہ تو کیا برابر بھی آج تک کوئی ہو سکا ہے اور نہ زیادہ ہو سکتا ہے۔ آپ دنیا کے سامنے ایک کامل ترین نمونہ بن کر آئے تھے۔ آپ کا ہر فعل احسن ہر قول خدا کا قول تھا۔ آپ کی پاک زندگی کا ایک کھلا ہوا درس ہے، ایک مستقل صحیح ہدایت ہے۔ اس لیے مسلمان بچوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے آپ کے حالات سے بہتر اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ مجیبی صاحب نے ان ہی مقاصد کو ملحوظ رکھ کر "سرکار کا دربار" تصنیف کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں "دربار کا سلام" کے عنوان سے مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی جیسے ناقد کا مقدمہ شامل ہے۔ جس میں موصوف نے چند معمولی لغزشیں نمایاں کرنے کے علاوہ ایک عجیب والہانہ انداز میں کتاب کی تقریب کی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی ضرورت اور اہمیت دکھلانے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں :—

اب تک جنھوں نے قلم اٹھایا، یا تو انکے دلوں میں درد محبت کی کسک موجود نہ تھی اور یا دماغ کو تاریخی حقیقتوں کی قید گوارا نہ ہوئی۔ پھر اگر دونوں باتیں جمع ہو بھی گئیں، تو بوڑھا آدمی بچوں کی زبان میں باتیں کرنے کے لیے خود کہاں سے بچہ بن جائے۔"

یہ چند جملے کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ اور انکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے پہلے اب تک اردو زبان میں اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں تاریخی حقیقت بھی نظر انداز نہ کی گئی ہو اور جو دردِ محبت سے بھی لبریز ہو۔ ساتھ ہی ساتھ زبان اتنی سادی اور پیاری ہو کہ بچوں کے لیے صرف گرانبار ہی نہ ہو، بلکہ ایک مرتبہ اگر وہ شروع کر دیں تو ختم کیے بغیر نہ اٹھیں، اور اٹھیں تو اپنے ہادیِ اعظم کی محبت کی ہلکی ہلکی موجیں اپنے سینوں میں اٹھتی ہوئی محسوس کریں۔

کتاب میں رسول اکرمؐ کی ابتدائی زندگی کے حالات، خاص خاص لڑائیوں کے تذکرے، اور سخت سے سخت مصیبتوں اور آزمائشوں کے مقابلہ میں نہایت استقلال کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہنا، اور اشاعتِ اسلام کو جاری رکھنا زیادہ نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی عقائدِ اسلام کی تشریح اور انکی اہمیت پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے اور آخر میں آپ کے اخلاقِ حسنہ کو ایک ایک کر کے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ خاص طور پر تمام کتاب میں اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان چیزوں کو منتخب کیا جائے جنکا تعلق براہِ راست بچوں کے کیرکٹر سے ہو۔ اور شاید مصنف کے ذہن میں یہی بات ہو جسکی وجہ سے حضورؐ کے معجزات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال مثلاً آپ اس موقع کو ملاحظہ [illegible] حضورؐ کے سلسلہ میں حضورؐ کے چند ارشادات بیان کیے گئے ہیں۔ بچوں کی عادت

ہوتی ہے کہ چڑیوں کے انڈے بچے اُنکے گھونسلوں سے نکال لیتے ہیں اور اُن سے کھیلتے ہیں۔ اس کے متعلق چند واقعات کچھ اس پیرایہ میں بیان کیے ہیں کہ ایک مسلمان بچہ انھیں پڑھ لینے کے بعد اگر کبھی ایسی حرکت کرے گا تو فوراً اُسے حضورؐ کی تعلیم یاد آجائے گی اور وہ اس سے ضرور احتراز کریگا۔ وغیرہ وغیرہ

مجیبی صاحب نے زیرِ تحریر میں ادب کے پہلو کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ہر جگہ انھوں نے اس قدر سنبھال کر لکھا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں کامل توجہ کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ مثلاً

"عرب اور خاص کر مکہ میں تو (گھر کی مرغی دال برابر تھی) کی مثل تھی" ص۸۷

واقعیت سے یہ دور نہ سہی لیکن طرزِ بیان ضرور کھٹکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس قسم کی فروگذاشتوں کی اصلاح کر دی جائے گی۔

زبان کے لحاظ سے بھی بعض خامیاں نظر آتی ہیں۔ جن میں سے چند کا یہاں لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر مصنف صاحب مناسب سمجھیں تو آئندہ ایڈیشن میں انکی جانب ضرور توجہ فرمائیں۔ بعض غلط یا غیر فصیح الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) ص۳۴ تپتی پتھریلی زمین بجائے تپتی
(۲) ص۴۴ کبھی نہیں میٹ سکتا بجائے مٹا سکتا
(۳) ص۸۵ دھیرے دھیرے بجائے آہستہ آہستہ
(۴) ص۹۰ ساری رکاوٹیں دھری رہیں بجائے رکھی رہ گئیں۔
(۵) ص۹۰ خدا نے جو کام اسکے ذمہ دھرا تھا بجائے کیا تھا
(۶) ص۳۹ اسکا ذکر کھول کر کیا جائیگا بجائے پوری طرح
(۷) ص۹۹ وارقی شاہ جی بجائے شاہ صاحب (اسمیں تذلیل کا پہلو نکلتا ہے)
(۸) ص۱۰۶ آپ مجھ جیسے نہ تھے (اگرچہ انکار ہے لیکن پھر بھی ادب مانع ہے۔)

اسکے علاوہ زبان کو سہل کرنے کے خیال سے بعض جگہ ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ جن میں سے اکثر یا تو غیر فصیح معلوم ہوتے ہیں یا اُن لفظوں سے زیادہ مشکل ہو گئے ہیں جن کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً

(۱) ص۴۶ ہمارا تمھارا سب کا پالن ہار
(۲) ص۵۲ ابو طالب نے اپنے حضرت کو بلا کر باتیں کیں اور کہا کہ اچھے پوت!
(۳) ص۱۰۹ جنتی ماں

(۴) صفحہ ۱۴۵ دین کے پرچار بجائے پھیلانے کے
کتاب میں اکثر جگہ اقبال کے اشعار بھی مناسب موقعوں پر دیے گئے ہیں۔ لیکن ایک موقع کی موزونیت
بالکل ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ صفحہ ۹۶ پر سرکار کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔
"اگر توحید کا معاملہ نہ ہوتا تو رسول پاک ہمارے سرکار کے دیوانے حضرت صدیق کے
ان لفظوں کا سننا بھی گوارا نہ کرتے۔ ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال نے "شکوہ" نامی
اپنی ایک نظم میں ایک جگہ لکھا ہے، اللہ میاں سے کہتے ہیں ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم — پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم — بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

مصنف نے شاید "دیوانی" پر زور دیا ہے، لیکن میں ان کی توجہ "ورنہ" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں

کتاب کے بالکل آخر میں حدیثوں سے اقتباس کر کے حضورؐ کے کچھ اقوالِ زریں اور اس کے بعد
خواجہ حالی کے مسدس کے چند بند بھی دیے ہیں، جو اپنی جگہ پر موزوں اور مناسب ہیں۔ ہم پرزور تائید
کرتے ہیں کہ ہر مسلمان بچے کو "سرکار کا دربار" کا مطالعہ ضرور کرانا چاہیے۔ اس لیے ہماری قطعی یہ رائے ہے
کہ تمام اسلامی مدارس کو اپنے نصاب میں یہ کتاب داخل کر لینا چاہیے۔

محمود علی خاں (از دہلی)

رسید کتب

عربوں کا تمدن	مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعہ)	عہ/
ذکر میر (فارسی)	میر تقی میر کی خودنوشت۔ انجمن ترقی اردو	عہ/
اسلامی تعلیم	مولفہ مولانا سید محمود زیدی الوری	۸/
سیرۃ باقی	مصنفہ حافظ سید عزیز حسن۔ دہلی	۱۲/

غالب

تنہا صاحب نے اُردو نثر نویسوں کا تذکرہ سیر المصنفین کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جلد اول ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی تھی۔ دوسری جلد چھپ رہی ہے اور یقین ہے کہ سالِ رواں میں مکمل ہو جائے گی۔ اب آپ کی توجہ شعرائے اُردو کی طرف ہوئی ہے۔ شعراء کے متعدد تذکرے موجود ہیں، اور لالہ سری رام صاحب کا خُمخانۂ جاوید تو واقعی تذکرہ ہزار داستان ہے، جو تکمیل کے بعد ایک حد تک اُردو شاعری کی انسائیکلوپیڈیا کہے جانے کا مستحق ہوگا۔ مگر تنہا صاحب اپنے مذاق کے مطابق شعراء کے حالات، اُنکی شاعری پر تبصرہ، اور اُنکے کلام کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے ہیں اور وعدہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے کے سب مضامین ابتداءً الناظر ہی میں شایع ہوں گے، بعد کو کتابی صورت میں چھاپے جا سکیں گے۔ اسی قسم کے مضامین کا ایک سلسلہ ا-ز لکھنوی کے نام سے رسالہ زمانہ اور الناظر میں کبھی شایع ہوا کرتا تھا، مگر افسوس ہے کہ ناتمام رہا۔ تنہا صاحب کا اس سلسلہ کا پہلا مضمون حاضر ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے مرزا غالب کو اولیت کا فخر حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور تنہا صاحب کو اس طرف توجہ بھی دلائی گئی تھی۔ مگر وہ اس وقت کسی ترتیب کے پابند ہونا نہیں چاہتے۔ البتہ تدوینِ کتاب کے وقت ترتیب صحیح ملحوظ رکھی جائے گی۔

"ایڈیٹر"

آپ کا نام میرزا اسد اللہ خاں تھا اور غالب و اسد دو تخلص تھے۔ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب تور ابن فریدوں تک پہونچتا ہے اور آپکے آباء و اجداد ایبک قوم کے تُرک تھے۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے۔ ترسم خاں نامی ایک امیرزادے کی اولاد میں تھے۔ مرزا کے باپ عبد اللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا نے آگرہ ہی میں پرورش پائی اور سنِ شعور تک آگرہ ہی میں رہے۔ مرزا نے شیخ معظم سے جو اُس زمانے میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے تعلیم پائی اور اسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد سے جسکا نام مسلمان ہونے کے بعد عبد الصمد رکھا گیا تھا دو برس تک فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔

اس کے سوا مرزا نے اور کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا۔ اور اس لیے مرزا کا یہ کتنا مبالغہ نہیں کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من است　　　　گل جدا نا شدہ از شاخ بدامان من است

مرزا کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ تیرہ برس کی عمر میں ۷ رجب ۱۲۲۵ ہجری کو ان کا عقد ہو گیا، اور اس تقریب سے دلی میں ان کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر تک دلی ہی میں رہے۔

مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اسلئے تلّوں میں بسر ہوا تھا اور وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں صباحت اور خوبصورتی کے آثار انکے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

دلی میں وہ قریب پچاس برس کے رہے لیکن نہ اپنے لیے کوئی مکان خریدا اور نہ بنایا۔ جب ایک مکان سے جی اکتا یا، اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ اسی طرح مطالعہ کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ آپ کتاب فروشوں کی دکان سے کرایہ پر کتابیں منگاتے تھے اور مطالعہ کے بعد کتاب واپس کر دیتے تھے۔

مرزا نے کبھی کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تو انھوں نے ایک مثنوی بادِ مخالف لکھی، جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور انکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کیے ہیں۔

۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے لیے ایک فارسی کے مدرس کی ضرورت تھی۔ مرزا صاحب کو مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے طلب کیا۔ مرزا گئے۔ لیکن اس خدمت سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ان کا اعزاز و احترام جیسا کہ کیا جاتا تھا ملازمت کی صورت میں نہیں کیا جائے گا۔

۱۲۶۶ ہجری میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر دربار عام میں مرحمت فرمایا۔ اور خاندانِ تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ مرزا نے ابتدائے آفرینش سے صاحبقران تیمور گورکان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے آخر زمانے تک لکھے تھے کہ غدر ہو گیا اور یہ کتاب ناتمام رہی۔ البتہ مرزا نے حالات غدر تحریر کیے۔

• شیخ ابراہیم ذوق کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی، اور وہ

اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔

مرزا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرزا بدیہہ گو بھی تھے اور جو قطعہ اُنکے دیوان میں ملکہ پنڈلی کے متعلق چھپا ہوا ہے وہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔

مرزا کو عربی میں خاصی استعداد تھی اور فارسی دانی اور عروض میں وہ کامل تھے۔ علمِ نجوم سے کسی قدر اور اُسکی اصطلاحات سے اُنکو پوری واقفیت تھی۔ علمِ تصوف سے اُنکو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعہ سے گزرے تھے۔ مرزا کا خطِ نستعلیق شفیعہ آمیز نہایت پاکیزہ اور دلاویز تھا۔ اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُنکی خوشی سے خوش اور اُنکے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھتے تھے۔ بیماری اور تکلیف میں بھی وہ اپنی اس عادت سے باز نہیں آتے تھے۔ مروت اور لحاظ بیحد تھا۔ اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُنکے دروازہ سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ مرزا لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا اور شعر فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ حق پسند اور راست گفتار تھے۔ آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔ تاریخ وفات "آہ غالب بمرد" ہے۔ مرزا فارسی کے بڑے شاعر تھے، اور نثرِ اردو میں جو طریقہ مکتوب نویسی کا اُنھوں نے ایجاد کیا اُس کا تتبع بھی آج تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہاں ہم کو اُنکی صرف اردو شاعری اور خصوصاً غزل گوئی سے بحث ہے لہذا ہم اس کے متعلق جو کچھ رائے رکھتے ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں

غالب کے اُردو کلام پر تبصرہ

اگرچہ مرزا غالب کی اردو شاعری اور اُنکے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن باوجود اس کے ابھی دنیائے ہندوستان میں ایسے قدامت پرست اصحاب موجود ہیں جو فکرِ نقیر نے بوسہ ہیں اور جن لوگوں نے اپنے بزرگوں یا اُستادوں سے جو اتفاق سے ذوق مرحوم کے کلام ... لہذا وہ مجھے یہ کہنے لیں۔

ہے کہ اُردو شاعری کا خاتمہ ذوق پر ہوگیا اور اس لیے اُن کا بھی یہ راسخ عقیدہ ہوگیا ہے کہ یہ رائے بلاشبہ درست اور سچا ہے۔ لیکن اگر وہ امعان نظر سے ذوق اور غالب کا موازنہ کریں تو انکو معلوم ہو جائے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ اصحاب ہی نہیں بلکہ ہر صاحب ذوق یہی کہے گا کہ غالب سے ذوق کو غزل گوئی میں کوئی نسبت نہیں۔ بے شک ذوق مرحوم غزل گوئی کی استعداد رکھتے تھے لیکن ظفر کی فرمایشوں نے اُنکا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اور وہ مجبور تھے کہ ایسی غزل لکھیں جو بادشاہ اور اراکین دربار کو پسند آئے۔ اور وہ لوگ صرف زبان کے چٹخارے پسند کرتے تھے اُنکو تخیل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چنانچہ تمام دیوان ذوق اسکی بین مثال پیش کرتا ہے۔ گنتی کے کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو بلند خیالی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ ذوق میں ملکۂ شاعری ضرور موجود تھا لیکن درباری شاعر ہونے کی وجہ سے وہ جذبہ روز بروز کم ہوتا گیا اور آخر کار معدوم ہوگیا۔

ایک درباری شاعر کو اہل انگلستان نے کبھی شاعر نہ مانا۔ یہاں تک کہ ورڈس ورتھ ملک الشعرائی کی کرسی پر جلوہ افروز ہوا اور اسکے بعد لارڈ ٹینی سن کو یہ جگہ دی گئی۔ جنھوں نے فرمایشوں سے قطع نظر کر کے اپنے جذبات کی ترجمانی کو مقدم سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرمایش پر کسی غزل یا نظم لکھنے اور اپنے جذبۂ دل سے بے اختیار لکھنے میں آورد اور آمد کا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر ایک درباری شاعر کا کلام تصنع اور آورد سے لبریز نظر آتا ہے۔ اور قدرتی شاعر کے یہاں حسیات و جذبات کا دریا بہتا معلوم ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا غالب کا کلام اول سے آخر تک یکساں نہیں ہے۔ بعض بعض اشعار ضرور مبتذل ہیں اور اُنکی شان سے بعید ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشعار کسی فرمایش کی بنا پر یا وقتی ضرورت کے لحاظ سے محض تفریح و تفننِ طبع کے لیے کہہ دیئے گئے ہیں اور مرزا غالب کے قدردانوں نے انھیں بھی دیوان میں شامل کر دیا ہے، مثلاً

چلیں ہیں گزرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

یا

کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا	خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

مرزا غالب نے جن اصحاب کو اپنا دیوان منتخب کرنے کے لیے دیا تھا وہ ضرور سخن فہم ہونگے لیکن اُنھوں نے اپنے انتخاب سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہت سا حصہ کلام جسکو وہ مشکل سمجھتے تھے اور نظرانداز کر دیا تھا اپنے اندر آسان اور عمدہ اشعار بھی رکھتا تھا اور بعض آسان اشعار جو محض زود فہمی کی بنا پر انتخاب کیے گئے نظری کرنے کے قابل تھے۔ تاہم ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر و بیشتر عمدہ ہی اشعار ہیں جو غالب کے نام کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر دیوان غالب کے مطالعہ کا شوق اُس وقت ہوا جبکہ میں آٹھویں کلاس میں تعلیم پاتا تھا اور کثرتِ مطالعہ سے تمام دیوان غالب از بر یاد ہوگیا تھا - میں اُس وقت دیوانِ غالب کے بہت کم اشعار سمجھتا تھا لیکن بعض اوقات جب کوئی مشکل شعر خود بخود سمجھ میں آجاتا تھا تو میں اچھل پڑتا تھا اور یہ خیال ہوتا تھا کہ غالب کے دیوان میں یہ شعر پہلی ہی مرتبہ میں نے دیکھا ہے - ادھر مجھ کو دیوان غالب پڑھنے کا یہ شوق تھا اور اُدھر اپنے ہمجولیوں کو دیوانِ داغ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا تھا - مجھکو اسوقت اشعار کی خوبیاں بیان کرنے پر قدرت نہ تھی اور میرے ساتھی داغ کی صرف زبان کی تعریف کیا کرتے تھے اور دیگر شعراء سے صرف اسی بات کا موازنہ کیا کرتے تھے - داغ مرحوم زندہ تھے اور اُسوقت ہر مبتدی فن کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مرزا داغ کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہو جائے جسکو دیکھو داغ ہی داغ پکارتا تھا - میں اگرچہ مرزا غالب کی شاعری کا مداح تھا لیکن اپنے دعوے کو ثابت نہیں کرسکتا تھا - ناظرین کرام میری اُس خوشی کا اندازہ فرماسکتے ہیں جبکہ ایک یا دو سال بعد میری نظر سے یادگارِ غالب گزری اور میں نے خواجہ حالی جیسے سخن شناس و سخنور کو بہ زعمِ خود اپنا ہمخیال پایا -

سچ یہ ہے کہ خواص نے مرزا غالب کے اُردو کلام کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے - عوام میں نہ اُنھیں مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ آئندہ اُمید ہے کہ وہ عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کریں گے - لیکن یادگار غالب نے تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت دی کہ وہ کلام غالب کا مطالعہ کریں اور اُس سے لطف اندوز ہوں - چنانچہ ڈاکٹر اقبال سے لیکر ایک سکول کے طالب علم تک ہر شخص اُسی عجیب و غریب ہستی کے مطالعہ کلام میں مصروف ہے اور بس نہیں بلکہ شرح پر شرح لکھی جا رہی ہیں اور زمانۂ حال کے شعراء اپنے کلام کو بھی غالب ہی کے انداز پر ڈھال رہے ہیں - طرح طرح کے نسخۂ دیوانِ غالب نکل رہے ہیں اور پبلک کی قدردانی روز افزوں ہے -

اُردو کے غزل گو شعراء میں میر اور غالب کو پسند کیا جاتا ہے - میر نے عشق کو اور غالب نے فلسفۂ عشق کو بیان کیا ہے - میر کا انداز عام فہم اور آسان ہے - فلسفۂ عشق کے اظہار کے لیے زبان خواہ مخواہ دشوار اور دقیق ہو جاتی ہے - اِس لیے غالب کا اندازِ بیان اگر ادق ہے تو اسکی کوئی شکایت نہیں کی جاسکتی - بلکہ غالب کے تخیل کے لیے یہی طرز ضروری اور لازمی تھا -

بعض اصحاب اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ "مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے" تو کہتے ہیں کہ جو علوم مشکل ہیں اُنکو ترک کر دینا چاہیے اور اسی طرح جو فن مشکل ہے اُسکو بھی چھوڑ دینا چاہیے

اگر زندگی کی یہی شکل اختیار کرلی جائے تو دنیا کبھی ترقی نہ کرے اور ادبی دنیا بھی جہاں ہے وہیں رہ جائے ایجاد اور نو آئینی ایکدم موقوف ہو جائے، ندرت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

ذوق کا مجھے ایک شعر یاد آگیا جو بلحاظِ تخئیل نہایت اچھا شعر ہے، لیکن اُس کا طرزِ بیان ذوق کا سا نہیں رہا، بلکہ غالب کا رنگ آگیا ہے۔

اُمید ہو گئی ہما یہ ورنہ خانۂ یاس بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

لہذا اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لکیر کا فقیر ہونا منظور نہیں ہے تو ندرتِ بیان کے لیے طرز اوا ضرور مشکل اور ادق اختیار کرنا ہوگا۔ اور غالب کی تقلید لازمی کی جائے گی۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم ایسے اشعار سے خوش ہوں:۔

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا بجھا ہوا ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے پر بڑے پتھر ہیں مشکل سے کھینچے جائینگے

ہمارے لیے بلند خیالی کی ضرورت ہے۔ پیش پا افتادہ مضامین ہم پر کچھ اثر نہیں ڈالتے۔

اُردو شاعری میں غالب نے فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کی ہیں اور بہت سی ترکیبیں اُنکی خود ساختہ ہیں، لیکن تقریبًا سب کی سب مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً شوخیِ تحریر، دامِ شنیدن، غبارِ رسوم، آتشِ خاموش، خانہ زادِ زلف، شبستاں، دریا ئے مے، جمع و خرجِ دریا، آئینۂ انتظار، تکلف برطرف، دریا آشنا، محشرِ خیال، سلکِ عافیت، وادیِ خیال، دریائے بیتابی، گرمِ تماشا، دامِ تمنا، چشمِ صحرا، غبارِ وحشت، شرارجستہ، وغیرہ وغیرہ۔ ان تراکیب سے زبان میں بیحد وسعت پیدا ہو گئی ہے اور دوسروں کو بھی موقع ہے کہ وہ اِسی انداز پر اپنے اظہارِ خیال کے لیے ترکیبیں ایجاد کریں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ غالب کی فارسیت نے اُردو کے محاورہ کو بھی بدل دیا ہے، لیکن ہم اُسکو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مثلاً

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عذر لانا، عذر آوردن کا ترجمہ ہے لیکن یہ اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ عذر لانے کا استعمال بالکل غلط ہے۔ نہیں معلوم غالب کے طرزِ بیان میں کیا دلکشی ہے کہ مجھے ذاتی طور پر اُس سے عشق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر نے بعض شعر (اگر یہ تعداد دو گنی کر دی جائے) ایسے ضرور کہے ہیں کہ جنکا جواب نہیں، لیکن یہ اشعار میر صاحب کی تمام عمر کی کمائی ہیں اور اُنکے سات دیوانوں میں سے ہیں۔ غالب نے اپنے زورِ طبیعت کو فارسی کلام میں صرف کیا ہے۔ کبھی کبھی تفریحِ طبع کے لیے اُردو میں کچھ کہہ لیا ہے

اس پر یہ حال ہے کہ اردو شاعری میں کوئی اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا، اور الف سے ی تک تمام دیوان میں سے اگر بہتر شعر نکال دیے جائیں تو باقی تمام اشعار لاجواب نظر آئیں گے۔ (نسخہ حمیدیہ کا ذکر نہیں دیوان سے وہ دیوان مراد ہے جو مرزا کی زندگی میں مرتب کیا گیا تھا)

میر صاحب فرماتے ہیں

رخ کو اُٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے　　اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

کیا خوب شعر ہے۔ لیکن مرزا غالب کے حسب ذیل شعر میں کچھ اور ہی لطف ہے:

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ　　کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

میر صاحب کا ارشاد ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا　　عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

فی الواقع یہ شعر دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے لیکن غالب اپنے مصائب کا حال اس طرح بیان کرتا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

یعنی مجھ پر وہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ ایک دل کا کام نہیں جو اُسے برداشت کر سکے۔

کوئی دوسرا شاعر کیا یہ شعر کہہ سکتا تھا؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اور اگر کہتا تو ہرگز اس طرح نہ کہتا۔ غالب کی خصوصیت یہی ہے کہ بات میں سے بات پیدا کرتا ہے اور طرز ادا میں وہ جدت ہوتی ہے کہ معمولی بات بھی دلکش ہو جاتی ہے اور نئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا کسی شاعر کے یہاں ایسا شعر مل سکتا ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟　　ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہمارے آسان فہم حضرات تو اس شعر کو بھی مہمل قرار دیتے اگر مولانا حالی خود مرزا غالب سے اس کا مطلب نہ دریافت فرماتے۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اُردو شاعروں میں غالب جیسا کہ اُن کا تخلص ہے سب پر غالب ہیں اُن کے آسان اور دشوار دونوں طرح کے کلام کا انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اس سے شاد کام ہوں:

کلام ادق

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

۲۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

۳۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

۴۔ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

۵۔ اسد یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون توام ہے — جسے تو بندگی کہتا ہے دعوےٰ ہے خدائی کا

۶۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۷۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل — جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۸۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

۹۔ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں، طرہ گیاہ کا

۱۰۔ رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

۱۱۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱۲۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۱۳۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

۱۴۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۱۵۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

۱۶۔ جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟ — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

۱۷۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۱۸۔ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

۱۹۔ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

۲۰۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

۲۱۔ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

۲۲۔ دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

۲۳۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

۲۴۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

۲۵۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

۲۶۔ اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

۲۷- شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

۲۸- کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

۲۹- گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۳۰- نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

۳۱- عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

۳۲- یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

۳۳- گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

۳۴- غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

۳۵- میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ "یوں"

۳۶- ہم پہ جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

۳۷- ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

۳۸- ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

۳۹- آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

۴۰- کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

۴۱- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

۴۲- قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

۴۳- حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو

۴۴- ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

۴۵- مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

۴۶- وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۴۷- ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

۴۸- گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

۴۹- وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

۵۰- ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۵۱- ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

۵۲۔ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی

۵۳۔ رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

۵۴۔ بسر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

۵۵۔ کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

۵۶۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ شاید یہ بھی میرے دل میں ہے

۵۷۔ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد سے تری صورت مگر ملے

۵۸۔ ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

۵۹۔ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

۶۰۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

۶۱۔ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

۶۲۔ کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ، کہ بس خاک ہو گئے

۶۳۔ منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

۶۴۔ اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

۶۵۔ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ، نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

۶۶۔ خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

۶۷۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۶۸۔ میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

۶۹۔ نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

۷۰۔ بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

۷۱۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

۷۲۔ مثال یہ مری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

سہلِ ممتنع

۱۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

۲۔ میں، اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

۳۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

۴- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

۵- کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

۶- کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

۷- میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

۸- دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

۹- لاگ ہو، تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا

۱۰- یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

۱۱- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

۱۲- ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

۱۳- آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

۱۴- آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

۱۵- زخم سِلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

۱۶- مہرباں ہوکے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

۱۷- لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

۱۸- ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

۱۹- نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

۲۰- کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اسقدر آباد نہیں

۲- وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم انکو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

۲- نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

۲- نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

۲- اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۲- دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

- جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۲۹۔ جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

۳۰۔ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

۳۱۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

۳۲۔ مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں — خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۳۳۔ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

۳۴۔ آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

۳۵۔ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

۳۶۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟ — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

۳۷۔ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۳۸۔ اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۳۹۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۴۰۔ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۴۱۔ کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

۴۲۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

۴۳۔ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

۴۴۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

۴۵۔ جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

۴۶۔ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

۴۷۔ بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۴۸۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۴۹۔ تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۵۰۔ نَے ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

۵۱۔ رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

۵۲۔ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

۵۳۔ اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

۵۴- عشق نے غالب نکما کر دیا / ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۵۵- منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید / ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

۵۶- عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب / کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۵۷- فریاد کی کوئی لے نہیں ہے / نالہ پابند نے نہیں ہے

۵۸- ہاں کھائیو مت فریب ہستی / ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

۵۹- سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے / کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

۶۰- کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر / پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

۶۱- بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ / کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

۶۲- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن / بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

۶۳- واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو / کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

۶۴- گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں / کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

۶۵- تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے / تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

۶۶- کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب / سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

۶۷- مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے / جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

۶۸- کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو / عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

۶۹- پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق / سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

۷۰- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن / بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

۷۱- زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا / کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

۷۲- ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا / صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

محمد یحییٰ تنہا بی اے، ایل ایل بی

رسید کتب

عربوں کا تمدن۔ (مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے) [illegible]

ذکر میر فارسی۔ (میر تقی میر)

نظرے خوش گزرے

دو سال ہوئے کہ ہندوستانی اکیڈمی کی تاسیس حکومت صوبجات متحدہ کے زیر غور تھی۔ ایک کرمفرمانے جن کو اکیڈمی کی تنظیم میں خاص دخل تھا، راقم الحروف کو بھی دعوت شرکت دی - اور خدمت گزاری اُردو کے غایۂ شوق سے متاثر ہو کر اکیڈمی کا نظام اساسی دیکھنے سے قبل ہی ان کرمفرما کی دعوت قبول کر لی گئی - مگر جب اُس کا مسودہ وصول ہوا تو مناسب خیال کیا گیا کہ اس بارے میں مہاتما گاندھی سے بھی مشورہ کر لیا جائے کہ مبادا اس میں شرکت ترک موالات کے اصولوں کے منافی ہو - مہاتما جی نے اُس مسودہ کو ملاحظہ فرمانے اور کافی بحث و غور کرنے کے بعد بالآخر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اکیڈمی میں شرکت تارکین موالات کے لیے جائز نہیں اور اس بنا پر میں نے اپنے کرمفرما سے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا۔

یہ فیصلہ دو سال ہوئے کیا گیا تھا - اسکے بعد اکیڈمی قائم ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اُسکا کاروبار جاری ہے - اس اثنا میں جو حالات بعض احباب کے ذریعہ سے معلوم ہوئے اُنکی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ مہاتما جی کی رائے نہایت صائب تھی - اور دلی مسرت ہے کہ اُنکے دانشمندانہ مشورہ کو قبول کر کے میں اس سرکاری ادارہ سے علٰحدہ رہا - جن بعض احباب نے کسی مصلحت سے اکیڈمی میں شرکت گوارا کر لی تھی امید ہے کہ وہ بھی اب زیادہ دنوں اُس سے وابستہ نہ رہ سکیں گے بشرطیکہ ترک موالات کی تحریک کے ساتھ اُنکو اب بھی وہی شیفتگی و دلچسپی باقی ہو جسکا اس سے قبل مظاہرہ ہو چکا۔

سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر بھی ادب کی خدمت کے کافی مواقع حاصل ہیں - انجمن ترقی اُردو، دار المصنفین، انجمن اُردو، اور اردو اکیڈمی کے علاوہ اب ایک خالص سیاسی ادارہ بھی قائم ہو گیا ہے اور ان سب مجالس کو مخلص و سرگرم خدمتگذاروں کی ضرورت ہے - کاش حکومت کے خزانہ کا سہارا ڈھونڈھنے کے بجائے ہمارے احباب خود اپنے اور اپنی قوم کے وسائل پر اعتماد کریں اور سرکاری اداروں کو اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنکا مطمح نظر یا طریق کار آزادانہ جدو جہد سے موافقت نہیں رکھتا۔ بے شبہہ حکومت کی دولت و اقتدار کے سایہ میں رہنے والوں کیلیے جو عافیت و منفعت ہے آزاد قومی اداروں میں اُسکا سامان فراہم ہونا محال اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن منافع کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں میں مضرت کے جو پہلو ہیں اُن سے تو بہر حال نجات رہیگی۔

اور یہ بھی تیسرے باب مین معلوم ہو چکا ہے کہ اون عدالتون مین ارباب جیوری نہین بیٹھتے
ہین صرف حکام اپنی راے سے مقدمات فیصلہ کرتے ہین مگر بعد وہان اوٹھا بیجانے کے . . .
معلوم ہوا کہ اوس عدالت مین مقدمہ کا لیجانا نامناسب ہوا۔ انفصال اوس کا ارباب
جیوری ہی کے سامنے مناسب تھا اور جس جلدی کے واسطے مقدمہ اوٹھا لیگئے تھے وہ بھی ظہور
مین نہ آئی یعنی اوس ٹرم مین وہان بھی حکم اخیر اوس مقدمہ مین نہ ہوا۔ دوسرے ٹرم مین جب پیش
ہوا وہان کے حکام نے یہ تجویز کیا کہ مقدمہ مین جعل اور فریب خواہ مخواہ ہے مگر مدعی اوس مقدمہ کا
اوس جعل اور فریب سے آگاہ نہ تھا اور چونکہ اوس نے محض میرے اعتماد پر روپیہ دیا اس واسطے
مجھ پر لازم ہے کہ مدعی کا روپیہ ادا کرون اور میرا مواخذہ جعلسازون سے چاہیے اور
اوس حاکم کو جس نے اور چار تمسک باطل کر دیے تھے اون کو وہان کے حاکمون
نے حکم دیا کہ جعلسازون کی نسبت میرے واسطے جو مناسب سمجھاین حکم دیوین اوس
حاکم کی راے مین جیسا اون کی تجویز سے معلوم ہوا وہ حکم انصاف کے خلاف ہوا مگر چونکہ
اوس حاکم پر وہان کے حکام بالا تھے اصل تجویز مقدمہ مین کچھ دخل نہ کر سکا مگر حکم دیا کہ جس قدر
اوس عدالت سے میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے وہ کل میرے حق مین جعلسازون پر ڈگری ہو
لیکن کیا فائدہ اول تو جعلساز مفرور تھے اور وہ مفلس بحت تھے اور وہ سارا اونکا طمطراق
اوسی جعل اور فریب کے روپیہ سے میرے اور اور لوگون کے شکار کرنے کے واسطے تھا اور
اس مقدمہ کے فیصلہ کے بعد وزیر ہندوستان نے دفعۃً میری اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا
ہر چند مین نے شور اور شغب کیا کہ صرف تمہارے روکنے سے مین یہان ٹھہرا اگر
پہلے مقدمہ کے فیصلہ ہونے کے بعد مین یہان سے چلا جاتا تو کوئی میرا دامنگیر نہ تھا
اس واسطے کہ اوس مقدمہ کی تجویز ثانی بھی تین چار مہینے کے بعد منظور ہوئی تھی مگر
کسی نے کچھ نہ سنا۔ دوسری مصیبت میرے اوپر یہ ہوئی کہ تیس چالیس ہزار روپیہ کا
میرا اسباب چوری ہوگیا چاندی اور سونا اور عمدہ عمدہ لباس کشمیری اور ریشمی فرنگی اور

اور میرا مواخذہ جعلسازون سے چاہیے

جعلسازون پر ڈگری ہوئی

وزیر ہندوستان نے میری اعانت سے ہاتھ کھینچا

مال راقم کا چوری ہوگیا

بہت کچھ زیورات جو مین نے تحائف کے واسطے جمع کیا تھا سب لٹ گیا جو رہ گئے ایک
مدت تک اوس کے بکھیڑے مین راقم رہا اونکو سات برس کی قید ہوئی مگر دو چار چیزون
کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ تیسری مصیبت یہ ہوئی کہ کچھ حصے ہندوستان کی ریلوے کے قریب ساٹھ
ستر ہزار روپیہ کے مدت سے میرے قبضے مین تھے اوس کے منافع پانچ روپیہ سیکڑے
کے جو تھے وہ کلکتہ مین اپنے اہل وعیال کے مصارف کے واسطے اوتار دیے تھے وکلا کو
اوس سے اطلاع ہوگئی اور وزیر ہندوستان نے خلاف وعدگی کر کے میری اعانت سے
دست برداری کی وکلا نے وہ سب حصے بکوا کے تصرف کر لیا۔ کچھ تھوڑا سا اسباب
رہا سہا تھا وہ بعضے دوستی اور محبت والے دوستون کے فریب مین گیا کہ وہ دوسری اور تیسری ڈکیتی
وہان ہوئی ہندوستان مین غدر کے ایام مین جو غدارون نے چھوڑا وہ سرکاری فوج نے
لوٹ لیا کچھ مکانات میرے اکبرآباد مین تھے وہ یہان کے حکام نے نیلام کر ڈالے اوس کا قصہ
بہت طول ہے حالانکہ ایک دفعہ ہندوستان کے وزیر نے حکم دیا کہ وہ نیلام ناانصافی کا ہے مگر
کبھی یہان کسی نے نہ سنا اب مین ہندوستان مین اور انگلستان مین دونون جگہہ مفلس محتاج ہو گیا
نوبت قریب فاقہ کشی کے پہونچی اس حالت مین جب مین نے بہت شور و شغب
مچایا تب ایک بڑے جلیل القدر افسر نے وزیر ہندوستان کی کچہری کے مجھ سے
فرمایا کہ تم نے حتی المقدور سرکار بلند اقتدار کی بدنامی مین کچھ قصور نہین کیا بادشاہ
کے مقدمہ مین کتابین چھاپ چھاپ کے سارے عالم مین سرکار کو رسوا کیا اب کا
ہے کس منھ سے امید اپنی رفاہ کی رکھتے ہو اس کے ساتھ اب یہ بھی مجھے یقین
ہو گیا کہ ارباب اقتدار یہ بھی نہین چاہتے کہ مین ہندوستان مین جاؤن اس گمان سے کہ شاید پھر
بادشاہ کو آمادہ پارلیمنٹ مین استغاثہ کا کرون جب وزیر ہندوستان سے درخواست
کی کہ اب میری نوبت یہان فاقہ کشی کی آئی میری رہائی کروائیے وہان سے یہ جواب
ہوا کہ وہ مدعی جس کی میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے اوس کی تحریری اجازت داخل کرو

تب قرض بھی میرا ادا کیا جائیگا اور جہاز کی سواری کی بھی اجازت دی جائیگی ۔ اور حالانکہ وہ
مدعی مجھسے خواستگار اپنے دعوے کا نہ تھا اور اوس نے بھی مکرر عرایض وزیر ہندوستان کو
اس مضمون کے گذرانے تھے کہ حقیقت مین اوس کا دعوے اودھ کے بادشاہ پر ہے اس سبب
سے کہ اون کے مقدمہ کے خرچ کے واسطے روپیہ اوس نے دیا تھا سفیر کی ذات کے واسطے نہین
دیا اور وزیر ہندوستان پر ہے اس سبب سے کہ اونھون نے برابر اس مقدمہ مین اعانت روپیے اور
تدابیر سے بادشاہ کے سفیر کی کی ہے اس واسطے اوس کو امید ہے کہ وہ روپیہ ادا کرین ۔ مگر جب
وزیر ہندوستان نے مجھے اجازت تحریری مدعی کی پیش کرنے کا حکم دیا راقم نے مدعی سے درخواست
کی کہ تم اپنی ڈگری میرے اوپر جاری کرواؤ تو مجھے کچھ چارہ نہین ہوگا بجز اسکے کہ مین انسالونسی کی
درخواست گذرانون جس کو ہندوستان کی اصطلاح مین دیوالہ نکالنا کہتے ہین اور اگر میرے اوپر
جاری کروانا ڈگری کا منظور نہین ہے تو اجازت تحریری مجھے دیدو کہ میری یہان سے نجات ہو ۔
اوس نے کہا کہ نہ بالفعل مجھے تمھارے اوپر ڈگری جاری کرانا منظور ہے اور نہ مین تحریری اجازت
دونگا اور اگر تم چلے جاؤگے تو مین تمھین نہین روکونگا ۔ اب راقم نے اپنے وکلا سے کہا کہ ہزارون
روپیہ تم میرا لے چکے ہو اب کچھ ایسا سامان کردو کہ مین یہان سے روانہ ہو جاؤن ۔ بہزار دشواری قریب
ایک ہزار روپیہ کے اونھون نے تدبیر کی اوس روپیہ سے راقم نے ایک فرانسیس کی کمپنی سے
جس کے جہازات ہر مہینے مین ایک دفعہ مسافرون کو ہندوستان مین اور چین مین پہونچاتے
ہین اوس کمپنی سے بندوبست کیا جس کے ذریعہ نومبر ۱۸۶۳ء مین راقم لندن سے روانہ ہوا
چار دن ریل کا خشکی مین سفر ہوا اور سات دن دریا مین پارس اور مارسلیس کے راستے
گیارھوین دن بلدۂ اسکندریہ مین راقم پہونچا تین چار صندوق کچھ ضروری پوشاک و چند کتابون کے لیکے
رہین اسکندریہ تک کرایہ کیا تھا اور ارادہ تھا کہ مفلسانہ وہان سے مکہ معظمہ مین جاؤن اس واسطے کہ جن

روانگی راقم کی لندن سے ماہ نومبر ۱۸۶۳ عیسوی

سے ہماری شریعت کی اصطلاح مین جب کسی شخص کے پاس کچھ باقی نہ رہے اور قرضخواہ اوس کے بہت ہون تب ایک
قاعدہ ہے کہ قاضی اوس کا افلاس مشہور کرتا ہے اس غرض سے کہ اگر کوئی شخص فلانے شخص کو قرض دیگا اوسکا دعوے
باقی نہ سنا جائیگا اس کو تفلیس کہتے ہین انسالونسی جو انگریزی قانون مین ہے اوس کے قریب قریب ہے ۔

نجاسات مین راقم مبتلا تھا بغیر زمزم سے دھونے کے طہارت ممکن نہ تھی۔ اگرچہ میرے عقیدہ مین
لندن مین کچھ نجاست نہ تھی میرے اپنے حرکات موجب نجاست تھے جس وقت مین اسکندریہ مین پہونچا
تیس چالیس روپیہ نقد میرے پاس باقی تھے اور گھڑی وغیرہ کئی سو روپیہ کا مال بھی تھا کہ مصر مین اگر
مین بیچتا تو گیارہ بارہ سو روپیہ کو وہ مال بکتا تھا۔ اب یہان کوئی چار سو روپیہ کو بھی نہین پوچھتا۔ ارادہ یہ تھا
کہ دس بارہ روپیہ مین اسکندریہ سے بندر سویس تک ریلوے کے ذریعہ سے پہونچون گا اور سویس سے
کوئی بغلہ دس پندرہ روپیہ مین جدہ تک پہونچا دیگا اور جس وقت جہاز اسکندریہ مین پہونچا اوس وقت
راقم نے بہ نیت صادق اور خالص بارگاہ آلہی کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی اور پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ گردانا اور عرض کیا کہ اب مین نے اپنے تئین خدا اور رسول کی
مہمانی مین سپرد کیا جس طرح سے ہو مجھکو بیت اللہ اور مدینۃ النبی مین پہونچا دے۔ کچھ شبہ
نہین ہے کہ اس روسیاہ کی دعا تیر بہدف ہوئی اور خدا اور رسول نے ایسی مہمانی کی کہ
جس کا مطلق وہم اور گمان بھی نہ تھا یعنی باوصف اس افلاس کے مثل امرا اور دولتمندون
کے دو حج کروائے اور چھ مہینے اقامت مدینۃ النبی مین میسر ہوئی کیا اوس کا سامان باندھا جو وہی
عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ مرا۔ دستور ہے کہ جب جہاز پر چڑھتے ہین تو صندوقون پر
(قریب ہے کہ تم بعض چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے حق مین بہتر ہو)
اسباب کے نام و نشان جہان تک اسباب جائیگا لکھ دیتے ہین۔ بعضے اتفاقیات سے مارسلیس
مین جہاز پر مین اوس وقت پہونچا جب اوس کا لنگر اوٹھتا تھا مہتمین نے جھٹ پٹ
صندوق اوٹھا کے مخزن مین پھینک دیا اوس پر نشان لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ یہ صندوق
اسکندریہ مین اوترین گے۔ اور اوس جہاز پر چین کے مسافر بہت تھے جب لنگر ہوا مین جہاز
پر منتظر کھڑا رہا کہ میرے صندوق خزانہ سے نکلین تو پہچان کے مین لے لون۔ لوگون نے کہا
گھاٹ پر چلو وہین اسباب آتا ہے وہان لے لیجیو۔ گھاٹ پر مین پہونچا تو شام ہو گئی وہان لوگون
نے کہا اب اندھیرے مین اسباب نہین مل سکتا اس وقت جا کے کہین اقامت کرو صبح کو آکے
اسباب لے جانا۔ مین تو شہر مین چلا آیا اور وہان اسباب راتہی کو چین کے مسافرون کے ساتھ

راقم کا بہ نیت صادق و خالص [illegible] خدا اور رسول
[illegible] کی مہمانی [illegible]

راقم کا اسباب بعض غلطی سے چین [illegible] روانہ ہوگیا

ریل پر لد گیا صبح کو پھر گھاٹ پر پہونچ کے اسباب ڈھونڈھا کہین نہ ملا جہاز کی کمپنی کے مہتمم جو اسکندریہ
مین تھے اون کے پاس جا کے ظاہر کیا اونھون نے اوسی وقت قاہرہ اور سویس مین ٹیلیگراف
کے ذریعہ سے خبر بھیجی کہ اس اس طرح کے صندوق فلانے مسافر کا اسباب ہے وہ آگے نہ بڑھے
جہان پہونچے وہین روکو اور مجھ سے کہا تم قاہرہ مین جاؤ تمکو اسباب وہان ملیگا راقم قاہرہ مین آیا
اور وہ اسباب سویس مین بھی نہ روکا جہاز پر لد کے چین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میرے پاس
وہی کپڑے جو بدن پر تھے وہ رہ گئے اور ایک باگ یعنی چمڑہ کا ایک بٹوہ رہا جو میرے گلے مین
تھا اور تیس چالیس روپیہ کی انگریزی اشرفیان اور ایک سونے کی گھڑی وغیرہ جس کا مین نے اوپر
ذکر کیا مصر مین گیارہ بارہ سو روپیہ اوسکے ملتے تھے وہ بھی اوس بٹوہ مین تھی جب مین اسباب سے
مایوس ہوا تب انگریزی کنسل یعنی بالیوز جو قاہرہ مین وکیل التجارت تھا اوسکے پاس گیا ان بالیوز
کا یہی کام ہے کہ جس سلطنت کا بالیوز ہوتا ہے اوس سلطنت کی رعایا کے انفس اور اموال کا محافظ
رہتا ہے اوس سے اپنی مصیبت کا حال بیان کیا پہلے اوس نے کہا کہ ہم کس طرح سے جانین کہ
تم سلطنت برطانیہ کی رعایا مین ہو۔ اتفاقاً لندن سے روانہ ہوتے وقت راقم نے وزیر ہندوستان
کو ایک چٹھی لکھی تھی کہ میری یہان سے نجات کروا دیجئے اونھون نے اوسکے جواب مین یہی
لکھا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اپنے مدعی کے پاس سے تحریری اجازت داخل کر کے جو چاہو کہ
اعانت ہو وہ چٹھی اوسی کیسہ مین چمڑے کے تھی . . . وہ چٹھی مین نے دکھائی اوس کو دیکھ کے وہ مطمئن ہوا
جہاز کی کمپنی کے لوگون سے مواخذہ شروع کیا کہ فلانے شخص کا اسباب منگوا دو اور جب تک
اوس کا اسباب نہ آویگا دس روپیہ روز اوسکے خرچ کے واسطے اور جو کچھ نقصان توقف اور تاخیر سے
یہان ہوگا وہ سب تم کو دینا پڑیگا۔ اب ایک اور اتفاق عجیب ہوا کہ شب کو راقم قاہرہ
مین ایک فرنگی مہمان سرا مین جا کے رہا تھا تین چار اشرفی انگریزی جو بٹوہ مین میرے پاس
تھین وہ کسی نے چرا لین اب میرے پاس ایک حبہ نہ رہا جو روز مرہ کے خرچ کو کافی ہو
مین نے بالیوز سے کہا کہ مین کس طرح سے بسر کرون اوس نے اپنے میر منشی کے ہمراہ

[illegible]

مصطفی پاشا قاہرہ کے گورنر کے پاس بھیجدیا .... جو

اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے اقرباؤن مین تھے کہ سلطانی مسافرخانہ مین ان کو بھیجدو سلطان کی طرف سے

ہر شہر مین مسافرخانہ ہین بہت عمدہ مکانات نہایت تکلف سے فرش و فروش سے آراستہ

ہر قسم کے خدام خدمت کے واسطے اگر سواری کی حاجت ہو گھوڑے کی گاڑیان

سواری کی۔ کھانا پینا بہت عمدہ سرکاری مگر وہان صرف عمائد اور امرا اور شاہزادے

جو مسافرانہ اوس شہر مین وارد ہوون اقامت کرتے ہین۔ عام مسافرخانے نہین ہین مصطفی

پاشا نے فوراً مجھکو وہان بھیجدیا۔ اب یہ پہلا اثر میری اجابت دعا کا تھا کہ کس خوبصورتی

سے خدا و رسول نے میری مہمانی کی مصر کے ممالک مین بہت سرائین ہین قہوہ خانے

ہین کہ وہین لوگ اقامت کرتے ہین دو تین دن اسکندریہ مین او قاہرہ مین اون قہوہ خانون مین

راقم رہا پسوؤن کی کثرت سے مطلق نیند نہ آئی اور فرنگی ہوٹل انگریزی اور فرانسیسی اور اطالیانی جو وہان

ہین وہ البتہ بہت پاک و صاف رہتے ہین لیکن اسکندریہ مین جب جہاز پہونچا اور مین نے دعا کی

جس کا مین نے ذکر کیا اوس وقت یہ بھی نیت کی تھی کہ اب فرنگی کھانے پینے سے مین احتراز کرونگا

جب قہوہ خانون مین وہ تکلیف ہوئی اور مین پھر فرنگی ہوٹلون مین جانے کے لیے مجبور ہوا تو مجھے

نہایت ملال ہوا کہ اللہ تعالے کی مرضی نہین ہے کہ مین اس بدنامی سے بچون اس واسطے کہ اون

سب ہوٹلون کا دستور ہے کہ کوئی اونکے یہان کھانا پینا کھائے یا نہ کھائے وہ کرایہ مع مصارف

کھانے پینے کے مجرا لیتے ہین اور میرے پاس گنجایش بھی مصارف کی نہ تھی اور ظاہر ہے اگرچہ شرعاً

وہان کے کھانے پینے مین کچھ قباحت نہ تھی اور مصر کے لوگ سب باہم مختلط تھے مگر راقم نے اپنے ہندستان

کے دستور کے موافق باقتضاے اِتَّقُوا مِنْ مَوَاضِعِ التُّهَمِ عزم احتراز کا کیا تھا اس سبب سے
تہمتون کی جگہہ سے پرہیز کرو

دل مین بہت ملال پیدا ہوا کہ نقض عہد کرنا پڑا۔ جناب اقدس الٰہی نے وہ سامان کر دیا کہ بمراتب فرنگی

ہوٹلون سے زیادہ وہان آسایش ہوئی اور میرا اسباب چھ مہینے کے بعد سیلان یعنی سرانديپ مین

پہونچ کے وہان سے پھر کے آیا اور مین اسکندریہ مین اواخر جمادی الثانی سنہ مین پہونچا تھا اور

ذیقعدہ اوسی سال تک قاہرہ مین اور وہان رہا ان مسافر خانون مین جو آسایش پائی اوس کے ادائے شکر کی زبان کہان ہے خصوص ماہ مبارک رمضان مین افطاری اور کھانا اور سحری کس کثرت سے آتی تھی عمدہ عمدہ کھانے میٹھے اور سلونے تر کی آتے تھے جو راقم اکیلا تن تنہا کھا پیتا تھا وہی خرچ تھا باقی سب مسافر خانہ کے خدام کو نصیب ہوتا تھا اوسی عرصہ مین قاہرہ کے بالیوز نے میری درخواست پھر وزیر ہندوستان کے پاس بھیجی اور میری زحمت اور تکلیف سے اطلاع دی۔ ظاہر مین پہلے اونھون نے انکار مطلق میری اعانت سے کی مگر بالیوز کو خدا جانے کچھ مخفی کیا لکھا آیا کہ وہ مجھ سے اصرار کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تم اب ہندوستان مین نہ جاؤ وہان تم جا کے خوش نہ ہوگے قسطنطنیہ کا سفر کر آؤ وہین کچھ فکر اپنے معاش کے پیدا کرنے کی کرو مجھ سے جو اعانت ممکن ہے وہ کرونگا۔ مین نے جواب دیا کہ مین حج کر آؤن پھر جیسا مناسب ہوگا وہ کرونگا اور اوسی بالیوز کی معرفت وہی گھڑی وغیرہ اپنا اسباب پانسو روپیہ پر مین نے رہن کیا جسکے سبب سے چھ مہینے مصر کے ایام قیام مین سب اپنے مصارف بالائی امیرانہ مین کرتا رہا اور وطن مین اپنے عزیزون کو اطلاع کی کہ جلد میری کچھ اعانت کرو تاکہ مین وطن مین پہونچون اور جب اسباب سب سرندیپ سے پھر کے آیا تو کچھ تھوڑا سا پشمینہ باقی رہ گیا تھا اور پانسو روپیہ جو اسباب رہن کر کے ہاتھ آئے تھے وہ سب خرچ ہوگئے

بالیوز نے وزیر ہند کے خط پہونچنے کے بعد دوستانہ مجھ سے اصرار شروع کیا کہ ہندوستان مین نہ جاؤ تمکو ہندوستان پسند نہ آئیگا قسطنطنیہ کا سفر کر آؤ۔ مین تمھاری اعانت کرونگا

اب ذیقعدہ کی پچیسوین یا چھبیسوین راقم نے ارادہ جدہ کی روانگی کا کیا اوسی انگریزی بالیوز نے خدیو مصر کا حکمنامہ ایک جہاز بخاری پر جو مصری جہاز سویس سے جدہ تک آتے جاتے ہین اور ایک ریلوے کے مہتمم پر جو قاہرہ سے سویس تک تھی لکھوا کے منگوا دیا۔ الغرض راقم بہت آسایش سے پہلے درجہ کی ریل پر سویس تک پہونچ وہان دو تین دن توقف ہوا پھر جہاز پر سوار ہوا چوتھی یا پانچوین ذی الحجہ کی جدہ مین پہونچا اور وہان سے ایک دن یا دو دن پیشتر اون کے جس دن امیر الحاج عرفات کی طرف روانہ ہوگا مکہ معظمہ مین داخل ہوا وہ قلیل پشمینہ قاہرہ مین ڈیڑھ یا پونے دو سو

انگریزی بالیوز نے حکمنامہ خدیو مصر کے سویس تک ریل کے واسطہ اور وہان سے جہاز بخاری کے واسطے جدہ تک منگوا دیا

روپیہ کو پہنچا تھا کہ جہاز کے اور ریل کے کرایہ کے سوا اور مصارف بالائی مین کام آئے تین چار روپیہ
میرے پاس باقی تھے۔ اب نہایت تشویش ہوئی کہ وہ سفر حج کے واسطے کافی نہ ہون گے
اگرچہ بہت سے لوگ وہان اہل تعارف سے موجود تھے جن سے درخواست قرض کی کیجاتی روپیہ
مل جاتا مگر حمیت اور غیرت مجاز کسی سے طلب کے نہین کرتی تھی۔ مجبوری سے ایک بڑے تعلقہ دار
علیگڈھ کے علاقہ کے وہان مہاجر ہو کے رہے ہین اون کے پاس مین گیا کہ اون سے کچھ قرض مانگونگا
وہان پہونچ کے پھر حمیت مقتضی طلب کی نہ ہوئی اور ذہن مین یون گذرا کہ مفلسانہ پیادہ پا چل کے
حج کرو کسی سے کچھ طلب نہ کرو یہ دل مین تصور کر کے اوٹھ کھڑا ہوا۔ اوسی وقت ایک شخص نے آکے
خبر دی کہ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مغفور کے پاس ایک ہزار روپیہ کی ہنڈوی میرے گھر
سے میرے مصارف کے واسطے آئی ہے مولوی صاحب ممدوح حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ
کے نواسہ مولوی اسحاق صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی وہان مہاجر ہو کے جا رہے تھے اور سارے
اہل ہند کے بہت سے امور مین حاجت روا رہتے تھے اور راقم جا کے اونھین کے گھر مین فروکش ہوا
تھا الغرض اس روپیہ کے پہونچنے سے جو وہ ایک اور اثر میری اجابت دعا کا تھا راقم نے نہایت آسایش سے
جا کے حج کیا اور حج سے فراغت کر کے اواخر محرم ۱۲۸۱ھ مین مدینہ منورہ کی عزیمت پر روانہ ہوا جو قافلہ
حج کر کے وہان جاتا ہے دستور ہے کہ اکثر آٹھ روز وہان اقامت رہتی ہے تا کہ چالیس نماز جو حدیث
شریف مین واقع ہوئی ہین وہان ادا کرین راقم نے جو روپیہ وطن سے آیا تھا نصف اوس مین سے
جناب مولوی یعقوب صاحب ممدوح کے پاس امانت رکھا اور نصف لے لیا کہ حج کے سفر مین مدینہ
منورہ کے سفر مین خرچ کرونگا اس نیت پر کہ وہ نصف بقیہ معاودت کے واسطے ہندوستان مین کافی
ہو ہلال صفر کا شاید مکہ معظمہ یا مدینہ شریفہ کے راستہ مین دیکھا گیا دوسرے یا تیسرے دن مکہ معظمہ سے
روانگی کے مین قضاے حاجت کے واسطے اونٹ پر سے اوترا ساربان جو بدوی لوگ ہین اون کا
عجیب دستور ہے کیسی ہی ضرورت ہو قافلہ سے جدا کر کے ایک اونٹ کو نہین روکتے ہین راقم قضاے حاجت کے واسطے
جو اوترا اونٹ میری سواری کا رکا نہیں مین قافلہ سے الگ ہو گیا پھر قافلہ مجھے نہ ملا مین جنگل مین ادھر اودھر بھٹکا

سے یہان کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے

آخرش کئی شیخ بدویون کے یہ خبر سن کے میری تلاش کے واسطے نکلے کہ وہ اونکا ایک شکار تھا اونمین سے ایک شیخ مجھے پکڑ لیگیا راقم کے پاس جیب مین چند ریال تھے۔ وہان مشہور ہے کہ بدوی لوگ جس قافلہ گم کردہ کو پکڑ لیجاتے ہین صرف کپڑے وغیرہ جو اوسکے پاس ہین چھین نہین لیتے بلکہ اوس کو قتل کر ڈالتے ہین یا کہین بیچ لیتے ہین سر رستہ مین اوس شیخ نے جب مجھے پکڑا مین نے کہا میرے پاس یہ چند ریال ہین اور میرے کپڑے ہین یہ لیلو اور مجھے قافلہ مین پہونچا دو۔ اوس نے کہا نہین تم ہمارے ساتھ چلو مین نے کہا کیا تم کو میرا خون ناحق کرنا منظور ہے اوسکے جواب مین اوس نے کہا استغفر اللہ ایسا ہم نہین کرینگے رستہ مین اور دو تین شیخ اونٹون پر سوار آکے اون کے شامل ہو گئے اون کو یہ شیخ جو میرے میزبان تھے شریف کہتے تھے یعنی وہ سید تھے۔ غرض وہ شیخ مجھے اپنے خیمہ صحرائی مین لیگیا اور وہان پہونچ کے ایک شخص کو بھیجا کہ ہمارے قافلہ مین اطلاع کرے کہ قافلہ گم کردہ آدمی یہان موجود ہے۔ اس حکایت کو جس نے سنا بہت تعجب کیا واللہ سب ہمارے قافلہ کے لوگ میری طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بدویون کا صحیح و سالم مجھکو چھوڑ دینا اور خود قافلہ مین اطلاع کر بھیجنا یہ بھی اثر اسی میری دعا کا تھا کہ جناب اقدس الٰہی تعالےٰ شانہ نے اون کے ہاتھ سے میری حفاظت کی جب قافلہ چند میل اوس مقام سے جہان مین تھا پہونچا بدوی لوگ جو ہمارے قافلہ کے ساربان تھے وہان آئے اور جب شام کو قافلہ نے کوچ کیا تو وہ مجھے ہمراہ لیکے قافلہ کے شامل ہوئے اور اوس شیخ نے میری بہت مدارات کی اور بدوی جو وہان تھے وہ مجھ سے کہتے تھے کہ تم بڑے خوش نصیب ہو جو اس شیخ کے ہاتھ آئے والا اور لوگ تمھین آخر کر ڈالتے وہ لوگ جن کو ہمارے شیخ شریف کہتے تھے وہ استہزاءً مجھ سے کہتے تھے ہم تم کو قتل کر ڈالین مین کہتا تھا ہم تمھارے قابو مین ہین جو چاہو سو کرو بعد اوسکے وہی شیخ اوٹھے اپنے دوسرے خیمہ مین جا کے ایک بڑی سینی مین باجرے کا ملیدہ دودھ مین بنا کے لائے اور اوس مین ایک سیر بھر گھی چھوڑ دیا جتنے لوگ وہان جمع تھے سب کے آگے رکھدیا مجھکو بھی شریک کیا شام کے قریب جب مجھے رخصت کیا تین چار ریال جو میرے پاس تھے راقم نے اون کے نذر کیے اور وہان سے اپنے بدویون کے ساتھ قافلہ مین آکے شامل ہوا سب لوگ قافلہ کے

بہت خوش ہوے اور ہر ایک میری حفاظت سے نہایت متعجب تھا کہ بدویون کے قبضہ مین جاکے زندہ رہنا یا کہین بک نہ جانا ایک امر عجائبات سے ہے - بعضے شیوخ ہندی جو قافلہ مین تھے اور میرے گم ہونے سے دست افسوس ملتے تھے اور دعا کرتے تھے اونکے مریدین اور معتقدین میری حفاظت کو اونکی کرامات پر محمول کرتے تھے غرض قافلہ جسکے ساتھ راقم تھا دسوین یا بارھوین دن مدینہ منورہ مین پہونچا اور چونکہ دستور ہے جو قافلہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو جاتا ہے ساربانون کے اختیار مین رہتا ہے اس واسطے کہ اونٹون کا کرایہ آمد و رفت دونون کا لیا کرتے ہین اور اکثر وہ روپیہ کرایہ کا پیشگی لے لیا کرتے ہین پھر جب مدینہ منورہ مین پہونچے تو جو تاریخ وہان سے معاودت کی ساربان لوگ معین کر دیتے ہین اوسی تاریخ سارا قافلہ جمع ہو جاتا ہے کبھی آٹھ دن کبھی کم یا زیادہ جو اون بدویون کو مصلحت معلوم ہوتی ہے اوسکے بموجب زائرین مجبور اونکی اطاعت کے رہتے ہین راقم جب مدینہ منورہ مین پہونچا اور مشرف زیارت سے ہوا تو دل یہ چاہتا تھا کہ وہان زیادہ توقف کرے مگر زاد و راحلہ کی کمی کے سبب سے علے الخصوص مدینہ منورہ مین جو ساتھ لیگیا تھا اوسمین کچھ قلیل باقی رکھیا تھا نصف اوس کا جو وطن سے روپیہ آیا تھا مکہ معظمہ مین چھوڑ گیا اور افکار اپنی معیشت کے اور اہل و عیال کے ظاہر مین مانع بہت توقف کے تھے مگر جو تھے یا پانچوین دن اوس بلدہ متبرکہ مین پہونچنے کے موافق دستور کے پانچون وقت کی نماز مسجد نبوی مین علی صاحبہا الف الف تحیۃ و سلام ادا کرکے جب مواجہہ شریف کے سامنے دعاے زیارت پڑھنے کو لیا تب راقم نے نہایت تضرع و زاری سے روح مبارک کی طرف متوجہ ہو کے دعا کی کہ آج شب کو مین دعاے استخارہ پڑھونگا اس نیت پر کہ ... جو میرے حق مین دین اور دنیا کے لیے بہتر ہے مجھکو صاف صاف بلاتعبیر کے خواب مین حکم ہو جاے کہ یہان مین اقامت کرون یا قافلے کے ساتھ معاودت کرون اور اوسی شب کو وہ عمل استخارے کا جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قول جمیل مین لکھا ہے وہ پڑھا اور جناب مولانا عبد الرشید مدظلہ بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین مولانا احمد سعید بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین حضرت شاہ ابو سعید خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی

[حاشیہ: راقم کا استخارہ کرنا دیار حرمین مین اقامت کرون یا معاودت کرون ... جواب مین حکم ...]

خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ مظہر جانجانان قدس اللہ اسرارہم کے جو وہان مہاجر ہو کے رہے ہین
اونھون نے تبلایا تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بقدر اوس کے اعداد جمل کے جو پڑھ کے سو دے وہ
اپنے مطلوب پر خواب مین آگاہ کیا جاتا ہے وہ بھی اوس عمل کے ساتھ ضم کیا اوسی شب کو مین نے
خواب مین دیکھا کہ ایک گھوڑا سبز رنگ معہ ساز و یراق میری سواری کے لیے کھڑا ہے اور مین سوار
ہونے کا ارادہ رکھتا ہون کہ کسی شخص نے پکار کے کہا جسکی مین نے غالباً صورت نہین دیکھی کہ رسول اللہ
جانے اور سوار ہونے کو منع فرماتے ہین مین اپنے عقیدہ مین یہ نعمت عظمی بہ تصدق رسول مقبول
صلے اللہ علیہ الف الف تحیۃ و سلام اپنے اوپر سمجھتا ہون جو استخارے کے جواب مین مجھے ارشاد ہوا اور
جو دعا اور آرزو نہایت تضرع اور زاری سے جہاز سے فرنگستان کے سفر کے اوترکے راقم نے کی تھی کہ
اپنے تئین دعوت اور مہمانی مین خدا اور رسول کے سپرد کیا تھا اس طرح کی میری دعوت اور مہمانی
اس دار دنیا مین ہوئی کہ اوس سفر حج مین ایسی راحت اور آسایش سے بسر ہوئی کہ بڑے دولتمندون
کی بھی بسر نہ ہوئی ہوگی اور اس روسیاہ نالایق اور ہیچکارہ کو حکم ہوا اور اجازت قیام کی مدینۃ النبی
مین ملی اور بہت امیدواری فوز و فلاح آیندہ کی حاصل ہوئی اسی طرح سے مجھے امید اور آرزو ہے
کہ عقبے مین بھی مقبول ہو جاؤن اور عاقبت میری بخیر ہو اس طرح کا جواب صاف صاف پہلی شب
مین استخارہ کرنے کے جس نے سنا نہایت تعجب کیا اس واسطے کہ اون استخارون مین آٹھ آٹھ نو نو یا کم
اور زیادہ شبون مین ایسی خوابین نظر آتی ہین کہ تعبیر اور تاویل سے لوگ اپنا مطلب سمجھتے ہین یا آلعالمین
برکات اوس کے اور جو جو عزت اور حرمت مجھکو وہان حاصل ہوئی جب تک دنیا مین زندہ ہون
اور عقبے مین بعد مفارقت روح کے بدن سے میرے اوپر دایم اور قایم رہے واللہ ہو المؤید و المستعان
لِکُلِّ رَاجٍ غَایَۃُ الغرض راقم چھ مہینے کامل مدینہ منورہ کے قیام سے مشرف رہا اور پنجگانہ نماز مین
اول جماعت مین مسجد نبوی کے اداکین اور موافق وہان کے دستور کے ہر نماز کے بعد مواجہہ
شریف مین دعاے زیارت پڑھا گیا جو جو فیوض اور برکات وہان حاصل کیے شرح اوس کی
مصلحت نہین ہے چند مرتبہ خواب مین بھی مشرف زیارت کا ہوا۔ پہلے سعادت شرکت مجلس

[illegible]

دوازدہم ربیع الاول میں حاصل ہوئی اور رجبی کی مجلس مین جو ستائیسوین رجب کی معراج کے ذکر
کے واسطے ہوتی ہے شریک ہو کے مشرف ہوا اور سب خلفا اور ایمہ کے عرسون مین جو مختلف
مہینون مین ہوتے ہین شریک رہا۔ حضرت امیر حمزہ کے عرس کے بعد جو ستائیسوین رجب سے شروع
ہو کے پانچ چھ دن تک اوس کا مجمع بطور میلہ کے ہوتا ہے وہان سے مکہ معظمہ کے عزم پر روانہ ہوا
برشتگی طبیعت کی اوس بلدۂ طیبہ اور مناسک معظمہ کی مفارقت سے اور حرمان نصیبی سے جو حاصل
ہوئی اور کیفیت بے اختیاری گریہ وزاری کی جو ہنگام رخصت مین پیش آئی یاد اوس لذت سوز و گداز
کی اب خواب وخیال ہو گئی آرزو یہ ہے کہ انفاس بقیہ چند پھر وہین بسر ہون افسوس ہے کہ تعلقات
دنیاوی علایق اور عشایر کے سنگ راہ ہوے والا ایام قیام حرمین شریفین کے ایک برس اور دو
مہینے کے قریب جس راحت اور آسایش اور بے فکری مین گذرے مدۃ العمر اس ستر برس مین کبھی
نصیب نہین ہوے تھے اس کا مقتضا یہ نہ تھا کہ یہ چند انفاس باقیہ کہین اور بسر ہون مگر وطن کے
آب و دانہ نے نہ چھوڑا اور اون برکات سے محروم کیا۔ غرض ہلال شعبان ۱۲۸۱ھ کا
دوسری یا تیسری منزل مین اوس بلدۂ طیبہ سے روانہ ہو کے دیکھا غالبا چھٹے دن وہان سے
روانگی کے سفر خشکی ترک کیا اور ایک بغلہ کرایہ کر کے لنگر بحر عرب مین اوٹھایا۔ اس کا
سبب یہ ہوا کہ اس تین چار دن کے سفر خشکی مین ایک مصیبت عظیم پیش آئی۔ ایک
منزل مین جس کا نام سہو ہو گیا ہے ایک قلعہ تھا وہان کچھ فوج ترکی مامور تھی بدوی ساربان جو
ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے کنوین سے پانی بھرنے مین اون سے اور ترکی لشکریون سے کچھ تکرار
ہوئی منازعت زبانی منجر جنگ وجدل کی طرف ہوئی دونون طرف سے بندوقین چلنا شروع
ہو گئین بیچ مین قافلہ ایک طرف ترکی فوج مہذب دوسری طرف جنگلی بدوی قریب دو گھنٹہ
کے مار دھاڑ رہی کتنے قافلہ کے مرد اور عورت کا خون ناحق ہو گیا بعضے مجروح ہوے ایک
حافظ بیچارے یا دش بخیر مولوی عبد القیوم صاحب کے بیٹے کو قرآن شریف حفظ کرواتے تھے اور
اکثر تمنا شہادت کی کیا کرتے تھے ہم چند آدمی ایک ہی جگہ پر بیٹھے تھے وہ حافظ بھی ہمارے ساتھ

[illegible]

بیٹھے تھے .... ایک گولی اونکے آکے لگی وہ بیچارے شہید ہو گئے آخرش ترکون نے رحم کرکے
ہاتھ کو روک لیا والا بدویون نے تو سارے قافلہ کو تمام کر دیا تھا غرض دو گھنٹہ کے بعد امن ہو گیا
جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے مثل اور حفاظت اور عنایت اور شفقت کے اس مصیبت مین
بھی اس روسیاہ کو محفوظ رکھا والا بہت سی گولیان سر پر سے اور داہنے اور بائین دونون طرف
نکل گئین ساری رات اور وہ دن الامان اور توبہ اور انابت مین گذرا صبح کو دوسرے دن پھر
کوچ ہوا قافلہ کے بہت سے لوگون نے اس خوف سے کہ پھر رستہ مین مبادا ترکی فوج سے جو جابجا
قلعون مین مامور تھی اور بدویون سے بکھیڑا ہو جائے خشکی کا سفر ترک کیا جس بغلہ پر راقم سوار ہوا اوسی
پر چند اپنے احباب بجنس مثل مولوی عبد القیوم صاحب سلمہ اللہ تعالے مولانا عبد الحی مغفور کے بیٹے اور مولانا
اسحاق حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے نواسہ کے داماد مع اپنے اہل و عیال کے بھی سوار ہوے لیکن
جس دن سے بغلے نے لنگر اوٹھایا برابر ہوا مخالف رہی دسوین یا یارھوین دن بہت صعوبت سے
بندر جدہ مین لنگر ہوا دو ایک دن اونٹون کی تلاش مین وہان اقامت رہی آخرش اواسط
شعبان مین مکہ معظمہ مین بخیریت داخل ہوے مشفقی حاجی سعید بخت سلمہ اللہ تعالے سوات
کے ایک بڑے زمینداروں مین مہاجر ہو کے امیرانہ وہان رہتے تھے پہلے سال
مین بھی بعد فراغت کے حج سے جو پندرہ بیس دن وہان اقامت ہوئی تو وہ مبالغہ ہو کے
اپنے مکان مین راقم کو اوٹھا لیگئے تھے اب کے دفعہ بعد معاودت کے مدینہ طیبہ
سے پھر وہ مبالغ ہوے اور راقم اونھین کے ہمخانہ ہوا اور پیشتر سے اونھون نے اب زیادہ محبت
یہ کی کہ راقم کو الگ کھانے پینے کا بندوبست نہ کرنے دیا لیکن حساب دوستان در دل برات نہ اید
اونکے مصارف سے ایک لبادہ قاقم کا جو لندن مین چھ سات سو روپیہ مین راقم نے تیار کروایا
تھا اور وہ بھی لندن کے مال مسروقہ مین تھا جو اسباب میرا چوری ہو گیا تھا مگر بعضی اور چیزون
کے ساتھ وہ مل گیا تھا وہ ہدیتہً راقم نے اون کو نذر کیا۔ رمضان شریف سنہ ۱۲۸۱ھ کا مکہ معظمہ مین بہت
خیریت سے گذرا آٹھ ساعت عمر کے اوس ماہ مبارک مین ملا دائیے اور اوس سال کا حج جو میرے قسمت سے

بسبب اوس مصیبت کے خشکی مین بحری سفر اختیار کیا ہوا کی مخالفت سے دسوین یا یارھوین دن بندر جدہ مین لنگر ہوا۔ اواسط شعبان مین مکہ معظمہ مین داخل ہوے

حج اکبر واقع ہوا یعنی روز حج روز جمعہ تھا بخیر وخوبی ادا ہوا - عجیب اتفاق ہوا کہ جب امیر الحاج نے حج
کے واسطے کوچ کیا مجھکو سواری نہ میسر ہوئی اور باوصف یسر کے حج مسنون یعنی پیادہ پا کرنا پڑا
مکہ معظمہ سے منا تک پیادہ پا گیا چونکہ اوس مین بہت بڑا ثواب ہے تصور ہوا کہ یہ بھی فضل اور عنایتون
کے ہے جو اوس سفر مین میرے اوپر جناب اقدس الٰہی کی مبذول ہوئی ہین - لیکن بسبب ضعف
سن کے متحمل اوس کا نہ ہو سکا - منا مین کچھ زیادہ خرچ کرنے سے ایک اونٹ کرایہ کا
عرفات تک دونون آمدورفت کے واسطے مل گیا - شکر الٰہی جس کی طاقت ادا کی ہرگز
نہین ہے بجالایا اور نصف حج پیادہ پا ہوا - جب حج سے فراغت ہوئی منا مین پھر کے
آئے وبا ہیضہ کی شروع ہوئی اوس کے زور وشور کا کچھ بیان نہین ہو سکتا پندرہ بیس
دن تک بازار ملک الموت کا ایسا گرم رہا کہ العیاذ باللہ ہزارون آدمی آخر ہو گئے - بہت سے
ہمخانہ اور ہمصحبت لوگ کوچ کر گئے ہزارون آدمی بہت سے مناسک مسنون حج کے چھوڑ کے
معاودت کر گئے اوسی حالت مین ایک مرتبہ راقم بھی اسہال مین مبتلا ہوا کہ نوبت وصیت نامہ بھی
لکھنے کی پہونچی لیکن اس مصیبت سے بھی جناب اقدس الٰہی نے نجات دی ایک شب
کو ایک بزرگ کے دفن کرنے کے واسطے جنت المعلےٰ مین اتفاق جانے کا ہوا چونکہ وہان
لاشون کو بہت ہی اوتھلا غار کھود کے دبا دیتے ہین ہزارون لاشین گویا زمین پر رکھی ہوئی ہین
تھین شدت تعفن سے میری عجیب کیفیت ہو گئی کہ معاودت دشوار ہوئی غش کی صورت
پر مکان مین پہونچ کے مین گر پڑا عشا کی نماز کے واسطے حرم مین جانے کی نوبت نہ آئی - شاید آدھی
رات کو اقامت گاہ مین اوٹھ کے نماز پڑھی - بالجملہ اواخر محرم ۱۲۸۳ھ مین معاودت کے
ارادے سے مکہ معظمہ سے روانہ ہو کے جدہ مین آیا - یہان قریب ایک مہینے کے اوس
اسباب کے بندوبست کے واسطے جو قاہرہ مین راقم رہن کر کے آیا تھا توقف ہوا پہلے
ارادہ تھا کہ خود مصر مین جا کے اور اسباب رہن سے نکال کے وہین سے جو جہازات
بخاری ہندوستان کو آتے ہین اون پر سوار ہو کے روانہ ہون مگر کچھ روپیہ کا بندوبست نہ ہو سکا

مکہ معظمہ سے حج کی روانگی کے وقت سواری بہم نہ پہونچی نصف حج پیادہ پا ادا ہوا حج اکبر تھا

عرفات سے جب معاودت ہوئی ہیضہ کی وبا شروع ہوئی ایک دن درست آئے لیکن الحمد للہ محفوظ رہا

اواخر محرم ۱۲۸۳ھ مین راقم وطن کے ارادہ سے مکہ معظمہ سے روانہ ہو کے جدہ مین آیا

آخر ایک تاجر حاجی قاسم نام میمند تھے اون کے ساتھ بندوبست کیا کہ وہ اسباب منگوا کے بمبئی مین بھیجدین گے اور اس نظر سے کہ ارباب اقتدار سلطنت کے مبادا یہ شبہہ کرین کہ مین کلکتہ مین پہونچ کے پھر بادشاہ کو پارلیمنٹ مین مرافعہ کے واسطے بہکاؤنگا کلکتہ جانے کا عزم موقوف کیا منتظر تھا کہ کوئی بخاری جہاز بمبئی کا جانے والا ملے تو اوس پر سوار ہون۔ اتنے مین جناب مولوی عبد القیوم صاحب مع اپنے اہل و عیال کے بھی معاودت کے ارادہ پر جدہ مین آئے اور ایک بادبانی جہاز پر اونھون نے بندوبست روانگی کا کیا اون کی رفاقت اور مصاحبت کی نظر سے راقم نے بھی اوسی جہاز پر ایک کمرہ لیا۔ ربیع الاول کے شروع مین جہاز نے جدہ سے لنگر اوٹھایا اور پچیس روز مین بمبئی مین داخل ہوا۔ چونکہ عین ایام بارش کے تھے اور اوس سال برسات بہت زور شور کی ہوئی۔ اور جب تک ریلوے کی سڑک طرف بمبئی سے برہان پور تک جاری ہوئی تھی برہان پور سے آگے رستہ بہت خراب تھا لاچاری سے قریب تین مہینے کے بمبئی مین توقف ہوا اور آخر جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ مین بمبئی سے ریلوے کے ذریعہ سے برہان پور تک پہونچا یہان سے بمعیت مولوی عبد القیوم صاحب کے خشکی کا سفر اختیار کیا بھوپال مین آیا وہان دو تین ہفتہ تک توقف ہوا بعد اوس کے کرانچی کی ڈاک پر آگرہ مین پہونچا وہان سے ریلوے کے ذریعہ سے کانپور مین آیا۔ کانپور سے لکھنؤ تک جب تک ریل نہین تیار ہوئی تھی گھوڑے کی گاڑی کی ڈاک پر چوتھی شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۳۔ دسمبر ۱۸۶۵ع وطن مین داخل ہوا چونکہ بعد سلطنت اودھ کی ضبطی کے حکم تھا کہ سب بادشاہی نوکرون کو پنشن دیا جاے اس سبب سے راقم نے اپنی طرف سے اور اپنے بڑے بیٹے مولوی فریدالدین خان سلمہ اللہ تعالے کی طرف سے پنشن کی درخواست کی مدت تک اوس کا جھگڑا پڑا رہا آخرش یہ درخواست منظور ہوئی۔ لارڈ لارنس گورنر جنرل تھے اور عجب طرح کا اتفاق ہوا کہ جب راقم لندن مین تھا لارڈ موصوف وزیر ہندوستان کے ایک مشاورین مین تھے اور راقم وزیر ہندوستان کے محکمہ مین اکثر جاتا تھا چونکہ لارڈ ممدوح سے ہندوستان مین کبھی شناسائی اور تعارف نہ تھا مین اونکے پاس

جدہ سے شروع ربیع الاول مین بادبانی جہاز پر راقم سوار ہوا۔ ۲۵ دن مین بمبئی پہونچا۔ تین مہینے وہان توقف ہوا

۴ شعبان ۱۲۸۲ھ کو راقم وطن مین پہونچا

کبھی ملاقات کے واسطے نہین گیا اور ظاہر امزاج اون کا بہت خوشامد طلب ہے۔ یہ امر اون کو
ناگوار ہوا۔ جب اون کے پاس میری ۵ درخواست پنشن کی۔ اور ایک دوسری درخواست اس
مضمون کی گذری کہ میرا دعوے بادشاہ اودھ پر چار لاکھ روپیہ کا ہے اور ایکٹ ۲۳ سنہ ۱۸۶۸ء کا نفاذ
پایا ہے کہ کسی طرح کا کوئی دعوے بادشاہ پر بدون اجازت خاص گورنمنٹ کے کسی عدالت
مین مسموع نہ ہوگا اس واسطے مین امیدوار ہون یا خود گورنمنٹ میرے دعوے کو اونکے اوپر فیصلہ
کرے یا مجھے اجازت دیوے کہ مین عدالت مین نالش کرون۔ مجھے یقین ہے کہ لارڈ ممدوح نے
اوسی نارضامندی کے سبب سے جو میری طرف سے اون کے دل مین تھی میری دونون درخواستون
کو نامنظور کردیا۔ اگرچہ راقم نے اوس کا مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس بھی کیا مگر کچھ وہان بھی اب
تک شنوائی نہ ہوئی۔ شرح اور تفصیل اپنی تباہیون کی جو اس سلطنت کے ارباب اقتدار کی
عدم توجہ سے میرے حال پر ہوئی بسبب یاس کلی کے کسی نتیجہ خیر سے عبث اور فضول
ہے اور اصل وہی ہے جو اوپر ایک جلیل القدر کا قول راقم نے نقل کیا ہے کہ بادشاہ اودھ
کے مقدمہ مین لندن مین بعضے تصانیف جو راقم نے چھاپ کے مشتہر کئے تھے وہ باعث
میرے حال پر شفقت اور رحم نہ کرنے کے ہوئے اور بادشاہ والاجاہ اودھ جنھون نے
راقم کو ان مصایب مین گرفتار کیا اون کی عقل اور فطانت اپنی سلطنت کھو ضایع کرنے سے ظاہر ہے
اون سے کچھ امید بہبود کی رکھنا طول امل سے بھی کچھ بڑھکے ہے ایسی حالت مین بجز قہر درویش
بر جان درویش اور کچھ نہین ہے اور کسی سے محل شکایت نہین ہے بجز اپنی تقدیر کے کبھی ایسا تصور
ہوتا ہے کہ اگر مین لندن نہ جاتا تو بہتر ہوتا کہ اتنی تباہی نہ آتی پھر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی عَسٰی اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تھا غدر کا عہد چونکہ مصالح سلطنت اندھا عہد تھا کچھ تعجب نہین ہے
کہ لوگ پھانسی پر چڑھا دیتے اس حفاظت کے واسطے آب ودانہ نے وہان کھینچا تھا۔ غرض اس عالم
اسباب مین لاکھون تدبیرین معاش پیدا کرنے کی ہین مثل مشہور ہے پاے مرا لنگ نیست ملک خدا
تنگ نیست جب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین محض عنایت اور شفقت الٰہی سے مین مایوس نہین ہون

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۴
جون سنہ ۱۹۲۸ء

خان جہاں لودی

تمہید محمد بن قاسم علیہ الرحمہ کی فتوحاتِ ہند سے لیکر سلطان شہاب الدین غوریؒ کی وفات تک ہندوستان کے شمالی و مغربی صوبے اکثر مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہے لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک الگ مستقل سلطنت قطب الدین ایبک کے زمانے سے شمار کی جاتی ہے۔ قطب الدین ایبک۔ شمس الدین التمش۔ غیاث الدین بلبن اور اُنکی اولاد کا دورِ حکومت ختم ہو کر خاندان خلجی ہندوستان کی فرماں روائی پر فائز ہوا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کی شہنشاہی کا نمبر آیا۔ ان تینوں فرمانروا خاندانوں کے عہدِ سلطنت میں وزیر اعظم کو الغ خاں کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ الغ خاں ترکی زبان کا لفظ ہے جسکا ترجمہ سردار اعظم، خان جہاں، خان خاناں، خانِ اعظم، مسند عالی، حضرتِ اعلیٰ وغیرہ الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ حملۂ تیمور نے جب خاندان تغلق کا خاتمہ کر کے ایک نئے مجہول النسب خاندان کو فرمانروائی کا موقع [دیا] تو اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ خضر خاں نے اپنے آپ کو تیمور کا وائسرائے قرار دیکر اپنا لقب [م]سند عالی تجویز کیا۔ مسند عالی خضر خاں کے بعد اُسکے بیٹے نے ایک خود مختار اور مطلق العنان پادشا[ہ کی] حیثیت سے تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ لیکن الغ خاں کا ترکی خطاب پھر ہندوستان میں نہیں [س]نا گیا۔ اس خاندان کے بعد لودیوں کی حکومت شروع ہوئی تو ایک ہی وقت میں کئی کئی شخصوں کو [مس]ند عالی، خان خاناں اور خان جہاں کے خطابات ملے۔ سکندر لودی اور ابراہیم لودی کے [عہ]دِ حکومت میں کئی خان خاناں، کئی مسند عالی، اور کئی خان جہاں تھے۔ خان جہاں کا خطاب

ں کے زمانے سے شروع ہوکر شاہجہاں کے عہد حکومت تک رائج اور باقی رہا۔ یہ خطاب مغلوں
ہد حکومت میں اگرچہ اعلیٰ درجہ کے خطابوں میں شامل تھا لیکن وزیر اعظم یا نائب السلطنت کا
اس میں باقی نہ رہا تھا۔ وزیر اعظم کو خان خاناں، امیر الامراء اور وکیل سلطنت وغیرہ
سے یاد کیا جاتا تھا۔ جہانگیر نے پیر خاں ابن دولت خاں کو خان جہاں کا خطاب دیا اور
ستان کی تاریخ میں یہی جہانگیری خان جہاں سب سے زیادہ مشہور اور خاں جہاں لودھی کے
ے معروف ہے۔ کسی دوسرے خان جہاں کی شہرت اس جہانگیری خان جہاں کی شہرت کے
بھی نہیں۔ علم تاریخ کے طلباء کی مجلس میں جب کبھی خان جہاں کا لفظ کسی کی زبان پر آتا
اس سے سوائے اس جہانگیری خان جہاں کے کوئی دوسرا شخص مراد نہیں لیا جاتا۔ لیکن باوجود
رت کے بہت ہی تھوڑے لوگ ہونگے جو خان جہاں کے تفصیلی حالات سے واقف اور اُسکے
بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج الناظر کے قرضہ کے ساتھ ہی
یہ بھی جو خان جہاں کا مجھ پر واجب ہے ادا کر دوں اور اپنے دوستوں کو جہاں تک ممکن ہو،
ہاں لودھی کی اصل تصویر دکھادوں۔ عہد آخر یعنی ہمارے زمانے کے بعض مورخین نے خانجہاں
کی نسبت یہ لکھ کر کہ وہ ایک مجہول النسب اور کسی رذیل قوم کا آدمی تھا اپنی ناواقفیت اور
کا اظہار کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں آج تک اپنے آپ کو خان جہاں لودھی کا مقروض
ہا۔ اور یہی سبب ہے کہ اسوقت سب سے پہلے خان جہاں کے خاندانی حالات پر ایک سرسری
تا ہوں۔

ر لودھی

جس زمانے میں سامانی سلطنت کے دربار بخارا کی ماتحتی سے جدا ہوکر افغانستان
میں الپتگین ایک الگ خودمختار حکومت قائم کر رہا تھا اُس زمانے میں قرامطہ بحرین
اپنا کام افغانستان میں شروع کر چکے تھے۔ مصر فاطمیوں یعنی عبیدیوں کے قبضے میں آچکا تھا
بغداد کے عباسی خلفاء پر دیلمی خاندان مستولی تھا۔ ایسی حالت میں کوہ سلیمان اور افغانستان کے
ں قرامطہ کے ملحدانہ خیالات اور اباحتی مذہب کا شایع ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سبکتگین
فزوں طاقت سے خائف ہوکر لاہور کی ہندو سلطنت کا حمید خاں لودھی کے ملتان پر قابض
ہو جانے کو جائز رکھنا اور حمید خاں کے ساتھ تعلقات دوستی پیدا کرکے اُسکو سبکتگین کی مخالفت
ذا تعجب خیز نہ تھا۔ ملتان و منصورہ کی اسلامی ریاستیں چند ہی روز پہلے قرامطہ کی شرارتوں
دہو چکی تھیں۔ ملتان کو قرامطہ نے اپنا تبلیغی مرکز بنا کر ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف

افغانوں کو متأثر و معمول بنانے کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا - حمید خاں لودی جو سلسلۂ کوہ سلیمان آکر ملتان پر قابض ہوا تھا ایک طرف قرامطہ اور دوسری طرف لاہور کے راجہ جے پال کی امید اور غالباً افغانستان کی لودی قوم کا سب سے پہلا شخص تھا جسکا نام مورخین نے حکمرانوں کی فہرست میں لکھا ہے - حمید خاں لودی کے پوتے ابوالفتح لودی فرماں روائے ملتان نے سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ پر توبہ اور قرامطہ کے الحادی عقائد و اعمال کو ترک کر کے کتاب و سنت کی پیروی اختیار کی لیکن بعض سیاسی پیچیدگیوں نے اس لودی خاندان کی حکومت کا جلدی خاتمہ کر دیا - ابوالفتح لودی تو سلطان محمود غزنوی کے قید خانے سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوا لیکن اُس کی اولاد اور اُسکے رشتہ داروں، اور اُسکے ہمقوموں پر سلطان کی مہربانیاں ہمیشہ مبذول و منعطف رہیں چنانچہ ملک سلیمان خاں لودی کو سلطان نے اپنے زمرۂ امراء میں شامل کر کے ہندوستان کی معرکہ آرائیوں میں اُس سے خوب کام لیا - حملۂ سومنات میں سلیمان خاں لودی بارہ ہزار سواروں کا سپہ سالار اور سلطان کا سب سے زیادہ معتمد جرنیل تھا - جو تین سال تک سلطان کے ساتھ سومناتھ کے علاقے میں خدمات شایستہ بجالاتا رہا - سلطان شہاب الدین غوری کی حملہ آور فوج میں بھی افغانوں کے دوسرے قبائل کے ساتھ لودی قبیلہ کے اکثر افراد موجود تھے - بختیار خلجی کے ساتھ دریائے برہم پُتر کو عبور کر کے آسام و تبت پر حملہ کرنے والے مجاہدین میں بھی یہ لوگ شامل تھے ۷۳۹ھ میں ملک بہرام خاں صوبہ دار سنارگاؤں کا انتقال ہوا تو اُس کے سپہ سالار ملک فخرالدین لودی نے سنارگاؤں پر قبضہ کر کے خود حکومت شروع کی - قدر خاں حاکم لکھنوتی نے مقابلہ کیا کئی معرکوں کے بعد قدر خاں کام آیا اور فخرالدین تمام ملک بنگال کا فرماں روا بنگیا - یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمد تغلق ہفت سالہ قحط کے شدائد کا مقابلہ کر رہا تھا اور جلد بنگالہ کی طرف نہیں جاسکتا تھا - آخر ۷۴۰ھ میں سلطان محمد تغلق، حاجی الیاس کی استدعا پر بنگال پہونچا - ملک فخرالدین کو گرفتار کر کے قتل کیا اور اُسکے دشمن حاجی الیاس کو بنگال کا حاکم بنا کر واپس آیا - ملک فخرالدین کا داماد ظفر خاں لودی جو حمید خاں لودی مذکور حاکم ملتان کی نسل سے تھا ملک فخرالدین کے گرفتار و مقتول ہونے کے بعد خلیج بنگال کے ساحل کی طرف بھاگا - وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر جنوبی ہند کا طواف کرتا ہوا بہزار دقت و پریشانی بندر دیبل (کراچی) پہونچ کر اپنے وطن کوہ سلیمان میں واپس آیا - یہاں اُس نے سلطان محمد تغلق کے فوت ہونے اور سلطان فیروز تغلق کے بادشاہ بننے کی خبر سننے کے بعد جب یہ سنا کہ حاجی الیاس پر فیروز تغلق نے چڑھائی کی ہے

تو ایک جمعیت فراہم کر کے اپنے وطن سے چلا اور [illegible]ھ میں جبکہ فیروز تغلق بنگالہ کے سفر سے ناکام واپس آچکا تھا دہلی پہونچ کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے سابقہ حقوق اور حاجی الیاس کی شکایات زبان پر لا کر ہر قسم کی جانفشانی و جانفروشی پر آمادگی ظاہر کی سلطان نے بھی ظفر خاں کو اپنی مہربانی و عنایت کا یقین دلایا۔ شمس سراج عفیف سلطان فیروز کے الفاظ کو اس طرح روایت کرتا ہے کہ

"آں شہریار بمراحم شاہی و عواطف پادشاہی ظفر خاں را بسیار پرسیدہ و بعنایت نواختہ فرمان فرمود کہ ظفر خاں خاطر جمع دارد و اندیشہ را بسوے خود نگذارد اگرچہ شدائد بسیار و مکائد بیشمار دیدی و دراہہاے مخالف دیدہ ہاے مخوف پیمودی المنۃ للّٰہ بمقصود رسیدی ہرچہ در سنار گانؤں داشتی اضعاف آں بتو مفوض خواہد شد"

چنانچہ ظفر خاں کو سلطان نے زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ وہ اول نائب وزیر پھر ۷۶۹ھ میں صوبہ گجرات کا حاکم مقرر ہوا۔ ظفر خاں لودی جب ۷۷۵ھ میں فوت ہوا تو اسکے بیٹے دریا خاں لودی کو سلطان فیروز تغلق نے ظفر خاں کا خطاب دیکر باپ کی جگہ گجرات کی حکومت پر مامور کیا۔ تین سال کے بعد ۷۷۸ھ میں دریا خاں لودی المخاطب بہ ظفر خاں ثانی حاکم گجرات کو صوبہ کی حکومت پر اس لیے تبدیل کیا گیا کہ یہاں کے سرکشوں اور باغیوں کو کوئی دوسرا سردار قابو میں نہیں لا سکا تھا۔ خان جہاں ثانی ایک ہندو زادہ فیروز تغلق کا وزیر اعظم تھا اس نے خاندان شاہی کے خلاف ایک سازش میں شریک ہو کر ظفر خاں ثانی کو جو خاندان شاہی اور سلطان کے بیٹے ناصر الدین محمد شاہ تغلق کا طرفدار تھا دھوکے سے ۷۸۹ھ میں قتل کرا دیا۔ یہی قتل خاندان تغلق کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ظفر خاں ثانی نے چار بیٹے چھوڑے تھے جنکے نام ملو خاں، سارنگ خان، عادل خاں، محمود خاں تھے۔ جب تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تو سارنگ خاں نے تیمور کے پوتے پیر محمد کا ملتان میں مقابلہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد بڑی بہادری سے لڑ کر مارا گیا۔ لاہور میں عادل خاں نے اپنی مٹھی بھر جمعیت سے تیموری ۹۲ ہزار جرار فوج کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ کامیاب نہ ہو سکا مگر دوست و دشمن دونوں سے اپنی شجاعت و بہادری کا اقرار کرا لیا۔ تیمور جب دہلی پہونچا تو بڑے بھائی ملو خاں لودی المخاطب بہ اقبال خاں نے چالیس ہزار کی بھیڑ بھاڑ لیکر جسمیں تجربہ کار جنگجو کم اور دہلی کے ناتجربہ کار شہری لوگ زیادہ تھے تیموری ایک لاکھ بائیس ہزار فوج کا

مقابلہ کیا (چونکہ پیر محمد کی فوج بھی جنگ لاہور کے بعد شامل ہوگئی تھی اس لیے اب تیموری لشکر کی
تعداد ایک لاکھ بائیس ہزار تھی) غرض ہندوستان میں تیمور کو ظفر خاں لودی ہی کی اولاد سے
بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ تیمور کے بعد ملو خاں لودی المخاطب بہ اقبال خاں نے دہلی
میں آکر پھر سلطنت اسلامیہ قائم کی اور خضر خاں سند عالی کو جو سارنگ خاں کا رگیدا ہوا سپوت
کے جنگلوں میں چھپا چھپا پھر رہا تھا اور تیمور کے آنے پر اسکی خدمت میں پہونچ کر ہندوستان کی
سند حکومت تیمور سے حاصل کر چکا تھا دہلی پر قابض نہ ہونے دیا۔ آخر سات آٹھ سال کی فرماں
روائی اور خود مختارانہ حکومت کے بعد ۱۹۔ جمادی الاول ۸۰۸ھ کو خضر خاں اور گجرات کی
متحدہ فوجوں سے ملتان کے قریب لڑتا ہوا اپنے ایک ہمقوم ملک شاہ لودی ابن بہرام خاں
لودی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ خضر خاں نے ملک شاہ لودی کو اس برادر کشی کے صلہ میں اسلام خاں
کا خطاب دیا۔ ملتان میں خضر خاں کی حکومت مستقل ہوگئی لیکن دہلی پر پھر بھی قابض نہ ہو سکا۔
دہلی میں اقبال خاں لودی کے بھتیجے دولت خاں ابن محمود خاں لودی نے سلطنت کو سنبھالا
ور آٹھ نو سال تک ایک طرف خضر خاں حاکم ملتان دوسری طرف ابراہیم شاہ شرقی بادشاہ
ونپور کا کامیاب مقابلہ کرتا اور دہلی کو دونوں کی باربار کی یورشوں سے بچاتا اور دشمنوں کو
لست دے دے کر بھگاتا رہا۔ ۸۱۵ھ میں سلطان ناصر الدین محمود جو شاہ شطرنج سے زیادہ
ی حیثیت نہ رکھتا تھا فوت ہوا تو دہلی کے تمام امرا و شرفا و علما نے متفقہ طور پر دولت خاں
ی کو تخت سلطنت پر جلوس کرنے اور بادشاہ بننے پر مجبور کیا۔ اس طرح ۸۱۷ھ تک دولت خاں
ی سلطان دہلی رہا۔ اسکو مورخین دولت خاں اول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آخر خضر خاں
پر قابض ہونے اور دولت خاں اول کو قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ خضر خاں اور اسکی
وکے عہد حکومت میں ملک شاہ لودی المخاطب بہ اسلام خاں نے خوب ترقی کی۔ اسی
م خاں لودی کا بھتیجا بہلول خاں لودی ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ جسکے پوتے ابراہیم خاں
ہ کے عہد حکومت میں دولت خاں اول کا پوتا یا پڑپوتا دولت خاں دوم پنجاب کا صوبیدار
ں نے بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ یہ دولت خاں دوم سلطان
ر لودی کے زمانے میں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ اسکے یکجدی رشتہ دار ملک احمد لودی
روں بیٹے دولت خاں، نصرت خاں، بہادر خاں، موسیٰ خاں، لاہور آئے اور دولت خاں
نے انکو مناسب جاگیریں عطا کرکے نصرت خاں ابن ملک احمد لودی کے ساتھ اپنی بیٹی

کی شادی کردی۔

خان جہاں لودی کا خاندان

نصرت خاں کے بھائی دولت خاں کو ایک دن دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب کی محلس میں کسی شخص نے دولت خاں کہکر پکارا تو دولت خاں صوبہ دار اور دولت خاں ابن ملک احمد دونوں اُس طرف متوجہ ہوئے اس پر دولت خاں صوبہ دار نے کہا کہ برادرم دولت خاں یا تو میں اپنا نام تبدیل کروں یا تم اپنا نام تبدیل کرو۔ اُس نے جواباً عرض کیا کہ آپ کو اپنا نام مبارک ہو میرا دوسرا نام تجویز فرما دیجیے۔ چنانچہ دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب نے دولت خاں کا نام شیر خاں تجویز کیا۔ اور پھر وہ شیر خاں ہی کے نام سے موسوم رہا۔ جب دولت خاں لودی حاکم پنجاب اور ابراہیم لودی سلطان ہندوستان دونوں کی عمر و دولت ختم ہوگئی تو شیر خاں، نصرت خاں اور پہاڑ خاں تینوں بھائی پنجاب سے سفر کرکے صوبہ بہار میں پہونچے جہاں پٹھانوں کی سلطنت و حکومت ابھی باقی تھی۔ پٹنہ میں محمود خاں ابن سلطان سکندر لودی برادر سلطان ابراہیم لودی کو امرائے افاغنہ نے بادشاہ بنایا تو دولت خاں المعروف بہ شیر خاں بھی اس جدید سلطان کی فوج میں بھرتی ہوا۔ فرید خاں الملقب بہ شیر خاں بھی جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوا سلطان محمود خاں لودی کے ساتھ جونپور کی طرف گیا تھا۔ اسی سفر میں ہر دو شیر خاں ایک دوسرے سے واقف اور ہمنامی کے سبب ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ جون پور کی جنگ میں سلطان محمود خاں لودی کو شکست ہوئی دولت خاں المعروف بہ شیر خاں زخمی ہوکر پٹنہ واپس آیا اور سپہ گری سے دستکش ہوکر تجارت میں مشغول ہوا۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو پہلی مرتبہ بکسر کے قریب شکست دیکر بھگا دیا اور شیر خاں سے شیر شاہ بن گیا تو شیر خاں (دولت خاں) اپنے تجارت کے کاروبار کو چھوڑ کر شیر شاہ کی خدمت میں آیا۔ شیر شاہ نے پُرانی دوستی و شناسائی کو مدنظر رکھکر مروت و عزت کا سلوک اور زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ اسکے بعد مالوہ کے زمینداروں اور رئیسوں نے شیر شاہ کے پاس درخواستیں بھیجیں کہ ہم آپ کے فرماں بردار و مطیع ہیں کسی سردار کو اس طرف بھیجیے کہ ہم سب اُسکے ساتھ ہوکر ہمایوں کے کارندوں کو اس ملک سے خارج کر دیں۔ شیر شاہ نے اپنے بڑے بیٹے قطب خاں کو مالوہ کی طرف روانہ کیا اور شیر خاں کو بطور اتالیق قطب خاں کے ہمراہ بھیجا۔ چونکہ امرائے مالوہ نے خود درخواست بھیجی تھی اور ہر قسم کی جانفشانی کا اقرار کیا تھا لہذا قطب خاں کے ساتھ کوئی بڑی فوج نہیں بھیجی گئی۔ خیال تھا کہ مالوہ کی تمام فوجیں قطب خاں

کے زیر علم فراہم ہو جائیں گی۔ قطب خاں اور شیر خاں جب مالوہ میں پہونچے تو ہمایوں نے آگرہ
سے اپنے بھائی مرزا عسکری و مرزا ہندال کو اُس طرف روانہ کیا۔ امرائے مالوہ ازراہ بد عہدی
قطب خاں کو تنہا چھوڑ کر مرزاؤں کے شریک ہو گئے۔ قطب خاں سے سب [illegible] ہمراہیوں
نے کہا کہ یہاں سے بھاگ چلو تو اُس نے جواب دیا کہ میرے سوا شیر شاہ کے اور بھی بیٹے موجود ہیں
میرے مارے جانے سے کوئی ہرج و نقصان واقع نہ ہوگا لیکن مرزاؤں کے مقابلے سے منہ پھیر
ہو جانا ہمارے خاندان کی عزت کو نقصان پہونچائیگا۔ یہ کہکر وہ اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کے
ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ اور بڑی بہادری کے ساتھ مارا گیا۔ قطب خاں کے مارے جانے پر شیر خاں
کے ہمراہیوں نے کہا کہ اب کیا باقی رہا ہے اپنی جان میدان سے سلامت نکال لے چلو۔ شیر خاں
نے کہا میں اپنی سفید داڑھی شیر شاہ کو کیسے دکھا سکتا ہوں۔ یہ کہکر حملہ آور ہوا اور بہت سے
دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر خود بھی قطب خاں کے پاس پہونچ گیا۔ شیر شاہ نے قطب خاں
اور شیر خاں کے مارے جانے کا حال سنکر پٹنہ سے شیر خاں کے چاروں بیٹوں کو بلا بھیجا جنکے نام
محمود خاں، عمر خاں، قاسم خاں اور کمال خاں تھے۔ ان چاروں کو بڑی بڑی جاگیریں اور
تیغ و علم و نقارہ عطا کر کے معزز و سربلند کیا۔ عمر خاں کو اپنے پاس رکھکر باقی تینوں کو ان کی
جاگیروں کی طرف رخصت کر دیا۔ برہان پور کے فاروقی فرماں روا کا سپہ سالار عالم خاں لودی
[illegible] شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو شیر شاہ نے عالم خاں کی بیٹی سے عمر خاں بن شیر خاں
کی شادی کر دی۔ پھر چند روز کے بعد عمر خاں کو بھی جاگیر کی طرف رخصت کیا۔ [illegible]
بہت کئی مرتبہ لوگوں نے شیر شاہ کی خدمت میں شکایتیں پہونچائیں۔ شیر شاہ نے [illegible]
ابھی تک شیر خاں کا خون مالوہ کی زمین پر خشک نہیں ہوا ہے [illegible]
نہ کروں گا۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ نے عمر خاں اور محمود خاں کو اٹاوہ اور قنوج [illegible]
و سنبھل وغیرہ کی طرف حکومت و انتظام ملکی پر مامور رکھا۔ ۹۵۶ھ میں عالم خاں لودی
کے بیٹی کے پیٹ سے عمر خاں کا بیٹا دولت خاں قلعہ گوالیار میں پیدا ہوا۔ سلیم شاہ کی وفات کے
[illegible] عدلی تخت نشین ہوا تو وہ عمر خاں اور اُسکے بھائیوں سے ناخوش رہا۔ آخر اس نے
[illegible] قاسم خاں اور کمال خاں تینوں بھائیوں کو اُنکی جاگیروں سے بیدخل کرکے چنار
میں قید کر دیا۔ یہ سنتے ہی عمر خاں فرار ہو کر مالوہ کے کسی غیر معروف مقام میں چلا گیا
[illegible] بیچارے ہیمو بقال کو فوج دیکر آگرہ و دہلی کی جانب روانہ کیا، تو محمود خاں [illegible]

کمال خاں، تینوں بھائیوں کو قید خانہ سے نکال کر خلعت فاخرہ عطا کیے اور ہر قسم کے انعام و اکرام کا متوقع کر کے ہیمو کے ساتھ روانہ کیا۔ پانی پت کے معرکہ میں محمود خاں و قاسم خاں دونوں بھائی مغلیہ فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ عمر خاں بھائیوں کے مارے جانے اور پٹھانوں کے قبضے سے سلطنت کے نکل جانے کی خبر سنکر مع اہل و عیال گجرات کی طرف روانہ ہوا اور ۹۶۳ھ میں احمد آباد پہونچکر گجرات کے مشہور سردار شیر خاں فولادی کا نوکر ہو گیا۔ عمر خاں کا بیٹا دولت خاں جب جوان ہوا تو وہ گجرات کے ایک دوسرے امیر حاجی خاں کا نوکر ہوا اور موضع اٹاوہ متصل احمد آباد دولت خاں کی تنخواہ میں بطور جاگیر مقرر ہوا۔ ۹۸۲ھ میں جب اکبر کی فوجوں نے گجرات پر حملہ کیا تو میدان جنگ میں شیر خاں فولادی کے بیٹے محمد خاں کے ہمراہ عمر خاں بھی مارا گیا اُسوقت دولت خاں کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔

مسند عالی دولت خاں سوم

جب گجرات پر مغلوں کا قبضہ ہوا تو دولت خاں احمد آباد سے سورت چلا گیا۔ سورت کے راجہ نے دولت خاں کے ساتھ عزت و تکریم کا برتاؤ کیا اور اُسکو اپنے زمرۂ مصاحبین میں داخل کر لیا۔ شاہ ابو تراب محاسب گجرات نے ۹۸۳ھ میں دولت خاں کو سورت سے بلوا کر خان اعظم مرزا عزیز کوکہ صوبہ دار گجرات کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا عزیز کوکہ نے دولت خاں کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے پرگنہ جھالا وار جاگیر میں عطا کیا۔ جب گجرات سے مرزا عزیز کو آگرہ طلب کیا گیا تو مرزا کے ساتھ دولت خاں بھی ہمسفر ہوا۔ راستہ میں بمقام سروہی کے قریب راجپوتوں کی ایک زبردست جماعت نے مرزا عزیز کے قافلہ پر اچانک حملہ کیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور بظاہر بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دولت خاں نے اُسوقت بڑا کام کیا اور تنہا راجپوتوں کے سپہ سالار سے جا بھڑا۔ اگرچہ خود بھی زخمی ہوا مگر راجپوتوں کے اس سردار کو قتل کر دیا۔ سردار کے قتل ہوتے ہی راجپوت بھاگ گئے۔ اور مرزا عزیز نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اُسی وقت دولت خاں کو دو ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ دار السلطنت پہونچکر دولت خاں کے اس کارنامہ کا حال پادشاہ کو سنایا۔ اکبر نے دولت خاں کو اپنے سامنے بلوایا تو اُسوقت تک اُسکے چہرہ کا زخم پورے طور پر مندمل نہ ہوا تھا۔ پادشاہ نے خوش ہو کر اپنے کاندھے سے طوسی دوشالہ اُتار کر دولت خاں کو دیا۔ چند روز کے بعد مرزا عزیز کوکہ نے پادشاہ سے ناراض ہو کر امارت ترک کی اور گوشہ نشیں ہو گیا۔ دولت خاں نے اس حالت میں بھی مرزا عزیز کی رفاقت ترک نہیں کی۔ مرزا عزیز نے عبدالرحیم

ابن بیرم خاں المخاطب بہ مرزا خاں کو جو ابھی تک خان خاناں نہیں ہوا تھا اپنے پاس بلوایا۔ دولت خاں کا ہاتھ پکڑ کر مرزا خاں کے سپرد کیا اور کہا کہ "یہ ایک امانت ہے جو تم کو سپرد کرتا ہوں۔ اسکے حال سے کبھی غافل نہ ہونا اور ہمیشہ اسکے ساتھ بھائیوں کی طرح سلوک کرنا"۔ مرزا خاں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور دولت خاں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بھائیوں سے بڑھ کر عزیز رکھا اور کبھی اسکو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ ۹۸۴ھ میں دولت خاں کا تعلق مرزا عبد الرحیم کے ساتھ قائم ہوا۔ ۹۹۰ھ میں اکبر نے شہباز خاں کمبوہ اور مرزا خاں کو اودے پور میواڑ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ رانا پرتاب بانسواڑہ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا اور کونبھلمیر و اودے پور پر شاہی فوج کا قبضہ ہوا۔ اس مرکہ میں سب سے زیادہ دولت خاں نے خدمات شایستہ انجام دیں۔ پھر ۹۹۱ھ میں اکبر نے مرزا عبد الرحیم کو مظفر گجراتی کے خلاف گجرات پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس معرکہ میں دولت خاں ہی نے مرزا عبد الرحیم کو سنبھالا اور وہ ایسا نہ جلے کیے کہ تمام دشواریاں آسانی سے تبدیل ہو گئیں۔ اسی فتح گجرات کے صلے میں مرزا عبد الرحیم کو خان خاناں کا خطاب اور پنجہزاری منصب ملا۔ اسکے بعد سندھ کی تسخیر میں دولت خاں سے وہ بہادری و صف شکنی ظہور میں آئی کہ پادشاہ نے خوش ہو کر دو ہزاری منصب عطا کیا اور سندھ کے فتحنامے دولت خاں کے نام پر لکھے گئے۔ شہزادہ مراد دکن کی فتح پر مامور ہوا تو خان خاناں کو شہزادہ کا اتالیق بنا کر بھیجا گیا۔ دولت خاں خانخاناں کے ہمراہ تھا اور خانخاناں کوئی کام دولت خاں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا تھا۔ مراد کے مرنے پر اسکے بھائی شہزادہ دانیال کو پادشاہ نے دکن کا ناظم مقرر کیا۔ اور خانخاناں و دولت خاں اس شہزادے کی اتالیقی پر بھی مامور ہوئے۔ شہزادہ دانیال خانخاناں کا داماد بھی تھا۔ شہزادہ نے یہ دیکھا کہ دولت خاں سے بڑھ کر بہادر اور صائب الرائے دوسرا تلاش نہیں کیا جا سکتا خانخاناں سے فرمایش کی کہ دولت خاں کو میری سرکار سے متعلق کر دو۔ خانخاناں نے اول عذر کیا لیکن جب شہزادہ نے اپنی بیوی یعنی خانخاناں کی بیٹی سے بہت زور ڈلوایا اور خود بھی مسلسل اصرار کرتا رہا تو خانخاناں نے مجبور ہو کر کہ یہ معاملہ دولت خاں کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔ دولت خاں سے کہا گیا تو اس نے کہا کہ خانخاناں کو اختیار ہے کہ وہ مجھ کو اپنے پاس سے جدا کر دے لیکن میں خود اس سے جدا ہونے کی خواہش کبھی نہ کروں گا۔ آخر بڑی رد و کد کے بعد باہ صفر ۱۰۰۹ھ میں دولت خاں شہزادہ کے متوسلین میں شامل ہوا۔ شہزادہ دانیال نے دولت خاں کو حاصل کرکے ایسی خوشی کا اظہار کیا جیسے کسی بڑی عظیم الشان سلطنت پر قبضہ پایا۔ شہزادہ نے دولت خاں کو ...

کا خطاب دیکر اپنے تمام کاموں کا مدار المہام اور مختار کل بنا دیا۔ اس کے بعد اکبر خود برہان پور گیا اور شہزادہ دانیال کو احمد نگر سے برہان پور طلب کیا تو وہ دولت خاں کو احمد نگر چھوڑ کر خود باپ کی خدمت میں برہان پور حاضر ہوا۔ ۲۸ رشعبان سنہ ۱۰۰۸ھ کو مسند عالی دولت خاں کا احمد نگر میں انتقال ہوا۔ باون سال کی عمر پائی۔ جنازہ برہان پور میں لاکر دفن کیا گیا۔ یہی مسند عالی دولتخاں ابن عمر خاں ہے جسکو مورخین "دولت خاں سوم" کہتے ہیں۔ اگر دولت خاں سوم کے دادا کا نام دولت خاں کی جگہ شیر خاں مشہور نہ ہوا ہوتا تو اسکو دولت خاں سوم اور اسکو دولت خاں چہارم کہا جاتا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کہا کرتا تھا کہ "ہر شخص میں خواہ کتنی ہی خوبیاں ہوں مگر کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے لیکن دولت خاں ایسا شخص ہے کہ مجھ کو سوائے خوبیوں کے کوئی عیب اس میں نظر نہ آیا۔ ہاں اگر کوئی عیب دولت خاں سے منسوب ہی کرنا پڑے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہمت رکھتا ہے سو یہ ایسا عیب ہے کہ اس پر ہزار خوبیاں قربان کی جا سکتی ہیں"۔ مسند عالی دولت خاں نے دو جوان بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ ایک کا نام محمد خاں اور دوسرے کا نام پیر خاں تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی محاربات دکن میں باپ کے ساتھ بڑی بڑی بہادریاں دکھائی تھیں اور فنون سپہگری کے علاوہ علم و فضل سے بھی بے بہرہ نہ تھے شہزادہ دانیال نے ان دونوں کو اپنی مصاحبت میں داخل کرکے ہر قسم کی رعایت و تربیت انکے حال پر مبذول رکھی۔ محمد خاں ابن دولت خاں سنہ ۱۰۱۱ھ میں ایک بیٹا خضر خاں نامی چھوڑ کر فوت ہوگیا۔ اب مسند عالی دولت خاں کا صرف ایک بیٹا پیر خاں باقی رہا۔ یہی پیر خاں ابن دولت خاں ہے جو بعد میں خانجہاں کے خطاب سے مخاطب ہوکر آج تک خاں جہاں لودی کے نام سے مشہور اور اس نگارش کا موجب ہے۔

خان جہان لودی

سنہ ۱۰۰۸ھ میں پیر خاں ابن دولت خاں لودی شہزادہ دانیال کی مصاحبت میں داخل ہوا۔ پیر خاں کی قابلیت و اہلیت نے بہت جلد شہزادہ کو اپنا گرویدہ کرلیا۔ اور اس نے بیٹے کو باپ کا نعم البدل پاکر اس کے اختیار و اقتدار میں اضافہ کرکے دولت خاں کی ذمہ داریاں اسکے سپرد کر دیں۔ یکم ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ھ کو شہزادہ دانیال کا دکن میں انتقال ہوا۔ اسکے ساڑھے چھ مہینے بعد ۱۳ رجمادی الثانی سنہ ۱۰۱۴ھ کو اکبر بھی فوت ہوگیا۔ شہزادہ سلیم نے جو اکبر کے بعد جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا سنہ ۱۰۱۳ھ میں جبکہ شہزادہ دانیال زندہ تھا دو مرتبہ پیر خاں کے پاس پیغام بھیجے کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ۔

غالبًا جہانگیر پیر خاں کو اس لیے اپنے پاس بُلانا اور شہزادۂ دانیال سے جدا کرنا چاہتا ہوگا کہ
شہزادۂ دانیال ہی تخت سلطنت کے لیے جہانگیر کا رقیب اور مقابل بن سکتا تھا - پیر خاں کی
بہادری اور قابلیت کی شہرت جہانگیر تک پہونچ چکی تھی - اُس نے ہر قسم کے لالچ دیے مگر
پیر خاں نے شہزادۂ دانیال سے جدا ہونا پسند نہ کیا - جب اکبر کا انتقال ہوا تو خانخاناں اور
پیر خاں دونوں برہان پور میں موجود اور معاملات دکن کے سلجھانے میں مصروف تھے - مرزا عزیز
اور مان سنگھ دونوں جہانگیر کی تخت نشینی کے مخالف اور جہانگیر کے بیٹے خسرو کو تخت پر بٹھانا
چاہتے تھے - خسرو مان سنگھ کا بھانجا اور مرزا عزیز کا داماد تھا - اگر شہزادہ دانیال زندہ ہوتا تو
خانخاناں دانیال کی تخت نشینی کے لیے جہانگیر کے خلاف ضرور کوشش کرتا اور پیر خاں کو بھی
اس کوشش میں حصہ لینا پڑتا - لیکن خانخاناں اور پیر خاں کو دانیال کی وفات نے اس مصیبت
سے پہلے ہی نجات دیدی تھی - جہانگیر کو بھی اب خانخاناں یا پیر خاں سے کوئی اندیشہ نہ رہا تھا
لہٰذا اُس نے تخت نشین ہوتے ہی خانخاناں کے پاس مہماتِ دکن کے اہتمام کی سند اور خلعت بھیجکر
پیر خاں کو اپنی خدمت میں طلب کیا - خانخاناں نے شاہی ایلچیوں کے ہمراہ عرضداشت بھیجی کہ
پیر خاں کا اسوقت یہاں سے جدا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے - جہانگیر چونکہ عرصہ سے
پیر خاں کو اپنے پاس بُلا رہا تھا اس لیے خانخاناں کی درخواست پڑھ کر آتش شوق اور بھی تیز
ہوئی - دوبارہ تاکیدی حکم بھیجا گیا کہ بلا توقف پیر خاں کو ہمارے پاس بھیجدو - اس حکم کے
پہونچنے پہ پیر خاں برہان پور سے روانہ ہوا - اور لاہور میں جبکہ جہانگیر خسرو کو گرفتار کرکے حسن بیگ
وغیرہ کو سزا دے چکا تھا، جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا - جہانگیر پیر خاں کے آنے سے بہت خوش
ہوا - صلابت خاں کا خطاب اور دوہزاری منصب عطا کیا - اسکے بعد جہانگیر کابل کی طرف
روانہ ہوا اور پیر خاں لودی المخاطب بہ صلابت خاں کو ہمراہ لے گیا - اس سفر میں ہر روز
جہانگیر کا التفات صلابت خاں کی نسبت بڑھتا گیا - کابل سے لاہور واپس آکر جہانگیر نے
صلابت خاں کو پنجہزاری منصب اور خانجہاں کا خطاب عطا کرکے اپنی فرزندی سے بھی مفتخر کیا -
چنانچہ پادشاہ نے خود تصنیف فرما کر اپنے قلم سے ایک کاغذ پہ یہ سجع لکھا ؎

"فرزند خاص شاہ شد از قدرت الٰہ
خانِ جہان مرید جہانگیر پادشاہ

اور ملا احمد مہرکن کو طلب فرما کر حکم دیا کہ اس سجع کو انگوٹھی کے نگینہ پر کندہ کرکے لاؤ - ملا احمد انگوٹھی

تیار کر کے لایا تو پادشاہ نے اپنے ہاتھ سے وہ انگوٹھی جس پر سجع مذکور کندہ تھا خان جہاں کو عطا کی
خان جہاں کے حال پر اس قدر شفقت و عنایت مبذول دیکھ کے بعض حاسدوں نے پادشاہ سے
تنہائی میں موقع پاکر عرض کیا کہ ایک افغان کو ایسا بلند مرتبہ عطا کرنا اور فرزندی کے مقام رفیع
تک پہونچانا احتیاط و عقل کے خلاف ہے۔ جہانگیر پر اسکا اثر اُلٹا ہوا۔ اُس نے اگلے روز دربار
میں خان جہاں کو خلعتِ خاص، اسپ خاص، تسبیح جواہر، کمر دخنجر مرصع، شمشیر مرصع عطا کر کے
تمام امیروں اور وزیروں سے اونچے مرتبے پر بٹھایا۔

دارالسلطنت آگرہ میں پہونچ کر جہانگیر نے خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔
تمام امرا نے پادشاہ کے اس ارادہ کی تائید و توثیق و تصویب کی۔ خانجہاں اس مجلس میں شریک
نہ تھا اور شاید وانستہ شریک نہیں کیا گیا تھا۔ پادشاہ کے اس ارادے کا حال سُن کر خود پادشاہ
کی خدمت میں پہونچا اور نہایت آزادی کے ساتھ عرض کیا کہ "خان اعظم کی ماں جیجی نے آپ کے
باپ کو دودھ پلایا ہے۔ خان اعظم کے باپ شمس الدین محمد خاں اتگہ نے اُسوقت جبکہ سلطنت
خطرے میں تھی بیرم خاں کو شکست فاش دے کر سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ اسی کارنامے نے
اُسکے حاسدوں کو اُسکی جان لینے پر آمادہ کیا اور وہ آپ کے باپ پر قربان ہوگیا۔ مرزا عزیز کوکہ
کے کارنامے اور پادشاہ اکبر کا اُسکی نازبرداریاں کرنا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مرزا عزیز آپ کا
چچا اور آپ کے لیے عزت و عظمت کا مقام ہے۔ اُسکی کسی اضطراری غلطی پر سخت گیری یا سنگدلی
کا برتاؤ کرنا ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ پادشاہ پر خانجہاں کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا اور
اُسی وقت مرزا عزیز الملتمس بہ خانِ اعظم کی تمام لغزشوں کو معاف فرماکر ہفت ہزاری منصب
اور خلعت و اسپ عطا کیا۔

عبدالرحیم خانخاناں اگرچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت جہانگیر کا مخالف و مزاحم نہ تھا،
نہ وہ خود دارالسلطنت آگرہ میں اُسوقت موجود تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں پہلے تک وہ
جہانگیر کی تخت نشینی کے خلاف تھا لہذا کچھ دنوں بعد جہانگیر کے انتقامی جذبہ میں تحریک پیدا ہوئی اور اُس نے
خانخاناں کا پنجہزاری منصب اور تمام سامان امارت اور جاگیر وغیرہ ضبط کر کے اُسکو نظر بند کر دیا
پایا۔ امرائے دربار بھی خانخاناں کے مخالف و بدخواہ تھے اور اگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی
بھی تھی تو اس قدر جرأت نہ تھی کہ خانخاناں کی نسبت کلمہ خیر زبان تک لا سکے۔ اس نازک
موقع پر جبکہ زمین و آسمان سب خانخاناں کے مخالف نظر آرہے تھے، خانجہاں لودی نے

اپنی شرافت و انسانیت کا اظہار اس طرح کیا کہ نہایت بیباکانہ و آزادانہ لہجہ میں سر دربار بادشاہ
سے عرض کیا کہ "خانخاناں خاندان سلطنت کا قدیمی پروردہ و تربیت کردہ ہے اُسکو ذلیل و
رسوا کرنا اور اذیت پہونچانا ہرگز شان شاہانہ کے شایاں نہیں"۔ پھر یہ شعر پڑھا کہ ؎

"چوب را آب فرو می نبرد از پئے آنکہ
شرم دارد ز فرو بردن پروردہ خویش"

خانجہاں کے کلام نے اعجاز کا کام کیا اور جہانگیر کے دل میں عفو و درگزر کی صفت نے
فوراً واپس آکر خانخاناں کے منصب و جاگیر کو بدستور بحال رکھا اور وہ دکن کی نظامت پر
مامور ہوا۔

اسکے بعد جہانگیر دوبارہ خانخاناں سے ناراض ہوا اس لیے کہ اُسنے عنبر حبشی کے
ساتھ دوستی پیدا کرکے جالنہ وغیرہ چند پرگنے بخشش عنبر کو دیدیے تھے۔ خانخاناں آگرے
میں طلب ہوا۔ اور قریب تھا کہ اُسکو عبرتناک سزا دی جائے اس مرتبہ بھی خانجہاں نے ہی
اپنی جان پر کھیل کر خانخاناں کی سفارش کی۔ اور ایسے لطیف و عاقلانہ انداز سے بادشاہ
کو سمجھایا کہ اُسکا تمام غیظ و غضب فرو ہوگیا۔ اور خانجہاں سے خانخاناں کی ضمانت لیکر اُسے
پھر دکن کی نظامت پر بھیجدیا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ خانجہاں لودی کے باپ دولت خاں سے مرزا عزیز اور مرزا
عبدالرحیم سے کس قسم کا تعلق تھا۔ خانجہاں نے اپنے باپ کے ان دوستوں قدردانوں اور
محسنوں کے حقوق کو بخوبی ادا کیا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ جہانگیر نے
جب راجہ مان سنگھ کے استیصال کا ارادہ کیا تو کسی کو بھی وہم و گمان نہ تھا کہ مان سنگھ کی سفارش
کے لیے کوئی شخص اپنی زبان کھول سکے گا۔ مان سنگھ ہی وہ شخص تھا جس نے جہانگیر کو محروم
رکھ کر خسرو کو اکبر کے بعد تخت نشین کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ اُسی نے خان اعظم مرزا
عزیز کوکہ کو بھی اپنا ہمخیال اور شریک کار بنا لیا تھا۔ جہانگیر کے دل میں مان سنگھ کی جانب سے سخت
نفرت تھی اور وہ راجپوتوں سے بہت بدگمان ہوگیا تھا۔ دربار جہانگیری میں کوئی شخص ایسا
نہ تھا جو مان سنگھ کی نسبت کلمۂ خیر کہہ سکے۔ لیکن اس موقع پر بھی خانجہاں لودی ہی آگے
بڑھا۔ اور اُس نے مان سنگھ کے اُن تمام کارناموں اور جاں فروشیوں کی داستان سنائی۔
جو اکبر کے عہد حکومت میں اُس سے ظہور میں آئی تھیں۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی توجہ

دلائی کہ پادشاہ کے لیے اور سلطنت کے استحکام و رونق کے لیے بھی عفو کا نتیجہ انتقام سے بدرجہا بہتر ثابت ہوگا۔ چنانچہ جہانگیر نے مان سنگھ کے قتل کا ارادہ ترک کرکے اُسکو دکن کی جانب ایک مناسب جاگیر دے کر رخصت کردیا اور وہ وہیں فوت ہوا۔ گویا خان جہاں لودی نے ہر شاہی معتوب کی سفارش کرنے اور ہر معزز شخص کی عزت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اگر خانجہاں لودی نہ ہوتا تو جہانگیر مذکورہ ہر سہ امیروں (خان اعظم مرزا عزیز کوکہ، عبدالرحیم خانخاناں، راجہ مانسنگھ) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرکے ہندوستان کے نہایت بدنام پادشاہوں میں شامل ہو چکا ہوتا خان جہاں لودی کے ان کارناموں اور اُسکے اُس اثر و اقتدار کو جو دربار جہانگیری میں اُس کو حاصل تھا عہد شاہجہانی کا کوئی مورخ اس لیے مفصل بیان نہیں کرسکا کہ شاہجہاں کے زمانہ میں خانجہاں لودی کو دشمنِ سلطنت اور باغی و طاغی قرار دیا جا چکا تھا جیسا کہ آگے یہ دلخراش داستان بیان ہونے والی ہے۔ مذکورہ حالات زیادہ تر عہد جہانگیر کی تصنیف شدہ مخزنِ افغانی مصنفۂ حبیب اللہ ہروی سے ماخوذ ہیں۔ دکن کی سلطنت نظام شاہی اور سلطنت دہلی کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے تھے۔ جہانگیر نے شہزادۂ پرویز کو دکن کی جانب روانہ کیا لیکن شہزادہ کو رخصت کرنے کے بعد کسی زبردست سپہ سالار اور صاحب تدبیر شخص کا اُس طرف بھیجنا ضروری محسوس ہوا۔ امرائے دربار خان جہاں لودی کے اثر و اقتدار کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے اور اُسکو پادشاہ سے جدا رکھنا چاہتے تھے سب نے یکزباں ہوکر مشورہ دیا کہ خان جہاں سے بہتر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دکن کی مہمات کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ یہ مشورہ غلط اور حقیقت کے بھی خلاف نہ تھا اور خان جہاں کے مانند کوئی دوسرا شخص دارالسلطنت میں موجود نہ تھا۔ جہانگیر نے بادلِ ناخواستہ خان جہاں کو اپنے پاس سے جدا کرنا گوارا کیا اور خانجہاں شروع سنہ ۱۰۱۹ھ میں شہزادۂ پرویز کے پاس برہان پور پہونچکر مہمات دکن میں شریک ہوا۔ ۲۰ ماہ صفر سنہ ۱۰۱۹ھ کو ملکاپور کے میدان جنگ میں خانجہاں اور اُس کے بھتیجے خضر خاں نے دکنی لشکر کے مقابلہ میں رستم و اسفندیار کے کارناموں کو تازہ کرکے دکھایا اور دکن میں سلطنت دہلی کی دھاک بٹھا دی۔ عبدالرحیم خانخاناں بطور اتالیق شہزادہ کے ہمراہ تھا لیکن ابھی تک کسی سے کچھ نہ ہوسکا تھا۔ خانجہاں کے پہونچتے ہی مہماتِ دکن کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ نظام الملکی لشکر کو جب خان جہاں کے مقابلے میں پے درپے چند شکستیں ہوئیں تو عنبر جی حبشی کی جانب سے صلح کی درخواست آئی۔ خان جہاں لودی اور شہزادہ پرویز اگرچہ صلح پر رضامند نہ تھے لیکن خانخاناں اور دوسرے امرائے لشکر صلح پر آمادہ ہوگئے اور عنبر جی حبشی نے

بالا گھاٹ اور جالنہ وغیرہ کئی پرگنے دیکر اور دیکر صلح کرلی۔ اس صلح کے بعد شہزادہ مع خانخاناں وخان جہاں برہان پور آگیا جو اس زمانے میں ناظم دکن کا مستقر حکومت تھا۔ ۲ ماہ رجب ۱۰۱۹ھ کو مہابت خاں بادشاہ کا فرستادہ پہونچا اور خان خاناں کو شاہی حکم پہونچا کہ فوراً اپنی تمام ذمہ داریوں کا چارج خانجہاں کو سپرد کرکے آگرہ پہونچو۔ چنانچہ عبد الرحیم خان خاناں شہزادہ کی اتالیقی اور دکن کی تمام ذمہ داریاں خان جہاں کو سپرد کرکے مہابت خاں کے ہمراہ آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ خان جہاں پونے دو سال تک شہزادہ کا اتالیق اور صوبجات دکن وبرار کا ناظم وفرماں روا رہا۔

۲- ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو ارادت خاں المخاطب بہ خان اعظم شاہزادہ کی اتالیقی پر مامور ہوکر برہانپور آیا اور خان جہاں بدستور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ پر قائم رہا۔ ۱۹ رشعبان ۱۰۲۱ھ کو برہان پور سے خان اعظم شہزادہ پرویز کو ہمراہ لیکر دولت آباد کی جانب روانہ ہوا۔ جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ برسات کے گزرنے اور سہیل کے طلوع ہونے کے بعد برہانپور کا لشکر شمال ومشرق کی جانب سے اور عبد اللہ خاں فیروز جنگ حاکم گجرات مع علی مرداں خاں وخان عالم شمال ومغرب کی جانب سے دولت آباد پر حملہ آور ہوں۔ اسی قرارداد کے موافق خان اعظم برہانپور سے روانہ ہوا۔ لیکن احمد نگر کی نظام شاہی فوجوں نے صوبہ خاندیس پر حملہ آوری شروع کردی تھی لہذا صوبۂ خاندیس کی حفاظت کے لیے خانجہاں مقرر ہوا۔ خان جہاں نے موضع روہنکھیڑہ کے قریب نظام شاہی فوجوں کو شکست فاش دیکر دکنی لشکر کی کمر توڑدی اور صرف بیس روز کے عرصہ میں خاندیس اور سرحدات خاندیس سے حملہ آوروں کو بھگا کر اس طرف کے خطرہ کا قابل اطمینان سدباب کردیا۔ اور یہاں سے روانہ ہوکر شہزادہ سے جو بآہستگی دولت آباد کی طرف بڑھ رہا تھا جا ملا۔ وہاں جاتے ہی یہ خبر سنی کہ عنبر حبشی نے یعقوب خاں حبشی اور آدم خاں کو بیس ہزار سواروں کے ساتھ بالا گھاٹ سے خاندیس پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی خان جہاں لودی بالا گھاٹ کی جانب اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ مذکورہ نظام شاہی فوج کو شکست دیکر اس طرف سے دولت آباد کی جانب روانہ ہو جائے گا۔ اس یلغار میں راجہ مان سنگھ وسورت سنگھ بھی خانجہاں لودی کے ہمراہ تھے۔ بالا گھاٹ کے قریب پہونچکر دکنیوں کے لشکر کو شکست فاش دیکر خان جہاں دولت آباد کی جانب روانہ ہوا۔ دولت آباد پر حملہ کرنے کی تاریخ پہلے سے مقرر ہوچکی تھی کہ اسی روز عبد اللہ خاں فیروز جنگ اور خاں جہاں ہر دو جانب سے حملہ آور ہونگے۔ خان جہاں بالا گھاٹ سے فارغ ہوکر دولت آباد کی جانب ایسے وقت روانہ ہوچکا تھا کہ مقررہ تاریخ پر وہاں ضرور پہونچ جائے

لیکن ایک قدرتی رکاوٹ پیش آگئی کہ راستہ میں نہایت سخت بارش ہوئی اور دو تین دن لشکر کو
مجبوراً مقام کرنا پڑا۔ بارش نے جب ذرا مہلت دی تو دولت آباد کی طرف کوچ ہوا۔ عبداللہ خاں
فدوی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خان جہاں لودی ابھی دولت آباد کے قریب نہیں پہونچا اور دو
تین روز کا تامل ضروری ہے، لیکن اُس نے محض اس شوق میں کہ دولت آباد کی فتح تنہا میری
کوشش سے حاصل ہو، خان جہاں کا انتظار نہ کیا اور بڑھا چلا آیا۔ دولت آباد سے بارہ کوس
کے فاصلہ پر موضع بھیا پور میں عنبر حبشی سے مقابلہ ہوا۔ عبداللہ خاں شکست کھا کر بھاگا۔ علی
مردان خاں اور مرزا برخوردار خاں المخاطب بہ خان عالم دونوں سردار زخمی ہو کر گرفتار ہو گئے
خانجہان لودی دولت آباد سے ۴۴ کوس کے فاصلہ پر پہونچا تھا کہ اُسکو عبداللہ خاں کے
شکست کھا کر فرار ہونے اور مذکورہ دونوں سرداروں کے زخمدار و گرفتار ہو جانے کا حال
معلوم ہوا۔ اسی جگہ خان اعظم بھی مع فوج خانجہاں سے آملا۔ اور شہزادہ پیچھے لنکا پور میں
مقیم رہا۔ لشکر گجرات یعنی عبداللہ خاں کی شکست اور علی مردان خاں و خان عالم کی گرفتاری
کا حال سنکر لشکر شاہی اور سرداران لشکر کے حوصلے پست ہو گئے۔ سب نے یہی مناسب سمجھا
کہ برہان پور کی طرف واپس لوٹ چلیں کیونکہ دشمن کی فوج بہت زیادہ اور لشکر شاہی کے لیے
سامان رسد کا کوئی بند و بست نہیں ہے۔ خان جہاں لودی نے واپسی سے قطعاً انکار کیا اور کہا
کہ تم سب واپس چلے جاؤ میں تنہا اپنے ذاتی آدمیوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کروں گا۔ اس اختلاف
نے بہت طول کھینچا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ خان اعظم، مان سنگھ، نرسنگھ دیو بندیلہ، خواجہ ابوالحسن
وغیرہ تمام سردار خانجہاں لودی کے خیمہ میں آئے اور سب نے مل کر منت سماجت کے ساتھ واپسی
پر آمادہ کرنا چاہا مگر خانجہاں کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ اسی اصرار و انکار میں تین دن گزر گئے، اور
نظام شاہی فوج کے بعض دستے لشکر گاہ کے قریب پہونچکر شوخی دکھانے لگے جن کو شکست
دے دے کر بھگا دیا تھا۔ اس قضیہ کو طے کرنے اور خان جہاں کو واپس لیجانے کے لیے
مان سنگھ، خواجہ ابوالحسن اور دوسرے سرداروں نے یہ تدبیر سوچی کہ دستاویز تیار کی جائے اور
چنانچہ اس مضمون کی دستاویز لکھی گئی کہ خانجہاں واپسی پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے ہم مفاد
سلطنت اور شاہی مقاصد کو مد نظر رکھ کر مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہاں سے واپس لوٹ
چلیں اور دولت آباد کی طرف ہرگز قدم نہ بڑھائیں۔ ہم سب مجبور کرکے خانجہاں کو واپس
لیے جاتے ہیں اگر ہماری اس واپسی کو بادشاہ نے ناپسند کیا تو ہم ہی شاہی عتاب کے مورد

ہوں گے خانجہاں پر اُسکا کوئی اثر نہ ہوگا - یہ تحریر بطور دستاویز خان جہاں کو سپرد کی جاتی ہے - جب سب کے دستخطوں سے مکمل ہوکر یہ تحریر خان جہاں کے روبرو پیش ہوئی تو وہ واپسی پر آمادہ ہوا - لیکن ابھی کوچ نہ ہوا تھا کہ ملکاپور سے شاہزادہ کی تحریر پہونچی کہ احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے ذریعے صلح کی درخواست بھیجی ہے اور دربار بیجاپور سے سفارت ہمارے پاس پہونچی ہے - عارضی طور پر جنگ ملتوی کرکے تمام سردار و امراء مع فوج ملکاپور واپس آجائیں تاکہ صلح کے معاملے میں مشورہ کیا جاسکے - چنانچہ سب ملکاپور پہونچے اور صلح نامہ مرتب ہوا - اسی قصبۂ ملکاپور میں جبکہ صلحنامہ کی تحریر و تکمیل ہو رہی تھی ۲۰ ماہ محرم ۱۰۲۰ھ کو حبیب اللہ ہروی، خان جہاں لودی کے ملازم نے کتاب مخزن افغانی لکھنی شروع کی اور ۱۰ محرم ۱۰۲۱ھ کو برہان پور میں یہ کتاب ختم کی - صلحنامہ کی تحریر و تکمیل کے بعد شہزادہ پرویز ملکاپور سے روانہ ہوکر آخر ماہ محرم ۱۰۲۰ھ کو مع امرا برہان پور پہونچ گیا - ماہ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ تک خان جہاں لودی برہان پور میں شہزادہ پرویز کے ہمراہ رہا - ۲ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو شاہی حکم کے بموجب خان جہاں لودی صوبۂ برار کا گورنر مقرر ہوکر برہان پور سے ایلچ پور کی جانب روانہ ہوا - بادشاہ جہانگیر نے صوبۂ برار کی گورنری کا فرمان اپنے قلم سے لکھ کر مع خلعت و شمشیر روانہ کیا تھا - اس زمانہ میں صوبۂ برار سرحدی صوبہ تھا اور اس صوبہ کی حکومت پر سب سے زیادہ ذی ہوش و معتمد اور طاقتور شخص کی ضرورت تھی - اسی سال بماہ شعبان شب جمعہ ایلچپور میں خان جہاں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی - خان جہاں نے صبح بیدار ہوکر اس خوشی میں اپنا تمام مال و اسباب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردیا - ایلچپور میں خان جہاں ذیحجہ ۱۰۲۲ھ تک مقیم رہا اور اس سرحدی صوبے کا نہایت اچھا انتظام کیا - یہاں اُسکے پاس بہت سے علما و صلحا وغیرہ جمع ہوگئے تھے - اس نے اپنے اوقات کا بڑا حصہ عالموں اور با خدا لوگوں کی صحبت میں گزارا - ایلچپور میں جہانگیر کا شقہ جو بادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا خان جہاں کے پاس پہونچا جسکے الفاظ یہ تھے :-

فرزند سعادت مند صاحب اقبال گوہر درج دولت و اجلال منظور انظار مربیانہ اقتدار خان جہاں باستفاضہ انوار خاطر دانش آرائے منظور و محفوظ بودہ خاطر اشرف اقدس ما رانگران خود شناسد و چوں مہمات دکن عمدۃ الملک رکن السلطنت خانخاناں سپہ سالار وابستہ بالفعل ہے کہ باعث تر تعب [illegible] فرزند [illegible] میان قسمت [illegible]

درگاہ سازد داگر درین باب تعلل نماید بعد ازیں بطلب او چیزے نوشتہ نخواہد شد۔"
اس شاہی شقہ کے پہونچنے پر بھگونداس وکیل سلطنت نے جو ایلچپور میں مقیم تھا خاں جہاں کو مشورہ دیا کہ شاہزادہ پرویز اور خانخاناں سے ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ خاں جہاں نے برہان پور میں شاہزادہ کو اطلاع دی۔ شاہزادہ نے خان جہاں کو فوراً لکھا کہ تم ایلچپور کو ہرگز نہ چھوڑو میں پادشاہ کو تمہاری نسبت لکھتا ہوں کہ خان جہاں کا ایلچپور سے جدا ہونا فی الحال کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ شاہزادہ کی تحریر کے دربار میں پہونچنے اور خاں جہاں کے نہ آنے پر خان جہاں کے حاسدوں کو باتیں بنانے اور جھوٹی شکایتیں کرنے کا خوب موقع ملا۔ اور پادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ خانجہاں خود ہی دربار میں آنا نہیں چاہتا کیونکہ شاہان دکن سے اُس نے تعلقات دوستی قائم کر لیے ہیں۔ جہانگیر کے دل پر بدگویوں کی باتوں کا اس قدر اثر ضرور ہوا کہ اُس نے خان جہاں کو برار کی صوبہ داری سے گجرات کی حکومت پر تبدیل کر دیا اور تبدیلی کے فرمان میں لکھا کہ گجرات کا صوبہ برار کے صوبہ سے بہتر ہے اور وہاں کولی اور بھیل قوم کے متمردوں نے جو پہاڑوں میں مسکن گزیں ہیں سرکشی اور بے راہ روی اختیار کی ہے تم ہی وہاں پہونچ کر اُنکا علاج بخوبی کر سکو گے۔ چنانچہ خان جہاں ایلچپور سے روانہ ہو کر اول برہان پور شاہزادہ پرویز کی خدمت میں پہونچا۔ پھر وہاں سے گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ شاہزادہ کو خان جہاں سے بہت محبت ہو گئی تھی اور وہ اُسکو اپنے پاس سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا۔ خانجہاں نے گجرات پہونچ کر قلعہ تھالینر میں قیام کیا اور چند روز میں وہ ملک ہر قسم کے فتنوں سے پاک ہو گیا۔ خان جہاں ڈیڑھ سال گجرات میں رہا اسکے بعد شہزادہ پرویز نے پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ خاں جہاں کے اب گجرات میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی میری خواہش ہے کہ خان جہاں کو میرے پاس برہانپور میں رہنے کی اجازت دیدیجائے۔ جہانگیر نے شہزادہ کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اور خان جہاں ۲۷ رشعبان ۱۰۲۳ھ کو تھالینر سے روانہ ہو کر یکم رمضان کو برہان پور میں شہزادہ کے پاس پہونچ گیا۔ خان جہاں کو شاہزادہ پرویز کے پاس برہان پور آئے ہوئے نو مہینے گزرے تھے کہ نور جہاں بیگم نے جہانگیر کو اس بات پر مجبور کیا کہ خان جہاں کو برہانپور سے دارالسلطنت میں بلوایا جائے۔ چنانچہ جہانگیر نے پھر خان جہاں کو خط لکھ کر شوق ملاقات کا اظہار کیا اور اپنے پاس بُلایا۔ اس مرتبہ شہزادہ پرویز کی تمام تدبیریں اور کوششیں بیکار ثابت ہوئیں جہانگیر کی طرف سے طلبی کے فرامین پیہم پہونچے اور ۴ر جمادی الثانی ۱۰۲۴ھ کو خاں جہاں برہان پور سے اجمیر کی طرف جہاں جہانگیر مقیم تھا روانہ ہوا۔ شاہزادہ پرویز نے خاں جہاں کو

بادِل ناخواستہ بچشم پُرآب رخصت کیا۔ خان جہاں جب اجمیر سے دو تین منزل پر پہونچا تو جہانگیر نے شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور خلعت و اسپ خاصہ معتمد خاص کے ذریعہ بھجوایا۔ جب اجمیر سے ایک منزل پر پہونچا تو بادشاہ نے اعتماد الدولہ پدر نور جہاں و آصف خاں وزیر اعظم مہابت خاں کو جو سب سے بڑے امیر تھے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ اجمیر میں خان جہاں کے لیے نہایت شاندار خیمہ و سراپردہ استادہ کرایا گیا۔ نور جہاں نے مٹھائیاں اور فواکہات اور بادشاہ نے مطبخ خاص سے انواع و اقسام کے کھانے بھجوائے۔ لحظہ بلحظہ بادشاہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی تحفہ پہونچتا رہا۔ نماز عصر کے بعد خان جہاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دُور سے دیکھتے ہی فرمایا کہ "بابا خان جہاں خوش آمدی پیش بیا" جب خان جہاں تخت شاہی کے قریب پہونچا تو بادشاہ نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر خان جہاں سے معانقہ کیا اور اُسکی پیشانی کو بوسہ دیا پھر نہایت محبت اور خصوصی التفات کے ساتھ حالات سفر اور خیریت دریافت کرتا رہا۔ خان جہاں نے نذرانے اور تحفے جو بہت قیمتی تھے پیش کیے۔ رات کو پھر بادشاہ نے صحبت خاص میں طلب کیا اور ہر قسم کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔ (یہاں تک خان جہاں لودی کے جو حالات لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر حبیب اللہ ہروی مصنف مخزن افغانی کی تحریر سے ماخوذ ہیں جو چشم دید راوی اور عینی شاہد ہے۔ حبیب اللہ ہروی کا بیان خانجہاں کو جہانگیر کے پاس بمقام اجمیر پہونچا کر ختم ہو جاتا ہے اور یہیں تک خان جہاں کے عروج و اقبال کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ آگے چل کر زوال شروع ہونے والا ہے)

خانجہاں کی زندگی کا نصفِ آخر

خان جہاں لودی ایک بہادر، باوفا، اور یکرنگ و یک رُخ انسان تھا۔ دربار سلطنت اس زمانے میں سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آصف خاں وزیر اعظم چاہتا تھا کہ جہانگیر کے بعد اُسکا داماد شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) تخت نشین ہو۔ اُسکی بہن نور جہاں بیگم جو سلطنت کے کاموں میں دخیل اور جہانگیر کے دل پر قابض تھی، شہزادۂ شہریار کو جہانگیر کے بعد بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ شہزادۂ پرویز کو خود جہانگیر نے ولیعہد بنایا تھا اور خان جہاں لودی و خان خاناں وغیرہ امرا اُسکے طرفدار تھے۔ نور جہاں نے خان جہاں کو برہانپور سے اسلیے بُلوایا تھا کہ اُس پر اثر ڈال کر شہریار کا ہوا خواہ و معاون بنائے۔ آصف خاں اس کوشش میں تھا کہ خانجہاں کو خورم کا طرفدار بنا دے۔ جہانگیر کے سامنے جب دکن کے معاملات پر خان جہاں کی موجودگی میں گفتگو چھڑی تو سارے دربار شہزادۂ پرویز کا مخالف نظر آیا۔ اُسکی برائیاں [illegible] نور جہاں اور آصف خاں دونوں کے طرفداروں نے یک زبان ہو کر بیان کرنی شروع کیں اور

اور خان جہاں سے جو سب سے بہتر اور ثقہ گواہ ہوسکتا تھا تائید چاہی - اگر خان جہاں دوسرے امیروں کی طرح زمانہ ساز اور چالاک شخص ہوتا تو یہ رنگ دیکھ کر کم از کم خاموش ہی رہتا، لیکن وہ اس قسم کا آدمی نہ تھا - اس نے نہایت جرأت کے ساتھ شہزادۂ پرویز اور خانخاں کی خوبیاں بیان کرکے نہ صرف اُسکی بیگناہی بلکہ مستحق ستائش ہونے کے زبردست دلائل اس خوبی سے بیان کیے کہ سب ہونٹ چاٹتے رہ گئے - ایک روز شہزادہ خورم (شاہجہاں) نے دربار خاص کی بے تکلف صحبت میں موقع پاکر پادشاہ سے استدعا کی کہ مجھ کو دکن کا ناظم بنا کر شہزادۂ پرویز کی جگہ برہان پور بھیجدیجیے میں ایک ہی سال میں سلطنت احمد نگر اور سلطنت بیجاپور کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کر دونگا" آصف خاں وزیر اعظم نے اسکی تائید کی لیکن خان جہاں لودی نے بلا تامل شہزادۂ خورم کو اس طرح مخاطب کیا کہ" یہ کلام آپ کی شان کے بالکل خلاف اور نہایت گستاخانہ ہے - آپ اپنے بڑے بھائی کی تحقیر کر رہے ہیں اور چھوٹے ہوکر بڑے پر فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں - آپ کو ہرگز کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی" - خان جہاں کے یہ بیباکانہ الفاظ اگرچہ جہانگیر کو ناگوار نہیں گزرے لیکن شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے لیے تیر و خنجر سے ہرگز کم نہ تھے - نہ صرف خورم بلکہ آصف خاں وزیر اعظم کے دل میں بھی خانجہاں کے ان الفاظ نے ناسور ڈال دیے - اور خان جہاں کے یہی الفاظ اُسکی تباہی کا باعث ہوے - نور جہاں بھی اس سپاہی پیشہ آزاد منش اور صاف گو سردار سے مایوس ہوگئی - نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے کوشش کرکے خان جہاں کو گجرات کی حکومت پر اور شہزادۂ پرویز کو برہان پور سے جدا کرا کر بنگالہ کی حکومت پر بھجوادیا - شہزادہ پرویز کا سب سے بڑا دوست اور معاون خان جہاں لودی تھا - جب اُسکی دوستی کو دشمنی میں تبدیل نہ کیا جا سکا تو ایک کو مشرق اور دوسرے کو مغرب میں بھجوادیا گیا تاکہ ایک دوسرے کو کوئی امداد نہ پہونچا سکے - اس کام سے فارغ ہوکر بہن اور بھائی یعنے نور جہاں اور آصف خاں کی سازشی معرکہ آرائی خوب زور شور سے شروع ہوئی - نور جہاں نے مہابت خاں کو تقویت پہونچا کر اپنا آلہ کار بنایا - آصف خاں نے بوڑھے سردار خان خاناں اور اُس کے بیٹوں کو اپنی طرف توڑ لیا - مگر دونوں کے لیے یہ دونوں سردار کچھ کارآمد ثابت نہ ہوے - آخر وہ وقت آگیا کہ شہزادہ خورم نے سرکشی اختیار کی - وہ جب بنگالہ کی طرف پہونچا تو شہزادۂ پرویز کو مہابت خاں کے ذریعہ امداد پہونچائی گئی - پرویز کے مقابلہ میں خورم کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی - وہاں سے وہ دکن کی جانب متوجہ ہوا تو شاہی حکم کے موافق پرویز بنگالہ کی حکومت مہابت خاں کو سپرد کرکے اُس کے تعاقب میں

میں روانہ ہوا۔ یہ سب نورجہاں کی تدبیریں تھیں کہ پرویز کو بنگالہ کی حکومت سے بھی جدا کردیا گیا ورنہ
خرم کے تعاقب میں مہابت خاں بھی جاسکتا تھا۔ شہزادہ خرم نے جب احمد نگر کی فوجوں کے
ساتھ برہان پور کا محاصرہ کیا تو خان جہاں لودی کا سب سے بڑا دوست اور دست راست لودیجا
نامی سردار جو برہان پور میں موجود تھا لڑائی میں مارا گیا۔ شہزادہ پرویز نے بنگالے سے برہانپور پہونچکر
شہزادہ خرم کو شکست دیکر بالکل بے سازوسامان بنادیا۔ برہان پور سے بحالت تباہ شہزادہ خرم
ٹھٹھہ کی جانب اس ارادے سے آیا کہ ملک ایران کی طرف چلا جائے۔ آصف خاں اپنے داماد
شہزادہ خرم کی اس خطرناک حالت سے بیخبر نہ تھا۔ اسکے توڑ جوڑ عین وقت پر کام آئے۔ ادھر
مہابت خاں جو بنگال پر حکومت کررہا تھا آصف خاں سے مل گیا ادھر شاہزادہ پرویز مرض
میں مرگ مفاجات کا شکار ہوا۔ شہزادہ پرویز کے یکایک فوت ہوجانے پر حیرت تو سب کو ہوئی
مگر اسکی وفات کا اصلی سبب کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ مہابت خاں نے بنگال میں سرکشی کا اظہار
کیا۔ ان واقعات نے بچھی ہوئی شطرنج کی چالوں میں تغیر عظیم پیدا کردیا۔ خرم ایران کا ارادہ
فسخ کرکے دکن کی جانب چلا گیا۔ پرویز کے مرتے ہی خان جہاں لودی کی جانب سے اب کسی کو
کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔ خرم نے خان جہاں لودی صوبہ دار گجرات کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ
سفارش کرکے بادشاہ سے میری خطائیں معاف کرادیں۔ ادھر مہابت خاں نے بادشاہ کی
خدمت میں عفو تقصیرات کی درخواست بھیجی۔ دونوں کی خطائیں معاف ہوئیں۔ خرم
(شاہجہاں) تو دکن کی جانب رہا۔ مہابت خاں کو بنگالہ سے دربار شاہی میں طلب کیا گیا۔
خان جہاں لودی کو ناظم دکن بنا کر گجرات سے برہانپور تبدیل کیا گیا۔

مہابت خاں جو پہلے نورجہاں کے اشاروں پر کام کرتا تھا اب آصف خاں کے مقاصد
کا مؤید تھا۔ وہ بنگالہ سے خوب مستعد ہوکر اور راجپوتوں کی تازہ فوج بھرتی کرکے اپنے ہمراہ لیکر
حاضر ہوا اور غالباً آصف خاں کے مشورہ اور سازش سے جہانگیر کو قید کرلیا۔ مہابت خاں کی
قید سے آزاد ہوکر جہانگیر کا جلدی ہی یعنی ماہ صفر ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہوگیا۔ شہریار تخت نشین
ہوکر مارا گیا اور ہندوستان کی حکومت شہزادہ خرم کے حصہ میں آئی جو شاہجہاں کے نام سے
ہندوستان کا مشہور بادشاہ ہوا۔

شاہجہاں نے تخت نشین ہوکر تمام امرا کے مناصب و مراتب بلند کیے۔ آصف خاں
بدستور وزیر اعظم اور مدار المہام سلطنت رہا۔ مہابت خاں کو خانخاناں کا خطاب ملا۔ خان جہاں لودی

کی باتیں بادشاہ اور وزیر دونوں کو یاد تھیں۔ اُسکا استیصال فوراً مناسب نہ سمجھ کر اول صرف یہ انتظام کیا گیا کہ خانجہاں کو برہان پور سے مالوہ کی صوبہ داری پر تبدیل کر کے مہابت خاں خانخاناں کو ناظم دکن بنایا گیا اور خانخاناں کو حکم دیا گیا کہ تم اپنی طرف سے اپنے بیٹے خان زماں کو برہانپور بھیجدو۔ خان جہاں برہان پور سے مالوہ آکر ابھی اطمینان سے بیٹھنے نہ پایا تھا کہ جھجار سنگھ ابن نرسنگدیو بندیلہ نے علامات سرکشی کا اظہار کیا۔ اُسکی سرکوبی کے لیے خانجہاں کے پاس حکم پہونچا اور بعض دوسرے امرائے شاہی بھی اس مہم پر مامور ہوے۔ خانجہاں نے اس مہم میں حسب توقع اپنی شجاعت و قابلیت کا اظہار کیا۔ بندیلہ مذکور کو عاجز کر کے حکم شاہی کے موافق اُسکے مقبوضہ علاقہ کا بڑا حصہ اُس سے جدا کر لیا گیا۔ اور بھاری نذرانہ وصول ہونے کے بعد اُسکی خطا معاف ہوی۔ خان جہاں لودی کا یہ کارنامہ سنہ جلوس اول شاہجہانی میں ظہور پذیر ہوا لیکن اُس گرہ کو جو اُسکی طرف سے شاہجہاں کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی نہیں کھول سکتا تھا۔ امرائے دربار بھی معہ آصف خاں وزیر اعظم درپئے انتقام تھے۔ ایسے بے عذر، بہادر اور شمشیر برہنہ شخص کو کسی خطرناک مہم اور ہلاکت کے مقام میں بھیجکر اُس کا قصہ پاک کرا دینا کوئی دشوار کام نہ تھا، اور بادشاہ ہر قسم کی بدنامی اور مردم ناشناسی کے الزام سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اس طرح خانجہاں لودی کی شہرت و عزت کو کوئی نقصان نہ پہونچتا اور وزیر و بادشاہ دونوں کے جذبہ انتقام کو پوری تسکین حاصل نہ ہوتی لہذا اب خانجہاں کو زیادہ مہلت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اُسے آگرہ طلب کیا گیا یا وہ خود جھجار سنگھ بندیلہ کی مہم سے فارغ ہو کر رسم تہنیت ادا کرنے آیا۔ بادشاہ بظاہر عزت کے ساتھ پیش آیا لیکن صوبۂ مالوہ کی طرف واپس جانے کی اجازت اور رخصت نہیں دی گئی۔ وہ چند روز آگرہ میں مقیم اور روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہوتا رہا۔ کسی صوبہ دار کو اُسکے صوبہ کی طرف جانے کے لیے رخصت نہ کرنا معمولی بات نہ تھی۔ خانجہاں اس طرز عمل سے پہلے ہی اندیشہ مند تھا کہ اسی اثنا میں اُسکو معلوم ہوا کہ وہ معہ اہل و عیال گرفتار ہو کر کُتے کی موت مارا جائے گا۔ یہ سن کر خانجہاں بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اپنے دروازہ کے سامنے پٹھانوں کی فوج کا جو اُسکے ہمراہ تھا پہرہ مقرر کر کے دربار میں جانا ترک کر دیا۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ مخلص خاں کے بیٹے نے جو خانجہاں کے بیٹے کا دوست تھا محض دلگی اور مذاق کے طور پہ یہ کہا تھا کہ خانجہاں کو بہت جلد قرار واقعی سزا ملنے والی ہے۔ یہی باعث خانجہاں کے وہم کا ہوا۔ مگر یہ مورخ موصوف کی دلگی، ور شاہجہاں کی غیر مفید وکالت ہے۔ خانجہاں لودی کوئی جنگلی، پہاڑی، وحشی یا گنوار

آدمی نہ تھا کہ اس طرح لڑکوں کی گفتگو اور دل لگی کی باتوں میں آکر ایسی غیر معمولی حرکت کا ارتکاب کرتا۔ وہ اول درجہ کا امیر، خانجہاں، فرزند شاہ کے خطاب سے مخاطب اور دکن کے چار صوبوں کا وائسرائے رہ چکا تھا۔ جہانگیر کے دربار میں اُس کی سب سے زیادہ عزت و توقیر تھی۔ وہ عبدالرحیم خانخاناں، مرزا عزیز کوکہ، مان سنگھ، شہزادہ پرویز کی سفارشیں کرکے شاہی عتاب سے انکو بچا چکا تھا۔ جہانگیر کے خاص الخاص مشوروں میں دوسرے تمام وزراء سے بڑھ کر اپنے صائب الرائے ہونے کا ثبوت پیش کرتا رہا تھا۔ وہ صاحب السیف والقلم تھا۔ یعنی شجاعت وبہادری کی مخصوص صفت کے علاوہ علم وفضل سے بھی بے نصیب نہ تھا۔ اُس کی ساری عمر میدان جنگ میں سپہ سالاری اور درباروں میں پادشاہ کی مصاحبت وندیمی کرتے ہوئے گزری تھی۔ شہزادوں اور وزیروں کی صحبت اُسکو ہمیشہ رہی تھی۔ وہ خود دل کا صاف، زبان کا سچا، قول کا پکا اور وعدہ کا وفا کرنے والا تھا لیکن دنیا داروں کی چالاکیوں اور دھوکہ بازیوں کو ساری عمر دیکھتا رہا تھا۔ ایسے شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اُس نے ایک لڑکے سے دل لگی کی بات سنکر بلا وجہ دربار کا جانا ترک کر دیا اور اپنے دروازہ پر اپنے ہم قوم پٹھانوں کا پہرہ مقرر کیا سب سے زیادہ تمسخر انگیز بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانجہاں کو ہلاک اور ذلیل کرنے کے منصوبے مکمل ہو چکے تھے۔ خان جہاں کو اسکی صحیح صحیح خبریں ضرور معلوم ہو چکی تھیں۔ کوئی دوسرا کم ہمت شخص ہوتا تو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے چھری کے نیچے گردن رکھ دیتا۔ یا خانجہاں اگر حقیقتاً اپنے آپ کو خطاوار جانتا تو وہ بھی ہر قسم کی سزا برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن وہ چونکہ اپنے آپ کو بالکل سچا یقین کرتا تھا۔ لہذا آخر وقت تک مدافعت اور بہادروں کی طرح جان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ منتخب اللباب کی ست ہے کہ شاہجہاں کو جب خانجہاں کے اس طرح گوشہ نشین ہونے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے سلام خاں کو تسلی کے لیے بھیجا اور اسکو ہر قسم کا اطمینان دلایا۔ چنانچہ خانجہاں پھر بدستور دربار ں آنے لگا۔ مگر چند روز کے بعد بعض مصاحبوں نے خانجہاں کو یقین دلایا کہ یہ چند روزہ ڈھیل مصلحتاً دی گئی ، اور ہلاکت بہت قریب ہے۔ مصاحبوں کے اس بیان کو بھی منتخب اللباب میں غلط ہی بتایا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر شخص خان جہاں ہی سے دل لگی کرتا تھا اور لطف یہ کہ آئندہ واقعات سے یہ تمام دل لگی کی باتیں حقیقت واصلیت کے سانچے میں ڈھلجاتی ہیں۔

ست وبہادری کے حیرت انگیز کارنامے

آخر ایک روز رات کو دو گھڑی رات گئے خان جہاں آگرہ سے روانہ ہوا جس کی

تفصیل خافی خاں نے ان الفاظ میں بیان کی ہے

"شبے از شبہا بعد از انقضائے دو ساعت نجومی با سائر متعلقان صغیر و کبیر کہ بعضے را
بر فیلان و برخے را بر اسپان برقع پوش سوار نمودہ جریدہ خانہ بدوش گشتہ معہ دو ہزار
سوار افغان جرار کہ اکثر آں از خویش و تبار و یکجان و دو قالب بودند و دوازدہ نفر
فرزندان و داماد و دو صد سہ صد پیادہ و شاگرد پیشہ ہوا خواہ قدیمی از آگرہ نقارہ و
طبل زناں برآمدہ مرحلہ پیمائے تیہ حیرانی گردید"

شاہجہاں کو خان جہاں کے اس طرح آگرہ سے فرار ہونے کا حال معلوم ہوا اُس نے فوراً خواجہ
ابو الحسن - خدمت پرست خاں عرف رضا بہادر میر آتش - سید مظفر خاں بارہہ - نصیر خاں -
خواص خاں بھٹی - مرحمت خاں بخشی - راجہ بتھیلداس سہ ہزاری پسر راجہ گوپال داس - راجہ
پرتھی راج - معتمد خاں - خان زماں - رائے رایان - راجہ جے سنگھ وغیرہ بیس[2] مشہور سرداروں
کو تیس چالیس ہزار فوج اور زبردست توپخانہ کے ساتھ خانجہاں کے تعاقب میں روانہ کیا -
شاہجہاں کو جب خانجہاں کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا اُس سے چار گھڑی یعنے ڈیڑھ
گھنٹہ بعد یہ فوج آگرہ سے روانہ ہو چکی تھی - سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ صرف دو ہزار پٹھانوں
کی فوج کے تعاقب میں بیس[2] بڑے بڑے سپہ سالار ایک عظیم الشان لشکر اور زبردست توپ خانہ
لیکر روانہ ہوتے ہیں - آدھی رات کا وقت ہے جبکہ سب آرام میں ہیں - اس قدر جلد اس لاؤ لشکر
کا مرتب و مسلح ہو کر روانہ ہو جانا یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہی رات خانجہاں کے گرفتار و قتل کرنے
کی پہلے سے مقرر ہو چکی تھی - اور یہ تمام سردار معہ اپنی اپنی فوج اور توپخانہ کے پہلے سے مستعد
اور حکم کے منتظر تھے کہ حکم پاتے ہی خانجہاں کے مکان کا محاصرہ کر لیں - خانجہاں کو اتفاقاً
تھوڑی دیر پہلے اسکا علم ہوا اور وہ نہایت سراسیمگی کے عالم میں اپنا ننگ و ناموس بچانے کے
لیئے اس طرح روانہ ہوا کہ عورتوں کو برقعے پہنا کر گھوڑوں پر سوار کرنا پڑا - اگر اُسکو پہلے سے
اسکا علم ہو گیا ہوتا تو یہ کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ وہ کم از کم اتنے ہاتھی فراہم کر لیتا کہ عورتیں اُن پر
سوار ہو سکتیں - یا وہ اپنی کوئی جائے پناہ متعین کر کے عورتوں کو پہلے سے وہاں بھیجدیتا - لیکن
آئندہ پیش آنے والے واقعات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ خانجہاں اپنے لیئے کوئی جائے پناہ
اور منزل مقصود متعین کیئے بغیر آگرہ سے روانہ ہوا تھا - خانجہاں کی ہیبت اور اُسکا رُعب
شاہجہاں کے دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا اسکا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ

کہ دو ہزار کے چھوٹے سے لشکر کو جس کے ساتھ عورتیں، بچے، مال و اسباب اور شاگرد پیشہ لوگ بھی تھے اس قدر خطرناک تصور کیا تھا کہ مذکورہ عظیم الشان لشکر کو بھی جو رات ہی میں روانہ ہو چکا تھا کافی ہو چکا تھا کافی نہ سمجھ کر صبح اُٹھتے ہی شاہجہاں نے آگرہ سے پیہم کمکی فوجیں بھیجنا شروع کر دیں۔ خان جہاں کی بہادری و سپہ سالاری کے مرتبے کو سمجھنے کے لیے مذکورہ تصور سے بہت کچھ روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ خان جہاں کے دل گردہ کا اس بات سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آگرہ سے چوروں کی طرح نہیں بھاگا بلکہ نقارہ بجاتا ہوا چلا۔

جنگِ چمبل

آگرہ سے اٹھارہ کروہ (کوس) کے فاصلہ پر جبکہ خانجہاں دریائے چمبل کو عبور کرنے کیلیے کشتیاں فراہم کر رہا تھا اور سورج افقِ مشرق سے کچھ تھوڑا ہی بلند ہوا تھا کہ مذکورہ شاہی لشکر پہونچ گیا۔ خانجہاں نے اس عجلت میں عورتوں اور بچوں کو دوسرے کنارے پر پہونچایا اور خود دریا کے اسی طرف رُک کر حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ تماشا دیکھنے کے قابل ہوگا جبکہ نہایت گرانبار بے معین و مددگار مٹھی بھر فوج اس عظیم الشان شاہی لشکر کے مقابلے میں جسکی پشت پر کمکی فوجوں کا تانتا بندھا ہوا تھا مصروفِ جنگ ہوئی ہوگی۔ خان جہاں کے لیے یہ اور بھی نازک موقع تھا کہ اُسکی پشت پر دریا تھا۔ نہ اِدھر اُدھر حرکت کرنے کا موقع تھا، نہ کسی امداد کی توقع تھی۔ مگر شاہی لشکر کا سیلاب ان مٹھی بھر افغانوں سے ٹکرایا تو معلوم ہوا کہ دریائے چمبل کے کنارے کوئی ریتی کی دیوار نہیں بلکہ فولادی قلعے کی دیوار یا سنگ خارا کا ایک پہاڑ تھا۔ پانی کا سیلاب جب پہاڑ سے ٹکراتا ہے تو شور بلند ہوتا ہے۔ یہاں بھی غریو لشکر سے میدان گونج اُٹھا۔ بہادری و مردانگی نے اپنے پورے حسن و جمال کا تماشا دکھایا۔ شجاعت نے مَردوں کے منہ چومے تہور نے تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھاتی سے لپٹا لیا۔ خون کی بارش نے صفحۂ زمیں کو زرافشاں بنایا اور مقتولوں کی خون فشاں لاشوں نے اُس پر بیل بوٹے بنائے دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی عورتیں اپنے شوہروں، بھائیوں، اور بیٹوں کی جاں فشانیوں کو سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھیں اور دریائے چمبل کا آبِ رواں اپنی سُریلی آواز میں اس طرح نغمہ خواں تھا ؎

بہادر جو نامی ہیں وقتِ ستیز ‏ ‏ بڑن میں، نہیں رکھتے پائے گُریز

اس ستیز و آویز کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان جہاں کے دو بیٹے عظمت خاں و حسین خاں، ایک داماد شمس خاں اور شمس خاں کے دو بھائی محمد خاں و محمود خاں کُل پانچ قابلِ تذکرہ سردار اور کُل ستر پٹھان کُشتوں کے پُشتے لگا کر شجاعت و مردانگی کا آخری مرحلہ طے کر گئے اور سرخروئی کے ساتھ اس جہانِ فانی ..

سے عالم جا ودانی کی جانب رخصت ہوئے۔ ان پانچوں مذکورہ سرداروں کی نسبت پٹھانوں کے مخالف اور غیر ہمدرد مورخ خافی خاں کے الفاظ یہ ہیں کہ

ہر پنج پنجہ شیر ثریاں را روز نبرد رنجہ می داشتند ودر معرکہ مصاف فیل دماں را اماں نمی دادند"

خان جہاں کے مذکورہ نقصان کو مد نظر رکھتے ہوئے شاہی لشکر کے نقصانات پر بھی غور کرو خدمت پرست خاں میر آتش۔ سید محمد خاں نبیرہ سید مظفر خاں بارہہ۔ سید محمد شفیع نبیرہ سید مظفر خاں بارہہ۔ راجہ بیتھلداس کے دو بھائی۔ سادات بارہہ کے ۱۹ اور ستاس بہادر۔ کئی راجپوت سردار۔ سترمغل سردار جان سے مارے گئے۔ اور راجہ بیتھلداس، راجہ پرتھی راج، سید مظفر خاں بارہہ۔ خواص خاں بھٹی ایسے زخمی ہوئے کہ لاشوں میں سے زندہ نکالے گئے اور کئی کئی مہینہ کے علاج معالجہ کے بعد اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ شاہی لشکر کے تمام مقتولین کی کوئی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ لیکن انکی تعداد کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ خانجہاں تو جس اس شاہی لشکر کا دریائے چمبل کے کنارے ستھراؤ کر کے دریائے چمبل کے پار ہو کر روانہ ہوا ہے تو اگلے روز یعنی لڑائی ختم ہونے اور خان جہاں کے دریا سے عبور ہو کر روانہ ہونے کے بعد ۱۲ گھنٹے تک بقیۃ السیف شاہی لشکر کو لاشوں کے دفن کرنے سے فرصت نہ ملی۔ آگرہ سے تازہ دم فوجیں بھی پہونچ گئیں اور اگلے روز دوپہر کو شاہی لشکر دریائے چمبل کو عبور کر کے خانجہاں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مذکورہ زخمیوں کو دھولپور میں چھوڑا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ خانجہاں گوالیار، چندیری، بندیلکھنڈ ہوتا ہوا گونڈوانہ پہونچا۔ شاہی لشکر کے دل پر خانجہاں کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ وہ خان جہاں سے دور ہی دور پیچھے پیچھے رہا۔ گونڈوانہ سے خانجہاں احمدنگری سلطنت نظام شاہی میں داخل ہوا۔ اور دولت آباد پہونچ کر قیام کیا۔ شاہی لشکر مالوہ کے پہاڑوں اور جنگلوں کو طے کرتا اور خان جہاں کا سراغ لگاتا ہوا بگلانہ پہونچکر مقیم ہوا۔ شاہجہاں کو اطلاع دیگئی کہ بغیر آپ کے تکلیف فرمائے کام نہیں چلیگا۔ بیتھلداس، پرتھی راج، سید مظفر بارہہ، خواص خاں بھٹی وغیرہ مذکورہ مجروحین اب اچھے ہوگئے تھے۔ شاہجہاں نے انکو بلا کر خلعت ہائے فاخرہ اور بڑے بڑے انعام عطا کیے انکے مناصب و مراتب بھی بڑھائے۔ خواجہ ابو الحسن اور دوسرے سردار جو تعاقب فوج کو لیے ہوئے بگلانہ میں خیمہ زن تھے وہ بھی مورد تحسین و آفرین ہوئے ان کے مناصب میں بھی اضافہ کیا گیا۔

خان جہاں کے مقابلہ پر شاہجہاں

یکم ربیع الآخر ۱۰۳۹ھ کو شاہجہاں ایک عظیم الشان
لشکر ہمراہ لیکر آگرہ سے روانہ ہوا۔ کوچ و مقام کرتا
ہوا دریائے نربدا کو عبور کرکے سرحد خاندیس میں داخل ہوا اور ارادت خاں و شائستہ خاں و
اعظم خاں و راجہ گج سنگھ کی سرداری میں پچاس ہزار فوج دیکر ارادت خاں کو اس کل فوج کا
افسر اعلیٰ اور ذمہ دار سپہ سالار بنا کر خان جہاں کی گرفتاری کی تاکید کی اور خود ۸ جمادی الآخر
۱۰۳۹ھ برہانپور پہونچکر قیام کیا۔ اسی دوران قیام میں برہان پور کا نام دارالسرور تجویز ہوا۔
خواجہ ابو الحسن جمرچہ برہان پور میں حاضر ہوکر باریاب خدمت ہوا۔ اسکو بدستور خانجہاں کی گرفتاری
پر مامور رکھ کر اسکے ساتھ شاہ نواز خاں کو بھی ایک شائستہ فوج دیکر روانہ کیا گیا۔ شیر خاں گورنر
گجرات کے پاس حکم بھیجا گیا کہ احمد آباد میں اپنا نائب اور قائم مقام چھوڑ کر معہ لشکر گجرات
ابو الحسن کی مدد کو پہونچو۔ بگلانہ کے راجہ کو فرمان بھیجا گیا کہ اپنی پوری طاقت اور تمام ذرائع کو
شاہی لشکر کی امداد و اعانت میں صرف کرو۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور شمالی ہند کی مغلیہ
سلطنت کے درمیان اگرچہ پہلے سے حالت جنگ قائم تھی مگر شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد کوئی
خصوصی سرگرمی طرفین سے ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اب خانجہاں کے اس طرف آجانے پر شمالی ہند کی
فوجوں کا ٹڈی دَل دکن کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ریاست احمد نگر نے بھی مقابلہ کی تیاری کی۔
شاہجہاں نے کالپی کے صوبہ دار عبد اللہ خاں کو بھی بُلا کر اس حملہ آوری میں شریک کیا۔
تلنگانہ، خاندیس، بگلانہ تین طرف سے ریاست احمد نگر پر حملہ آوری شروع ہوئی۔ امام قلی خاں
پسر جاں سپار خاں، پسر شجاعت خاں، راجہ ستر سال سنگھ برادرزادہ مانسنگھ، دیانت خاں
غیرہ نامی سردار لڑائیوں میں مارے گئے۔ گردھر داس اور بہت سے راجپوت سردار زخمدار
ے شاہجہاں نے ریاست احمد نگر پر نہ صرف جنگی دباؤ ڈالا بلکہ امرائے احمد نگر اور رعایائے احمد نگر
اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش و سازش بھی جاری رکھی۔ چنانچہ اسی دوران جنگ میں
ت سے سرداران ریاست احمد نگر آ آکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے بڑے
اصب اُنکو عطا کیے گئے۔ ان لوگوں میں جادو رائے (سیوا مرہٹہ کا نانا)۔ ساہو بھونسلہ
سیوا مرہٹہ داماد جادو رائے)۔ جگدیو (جادو رائے کا سالا)۔ تلنگ راؤ۔ تادجی وغیرہ مرہٹے
س طور پر قابل تذکرہ ہیں جن کو بڑی بڑی جاگیریں اور اعلیٰ درجہ کے منصب شاہجہاں سے
کیے۔ اسی زمانہ سے مرہٹوں کے حوصلے بلند ہوئے اور نظام شاہی حکومت کی نگاہ میں

بھی اس غداری کے سبب اُنکی اہمیت بڑھ گئی۔ مسلمان سرداروں میں ساداتت خاں اور شرزہ
خاں قابل تذکرہ ہیں جو شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہو کر مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ شاہجہاں
کی اس تدبیر نے نہ صرف ریاست احمدنگر ملکہ خانجہاں لودی کو بھی سخت پریشاں و متحیر بنا دیا۔

جنگِ راجوری

مذکورہ غدار مرہٹوں کی تحریک اور شاہجہانی ترغیب سے مرہٹوں کی
جمعیتوں نے فرنگیوں کو اپنے ساتھ ...... شامل کرکے ساحل سمندر
کی جانب ریاست احمدنگر کے لیے سخت مشکلات پیدا کردیں لیکن خان جہاں نے ایک طرف
شاہی لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا دوسری طرف وہ فرنگیوں اور مرہٹوں کے اس
فتنے کو بھی فرو کر رہا تھا۔ جو شاہی فوج خان جہاں کے مقابلہ پر معرکہ آرا تھی۔ خان اعظم اسکا
سپہ سالار اعظم تھا اور یہی سب سے بڑی اور زبردست فوج تھی۔ جب اعظم خاں (خان اعظم)
سے عرصہ دراز تک کچھ نہ ہوسکا تو شاہجہاں نے اعظم خاں کی جگہ آصف خاں وزیر اعظم کو سپہ سالار
بناکر برہان پور سے روانہ کیا۔ اعظم خاں کو بمقام مچھلی گانوں جب آصف خاں کے مامور ہونے
کی خبر پہونچی تو بہت نادم و شرمندہ ہوا۔ اسی اثنا میں خبر پہونچی کہ خان جہاں لودی مرہٹہ اور
فرنگی باغیوں کی سرکوبی سے فارغ ہوکر تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ معہ اہل و عیال قصبہ راجوری
میں مقیم اور شاہی لشکر کی جانب سے بالکل بے خوف و مطمئن ہے۔ اعظم خاں نے اپنی ابتک
کی ناکامیوں کی تلافی کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر آصف خاں کے آنے سے پہلے ہی ایک
عظیم الشان جرار لشکر کے ساتھ یلغار کیا اور خان جہاں لودی کو جا گھیرا۔ اعظم خاں کے ساتھ اس
یلغار میں بہادر خاں ابن دریا خاں، راجہ جے سنگھ، راجہ بیٹھلداس، سپہدار خاں، خواص خاں،
سردار خاں، مرحمت خاں، اہتمام خاں داروغہ توپخانہ، ناہرداس جہالہ، راجہ انوپ سنگھ،
راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ، خان زماں، دلہراسپ پسران مہابت خاں، شیر خاں، شاہ نواز خاں،
چندرمن بندیلہ، کیلوجی مرہٹہ، اچجی رام مرہٹہ، جگدیو مرہٹہ، صف شکن خاں وغیرہ نامی
گرامی سردار موجود تھے۔ خان جہاں لودی نے اس بلاے ناگہانی کے ورود پر عزم و استقلال کو
ہاتھ سے نہیں دیا۔ عورتوں اور بچوں کو معہ ساز و سامان قریبی پہاڑ کے دروں میں بھیجدیا اور
خود اپنی قلیل جمعیت کو جو اس کے رشتہ داروں اور قابل اعتماد شاگردوں پر مشتمل تھی لیکر مقابلہ
پر ڈٹ گیا اور شاہجہانی لشکر کو جنگ جمیل کا مزا ایک مرتبہ پھر چکھا دیا۔ اس معرکہ کی ایک خاص
قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ بہادر خاں ابن دریا خاں شاہی مقدمۃ الجیش کا سردار اور سب سے

زیادہ بہادر شخص تھا دوسری طرف اُس کا باپ دریا خاں لودی خان جہاں لودی کا ہمدم و دستِ راست اور چوٹی کا سردار تھا۔ دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ خان جہاں لودی کے ایک بھتیجے کا نام بھی بہادر خاں تھا وہ اپنی بہادری اور صف شکنی میں بہادر خاں ابن دریا خاں کا حریف اور مدمقابل تھا۔ شاہی فوج نے خانجہاں لودی اور اُسکے ہمراہیوں کو چاروں طرف سے احاطہ کر لیا۔ بظاہر کوئی صورت خاں جہاں کے بچنے کی باقی نہ رہی تھی۔ تیر اور تلوار اور نیزہ و خنجر کے علاوہ شاہی فوج کا ایک بڑا حصہ بندوقوں سے بھی مسلح تھا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شاہجہانی سردار بہادر خاں ابن دریا خاں تیر کے دو زخم اور تلوار کا ایک زخم کھا کر ہلاک ہوا۔ ناہر سنگھ جھالا بھی اُسکے ساتھ مارا گیا۔ ایک خونریز شدید شمشیر زنی کے بعد شاہی لشکر میں شکست کے آثار نمودار ہوئے یعنی تمام لشکر سمٹ کر ایک پشتہ کوہ کی طرف مجتمع ہوا اور خان جہاں جو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں مصروف حریف افگنی تھا میدان پر قابض نظر آیا۔ شاہی لشکر نے سمٹ کر اور سنبھل کر پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تلواروں کی بجلیوں نے چمک چمک کر دامن کوہ میں خون کے ندی نالے بہا دیے اور شجاعتِ افغانیہ نے شاہجہانی لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ اس مرتبہ بہادر خاں برادر زادۂ خانجہاں لودی بہت سے زخم کھا کر میدان جنگ میں کام آیا اور دوست و دشمن دونوں کو بتا گیا کہ بہادر ایسے ہوتے ہیں اور میدان جنگ میں اس طرح جان دیا کرتے ہیں۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ

"ہر کہ از زخم کاری می رسید آرزوے زخم دیگر نمودہ قدم جرأت بقصد سربازی پیش می گذاشتند تا آنکہ بہادر خاں از طرف خصم از زخمہاے پیاپے از پا درآمد بہادر خاں کہ از بسیاریِ زخم افتادہ بود چوں رمقے باقی داشت بحدِ غیرت از جاے خود برخاستہ باز روے بلشکر پادشاہی دست بشمشیر بردہ حملہ ہاے مردانہ نمودہ آخر بزخم گولہ تفنگ افتاد۔ راجپوتے آمد کہ سر او را جدا سازد چہرہ از کمر برآوردہ چناں افتادہ بر راجپوت انداخت کہ گوشش او بیاد داد و راجپوت زخم خوردہ دست از و برداشت سر او را جدا ساختہ با انگشتریِ دست و یراق او نزد اعظم خاں آورد۔"

خان جہاں لودی نے اب میدان میں دیر تک قیام مناسب نہ سمجھ کر اپنے اہل و عیال کی طرف منہ موڑا اور اُنکو ہمراہ لیکر صاف نکل گیا۔ جس ہاتھی پر عورتیں سوار تھیں وہ ایسا مرکب

تھا کہ چل نہ سکا مجبوراً عورتوں کو گھوڑوں پر برقع پوش سوار کرا کر روانہ ہوا۔ شاہی فوج میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُس کا تعاقب کر سکتی۔ شاہی لشکر کو اس لڑائی میں بہت سے آدمی اور متعدد سردار قتل کرا کر صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ خان جہاں کا بھتیجا بہادر خاں مارا گیا۔ بہادر خاں کی انگوٹھی اعظم خاں نے برہان پور بادشاہ کے پاس روانہ کی۔ اس انگوٹھی کے نگینے پر بہادر خاں کا نام کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی اس بات کی زبردست دلیل تھی کہ بہادر خاں مارا گیا۔ شاہجہاں نے اس انگوٹھی کو دیکھ کر خوشی کے شادیانے بجوائے اور برہان پور میں چراغاں کیا گیا۔

احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کو اگرچہ خان جہاں کے پہونچنے سے بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی اور خانجہاں کی پامردی و جوانمردی کا نتیجہ تھا کہ اس چھوٹی سی ریاست نے ہندوستان کے شہنشاہ شاہجہاں کا کامیاب مقابلہ کر کے اپنا رعب و وقار قائم رکھا۔ لیکن اب مسلسل معرکہ آرائیوں سے تنگ آکر دربار احمد نگر صلح کی جانب مائل اور خان جہاں کو گرفتار کر کے شاہجہاں کے سپرد کرنے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ خان جہاں تک یہ خبریں پہونچ چکی تھیں لہذا اس دکن کو بھی اپنے لیے جائے پناہ نہ دیکھ کر اس بات پر آمادہ ہوا کہ مالوہ و راجپوتانہ و پنجاب کے وسیع ملکوں کو چیرتا ہوا پشاور و افغانستان کے پہاڑوں میں پہونچ کر دم لے جہاں پٹھانوں کے قبائل سے اُسکو ہمدردی و اعانت کی توقع تھی۔ خان جہاں جب حدود ریاست احمد نگر سے نکل کر حدود خاندیس میں داخل ہوا تو شاہجہاں حواس باختہ اور بے حد فکر مند ہوا۔ اُس نے عبداللہ خاں۔ سید مظفر خاں بارہہ۔ سرفراز خاں، درگا داس۔ مادھو سنگھ۔ لہ تاز خاں وغیرہ سرداروں کو فوجیں دیکر مامور کیا کہ دریائے نربدا کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کریں اور خان جہاں لودی کو دریائے نربدا عبور نہ کرنے دیں۔ دو دو گرز بردار ہر سردار کے ساتھ محض اس کام کے لیے مامور ہوئے کہ ایک کی خبر دوسرے کو پہونچاتے رہیں۔ اس طرح دو سو گرز برداروں کو مصروف ہونا پڑا جو دلیل اس بات کی ہے کہ مذکورہ سرداروں کی تعداد ایک سو تھی جو دریائے نربدا پر مامور ہوئے تھے۔ خانجہاں لودی نے دریائے نربدا کو عبور کیا اور کوئی اُسے نہ روک سکا۔ مالوہ اور راجپوتانہ کے جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کو طے کرتا ہوا دیپال پور تک پہونچ گیا۔ بظاہر احمد نگر اور دیپال پور نہ سمولی الفاظ معلوم ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کے نقشے میں احمد نگر اور دیپال پور کے مقاموں کا فاصلہ دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ راستے میں کون کون سے پہاڑ، دریا، اور شہر و قصبات حائل ہیں، پھر یہ بھی سوچو کہ برہان پور میں شاہجہاں بہ اعظم ہندوستان کی پوری طاقت لیے ہوئے پڑا ہے۔

اور رات دن اس فکر میں مبتلا ہے کہ خان جہاں کا کانٹا جلد از جلد چھانٹا جائے۔ خان جہاں
کا صرف ہزار بارہ سو تباہ حال وافسردہ خاطر پٹھانوں کی جمعیت کے ساتھ دیپال پور پہونچ
جانا معجزہ سے کم نہ تھا۔ اور اگر وہ افغانستان کے پہاڑوں تک پہونچ سکتا تو بہت زیادہ
ممکن تھا کہ شیر شاہ اعظم کی سلطنت پھر پٹھانوں کے قبضہ میں آجاتی اور شاہجہاں کو اپنے پردادا
ہمایوں کی منزلیں ایران و ہندوستان کے درمیان طے کرنی پڑتیں۔ مگر خدا تعالیٰ کو اس طرح
نہیں، بلکہ حضرت عالمگیر علیہ الرحمہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی اثر قائم رکھنا منظور تھا۔
پنجاب و پشاور کے صوبہ دار غافل نہ تھے اور دیپال پور سے آگے بڑھ کر پنجاب یا سندھ کے
میدانوں میں خان جہاں کا قتل وگرفتاری سے محفوظ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ خانجہاں
کی خبر سنتے ہی جالندھر سے پشاور تک کی چھاؤنیوں میں حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ لہذا خانجہاں
دیپال پور سے پھر مالوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سرونج پہونچ کر دو تین روز قیام کیا۔ عبداللہ خاں
صوبہ دار کالپی اور سید مظفر خاں بارہہ سرونج کی جانب متوجہ ہوئے لیکن سرونج پہونچکر
معلوم ہوا کہ خان جہاں لودی دو روز پہلے سرونج سے روانہ ہو چکا ہے اور دو شاہی ہاتھی
جو سرونج میں موجود تھے انکو اپنے ہمراہ لے گیا ہے۔

دریا خاں کی شہادت

سرونج سے روانہ ہو کر خان جہاں بکرماجیت ابن جھجار سنگھ بندیلہ
کے علاقے میں داخل ہوا تو بکرماجیت اپنا لشکر جرار لے کر
خان جہاں کی گرفتاری کے لیے چلا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خان جہاں آگرہ سے صرف
دو ہزار افغانوں کی جمعیت لیکر چلا تھا۔ ان دو ہزار افغانوں میں سے کسی نے اسکی رفاقت
ترک نہیں کی۔ حالانکہ انکو کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنا اور سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ ہر روز
مصروف قتال رہنا یا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مقابلہ بھی ہمیشہ دس گنی، بیس گنی یا پچیس گنی فوج
سے ہوتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ خاں جہاں کی قابلیت سرداری زیادہ مستحق تحسین
ہے یا اسکے دو ہزار رفیقوں کی وفاداری زیادہ مستوجب آفریں ہے۔ کم از کم یہ ضرور تسلیم کرنا
پڑتا ہے کہ خانجہاں ایسا لائق اور شریف سردار تھا کہ اسکے گرد ایک دو نہیں بلکہ دو ہزار ایسے
بہادر، وفادار، جان نثار اور انتخاب روزگار اشخاص جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہر قسم
کی سختیاں سہنے اور بالآخر اپنی جانیں قربان کر دینے میں تامل نہیں کیا۔ کسی سپہ سالار اور شریف
سردار کی اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں کیجا سکتی کہ اسکے ماتحت اسکے فرمانبردار

جاں نثار اور آخر دم تک وفادار تھے۔ سیکڑوں معرکہ آرائیوں کے بعد جن میں سے بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے خان جہاں کے پاس وہ ہزار جاں فروشوں میں سے اب صرف نو سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ان نو سو مصیبت زدہ مسافروں کے قافلے میں بہت سے زخمی، بیمار، عورتیں، بچے، سامان رسد، ڈیرے خیمے سب کچھ تھے۔ ایسے گرانبار قافلہ کا لوٹ لینا بکرماجیت بندیلہ کے لیے کیا مشکل تھا جو دس پندرہ ہزار سواروں کا لشکر لیکر گھر سے نکلا تھا۔ خان جہاں نے ان نو سو آدمیوں سے بکرماجیت کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن دریا خاں نے باصرار تمام خان جہاں کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ پانسو آدمیوں کے ساتھ عورتوں، بچوں اور بیماروں کو لیکر آگے نکل جائے اور دریا خاں چار سو آدمیوں کے ساتھ بندیلہ کے لشکر کو روکے۔ عورتیں اور بچے خان جہاں کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے اور ہر جگہ انھیں کی وجہ سے اسکو دقتیں پیش آتی تھیں۔ اگر عورتوں اور بچوں کی رسی اسکے گلے میں پڑی ہوئی نہ ہوتی تو غالباً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہوتی۔ بہرحال خان جہاں عیال و اطفال کو لیکر آگے بڑھا اور دریا خاں نے رک کر بکرماجیت کا مقابلہ کیا۔ یہ چار سو بہادر ایک ایک کرکے مارے گئے اور دریا خاں بھی میدان جنگ میں پیشانی پر بندوق کی گولی کھا کر مارا گیا۔ بکرماجیت نے صبح سے شام تک ان چار سو آدمیوں کو بمشکل جام شہادت پلایا اور خان جہاں کو اس یکروزہ وقفہ کے سبب آسانی بکرماجیت کے علاقے سے سلامت نکل جانے کا موقعہ مل گیا۔ بکرماجیت نے دریا خاں کا سر کاٹ کر شاہجہاں کے پاس برہان پور بھیجدیا۔ پادشاہ نے بکرماجیت کے اس عظیم الشان کارنامے سے خوش ہو کر خلعت، جمدھر، شمشیر خاص اور نقارہ اسکو عطا کیا۔ اسکے منصب اور مرتبے کو بڑھایا۔ خان جہاں اور اسکے ہمراہی پیہم سفر کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے آخر مقام بھانڈیر کے قریب جو جھانسی سے شمال و مشرق میں ہے قیام کرکے آرام کرنا ضروری معلوم ہوا۔

جنگ بھانڈیر خان جہاں کے اس قلیل جمعیت کے ساتھ قیام کی خبر سن کر سید مظفر خاں بارہہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ پہونچ گیا۔ خان جہاں کو اس کے قریب پہونچنے کا حال ایک روز پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے اہل و عیال، مجروحوں اور بیماروں کو ایک منزل آگے روانہ کیا اور خود مظفر خاں کے مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ دریا خاں کے مارے جانے کے بعد خان جہاں لودی اپنی زندگی سے بیزار اور دنیا و مافیہا سے متنفر ہو چکا تھا۔ سید مظفر خاں سے یہ مقابلہ بہت عظیم الشان اور قابل یادگار رہا۔ اس معرکہ کی نسبت منتخب اللباب کے الفاظ

یہ ہیں کہ

عجب مقابلہ و مقاتلہ دست داد از ہر دو طرف رو داد کہ سیدان بارہہ مقابل سیر ...
کہ ہر یکے چوں سد سکندر ثبات ورزیدہ داد شرط نمکخواران آخر روز سیداو پردانہ داد ایشان
شعلہ کو ہ زدہ جوہر شجاعت بروے کار آوردند و از افغانان نیز چپقلش ہاے مردانہ مردر با
بظہور آمد کہ سادات بارہہ آفرین گفتند۔ ع

چو برق از رگ ابر بہر مصاف — بروں کرد شمشیر خود از غلاف
چناں گشت دست و بغل کارزار — کہ شد تیغ ہا جفت مقراض دار

خان عالم کا خویش مسمیٰ شیر زاد، راجہ درگا داس راجپوت اس لڑائی میں خان جہاں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ خان جہاں اور اُسکے اکثر ہمراہی زخمی ہوے۔ خان جہاں کے دو بیٹے بندوق کی گولیوں سے مارے گئے۔ خان جہاں یہاں سے کالنجر کی طرف گیا۔ اب اُسکے ہمراہ سو دو سو آدمیوں سے زیادہ نہیں رہ گئے تھے۔ کالنجر کے قلعہ دار سید احمد نے اپنی رستمی دکھانے کا بہت اچھا موقع پایا اور خانجہاں کے بیٹے حسن خاں اور بعض زخمیوں کو گرفتار کر سکا اور اس قابل رحم قافلے سے بعض ڈیرے خیمے اور سامان رسد چھین لینے میں کامیاب ہوا۔

آخری معرکہ خان جہاں کالنجر سے روانہ ہو کر تالاب سندرہ کے قریب پہونچا جو کالنجر کے شمال میں کین ندی کے کنارے ہے۔ چند ہمراہی جو باقی رہ گئے تھے انکو قسمیں دے دیکر رخصت کرنا چاہا کہ اپنی جان سلامت لیکر جدا ہو جاؤ، مگر کسی نے جدائی گوارا نہ کی۔ سب نے آخر وقت تک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں۔ راجہ مادھو سنگھ بھی گذشتہ معرکے کے بعد سید مظفر بارہہ سے آملا تھا۔ یہ دونوں یلغار کرکے خان جہاں کے قریب پہونچ گئے۔ اب خان جہاں کے ہمراہ صرف بیس آدمی اور دو ہاتھی تھے۔ ان دونوں ہاتھیوں کو بورچہ بنا کر اول مصروف خدنگ اندازی ہوے۔ اسکے بعد شمشیر و خنجر تک نوبت پہونچی۔ اس شیر بیشۂ شجاعت کی آخری ساعتوں کا حال میں اپنے الفاظ میں لکھنا نہیں چاہتا۔ خافی خاں کو خان جہاں سے مطلق ہمدردی نہیں۔ وہ خان جہاں کو بُرا کہنے اور گالیاں دینے میں ذرا باک نہیں کرتا اور اُسکی ذلت و تباہی کا تذکرہ ہمیشہ خوش ہو ہو کر کرتا ہے۔ میں اس جگہ خافی خاں کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

"خان جہاں چوں تیر خوردہ زخم رسیدہ غرش کناں بر در سنانہ پرداخت — نعرہ
خراسیدہ شیران بگشت آمدند — نہنگان ز دریا بدشت آمدند"

دراں عرصہ شورے بر انگیختند   کہ در چشم محشر نمک ریختند
زبرگند گیہا سے شمشیر کیں   لب زخم بر تیغ گفت آفریں

"واں از جاں سیر آمدہ خوں گرفتہ در عرصہ کارزار ہیچ وجہ کوتاہی ننمودہ دادِ مردانگی میداد تا طناب عمرش بہ تیغ اجل بریدہ گشت و بہ برچھی ادھو سنگھ از پا درآمدہ و با وجود زخم دیگر کہ بہ پاے رسید باز بعد از افتادن خودداری نمودہ نشستہ تا دم واپسیں از دوست و دشمن آفریں شنیدہ در جواب محاربہ حریف کوتاہی و پہلو خالی نمودہ تا رسیدن سید مظفر خاں بہ ستیاری حربہ جانستاں بعالم بقا شتافت۔ گویند شاہ قلی نام گرز بردار سر او را از تن جدا ساخت۔"[27]

اس آخری معرکہ میں بھی خان جہاں لودی سید مظفر خاں کے ایک پوتے اور ستائیس دوسرے شاہجہانی بہادروں کو خاک و خون میں ملا کر شہید ہوا۔

شیر نر کی ڈکار سے بڑے بڑے پہلوانوں اور نوجوانوں کا پیشاب بلکہ پاخانہ بھی خطا ہو جاتا ہے۔ شیر نر جب ہاتھی پر حملہ کرتا ہے تو ہاتھی سُرن کے بل زمین پر گر پڑتا ہے۔ شیر نر جب غرّا کر کچھار سے اُٹھتا ہے تو ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں کی جوتیاں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم نے یہ تماشا بھی اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مرے ہوئے شیر کی کھال ایک چمار اُتار رہا ہے اور اُسکی مونچھ کے بال بڑے اطمینان کے ساتھ دیا سلائی سے جلائے جا رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے شیر نر کی دُم پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے اور اُسکی آنکھوں کو انگلیوں سے ٹٹول رہے ہیں۔ عقلمند ایسے نظاروں سے عبرت حاصل کرتے اور غافل بے پروائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

مذکورہ دو ہزار بہادروں میں سے صرف تیس آدمی خان جہاں کے بعد زندہ بچے جو اہل و عیال ... کو لیکر بھاگے یا مختلف موقعوں پر قید ہوگئے تھے باقی سب کے سب ایک ایک کر کے خانجہاں پر پروانہ وار نثار ہوئے۔ خانجہاں کا سر شاہجہاں کے پاس عبداللہ خاں لیکر پہونچا تو شاہجہاں نے عبداللہ خاں کو فوراً شش ہزاری منصب اور فیروز جنگ کا خطاب عطا کیا۔ خوشی کے شادیانے بجے۔ جشن برپا ہوئے اور شاہجہاں کے دم میں دم آیا۔ آخر جمادی الثانی یا شروع رجب سنہ ۱۰۴۰ھ میں خانجہاں مارا گیا۔ خانجہاں کے کٹے ہوئے سر کو شاہجہاں نے شہر شہر گشت کرایا۔

سرگشتہ بر نیزہ می زد نفس
کہ معراج مرداں ہمین است و بس

اکبر شاہ خاں۔ نجیب آباد

۱۵ ستمبر ۱۹۲۵ء

پتنگے

اختر، قصبہ س ـــــ کا ایک نوعمر رئیس (جسکی جائداد حال ہی میں کورٹ آف وارڈس
سے چھوٹی تھی) اور آنریری مجسٹریٹ، اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا تھا۔ کچھ دن
پہلے مقدمہ کے فریقین کے گواہ گزر چکے تھے اور جرح ہو چکی تھی اور صبح تک اُسے فیصلہ لکھ کر سنا دینا تھا
اور اپنے حاکم تحصیل کے پاس بھیج دینا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ اختر نے
کمرے کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں اور دروازوں پر پردے چڑھا دیے تھے تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آ سکے
لیکن ہوا رکی ہوئی تھی اور کمرے میں نہیں آ رہی تھی۔ تیز روشنی والا لمپ جسکے اوپر گلوب نہیں چڑھایا
گیا تھا اپنی روشنی کمرہ کی دیواروں پر ڈال رہا تھا۔ صرف دیوار کے اُس حصے پر روشنی نہیں پہونچ
رہی تھی جہاں تصویریں لٹک رہی تھیں اور جنکے سائے ٹیڑھے ترچھے ہو کر دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ لمپ
کی چمنی نے کمرے کی چھت میں ایک بڑا ہلکے رنگ کا گول دھبا ڈال رکھا تھا اور سامنے آتشدان کے
کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے شیشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ لکھ لیا ہوتا۔ وہ محنتی آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو
اپنے وقت پر کرتا تھا مگر کبھی جب اُسکی طبیعت خراب ہوتی تو مجبوراً اُسے اپنے اصول توڑنے پڑتے اور
وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ دو دن سے اُسکی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت
وقت چلنے نے اُسکے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیا تھا جسکی وجہ سے وہ کام کرنے کے لائق نہ رہا تھا اور آرام
تا رہا تھا۔ دن کو اُس نے فیصلہ لکھ لینے کے لیے ارادہ کیا تھا مگر ٹھیک اُسوقت جبکہ وہ کام کرنے
رہا تھا اُس سے چند لوگ ملنے آ گئے جنھوں نے اُسکے کئی گھنٹے خراب کیے۔ وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور
اب لکھنے بیٹھا تھا۔

یکایک ایک بڑا سا سیاہ چیونٹا جسکے پر نکل آئے تھے معلوم نہیں کہاں سے اُڑ کے آیا اور
پ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ چکر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کاغذ پر آ کے گرا جسے اُس نے
ے پھونک کر اُڑا دیا۔ اُسکے بعد ایک پروانہ آیا اور طوافِ شمع کرنے لگا۔ اختر نے اُسے بھی
ے کیڑے کی طرح اُڑا دینا چاہا مگر یہ اُسکی بہ نسبت زیادہ مستقل مزاج تھا اور اسکی کوشش کے باوجود
ا سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے پردار چیونٹے، پروانے، جنگلی بوٹ، اور بینیا رکیڑے اور پتنگے جنکے

نام کسی کو نہیں معلوم، لمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لمپ کی سطح پر، میز پوش پر، کاغذ پر رینگنے لگے
اور دوات اور اُس کے قمیص کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے باری باری
اُڑ کے گیت گانا شروع کیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ماش کے دانوں کے برابر کیڑے اُڑتے اُڑتے
تھک کے ایک جگہ گر پڑے اور دیر تک بے حرکت گویا دم سادھے مُردے کی طرح پڑے رہے
اور اُن میں سے ایک طرح کی بو آنے لگی۔ کچھ کیڑے اور پتنگے اُسکے گریبان اور آستینوں کی
راہ سے اُسکے کپڑوں کے اندر گھس گئے اور بعض اُسکے مُنہ اور رخساروں پر ٹہلنے اور رینگنے لگے
ایک سیاہ پتنگے نے اُسکے قلم کے راستے میں اپنے آپ کو ڈال دیا اور مُصر ہوا کہ یا وہ لکھنا بند کر دے
یا اُسکو پامال کر ڈالے۔ ایک دوسرا کیڑا اُسکے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذات کی تہ
میں گھس گیا اور کاغذ کو اُچھالنے لگا۔ اُس نے کاغذ اُٹھایا اور اُسے پھونک سے اُڑا دینا چاہا مگر
وہ اُڑ کر کسی اور طرف جانے کے بجائے اُسکے منہ کے اندر چلا آیا . . . . .

"آخر یہ اتنے بہت سے کہاں سے آئے ہیں؟" اختر نے خیال کیا "جب روشنی نہیں ہوتی تو یہ
ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نظر نہیں آتے اور چراغ جلتے ہی یہ ہر طرف سے اپنی جان ہتھیلی پر لیکر دوڑتے
ہیں۔ شاید یہ اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں اور اسی وقت مر جاتے ہیں۔ اس بری طرح جان دینے میں انھیں
کیا مزہ آتا ہے؟ اللہ ہی اُن پر رحم کرے اور انھیں سمجھ دے۔ انھیں کوئی کیسے بچا سکتا ہے؟ آدمی
ہاتھی کو پکڑ سکتا ہے اور شیر کا شکار کر سکتا ہے اور میدانِ جنگ میں ہزاروں آدمیوں کا خون بہا سکتا
ہے مگر پروانے نہیں اُڑا سکتا۔" اُس نے غور سے انھیں دیکھنا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی
جانیں تھیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ اُڑتے تھے اور پھر پھڑپھڑاتے تھے،
رینگتے تھے اور ٹھہر جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کے مر چکے تھے اور بہتوں کے پر اُنکے بازوؤں
سے علیحدہ ہو کر میز پوش کے سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پرواز کی قوت کھو کے شمع کے گرد صرف رینگنے پر
اکتفا کرتے تھے۔

"مگر ان سے کوئی کب تک لطف اُٹھائے؟" اختر نے سوچا "اس کیلئے فرصت کی ضرورت
ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میرے جسم میں
درد ہو رہا ہے اور مجھے آرام کرنا ہے" اُس نے پھر لکھنا شروع کیا مگر پھر اُسے پتنگے کام سے روکنے لگے
اُسے مقدمہ کی روئداد پڑھنا تھی اور وکیلوں اور گواہوں کے بیانات اور بحثوں پر غور کرنا تھا اور خیالات
اکٹھا کرنے تھے مگر ان سب سے زیادہ دشوار اور غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیونکر اُڑائے جائیں۔

وہ اُٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آ کے اُس نے پیاز کے کچھ ٹکڑے لیمپ اور میز پہ رکھے۔ اسکے بعد اُس نے کمرے کی سب کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازوں کے پردے گرا دیئے لیکن کیڑوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

آخر وہ کیا کرے؟ اُسکے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اُسے فیصلہ لکھ کر تیار کر لینا تھا، مگر وہ کیونکر لکھے؟ اگر صبح تک اُس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور کل نہ سنا دیا اور مسل کو تحصیل نہ بھیجا تو اُسکی بڑی سُبکی ہوگی اور اُسکی ساری ساکھ خاک میں مل جائے گی۔ وہ ایک عزت دار رئیس تھا اور اُس کا سارے حکام اور رعایا پہ بڑا اثر تھا۔ معلوم نہیں فیصلے میں تعویق ہوئی تو اسکا کیا اثر پڑے۔ ان پتنگوں کو کیا معلوم کہ اُنکے اس ننھے سے شغلِ تفریح میں اُسکے لیے کیسی تلخ مصیبت کا سامنا تھا۔ اُسے غصہ سا آنے لگا۔ کمرے کی گرمی اور اُس نے اُسکے مزاج میں اور برہمی پیدا کی۔ وہ دروازہ کھول کر لیمپ کو باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اُسکی پیشانی سے پسینہ کے چند قطرے کاغذ پہ ٹپک پڑے جن کی سیل رواں نے اُسکی کوششوں پہ پانی پھیر دیا۔ اور اُسکے لکھے ہوئے کو مٹانا شروع کیا۔ اُس نے تنگ آکر قلم کاغذ پہ زور سے پٹک دیا جس سے کاغذ اور میز پوش پر کئی گُل بوٹے کھلا دیے۔ ان گُل بوٹوں نے اُسکے دماغی توازن میں اور ہلچل پیدا کی۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے لیمپ کو مُنہ سے پھونک کے گُل کر دیا۔

تاریکی یکدم چھا گئی۔ کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی اور روشنی یا روشنی کی ایک شعاع بھی کسی طرف نہ آتی تھی، صرف تاریکی۔ کسی فوٹوگرافر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک۔ کیونکہ اُس میں بھی دھیمی سرخ روشنی حیات کا پتہ دیتی ہے۔ ملٹن کے مشہور بیان کردہ تاریکی سے زیادہ تاریکی ہر طرف چھا گئی۔ کائنات جو گویا لیمپ کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہو گئی، یکدم جیسے مر گئی، چُپ ہو گئی.......
آہستہ آہستہ اختر نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دروازے کو ڈھونڈھا اور آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہونچا اور بستر پہ پڑ گیا۔ دن بھر سرد ہوا چلی تھی اور سو وقت بھی خُنکی تھی اور وہ ملاقاتیوں کے ساتھ دن بھر تکلف سے بالکل بند بھا ہوا، جکڑا ہوا، اپنی طبیعت پہ جبر کر کے بیٹھا رہا تھا اور اُس نے آرام نہ کیا تھا، جسکی وجہ سے اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اب دانوں نے آکر اُسکے دماغ میں ابتری پیدا کر دی تھی۔ اُس نے بستر پہ پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے پیر بار بار دے دے مارے۔ اس کے دل و دماغ میں اسوقت ایک بے چینی تھی اور وہ اپنے کو بہت بہت بدقسمت آدمی خیال کر رہا تھا "مجھے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے ... مگر جب یہ

پتنگے کچھ کرنے دیں" اُس نے اپنے پیروں کے نیچے سے کمبل اُٹھا کر اُسے اپنے بدن پر ڈال لیا۔ اور اپنے کانوں سے سرہانے رکھی ہوئی تولیا لپیٹ لی ....

آہستہ آہستہ فضائے سیاہ کو چیر کر اُس کمرے کی ہر چیز اُس میں سے اُبھرنے لگی اور صاف نظر آنے لگی۔ اُسکے سرہانے اُسکی چھوٹی میز تھی جس پر سفید جھالردار میز پوش پڑا تھا۔ داہنی طرف دیوار سے برابر برابر لگے ہوئے بید کے مونڈھے تھے سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی اُسکی سنگار میز تھی جسکا بڑا حلبی آئینہ اس تاریکی میں چمک رہا تھا ..... دوسری طرف کمرے میں سے ہارمونیم کی دلربا تان اور ہلکے رسیلے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ اُسکی بیوی اور اُسکی چھوٹی سالی تھیں جو آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں اور نغمہ سرائی کر رہی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ اختر کو اسوقت ان سُریلے قہقہوں اور رسیلی آوازوں کے بجائے غمناک اور ترحم آمیز لہجوں، ہمدرد و غمگسار آوازوں کی ضرورت تھی، جو اُسکے حال کو سنبھالیں، ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جو اُس کا حال اُس سے پوچھے اور ممکن ہو تو اُس کے پیر دبائے۔

"میرے پیر کون دبائے؟" اختر نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ خیالات کی دُنیا عجیب دُنیا جس طرح کمرے کی فضائے سیاہ میں سے ہر چیز اُبھری تھی اور اُسکی آنکھوں کے سامنے آئی تھی اسی طرح اُسکے دماغ اور خیال کی دنیا میں دبے ہوئے گڑے ہوئے خیالات اُبھرنے لگے اور دیدۂ دل کے سامنے آگئے۔ نہ معلوم کس طرح اُسے وہ رات یاد آئی جب اسی طرح کی تاریکی تھی اور اُسکی ماں، اُسکے باپ سے آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہی تھی اور سسکیاں بھرتی جاتی تھی۔ اُسے صاف یاد آیا۔ وہ ایک رات تھی جب اُسکی شادی نہیں ہوئی تھی اور اُسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اُس لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ مگر اُسکی ماں کے آنسو اُسکے وقتی جذبۂ محبت پر غالب آئے تھے اور اُس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ اور اُسے یہ خیال کر کے افسوس ہوا کہ اُسکی شادی اُس لڑکی سے نہیں ہوئی جسے وہ اس قدر چاہتا تھا جسکے لیے وہ دیوانہ ہوگیا تھا، اور جو اَب تک کنواری تھی۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس نے اپنی اُس پہلی مایوس محبت کی یاد میں اپنی زندگی بغیر شادی کے گزاری ہوتی۔ لوگ اُسے دیکھتے اور اُسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے، ایک پُر راز ہستی جو ایک کھوئی ہوئی محبت کی یاد کو کلیجہ سے لگائے ہے اور اسی کے سہارے زندگی ختم کرتا ہے۔

"مگر یہ سب کیا؟" اُس نے خیال کیا "پتنگوں کو میری کھوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق ہے

اور یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟" اور یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے کروٹ لی اور اُس کے جسم کی ہڈیاں چٹ پٹ بولیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے نیچے کا دھڑ اُسکے بدن سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اُسکا نہیں ہے کسی دوسرے کا ہے۔ بستر پر اُسے کل نہیں آ رہی تھی اور اُسکے دماغ کی کوئی کل بگڑ گئی تھی اور اُسکے خیالات میں ایک جنگ سی ہو رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُسکے جسم کا ہر حصہ اُس جنگ عظیم سے مغلوب ہے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور کمبل اور تکیے لیکر وہ بستر کے نیچے فرش پر پڑ رہا تاکہ خیالات کی آمد کو روک سکے اور انتشار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا اور اُسے اپنی زندگی کے بعید سے بعید واقعات اور حادثات یاد آتے رہے جیسے اُس رات خیالات نے قسم کھائی تھی کہ اسکی ساری گذشتہ زندگی اُسکے سامنے لے آئیں گے اور دوہرا دیں گے۔

پورے دو گھنٹے گزر گئے .....

یکدم کہیں سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اُسکی بیوی اپنے ہاتھ میں موم بتی لیے آ رہی تھی اور اُسکے پیچھے بارہ برس کی ایک خوبصورت نازک چھوکری کشتی میں چائے کا سامان لیے تھی۔ فوراً جیسے مُردہ زندہ ہو جائے اختر چونک پڑا اور سراسیمگی میں کمبل اور تکیوں کو اُٹھا کے وہ اپنے بستر پر آیا اور ایسے اہتمام سے چپ پڑ گیا جیسے وہ گھنٹوں سے بے خبر سو رہا ہے۔

"چائے لائی ہوں .... کیا سو گئے؟ اختر نے اپنی بیوی کی سُریلی آواز سُنی۔

اُس کی بیوی نے اُسے بیدار کیا اور لمپ روشن کیا اور اُسے چائے پلائی اور اُس سے چھی باتیں کرتی رہی اور چلی گئی۔ خوب گہرے رنگ کی تیز چائے کی تین پیالیاں پی کر اختر کی جان میں جان آئی۔ پھر اُس نے کئی سگرٹیں سلگائیں اور ان کے دھوئیں اُڑائے اور کمرے میں ٹہلتا رہا ..... گیارہ بجے کے قریب وہ دفتر کے کمرے میں داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھا اور دو بجے صبح تک خوب دُھنواں دار مضمون لکھتا رہا ....

میز پوش پر پروانوں کے پر اب تک پڑے تھے مگر پروانے اُڑتا اور باہر سے پتنگے آنا بند ہو گئے تھے۔

جلیل احمد قدوائی بی۔اے

افکارِ وحشت

نہاں بلا کی تپش جانِ بیقرار میں ہے
کشش یہ کس کی دل آویزیِ بہار میں ہے

تری ادا کی جھلک شوخیِ بہار میں ہے
تری نوائے طرب نغمۂ ہزار میں ہے

نہیں ہے ایک طرف سے کششِ محبت میں
کچھ اپنے دل میں ہے اور کچھ نگاہِ یار میں ہے

تو ہی تو ہے چمنِ رنگ و بو کا جلوہ فروش
ترا ہی عشوہ تو رنگینیِ بہار میں ہے

ہوا ہے مدعیِ دید دیدۂ حیراں
لبِ خموش بیانِ حدیثِ یار میں ہے

اگرچہ خاک ہوا دل ترے تغافل سے
ہنوز تیری توجہ کے انتظار میں ہے

ہم اپنے عقدۂ مشکل کو دیں مبارکباد
کسی کا گوشۂ ابرو کشادِ کار میں ہے

دلِ اسیر کا میرے رہینِ منت ہے
وہ پیچ و خم جو تری زلفِ تابدار میں ہے

مرے ہی جوشِ محبت کی ہے سکھائی ہوئی
وہ دلبری کی ادا جو نگاہِ یار میں ہے

نہیں ہیں راہ نوردانِ عشق بے ساماں
علاجِ آبلۂ پا کا نوکِ خار میں ہے

بجھا ہوا ہے دل ایسا کہ کچھ اثر ہی نہیں
نگاہِ یار کی شوخی نگاہِ یار میں ہے

جہاں کا رہے یہ اور تو دلِ ناداں
فریبِ مسئلۂ جبر و اختیار میں ہے

گواہِ شوق نہیں صرف ایک دامنِ چاک
نشاں جنوں کا گریباں کے تار تار میں ہے

خزاں کے دستِ تعدی کو جس سے تھی تحریک
وہی پھر اب چمن آرائیِ بہار میں ہے

امیدیں بڑھتی ہیں اس کی بقدرِ مایوسی
عجیب بات یہ تیرے امیدوار میں ہے

عدوئے امن و اماں تھی کشاکشِ ہستی
میسر اب مجھے آسودگی مزار میں ہے

ہے میری آنکھ کا نور اور میرے دل کا سرور
وہ جام مے جو مرے دستِ رعشہ دار میں ہے

رہے گا دل اثرِ بیخودی سے گم کب تک
نگاہ اسکی تقاضائے بار بار میں ہے

اثر ہوا نہ ذرا بھی ترے تغافل کا
کہ اک زمانے سے شوق اپنے کاروبار میں ہے

تمام عمر نہ اترے گا نشۂ وحشت کا

رضا علی وحشت

روح رواں

یوں تو سب جانتے ہیں کہ اُردو کا پُتلا بقول آزاد سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے بنا ہے۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ زبان اُردو پر جس قدر مسلمانوں کے احسانات ہیں اُسی قدر ہندوؤں کے بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کے دور میں اس حقیقت کو اکثر اصحاب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور سیاسی تنازع البقاء کے ہنگامہ نے ادبیات میں بھی ایک اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر رکھا ہے۔ ایک فریق کی کوشش تمام تر اس پر صرف ہو رہی ہے کہ زبان میں اجنبی سے اجنبی عربی و فارسی الفاظ بہ افراط استعمال کیے جائیں اور اُردو کو خالص اسلامی رنگ دیدیا جائے۔ وہ اپنے نزدیک اسی کو "ادبِ لطیف" کہتے ہیں کہ چند غیر مانوس الفاظ و تراکیب کو جمع کر دیا جائے۔ مطلب ہو یا نہ ہو۔ دوسرے گروہ کی سعی کا مدار اس پر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عبارت میں سنسکرت اور ہندی کے ثقیل سے ثقیل الفاظ داخل کر دیے جائیں۔ خواہ سادگی و روانی کا خون کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے حضرات روزمرہ میں سیکڑوں عربی و فارسی الفاظ بولتے ہیں مگر تمام تحریر و تقریر میں بتکلف ہندی لفظ تلاش کرتے ہیں۔

ایسے نازک دور میں اس مشترکہ ملکی زبان کی صحیح خدمت کی آواز جس طبقہ سے بھی بلند ہو قابل صد تبریک ہے۔

حال میں بابو جگت موہن لال صاحب رواںؔ ایم اے ایل ایل بی وکیل اُناؤ کا کلیات اُردو نہایت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ روح رواں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جسکو دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ برادرانِ وطن میں اپنی ملکی زبان سے صحیح ذوق رکھنے والے موجود ہیں۔ رواں صاحب قانون اور انگریزی لٹریچر میں کافی دستگاہ رکھنے کے ساتھ فارسی ادبیات کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور اُردو کے ایک نکتہ سنج سخنور ہیں۔

اس حسین و جمیل مجموعہ کو اُنھوں نے منظومات، غزلیات، قطعات، اور رباعیات کے عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم اگرچہ منطقی نہیں اور جا بجا متداخل معلوم ہوتی ہے، تاہم مصنف نے غالباً اسی میں سہولت سمجھی۔ موضوعات کے اعتبار سے اُنھوں نے مناظر، واقعات،

جذبات، اخلاق، تصوف، فلسفہ، تغزل سبھی پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اپنی قدرتِ کلام اور تنوع تخیل کا درخشاں ثبوت دیا ہے۔

منظومات کے تحت میں وہ نظمیں ہیں جن میں جناب رواں نے کسی تخیلی یا حقیقی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ بعض نظموں میں چند سامحات بھی موجود ہیں جو غالباً ابتدائی مشق کے زمانہ کی یادگار ہیں، اور جو انھوں نے خود شاعر کا میلانِ سخن اور ارتقائی مذاق دکھانے کے لیے بدستور قائم رکھے ہیں۔ نظمیں مجموعی طور پر بلند اور دلآویز ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ شاعری کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں

شاعری کیا ہے اک احساسِ قوانینِ وجود | دل کے جذبات کا اظہار بہ تائیدِ قیود
مہرِ ہمن ہے دلِ شاعر۔ بتِ فطرت معبود | جلوہ پیرائے ازل کا ہے بیانِ حسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اتر آتی ہے

اللہ اللہ زہے وسعتِ دامانِ غزل | بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم ہوتا ہے دو عالم پہ بیانِ غزل | پوچھیے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

جذبات کا تنوع انسانی دل میں کم و بیش ہونا ضروری ہے۔ مگر شاعر و غیر شاعر میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر زیادہ حساس اور ذکی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے احساسات کو بیان کرنے کے لیے بہترین اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کسی قدر اس نظم سے ہوتا ہے جو رواں نے لاوارث بچہ کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاعر نے ایک نومولود حسین بچے کو دیکھا ہے جو گھورے پر پڑا ہوا ملا ہے۔ اور دفعتاً اسکے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا ہے۔ جسکو اس طرح ادا کیا ہے۔

آہ اے نو واردِ بزمِ رباطِ روزگار | آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار
آہ اے دیباچہ شرحِ کتابِ دردِ دل | آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل
آہ اے تعبیرِ خوابِ مستِ ایامِ شباب | آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب

اسی قسم کے چند اشعار کے بعد جن کی دلآویز اور بلیغ تراکیب شاعر کی جودتِ طبع کا پتہ دیتی ہیں اس طرح استفسار ہوتا ہے

کچھ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون | پھول ہے تو کس شجر کا اور ترا مالی ہے کون

زینت آغوش ہے تو جسکی وہ مادر ہے کون — نور ہے جس گھر کا تو، پیچھے بتا وہ گھر ہے کون

تو کوئی اسرار پنہانی کا دفتر تو نہیں — تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں

حیف کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل — تجھ کو سمجھوں ثمرۂ بدکاری نفس ذلیل

ے خیالات میں ایک پُر اضطراب اُلجھن رونما ہے۔ ایک طرف اس حسین و جمیل معصوم صورت
بدکاری نفس ذلیل" ماننے سے گریز کرتا ہے۔ دوسری طرف "حضرت انسان کی کمزوریاں"
ہوے اپنے فیصلہ کو "دنیا کے لوگوں کی دلیل" کا تابع قرار دینے پر مجبور ہے۔ آخر عالم حیرت
سا چلا اُٹھتا ہے

حسن کا یہ باوہ نا کچھ مجھے بھاتا نہیں — میرے مالک کچھ سمجھ میں راز یہ آتا نہیں

باپ ماں کے نفس سرکش کی کہانی ہائے ہائے — اے معاذاللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے

خودغرض انسان تیری خودپرستی الاماں — یہ تری ناعاقبت اندیش مستی الاماں

یکسر جذبات، اخلاقیات، اور ادب لطیف کا دلکش مرقع ہے۔ جناب رواں نے ایک
شوہر کُش حسینہ" کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ جو شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔
دل ایک طرف حسینہ کے بے پناہ حسن کے تاثرات سے متاثر معلوم ہوتا ہے، دوسری
ن سفاکی اور شوہر کشی کا شکوہ سنج نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا سمجھوں تجھے یا بیوفا سمجھوں تجھے — حسن فطرت کے فرشتے بول کیا سمجھوں تجھے

تجھے مظلوم کج فہمی دنیا مان لوں — یا مجسم میں کوئی سرّ خدا سمجھوں تجھے

ن کو اپنا مرکز پرستش مانتا ہے اُسکی نامرادی اور شکستہ حالی دیکھ کر تصویر حیرت ہے۔
یح سوال کرتا ہے

ہی گر تجھکو بھاتی ہے تو میرے دل میں آ — کسلیے مٹی کی دیواروں میں زندانی ہے تو

ن افروز ہوتی آہ تو وہ شمع تھی — کسلیے زنداں میں وقف سوز پنہانی ہے تو

دل میں ہو جگہ تیری تو وہ حسن تھا — سچ بتا کیوں مبتلائے عالم فانی ہے تو

عر کے افتاد طبع کی کتنی سچی ترجمانی کر رہا ہے

روں کو تو کوئی وجہ مسرت ہو تو ہو — مجھ کو لیکن باعث تکلیف روحانی ہے تو

بات کو مطلق العنان چھوڑنا نہیں چاہتا اور ایک ساتھ ضمیر و اخلاق کی آواز سے چونکتا
آتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اُسکی تعلیم فلسفہ اخلاق شروع ہوتی ہے اور یہی اُسکا

کمال ہے۔ سنیے وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس میں بھی خشک استدلال کے بدلے شاعرانہ
رنگینی کا عنصر نمایاں ہے۔ یہی واعظ و شاعر کا بین فرق ہے

یہ جفائیں اے نگاہِ ظلم پرور کس لیے — یہ ستم تو نے کیے آخر ستمگر کس لیے
جانگدازی کو نگاہِ ناز کافی تھی تری — حلق عاشق پر کیا تھا تیز خنجر کس لیے
کیا رہیگا آہ بتلا تیرے پاسِ ناز پر — تو نے کاٹا عاشقِ جانباز کا سر کس لیے
اضطراب دل کا تھا کیا کم تماشا دلفریب — رقص بسمل کا ہوا منظور منظر کس لیے
کیوں کیا بدنام تو نے حسن کی عصمت کو آہ — داغ ڈالا دامنِ شرم و حیا پر کس لیے

کام تو نے اے حسیں جلاد کا کیونکر کیا
خون اپنے شوہرِ ناشاد کا کیونکر کیا

اسکے بعد وہ بیگناہ مقتولِ ستم شوہر کی نعش سے مخاطب ہوتا ہے

آہ اے مقتول - آہ اے کشتۂ نخچیرِ حسن — آہ اے صید جراحت خوردۂ شمشیرِ حسن
آہ اے مخمورِ سمِ گیسوے افعی سرشت — آہ اے تازہ اسیرِ حلقۂ زنجیرِ حسن

سچ بتا دے تجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی
حسن عالم سوز کو کیوں تجھ سے ایسی کد ہوئی

پوری نظم پڑھیے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے -
"منظر عبرت" میں ایک مزدور کی زبان سے اسکی داستانِ درد بیان کی گئی ہے - یہ غریب
سادگی، محنت، نیکی اور خلوص کا مجسمہ ہے - اور تمام گھر کی امیدوں کا مرکز - مزدوری کے لیے
نکلا ہے اور زمین کھودنے کی خدمت پر مامور ہے - اچانک اوپر سے ایک کگار ٹوٹتی ہے اور اسکی
زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے - اس نظم میں اگرچہ ادبی لطافت زیادہ نہیں لیکن اسکے سر تا سر پُر تاثیر ہونے
میں شک نہیں - طوالت کے خوف سے صرف پہلا بند لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے -

منظرِ عبرت ہے اے رہرو ذرا تھم دیکھ لے — روبرو آئینہ اسرار عالم دیکھ لے
حالتیں دیکھے گا پھر ایسی بہت کم دیکھ لے — حسرتوں کا خون ارمانوں کا ماتم دیکھ لے

داستانِ خانہ ویرانی ذرا سن لے تو جا
سرگزشتِ عالمِ فانی ذرا سن لے تو جا

اسی سلسلہ میں کچھ مذہبی نظمیں ہیں - جن میں "رحلتِ بلال" نسبتاً بہتر ہے -

رواں صاحب کو ادائے جذبات کے علاوہ تصویرِ مناظر کھینچنے میں بھی خاص کمال ہے۔ گنگا کنارے کی شام نہایت پیاری نظم ہے اور جن لوگوں نے کبھی گنگا کے کنارے شام کا دلفریب منظر دیکھا ہے وہ یقیناً اسکی داد دیں گے اور اعتراف کرینگے کہ رواں کا قلم جزئیات کا احاطہ کرنے میں کس قدر مہارت رکھتا ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں

اُف یہ فضائے دریا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے | موجوں کا چلبلا پن فطرت کے یہ کرشمے
حدِ نظر تک اپنی پھیلا ہوا ہے پانی | پانی میں آ رہے ہیں ہلکورے ہلکے ہلکے
یوں ٹوٹی پڑ رہی ہیں ایک ایک پہ یہ موجیں | ملنے کو مضطرب ہیں گویا کہیں کسی سے
آئینہ ہے کہ پانی اللہ رے دل فریبی | اک آسمان اوپر اک آسمان نیچے
یہ نشہ خیز موسم یہ دل ربا خموشی | یہ جانفزا مناظر۔ گنگا میں تیرے صدقے

مسرور کر رہی ہے گو ہم کو سیرِ دریا
لیکن قلق ہے دل کو اے کاش تم بھی ہوتے

حصۂ منظومات کی بابت ریویو نامکمل رہیگا اگر رواں کی نظم "دو آنسو" کی نسبت اظہار خیال نہ کیا گیا۔ اس میں ایک ہندو بیوہ سے پیامِ شادی اور بیوہ کا جواب ہے۔ پوری نظم کی نقل کے لیے یہ "سفینہ" ناکافی ہوگا۔ اور انتخاب کرنا درحقیقت شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے پوری نظم کے مطالعہ کے لیے اہلِ نظر کو دعوتِ نظر دیتے ہوئے میں اس حصہ کو ختم کرتا ہوں اور قدر گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے عندیہ میں یہ نظم اُردو ادب کے شاہکاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ ہندو عورت کے جذبات کی اس سے بہتر ترجمانی میں نے نہیں دیکھی۔

غزلیات رواں دَورِ جدید کے عمدہ غزل لکھنے والوں میں ہیں۔ ورتغزل، تصوف، فلسفہ، اخلاق، غرض دَورِ جدید کی غزل کے تمام خصائص اُنکے یہاں ملتے ہیں۔ اُنکا فلسفۂ شعر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اُردو کے قدیم اساتذہ میں رواں میر اور غالب کے معتقد ہیں۔ ان دونوں شاہانِ سخن کی بارگاہ میں وہ اپنا خراجِ عقیدت اس طرح ادا کرتے ہیں

میر سمجھا تھا فقط معنیِ اسرارِ سخن
ختم غالب پہ ہوئی گرمیِ بازارِ سخن

تغزل کی بابت اُن کا خیال ہے کہ وارداتِ عشق کو اس طریقہ سے بیان کیا جائے کہ جو اثر بیان کرنے والے پر ہوا ہے سننے والے پر بھی مترتب ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسلوبِ بیان اور مضمون

ایسا ہو کہ بڑے چھوٹوں کے سامنے یا چھوٹے بڑوں کے سامنے ادا کر سکیں۔ اس شرط کو نباہنے میں وہ نمایاں طور پر کامیاب ہوئے ہیں جیسا کہ آئندہ انتخاب پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا۔ رواں بالطبع فلسفی واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکی غزلیات اور رباعیات میں فلسفہ اور اخلاقیات کا عنصر زیادہ ہے۔ تصوف کا مذاق بھی اسی کا اثر ہے۔ مگر اُنکا فلسفہ اور تصوف بیشتر ہندو تخیل کا رہین منت ہے اور ہر ہر قدم پر ویدانت، تناسخ، تنوطیت کی تعلیم ملتی ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید تمہید کے بجائے ہر خصوصیت سے متعلق کچھ نمونہ پیش کیا جائے جس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکے۔

مضامین تغزل و عشق

ذرا حسنِ نمک آلود سے کر دے خبر ظالم	مرے زخمِ جگر وہ لذتیں پھر یاد کرتے ہیں
گزاری اتنی مدت قید میں صیاد کی ہم نے	کہ اب ڈھونڈھے نہیں ملتا چمن میں آشیاں مجکو
میں کہ چلا تھا وا اور محشر سے حال دل	اک سرمگیں نگاہ گلوگیر ہو گئی
طلسم و عدۂ فردا کے توڑنے والے	تجھے خبر نہیں کیا لطف انتظار میں ہے
دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی	آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں
میں کیجا ہی کرتا تھا اپنے حواس	کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا
قفس میں اور یہ صیاد نے مجھ پر ستم ڈھایا	نظر کے سامنے ہی لا کے شاخِ آشیاں رکھدی
آبلے دل کے یہاں ٹوٹ کے ناسور ہوئے	مُڑ کے دیکھا بھی نہ اُس محوِ خود آرائی نے
تری نگاہ جراحت نواز کے صدقے	یہ تازگی مرے داغِ کہن میں آئی ہے
ارے مرے دل رنگیں کے روندنے والے	بچا بچا، کہ یہ تصویر ہے زمانے کی
وہ عرضِ حال میں اشکوں پہ معترض ہیں عبث	میں کیا کروں یہی سُرخی ہے اس فسانے کی
گلہ فضول ہے طولِ شبِ جدائی کا	بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی
بہت دنوں میں ہوا ہے یہ فیصلہ دل کا	کہ آج چل کے چکالیں معاملہ دل کا

تصوف و فلسفہ

اشعار ذیل میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ رواں نے فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور مضمون کے خشک ہونے کے باوجود انداز بیان کی رنگینی کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ تخیل مقدرۃً بلند ہے مگر زبان میں سلاست اور بیان میں تاثیر ہر جگہ موجود ہے۔

ـتی بینا کو دکھلا اپنی آنکھیں دیکھنے والے — دوا کر ہوش کی لے کہنے والے بے نشاں مجکو
ل زندگی ہے کام کرنا کام کرتا ہوں — تاسف ہے اگر ہو کاوش سود و زیاں مجکو
یا راحت عدم کی اور کجا ہنگامۂ ہستی — کہاں سے کھینچ لائی ہے مری قسمت کہاں مجکو
نذرانیانِ کاکل ہستی کدھر کو جائیں — اک زلف سب کے پاؤں کی زنجیر ہوگئی
ں تھم گیا سفیرِ عمل کہ کے یا نصیب — جس جا پہ ختم منزل تدبیر ہوگئی
ـشنی روح کی موقوفِ فنا سے تن ہے — جلتے جب شمع کو دیکھا تو پگھلتے دیکھا
ـہ کاری پہ آتا ہے جب انساں کا دلِ غافل — یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ کوئی دیکھتا بھی ہے
ـم ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک خوابِ جنوں — کون بتلائے مرے خواب کی تعبیر مجھے
ـگیا مل گیا انجام گنہ اسے داور — اب خیالات مرے دیتے ہیں تعزیر مجھے
ـر انوارِ حقیقت سے ہر اک وہ زیست — توڑ دیتا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے
ـں کو پیار نہ کر مجکو ڈھونڈنے والے — کہ میرے حسن کا جلوہ ہر اک خار میں ہے
ـی جاتی ہے تنہائی میں لذت روح کی ضائع — لٹا جاتا ہے ویرانہ میں گنج شائیگاں میرا
ـصر ہنستے ہیں دنیا کی سیاست سکراتی ہے — کسی سے پوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا
ـروئے عصیاں ہے دنیا سے خطا مسلک — اے کاش کہ میں اس میں پیدا نہ ہوا ہوتا
ـم دیے وہ رنج کہ انساں بنا دیا — منت پذیر ہوں ستم روزگار کا
ـروح ہے ایام گذشتہ کا خیال — حیف کچھ ایسی بھی باتیں ہیں کہ جو یاد نہیں
ـا قالب انساں میں کیا میں نے ترقی کی — آوارۂ منزل ہوں آوارۂ منزل تھی
ـرم تن میں ہے اک نور پر تو رخ یار — جو کم نظر ہیں اسے شمع جاں بھی کہتے ہیں
ـسی سے کیا چاہوں میں کسی سے کیا مانگوں — دولتِ ہمہ عالم میری تنگدستی ہے
ـا تک چھائی ہوئی ہے تیرے نغمہ کی صدا — اپنی لے سے بیخبر اے سازِ زندگی
ـں عطا ہو پھر وہی نور نشاطِ بیخودی — قلب سیاہ ہو گیا کاوشِ امتیاز میں
ـیں روحِ آرزو- رقص میں ذرہ ہائے دل — اُف یہ کسی نے کیا کہا خامشی زبان راز میں
ـانے آخرِ شب پردہ ہائے نور سے جھانکا — کہ کو دینے لگا اک ایک ذرہ بزم امکاں کا
ـچہاں سے کفر و توہم کا کیا علاج — آئینہ کہہ رہا ہے آ آئینہ ساز تھا
ـکے کا تعین بھی دھوکا نظر آتا ہے — تصویر سمجھتا ہوں یا پردہ نظر آتا ہے

کے اکثر اشعار کی تان تصوف یا فلسفہ پر آکر ٹوٹتی ہے۔ یہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ان
ہر شعر کی تفصیل کیجائے تو مضمون زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اسلیے دوسرے اصنافِ سخن کے بارے
میں عرض کرتا ہوں۔

قطعات - میں بھی بیشتر یہی انداز پایا جاتا ہے اگرچہ اتنے دلکش نہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک
قطعہ ملاحظہ ہو:-

جو انِ عشق میں بیہوشیوں کی انتہا جو ہے ۔۔۔ وہیں سے عالم عقل و خرد کی انتہا سمجھو
علاج درد کا جب تک دل غافل رہے اب ۔۔۔ وہی عار ہے کہ جب تک تم مرض کو لا دوا سمجھو

رباعیات ڈیڑھ سو سے کچھ اونچی ہیں اور ان میں سے اکثر خیالات کی بلندی اور زبان کی
صفائی کے لحاظ سے اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ رواں کو رباعی سے خاص شغف ہے
اور وہ رباعی نویس کی حیثیت سے زیادہ مشہور رہیں۔ یوں تو انکی غزلیں اور دوسری نظمیں بھی عموماً
مذاقِ عام سے بلند ہیں، لیکن رباعی میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز و مخصوص درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں
نے اپنے وسیع خیالات کو ادا کرنے کے لیے رباعی کی تنگنا ے کو منتخب کیا ہے۔ اور جہاں جہاں
انکا توسنِ قلم اس نازک اور دشوار گزار مرحلے سے عہدہ برآ ہوا ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔ نیا لاتا
زیادہ تر تصوف یا فلسفہ کے بحث سے متعلق ہیں اور وہی ہر جگہ بار بار آتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر مقامات
پر شاعر نے اپنے طرزِ ادا سے گونہ تازگی پیدا کر دی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم چند عنوانوں کے تحت
بعض رباعیوں کے نمونے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں:-

تدبیر و تقدیر

تدبیر پہ منحصر اوقات پہ ہے ۔۔۔ انجام عمل خدا ہی کی ذات پہ ہے
یہ کوشش نامراد کہتی ہے رواں ۔۔۔ تقدیر کی راہ اتفاقات پہ ہے

ایضاً

مذہب فقط اک ہوس ہے ایمان نہیں ۔۔۔ باب ایمان کا کوئی عنوان نہیں
نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواں ۔۔۔ بندے کے لیے گنہ بھی آسان نہیں

آزادی و اسیری

آزاد ضمیر ہو فقیری تو ہے ۔۔۔ دل بے پروا رہے امیری تو ہے
زنجیر ہو سے باعث قید رواں ۔۔۔ محدود رہے خیال اسیری تو ہے

قنوطیت

دھوکے میں جہاں کے ہر بنی آدم ہے
عنوانِ خوشی بھی سرخیٔ ماتم ہے
یہ فیصلۂ نگاہِ عبرت ہے رواں
عشرت کدۂ جہاں میں غم ہی غم ہے

حقیقتِ انسانی

جتنا بیہوش تر ہوں دانا تر ہوں
جتنا مشہور تر ہوں رسوا تر ہوں
اے میرے مٹانے والے معلوم نہیں
میں ہستی و نیستی سے بالاتر ہوں

رازِ عالم

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں
رازِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیال اہلِ دنیا ہیں رواں
اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

ایضاً

دل! رازِ ثبات تجھکو معلوم نہیں
اصلی حالات تجھکو معلوم نہیں
تو نقطۂ اصل و مرکزِ ہستی ہے
شاید یہ بات تجھکو معلوم نہیں

ثباتِ ہستی

ہے گرم جہاں رسمِ بازارِ فنا
ہے دارِ حیات سربسر دارِ فنا
لیکن کیونکر جہاں کو فانی سمجھوں
ذرّے کو بھی جب نہیں ہے اقرارِ فنا

تناسخ

یہ ہستی جزو و کُل نہیں ہونے کی
ہستی پابندِ مُل نہیں ہونے کی
محفل بدلے لگن بدل جائے مگر
یہ شمعِ حیات گُل نہیں ہونے کی

فلسفۂ گناہ

گر پھر کبھی زندگی عنایت کرنا
مالک میرے خودی عنایت کرنا
ہوتے ہیں گناہ وجہِ تکمیلِ حیات
پھر ذوقِ گناہ بھی عنایت کرنا

تہذیب و فطرت

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے
آزادیٔ دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے
فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

تشکیک

دیں شیخ کا۔ مذہب برہمن کیا ہے   کیا ثابت جاں ہے مقصد تن کیا ہے
دھوکے ہیں یہ قصہ ہائے نار و جنت   کس کو معلوم بعد مردن کیا ہے

بعض رباعیوں میں اپنے رنگ کے خلاف رندی و سرمستی کے خیالات ادا کیے ہیں۔ اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ تعجب ہوتا ہے کہ آیا یہ وہی غم پرست شاعر ہے یا کوئی اور۔ ایک رباعی سنتے جائیے:۔

نوروز ہے غرق بادہ دنیا کر دے   میرا ارمان آج پورا کر دے
پیالوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی   تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

ہمیں رواں صاحب کے فلسفۂ حیات سے اختلاف ہو یہ امر دیگر ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے کنوکشن (معتقدات) کو جوش اور رنگینی کے ساتھ شاعری کے پیرایہ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اور خصوصاً رباعی میں وہ ایک بلند پایہ سخنور رکھے جانے کے اہل ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ کلیات میں بعض مقامات پر زبان کی خامیاں اور فروگذاشتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳۷ پر پران ناتھ استعمال کیا ہے حالانکہ تقطیع میں پ یا ر گر جاتی ہے۔ اگرچہ ہندی میں ان دونوں حرفوں کا تلفظ ایک حرف کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے، مگر اردو اسکی متحمل نہیں ہو سکتی۔ صفحہ ۴۰ پر ذوالکرام ہے جسکے کچھ معنی نہیں۔ ذوالکرم اس موقع پر ہونا چاہیے یا قافیہ و وزن کی رعایت سے نیکنام وغیرہ۔ اکثر جگہ لگانے قابل، دیکھنے قابل لکھا ہے۔ حالانکہ یہ غیر فصیح ہے۔ اسی طرح سے صفحہ ۹۴ پر مسافر کے بدلے سفیر کا لفظ بے محل ہے۔ صفحہ ۱۴۲ پر ہر بنی آدم تحریر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی آدم جمع ہے۔ اسپر ہر بنی آدم لکھنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶ پر مثنویات کو قطعات کی ذیل میں درج کر دیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی چند اور فروگذاشتیں ہیں۔ جو اگر نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ تاہم ان جزوی تسامحات کی بنا پر جناب رواں کے کلام کے مجموعی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ادبی کمال کی وجہ سے ملک کے خوشگو شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
(لکچرار۔ علیگڑھ)

۲۳۔ اکتوبر ۳۲ء

غلط رہ نمائی

دو چیز تیرۂ عقل است، دم فروبستن
بوقتِ گفتن، وگفتن بوقتِ خاموشی

لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے، ہندوستان کے زعماء و رہنمایانِ قوم
ملک یکجا ہوتے ہیں۔ چار روز کامل جلسوں، مشوروں اور فیصلوں میں گزرتے ہیں اور خاتمہ پر شرکاءِ
مجلس اس عظیم الشان جلسہ کے بخیر و خوبی اتمام پر باہم گر مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہوتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گذشتہ چند سال کی خانہ جنگیوں اور بہیمیت کی نمائش کے بعد بالآخر ایک ایسا
نسخۂ کیمیا ہاتھ آگیا جس سے بدنصیب ہندوستان تیرہ و تاریک ہنگاموں سے نکل کر آزادی کی
روشنی بخش جد و جہد میں گامزن ہونے کے لائق بن جائیگا، اور ملک میں پھر وہی کیفیتِ اتحاد کی ہوا
چلنے لگیگی جو ۲۰ء و ۲۱ء میں ایک سال کے اندر سوراج حاصل کرنے کی دلخوش کن توقعات
پیدا کرنے کی موجب ہوئی تھی۔

کانفرنس کے اندر مسلمانوں کی تینوں بڑی سیاسی مجالس کے نمائندے تشریف رکھتے ہیں آل
نڈیا مسلم لیگ کی طرف سے اس ذیلی مجلس کے ارکین موجود ہیں جو ہندوستان کے لیے دستورِ اساسی
تیب دینے کے متعلق غیر مسلم جماعتوں سے گفت و شنید کرنے پر مامور تھی، مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ
ن روز تک لکھنؤ میں منعقد رہتا ہے، اور آخری دن میں نمائندے کانفرنس کے لیے منتخب کیے
تے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ اپنی محترم جماعت کی طرف سے دس بزرگوں کو نمائندگی کے
انتخاب کرتی ہے۔ کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ کی مشہور بارہ دری میں بڑے طمطراق اور جاہ و
ل کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے دستور اساسی مرتب کرنے والی کمیٹی کے ارکین کی
ت جلیلہ کے اعتراف اور شکریہ کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ مجلس خلافت کی طرف سے مولانا
ت علی صاحب نہرو کمیٹی کا شکریہ ادا فرماتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ایک حرفِ مخالفت
زبان سے نکلے تو میری زبان مفلوج ہو جائے، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماء اپنی محترم مجلس
ف سے شکریہ ادا فرماتے ہیں، اور مولوی محمد یعقوب صاحب گذشتہ اجلاس مسلم لیگ کے
ظم لیگ کی نمائندگی فرما کر تجویز شکریہ کی تائید فرماتے ہیں۔ اور جب تجویز کی منظوری کا وقت

آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مولانا حسرت کے سوا جنکی مخالفت کی تائید اس تجاویز ۔۔۔
نے بھی نہ کی جبکے نمایندہ ہوکر وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کسی کو اظہار اختلاف میں ۔۔۔
اسکے بعد ڈومینین سٹیٹس (یعنی برطانوی نوآبادیات کے مساوی درجہ) والی تجویز پیش ہوئی ہو تو سب سے پہلے پنڈت
جواہر لال نہرو ایک اعلان پڑھتے ہیں، جس پر انکے علاوہ دیگر ہندو مسلمانوں کے دستخط ثبت تھے اور جسکا
مفہوم یہ تھا کہ ہم لوگ آزادیٔ کامل کے حامی ہیں اس لیے حصول مدعا کے لیے اپنی آزادیٔ عمل کو
قائم رکھتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ اس تجویز کی تائید ہم نہیں کر سکتے، مگر چونکہ کانفرنس کے کام میں
خلل ڈالنا نہیں چاہتے اس لیے اس تجویز کے متعلق ووٹ دینے سے ہم اجتناب کریں گے۔ پھر مسٹر
سبھاش چندر بوس اپنی اور شعیب قریشی صاحب کی جانب سے اعلان فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم
لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے جس نے یہ دستور اساسی مرتب کیا ہے، لیکن آزادیٔ کامل کی جدوجہد
کرنے کے متعلق ہم بھی اپنی آزادیٔ عمل برقرار رکھیں گے۔ البتہ اس تجویز کی منظوری میں حارج نہ ہونگے
اسکے بعد خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا شفیع داؤدی صاحب صدر مجلس خلافت، اور جمعیۃ العلماء
کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند بھی اسی قسم کے اعلان فرماتے
ہیں، اور بالآخر مولانا حسرت موہانی کی واحد اختلافی رائے کے ساتھ تجویز منظور کر لی جاتی ہے۔

اب فرقہ وارانہ مسائل کی باری آتی ہے اور سب سے پیشتر مسئلۂ سندھ کے بارے میں اعلان
ہوتا ہے کہ سندھ کے ہندو مسلمان اور پارسی نمایندوں نے باہمی سمجھوتے سے ایک تجویز منظور کر لی ہے
جس پر مسلمانوں کی جانب سے مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بھی
دستخط فرما دیے ہیں۔ اور یہ تجویز جلسہ کے سامنے پیش ہو کر منظور کی جاتی ہے۔ ٹھیک معلوم نہیں کہ مولانا
حسرت نے جو ہر تجویز سے اختلاف کرنے کے لیے گویا مامور تھے اس تجویز کے بارے میں اپنا اختلاف ثبت
کرایا یا جلسہ کے اندر جس جوش و خروش کا اظہار اس موقع پر کیا گیا اس نے انکو اپنے وظیفہ سے غافل
کر دیا۔

پھر تالیوں کی گونج میں پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ نمایندوں کی جانب سے ایک متفقہ سمجھوتہ
پیش ہوا۔ جسکے متعلق مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کو ضامن بناتے کے بجائے غلطی سے
ڈاکٹر سپرو، مولانا ابوالکلام اور مسز سروجنی نائیڈو کو واسطہ بنایا گیا تھا۔
مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب اور مولانا حسین احمد
صاحب، جمعیۃ العلماء ہند کے چار محترم نمایندے مراجعت فرمائے وطن ہو چکے تھے ورنہ وہ مشاہدہ

فرما سکے اب جب یہ سمجھوتہ سا پا لیا اور اس پر دستخط کرنے والوں کے نام پڑھے گئے تو شرکائے بزم نے کس درجہ مسرت و انبساط کا اظہار کیا۔

دفعتاً مولانا شوکت علی صاحب "روسٹرم" (تقریر کرنے کا مقام) پر تشریف لائے اور بیچ ہوئے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں اعلان فرمایا کہ خلافت کمیٹی نے اسکے خلاف تجویز منظور کی ہے اور خلافت کمیٹی اسی تجویز پر قائم ہے۔

بجلی کی کوندھ دیکھکر یا بادل کی گرج سن کر جو حالت لوگوں کی ہوتی ہے بعینہ یہی سماں اسوقت جلسہ میں نظر آرہا تھا۔ غیر مسلم انگشت بدنداں تھے کہ صوبہ پنجاب کے نمائندوں کے باہمی سمجھوتے کے بعد اس قسم کے اعلان کا کیا محل تھا۔ اور مسلمان ندامت سے سرنگوں تھے کہ اسکے سمجھنے سے قاصر رہتا، مقتضیات وقت سے کس درجہ نا آشنا ہیں۔

اسی حالت میں بعض نمائندگان پنجاب نے مولانا سے استفسار کیا کہ مجلس خلافت نے اس قسم کے اعلان کی کب ہدایت کی تھی، اور مولانا نے زبان سے کم مگر چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی جنبشوں سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا جواب بھی مرحمت فرمایا اور انکے نیچے اترتے ہی مولانا عبدالقادر قصوری نے پنجاب کے مسلمان نمائندوں کے طرز عمل کے حق بجانب ہونے کے متعلق ایک واضح بیان دے کر اہل جلسہ کی تشویش و حیرت کو دفع کر دیا۔

پھر بنگال کی جانب سے مسٹر سین گپتا اور مولانا اکرم خان صاحب نے اعلان کیا کہ بنگال کے ہندو مسلمانوں کو نہرو رپورٹ کی وہ تجاویز منظور ہیں جنکا تعلق اس صوبہ کی فرقہ وارانہ نمائندگی سے ہے۔

اب بقیہ سفارشات کے متعلق ترمیمات پر بحث شروع ہوئی نمائندگان جمعیۃ العلماء ہند میں سے مولانا حسرت کو سب سے زیادہ تقریر فرمانے کے مواقع حاصل ہوئے کیونکہ انکو بسم اللہ سے لیکر تا ے تمت تک غالباً ہر چیز سے اختلاف تھا۔ اور دوسرے نمائندوں میں سے ایک نے فرض کفایہ کی ادائگی کے لیے اس درجہ مستعد ہو تو بقیہ اصحاب کے سر سے ساری ذمہ داری ساقط ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

مسلم لیگ کے نمائندوں میں سے مولوی محمد یعقوب صاحب تو اسکے تقریر کے سدھی تشریف لے گئے تھے البتہ ڈاکٹر کچلو اور مسٹر چھاگلہ کانفرنس کی کارروائی میں برابر حصہ لیتے رہے اور آخر الذکر کی ایک اہم ترمیم بحث مباحثہ کے بعد اصولاً قبول بھی ہو گئی۔

مجلس خلافت نے نمائندوں میں سے پنجاب کے بعض اصحاب نے پورا پورا حصہ لیا۔ مولانا موصوف علی تو پہلے ہی شیر مار چکے تھے اس لیے اب چھوٹے چھوٹے چرندوں اور ننھے ننھے پرندوں کے شکار کی طرف کیوں مائل ہوتے۔ البتہ مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بعض ترمیمات پیش کیں۔ ایک میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بعض تبدیلیاں تجویز کیں جسے انھوں نے بھی قبول فرما لیا اور کانفرنس نے بھی اسکی منظوری دیدی۔ بعض کے متعلق صدر نے یہ فیصلہ کیا کہ منظور شدہ تجاویز کی بدولت اب یہ ترمیمات خلاف ضابطہ ہو گئیں اور آخری مانده ترمیم پیش کرنے کے وقت معلوم ہوا کہ صاحب موصوف صدر کے اس فیصلہ سے ناراض ہو کر کسی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ اور انہوں نے یا مولانا شوکت علی صاحب نے خلافت کمیٹی کے کسی دوسرے نمائندے کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں فرمائی کہ اس ضروری ترمیم کو جلسہ کے روبرو پیش کرے۔

دو دن بعد مولانا شوکت علی صاحب لکھنؤ سے دہلی پہونچے اور ہمدرد کے ذریعہ آل پارٹیز کانفرنس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور بمبئی پہونچ کر کانفرنس کی مخالفت میں اخبار خلافت کے ذریعہ مسلسل گولہ باری شروع کر دی گئی اور کانفرنس کے ساتھ ہی ساتھ مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام اور "پنجابی ٹولی" سبھی کو تاک تاک کر مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

ادھر مولانا شوکت علی نے شبخون مارا اور ادھر جمعیۃ علماء ہند کے اخبار الجمعیۃ نے باڑھ مارنا شروع کر دی اور حضرات صدر و ناظم جمعیۃ نے اسی پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ بعض مشتبہ چال چلن کے لوگوں کی معیت میں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ کر کے کہرام مچا دی کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کا قتل عام ہو گیا۔

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایسی جماعتیں پہلے سے موجود تھیں جو آتش افتراق کو شعلہ زن کرنے کے لیے ہوا دینے پر مامور تھیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء کی شرکت سے انکے نصیب کھل گئے۔ اور سارے ملک میں طوفان تلاطم بپا ہو گیا۔ اور مسلمانان ہند دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

نہرو رپورٹ کوئی خدائی ضابطہ نہ تھا کہ اسکے خلاف زبان کھولنا گناہ قرار پائے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی غرض ہی یہ تھی کہ اس رپورٹ کے ما لہٗ و ما علیہ پر غور و بحث ہو۔

کوئی شخص یہ توقع نہیں کرتا تھا کہ ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں میں سب ہی اسکی درستی کو تسلیم کرلیں گے۔ اور کم سے کم ہر قوم کے اندر ایک جماعت ایسی ضرور موجود تھی جسکے متعلق یہ پیشنگوئی کی جا سکتی تھی کہ خواہ باہم انکے درمیان کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو مگر اس رپورٹ کی مخالفت میں وہ ضرور متفق الخیال ہونگے۔

لیکن یہ توقع بیجا نہ تھی کہ ملک کے وہ تمام ہی خواہ جو موجودہ اجنبی حکومت سے کسی نہ کسی حد تک بیزار ہیں اور متمنی ہیں کہ اس ملک میں بھی اہل ملک کو وہی حقوق حاصل ہوں جو اغیار اور دنیا کی آزاد دوسری اقوام کو اپنے اپنے ممالک میں حاصل ہیں، اس رپورٹ کو پورے غور و خوض اور ضروری تغیرات و ترمیمات کے بعد ضرور قبول کرلیں گے تاکہ کسی قسم کی مشترکہ جد و جہد ممکن ہو۔

مجلس خلافت کے ایک مخلص کارکن، اس رپورٹ کی تیاری میں شریک رہے تھے اور سوائے ایک دو باتوں کے رپورٹ کے بقیہ حصص کے بارے میں ان کا اختلاف بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔

مجلس خلافت میں جب تین دن کے قریب بحث ہوئی تو اسوقت بھی صرف بعض جزئیات میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ پوری رپورٹ مسترد نہیں کی گئی۔

جمعیۃ العلماء نے البتہ غالباً اس غلط فہمی (غلط فہمی اس لیے کہ بعد کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے تحقیقات کی تو آل پارٹیز کانفرنس کا دعوت نامہ دفتر جمعیۃ العلماء کے کاغذات سے برآمد ہوا) میں کہ آل پارٹیز کانفرنس نے اسکو دعوت شرکت نہ دے کر اسکی اہمیت کو نظر انداز کیا، اپنی بعض مخالفانہ رایوں کو قبل از وقت شایع کردیا۔ لیکن جب اسکے نمایندے کانفرنس میں شریک ہوئے تو ان کا فرض تھا کہ جن جن امور میں اختلاف تھا کانفرنس کے روبرو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے اور شرکائے کانفرنس کو موقع دیتے کہ انکے اعتراضات کو جانچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ کہاں تک قابل قبول یا لائق استرداد ہیں۔ لیکن یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دلوں کی باتیں زبانوں پر نہیں آئیں۔ بیشتر حضرات صم و بکم بنے بیٹھے رہے اور اب ہر طرف سے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق پامال ہوگئے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوگیا۔ وغیر ذالک۔

اب اگر غور کیا جائے تو اس سارے شور بے ہنگام کا باعث سوائے اسکے کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کے بقول آل پارٹیز کانفرنس میں بعض رہنمایان خلافت اور چند علمائے کرام کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوئی جسکے یہ حضرات اپنے مقتدر مناصب کے لحاظ سے حقدار تھے۔

اگرچہ یہ تھا۔ اور اسکے سوا بظاہر کوئی معقول بات کہی بھی نہیں گئی، تو ذرا غور کرنا چاہیے کہ
اسکی ذمہ داری کس پر ہے؟ مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داودی صاحب دونوں بزرگ
صدر کے پشت پر جو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں وہیں مولانا ابو الکلام اور مہاراجہ صاحب محمود آباد وغیرہ
کے پاس تشریف فرما تھے۔ اور جب سندھ کا معاملہ پیش ہوا تو باوجودیکہ ان حضرات کو سندھ سے براہ
راست کوئی تعلق نہ تھا مگر انکی منزلت پر نظر کرکے ان دونوں صاحبوں سے بھی سندھ کے سمجھوتے پر
دستخط کرائے گئے۔ حضرات علمائے کرام جلسہ میں بہت دیر کو تشریف لائے اور آخری نشستوں میں دیگر
نمائندگان جمعیۃ العلماء و مجلس خلافت کے پاس بیٹھ گئے۔ مولانا عبد الماجد صاحب کو یہ امر نامناسب
معلوم ہوا تھا تو وہ بہت آسانی سے بابو موہن لال سکسینہ یا اور کسی کارکن کو توجہ دلا کر ان حضرات
کے لیے عمدہ نشست کا انتظام فرما سکتے تھے۔ بلکہ زیادہ آسان یہ تھا کہ وہ خود آگے کی صف میں جہاں
تشریف رکھتے تھے اس جگہ کو خالی کرکے ایک صاحب کو وہاں لیجا کر بٹھا دیتے جسکے بعد منتظمین کانفرنس
کو غالباً اس غلطی کے انسداد کی طرف توجہ ہو جاتی۔ مگر شاید وہ بھول گئے کہ

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

اور اسلامی تعلیم کے بموجب تو غالباً یہ بات ایسی وقیع نہ تھی کہ اتنی اہم مجلس کی کارروائی پر اس کا اثر
پڑنے دیا جاتا۔ پھر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داودی کو تو اس کس مپرسی
کی بھی شکایت کا موقع نہیں۔ اور اسی لیے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ ان حضرات
کی موجودہ روش کا سبب کچھ اور بھی تھا۔ وہ سبب کیا ہو سکتا ہے؟

کیا یہ کہ مجلس خلافت کے آخری اجلاس میں مولانا شوکت علی صاحب کی رائے و مرضی کے خلاف
انگورہ فنڈ کے اس سرمایہ سے جو اسی جلسہ میں مجلس خلافت کی ملک قرار دیدیا گیا، بیس ہزار روپیہ جامعہ ملیہ کی
اعانت میں دینا منظور ہوا۔ اور اسکی ذمہ داری انکی رائے گرامی میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام
اور پنجابی ٹولی کی سازش پر ہے۔ یا پھر جیسا کہ انکی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کہ پنجاب کے
بارے میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اسکے متعلق انکی رائے والا یہ ہے کہ پنجابی ٹولی اور مولانا ابو الکلام نے اس سمجھوتے
کے ذریعہ سے مجلس خلافت کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، میں کچھ ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اتفاق سے
اُس وقت میں مجلس خلافت کے جلسہ میں موجود نہ تھا۔ البتہ جو کچھ سنا اسکی بنا پر سمجھتا ہوں کہ خواہ تصفیہ
مولانا شوکت علی صاحب کی رائے کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہوا ہو، مگر یہ بات کچھ ایسی نہ تھی کہ

س کا اثر آل پارٹیز کانفرنس کے معاملات میں قبول کیا جاتا۔

اب رہی دوسری بات، تو میری ناقص رائے میں اول تو مرکزی خلافت کمیٹی کی ذلت و رسوائی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سمجھوتہ کرنے کے گناہ گار سب کے سب مجلس خلافت کے رکن ہیں۔ اور کم سے کم دو حضرات ایسے ہیں جو سنین ماضیہ میں مجلس خلافت کے صدر رہ چکے ہیں۔ دوسرے جو تھوڑی بدنامی پیدا ہوئی ہے اُسکے ذمہ دار بھی بہت کچھ مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی ہیں۔ کیونکہ سمجھوتے کا اعلان ہونے سے قبل دونوں حضرات کو بتا دیا گیا تھا کہ نمائندگان پنجاب کیا تصفیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور انکا فرض تھا کہ وہ مجلس مرکزیہ خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ طلب کرتے اور تمام صورت حالات کو اُسکے روبرو پیش کرکے از سر نو فیصلہ کرا لیتے۔ اور جیسا کہ مجلس خلافت کے اندر رائے شماری سے ظاہر ہوا تھا یہ امر قطعی ہے کہ مجلس خلافت اس سمجھوتے کو قبول کر لیتی۔ کیونکہ ابتداءً جب یہ مسئلہ پیش ہوا اور رائے شماری کی نوبت آئی تو پہلے اہل پنجاب کی رائے لی گئی۔ ...نے تحفظ نشست کے خلاف اور ۱۱ نے موافق رائے دی۔ پھر جب سب اراکین کی رائے لی گئی تو اُسوقت ۲۶ موافق اور ۱۵ مخالف تھے۔ اب اگر یہ سمجھوتہ سامنے آتا تو ۱۵ پنجابی اور ۱۱ دیگر صوبجات کے نمائندوں کی مجموعی طور پر ۲۶ رائیں سمجھوتہ کے موافق ہوتیں اور زیادہ سے زیادہ ... رائیں مخالف۔ بہت ممکن تھا کہ مخالفت کرنے والوں کی تعداد اس سے بھی کم ہو جاتی۔ اسلئے تحفظ کی موافقت میں رائے دینے والوں میں سے بعض حضرات نے محض اہل پنجاب کی اکثریت کا ... دیا تھا۔ کانفرنس میں جانے سے قبل بھی عرض کیا گیا اور کانفرنس میں سمجھوتہ ہو جانے کے ... تو بہت سے اراکین خلافت نے تحریری درخواست دی کہ مجلس خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ ... طلب کیا جائے۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

بہرحال اس تمام روداد سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے رہنمایان کرام کے سامنے قوم و ملت کی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتیات کا سوال کتنی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور شکوک و شبہات یا کدورت و رنجش پر ملک و قوم کے اہم سے اہم مقاصد کس طرح قربان کر دیے جاتے ہیں۔ اور بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ

اب کسے رہنما کرے کوئی ؟

اکتوبر ۱۹۲۸ء

نظرے خوش گزرے

سفیر اودھ، اس پرچہ میں مکمل ہوگئی ہے۔ صرف سرورق چھپنا باقی ہے۔ جن احباب نے اسکے اوراق رسالہ سے علٰحدہ کرکے کتابی صورت میں رکھے ہوں دفتر کو مطلع فرمائیں۔ سرورق چھپنے کے بعد ارسال خدمت کیا جائے۔

ہمدرد کے سلسلہ میں دہلی کی مسلسل ہفتہ وار حاضری کا نتیجہ یہ ہوا کہ الناظر کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوتی رہی تا آنکہ اب ختم سال میں دو ماہ سے بھی کم باقی رہ گئے ہیں اور الناظر کے چھ پرچے شایع ہونا باقی ہیں۔ پہلے خیال تھا کہ دو سہ ماہی نمبر نکال کر سال آیندہ سے پرچہ کی بروقت اشاعت کا انتظام کیا جائے مگر آیندہ چند ہفتوں میں غیر معمولی مصروفیت کا سامان فراہم ہے اسلیے امید نہیں کہ اس پر عمل کیا جاسکے گا۔

ماہ رواں کے آخر میں سائمن کمیشن ناخواندہ مہمان بنکر لکھنؤ آرہا ہے اور دس دن تک یہاں قیام کرنیوالا ہے۔ ان بن بلائے مہمانوں پر اہل شہر کو مختلف مظاہروں کے ذریعہ یہ امر واضح کرنا ہے کہ دفتری اقتدار کے کارندے خواہ کتنے ہی نمایشی طریقوں سے انکا خیر مقدم کریں مگر اہل لکھنؤ اس خیر مقدم میں شریک نہیں۔ پھر ۶ دسمبر کو مولانا محمد علی صاحب یورپ سے ہندوستان واپس پہونچنے والے ہیں۔ انکی تشریف آوری پر ہمدرد کے سلسلہ میں غالبًا کامل ایک ہفتہ دہلی میں رہنا ہوگا اور بڑے دن کی تعطیل میں قومی ہفتہ کی شرکت کے لیے کلکتہ جانے کا قصد ہے۔ ان تمام مصروفیتوں کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کرنا پڑا ہے کہ ۱۹۲۸ء کی دوسری ششماہی کا کوئی پرچہ شایع نہ کیا جائے بلکہ نئے سال سے الناظر کو بروقت شایع کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن احباب کی میعاد خریداری جون میں ختم ہوتی ہے انکا سال خریداری آیندہ جولائی کے بجائے جنوری سے شروع ہوگا اور جنوری ۱۹۲۹ء کا پرچہ انکی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کیا جائیگا۔ اور بقیہ احباب کی میعاد میں چھ مہینے کی توسیع کردی جائیگی تاکہ کسی صاحب کا اس تاخیر سے نقصان نہ ہو۔

کرمی جناب مولوی محمد یحیٰی صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد الناظر کے لیے امریکہ کی تاریخ ترجمہ و تلخیص کے بعد تیار کررہے ہیں۔ انشاء اللہ نئے سال سے اسکے اوراق ماہ بماہ نذر ناظرین ہونگے۔ اور کوشش کیجائیگی کہ سنہ ۱۹۲۹ء کے اندر اندر یہ کتاب مکمل ہو جائے۔ وما توفیقی الا باللہ

۲۵ نومبر ۱۹۲۸ء ظفر الملک

عجز اور قصور ہمت کا عایق نہ ہو تو مجھے ایسی امیدواری ہے کہ میرے امثال مین کمتر کسی کو ہوگی
جب تک تلاش کی طرف توجہ نہین ہے البتہ کچھ عسرت اور افکار مین گرفتاری ہے چنانچہ
اوسی خانہ نشینی کے عرصہ مین بدون اس کے کہ میری طرف سے کچھ درخواست ہو نواب
محمد علی خان ٹونک کے نواب نے کمال آرزو سے گھر بیٹھے مجھے طلب کیا اور پانسو روپیہ
درماہہ میرا مقرر کیا۔ بعضے وجوہ سے اوس کے قبول کرنے مین تامل تھا آٹھ مہینے تک راقم نے
آرے اور بلے مین رکھا اور باوصف اونکے اصرار کے اور تاکید طلب کے وہان جانے کا نا اتفاق
ہوا۔ اس عرصہ مین اون پر ایک مصیبت آئی یعنی سلطنت انگریزی کی عدالت و انصاف
نے اون کو حکومت سے معزول کر دیا اب اصرار اور مبالغہ نواب محمد علی خان کا میری طلب مین اور
زیادہ ہوا اور جو قصہ اون کی معزولی کا سنا اوس سے معلوم ہوا کہ جن رفع مظالم کی
نیت سے اون کی معزولی ہوئی اوس مین اوس بیچارے کی ذات پر مظالم واقع
ہوے اگرچہ پچھلے امتحانون سے راقم اپنے دل مین عہد کر چکا تھا کہ کبھی ہندوستان
کے پولیٹکل یعنی نظم سلطنت کے باب مین گورنمنٹ کی تدابیر کے مخالف کسی تدبیر مین
راقم شرکت نہ کریگا لیکن صرف اس نظر سے کہ ایسے اوقات مین اس جنس کے رؤسا اکثر
غدار اور مفسد اور طماع لوگون کے پھندے مین پڑ جاتے ہین اور تباہ ہوتے ہین۔ شاید اگر میرے مشورہ
کو قبول کرین تو اون کے دستبرد سے بچین اور اس معزولی کی بلا سے زائد اور تباہی مین نہ پھنسے ہین
راقم نے اون کی رفاقت اور مصاحبت قبول کی اگرچہ اوسکے قبول کرنے مین راقم فی الجملہ اپنی
ہتک سمجھتا تھا جب راقم اون کے پاس آیا تب اونھون نے نہایت عجز اور الحاح سے مجھ سے کہا
کہ پانسو روپیہ مہینا جو حالت قیام ریاست مین اونھون نے وعدہ کیا تھا اب اوس کا ایفا اون سے
نہین ہو سکتا ایک مہینا اوس حساب سے دیکے درخواست کی کہ تین سو روپیہ مہینا سے زیادہ کے
ب وہ متحمل نہین ہو سکتے چونکہ مین اون کے پاس آچکا تھا اور وہ غدر اون کا قابل قبول تھا راقم نے
ل کیا دو برس تک باوصف اس کے کہ اون کی رفاقت مین راقم کا بہت نقصان ہوا اون کے

ہمراہ رہا۔ اس صحبت دراز مین اگرچہ اون کو راقم نے حسن اخلاق اور تواضع اور فروتنی اور بعضے اور
صفات مستحسنہ مین فرد پایا مگر شان ریاست و سرداری سے اون کو عاری پایا اور چونکہ علی العموم
اہل ہند خصوص رؤسا اور بالتخصیص اون مین اہل اسلام ادبار اور نکبت مین گرفتار ہین سوا اپنا
نیک و بد سمجھنے کی کسی کو لیاقت نہین ہے اور بالتخصیص رؤسا آدمی کو بالکل نہین پہچانتے اور مطلق
دوست اور دشمن مین اونکو تمیز نہین ہے جیسا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہین چشم واز دگوش
واز واین زکا * خیرہ ام از چشم بندی خدا * کوئی ایک نصیحت میری اونھون نے قبول نہ کی جہان تک
ممکن تھا مصارف لغو سے مین اون کو روکتا رہا۔ مگر پھر جو فروش گندم نما لوگون کے ہاتھ مین جیسے
وہ پھنسے تھے ویسے ہی پھنسے رہے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا اسباب ٹونک سے ساتھ لائے تھے
وہ سب اوڑا دیا۔ میری صلاح یہ تھی کہ کہین کسی کو وکیل کر کے نہ بھیجین صرف وہین بیٹھے ہوئے ایک
مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس کر دیوین اگر کچھ مفید ہو تو بہتر نہین تو صبر اور شکر کرین آخر اونھین
کا بیٹا رئیس ہے۔ پانچ ہزار روپیہ درماہہ اون کا مقرر ہے جو اسباب پاس ہے اوس کی حفاظت
کرین۔ ایک نہ سنی جو پاس تھا اوس کو ضایع کیا۔ آیندہ دیکھیے اون کی کیا گت ہوتی ہے خدا
اون کو زندہ رکھے بعضے صفات مستحسنہ مین بے نظیر ہین غرض صحبت راقم کی اون کے ساتھ برہم
ہوئی اور رفاقت اونکی ترک ہوئی۔ اب میری غیبت مین ٹھنڈے لوہے کے پیٹنے کی تدبیرون مین جو گیا
سو گیا آیندہ دیکھیے کیا ہوتے ہین۔ ان سب کوایف کے نقل کے بعد بموجب مضمون
بلاغت مشحون وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اس امر کے اظہار سے راقم کو باک نہین ہے
اپنے پروردگار کی نعمت کا بات چیت مین ذکر کر
کہ مجھ سا بد لیاقت ناقص اور ناتمام اپنے جوہر ذاتی مین اس وقت تک جسکی عمر ستر برس کی
پہونچی جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے محض اپنے لطف و کرم سے بدون استحقاق کے اوسکو
اوس رتبہ اور ناموری پر پہونچایا کہ جس نے میرے آبا و اجداد کی جو شہرت اور بلند پایگی تھی اوس کو
روشن کیا۔ انگلستان مین سلطانہ برطانیہ اعظم اور آیرلینڈ اور ہندوستان وغیرہ یعنی ملکہ معظمہ وکٹوریا
دام اقبالہا و حشمتہا جس کا جھنڈا شوکت اور عظمت کا اکثر کرۂ عالم پر اوڑ رہا ہے اوس کے دربار مین

ذکر [illegible] بالاجمال

راقم نے نہایت عزت اور امتیاز کے ساتھ راہ پائی۔ اونکے کھانے کی میز پر مدعو ہوا تھا اگرچہ باقتضاے
تقدیر کے جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے اوس کا ظہور نہ ہوا۔ ہندوستان مین ایک وقت مین کئی سو سوار
اور پیادے انگریزی فوج کے میری سواری کے جلو مین دوڑے۔ قطع نظر اپنے ہندوستان کے
ابناے جنس سے با افراشتگان انگلشیان جو آج ہندوستان مین سر تفاخر عرش برین پر رکھتے ہین
جس صحبت کی شرکت سے اور جس دعوت مین مطلوب ہونے سے نہایت اپنا فخر اور اعزاز سمجھتے
ہین اور شاید بعضون کو وہ صحبت اور دعوت باوصف کمال سعی کے میسر نہ ہو یا دشواری سے میسر
ہو اون صحبتون اور دعوتون مین راقم میزبانون کی بہت خواہش اور آرزو سے شریک ہوا۔ آنریبل مسٹر
گلاڈاسٹن جو آجکل ملکۂ معظمہ سلطنت برطانیہ اعظم کے وزیر اعظم ہین اونکی لیڈی نے اپنی صحبت شبینہ
مین جہان تمام ارکین سلطنت اور وزرا اور امرا جمع تھے دو دفعہ اپنا رقعہ طلب کا بھیج کے اوس مجمع
کی شرکت سے راقم کو مشرف کیا اور بہت سی دعوتون میں اور صحبتون مین جن کے میزبان اوس عہد
مین مسٹر گلاڈاسٹن سے عزت اور امتیاز مین کچھ کم نہ تھے شریک ہونے سے راقم نے عزت اور
امتیاز حاصل کی نام بنام سب کا ذکر کرنا عبث اور فضول ہے بہت سے لوگون کے نام راقم بھول
بھی گیا ہے۔ صدہا میری تصویرین چھپی ہوئی اور کھینچی ہوئی مرقعون مین اور دفترون مین ارکین اور
شاہزادون کے برطانیہ اعظم کے اور فرانسیس اور روس اور پروش اور اطالیا اور صقالیا اور جرمن اور
پرتگیز اور اسپانیول اور روم اور شام اور مصر کے موجود ہین جب تلک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان
کی حکومت پر رہی اوس کے کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بورڈ آف کنٹرول کے ساتھ اور قبل اور
بعد اوسکے برخاست کے سلطنت کے وزرا کے اور اکثر ارکین اور امرا کے ساتھ مراسلات اور مکاتبات
ہوا کیے شاہنشاہ فرانسیس کے خطوط حسب الحکم میرے نام پر آئے اوس سلطنت کے اکثر امرا کے ساتھ
مکاتبات رہے اکثر لوگ بلقب ہز اکسلنسی مجھکو لکھا کیے۔ الغرض پایۂ عزت و امتیاز ہر خاص و عام
کا اوس ممالک کے اشارہ کے واسطے میری طرف اوٹھا تھا اور میری دعاے شبانہ روزی اَللّٰھُمَّ
اجْعَلْنِیْ مَحْسُوْدًا وَّلَا تَجْعَلْنِیْ حَاسِدًا الحمد للہ والمنۃ کہ مستجاب ہوئی کہ یہ گمنام ناچیز ہمیشہ محسود خاص و عام کا رہا

رہا کہ اوس سے اب بھی اس حالت کم مایگی مین بھی بچاؤ نہین ہے اور اگرچہ اس ناموری اور بلند پایگی
کے ساتھ جو ہزارون مرتبہ میری حیثیت اور لیاقت سے زاید ہے اور لاکھون روپیہ میرے ہاتھ سے
صرف ہوا اور رہا تھ مین آ کے نکل گیا کچھ مایہ توکل جو اعقاب کے کام آوے یا میری حالت بے دست و پائی
مین کام آوے وہ مین نے نہ چھوڑا اور جو تھوڑا بہت مدتون کی محنت اور شفقت نے اکٹھا کیا
تھا وہ انگلستان مین دشمنون کے اور عدالت کے مصارف کے نذر کیا لیکن مال اور مثال کو مین ہاتھ کا
میل سمجھتا ہون آیا اور صاف ہوگیا۔ اب صرف دو آرزو مین ہین جس کے واسطے تبا نہ روز دست بدعا
ہون ایک یہ ہے کہ اللہ تعالے میری عاقبت بخیر کرے اور دوسری یہ ہے کہ میرے اعقاب فکر
حصول ناموری کی اپنی ذات سے کرین اور عیش و عشرت دارین مین بسر کرین اور رزے ہے سعادت
اونکی اگر میرے انفاس بقیہ چند کو طلب اور تلاش سے فارغ رکھین۔ گو آرزو یہ ہے کہ ضیق او عسرت
حالیہ کو با داے فرایض اور واجبات جو میری گردن پر ہین اس قدر اللہ تعالے اور مجھے اس عالم
مین رکھے کہ مین خود اوسکو دفع کرون اور اوس کا بوجھ اعقاب کی گردن پر نہ ڈالون اس واسطے کہ
اب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین لیکن اِرَادَةُ اللهِ غَالِبٌ عَلٰی کُلِّ اِرَادَةٍ جو مقدر ہو چکا ہے اور
لوح محفوظ مین لکھا جا چکا ہے وہ خواہ مخواہ واقع ہوگا۔ راقم کے اولاد ذکور مین ایک میرا بڑا بیٹا
مولوی فرید الدین خان سلمہ اللہ تعالے ہے۔ سلخ صفر المظفر ۱۲۵۹ھ مین مطابق یکم
اپریل ۱۸۴۳ع پیدا ہوا۔ الحمد للہ نہایت سعید اور رشید ہے بہت تقوے کے ساتھ
بسر کرتا ہے استعداد عربیت مین اچھی حاصل کی حدیث شریف کے درس مین بہت
اوس کو شغف ہے مشکوۃ شریف اور صحیح بخاری سند کر چکا ہے۔ اور معمولی تحصیل کی

راقم کی اولاد ذکور مین بڑا بیٹا مولوی فرید الدین خان ہے اور سکے حال سے پیدایش کی واقف

کتابون مین متوسطات سے فارغ ہو چکا ہے اب بھی شغل چلا جاتا ہے فکر مین مطولات سے
فارغ ہونے لگے ہے۔ اداے فرایض اور واجبات اور سنن اور مستحبات حتی المقدور ترک نہین کرتا۔
اللہ تعالے نے اب تک با نصیب رکھا ہے تین برس کی عمر مین اودھ کی سلطنت سے قدامت
آبائی کی نظر سے سات سو روپیہ مشاہرہ اوسکے واسطے مقرر ہوا اگرچہ پھر تخفیف مین قریب نصف کے

رہا مگر سلطنت کی ضبطی تک ملا کیا۔ چونکہ بسبب شغل درس و تدریس کے قوانین سلطنت کے یاد کرنے مین اونکو توجہ نہین ہے اور نہ ایسا کوئی اپنا مربی باقی رہا جس کو نظر رعایت کی ہو۔ سردست اس سلطنت مین ایسا کوئی عہدہ اون کو ملنا جو موافق حیثیت آبائی کے ہو عسیر معلوم ہوتا ہے۔ اور فضل الٰہی سے چونکہ ذہین اور باعلم ہین قوانین یاد کرلینا اور امتحان دینا کچھ دشوار نہین ہے۔ اگر کوئی ایسا مربی ہاتھ آوے کہ فتوح اور فلاح بالیقین ہو خوامخواہ امتحان دینگے اسی نظر سے کہ باوصف ایسی محنت گوارا کرنے کے کچھ حاصل نہو توجہ نہین کرتے۔ بہرصورت اون کی سعادتمندی و ررشادت سے مجھے امید ہے کہ جناب اقدس الٰہی تعالےٰ شانہ کوئی راہ اونکی فلاح کی نکالیگا۔ قریب تین برس کے گذرے ہین کہ اونکی شادی کردی تھی اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ وہ عزیزہ مرحومہ جس کے ساتھ اون کا عقد ہوا تھا لاولد اس جہان سے اوٹھ گئی۔ اس صدمہ سے البتہ اون کو بڑا ملال ہے اللہ تعالےٰ صبر عطا کردے اور نعم البدل نصیب ہو۔ اس پیرانہ سالی مین ایک مصیبت عظیمہ میرے اوپر یہ ہوئی کہ اب تک اونکی اولاد کے دیدار سے مجھے اطمینان اور مسرت نہ حاصل ہوئی۔

وہ میری پہلی شادی سے جو والدین مغفورین نے کی تھی پیدا ہوا اگرچہ اور اولاد بھی ہوئی تھی مگر کوئی زندہ نہ رہی صرف اوس کی ایک بہن ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے اوس کی شادی مین اور اور تقاریب مین پچیس تیس ہزار روپیہ صرف ہوے۔ عباسیون مین واجد علی سلمہ نام ایک لڑکے سے جو ہمارے خاندان کا نواسہ بھی ہے اوس کی شادی ہوئی۔ بہت لایق اور ہوشیار اور کارگزار ہے۔ اب تک الور کی ریاست مین معزز عہدے پر نوکر تھا۔ کئی مہینے سے بیکار ہے خدا اوس کی دین و دنیا رفاہ اور فلاح سے کاٹے ایک اوس کا بیٹا میرا نواسہ ہے ساجد علی نام کلام اللہ حفظ کرتا ہے بیس سیپارے سے زیادہ حفظ کر چکا ہے بہت فطین اور ذہین ہے قیافہ اوس کا بہت اچھا ہے۔ اللہ تعالےٰ اوسکی عمر مین برکت دیوے اور دین اور دنیا مین بہ آسایش بسر کرے دو نکاح راقم نے اپنی خوشی سے کیے۔ ایک سیدہ کے ساتھ نکاح کیا تھا اوس سے میرا چھوٹا بیٹا ہے مولوی اکرام الدین احمد خان نام سلمہ اللہ تعالیٰ تیرھوین رمضان المبارک سنہ ۱۲۶۰ھ مطابق ستائیسوین ستمبر

نصف ۱ ان کی دعا مقبول ہوئی۔ حافظ ساجد علی صاحب وکیل اورنگ آباد کا وجود گرامی اسپر شاہد ہے۔

۱۸۹۵ء کو پیدا ہوا فضل الٰہی سے نہایت سعید اور رشید ہوا۔ لیاقت اور قابلیت نوشتخواند
فارسی کی بہت اچھی حاصل کی۔ عربیت مین متوسطات تک نوبت پہونچی تھی کچھ استعداد بھی
ہو گئی مگر تکمیل نہ کی۔ اپنے شوق سے انگریزی شروع کی۔ تین برس تک لکھنؤ کے کیننگ کالج مین
مشغول رہا فی الجملہ لکھنے پڑھنے کی کچھ استعداد بھی ہو گئی تھی کہ اوسکی شادی جناب عم والا مقام مولوی
خلیل الدین خان بہادر مغفور کی پوتی کے ساتھ جو امیر الدین خان مرحوم کی بیٹی ہے کر دی جب
سے انگریزی کا شغل بھی اوس کا موقوف ہو گیا۔ مین چاہتا تھا کہ اوس مین اوسکو تکمیل ہو جاے
مگر اوس کی ہمت عالی مقتضی خانہ نشینی کی نہ ہوئی۔ جیسا اوپر اوس کی طرف ایما ہو چکی ہے
حیدر آباد دکن کا اوس نے سفر کیا اور وہان فوراً ایک معزز عہدہ پر مامور ہو گیا اور آیندہ امیدوار
ترقی کا ہے۔ اور آجکل میری خانہ نشینی ہین مدار مصارف خانگی سارے کس وکو کا جو قریب
ایک سو آدمی زن و مرد ہین اوسی پر۔ اور میرے دو بھتیجے مولوی احسن الدین احمد خان اور مولوی فی الدین
خان علیہم اللہ تعالے پر جو تینون بھائی ایک ہی جگہ پر ہین۔ اور برادر عزیز حافظ مولوی ریاض الدین
خان سلمہ اللہ تعالے پر ہے۔ اللہ تعالے اون سب کی عمرون مین برکت دے اور خوش رکھے

اب ذکر اپنے نسب ناموں کا موافق پچھلے وعدہ کے ضرور ہوا۔ قدیم سے ہم
زبان بزبان سنتے چلے آئے ہین کہ ہم لوگ علوی ہین جن کے دو خاندان اس قصبہ
مین ہین ایک خاندان ملکزادون کا مشہور ہے اور ایک مخدوم زادون کا۔ یون نقل
کرتے ہین کہ ایک بزرگ علوی ابو بکر جاجی نام جون پور مین سلطان حسین سلطان الشرق
کے عہد مین وارد ہوے۔ اسعد الدین یا اسد الدین سالاری اون کے وزیر تھے اون کی بیٹی کے
ساتھ شادی ہوئی اون سے دو بیٹے پیدا ہوے۔ ایک کا نام نصیر الدین نصرت اور دوسرے کا
نام بہاء الدین کیقباد۔ اور قصبۂ کاکوری مین ایک راجہ بیس کی قوم کا تھا اوس کا نام تھا راجہ ساتھا
اوس قصبہ مین ایک مرد شریف جو ظاہرا سید تھے اوسی راجہ کے سوارون مین نوکر تھے اونکا مکان
اوسی راجہ کے قلعہ کے نیچے تھا جس کا نام کاکور گڈھ تھا۔ وہ سید کہین اوسی راجہ کے کام کو گئے تھے

[illegible]

ھ اوّل تعلقداری (ڈپٹی کمشنری) سے پنشن لی سعے الضاً۔

گھر مین اون کی بی بی اور ایک اونکی بیٹی ناکتخدا تھی - ساون کا مہینا تھا اون کے گھر مین ایک
درخت تھا اوس پر وہ جھولا جھولتی تھی - وہ راجہ بد معاش جوان تھا - ہاتھی پر سوار نکلا اوس
لڑکی پر اوس کی نظر پڑی - لوگ متعین کیے کہ اوس لڑکی کو لے آؤ - اوس لڑکی کی مان نے لوگون سے کہا
بہت اچھا مین اوس کو پوشاک اور زیور سے آراستہ کردون جب تم لیجاؤ اور کوٹھری مین لیجا کے
پہلے اپنی لڑکی کو چھری سے ذبح کیا اور بعد اوسکے اپنے تئین قتل کیا - اوس لڑکی کا باپ جب گھر
مین پھر کے آیا سیدھا جون پور کو چلا گیا اور دن کو مشعلین جلا کے اور سر پر خون مین ڈوبا ہوا کپڑا ڈال کے
قصر سلطنت مین گیا - مشعلین دن کو جلانا اشارہ ہے ظلم کی تاریکی کی طرف - الغرض جب شاہ حسین
کو اس مظلمہ کی اطلاع ہوئی وہ بہت برہم ہوے اور اپنے وزیر اسعد الدین سالاری کے ساتھ مخفی
ایک بندوبست کیا کہ وہ بادشاہ سے ظاہر مین برہم ہوکے جونپور سے مع اپنے کس و کو کے دلی
کے ارادہ پر روانہ ہوے اور کسی مقام پر کاکوری کے قریب خیمہ کرکے راجہ ساتنا کو اطلاع کی اور یہ
پیغام دیا کہ ہم سے اور سلطان الشرق سے بدمزگی ہوگئی ہے - اس واسطے ہم اپنی سلطنت قدیم دلی مین
جاتے ہین اس سفر مین زنانہ یعنی محل کے لوگون کا لیجانا موجب زحمت کا ہے اس واسطے آپ اگر
مہربانی سے ہمارے محل کے لوگون کو چند روز کے واسطے اپنے قلعہ مین جگہ دیجیئے کہ وہ حفاظت سے
رہین تو ہم بہت ممنون ہونگے دلی مین پہونچ کے اطمینان کے بعد ہم طلب کرینگے - راجہ چونکہ بد معاش تھا
وہ نعمت غیر مترقبہ سمجھا کہ لاکھون کا مال اور وزیر کے محل کی سیکڑون خوبصورت خوب صورت
بیگمات مفت ملتی ہین نہایت خوش ہوا اور نہایت عجز و الحاح سے عرضی بھیجی کہ قلعہ حضور کا
ہے اور مین غلام ہون بخوبی حفاظت کرونگا اس واسطے بدرقہ کی حاجت نہین ہے قلعہ کے
اندر کوئی مسلح نہ آوے محل کے لوگ بے تکلف داخل ہون - اسعد الدین سالاری نے یہ بندوبست
کیا کہ دو ہزار زنانی ڈولی ..... ہر ڈولی پر دو سپاہی مسلح تلوار وغیرہ چھوٹے ہتھیار اور تیر کمان
سے جو اوس وقت رائج تھے تیار کین اور خود کچھ اور بدرقہ کے ساتھ ہمراہ ہوے ظاہر مین جو مسلح
لوگ تھے وہ قلعہ سے باہر رہے ڈولیان سب جب قلعہ مین آچکین چار ہزار سپاہی مسلح پڑے ڈولیون

کا اوٹھا کے نکل پڑے اور قتل عام شروع کر دیا۔ خود راجہ کو پکڑ کے سیکڑون عذاب سے قتل کیا
منقول یون ہے کہ سلطان حسین کا حکم تھا کہ کتے اور بلی تک وہان زندہ نہ چھوڑنا۔ یہ ظاہرا
مبالغہ ہے اس واسطے کہ مرد اور عورت اور لڑکے سپاہی اور پیشہ ور کسی کو زندہ نہ چھوڑنا اور سب
پیشہ کے لوگ جون پور سے ہمراہ کر دیے تھے کہ اس قصبہ مین نئے آباد ہون۔ چنانچہ یہ حکایت
ہمارے قصبہ مین سب خاص و عام کی زبان پر اباً عن جدٍ منقول چلی آتی ہے۔ ایک بہت بوڑھا
حجام جو ہمارے خاندان کا برتی تھا وہ بھی چھٹپن مین ہم سے یہ حکایت نقل کرتا تھا اور کہتا تھا
کہ ہم بھی رئیس قدیم اس قصبہ کے ہین اور تمھارے اجداد کے ساتھ سلطان حسین کے بھیجے ہوے
آکے آباد ہوے ہین۔ الغرض یون منقول ہے کہ ساری کاکوری سلطان حسین نے اسعد الدین
سالاری کے اختیار مین چھوڑی اور اونکے دونون نواسے نصیر الدین نصرت اور بہاء الدین کیقباد یہان
آباد ہوے اونھین کو یا بہاء الدین کیقباد کی اولاد مین سے کسی کو ملک کا خطاب ہوا چنانچہ چند
پشت تک ملک کا لفظ اسما کے ساتھ ضم ہوتا تھا کہ وہ نسب نامہ سے معلوم ہوگا اور اونکی اولاد
سب ملکزادے کہلاتے ہین اور نصیر الدین نصرت کی اولاد سب مخدوم زادہ مشہور ہین اس واسطے کہ اونکی
تیسری پشت مین حضرت مخدوم نظام الدین قاری معروف بہ شیخ بھکاری یا شیخ بھیکہ قدس سرہٗ پیدا
ہوے جو بہت بڑے نامور مشایخ اور علماء کبار مین گذرے ہین اور اونکے عہد سے ساری اونکی اولاد
مخدوم زادے کہلاتے ہین آئین اکبری مین مشایخ کے زمرہ مین نام نامی اونکا مندرج ہے اور
بڑے بڑے امراے نامی اکبری عہد کے اون کے مریدین مین تھے چنانچہ ماہم انگہ جو اکبر بادشاہ
کی دائی تھین اور اونکے بیٹے یا بھائی امراے کبار اکبری مین تھے جن کا نام شمس الدین کوکہ مشہور
ہے اونھون نے وصیت کی تھی کہ حضرت کے جوار مین مدفون ہون اون کا بہت بڑا حظیرہ بنا ہوا
اور عوام کی زبان مین ماہم ساہم کا روضہ مشہور ہے۔ حالات اور صفات حضرت کے نقل کرنے
واسطے ایک مجلد جداگانہ درکار ہے ان دونون خاندانون مین تو بسبب یکجدی ہونے کے قدیم
سے خلط تھا ایک اور خاندان عباسیون کا ہے یعنی نسب اون کا حضرت عباس عم رسول اللہ صلی

علیہ وسلم کی طرف منتہی ہوتا ہے یہ خاندان بھی مدت سے ہمارے دونون خاندانون سے مخلوط
اور اوسی خاندان مین منصب اس قصبہ کی قضا کا ہے اور وہ مدعی ہین کہ پہلے رئیس کاکوری کے اوس
خاندان کے بانی ہین مگر سند قدامت کی ظاہرا فرمان اونھین سلطان حسین کا ہے تو غالبًا جب
اسعد الدین سالاری کی اولاد کو ریاست یہان ملی اوسی عہد مین سند قضا کی اوس خاندان کو ملی
ایک اور صدیقی خاندان ہے جو کاکوری کے رؤسا مین ہین وہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی طرف
منتسب ہے وہ خاندان بھی پچھلے زمانہ مین دونون علوی خاندانون سے اور عباسی خاندان سے مخلط
تھا۔ اب وس خاندان مین صرف ایک گھر باقی ہے جن سے ہمارے خاندانون مین اختلاط ہے اور
کئی گھر مخدوم زادون کے اوس خاندان کے نواسے ہین جواب تلک ہمارے یہان مختلط ہین۔ کچھ گھر
اوس خاندان کے باقی ہین جن سے اختلاط نہین ہے۔ ایک اور خاندان ہے کہ وہ بھی اپنے تئین
صدیقی کہتے ہین مگر یہ راقم کو نہین معلوم ہے کہ اوسی صدیقی خاندان کے ہین یا اوس سے علاوہ کوئی
دوسرا خاندان ہے جتنے گھر اون کے ہین وہ سب چودھری کہلاتے ہین کسی عہد مین یہ منصب
اون کے خاندان مین مفوض ہوا ہوگا جو پچھلے زمانے مین ایک معتمد خدمت بادشاہی تھی اور اس
سلطنت اودھ کی ضبطی تک کچھ نہ کچھ کام اس منصب کا اون خاندانون مین رہا جب سے انگریزی
ہوئی تب سے صرف نام رہگیا ہے لیکن وس خاندان سے ہمارے تینون خاندانون کے ساتھ کبھی
خلط اور آمیزش نہین ہوئی۔ ایک اور گھرانا تھا کہ اون کو شامی کہتے تھے ایک بزرگ مولوی حسن بخش
صاحب مرحوم اس گھرانے مین نامی ہوے اونھین کے ذریات کچھ باقی ہین کچھ مغول ہین سنتے ہین
کہ بعضے خاندان مغول کے اس قصبے مین بہت پرانے تھے یہان تک کہ کہتے ہین بعضے پالکی نشین
تھے اور پالکی پچھلے عہد مین یہ پالکی نہ تھی جو اب مروج ہے ظاہرا مراد اوس سے جھالردار پالکی ہے
جو بے عطاے سلطنت کے کوئی استعمال نہین کرسکتا تھا۔ اب بھی کچھ گھر باقی ہین مگر کوئی نامبرآوردہ
اونمین نہین ہے۔ سلطنت کی ضبطی تک سپاہ کے فرقہ مین سوارون مین چند لوگ نوکر تھے۔ لیکن وے
لوگ اونھین خاندانون کے ذریات مین ہین جو پالکی نشین کہلاتے تھے یہ ہمکو نہین معلوم ہے سنتے

یون ہین کہ وہ خاندان ہودہ تالاب جو اس قصبہ مین ہے اوسکے کنارہ رہتے تھے۔ اوراب یہ
لوگ وہان سے الگ قصبے کے شمال کی طرف رہتے ہین۔ کچھ اور خاندان خوش باش بھی تھے اب
کوئی نام براوردہ اون مین نہین ہے۔ ہنود مین کایتھ کی کئی قوم ہین اونمین بھی کوئی نامی نہین ہے
چند لوگ روزگار پیشہ ہین کچھ کھاتے پیتے ہین۔ دو ایک بنیے کی قوم مین کچھ متمول ہو گئے ہین
مردم شماری انگریزی جو ہوئی اوس سے معلوم ہوا کہ کل عام و خاص آٹھ ہزار آدمی اب یہان کے
باشندون مین ہین۔ یہان تک طوالت اس قصبہ کے ذکر مین ہوئی۔ اب اصل غرض جو نسب نامہ
کے ذکر کی ہے وہ یہ ہے ہم نے اپنے والد ماجد مغفور سے سنا ہے کہ جناب حضرت جد امجد مغفور نے
ایک نسب نامہ پچھلے کاغذات اسناد سے لکھا تھا مگر یہ نہین معلوم ہوا کہ وہ خاص اپنے ہی خاندان کا
تھا یا سب خاندانون کا تھا سو وہ نسب نامہ شیخ فیض بخش صاحب مرحوم جو ایک بزرگ ہمارے
ملکزادون کے خاندان کے تھے وہ لے گئے لیکن خود اونھون نے ایک بہت بڑی کتاب تمام
کاکوری کے خاندانون کے نسب نامہ کی لکھی ہے شاید وہ نسب نامہ جناب جد امجد مغفور کا لکھا ہوا
اون کا کچھ معین ہوا ہو یا وہی اصل تھا اس کا حال ہم کو معلوم نہین ہے بموجب اوس نسب نامہ کے
جو وہی امر قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین ملکزادے اور مخدوم زادے کی زبان بزبان چلا
آیا ہے نسبت ان دونون خاندانون کی محمد ابن حنفیہ ابن علی مرتضٰے کرم اللہ وجہہ کی طرف ہے اور
بیچ مین واسطہ شیخ احمد جام کی طرف دونون خاندانون مین مشہور ہے چنانچہ ایک اور بزرگ
مخدوم زادون کے شیخ احسان علی صاحب مرحوم نے اوسی نسب نامہ کے مطابق مخدوم زادون کا
نسب اپنی بیاض مین لکھا ہے اور آخر مین اوس نسب نامہ کے یہ عبارت لکھی ہے۔ از کتاب مخدوم شیخ
بھیکہ قدس سرہ این چند سطور از بیاض شاہ حسن علی صاحب متوطن جورہ من اعمال بلدہ کالپی در باب
نسب نامہ نوشتہ شد انتہٰے۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ جناب حضرت شاہ تراب علی قدس سرہ نے
ایک کتاب کشف المتواری لکھی ہے اوس مین جو نسب نامہ مخدوم زادون کا لکھا ہے اوس سے اور
جو قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین مشہور تھا بڑا فرق ہے اور چونکہ وہ نسب نامہ کتاب

زاد الآخرت کے مقدمہ سے نقل ہوا ہے جو تصنیف ملا عبدالرشید ملتانی کی حضرت مخدوم شیخ بھیکہ کے خلفاؤن مین سے ہے بظاہر نہایت معتبر ہے اوس مین نصیر الدین تک تو اتفاق ہے جو قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت لکھا ہے اور اوس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ لکھا ہے بعد اوس کے قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت ابن ابوبکر جامی مرقوم ہے اور اس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ ابن ابو محمد خافی لکھا ہے اور اوسکے بعد بالکل ایک دوسرے کے خلاف ہے اور ابو محمد خافی کے کوئی بیٹے بہاء الدین کیقباد تھے یا اون کی شادی اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اسکا حال بھی وہان نہین لکھا گیا۔ ایک اور امر مشتبہ نقل کرتے ہین کہ شیخ احمد جام علوی نہ تھے شاید فاروقی یا صدیقی تھے۔ غرض عجیب سانحہ ہے نہ مشہور قدیم کو بالکل ہم غلط کہہ سکتے ہین ورنہ انکشاف کشف المتواری کو خلاف واقع تصور کرسکتے ہین۔ بارخدایا مگر یہ کہیے کہ کوئی ایک اون مین سے نسب مادری ہے اور بسبب عظمت شان کسی بزرگ کے اوس طرف منتسب ہوا اور اصل سے سہو اور ذہول واقع ہوگیا۔ یا جیسا بعضے بزرگون کی زبان سے یہ بھی سنا ہے کہ اصل ہمارے خاندان ملک زادون کا انتساب حضرت ابوبکر صدیق کی طرف ہے اور شاید خواجہ احمد جام صدیقی تھے اور جو بزرگ ابوبکر جامی جون پور مین آئے اور اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اون کی شادی ہوئی وہ صدیقی ہون غرض حقیقت حال اور غیب کا آگاہ خداوند تعالے ہے۔ بہرصورت اس مقام پر ہم نسب نامہ اپنے خاندان آبائی کا موافق مشہورۂ قدیم کے جناب شیخ فیض بخش صاحب مرحوم کی کتاب سے نقل کرتے ہین اور جو انتساب ہمارے خاندان کو مخدوم زادون مین ہے اوس کو بموجب انکشاف کشف المتواری کے ہم نقل کرین گے۔ پس اول یہ ہے راقم عاصی مسیح الدین المخاطب بہ خان بہادر ابن قاضی علیم الدین خان بہادر ابن لقضے القضات قاضی نجم الدین خان بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی الدین ابن ملا محمد غوث ابن ملک ابو الخیر ابن ملک ابو العفا عرف ابو المکارم ابن ملک عبد السلام ابن ملک سیٹھے[1] ابن ملک چاند ابن ملک حسام الدین ابن

[1] ملک سیٹھے اور ملک چاند دونو لقب ہین جو بسبب شہرت کے اسناد مین بھی لکھے گئے۔ اصل نام ان دونو بزرگون کے معلوم نہین ہوئے ۱۲

ملک نظام الدین ابن[13] ملک بہاء الدین کیقباد - یہان تک ان بزرگون کے نام اسناد اور وثایق سے متحقق ہوے ہین اوس سے آگے موافق اشتہار قدیم دونون خاندان ملکزادون اور مخدوم زادون کے جن دونون خاندانون کا اتصال اسی پشت مین ہے یعنی بہاء الدین کیقباد ملکزادون کے جد اور نصیر الدین نصرت مخدوم زادون کے جد دونون حقیقی بھائی تھے بیٹے[14] ابوبکر جامی کے ابن[15] خواجہ درویش احمد ابن[16] خواجہ احمد جام زندہ فیل ابن[17] خواجہ ابی طالب ابن[18] خواجہ محمد شاہ ابن[19] خواجہ محمد رضا ابن[20] خواجہ موسی ابن[21] خواجہ عمران ابن[22] خواجہ غثمان ابن[23] خواجہ ابوحنیف ابن[24] خواجہ اسفندیار ابن[25] خواجہ ابوالحسن کوفی ابن[26] خواجہ ابوتراب ابن[27] خواجہ رضی الدین ابن[28] خواجہ ابوالقاسم ابن[29] محمد حنفیہ ابن[30] علی مرتضی سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ - اور راقم کا انتساب مخدوم زادون کے خاندان سے دو وجہ سے معلوم ہے اور شاید کسی اور پشت سے بھی ہو کہ وہ معلوم نہین ہوا اول یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن[1] مولوی علیم الدین خان بہادر ابن[2] قاضی القضات مولوی نجم الدین علی خان بہادر ابن[3] جناب مولوی حمید الدین مغفور والد جد راقم کی والدہ[4] مسماۃ حیاتی بی بی بنت[5] محمد حوزم ابن[6] محمد اکرم ابن[7] محمد فضل ابن[8] محمد اشرف ابن[9] شیخ عبدالقادر ابن[10] شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور دوسری وجہ یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن[1] بی بی قطب النسا بنت[2] بی بی شرفیت ہماری جدہ مادری کی والدہ[3] بی بی ہدایت بنت[4] شیخ حفیظ اللہ ابن[5] امیر الرحمن ابن[6] شیخ عصمت اللہ ابن[7] شیخ عزیز اللہ ابن[8] شیخ عبدالکریم ابن[9] شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور شیخ شہاب الدین سوندھے صاحب ابن[10] مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھیکھ یا شیخ بھکاری ابن[11] قاری امیر سیف الدین ابن[12] قاری امیر حبیب اللہ نظام الدین معروف بہ امیر کلان ابن[13] قاری امیر نصیر الدین دلیل بعد ابن[14] قاری محمد صدیق المعروف بہ ابومحمد خافی ابن[15] قاری عبداللہ ابن[16] قاری عبدالصمد ابن[17] قاری امیر شمس الدین خورد معروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع کبیر لغت تفاسیر و احادیث ابن[18] قاری عبدالمجید دربان آستانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن[19] حاجی الحرمین سلطان حسین ابن[20] قاری امیر ابراہیم اور یہ قاری

نسب نامہ راقم کا بانتساب طرف مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھکاری صحیح ترین نسب نامون مین ہے کہ کسی طرح کا اس مین شبہہ نہین معلوم ہوتا

میرابراہیم خلیفہ اور نواسہ حضرت سید عبدالرزاق خلف اور خلیفہ حضرت غوث الثقلین محی الدین گیلانی
قدس سرہ کے تھے اور ابن قاری سلطان عبداللطیف ابن قاری امیر عبداللہ خانی ابن مولانا
شمس الدین صابر ابن قاری مجیدالدین خانی ابن قاری امیر سلیمان مفسر ابن مولانا وجیہ الدین احمد
ابن قاری محمد ابن قاری احمد ابن علی ابن محمد حنفیہ ابن جناب مستطاب امیرالمومنین علی مرتضی
سلام اللہ علیہ و کرم اللہ وجہہ - اب انتساب اپنا عباسیہ کے خاندان میں لکھا جاتا ہے
یعنی راقم مسیح الدین ابن قطب النسا مغفورہ بنت شیخ غریب اللہ ابن شیخ محمد نوح ابن قاضی
محمد تقی ابن قاضی عبدالحلیم - اور جدۂ پدری راقم کی بنت شیخ محمد اسلم ابن قاضی محمد تقی ابن
قاضی عبدالحلیم - اور راقم کی جدہ مادری بنت بخشی رفعت اللہ خان ابن قاضی محمد واعظ ابن قاضی
حافظ ابن قاضی عبدالحلیم - تو تین واسطے قاضی عبدالحلیم کی طرف منتسب ہوئے
ابن قاضی مسعود ابن قاضی حسین ابن قاضی بایزید ابن مخدوم قاضی شیخ دانشمند ابن مخدوم
قاضی شیخ بہاء الدین ابن مخدوم قاضی شیخ کلان ابن مخدوم شیخ فضل اللہ ابن مخدوم شیخ
عنایت اللہ ابن مخدوم شیخ فخرالدین ابن مخدوم شیخ ابوالبرکات ابن مخدوم شیخ طاہر ابن
مخدوم شیخ علی ابن مخدوم شیخ حسین ابن مخدوم شیخ منہاج الدین ابن مخدوم شیخ محمد ابن مخدوم
شیخ ضیاء الدین ابن مخدوم شیخ امین الدین ابن مخدوم شیخ کمال الدین ابن مخدوم شیخ مسعود
ابن مخدوم شیخ محمود ابن مخدوم صدرالدین حامد ابن مخدوم قاضی خواجگی ابن مخدوم احمد
ابن قاضی یحیے - ابن مخدوم قاضی علی ابن مخدوم قاضی احمد ابن مخدوم قاضی قاسم
ابن مخدوم قاضی عبدالملک ابن مخدوم قاضی حمد حاکم قلعہ ٹھٹھ ابن مخدوم ابراہیم ابن موفق ابن ابراہیم
ابن اسمٰعیل ابن محمد ابن علی ابن عبداللہ ابن عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - یہاں تک جو کچھ
اپنے حال میں مجھے لکھنا مقصود تھا وہ تمام ہوا -

تمت

خاتمہ

مولوی مسیح الدین خان مرحوم کی خودنوشت آپ کے ملاحظے سے گذر چکی۔
اون کی ایک دوسری تالیف تاریخ الخلفا اون کے فرزند رشید مولوی محمد اکرم الدین
خان نے جوریاست حیدرآباد مین اول تعلقداری کے عہدہ تک فائز ہوکر وظیفہ یاب
ہوے ۱۳۰۵ھ مین مطبع بھیکاجی نارائن واقع اورنگ آباد دکن مین طبع کرائی تھی۔اس کے
شروع مین ۸ صفحہ پر اسی خودنوشت سے اخذ کرکے مولف کے مختصر سوانحی حالات
اُنھون نے درج کیے تھے جس کے آخر مین یہ عبارت تھی :-

"۲۳ دسمبر ۱۸۶۵ء کو آپ نے وطن مین معاودت فرمائی اور اپنا اکثر
وقت تاریخ انگلستان (جس کا آخری جزو یہ خودنوشت ہے) کی تالیف
مین جو نہایت نادر و مفید کتاب ہے اور حفظ کلام مجید مین صرف فرمایا
قریب بیس بائیس سیپارہ کے حفظ بھی کرلیے تھے۔مگر علالت اور قضا
نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔اسی عرصے مین آپ کو چند دنون نواب ٹونک و
رامپور کی مصاحبت مین بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

الغرض مولوی صاحب نے ابتداے سن شعور سے زمانۂ وفات تک اپنا
وقت کبھی بیکار و رایگان نہین کیا۔آپ کے تالیفات مین مفتاح الرشاد
لکنوز المعاش والمعاد۔اور جدول طلوع و غروب۔اور تاریخ انگلستان
اور شرح خطبۂ شقشقیہ۔اور تاریخ الخلفا حالات خلفاے بنی امیہ و بنی عباس
مین۔اور تاریخ فارسی ہندوستان وا و دھ یادگار ہین۔آپ کے
خیالات اگرچہ گذشتہ صدی کے بزرگوارون سے بالکل نئے اور علٰحدہ تھے مگر

آپ اپنے مذہبی عقائد مین نہایت راسخ و مضبوط تھے جس کی تصدیق
خود آپ کے کلام سے ہوسکتی ہے۔

۷۔ محرم ۱۲۹۸ھ مطابق ۳۰۔ نومبر ۱۸۸۰ء کو آپ نے بعارضہ استسقا
اس جہان فانی سے مقام کاکوری مین رحلت فرمائی۔ اللہ تعالے جناب
ممدوح کو اپنے جوار رحمت مین جگہ دے۔"

تاریخ الخلفا جس زمانے مین لکھی گئی یا شائع ہوئی اوس وقت تو یقیناً بہت زیادہ
قدر کے قابل تھی کہ غالباً اردو مین اوس سے پیشتر اس بحث پر کوئی ایسی جامع کتاب
نہین موجود تھی۔ لیکن اب بھی باوجودیکہ متعدد تالیفات و تراجم اس موضوع پر شائع
ہوچکے ہین اوس کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اول تو لایق مؤلف نے اہتمام و
تلاش سے عربی و فارسی کی قدیم تاریخون کا مطالعہ کرکے ضروری حالات اخذ کیے تھے۔
دوسرے تاریخی روایات کی تحقیق اور واقعات کے متعلق اظہار راے کا جہان تک تعلق
ہے مصنف نے بہت آزادخیالی سے کام لیا ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ زبان کی جس سلاست
اور ترتیب مضامین کی جن خوبیون کا خوگر ہوگیا ہے وہ اوس مین نہ ملین گی۔ خدا کرے کہ
مصنف کے اہل خاندان کی کوشش سے یہ کتاب دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہوجائے
یا یہ سعادت بھی اس حقیر کی قسمت مین آئے۔

حال ہی مین مولوی حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی نے "تذکرۂ مشاہیر کاکوری"
کے نام سے ایک بسیط کتاب شایع کی ہے جس مین کاکوری کے اکثر علما۔ فقرا۔
شعرا۔ امرا وغیرہ کے حالات درج ہین۔ اس کے صفحات ۳۹۹ - ۴۰۳ مین مولوی مسیح الدین
خان کا تذکرہ ہے جو تمام تر اسی خودنوشت سے ماخوذ ہے۔ آخری عبارت جس مین تصانیف
اور وفات کا ذکر ہے نقل کی جاتی ہے۔

"تصانیف ان کے حسب ذیل ہین :۔

(۱) مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد فارسی مطبوع

(۲) بدول طلوع و غروب

(۳) تاریخ انگلستان مشہور بہ سفرنامۂ لندن - اردو غیر مطبوع - نہایت بے مثل تاریخ ہے

(۴) شرح خطبۂ شقشقیہ حضرت جناب امیر کرم اللہ وجہہ - غیر مطبوع -

(۵) تاریخ الخلفا اردو مطبوع -

(۶) تاریخ ہندوستان و اودھ - غیر مطبوع -

(۷) شرح مکتوب حضرت ابی بکر صدیق بنام حضرت علی - غیر مطبوع -

(۸) شرح الشرح رسالۂ نثر اللآلی غیر مطبوع

(۹) ضوابط ستہ غیر مطبوع - زبان فارسی کے اصول کے بیان مین -

انھون نے بمقام کاکوری بعارضۂ استسقا بتاریخ ۷ - محرم روز چہار شنبہ ۱۲۹۹ھ بعمر ۸۸ سال انتقال کیا - اور حظیرۂ خاندانی متصل چاند محل کاکوری مین دفن ہوے

قطعۂ تاریخ انتقال از مولوی محی الدین خان ذوق کاکوروی در صوری و معنوی

سال و ماہ فوت مولانا مسیح الدین خان	روز و تاریخیکہ رفت او جانب خلد برین
بین عیان زین مصرع و بگذار روئی اشتبا	"یوم الاربعا و بدا از ماہ محرم ہفتمین"

تاریخ الخلفا کا جو اقتباس پہلے درج ہوا اوس مین تاریخ انتقال ۷ - محرم ۱۲۹۸ھ ہجری مطابق ۲۰ - نومبر ۱۸۸۰ء ہے - یعنی سنہ ہجری غلط چھپ گیا ہے - مصرعۂ تاریخی کی شہادت قوی کے علاوہ صد سالہ جنتری دیکھی گئی تو ۲۰ - نومبر ۱۸۸۱ عیسوی کو ۷ - محرم ۱۲۹۹ھ ہجری ہی سے مطابقت ہوتی ہے - ۷ - محرم ۱۲۹۸ھ تو ۱۹ - نومبر ۱۸۸۰ء کے مطابق تھی -

خود نوشت مطبوعہ کے صفحہ پر مصنف کے پردادا مولوی حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جس فارسی رسالہ کا ذکر ہے اوسے خود نوشت سے کوئی تعلق نہ تھا - اس لیے خارج کر دیا - انشاء اللہ العزیز یہ رسالہ علیحدہ چھپ جائیگا -

ظفر الملک - ۹ - اکتوبر ۱۹۲۸ء

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات نامکمل
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- مینا بازار
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- مفید الشعراء [illegible]
- گلشن [illegible]
- رسالہ تذکیر و تانیث
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس حسین ہوش مرحوم

- فسانۂ نادرِ جہاں
- پیاری سہیلی
- [illegible]
- [illegible]

منشی افضل حسین ثابت

- حیات دبیر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- [illegible]
- [illegible]
- بنگالی دلہن
- مشوقۂ فرنگ
- [illegible]
- [illegible]

پریم چند

- پریم پچیسی

مولانا عبدالحلیم شرر

- [illegible]
- خواجہ حسن بصری
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مضامین
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- القانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- [illegible] کا پھل
- حیات حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم جمال
- سیر جمال
- تاریخی و جغرافی مضامین

حکیم محمد علی خان مرحوم

- آرائش محفل
- [illegible]
- حسن [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- عالم و زاہد
- نیرنگِ جہاں
- [illegible]
- [illegible] اور [illegible]

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زبان دانی
- اصلاحِ زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- بیان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- دوسری کتاب
- تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی

- مجموعۂ گذشت

مولانا عبدالحلیم [illegible]

مولانا حسن [illegible]

- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد علیم انصاری

- الاسلام و النصرانیہ
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء

مولوی [illegible]

- سیرۃ [illegible]
- تاریخ [illegible]
- [illegible]
- تاریخ [illegible]

مفتی [illegible]

- آثار [illegible]
- حیات [illegible]
- امرائے [illegible]

نوٹ: [illegible] زبان کی [illegible] کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قیمت صرف [illegible]

[illegible] انجمن [illegible] لکھنؤ